جدید
شعرائے اردو

•

اردو ادب میں جدید شاعری کے بانیوں

مولانا آزاد اور حالی سے

لے کر عہد حاضر تک کے

مستند اور صاحب طرز شاعروں

کے

سوانح حیات ، کلام پر بے لاگ تبصرہ اور

انتخاب کلام

•

چیف ایڈیٹر

ڈاکٹر عبدالوحید

•

فیروز سنز لمیٹڈ پرنٹرز، پبلشرز، بک سیلرز اینڈ اسٹیشنرز

پشاور ـــــ لاہور ـــــ کراچی

قیمت اٹھارہ روپے

دیباچہ

گزشتہ ایک صدی کا زمانہ انسانی معراج اور ترقی کا تیز رفتار دور کہا جا سکتا ہے - اس صدی میں جہاں ہر شعبہ حیات میں ترقی کے اُبھرتے ہوئے نقوش نظر آتے ہیں وہاں اس نے ادب پر بھی خاصا اثر کیا ہے - انہی تاثرات کا یہ نتیجہ ہے کہ اس میں ہر لحظہ نئے تجربے ہو رہے ہیں - نئے اسلوب ایجاد اور نئے زاویہ ہائے خیال پیش کئے جا رہے ہیں، نئے الفاظ و تراکیب وضع ہو رہی ہیں اور اس طرح ہمارا ادب جدید اقدامات سے متاثر ہو کر اپنا رخ بدل رہا ہے - ولی دکنی سے لے کر مرزا غالب کے زمانے تک غزل میں زبان و بیان کے انداز کہاں سے کہاں پہنچ گئے - غالب کے بعد تو یہ رفتار تغیر اس قدر تیز ہو گئی کہ مستقبل کی قدروں کے متعلق اندازہ کرنا مشکل ہے اور تاریخ ادب کی اہمیت انہی تغیرات سے ہے -

''فیروز سنز'' کی ہمیشہ یہ خواہش اور کوشش رہی ہے کہ اُردو ادب کو اس کے صحیح اور جائز مقام پر جگہ دی جائے - اُردو زبان میں جس موضوع پر کتابوں کی کمی محسوس کی جاتی ہے یہ ادارہ اس پر بہترین کتب پیش کرنے کی سعی و کوشش کرتا ہے - زیر نظر کتاب ہماری انہی امنگوں کی آئینہ دار ہے - یہ کتاب نہ ذاتیات کا اشتہار ہے نہ دوست نوازی کا نمونہ، بلکہ ابتدا سے آخر تک ٹھوس علمی تحقیق کا نتیجہ ہے -

ایک مدت سے اس اہم علمی اور ادبی ضرورت کا شدت سے احساس کیا جا رہا تھا کہ بدلتے ہوئے حالات میں گذشتہ ایک صدی میں ہمارے ادب نے ترقی کی جو نئی راہیں متعین کی ہیں ان کو اس انداز سے پیش کیا جائے کہ ارتقائی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے وہ ہمارے ادب کی ایک مکمل تاریخ بھی ہو اور اس کے مطالعہ کے بعد قاری کو اس کے انداز و رفتار ترقی کا اندازہ بھی آسانی سے ہو سکے -

ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہ تھا تاہم '' فیروز سنز '' نے جو علمی، ادبی، درسی اور اسلامی کتب کی طباعت و اشاعت کی گراں قدر ذمہ داریوں کو اپنا ملی فریضہ تصور کرتا ہے - اس عظیم الشان علمی اور ادبی خدمت کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا -
مرحوم ھی نہیں زندہ شعراء کے حالات اور نمونہ کلام کے حصول میں کافی محنت کرنی پڑی ہے اور سالوں کی سعی و کاوش کے بعد ہم یہ ضخیم تذکرہ آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے قابل ہوئے ہیں -

جدید اُردو شاعری کا یہ تذکرہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ان سب تذکروں سے مختلف ہے جو اب تک اس موضوع پر لکھے گئے ہیں - اس ضخیم تذکرے سے پہلے اس

موضوع پر جو رسالے یا گنتی کی جو کتابیں لکھی گئی ہیں اُنھوں نے جدید اُردو شاعری کے صرف اُس اصطلاحی مفہوم کو پیش نظر رکھا ہے جو حالی اور آزاد کی تحریک نے اُس کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ چنانچہ جدید شاعری کے متعلق جب کچھ لکھا گیا تو آزاد اور حالی کے معاصرین اور اُن معاصرین سے براہ راست متاثر ہونے والوں کے ذکر سے آگے بہت کم بڑھے اور اگر بڑھے بھی تو اتنی دور چل کر رک گئے کہ اُن کی کوششیں عہد حاضر کی شاعری کا پورا لحاظ نہ کرسکیں۔ پھر یہ بھی ہوا کہ حالی، آزاد، اسماعیل، شبلی، اور اکبر کے علاوہ جن شاعروں پر کچھ لکھا گیا ان میں ہر طرح کی افراط و تفریط کو دخل رہا اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اس وقت تک اُردو میں کوئی ایسا تذکرہ موجود نہیں جس میں حالی اور آزاد سے لے کر اس وقت تک کے خاص خاص شاعروں کا ایسا ایسا تذکرہ مل جائے جس میں شاعروں کے ذاتی حالات، ان کا ماحول، اُن کی خصوصیات شاعری اور ان کے انتخاب کلام کو یکساں اہمیت دی گئی ہو۔

زیر نظر کتاب میں خاصے سوچ بچار سے کام لیا گیا ہے۔ تقدم و تاخر کے لئے شاعروں کے رحجانات، میلانات اور ماحول کے تاثرات کے پیش نظر پورے تذکرے کو چار ادوار میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ متقدمین، متوسطین، متاخرین اور عہد حاضر۔

تنقید اور انتخاب ذاتی پسند کی چیزیں ہیں اس لئے ممکن ہے کہ بعض قارئین کو ان میں اختلاف کے بعض پہلو نظر آئیں لیکن ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد دیانتداری سے جو رائے قائم کی گئی ہے انتخاب کلام میں اس کی وضاحت ہو سکے اور کلام کا جو انتخاب شامل ہو وہ شاعر کے منفرد اور امتیازی رنگ اور اُس کے ماحول کے اثرات کا ترجمان اور آئینہ دار ہو۔

اس قدر ضخیم اور جامع کتاب شائع کرنے کے باوجود ہمیں معلوم نہیں کہ ہم اپنے فرائض سے کہاں تک عہدہ بر آء ہو سکے ہیں تاہم ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ہمارا ضمیر صاف اور رائے بے لاگ ہے۔

کتاب کی ترتیب و تدوین میں سب سے اہم اور مشکل کام شعراء کا انتخاب تھا۔ ایسی جامع کتابوں میں صرف انہی شعراء کا تذکرہ ہونا چاہئے جو اُردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہوں اور جن کی شاعری نئے اسلوب و خیالات اور نئے تجربوں سے متعارف کراتی ہو اور اُن کے مطالعہ سے اُردو ادب کی ارتقائی مساعی کا اندازہ ہو سکے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سلسلہ میں ہم سے کوئی فروگذاشت ہو گئی ہو اور کوئی ایسا شاعر نظر انداز ہو گیا ہو جس کا ذکر نہ کرنا بے انصافی کے مترادف ہو لیکن ایسی کتاب جو ٹھوس علمی تحقیق پر مرتب کی گئی ہو۔ اس میں ایسی فروگذاشت اس کی افادیت پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

کتاب کی ترتیب و تدوین میں اکثر ادیبوں، مبصرین اور ناقدین کا مشورہ حاصل کیا گیا۔ کتاب کے کئی پہلو ان کی آراء کے حامل ہیں۔ ان کے علاوہ اکثر بہ قید حیات شعراء نے اپنے سوانح حیات مہیا کرنے اور انتخاب کلام میں ہمارے ساتھ کامل تعاون کیا ہے لیکن جن اصحاب نے کتاب کے نظم و ترتیب اور اس کی تدوین

ہیں ھمواری پیدا کرنے میں اپنی علمی، ادبی اور تنقیدی مساعی کو بروئے کار لا کر اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے میں امداد دی - ان میں مشرف انصاری صاحب پروفیسر شعبہ آردو گورنمنٹ کالج مظفر گڑھ ' جناب سراج الدین صاحب ظفر اور جناب مقبول انور صاحب داؤدی کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ھیں - ان کے علاوہ ھمیں پروفیسر سید وقار عظیم صاحب' ڈاکٹر ابو اللیث صاحب صدیقی اور جناب بشیر حسین صاحب ضیائی کا بھی شکریہ ادا کرنا ھے جن کے مفید مشورے اس ادبی کاوش میں مشعل ھدایت کا کام دیتے رھے ھیں -

(ڈاکٹر) اے - وحید

فہرست

نمبر شمار		صفحہ نمبر
	مقدمہ	ا تا ن

متقدمین

نمبر شمار		صفحہ نمبر
۱	مولانا محمد حسین آزاد	۱
۲	مولانا الطاف حسین حالی	۱۵
۳	مولانا شبلی نعمانی	۳۳
۴	محمد اسماعیل میرٹھی	۴۵
۵	اکبر الہ آبادی	۵۶
۶	علامہ اقبال	۷۴

متوسطین

نمبر شمار		صفحہ نمبر
۷	محسن کاکوروی	۹۸
۸	نظم طباطبائی	۱۰۸
۹	شوق قدوائی	۱۲۲
۱۰	بے نظیر شاہ	۱۳۲
۱۱	وحید الدین سلیم	۱۳۹
۱۲	سرور جہاں آبادی	۱۴۷
۱۳	نوبت رائے نظر	۱۵۷
۱۴	تلوک چند محروم	۱۶۹
۱۵	سورج نرائن مہر	۱۷۹
۱۶	چکبست لکھنوی	۱۸۶
۱۷	نادر کاکوروی	۱۹۶
۱۸	امجد حیدرآبادی	۲۰۷
۱۹	شاکر میرٹھی	۲۱۴
۲۰	ریاض خیر آبادی	۲۲۳
۲۱	جلیل مانک پوری	۲۳۲
۲۲	بیخود دہلوی	۲۴۱
۲۳	سائل دہلوی	۲۵۰
۲۴	صفی لکھنوی	۲۵۷
۲۵	شاد عظیم آبادی	۲۶۷
۲۶	ثاقب لکھنوی	۲۷۶
۲۷	آرزو لکھنوی	۲۸۵
۲۸	سیماب اکبر آبادی	۲۹۵
۲۹	وحشت کلکتوی	۳۰۶
۳۰	علامہ دتاتریہ کیفی	۳۱۹
۳۱	احسن مار ہروی	۳۳۰
۳۲	نوح ناروی	۳۴۰
۳۳	جسٹس شاہدین ہمایوں	۳۴۸
۳۴	مولانا ظفر علی خاں	۳۵۶
۳۵	مولانا محمد علی جوہر	۳۶۷
۳۶	غلام بھیک نیرنگ	۳۷۶
۳۷	خوشی محمد ناظر	۳۸۹
۳۸	حکیم آزاد انصاری	۳۹۹
۳۹	عظمت اللہ خاں	۴۰۹
۴۰	عزیز لکھنوی	۴۱۹
۴۱	مولانا حسرت موہانی	۴۳۳
۴۲	فانی بدایونی	۴۴۳
۴۳	اصغر گونڈوی	۴۵۴
۴۴	جگت لال رواں	۴۶۳
۴۵	دل شاہجہان پوری	۴۷۲
۴۶	اثر لکھنوی	۴۷۹
۴۷	امین حزیں	۴۸۸
۴۸	مولانا تاجور نجیب آبادی	۴۹۸
۴۹	علی اختر اختر	۵۰۷
۵۰	ہادی مچھلی شہری	۵۲۱
۵۱	یاس یگانہ چنگیزی	۵۳۱
۵۲	جوش ملسیانی	۵۴۲
۵۳	آغا شاعر قزلباش	۵۵۰

متاخرین

نمبر شمار		صفحہ نمبر
۵۴	جگر مراد آبادی	۵۶۰
۵۵	جوش ملیح آبادی	۵۷۱
۵۶	حفیظ جالندھری	۵۸۳
۵۷	افسر میرٹھی	۵۹۳

نمبر شمار		صفحہ نمبر
۵۸	فراق گورکھپوری	۶۰۰
۵۹	مولانا عبدالمجید سالک	۶۱۷
۶۰	چراغ حسن حسرت	۶۲۷
۶۱	عبدالطیف تپش	۶۳۲
۶۲	اختر شیرانی	۶۳۹
۶۳	ایس - اے رحمان	۶۵۰ الف
۶۴	اثر صہبائی	۶۵۱
۶۵	ساغر نظامی	۶۶۰
۶۶	ڈاکٹر تاثیر	۶۷۳
۶۷	صوفی غلام مصطفیٰ تبسم	۶۸۵
۶۸	عابد علی عابد	۶۹۳
۶۹	تصدق حسین خالد	۷۰۴
۷۰	احسان دانش	۷۱۰
۷۱	موہن سنگھ دیوانہ	۷۲۳
۷۲	آنند نرائن ملا	۷۳۳
۷۳	میراجی	۷۴۷
۷۴	حفیظ ہوشیارپوری	۷۵۵
۷۵	اختر انصاری	۷۶۵
۷۶	آل رضا رضا	۷۷۶
۷۷	فیض احمد فیض	۷۸۵
۷۸	عبدالحمید عدم	۷۹۶
۷۹	ماہر القادری	۸۱۱
۸۰	روش صدیقی	۸۲۱
۸۱	ن - م - راشد	۸۳۳
۸۲	اسرار الحق مجاز	۸۴۱
۸۳	عرش ملسیانی	۸۵۲
۸۴	جذبی	۸۶۲
۸۵	علی سردار جعفری	۸۷۱
۸۶	وقار انبالوی	۸۷۹
۸۷	شور علیگ	۸۸۷
۸۸	نہال سیوہاروی	۸۹۴
۸۹	احمد ندیم قاسمی	۹۰۳
۹۰	علی سکندر وجد	۹۱۶
۹۱	ساحر لدھیانوی	۹۲۴
۹۲	ز - خ - ش	۹۳۳
۹۳	جلال الدین اکبر	۹۴۰
۹۴	زیب عثمانیہ	۹۵۰
۹۵	جگن ناتھ آزاد	۹۵۹
۹۶	حیا لکھنوی	۹۷۰
۹۷	صفیہ شمیم ملیح آبادی	۹۸۰

نئی پود

نمبر شمار		صفحہ نمبر
۹۸	جان نثار اختر	۹۹۱
۹۹	مختار صدیقی	۹۹۸
۱۰۰	قیوم نظر	۱۰۰۷
۱۰۱	سراج الدین ظفر	۱۰۱۶
۱۰۲	یوسف ظفر	۱۰۲۴
۱۰۳	قتیل شفائی	۱۰۳۲
۱۰۴	جمیل الدین عالی	۱۰۴۱
۱۰۵	نذیر مرزا برلاس	۱۰۴۶
۱۰۶	شورش کاشمیری	۱۰۵۴
۱۰۷	سیف الدین سیف	۱۰۶۱
۱۰۸	فارغ بخاری	۱۰۷۱
۱۰۹	ادا جعفری	۱۰۷۹
۱۱۰	خاطر غزنوی	۱۰۸۹
۱۱۱	باقی صدیقی	۱۰۹۸
۱۱۲	ناصر کاظمی	۱۱۰۵
۱۱۳	اللہ نواز خاں نواز	۱۱۱۵

مقدمہ

شعر و ادب قومی زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ کسی قوم کی زندگی میں انقلاب زمانہ کے ہاتھوں جو نشیب و فراز آتے ہیں انکی جھلک قومی شاعری میں ضرور دکھائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر زبان کی شاعری مختلف ادوار میں مختلف رجحانات کی حامل ہوتی ہے۔ اُردو شاعری بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں چنانچہ اپنے ابتدائی دور سے لیکر آج تک ہماری شاعری جن مختلف ادوار سے گزری ہے اور اس دوران میں ہماری زندگی جیسے جیسے انقلابات سے دوچار ہوئی ہے۔ یہ اُس کی عکاسی کرتی رہی ہے۔ اس عکاسی اور تاثر کا اندازہ اُن مخصوص میلانات کو دیکھ کر ہوتا ہے جو تغیر زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں پیدا ہوتے رہے۔ اُردو شاعری کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بحیثیت مجموعی تین عظیم رجحانات ظاہر کر چکی ہے۔ ان میں سب سے پہلا تو وہ ہندی رنگ ہے جو اس پر ابتدائی زمانہ میں غالب رہا۔ اُردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ سے ولی اور سراج تک سیکڑوں شعرا گزرے ہیں لیکن ان سب کے کلام میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو عام طور پر بھاشا کی شاعری میں پائی جاتی ہیں۔ دوسرا اہم رجحان اس نے اُس وقت قبول کیا جب ایرانی کلچر اور فارسی مذاق ہندوستان میں عام ہوا اور یہ صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے فارسی شاعری کی نقل ہو کر رہ گئی۔ تیسرا زبردست رجحان مغربی شاعری کے اثرات کا ہے یعنی برصغیر پاک و ہند میں انگریزی اقتدار کے بعد مغربی خیالات اور اُسلوب اس میں راہ پانے لگے۔ پھر بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی اس میں نئی نئی تحریکوں کا آغاز ہوا رفتہ رفتہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم نے اس میں اس بلا کا تنوع پیدا کر دیا جو اس سے پہلے کہیں نظر نہیں آتا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ جب ہم جدید اُردو شاعری کی ترکیب استعمال کرتے ہیں تو اُس سے ہماری کیا مراد ہوتی ہے اور اس جدید رنگ سے قبل اُردو شاعری کی کیا کیفیت تھی؟ جدید اُردو شاعری سے عموماً وہ شاعری مراد ہے جو ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد کی پیداوار ہے۔ ۵۷ء کے انقلاب نے مغلیہ سلطنت کے ساتھ قدیم تہذیب و تمدن کی بساط اُلٹی اور اس کے ساتھ عمرانی و اخلاقی اقتدار نے بھی پلٹا کھایا۔ مغربی تعلیم کی ترویج سے نئے نئے سیاسی اور معاشی مسائل پیدا ہو گئے۔ اہل ہند میں قومیت کا احساس بیدار ہوا، ماضی کی عظمتوں کی یاد ایک بار پھر تازہ ہو گئی، حال کے تلخ حقائق کا جائزہ لیا گیا اور مستقبل کے متعلق منصوبے باندھے گئے۔ زمانے کے جدید تقاضوں نے سیاست دانوں اور مذہبی مصلحین کے ساتھ ادبا اور شعرا کو بھی متاثر کیا چنانچہ آزاد اور پھر حالی نے اُردو شاعری کے شدید تنزل اور انحطاط کے پیش نظر اُس کی اصلاح پر کمر باندھی اور رسمی و تقلیدی شاعری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ انہیں بزرگوں کی اصلاحی مساعی کا نتیجہ ہے کہ اُردو شاعری اپنی فرسودہ و مذموم ڈگر سے ہٹ کر ایک نئے رنگ و آہنگ اور ایک نئی تب و تاب کے ساتھ

ہمارے سامنے جلوہ گر ہوئی ۔ جدید اُردو شاعری کی خصوصیات اور اُس کے برتنے والوں کا تفصیلی تذکرہ آئندہ آئیگا ۔ یہاں اس تبدیلی کی ضرورت کے سلسلے میں جدید رنگ سے قبل کی اُردو شاعری کا ایک سر سری سا جائزہ لینا مناسب ہوگا ۔

شمالی ہند میں ولی کی آمد کے بعد سے اُردو شاعری کا دور دورہ ہوا ۔ اُسوقت سے لے کر میر و مرزا کے زمانہ تک اس میں مسلسل ترقی ہوتی رہی ۔ میر و مرزا کا زمانہ درحقیقت اُردو شاعری کا سب سے شاندار زمانہ ہے ۔ شعرائے متقدمین کا یہی وہ دور ہے جس میں زبان و بیان ، خیال و مضمون ، فن اور اس کی ہئیت میں اُردو شاعری کو ترقی دے کر ایک نقطہ انتہا تک پہنچایا گیا ہے ۔ اس دور کا ہر اُستاد اپنی جگہ پر ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے مثلاً میر نے عشق اور درد و محبت کا ایسا بلند تصور پیش کیا جو آج تک کسی شاعر کو نصیب نہ ہوا ۔ سودا نے شوکت و جزاعت کے ایسے ہنگامہ آفریں مرقعے پیش کئے جن کا آج تک جواب نہ ہو سکا ۔ درد نے صوفیانہ خیالات کو جس پاکیزگی ، روانی اور شستگی کے ساتھ پیش کیا وہ بھی اپنی نظیر آپ ہیں ۔ سیرت نگاری ، منظر کشی اور انداز بیان کے بے مثل نمونے میر حسن نے پیش کئے ۔ غرض کہ ہر ایک نے اپنی جو جگہ مقرر کرلی اور جو اہمیت قائم کی وہ آج تک مسلم اور مستند ہے ۔ اور جتنے باکمال اس دور میں اکھٹے ہوئے شائد ہی کبھی ہو سکیں ۔ لیکن حسن اتفاق دیکھئے کہ یہی وہ زمانہ ہے جب دھلی کی شہنشاھیت نے دم توڑنا شروع کیا اور درانیوں ، ابدالیوں ، مرہٹوں ، جاٹوں ، اور روہیلوں کی لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت گری سے جب رفتہ رفتہ دلی بالکل تباہ و برباد ہوگئی تو انگریزوں کا تسلط بڑھنا شروع ہو گیا اور مغل شہنشاہ ان کے پینشن خوار ہوکر گزارہ کرنے پر قانع ہو گئے ۔

دلی کی اس ہیبتناک تباھی اور سرپرستوں کی بد حالی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر ادباء و شعراء اس خاک پاک کو خیر باد کہہ کر نکل کھڑے ہوئے اس وقت شمالی ہند میں فرخ آباد ، لکھنو اور عظیم آباد کے معروف دربار تھے جہاں ان فن کاروں کو ہاتھوں ہاتھ لیا جارہا تھا ۔ مگر فرخ آباد اور عظیم آباد کی سرکاریں بھی زمانے کے ہاتھوں جلد تباہ و برباد ہو گئیں ۔ ایک لکھنؤ ہی کا دربار نسبتاً زیادہ پائدار ثابت ہوا جہاں آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ اختر کے زمانہ تک ہر صاحب علم و فن کی سر پرستی دل کھول کر ہوتی رہی ۔ لکھنؤ میں سیاسی بدحالیوں کا نام نہ تھا اور بقول شخصے دولت کی گنگا بہہ رہی تھی ۔ اس فراغت اور فرصت کے ماحول میں بادشاہ سے لیکر عامی تک شعر و شاعری اور رقص و سرود کی ترنگ میں تھا اور ہر صاحب کمال اپنے اپنے مرتبے کے مطابق داد حاصل کر رہا تھا ۔

غرض اُنیسویں صدی کے آغاز سے تقریباً ۱۸۷۰ء تک اُردو شاعری کا وہ دور ہے ، جسے دور متوسط کہا جا تا ہے اس دور میں سر زمین دلی اور لکھنؤ دونوں نے بعض قابل قدر شعرا بھی پیدا کئے لیکن ان مستثنیات کو چھوڑ کر بلا مبالغہ سیکڑوں شعرا ایسے ہیں جنھوں نے بقول مولانا حالی "اگلوں کے چبائے ہوئے نوالوں کو چبایا اور قدما کی تقلید سے آگے قدم نہ رکھا" ۔ اس پر طرہ یہ کہ جدت پیدا کرنے کے زعم میں جب نئے مضامین ہاتھ نہ آئے تو زبان اور اُسلوب میں سادگی کے بجائے صناعی و رنگینی اور تکلف و تصنع سے خوب خوب کام لیا یا پھر اس سے سیری نہ ہوئی تو

ریختی، ہزل، زٹل وغیرہ جیسی اختراعات کر ڈالیں۔ اس طرح معدودے چند شعرا کے سوا جنہوں نے اپنی ذاتی قابلیت اور خداداد ذہانت کی بدولت مروجہ رسمی شاعری کی قیود سے آزاد ہو کر اپنا الگ رنگ نکالا ہے باقی سب پست شاعری کے نمونوں میں اضافہ کرتے رہے۔ دور مذکور کے شعرا میں رنگین، جان صاحب، سلیمان، ظفر، قائم، منت، ممنون، حسرت، قدرت، بیدار، ہدایت، ضیا، بقا، فراق، حزین، بیان، راسخ، نظیر، ناسخ، آتش، اسیر، برق، امانت، قلق، بحر، سحر، ذکی، درخشاں، شفق، بیخود، ہنر، ہلال، وزیر، رشک، مہر، منیر، سعادت، واجدعلی‌شاہ اختر، انیس، دبیر، رشید، اوج، ذوق، غالب، مومن، شیفتہ، تسکین، نسیم، ظہیر، انور، مجروح، سالک، آرزو وغیرہ کے نام ممتاز ہیں۔ اور غیر معروف شعرا تو خیر سے ان گنت ہیں۔ ان سخنوروں کے کلام کے مطالعہ سے ان کے فنی قابلیت اور ذکاوت کا پتہ چلتا ہے اور کلام کی ضخامت ہمیں متاثر بھی کرتی ہے لیکن اس کلام کو اعلیٰ شاعری کے معیاروں پر جانچا جائے تو چند شعرا کے علاوہ باقی سب کا کلام پست و بے رنگ نظر آتا ہے۔

اس دور کے معیار شاعری کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ مختلف اصناف سخن پر الگ الگ نظر ڈالی جائے۔ اس ضمن میں ہماری مقبول ترین صنف سخن یعنی غزل کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ غزلگوئی شعرائے اردو کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ مگر اس کے ارتقا پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ولی سے لیکر میر و سودا اور درد کے زمانے تک اس میں جو ترقی ہوئی وہ انہیں متغزلین پر ختم ہو گئی۔ موضوعات کی رنگا رنگی اور اسالیب کی سادگی و پرکاری کے اعتبار سے غزل اس دور میں اپنی معراج کمال پر پہنچ گئی تھی۔ اس کے بعد جن شعرا نے ان لوگوں کا اتباع کیا ہے وہ بھی سنبھل گئے ہیں مثلاً انشاء، جرائت، اور مصحفی ہی کو لیجئے جو اس صنف میں اگر کوئی اضافہ نہیں کر سکے تو کم از کم پیروی میر کی بدولت اسکی بنیادی خصوصیات کو قائم رکھنے میں ضرور کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن لکھنوی فضا میں آتش کے استثنیٰ کے ساتھ ناسخ اور ان کے متبعین کے ہاتھوں غزل کے گہرے جذبات، و بلند تصورات اور والہانہ احساسات کا خاتمہ ہو گیا۔ حسن کی مصوری لوازمات حسن کے بیان میں محدود ہو کر رہ گئی، نسائیت کا اضافہ ہوا۔ تشبیہ و استعارہ اور رعایت لفظی و محاورہ مقصود بالذات بن گئے۔ سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کی وبا ایسی پھیلی کہ سہ غزلے اور چوغزلے لکھے جانے لگے۔ اُستاد ناسخ نے اس میں شک نہیں کہ اصلاح زبان کا علم بلند کیا لیکن ان کا یہ اجتہاد بھی زبان کے حق میں مفید کم اور مضر زیادہ ثابت ہوا۔ چونکہ آن کے اثر سے جس زبان کو فروغ حاصل ہوا وہ زندہ، احساس سے لبریز اور تازہ بول چال کی ہونے کی بجائے پر تکلف، مصنوعی اور مہذب زیادہ تھی۔ لکھنوی رنگ کی یہ مرصع کاری ایسی مقبول ہوئی کہ دلی کے ہم عصر شعرا بھی اس سے اثر پزیر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ مومن اور غالب کا ابتدائی کلام اس مشکل پسندی، رنگینی اور صناعی کے ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

مختصر یہ کہ اُردو غزل اپنی سادہ و فطری ڈگری سے ہٹ کر اس دور میں بری طرح لفظی صناعی اور خارجیت کا شکار ہوئی۔ عین ممکن تھا کہ اس کی رہی سہی مقبولیت بھی ختم ہو جاتی مگر خدا بھلا کرے ذوق، غالب مومن اور داغ جیسے شاعروں کا جنہوں

نے اپنی سادگی و سلاست ' رفعت تخیل و بلاغت و شوخی اور تیکھے پن سے اس کے جسد بے جان میں ایک نئی روح پھونکدی ۔ اس طرح قدیم غزلگوئی کا زمانہ ختم ہونے سے پہلے ایک مرتبہ پھر اردو غزل کو میر و میرزا کے زمانہ کا سا قبول عام نصیب ہو گیا ۔

قصیدہ اپنی بنیادی خصوصیات کے ساتھ اردو میں رائج ہی نہیں ہوا البتہ فارسی قصائد کی جو روش پہلے سے چلی آتی تھی اس کی پیروی میں سودا کے قصائد قابل قدر ہیں ۔ ان کے قصیدوں میں وہی شان و شکوہ اور دھوم دھام ہے جو فارسی قصائد کا طرۂ امتیاز مانی گئی ہے ۔ لیکن سودا کا مخصوص زور بیان جس سے بقول کلیم ''سامعہ مرعوب اور دماغ متحیر رہ جاتا ہے'' محض قصیدہ ہی میں اپنی جولانیاں دکھانے پر مکتفی نہ ہوا بلکہ اس نے ہجو کا میدان بھی تلاش کیا ۔ یہ ضرور ہے کہ ہجونگاری میں سودا نے اعتدال سے کام کم لیا ہے اور انکی بیشتر ہجویات میں ذاتیات کا عنصر غالب ہونے کے ما سوا فحش کلامی سے بھی دریغ نہیں کیا گیا تاہم انکی وہ ہجویں جن کا موضوع ان کا عہد ہے یا جن میں انھوں نے کسی خاص شخصیت کے بجائے تخلیقی کردار پیش کئے ہیں اردو طنز و ظرافت کے لا زوال شہ پارے ہیں ۔ سودا کے بعد اس انداز کی ہجونگاری تو خیر کوئی کرھی نہ سکا۔ رہا قصیدہ سو وہ بھی تقریباً ایک صدی کے بعد بمشکل ذوق کو بروئے کار لایا اور بس ۔

مثنوی دکنی دور شاعری ہی سے خاصی مقبول صنف رہی ہے اور اکثر دکنی شعرا نے اس صنف میں مذہبی' اخلاقی اور عشقیہ قصے نظم کر کے اسے ایک مخصوص شکل و ہئیت بھی عطا کی ۔ شمالی ہند میں میر و سودا نے بھی مثنویاں لکھیں ہیں مگر ان میں نہ تو افسانوی رنگ ہے نہ منظر نگاری اور کردار نگاری کے وہ نمونے ' جنھیں مثنوی کی جان کہنا چاھیئے ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میر کی مثنویاں نتیجہ خیز اور عام مثنویوں کے مقابلہ میں یقیناً مہذب ہیں ۔ میر و سودا کے بعد خواجہ میر اثر کی مثنوی ''خواب خیال'' یقیناً قابل ذکر مثنویوں میں سے ہے لیکن اس صنف سخن کو چار چاند لگانے والے دراصل میر حسن ہیں ۔ جنکی مثنوی ''سحرالبیان'' قصہ کی دلچسپی' اور طرز بیان کی خوشنمائی کے اعتبار سے ایک شاہکار ہے ۔ دور متوسط میں دیا شنکر نسیم کی مثنوی ''گلزار نسیم'' اور نواب مرزا شوق کی دو ایک مثنویاں قابل قدر ہیں ۔ مگر ان میں وہ ''سحرالبیان'' کے سے شادی بیاہ کے ہنگامے' باغ و راگ کی دلچسپیاں' زیورات و ملبوسات کی تفصیل' رسم و رواج کا بیان نہیں ملتا ۔ ''گلزار نسیم'' کا سب سے بڑا نقص رعایت لفظی اور تصنع ہے۔ نواب مرزا شوق کی مثنویاں روز مرہ و محاورہ کی خوبی اور معاملات کی بے تکلف تصویر کشی میں منفرد و بے مثل ہیں لیکن ان کی بوالہوسی و کامجوئی جو کبھی کبھی عریانی بن گئی ہے انھیں لے ڈوبی ہے ۔ مختصر لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس دور کی مثنویاں بھی اپنے عہد کی جھوٹی اور بناوٹی زندگی کی غمازی کرتی ہیں ۔ ان میں نہ کہیں بذلہ سنجی ہے نہ حقیقی طنز بلکہ اس کے بر عکس ایک بد مزہ کر دینے والی سستی اور سستا پن ہے اور یہی سبب ہے کہ اس زمانے میں انھیں شہرت و قبول عام تو نصیب ہوا لیکن یہ کوئی اعلیٰ ادبی کارنامہ نہ بن سکیں ۔

غزل ' قصیدہ اور مثنوی جیسی معروف اصناف سخن کے اس تجزیہ سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ متقدمین کے بعد دور متوسط کے شعرا نے ان میں کوئی غیر معمولی

اضافہ نہیں کیا اور بلا شبہ اس کمی کی تھوڑی بہت تلافی بھی نہ ہو پاتی اگر انیس و دبیر جیسے باکمال شعرا ان اصناف سے ہٹ کر مرثیہ میں اپنے لئے ایک نیا میدان نہ تلاش کر لیتے ۔ مرثیے یوں تو شعرائے متقدمین نے بھی کہے تھے مگر ان کے مرثیے محض بین کے لئے تھے ۔ یہ صنف اپنی موجودہ شکل میں درحقیقت اسی دور کی پیداوار ھے اور یہ کہنا بے جا نہ ھوگا کہ مرثیت کے ساتھ ساتھ اس کے مجلسی و تہذیبی رنگ میں انیس و دبیر کے خون جگر کی جھلک صاف نظر آتی ھے ۔ یہ ٹھیک ھے کہ موجودہ مرثیہ کا سانچا میر ضمیر نے تیار کیا تھا مگر انیس نے اس میں جو اضافے کئے ھیں وہ انھیں سے مختص ھیں ۔ انیس کا کمال یہ ھے کہ انھوں نے مرثیہ کے کرداروں کو انسانی جذبات عطا کئے اور اس کے پس منظر میں اپنے گرد و پیش کی معاشرت اور وضع کے نقوش بھر کر صدیوں پہلے کے واقعہ کو لازوال بنا دیا ھے ۔ انیس و دبیر کے ھاتھوں مرثیہ طویل ضرور ھو گیا بلکہ آتش کے الفاظ میں ''لندھور بن سعدان کی داستان بن گیا'' لیکن اس طویل نظم نے ایک طرف تو رزمیہ شاعری کی کمی کو پورا کیا دوسری طرف منظر نگاری ' واقعہ نگاری اور جذبات نگاری کے کئی قابل قدر پہلوؤں کا ھماری شاعری میں اضافہ کیا ۔ یہاں یہ امر قابل غور ھے کہ انیس ودبیر نے اپنے عہد کے دوسرے شعرا کی طرح مروجہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کیوں نہ کی اور ان کی نظروں نے اس مخصوص صنف کو کیوں منتخب کیا ؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ھے کہ اودھ کا مذھبی رنگ اور خود شعرا کا شہدائے کربلا کے مصائب پر اظہار غم کر کے ثواب حاصل کرنے کا جذبہ اس انتخاب میں معین و مددگار ثابت ھوا ھوگا ۔ اس میں کلام نہیں کہ یہ دونوں باتیں بھی صحیح ھیں لیکن حقیقت یہ ھے کہ مروجہ اصناف سخن اس درجہ مردہ و بے جان ھو چکی تھیں کہ ان سے بیزاری لازمی و لابدی تھی ۔ اور اس بنا پر ھم شاید مرثیہ ھی کو جدید اردو شاعری کا ابتدائی کارنامہ سمجھ لیتے مگر اول تو مرثیہ کی شاعری سے دوسرے شعرا کے دلوں میں کسی نئے نصب‌العین کے حصول کے لئے کوئی تحریک پیدا نہیں ھوتی دوسرے یہ کہ انیس و دبیر اس طرز کے مرثیوں کے موجد بھی ھیں اور بعض حیثیتوں سے خاتم بھی ۔ اس لئے کہ ان کے بعد اس قابلیت کے مرثیہ نگار اردو میں پیدا ھی نہیں ھوئے ۔

یہ ھے جدید شاعری سے پہلے کی شاعری کا مجمل سا خاکہ—جس سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ھے کہ اس طویل عرصہ میں مرثیہ کے علاوہ اور کسی شعری کاوش کو حقیقی فروغ نصیب نہیں ھوا اور شعری احساس بڑی تیزی سے تنزل کے منازل طے کرتا ھوا اس مرحلے پر پہنچ گیا جہاں حالی کو مجبوراً کہنا پڑا کہ ۔

وہ شعر اور قصائد کے ناپاک دفتر عفونت میں سنڈاس سے جو ھیں بدتر

شاعری کے اس دور میں عفونت کی وجہ یہی تھی کہ لکھنوی دبستان شاعری میں جذبے کو فن پر قربان کر دیا گیا اور فن پر توجہ بھی وسعت' عمومیت' توانائی' زور' جوش اور جذبہ پیدا کرنے کے لئے نہیں بلکہ نرمی ' نفاست ' نزاکت ' لوچ اور مناسبت پیدا کرنے کے لئے ھے جو ظاھر ھے بڑی خطرناک چیز ھے ۔ لکھنو والوں نے دھلی کی روایات کو ٹھکرا کر دراصل خود اپنا ھی نقصان کیا ورنہ شاید یہ تکلف ' امیرانہ شان

اور نسائیت اُن کے شعر و ادب میں اس حد تک دخیل نہ ہو پاتی - اس دور نے زبان و ادب کی خدمت تو کی مگر اسے رفیع الشان بنانے کی بجائے چھوٹی چھوٹی چیزوں کا گرویدہ بنا دیا - ان حالات میں اس زمانہ میں اُردو شاعری کی پستی اور اچھے شعراء کا فقدان کوئی عجیب چیز نہیں -

اسے اُردو شاعری کی خوش قسمتی پر محمول کرنا چاہئے کہ قدیم شائستگی کے اس آخری دور میں جب کہ حالات بہت ہی ناساعد تھے نظیر' غالب ' داغ اور انیس و دبیر جیسے فنکار اُردو شاعری کے اُفق پر اُبھرے لیکن جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے ان کا شمار مستثنیات میں کرنا پڑے گا - چونکہ شاعری کا عام مذاق اس درجہ فاسد ہو چکا تھا کہ اب صحت مند ادب اُس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتا تھا جب تک ہمارے مریض معاشرہ کی اصلاح نہ ہوتی - اس اصلاح کا موقع ۱۸۵۷ء کے غدر نے دیا اور مغربی تعلیم و تمدن ہمارے لئے ایک نیا نصب العین لے کر آیا -

یہ انقلاب قدیم رنگ شاعری کے حق میں سم قاتل ثابت ہوا - دھلی کی برائے نام شہنشاہیت ختم ہوئی اور انتزاع مملکت اودھ سے بھی شعراء کے سر پرست اُٹھ گئے اور اب وہ ایسے اُمراء کے دست نگر ہوگئے جن کو اگر شوق تھا تو سر پرستی کے لئے بافراط پیسہ نہ تھا - پیسہ تھا تو اس رستخیز بے جا نے خواب غفلت سے اُن کی آنکھیں ایسی کھول دی تھیں کہ وہ اپنی دولت کے اس بے جا مصرف کی بجائے اب اسے دوسرے مفید کاموں میں لگانا چاہتے تھے - یہ ضرور ہے کہ ہمارے کچھ شاعر تلاش معاش میں حیدر آباد' رام پور وغیرہ جیسی ریاستوں میں چلے گئے لیکن وہاں بھی اُن کے پیر زیادہ عرصہ تک نہ جم سکے - ساتھ ہی انگریزی تعلیم جو رفتہ رفتہ ہندوستان کے طول و عرض میں بڑھتی اور پھیلتی جا رہی تھی ہمارے شعر و ادب پر اثر انداز ہونا شروع ہوئی اور انگریزی شاعری کے جو نمونے ترجموں کی شکل میں ہمارے سامنے آئے انہیں دیکھ کر ہمارے مصلحین کو نہ صرف شاعری کے نئے امکانات کا پتہ چلا بلکہ انہیں یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ اس طرز پر اُردو شاعری کو ترقی دی جا سکتی ہے -

ان مصلحین میں آزاد کا نام سر فہرست ہے - مولانا آزاد نے اگست ۱۸۶۷ء اور ایک دوسری روایت کے مطابق مئی ۱۸۷۴ء میں اردو زبان کو نظم کا ایک نیا تصور بخشا لیکن آزاد کا مطمح نظر خالص ادبی تھا اور ان کے پیش نظر دو بنیادی اصول تھے - ایک موضوع کا تسلسل دوسرے حسن و عشق کے محدود کوچے سے نکل کر فطرت اور دوسرے موضوعات تک رسائی - جس کے نمونے ان کی بعض مثنویوں میں نظر آتے ہیں - مروجہ اصناف سخن میں سے آزاد نے مثنوی کو اس لئے منتخب کیا کہ اس وقت تک مسلسل موضوعات کے لئے یہی صنف استعمال ہوتی چلی آئی تھی - آزاد کی اس اصلاحی تحریک میں حالی نے اُن کا ھاتھ بٹایا اور اس نئی شاعری میں اپنی طبیعت کے جوہر دکھائے - پھر کچھ عرصہ بعد جب حالی پنجاب سے اینگلو عربک کالج دھلی میں پہنچے تو اُنہوں نے سر سید تحریک کے زیر اثر اس ادبی تحریک کو قومی ترقی کے لئے بھی استعمال کرنا چاہا اور اس طرح ''مسدس مد و جزر اسلام'' ظہور میں آئی - ازاں بعد حالی نے اس تحریک کے انضباط و اشاعت کے سلسلے میں اپنی منظومات کے علاوہ ''مقدمہ شعر و شاعری'' لکھا جو اُن کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ ہے -

غرض ان دونوں بزرگوں کی کوششیں بار آور ہوئیں اور ایک نئے طرز کی شاعری نے جنم لیا - یہ شاعری اپنے نصب العین کے اعتبار سے ہماری قدیم شاعری سے بڑی حد تک مختلف تھی اس کے ابتدائی دور میں گو اصناف سخن میں ہمیں کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آتا مگر موضوعات اور اسالیب میں شروع ہی سے ایک نمایاں تغیر پیدا ہوا - موضوعات کی وسعت کا سب سے زیادہ اثر غزل پر ہوا - غزل کی تنگنائی کا شکوہ غالب کے وقت سے چلا آتا تھا حالانکہ انہوں نے اس کی تنگ دامانی کے باوصف اسے ایک عظیم الشان وسعت بخشی تھی لیکن لکھنو اسکول کے زیر اثر یہ سچ مچ بڑی محدود اور پامال سی ہو گئی تھی جس کا رد عمل عصر جدید میں یہ ہوا کہ ایک زمانہ تک نہ صرف اسے منہ نہیں لگایا گیا بلکہ اس کے مفروضات یعنی مناسبت لفظی محاورہ بندی اور رسمی تشبیہات و استعارات بھی ترک کر دئیے گئے - مثنوی و مسدس کا عروج ہوا تو اُن میں حقائق و واقعات کا بیان سیدھے سادے انداز میں کیا جانے لگا - دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جدید شعراء نے لفظ اور معنی دونوں کو مساوی اہمیت دینا شروع کی -

جدید شاعری کی دوسری نمایاں خصوصیت اُس کا قومی اور وطنی جذبہ ہے - قدیم اُردو شاعری میں یہ تصور بالکل ناپید تھا - چونکہ یہ چیز براہ راست مغربی اثرات کے تحت ہم تک پہنچی اور اس دور میں پہلی مرتبہ اُردو شعراء نے عرب و عجم کی باتیں چھوڑ کر ہندوستانی فضا میں سانس لینا شروع کی اور ملکی چیزوں کو اپنانے کی کوشش کی - یہی جذبہ رفتہ رفتہ آزادی کے راگوں کی طرف لے گیا اور شعراء نے غلامی کی لعنت کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی بے جا بندشوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی - گردش ایام کے ساتھ یہ احساس اور بھی شدید ہوتا گیا اور اب اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان کی آزادی میں جدید شعراء کا بڑا ہاتھ رہا ہے - آج بھی ہمارے شاعر ظلم و ستم کے خلاف جو آوازیں بلند کرتے اور انسان دوستی کی دعوت دے رہے ہیں وہ قدیم اُردو شاعری میں سرے سے مفقود رہی ہے -

مناظر فطرت کا والہانہ بیان اور اُن سے عقیدت ، جدید اُردو شاعری کا ایک اور وصف خاص ہے - منظر نگاری کے نمونے قدیم اُردو شاعری میں بھی ملتے ہیں لیکن ایک تو اُن کی تعداد بہت کم ہے دوسرے انہیں اصل موضوع کبھی نہیں بنایا گیا - صرف ایک نظیر ایسے شاعر ہیں جنہوں نے فطرت کی عکاسی منفرد انداز میں کی ہے تاہم اس رنگ میں جدید اُردو شعراء کے سیل بے کراں کے مقابلہ میں ان کی حیثیت بھی جوئے کم آب سے زیادہ نہیں - جدید اردو شاعری کے اولین معمار یعنی آزاد نے سب سے پہلے اس موضوع کی طرف توجہ کی پھر ان کے بعد جس خلوص اور جوش کے ساتھ ان کے متبعین نے اسے اپنایا وہ آپ اپنی مثال ہے -

اخلاقی مضامین اور تاریخی واقعات کا بیان بھی جدید شاعری کی ایک امتیازی خوبی ہے - پند و نصائح کی باتیں پچھلے شعراء نے کی ضرور ہیں لیکن سچ پوچھئے تو اخلاقی موضوعات کو جو اہمیت جدید اردو شعرا کے زمانے میں حاصل ہوئی وہ اس سے پہلے بہت کم نظر آتی ہے- پھر جس کثرت کے ساتھ ان موضوعات پر اب قلم اٹھایا گیا ہے وہ بھی اس دور سے مختص ہے - یہی حال تاریخی نظموں کا ہے - دکنی دور شاعری میں اس قسم کی نظمیں کم نہیں تھیں مگر شمالی ہند میں اس موضوع کو تقریباً اپنایا ہی نہیں گیا - جدید دور

میں یہ احساس پھر بیدار ہوا اور شعراء نے تاریخی موضوعات اور ہنگامی سیاسی واقعات پر نظمیں لکھنا شروع کیں ۔ اس میں شک نہیں کہ جدید شعراء نے بھی اس موضوع پر حسب دلخواہ نہیں لکھا تاہم یہی کیا کم ہے کہ اس طرف توجہ ہونے لگی ہے ۔

طرز جدید کی رجائیت اسے قدیم شاعری کی قنوطی لے سے ایک بڑی حد تک ممیز و ممتاز کرتی ہے ۔ انقلاب سے پہلے کی شاعری کم و بیش غم و الم کی ایک مسلسل داستان ہے ۔ بلا شبہ اس میں حالات کو بڑا دخل ہے ۔ عالمگیر کی وفات کے بعد سے غدر تک کا زمانہ ھی کچھ ایسا پر آشوب تھا کہ اس میں شاعر حرماں نصیبی اور غم و الم کی باتیں نہ کرتے تو اور کیا کرتے ۔ مگر اس کا کیا علاج کہ اس انداز کی شاعری آئندہ نسل کے جذبات اور اس کی قوت عمل پر بہت مضر اثرات چھوڑتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جدید شاعری کے علم برداروں نے اس حزنیہ رنگ سے قصداً اجتناب کیا اور مردہ قوم کی رگوں میں زندگی کی نئی لہر دوڑانے کے لئے ایک خوشگوار رجائی لے میں اپنے نغمے چھیڑے ۔

ان معنوی خوبیوں کے علاوہ جدید شاعری میں ھئیت کے بھی تجربے ہوئے ۔ گو یہ صحیح ہے کہ جدید شاعری کے ابتدائی دور میں اصناف سخن میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی لیکن اس کے بعد جوں جوں اردو شاعری انگریزی شاعری سے زیادہ متاثر ہوتی گئی ہمارے یہاں نظم معرا اور سانیٹ وغیرہ کی طرف توجہ ہونے لگی ۔ یہ اور بات ہے کہ ہندوستانی فضا میں یہ چیزیں بہت زیادہ مقبول نہیں ہوئیں ۔ بہ ایں ہمہ بیرونی مذاق کی اصناف سخن پر طبع آزمائی کرنا اور بعض صورتوں میں نہایت خوش اسلوبی سے نباھنا کچھ کم قابل تعریف بات نہیں ۔ اس کے علاوہ بعض نئی بحریں بھی ایجاد ہوئیں جن میں ہندی بحروں کو خاص مقبولیت حاصل ہوئی ۔

الغرض انیسویں صدی کے ربعہ آخر سے جدید اردو شاعری منظر عام پر آئی اور اپنی گوناگوں خصوصیات کے باعث قدامت پسندوں کی شدید نکتہ چینی کے باوجود فروغ حاصل کرتی گئی ۔ اس کے معرف اور برتنے والے پیدا ہوتے گئے حتیٰ کہ نئی نسل نے جو قدیم رنگ سے تقریباً نا آشنا تھی ، اس طرز کو بڑے ذوق کے ساتھ اور بہت جلد قبول کیا ۔ یہاں یہ بات ضرور ذہن میں رہنی چاہئے کہ جدید شاعری کے آغاز اور اس کی ترویج سے یہ مراد نہیں کہ قدیم رنگ بالکل ھی مفقود ہو گیا بلکہ نئے طرز کے ساتھ پرانا طرز بھی قائم رہا ۔ رفتہ رفتہ ایک زمانہ ایسا آیا جب ہمارے شعراء نے جدید رنگ میں قدیم شاعری کی قابل قدر روایات کو سمو کر اسے اور بھی چار چاند لگائے ۔

زیر نظر کتاب " جدید شعرائے اردو " میں انہیں شعراء سے بحث کی گئی ہے جن کی مجموعی اور بعض صورتوں میں مخصوص رنگ شاعری کا دور انیسویں صدی کے ربع آخر سے شروع ہوتا ہے ۔ ان میں اکثریت ایسے شعراء کی ہے جو کسی نہ کسی طرح جدید تحریکات سے متاثر ہوئے لیکن جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے ادبی بساط کا الٹنا حکومتوں کے انقلابات سے مختلف چیز ہے اس لئے ہمیشہ نئی تحریکات کے ساتھ قدیم رنگ بھی کچھ عرصہ باقی رہتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ عہد جدید میں ہمیں بعض یادگار زمانہ ایسے بھی نظر آتے ہیں جو قدیم رنگ کے والہ و شیدا رہے ۔ عہد جدید چونکہ خاصا

طویل عہد ہے اس لئے اسے چار ایسے ادوار میں تقسیم کر دیا گیا ہے جو جدید شعری رجحانات کی قدر مشترک کے باوجود چند منفرد خصوصیات کے حامل ہیں۔

ان میں پہلا دور متقدمین کا ہے جو آزاد، حالی، شبلی اور اسماعیل پر مشتمل ہے۔ اسے در حقیقت عصراصلاح کہنا چاہئے اس لئے کہ یہی وہ دور ہے جس میں جدید شاعری کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس جدید تصور کو ادبی دنیا کے سامنے سب سے پہلے آزاد نے پیش کیا لیکن اُن کی مساعی کو مشکور بنانے میں اُن کے معاصر حالی، شبلی اور اسماعیل نے بھی سرگرم حصہ لیا۔ حالی تو خیر ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اولین موقعہ پر آزاد کی ہمنوائی کی مگر شبلی اور اسماعیل بھی جدید احساس کو مقبول بنانے میں حالی و آزاد سے کسی طرح پیچھے نہیں رہے۔ خاص کر شبلی کی تاریخی منظومات اور اسماعیل کے انگریزی نظموں کے ترجمے اور بچوں کی نظمیں تو ایسے اصلاحی کارنامے ہیں جنھیں کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ غرض ان مجددین کی مشترکہ کوششوں نے ہماری شاعری کو اصلاحی و اخلاقی بنایا اور اس میں عظمت و زندگی پیدا کر کے اسے زمانے کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔

تاہم ان مصلحین کا زیادہ وقت شاعرانہ تصورات کی اصلاح اور اسکی اشاعت میں صرف ہوا تھا۔ ساتھ ہی چونکہ اُنھوں نے ایک نئے انداز کی شاعری شروع کی تھی اسلئے فطری طور پر اُنکے کلام کا معیار بحیثیت مجموعی زیادہ بلند نہ ہو سکا۔ نہ وہ فن کی کوئی ایسی صورت پیش کر سکے جو قدیم انداز سے بنیادی طور پر مختلف ہوتی۔ لیکن ان کے بعد دور متوسط کے شعرا نے اپنے پیشروؤں کی بنیادوں پر سر بہ فلک عمارت تعمیر کی اور اپنی اپنی پسند کے مطابق مختلف میدان منتخب کر کے اُن میں خصوصی رنگ پیدا کیا۔ اس دور کے شعرا میں، اکبر، نظم طباطبائی، شوق قدوائی، بےنظیر شاہ، سلیم، سرور، چکبست، نادر کاکوروی، نظر، محروم، مہر، ہمایوں، ناظر، نیرنگ وغیرہ کے نام نظم گویوں میں ممتاز ہیں۔ ان کے یہاں ایک نیا ذہن، ایک نیا احساس اور ایک نیا جذبہ ملتا ہے لیکن اس خوبی کے ساتھ کہ اعتدال کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں پاتا، اور اکبر تو قدامت پرست ہیں۔ جو زندگی کے بڑھتے ہوئے دھارے کو پیچھے کی طرف لےجانے کی ناکام کوشش میں مصروف رہے۔ مگر اس کے باوجود اُنھوں نے مغرب کی کورانہ تقلید کا مقابلہ جس دلیری سے کیا وہ قابل داد ہے۔ اُنکے ظریفانہ نشتر بڑے جاندار، لطیف اور دلوں میں چبھ جانے والے ہیں اور اُن کا فن ایک انفرادی شان کا مالک ہے۔ اکبر کا مشن پورا کرنے میں اقبال اور ظفرعلی خاں نے بہت کام کیا۔ مولانا ظفر علی خاں ہنگامی سیاست میں زیادہ اُلجھے رہے مگر اقبال نے مغرب سے بہت کچھ لے کر بھی اکبر کی ہمنوائی کی۔ اکبر کے علاوہ اس دور کے دوسرے نظم نگاروں کے یہاں مظاہر فطرت کی عکاسی، وطن سے والہانہ محبت، مقامی رنگ اور گھریلو زندگی کے حسن کی تصویر کشی عام ہے اور ان لوگوں نے ایک نئی ہندوستانیت کی مصوری جس پر خلوص اور حسین طریقے سے کی ہے وہ اُردو شاعری کی تاریخ میں یادگار رہیگی۔ نئی ہندوستانیت کی مصوری محض اس بنا پر ایک تاریخی یادگار نہیں کہ نئے نظم نگاروں نے حالی و آزاد کی روایت کو آگے بڑھایا ہے بلکہ اسلئے کہ اس مصوری میں اُنکی اپنی شخصیت اور ماحول کی بڑی واضح ترجمانی شامل ہے۔ مثال کے طور پر حالی و آزاد نے حب الوطنی کی جو روایت قائم کی اُسکو اپنانے میں

سرور ، چکبست ، نظر ، محروم ، کیفی ، سہر اور شاکر نے یہ تخصیص برتی کہ آسے ہندو دیو مالا کے رنگ میں رنگ کر ہندوؤں کے مذہبی و تاریخی مشاہیر اور ہندوؤں کے مقدس مقامات و واقعات کا تذکرہ بڑے دلکش و منفرد انداز میں کیا ہے ۔ ساتھ ہی ان شاعروں نے سیاسی موضوعات پر اپنے پیشروؤں اور ہمعصروں کے مقابلہ میں نسبتاً زیادہ نظمیں لکھی ہیں ۔ جسکی وجہ غالباً یہ ہے کہ آن کا ماحول مسلمانوں کے مقابلہ میں واضح طور پر زیادہ سیاسی تھا ۔ اسی طرح شوق و بینظیر شاہ نے مظاہر فطرت کے صرف آن پہلوؤں کو منتخب کیا ہے جنکی جزیات و تفصیل میں ایک شاعرانہ دلکشی پائی جاتی ہے ۔ نظم طباطبائی اور نادر نے اس رنگ میں انگریزی نظموں کے کامیاب ترجمے پیش کر کے اپنی انفرادیت قائم کی ہے ۔ ہمایوں ، ناظر ، نیرنگ اور اقبال نے ان روایات میں اپنی پسند ، مشاہدہ اور ماحول کا رنگ بھر کر ایک الگ راہ نکالی ہے ۔ اس سلسلے میں ''ناظر اور جوگ'' ہی کو لیجئے جو تنہا صورت میں اپنے شاعر کا نام صرف اسلئے زندہ رکھے گی کہ اس میں ناظر نے اپنی پسند کا موضوع منتخب کر کے ذاتی مشاہدہ اور گرد و پیش کے ماحول سے زیادہ سے زیادہ فائدہ آٹھایا ہے ۔ اقبال کے فکر و اظہار کے امتزاج نے حالی و آزاد کی روایات میں اور بھی جان ڈال دی ہے ۔ اقبال کی مناظر فطرت والی نظمیں پڑھکر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر آن میں ہر وقت ایک تازگی اور ایک نئی زندگی پاتا ہے ۔ وہ قدرت کے ہر مظہر کو ایک خارجی یا ساکت و خاموش چیز تصور کرنے کے بجائے نظام کائنات کا ایک جزو اور خدا کا رازداں سمجھتا ہے ۔ مناظر فطرت کی انہیں خصوصیات سے متاثر ہو کر اقبال اس کائنات کی حقیقت کی تلاش اور انسانی دکھوں کا مداوا ڈھونڈنے میں پریشان ہوتے ہیں تو ان سے استفہام کرنا شروع کرتے ہیں ۔ اس جستجو میں اقبال کو کہیں کہیں روشنی کی جھلک تو ضرور نظر آ جاتی ہے لیکن ابھی وہ اس روشنی کے راز شناس نہیں ہیں اسلئے آنکی پوری رہنمائی نہیں ہو پاتی ۔ اقبال کی شاعری کے پہلے دور میں مناظر فطرت کے علاوہ ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جو وطن کی محبت سے لبریز ہیں ۔ اقبال کو اپنے ہموطنوں کی خانہ جنگی سے بڑی کوفت تھی اور وہ چاہتے تھے کہ یہ لوگ مل جل کر رہیں تاکہ آپس کی محبت و یگانگت سے آنکے دوسرے آلام و مصائب بھی کم ہوں ۔ اقبال ان موضوعات پر لکھ ہی رہے تھے کہ وہ اعلیٰ تعلیم کیلئے یورپ گئے ۔ انگلستان کے دوران قیام میں مغربی تہذیب و تمدن ، مغربی سیاست اور مغربی علوم کے بالاستیعاب مطالعہ نے اقبال کی آنکھیں کھول دیں اور وطنیت کے مغربی تصور نے آن کے تصور وطن میں انقلاب برپا کر دیا ۔ آنہوں نے اب انسانی آخوت و محبت اور اسلام کی عالمگیر وطنیت کو اپنے فکر کی بنیاد بنایا ۔ اس مرحلہ پر اقبال نے عشق کو اپنا مذہب اور صدر اسلام کے اصول کو اپنے عمل کا میدان بنایا ۔ یہ چیزیں بالآخر آنہیں ''مرد مومن'' اور ''خودی'' کے مہتمم بالشان فلسفہ کی طرف لے گئیں ۔ اسکے یہ معنی نہیں کہ اقبال کے دل سے وطن اور وطن والوں کی محبت ختم ہو گئی ۔ وہ اپنی عمر کے آخری ایام میں بھی یہ کسک برابر محسوس کرتے رہے ۔ فرق صرف یہ ہو گیا کہ بنی نوع انسان کی یکجہتی اور امن عالم کی بنیاد کا تصور بدل گیا ۔ اقبال کی شاعری کا آخری دور جدید آردو شاعری میں ایک نئی منزل کا نشان راہ اور عہد آفریں دور ہے اور یہی وہ زمانہ ہے جب آنکی شاعری اپنے فلسفیانہ رموز و نکات کے ساتھ اس مرتبہ پر پہنچی جہاں آسے جزو پیغمبری کہا جا سکتا ہے ۔

اس دور میں ایک اور نام بڑے واضع طور پر سامنے آتا ہے یعنی عظمت اللہ خاں ۔ ۔ ۔ جنھوں نے شعوری طور پر بعض اُن بنیادی چیزوں کی طرف توجہ دلائی جو براہ راست جدید شاعری کے تعین انداز کی ذمہ وار قرار دی جا سکتی ہے ۔ مثال کے طور پر نئے عروض کی ضرورت ' انگریزی اصناف سخن کی ترویج' زبان میں ھندی عنصر کی آمیزش' ترنم اور موسیقی کا نیا تصور وغیرہ اس طرح عظمت اللہ خاں کی نظمیں نہ صرف ایک اجتہادی رنگ کی حامل ھیں بلکہ اُن میں ترنم' موسیقی' لطافت جذبات اور دلفریبئی ادا سبھی کچھ موجود ہے ۔ اور اُن میں سے بعض ہماری شاعری میں گراں قدر اضافہ کہلانے کی مستحق ھیں ۔

حالی اور اُن کے رفقا' کے اثر سے نظم کی دنیا میں تو یہ لالہ کاریاں ھو چلیں مگر غزل پر داغ اور امیر ھی چھائے رہے ۔ اور بیخود ' سائل ' احسن ' دل ' ریاض ' جلیل آخر دم تک اسی رنگ میں رنگے رہے ۔ ان متغزلین کے علاوہ نوح اور وحشت جیسے اساتذہ اس زمانہ میں بھی داغ کی یاد تازہ کرتے رھتے ھیں' لیکن اس روایت پرستی کے باوصف دور متوسط سے اُردو غزل میں ایک خاموش انقلاب آنا شروع ھوا اور حالی کی تحریک کا رد عمل یہ ھوا کہ بعض متغزلین ناسخ کی بجائے میر و غالب کی پیروی کرنے لگے ۔ ان لوگوں میں عزیز' ثاقب' صفی' آرزو' شاد' حسرت' فانی' اثر' وغیرہ کے نام نمایاں ھیں ۔ عزیز' ثاقب' اور صفی تو ایک حد تک میر و غالب کے اتباع ھی میں مصروف رہے اور اُن کی غزلوں پر قدیم رنگ چھایا ھوا ہے مگر جہاں تک لکھنؤ کا تعلق ہے یہ لوگ انقلابی کہے جا سکتے ھیں ۔ عزیز' ثاقب اور صفی کے علاوہ اس دور کے دوسرے غزلگو شعرا حسرت' فانی ' اصغر ' اور اثر نے بھی میر و غالب کی پیروی کی ہے مگر اس طرح کہ اُن کے کلام میں اُن کی اپنی شخصیت' مزاج اور ماحول کا رنگ غالب ہے ۔ حسرت نے مصحفی کے توسط سے میر کو پہچانا ہے اور اپنایا بھی ہے مگر اس طرح نہیں کہ میر کی آواز اور حسرت کی آواز میں کوئی فرق ھی نہ ھو ۔ حسرت نے غزل کی روایتی فضا میں نئے موضوعات کو بڑی چابکدستی سے برتا ہے ۔ اُن کی غزلوں کا میدان عشق مجازی اور اُس کی مختلف کیفیات کی ترجمانی ہے ۔ لیکن اس ترجمانی میں بیسویں صدی کا سماجی پس نظر' تہذیبی ماحول اور ایک مخصوص معاشرت کے لوگوں کی ذھنی اور جذباتی کیفیت کا شعور اپنا اثر دکھاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزلیں حقیقت و واقعیت سے قریب ھیں ۔ فانی بھی غالب اور میر کے پرستار ھیں ۔ اُنھوں نے میر کے سوز و گداز اور غالب کے تفکر کو اپنایا ہے مگر اس میں تقلید کی بجائے چونکہ اُن کے اپنے مزاج اور اُفتاد کو دخل ہے اس لئے فانی کے رنگ میں گہرائی ' گیرائی اور عظمت بھی ہے اور انفرادیت بھی ۔ اصغر کی غزل کا موضوع عشق حقیقی ہے اور وہ خواجہ میر درد کی روایت کو آگے بڑھانے والے ھیں مگر اس طرح کہ درد کے صوفیانہ خیالات کے اظہار اور اصغر کے روحانی و وجدانی خیالات کی ترجمانی میں بڑا فرق پیدا ھو گیا ہے ۔ اصغر کے یہاں موضوع کی یکسانیت کے باوجود اُن کے تخیل کی بلند پروازی نے اُن کے سارے کلام کو ایک نئی معنویت ' ایک نئے انداز اور ایک نئے آھنگ سے آشنا کیا ہے ۔ اسی طرح اثر لکھنوی بھی میر سے متاثر ھیں ۔ مگر میر سے اُنھوں نے صرف سادگی و صفائی لی ہے ۔ حسن و عشق کے موضوعات کو پیش کرنے میں اُنھوں نے جس سماجی' تہذیبی اور انسانی شعور کا اظہار کیا ہے اُس نے اُن کی غزلوں میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی ہے اس پر مستزاد یہ کہ لکھنو کی شستہ زبان بھی اُن کے حصے میں آئی ہے جس نے اثر صاحب کی غزلوں کو اور بھی دلکش بنا دیا ہے ۔

آرزو بھی اثر کی طرح لکھنو سے تعلق رکھتے ھیں ۔ لیکن اُن کے یہاں بھی لکھنوی انداز نہیں ھے ۔ آرزو نے غزل کے مزاج میں ھندی آھنگ کی آمیزش سے ایک نئی کیفیت پیدا کی ھے ۔ یاس یگانہ نے غالب کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے خواہ مخواہ اپنے مخالفین پیدا کر لئے ورنہ اُن کے مفکرانہ انداز میں بڑی جان ھے اور اُن کی غزلیں وسعت و گہرائی کے علاوہ ایک عجیب و غریب بلند آھنگی کی حامل ھیں ۔ اقبال دور متوسط کے شعرا میں نظم اور غزل دونوں میں یکساں اھمیت کے مالک ھیں ۔ اپنی غزل سرائی کے ابتدائی زمانہ میں وہ بھی اُستاد داغ کے نقش قدم پر چلے ھیں لیکن اس رنگ سے وہ جلد اُکتا گئے اور غالب کے کلام کا اثر قبول کیا ۔ یہ اثر چونکہ اُن کی فلسفیانہ طبیعت سے مناسبت رکھتا تھا اس لئے بہت دیرپا ثابت ھوا اور آخر وقت تک کسی نہ کسی صورت میں جلوہ گر ھوتا رھا ۔ ان اساتذہ فن سے اقبال نے غزل کی روایت کا احترام سیکھا لیکن بانگ درا کے آخری حصہ سے بال جبریل کی غزلوں تک پہنچتے پہنچتے اقبال نے اُردو غزل کے موضوع اور اسلوب دونوں میں حیرت انگیز وسعت پیدا کی ۔ بال جبریل کی مسلسل غزلیں اقبال کے مخصوص فلسفیانہ فکر، بلندیٔ تخیل اور ایمائیت کے ایک وسیع مفہوم اور ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ ایک سنجیدہ اور جرأت آمیز تغزل کے امتزاج کی ایسی مثالیں ھیں جنھوں نے دور جدید میں غزل کی روایت کو ایک ایسا راستہ دکھایا ھے جس سے وہ اس سے پہلے قطعی نا آشنا تھی ۔ اقبال کی غزل، غزل کے اُن بے پایاں وسیع امکانات کی بہترین مظہر ھے جس کا عکس ھمیں دور جدید کے اکثر اچھے شاعروں کے یہاں نظر آتا ھے ۔

اقبال کی شاعری کے عروج اور اُس کے دور شباب کے ساتھ ساتھ جدید شاعری کے ایوان میں ایسے شاعر داخل ھوئے جن میں سے ھر ایک اپنی شخصیت اور شاعرانہ مرتبہ کے اعتبار سے ایک ادارے کی حیثیت رکھتا ھے ۔ ان مختلف شاعروں کے کارناموں پر انفرادی طور سے نظر ڈال کر بھی پڑھنے والوں کو ایک خاص قسم کے جذبۂ تشکر و امتنان کا احساس ھوتا ھے ۔ لیکن انھیں زمانہ کے لحاظ سے اگر ایک ھی گروہ کے ارکان سمجھا جائے تو اس دور کی شاعرانہ حیثیت اور بھی شاندار نظر آنے لگتی ھے ۔ شاعروں کا یہ دور جسے عہد جدید کا دور متاخرین کہا جا سکتا ھے جن بہت سے ناموں کی بدولت معروف ھے اُن میں جگر، جوش، حفیظ، افسر، فراق، اخترشیرانی، ساغر نظامی، تاثیر اور چراغ حسن حسرت جیسے نام شامل ھیں۔ یوں تو ان میں سے ھر شاعر کا مختصر سا تعارف بھی ایک مستقل مضمون کا محتاج ھے لیکن یہ محل اُن کی منفرد خصوصیات سے زیادہ کے ذکر کا نہیں ۔ جگر نے داغ کے رنگ سے الگ ھٹ کر اور ایسی بلند سطح پر جا کر جس میں ارضی و سماوی حسن کا یکساں پرتو ھے اُردو غزل کو جذباتی خلوص اور رنگینیٔ بیان کی روایت دی ھے ۔ فکر، جذبہ، احساس اور اظہار میں یکساں تغزل کی شان اُن کی غزل کی منفرد خصوصیت ھے ۔ جوش کی مناظر فطرت اور انقلاب کی وہ شاعری جس میں سلاسل کی جھنکار اور فطرت کی رنگینی ایک ھی حقیقت کے دو نام معلوم ھوتے ھیں پڑھنے والے پر ایک خود فراموشی طاری کر دیتی ھے ۔ حفیظ کے میٹھے اور رس بھرے گیت جو زندگی میں بکھرے ھوئے، گونا گوں حسن اور اُس حسن پر نثار ھونے والی محبت کے پیامی ھیں نئی شاعری میں ایک ایسی سریلی آواز کی گونج سناتے ھیں جس کی جگہ دل کے سوا اور کہیں نہیں ۔ افسر عہد حاضر میں بچوں کی دنیا کے سب سے زیادہ رازداں اور نکتہ سنج ھیں ۔ فراق نے اُس غزل کو جو بہت سی اصلاحوں کے بعد بھی فارسی کی صدائے بازگشت معلوم ھوتی ھے ھندوستانی زندگی اور اُس کی شاعرانہ روایت

کی سوندھی خوشبو اور مدھر لے سے آشنا کیا ھے ۔ اختر شیرانی نے اپنی نظموں اور غزلوں کے ذریعہ پہلی مرتبہ ھمیں رومان کا وہ شیریں نغمہ سنایا ھے جو محبت کی صحیح کیفیتوں کا ترجمان ھے ۔ ساغر کی شاعری کا انقلابی جوش و خروش وطن پرستی کی روایت کو بام رفعت پر پہنچاتا ھے ۔ چراغ حسن حسرت ھمیں پھر ایک بار میر و مصحفی کی دنیا میں لے جاتے ھیں اور تاثیر شاعری میں ایسے نئے تجربوں کی راھیں کھولتے ھیں جن کی تقلید آنے والی پود کو کرنی ھے ۔ اس دور میں سراج اور آل رضا کی غزلوں میں رنگ قدیم کے ساتھ نئے نئے تجربوں کا ھلکا سا پرتو بھی پڑھنے والے کو متوجہ کئے بغیر نہیں رھتا ۔

ان گوناگوں نغموں کی گونج میں ایک اور سمت سے بھی انقلاب کے ترانوں اور ایک نڈر انداز میں غریبی کی حمایت کرنے والے گیتوں کی آواز آتی ھے ۔ انقلاب کے یہ ترانے جن میں ھر طرف مظلوم و بے کس کی حمایت اور ظلم و جبر کے خلاف صدائے احتجاج ھے ۔ احسان دانش، روش صدیقی اور نہال سیوھاروی نے سنائے ھیں ۔

اور پھر ایک گروہ شاعروں کا ھے جس نے گرد و پیش کی زندگی کے سارے دکھ درد سمیٹ کر انسان کے کرب و اضطراب کی داستان سنائی اور جہاں تک ھو سکا ھے اس کے زخموں کا مرھم اور دکھوں کا مداوا تلاش کرنے کی کوشش کی ھے ۔ اس گروہ میں مظلوم انسان کی بے بسی کا انوکھا انتقام لینے والے راشد ھیں ۔ غم محبت کے ساتھ غم زندگی کی کسک محسوس کرنے والے فیض ھیں ۔ اور ماحول کے غموں میں غرق ھو کر صورت جاناں کو بھول جانے والے شیریں دھن مجاز ھیں اور ٹوٹی پھوٹی کشتی میں بیٹھ کر ساحل کی تمنا کرنے والے جذبی ھیں ۔ اور پھر شاعری میں ترقی پسندی کی روایت کو جنم دینے اور اسے پروان چڑھانے والے علی سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی اور علی سکندر وجد ھیں ان میں سے ھر ایک نے شاعری کے اس مسلک کی پیروی کی ھے جو زندگی کو ظلم، جبر، استبداد اور استحصال کی قیدوں سے رھائی دلانا چاھتا ھے ۔ لیکن مجموعی طور سے ایک ھی پیام کے قاصد ھو کر بھی یہ سب ایک نیا اسلوب قائم کرنے اور نئے تجربوں سے شاعری کے دامن کو وسیع کرنے کے حامی ھیں ۔

نئے تجربوں کی ایک دوسری شکل تصدق حسین خالد کی آزاد شاعری اور میراجی کی ابہام پسندی میں ملتی ھے ۔ اس آزاد اور مبہم شاعری کے ساتھ ساتھ حفیظ ھوشیار پوری سراج الدین ظفر اور عدم کی روایتوں میں رچی ھوئی رنگین غزل اور شور علیگ کی نظمیں ھیں ۔ جو انسان کو تھوڑی دیر کے لئے ایک ایسے جہان میں لے جاتی ھیں جہاں شعر و نغمہ ھی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت معلوم ھوتے ھیں ۔

مختصر یہ کہ جدید شاعری کا یہ دور جسے آسانی کے خیال سے متاخرین کا دور کہا جا سکتا ھے موضوع، خیال فکر، اور اسلوب کے تنوع، رنگینی، وسعت اور رفعت کا دور ھے ۔ اس میں ھمیں قدامت اور جدت اور روایت اور تجربہ کا ایسا امتزاج نظر آتا ھے جیسا اس سے پہلے نظر نہیں آتا ۔

جدید شاعری کا اگلا دور جس میں نئی پود کے لکھنے والے شامل ھیں اس دور کے نغموں کی صدائے باز گشت ھے ۔

جاں نثار اختر کی شاعری میں جوش' اور احسان دانش' کے انقلابی گیتوں کی گونج سنائی دیتی ہے ۔ باقی' سیف اور ناصر کاظمی کی غزلیں غزل کی قدیم روایت کی پیروی اور نئے عہد کے سوز دروں کی آواز کی تخلیق ہیں ۔ ان شاعروں کی غزلوں کو دیکھ کر یہ یقین اور زیادہ مستحکم ہو جاتا ہے کہ غزل اردو میں ہمیشہ قائم رہنے والی صنف ہے ۔ عالی' قیوم نظر اور قتیل نے غزلوں اور گیتوں کو ہم آہنگ کرکے ایک نئی اور دلکش تر جھنکار سنائی ہے ۔ یوسف ظفر کے وہ تجربات جو انہوں نے ہیئت کے سلسلے میں کئے' مختار صدیقی کے وہ اسالیب اظہار جن میں کبھی کبھی فطنت کی جھلک نظر آ جاتی ہے نئی پود کی شاعری کے ایسے کارنامے ہیں جن میں آنے والے ایک اور بہتر زمانے کا سراغ ملتا ہے ۔ اس نئے دور نے جس اعتماد اور جرأت کے ساتھ تنقید حیات کرنے اور ماحول اور شخصیت میں مکمل مطابقت پیدا کرنے کا سبق سکھایا ہے اس کا جلوہ آپ کو آئندہ اوراق میں نظر آئے گا ۔

مشرف انصاری

مولانا محمد حسین آزاد

محمد حسین نام ، آزاد تخلص - ۱۸۳۳ء میں دلی میں پیدا ہوئے - ان کے والد مولوی باقر علی ایک اچھے عالم اور اہل قلم بزرگ تھے اور اپنے علم و فضل کی وجہ سے ہم عصروں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے - یہ وہ زمانہ تھا جب سرزمین دھلی میں ذوق ، مومن اور غالب جیسے یکتائے روزگار شعرا کی بدولت شعر و سخن کی بڑی دھوم دھام تھی اور ان با کمال اساتذہ کے فیض سخن کے دروازے ہر شخص کے لئے کھلے ہوئے تھے - مولوی باقر علی شیخ ابراھیم ذوق کے دلی دوست تھے - اسی تعلق کی بنا پر جب آزاد نے ہوش سنبھالا تو ان کے والد نے انہیں ذوق کے حوالے کر دیا - آزاد نے ان ہی کے سایہ عاطفت میں ابتدائی تعلیم بھی پائی اور نکات عروض و فن سخن میں دستگاہ بھی حاصل کی - ابتدائی تعلیم کے بعد آزاد اعلیٰ تعلم کے لئے دھلی کالج میں داخل ہوئے - جہاں مولوی نذیر احمد ، ذکاء اللہ اور پیارے لال آشوب جیسے ساتھیوں کے ساتھ علوم مروجہ کی تحصیل کی -

آزاد کو شروع سے ہی شعر و شاعری سے دلچسپی تھی - اس پر ذوق ایسے استاد کی تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا - آزاد نے ان کے ہمراہ دھلی کے اکثر معرکہ آرا مشاعروں میں شرکت کی - نتیجہ یہ ہوا کہ آزاد بہت جلد استاد ذوق کے کلام کی پختگی ، خیالات کی رفعت و سنجیدگی اور قدرت زبان سے بہرہ ور ہو گئے - آزاد تقریباً ۲۵ سال کے تھے کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کا فتنہ بپا ہوا - اس ھنگامہ میں مولوی محمد باقر شہید ہوئے - گھر بار لٹا - لیکن ان جانی و مالی نقصانات کے علاوہ سب سے زیادہ سوھان روح چیز آزاد کے لئے استاد ذوق کے کلام کا تلف ہونا تھا جسے وہ ذوق کے انتقال کے بعد کلیجے سے لگائے رہتے تھے - بہر حال جب اس رستخیز بے جا سے نجات ملی اور کوئی یار و مددگار نہ پایا تو آزاد تلاش معاش میں لکھنؤ پہنچے - لیکن وہاں بھی علم و ادب کا بازار سونا پڑا تھا اور واجد علی شاہ اختر کی معزولی کے بعد سے لکھنؤ میں بھی ادبی سرپرستی عنقا تھی - اس پر آزاد نے پریشانیوں سے تنگ آ کر ایک مدرسہ میں چند دن بحیثیت ایک معلم کے گزارے پھر شہر گردی کرتے ہوئے ۱۸۶۴ء میں لاھور پہنچے اور سررشتہ تعلیم میں ملازم ہو گئے - کچھ عرصہ کے بعد خوش قسمتی سے آن کی ملاقات اپنے ایک ہم جماعت پیارے لال آشوب سے ہوئی جن کے توسط سے وہ محکمہ تعلیمات پنجاب کے ناظم اعلیٰ

میجر فلر تک پہنچے ۔ میجر فلر کو عربی و فارسی سے خاصا شغف تھا چنانچہ وہ آزاد کے تبحر علمی سے بہت متاثر ہوا۔ اسی کے ایما پر آزاد نے اردو اور فارسی کی چند درسی کتابیں لکھیں ۔ رفتہ رفتہ آزاد کو اپنی فطری صلاحیتیں بروئے کار لانے کا موقع ملا اور محض اپنی ذاتی قابلیت کی بدولت محکمہء تعلیم ، عوام اور پھر حکومت کی نظروں میں بڑے سرخرو ہوئے ۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے ایک موقع پر علمی خدمات کے لئے انہیں کابل و بخارا بھی بھیجا گیا ۔ اور ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر انہیں ''شمس العلماء'' کا ذی وقعت خطاب عطا ہوا ۔

اس طرح گویا لاہور آ کر حضرت آزاد کی قسمت کا ستارہ چمکا اور سرکاری نیز دیگر علمی حلقوں میں آن کی بڑی قدر و منزلت ہوئی ۔ آن کی سرکاری خدمات مختلف نوعیت کی ہیں ۔ شروع شروع میں وہ کسی اسکول میں مدرس رہے اور اس ادنیٰ درجے سے ترقی کرکے بالآخر وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فارسی عربی کے پروفیسر ہوئے اس کے علاوہ وہ سرکاری اخبار ''اتالیق پنجاب'' کے نائب مدیر بھی رہے ۔ کچھ عرصہ کے بعد جب یہ پرچہ بند ہو گیا اور اس کی جگہ ''پنجاب میگزین'' جاری ہوا تو آزاد اس میں بھی نائب مدیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے ۔ ۱۸۸۳ء میں وہ فارسی زبان کی لسانی تحقیقات کے سلسلے میں ایران گئے اور وہاں سے نہ صرف اپنی ضروری علمی تحقیقات کے لئے مواد فراہم کر کے واپس ہوئے ۔ بلکہ ساتھ ہی جدید فارسی اور بول چال کی زبان میں بھی خاصی مہارت حاصل کر لی ۔ لیکن افسوس کہ چند ہی سال کے بعد آن کی چہیتی بیٹی کا ، جسے انہوں نے بڑے لاڈ پیار سے پرورش کر کے ، اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی ، انتقال ہو گیا ۔ یہ حادثہ جانکاہ آزاد کے لئے بہت ہی ناقابل برداشت ثابت ہوا اور وہ اس سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ آن کا دماغ مختل ہو گیا ۔ کئی سال تک یہ معذور اور تکلیف دہ زندگی گزار کر اردو ادب کے اس محسن نے آخرکار ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو انتقال کیا ۔

مولانا آزاد فارسی و عربی کے بڑے اچھے عالم تھے ۔ ساتھ ہی انہیں بھاشا و ہندی کے نکات اور انگریزی ادب کی خصوصیات سے بھی واقفیت تھی ۔ وہ فارسی بڑی سلیس و بامحاورہ بولتے تھے اور ایران سے واپس آنے کے بعد تو آن کا لب و لہجہ ایسا ہو گیا تھا کہ فارسی میں گفتگو کرتے وقت ان پر اہل زبان کا دھوکا ہوتا تھا ۔ اردو ادب میں مولانا کے کارنامے یقیناً آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں ۔ ہم آن کے بے مثل و ناقابل تقلید نثری کارناموں کا جائزہ '' آدبائے اردو '' میں لے چکے ہیں یہاں صرف جدید اردو شاعری کے بانی کی حیثیت سے ہم آزاد موصوف کی بیش بہا خدمات پیش کرنا چاہتے ہیں ۔

اس سے پہلے تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ لاہور میں مولانا آزاد کی رسائی میجر فلر تک ہو چکی تھی اور وہ آزاد کی علمی قابلیت سے بہت متاثر ہوا تھا ۔ آزاد نے حاکم کے اس رنگ سے فائدہ اٹھایا اور یہ تحریک کی کہ ایک ایسی انجمن قائم ہونی چاہئے جس کی سرپرستی میں علمی و ادبی مضامین بھی پڑھے جائیں اور مشاعرے بھی منعقد ہوں ۔ میجر فلر نے اس رائے سے اتفاق کیا چنانچہ ''انجمن پنجاب'' کے نام سے ایک علمی سوسائٹی کی بنیاد ڈالی گئی ۔ اسی سوسائٹی کے ایک جلسہ میں جو ۱۵ اگست ۱۸۶۷ء کو

منعقد ہوا تھا آزاد نے اپنا جدید نظریہ شعر پیش کیا ۔ گویا یہ پہلا دن تھا جب آزاد نے نظم اور کلام موزوں کے باب میں نئے خیالات کا اظہار کر کے نیچرل شاعری کے لئے زمین ہموار کرنا شروع کی تھی ۔

حسن اتفاق سے میجر فلر کے بعد اس کی جگہ ایک اور معقول انگریز مستشرق کرنل ہالرائڈ نامی محکمہ تعلیمات پنجاب کا ناظم ہو کر آیا ۔ وہ بھی آزاد سے مل کر بہت خوش ہوا ۔ بالخصوص ''انجمن پنجاب'' کی کارگزاریوں کو اس نے خوب سراہا ۔ کچھ دنوں کے بعد مولانا آزاد کی تحریک پر اس نے انجمن مذکورہ کی صدارت بھی قبول کر لی ۔ حاکم کے اس اخلاق و ظاہری تعاون کو حاصل کرنے کے بعد آزاد نے انجمن کے مشاعروں کا رنگ بدل دیا اور یہ طے پایا کہ اب بجائے مصرع طرح کے نظم کے کسی موضوع کا اعلان کر دیا جایا کرے چنانچہ اس نوعیت کا پہلا مشاعرہ مولانا آزاد کے ایک شاگرد غلام حیدر نثار کے بقول ۸ مئی ۱۸۷۴ء کو منعقد ہوا جس میں آزاد نے اس نئے طرز کے مشاعرے اور جدید شاعری کے ضمن میں ایک لکچر دیا اور پھر اپنی معروف مثنوی موسوم بہ ''شب قدر'' پڑھی جس میں شام کی آمد اور رات کی کیفیت بڑے سادہ مگر دلچسپ انداز میں دکھائی تھی ۔ غرض یہی وہ پہلا مشاعرہ ہے جس میں جدید اردو شاعری کا سنگ بنیاد مولانا آزاد کے ہاتھوں رکھا گیا ۔

آزاد ایک فطری شاعر تھے ۔ اور شعریت اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی یہی وجہ ہے کہ نظم کے علاوہ نثر میں بھی اُن کا منفرد رنگ ہے جس کی رچی ہوئی شعریت ایک نمایاں خصوصیت ہے ۔ سطور بالا میں عرض کیا جا چکا ہے کہ آزاد نے ذوق کے سایہ عاطفت میں پرورش پائی اور دھلی کے آخری مایہ ناز شعرا کی صحبتوں میں اُن کا نشو و نما ہوا ۔ اس ماحول میں رہ کر آزاد نے غزل سرائی میں شہرت حاصل کی لیکن افسوس کہ مولانا کا سرمایہ غزلیات جو اُن کی برسوں کی کمائی تھی غدر کے طوفان میں بہہ گیا ۔ یہ ایک شعر جس کا ایک مصرع اُستاد ذوق کا ہے غالباً آزاد کا سب سے پہلا شعر ہے ۔

آجائے اگر ہاتھ تو کیا چین سے رہئے   سینے سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

البتہ ''خمکدہ آزاد'' میں، جسے آغا محمد طاہر صاحب نبیرہ حضرت آزاد نے ترتیب دیا ہے، اُن کی کچھ غزلیں ضرور مل جاتی ہیں ۔ ان میں کچھ تو وہ ہیں جو انجمن پنجاب کے ابتدائی مشاعروں کی ہیں اور کچھ اُن آخری ایام کی یادگار ہیں جب مولانا پر ایک جذب کی کیفیت طاری تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ ان غزلوں میں تصوف و حقیقت کی چاشنی زیادہ ہے ۔ آزاد کی غزلوں پر ایک نظر ڈالنے سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ غزل سرائی کے میدان میں بہت زیادہ کامیاب نہ تھے اور یقیناً ہونا بھی یہی چاہئے تھا ۔ چونکہ اُن کا صحیح مذاق تو نظم آزاد میں جلوہ گر ہونا تھا تاہم اُن کی غزلیں غزل کے حسن و کیف اور تغزل کی چاشنی سے خالی نہیں ۔ ان میں سوزش قلب و جگر کی وہ چنگاریاں پوشیدہ ہیں جو ایک مخصوص تہذیبی روایت کی پروردہ ہیں ۔ یہاں ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ آزاد کی زبان پر نظر ہے وہ مختلف قواف اپنی اپنی جگہ اس طرح بٹھاتے ہیں کہ مشاق دیکھیں اور نو مشق سیکھیں ۔

آزاد کی اس غزل گوئی کے علاوہ اُن کی وہ منظومات ھیں جو نئی شاعری کی بڑی دور رس اور نتیجہ خیز تحریک کی پیداوار ھیں - یہی وہ مبارک تحریک تھی جس کی بدولت اُردو شاعری کے سکون میں ارتعاش پیدا ھوا اور اسی کے بانی کی حیثیت سے شہرت عام اور بقائے دوام کا تاج آزاد کے سر پر نظر آتا ھے - لیکن آزاد چونکہ جدید شاعری کے بانی تھے اس لئے اُن کے یہاں شاعری کی تمام خوبیاں پیدا نہیں ھو سکیں - بعض جگہ تعقید بھی ھے ' چستی بھی کم ھے اور علوئے تخیل کا بھی فقدان ھے مگر اس کے باوجود اُن کی نظموں میں صفائی اور خوبئی ادا بدرجۂ اتم پائی جاتی ھے - بالخصوص منظر نگاری اور زور کلام کو جس طرح آزاد نے نبھایا ھے وہ قابل تعریف ھے - وہ لطیف و نازک جذبات کو بڑے سلیقے سے اُبھارتے ھیں - اور اشعار کے پیرائے میں نتیجہ خیز مطالب کو ادا کرنے کی جیسی قدرت آزاد کو حاصل تھی اُن کے معاصرین میں شاید کسی کے حصے میں نہیں آ سکی - کلام آزاد کا خاص جوھر جوش اور درد ھے جو اُن کی تمام نظموں میں جھلکتا ھے -

آزاد کی شاعری پر تبصرہ کرتے ھوئے پروفیسر عبدالقادر سروری نے ٹھیک کہا ھے کہ " آزاد کی شاعری پژمردہ دلوں کو بہلا سکتی ھے ' دامن دل سے گرد افکار کو دھو سکتی ھے ' لیکن خیال کو مروج اور ذھن کو قوت پرواز عطا نہیں کر سکتی ' شگفتگی ' لطافت ' ترنم اور نفیس تشبیہوں اور طویل استعاروں کا استعمال آزاد کی شاعری کے اثر کا خاص راز ھے اس رنگ میں اُن کی شاعری منفرد[1] ھے"

آزاد کے اس دور شاعری کی یادگار چند مثنویاں ھیں جن میں شب قدر ' صبح اُمید ' گنج قناعت ' داد انصاف ' وداع انصاف اور خواب امن خاص طور پر قابل ذکر ھیں ' ان مثنویوں میں آزاد نے مناظر فطرت کی عکاسی ' حقائق کے انکشاف اور انسانی زندگی کے حسین و شگفتہ پہلوؤں پر روشنی ڈالی ھے - لیکن اُن کا اسلوب بالکل فطری ھے وہ کہیں پند و نصائح سے کام نہیں لیتے اور نہ نظموں کو ذریعہ اصلاح بنا کر وعظ و نصیحت سے کام لیتے ھیں بلکہ محض موضوع کے متعلق اپنے پاکیزہ خیالات کا اظہار بڑے فطری انداز میں کر دیتے ھیں یہی وجہ ھے کہ اُن کے کلام میں خشکی یا پھیکا پن نہیں ھونے پاتا اور پڑھنے والے کی دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رھتی ھے - ان نظموں میں "خواب امن" خاص طور پر قابل ذکر ھے جس میں خیالات کی بلندی ' طرز بیان ' روانی اور استعارے کی خوبیاں بہت ھی کامیاب صورت میں جلوہ گر ھیں -

اس میں شک نہیں کہ آزاد کی جدید شاعری کی تحریک کو سب سے زیادہ تقویت مولانا حالی جیسے سرگرم کارکن سے پہنچی جنھوں نے جدید شاعری کے اصول ' نوعیت اور ضرورت کو بڑی تیزی کے ساتھ عوام و خواص تک پہونچایا - لیکن بایں ھمہ آزاد کی اھمیت اس میں ھے کہ اول تو سب سے پہلے اُن کے دل میں اصلاح کا خیال پیدا ھوا اور اس سلسلے میں پہلا قدم اُنھوں نے بڑھایا دویم یہ کہ اُن کی شاعری میں بڑی فطریت ھے - وہ کسی پسندیدہ موضوع پر طبع آزمائی کرتے ھیں اور اصلیت ' سادگی و جوش جیسی خصوصیات شاعری سے کبھی گریز نہیں کرتے - ان کا انداز بیان شگفتگی ' لطافت و ترنم سے

[1] جدید اُردو شاعری از پروفیسر عبدالقادر سروری طبع سوم صفحہ ۱۱۳

مالا مال اور زبان لطیف و نازک تشبیہات و استعارات سے سجی ہوئی ہے - اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ آزاد ایک فطری شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایسے خاندانی گہوارہ میں پروان چڑھے اور ایسے کامل اُستاد کی آغوش میں اُنکے خیالات کی تربیت ہوئی جس کی رگ رگ میں شعریت رچی ہوئی تھی -

انتخاب کلام

تغزل

اے خرابیِ خانہ بر انداز ترے جوروں سے
خانہ دل کبھی ویران نہ ہوا تھا سو ہوا
دیکھ کر تیغ بکف یار کو بولا آزاد
دشمن جاں کبھی جاناں نہ ہوا تھا سو ہوا

متردد ہے دل کہوں نہ کہوں — پوچھتے ہیں وہ مدعا میرا
ہر نگہ میں ہیں سینکڑوں ارماں — کوئی دیکھے تو دیکھنا میرا
پاس تم کو اگر نہیں تو نہ ہو — اے بتو کیا نہیں خدا میرا
لئے جاتے ہو تم کہاں دل کو — ہے یہ مدت سے آشنا میرا

دل ان کا غیر کی باتوں میں ایسا شاد رہا
جو کچھ کہ ہم نے کہا تھا وہ کچھ نہ یاد رہا
حساب بوسہ میں کرتے ہو ہاتھا پائی تم !
مجھے جو بھول گیا تھا وہ تم کو یاد رہا
نہیں زمانہ کو مہلت کبھی یہاں آزاد
خوشی یہ ہے کہ وہ خوش وقت خیر باد رہا

جو آغاز یہ ہے خدایا ہمارا — تو انجام دیکھیں گے ہو کیا ہمارا
جنوں نے جو کی فصلِ گل کی رفاقت — تو دیکھوگے تم بھی تماشا ہمارا

کھلے جو دیدۂ غفلت تو یہ ہوا روشن
که نفع جس کو تھے سمجھے وہ تھا زیاں اپنا
ہمارے دل کی تو دلدار تک ہے دلداری
جو وہ نہ دل کو سنبھالے تو دل کہاں اپنا
میں ضبطِ دل کا ہوں قائل کہ خون ہو کے بہا
پہ حرفِ شکوہ نہ لایا سرِ زباں اپنا

شب نشہ میں جو رخِ یار سے پردہ اٹھا لطف دورِ شبِ مہتاب سے کیا کیا اٹھا
خلق سے اٹھ گئے پر سنگِ درِ جاناں سے روشِ نقشِ قدم پاؤں نہ اپنا اٹھا
جل گئے سوزِ نہاں سے جگر و دل شاید دیکھنا روزن سینہ سے دھواں سا اٹھا
شعر گوئی کا تو رکھتا نہیں دعویٰ آزاد
ہاں پر استاد کی خدمت میں ہے بیٹھا اٹھا

ہم نے سنا کہ آپ نے ہم کو برا کہا دل نے کہا کہ دوست ہے جو کچھ کہا کہا
وہ کون ہے کہ ہم کو نہ جس نے برا کہا پوچھو تو خامشی سے بھلا ہم نے کیا کہا
گزرے خموش کوئے سلامت روی میں ہم ہم نے برا سنا نہ کسی کو برا کہا

شیخ کعبہ میں تم نے کیا دیکھا ہم بتوں سے ملے خدا دیکھا
سوزِ نالہ نے کچھ اثر نہ کیا ہم نے یہ ساز بھی بجا دیکھا
آہ نے اپنی کچھ نہ کام کیا ہم نے یہ تیر بھی لگا دیکھا
ہر مرض کی دوا مقرر ہے مرض عشق لا دوا دیکھا
ہم نے دیکھا نہ عاشق اے آزاد
اور جو دیکھا تو مبتلا دیکھا

مشت خاک اپنی کجا اب اور کہاں کوئے صنم
اب صبا لے جائیگی واں یا خدا لے جائے گا
وادی الفت میں رکھا ہے قدم آزاد نے
ابتدا کی جس نے وہ تا انتہا لے جائے گا

چمن میں کہتے ہیں پھر موسمِ بہار آیا
کوئی تو یہ بھی زبان سے کہو کہ یار آیا
سر اپنا کاٹ کے پھینک آیا کوئے قاتل میں
یہ بوجھ تھا مری گردن پہ سو آتار آیا
جوان معرکۂ حسن و عشق تھا آزاد
چلا جو دل پہ نہ قابو تو جان ہار آیا

ڈریں کیا شورِ محشر سے کہ ہم نے بارہا زاہد
خرامِ یار سے ہنگامۂ محشر بپا دیکھا
نہ دیکھا تو نے ہم کو اور ہم نے تیرے جلووں میں
خدائی کا تماشا اے بت کافر ادا دیکھا

تمہاری جفائیں ہماری وفائیں — یہ قصے بھی ہونگے فسانے کے قابل
دلبستان اُلفت میں ہیں طفلِ مکتب — زمانے کے عالم زمانے کے قابل
نہ اُس زلف کو چھیڑو اے حضرتِ دل — کہ یہ جرم ہے مار کھانے کے قابل
دُرِ اشک کو یوں لٹاؤ نہ آزاد — کہ ہینگے یہ موتی خزانے کے قابل

چشمِ نرگس کو بھی گلشن میں بڑے دعوے ہیں
تم ذرا چل کے دکھا دو سرِ گلزار آنکھیں
نہیں کرتے جو مسیحائی ہماری نہ کرو
پر تم اپنی تو خبر لو کہ ہیں بیمار آنکھیں
ہائے حسرت نہ بر آئی کبھی دل کی آزاد
ساتھ ہی لے کے چلیں حسرت دیدار آنکھیں

جہاں کے حسن ہیں تم میں کہ شاہِ حسن ہو تم
جو عیب پوچھو جہاں کے تو اس غلام میں ہیں

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں — سوار خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں
قمار عشق میں اب کیا لگائینگے آزاد — کہ نقدِ دل کو تو پہلے ہی ہار بیٹھے ہیں

مرنا ہے اور ابھرنا ہے — اس کے سوا کیا کرنا ہے
درد ترا گنجینۂ دل پر — بیٹھا دے کر دھرنا ہے
اشکوں نے برسات لگائی — آنکھیں ہیں یا جھرنا ہے

بزمِ ہستی میں رہے ذوقِ نظر سے آزاد
گردشِ انجم و افلاک تماشا تھا مجھے

ہے اب کے حکم کہ گلشن میں فیض عام رہے
گلوں کو خندہ بہ لب سرو کو خرام رہے
سرائے ملکِ فنا ہی اسے سمجھ آزاد
کہ صبح کوچ ہو گر رات کو قیام رہے

ہر دم پھرے ہے ساتھ نسیم و صبا لگی
ایسی چمن میں آ کے گلوں کو ہوا لگی
اس گل سے جا لگی کبھی اس گل سے جا لگی
گلشن میں ہے کسی نہ کسی سے صبا لگی

دیوانگانِ عشق کو زیبا ہے داغِ سر
شاہوں کے سر پہ افسر شاہانہ چاہئے
اے غافلو کبھی تو ادھر کی بھی لو خبر
ایسی بھی دل میں الفت دنیا نہ چاہئے
کیا بیٹھا جمع کرتا ہے سامان عمرِ نوحؑ
بحرِ جہاں میں دم کا بھروسا نہ چاہئے
آزاد بے ثباتی دنیا کو دیکھ کر
یہ چاہتا ہے دل کہ کچھ اصلا نہ چاہئے

غیر دیدارِ صنم گر ہو سروکار مجھے　　تو میسّر نہ ہو اللہ کا دیدار مجھے
دیتے کیا کیا ہیں دلاسے شب فرقت میں بہم　　دلِ بیمار کو میں اور دلِ بیمار مجھے
دیکھنا قید تعلق میں نہ آنا آزاد　　دام آتے ہیں نظر سبحہ و زنار مجھے

پوچھتا حالت ہے کیا میرے دلِ ناشاد کی
آہ کی حالت نہیں طاقت نہیں فریاد کی
قیدیانِ زلف پر کیا جانے شب کیونکر کٹی
آج زنداں سے نہیں آتی صدا فریاد کی
سرو ساں زنجیرِ الفت سے ہے پابندِ چمن
نام کو آزاد ہے حالت یہ ہے آزاد کی

تقاضا ہے گریباں کا کہ مجھ کو چاک کر ڈالو
تمنا ہے یہ دامن کی اڑا دو دھجیاں میری

منظومات

انتخاب مثنوی ابرِ کرم

چلنا وہ بادلوں کا زمیں چوم چوم کر
اور اٹھنا آسماں کی طرف جھوم جھوم کر
بجلی کو دیکھو آتی ہے کیا کوندتی ہوئی
سبزے کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا روندتی ہوئی
آئی صبا ادِھر سے اُدھر سے نسیم بھی
اور اُن کے ساتھ ساتھ ہے آتی شمیم بھی
مستی میں جھومنا وہ جوانانِ باغ کا
جھک جھک کے لینا ہاتھ سے گل کے ایاغ کا
سبزے کے عکس سے در و دیوار سبز سبز
سیراب باغ و دشت تو کہسار سبز سبز

بوندوں میں جھومتی وہ درختونکی ڈالیاں
اور سبز کیاریوں میں وہ پھولونکی لالیاں
وہ ٹہنیوں میں پانی کے قطرے ڈھلک رہے
وہ کیاریاں بھری ہوئی تھالے چھلک رہے
آبِ رواں کا نالیوں میں لہر مارنا
اور آجڑے ہِسبزہ زار کا دھو کر سنوارنا
گِرنا وہ آبشار کی چادر کا زور سے
اور گونجنا وہ باغ کا پانی کے شور سے
جل تھل ہیں کوہ و دشت میں تالاب آب کے
گویا چھلک رہے ہیں کٹورے گلاب کے
ہر جا پہ طائران چمن غول غول ہیں
آپس میں بول بول کے کرتے کلول ہیں
کوئل کا دور دور درختوں پہ بولنا
اور دل میں اہلِ درد کے نشتر گھنگولنا
طاؤس کا وہ دُم کو چنور کر کے ناچنا
اور مورنی کا اشک کے موتی کو جانچنا
لیکن چمن سے ناچ کے چلتا جو سور ہے
اک قہقہہ سے طنز لگاتا چکور ہے
املی کے اک درخت پہ جھولا پڑا ہوا
اور ساتھ اُس کے آم کا ٹپکا لگا ہوا
جھولوں پہ نوجوان ہیں پینگیں چڑھا رہے
اور بچے آم کے ہیں پپیہے بجا رہے
ساون کے گیت اٹھا رہے طوفان دلوں میں ہیں
پردیسیوں کی یادوں سے ارماں دلوں میں ہیں
ہر تان میں ملہار کی مستی کا سوز ہے
بادل گرج کے پردے میں دیتا ٹکور ہے

انتخاب مثنوی خواب امن

(خسرو امن کا دربار)

میں کہ آشوبِ جہاں سے تھا ستم دیدہ بہت
امن کو سمجھا غنیمت ' دلِ غم دیدہ بہت

شوق دل لے کے غرض قصر میں آیا مجھ کو
پر عجب عالمِ نیرنگ دکھایا مجھ کو

خسروِ امن تھا واں جلوہ فزائے دربار
دیتی فرحت تھی دل و جاں کو ہوائے دربار

اس کے آگے تھا مرادوں کا چمن پھول رہا
آپ تھا پھولوں کے جھولوں میں پڑا جھول رہا

نیند کا جھوکا تھا جھوے کو جھلاتا جاتا
مورچھل سر پہ تھا آرام ھلاتا جاتا

گلِ خورشید تھا واں ہر گلِ شاداب سدا
دھوپ کی جا تھی مگر چادر مہتاب سدا

صبح دن رات کھڑی سامنے ھنستی تھی وھاں
نور کے ساتھ سدا اوس برستی تھی وھاں

ھاتھ باندھے تھیں مرادیں وھاں ہر دم آکے
آرزوئیں تھیں کھڑی ناچتی چھم چھم آکے

دولت و عیش و طرب تھے اُمرائے دربار
کرتے تھے نظم و نسق جملہ برائے دربار

دل میں افکارِ پریشاں کا نہ تھا نام وھاں
ساتھ جمعیت خاطر کے تھے سب کام وھاں

مرغزاروں میں جو اشجار تھے سب چھائے ہوئے
دامن امن و اماں خلق پہ پھیلائے ہوئے

شغل میں اپنے ہر اک شخص تھا مشغول وھاں
چنتا تھا راحت و آرام کے پھل پھول وھاں

انتخاب مثنوی وداعِ انصاف (ابتدائی حصه)

جب طور دمِ صبحِ شب تار کا بدلا
اور رنگ چمن میں گل و گلزار کا بدلا

شبنم نے گہر فرش کئے خاک کے اوپر
اور تارے لگے ڈوبنے افلاک کے اوپر

چلنے کو بہم آنکھ لگے مارنے سارے
اور چاند په جانوں کو لگے وارنے سارے

آئی جو صبا لوٹ کے نسرین و سمن میں
انگڑائیاں لینے لگیں شاخیں بھی چمن میں

لی صبح کے پہلو میں اُدھر رات نے کروٹ
لی خاک په یاں مست خرابات نے کروٹ

زاهد جو افیمی کی طرح جھوم رہا تھا
اور بیٹھا مصلّے په زمیں چوم رہا تھا

بیدار ہوا سن کے موذّن کی اذاں کو
آزاد جو تھا صرفِ سخن کر رہا جاں کو

هشیار هوا نالۂ مرغان سحر سے
اور وقتِ سحر نکلا ہوا کھانے کو گھر سے

تا فیضِ سحر سے هو دلِ زار شگفته
اور هو کوئی دم جانِ پُر آزار شگفته

پر طائرِ دل جب قفسِ شہر سے نکلا
اور قلزمِ افکار کی مَیں لہر سے نکلا

دیکھا که سوئے دشت هے دنیا چلی جاتی
اور خلق هے دوڑی سوئے صحرا چلی جاتی

حیرت هوئی میرے دلِ بے تاب و تواں کو
اور پوچھا هر اک شخص سے اس رازِ نہاں کو

پر دل کا خلش تھا سو مٹایا نه کسی نے
اس پردۂ حیرت کو اٹھایا نه کسی نے

آخر کو نظر عقل نظر باز سے لے کر
اور شوق کے بازو پرِ پرواز سے لے کر

پابند به رفتار زمانه هُوا مَیں بھی
ساتھ انکے سوئے دشت روانه هُوا مَیں بھی

جب شہر کے میدان سے هم دور تر آئے
اور سامنے راوی کے کنارے نظر آئے

دیکھا که سرِ راه کچھ اشجار هرے هیں
دامانِ تمنا کو طراوت سے بھرے هیں

اک شاه اسی جا په سرِ خاک هے بیٹھا
بیٹھا هے مگر سخت غضب ناک هے بیٹھا

اور سامنے کچھ باندھے هوئے هاتھ کھڑے هیں
کچھ برهنه سر اور که جو ساتھ کھڑے هیں

وه آکے گرے پاؤں په با دیدۂ تر هیں
اور عفوِ جرائم کو جھکائے هوئے سر هیں

اُولوالغرمی کیلئے کوئی سد راہ نہیں

ہے سامنے کھُلا ہوا میدان چلے چلو
باغِ مراد ہے ثمر افشاں چلے چلو
دریا ہو بیچ میں کہ بیاباں چلے چلو
ہمت یہ کہہ رہی ہے کھڑی ' ہاں چلے چلو
چلنا ہی مصلحت ہے مری جاں چلے چلو

ہیں کوہ و دشت جیسے کہ پھولا پھلا چمن
دامن میں ہیں بھرے ہوئے نسرین و نسترن
نہریں اِدھر آدھر ہیں آمیدوں کی موجزن
اس دشت میں نہ دوڑ سکو بن کے گر ہرن
کبکِ دری کی طرح خراماں چلے چلو

آؤ کہ کھوے اپنے نشاں ننگ و نام نے
باندھی کمر ہے کَس کے ہر اک شاد کام نے
کیوں اسطرح کمر کو لگے تھک کے تھامنے
دیوار باغ وہ نظر آتی ہے سامنے
سر و سہی کے سر ہیں نمایاں چلے چلو

یارو چلو چلو نہ کرو انتظار تم
کرتے ہو کیا آمید یمین و یسار تم
میدان عزم و جزم کے ہو شہسوار تم
بڑھ جاؤگے کروگے اگر مار مار تم
چلّا رہی ہے ہمتِ مرداں چلے چلو

ہمت کے شہسوار جو گھوڑے آڑائیں گے
دشمن فلک بھی ہونگے تو سر کو جھکائیں گے
طوفان بلبلوں کی طرح بیٹھ جائیں گے
نیکی کے زور آٹھ کے بدی کو دبائیں گے
بیٹھو نہ تم مگر کسی عنواں چلے چلو

آئینہ دل کا گرد سفر سے آجال دو
پوچھے کوئی ارادہ کدھر ہے تو ٹال دو

شیطاں جو شبہ ڈالے تو دل سے نکال دو
ہو خوف کا خیال تو بزدل پہ ٹال دو
اور آپ بن کے شیر نیستاں چلے چلو

رکھو رفاہ قوم پہ اپنا مدار تم
اور ہو کبھی صِلے کے نہ اُمیدوار تم
عزت خدا جو دیوے تو پھر کیوں ہو خوار تم
دو رُخ کو آبِ فخر سے رنگِ بہار تم
گلشن میں ہو کے بادِ بہاراں چلے چلو

یارو چلو فلک پہ ستارے ہیں چل رہے
آبِ رواں ہیں چشموں سے بہہ کر نکل رہے
جنگل میں کارواں بھی ہیں منزل بدل رہے
جو تھم رہے وہاں وہی خردر دِخل رہے
تھمنے کا یہ مقام نہیں ہاں چلے چلو

آگے بڑھو کہ اب نہیں تابِ قرار ہے
کرنا ہے جبکہ کام تو کیا انتظار ہے
جو کچھ کہ معرکہ تھا لیا تم نے مار ہے
ہو تم بھی خوش کہ آئی خوشی کی بہار ہے
فتح و ظفر نے لے لیا میداں چلے چلو

آؤ سیہ سفید کا فیصل حساب ہے
چمکایا چہرہ صبح نے با آب و تاب ہے
ظلمت پہ نور ہونے لگا فتح یاب ہے
اور شب کے پیچھے تیغ بکف آفتاب ہے
تم بھی ہو آفتابِ درخشاں چلے چلو

نیکی بدی کے دیر سے باہم ہیں معرکے
اب خاتموں پہ آ گئے ہیں اُن کے فیصلے
قسمت کے یہ نوشتہ نہیں جو نہ مٹ سکے
وہ گونجا طبل فتح کہ میداں لے لئے
ہے کرّنائے جنگ کی الحاں چلے چلو

مولانا الطاف حسین حالی

خواجہ الطاف حسین نام ، حالی تخلص ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے ۔ والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا ۔ خواجہ حالی کا سلسلہ نسب حضرت ابو ایوب انصاری سے ملتا ہے ۔ آبا و اجداد بلبن کے عہد میں ہرات سے آ کر پانی پت میں مقیم ہوئے اور پانی پت نیز اسکے اطراف کے علاقے خدمت قضاء کی کفالت میں انہیں تفویض ہوئے ۔ خواجہ ایزد بخش بڑے متقی و پرہیزگار بزرگ تھے اور ان کے زہد و ورع کی وجہ سے قرب و جوار کے لوگوں میں ان کی بڑی عزت تھی ۔ باپ کی یہ دینداری و پاک نفسی بیٹے کو ترکے میں ملی ۔ لیکن حالی کی کم سنی ہی میں جبکہ ان کی عمر تقریباً ۹ سال کی تھی والد کا انتقال ہو گیا ۔ اور وہ اپنے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین کی سرپرستی میں پرورش پانے لگے ۔ خواجہ امداد حسین نے انہیں بڑی محبت و شفقت سے پالا اور تعلیم و تربیت دی ۔ بچپن کے اس تعلق کا نتیجہ یہ ہوا کہ خواجہ حالی کو بڑے بھائی سے ایک خاص تعلق خاطر پیدا ہو گیا جس کا اظہار انہوں نے اپنی شاعری میں بھی کہیں کہیں کیا ہے ۔

حالی کی ابتدائی تعلیم بالکل قدیم انداز پر ہوئی ۔ انہیں پہلے گھر پر قرآن حفظ کرایا گیا ۔ پھر ایک بزرگ سید جعفر علی سے چند فارسی کی کتابیں پڑھیں اور عربی کا درس حاجی ابراہیم حسین انصاری سے لیا ۔ ابھی ان کی تعلیم مکمل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ سترہ برس کی عمر میں حالی کی مرضی کے خلاف ان کی شادی کر دی گئی ۔ اور گھریلو ذمہ داریوں کا بوجھ بڑے بھائی کے ساتھ ساتھ انکے کاندھوں پر بھی آ پڑا ۔ ایسی صورت میں نوکری کی تلاش ازبس ضروری تھی ۔ لیکن حالی کو حسب منشا تعلیم نہ حاصل کر سکنے کا بڑا قلق تھا ۔ چنانچہ وہ گھر والوں سے چھپ چھپا کر دہلی چلے گئے ۔ اور مولوی نوازش علی سے صرف ونحو اور منطق کی چند کتابیں پڑھیں ۔ ساتھ ہی ان کی رسائی مرزا غالب تک ہو گئی جن کی صحبت میں شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا بعد میں وہ اس یگانہ روزگار فنکار کے شاگرد ہو گئے ۔ مرزا غالب نے ان کی بڑی ہمت افزائی کی اور ان کی غزلوں پر اصلاح بھی دیتے رہے ۔ یہ سلسلہ تلمذ مشکل سے ڈیڑھ سال تک جاری رہ سکا تھا کہ گھر والوں کے مجبور کرنے پر حالی کو گھر واپس جانا پڑا ۔ حالی جانے کو تو پانی پت چلے گئے مگر دہلی کی علمی صحبتوں کا ان پر اتنا گہرا اثر پڑ چکا تھا کہ ان کا وطن میں رہنا مشکل ہو گیا ۔

١٨٥٦ء میں ضلع حصار کی کلکٹری میں انہیں قابل مشاہرہ پر ایک اسامی مل گئی لیکن روزی کا یہ سہارا ملے ہوئے زیادہ دن نہ گزرنے پائے تھے کہ غدر کا ہنگامہ بپا ہو گیا حالی ملازمت چھوڑ کر پھر پانی پت چلے آئے اور چار سال تک بیکاری کے عالم میں دن گزارتے رہے ۔ اس دوران میں انہوں نے بطور خود کتب بینی کے مشغلے کو جاری رکھا اور حتی الوسع قدیم علوم میں کافی دسترس حاصل کر لی ۔

١٨٦٣ء میں حالی کو نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی مصاحبت میسّر آئی ۔ شیفتہ فارسی اور اردو کے اچھے شاعر اور بڑے فاضل انسان تھے ۔ حالی نے ان کی صحبت میں تقریباً آٹھ سال گزارے ۔ لیکن یہی وہ زمانہ ہے جس میں ان کا ادبی مذاق نکھرا اور ان پر شیفتہ کے پاکیزہ مزاج و سنجیدہ مذاق کا بڑا گہرا اثر پڑا ۔ اگرچہ اس وقفہ میں حالی مرزا غالب سے بھی مشورۂ سخن کرتے رہے لیکن درحقیقت حالی کو اس لائق فائق استاد سے اتنا فائدہ نہیں ہوا جتنا شیفتہ کی فیض صحبت سے ہوا ۔ شیفتہ قدیم طرز کی مبالغہ آمیز شاعری کو نا پسند کرتے تھے اور سیدھے سادے خیالات و حقائق کو نظم کرنا ان کے نزدیک شاعری کا حقیقی منشا تھا ۔ شعر و شاعری کے باب میں شیفتہ کی یہی وہ باتیں تھیں جنہوں نے شاعری کو چمکایا اور ساتھ ہی ساتھ انکی جدید شاعری کی تحریک میں بڑی ممد و معاون ہوئیں ۔

نواب شیفتہ کے انتقال کے بعد حالی کو پنجاب گورنمنٹ بکڈپو لاہور میں ایک جگہ مل گئی ۔ انہیں انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی اردو کتابوں کی تصحیح کا کام کرنا پڑتا تھا ۔ اس کام میں حالی کو انگریزی ادب سے واقفیت کا بڑا اچھا موقع ملا ۔ اور مغربی خیالات کا ان پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ انہیں اردو شاعری و انشا پردازی کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا ۔ خوش قسمتی سے لاہور میں حالی کو اس کے بڑے اچھے مواقع بھی مل گئے ۔ یہاں اسی زمانے میں مولانا آزاد کے ہاتھوں جدید طرز کے مشاعروں کا قیام عمل میں آ چکا تھا ۔ چنانچہ رفتہ رفتہ حالی بھی ''انجمن پنجاب'' کے سرگرم رکن بن گئے ۔ اس کے مشاعروں میں انہوں نے اپنی چار معروف مثنویاں ''برکھا رت'' ''نشاط امید'' ''مناظرہ رحم و انصاف'' اور ''حب وطن'' پڑھیں ۔ جو بہت مقبول ہوئیں ۔ غرض اس طرح لاہور میں حالی کی جدید شاعری کی ابتدا ہوئی ۔

تقریباً چار سال تک لاہور میں رہنے کے بعد حالی ''اینگلو عربک اسکول دھلی'' کے مدرس مقرر ہوئے ۔ یہاں بھی انہوں نے جدید طرز کی نظمیں لکھنے کا مشغلہ جاری رکھا ۔ لیکن دوران قیام دھلی میں حالی کی قسمت کا ستارہ کچھ ایسا چمکا کہ انکی ملاقات سرسید احمد خاں جیسی زبردست شخصیت سے ہو گئی ۔ سرسید مرحوم نے بہت جلد انہیں اپنی تحریکات کا ایک اہم رکن بنا لیا اور انہیں کے ایما پر حالی نے مسدس ''مدوجزر اسلام'' لکھی ۔ جن کا شمار آج بھی ان کے بڑے کارناموں میں ہوتا ہے ۔ ان شعری کاوشوں کے علاوہ یہیں ان کی نثرنگاری کی بھی ابتدا ہوئی اور ''حیات سعدی'' ''حیات جاوید'' ''یادگار غالب'' اور ''مقدمہ شعر و شاعری'' جیسے شاہکاروں کی تخلیق ہوئی ۔ ١٨٨٧ء میں آسماں جاہ مدار المہام ریاست حیدر آباد علی گڑھ تشریف لائے تو سرسید نے ان سے حالی کا تعارف کرایا ۔ نواب صاحب نے از راہ قدردانی حالی کا ٧٥ روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا ۔ اور جب ایک مرتبہ علیگڑھ کالج کا ایک وفد لے کر حالی حیدر آباد گئے تو یہ وظیفہ ٧٥ کی بجائے سو روپیہ ماہوار ہو گیا ۔ اس وظیفہ کے ملنے کے بعد حالی نے عربک اسکول

کی ملازمت ترک کر کے بقیہ عمر پانی پت میں ہی علمی و ادبی خدمات انجام دینے میں گزار دی ۔ ۱۹۰۴ء میں ادبی خدمات اور علم و فضل کے صلے میں سرکار انگریزی سے ''شمس العلماء'' کا خطاب ملا ۔ اور آخر ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو آپ نے انتقال فرمایا ۔

مولانا حالی کو بیس برس کی عمر میں شعر و شاعری کا چسکا پڑا اور انہوں نے بھی آزاد کی طرح غزل گوئی سے ابتدا کی ۔ لیکن ان کی غزلوں میں غالب و شیفتہ کے اثر سے بڑا نکھار ' تیکھا پن ' گھلاوٹ اور دل دوزی پیدا ہو گئی ۔ ان کے عاشقانہ جذبات بڑے پر اثر اور نہایت تیز ہیں ۔ حالی کے تغزل میں حسن و عشق کے رموز ایسی صفائی ' لطافت اور سادگی کے ساتھ سموئے ہوئے ہیں کہ پڑھنے والا خود بخود ایک پر کیف و پاکیزہ فضا محسوس کرنے لگتا ہے ۔ اس پر اعتدال ' اختصار ' بے تکلفی ' نرم ترنم اور کہیں کہیں سہل ممتنع نے ان کی غزل گوئی کو اور بھی چار چاند لگا دئے ہیں ۔ جدید غزلوں میں البتہ اخلاقی تلقین کے باعث کہیں کہیں پھیکا پن پیدا ہو گیا ہے لیکن یہاں بھی ان کی کہنہ مشقی اور اسلوب کی روانی نے بہت سے اشعار کو بے جان ہونے سے بچا لیا ہے ۔ بحیثیت مجموعی ان کے قدیم رنگ شاعری میں دہلویت جس خوبی ' کمال استادی سے رچی ہوئی ہے وہ انہیں کا حصہ ہے ۔

لیکن حالی محض غزل گو ہی نہ تھے بلکہ ان کی شاعری کا اس سے بھی زیادہ اہم دور وہ ہے جس میں وہ اصلاح قوم کے وقیع علمبردار اور تحریک جدید کے حامیوں میں ایک سرگرم رکن بنے ۔ حالی کا شمار ان چند مقتدر ہستیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے پرانے مدرسہ میں تعلیم پا کر ایسے کارہائے نمایاں انجام دئیے ۔ جن کا جواب ہماری جدید تعلیم اب تک پیدا نہیں کر سکی اور حقیقت تو یہ ہے کہ جب ہم مولانا حالی کے اصلاحی کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کے سامنے مولانا آزاد کی بنیادی مساعی بھی ہم کو ایک حد تک بے حقیقت نظر آنے لگتی ہیں ۔ چونکہ حالی نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ جدید رنگ کی شاعری ہی کی ہو بلکہ وہ جب تک زندہ رہے اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ جدید شاعری کے خیال ' اصول اور اس کی ضرورت کی برابر تلقین کرتے رہے ۔ اس سلسلے میں قطع نظر دوسری کاوشوں کے صرف ''مقدمہ شعروشاعری'' حالی کا ایک ایسا لازوال کارنامہ ہے جس کی مثال ڈھونڈھے سے نہیں ملے گی ۔

حالی کی منظومات میں سادگی ' روانی ' تسلسل اور ایک حد تک ہمواری ' یکسانیت اور ایک رنگی ہے ۔ منظر نگاری ' واقعہ نگاری ' سیرت نگاری ' فلسفہ' اخلاق ' قومیت ' جذبہ' ہمدردی ' اخلاق ' وسعت نظر اور صداقت پسندی وغیرہ کے نہایت دلکش نمونے ان نظموں میں پائے جاتے ہیں ۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کہیں کہیں یہ نظمیں خشک و بے کیف ہو گئی ہیں لیکن عام طور پر ان میں اعلیٰ شاعری کی وجدانی کیفیات موجود ہیں ۔

حالی کی شاعری کا اہم ترین دور وہ ہے جس میں انہوں نے سر سید کے زیر اثر قومی راگ چھیڑا اور ''مسدس مد و جزر اسلام'' جیسی معرکہ آرا نظم کی تکمیل کی ۔ جو نہ صرف ایک طویل و مربوط نظم ہے بلکہ اپنے موضوع کے اعتبار سے بھی ایک انوکھی چیز ہے ۔ یہ در حقیقت زوال اسلام کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے تنزل کا مرثیہ ہے ۔

اور جس صبر و کمال کے ساتھ حالی نے اسے سر انجام دیا اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ چھپتے ہی اس درجہ مقبول ہوا کہ ہر گھر اور ہر مجلس میں بڑی شیفتگی سے پڑھا جانے لگا۔ اور آج بھی ہر پڑھے لکھے اردو داں کو اس کے دو چار بند یاد ہیں۔ اس نظم کے بعد سے حالی قومی شاعر مشہور ہوئے اور مسلمانوں کا تنزل حالی کی جدید شاعری کا ایک موضوع بن گیا۔ جو حالی کی اپنے معاصرین میں ایک نمایاں فضیلت ہے۔

مختصر یہ کہ حالی کے مجموعہ کلام کو ایک ضخیم اور طولانی وعظ کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا کیونکہ اس میں حالی نے درس عمل اور واقعیت کو کچھ اس طرح وجدانی کیفیات میں سمو کر پیش کیا ہے کہ لطافت و مسرت زائی کے بنیادی اصول کا سررشتہ کہیں ہاتھ سے جانے نہیں پاتا۔ اور حالی کا سارا کلام سادگی، اصلیت اور جوش کا ایک اعلیٰ نمونہ بن گیا ہے۔ یہی وہ نمونہ ہے جس نے آہستہ آہستہ ایک نئے ترجمان اور نئی تحریک کو جنم دیا اور اردو نظم کو نئی راہوں پر ڈال کر اس میں نئی امنگیں اور نئے ولولے پیدا کئے اور نئی جولان گاہوں سے روشناس کر کے نئے آفق پر پرواز بھی سکھائی۔

انتخاب کلام

تغزل

کچھ تو ہے پاس تماشائی کا
ہے جو یہ شوق خود آرائی کا
تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا
کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا
بزم دشمن میں نہ جی سے اترا
پوچھنا کیا تیری زیبائی کا

کچھ میری بے خودی سے تمہارا زیاں نہیں
تم جاننا کہ بزم میں ایک خستہ جاں نہ تھا
رونا یہ ہے کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یاں
طعن رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

دل سے خیال دوست بھلایا نہ جائے گا
سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا
تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے جو چھپایا نہ جائے گا
مقصود اپنا کچھ نہ کھلا لیکن اس قدر
یعنی وہ ڈھونڈتے ہیں کہ پایا نہ جائے گا

بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں، جانتے ہیں وہ　　ہم وہ نہیں کہ ہم کو منایا نہ جائے گا
مئے تند و ظرف حوصلہ اہلِ بزمِ تنگ　　ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائے گا

دکھانا پڑے گا مجھے زخم دل　　اگر تیر اس کا خطا ہو گیا
سبب ہو نہ ہو لب پہ آنا ضرور　　مرا شُکر تیرا گِلہ ہو گیا
وہ اُمید کیا جس کی ہو انتہا　　وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا
نہیں بھولتا اُس کی رخصت کا وقت　　وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا
ٹپکتا ہے اشعارِ حالی سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

رُخِ جہاں سوز تیرا دیکھا نظارہ افروز جس چمن میں
نہ بلبل و گل میں واں تعلق نہ سرو قمری میں پیار دیکھا

اب محو بوئے گل پہ ہوا کب دل حزیں　　ہم کو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا
ہر سمت گرد نالہ لیلا بلند ہے　　پہونچے جو حوصلہ ہو کسی شہسوار کا

اسی میں ہے خیر حضرت دل کہ یار بھولا ہوا ہے ہم کو
کرے وہ یاد اس کی بھول کر بھی کبھی تمنا نہ کیجئے گا
لگاؤ تم میں نہ لاگ زاہد نہ درد اُلفت کی آگ زاہد
پھر اور کیا کیجئے گا آخر جو ترک دنیا نہ کیجئے گا

ہوئے تم نہ سیدھے جوانی میں حالی　　مگر اب مری جان ہونا پڑے گا

دل میں باقی ہے وہی حرص گناہ　　پھر کئے سے اپنے ہم پچھتائیں کیا
دل کو سب باتوں کی ہے ناصح خبر　　سمجھے سمجھانے کو اب سمجھائیں کیا

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بہ خود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت　　پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت
ہم نہ کہتے تھے کہ حالی چپ رہو　　راست گوئی میں ہے رسوائی بہت

کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل　　کل نہ پہچان سکے گی گُلِ تر کی صورت
ہے غم روز جدائی نہ نشاط شب وصل　　ہو گئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت
اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار　　اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت
آن کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

آیا نہ ہوگا اُس کو تغافل میں کچھ مزا　　ذوقِ نگاہ ہم نے جتایا نہیں ہنوز
یاں دے چکی جواب امیدِ جوابِ خط　　واں نامہ بر نے بار بھی پایا نہیں ہنوز

آگے بڑھے نہ قصہ عشق بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کُھلے رازداں سے ہم
اب بھاگتے ہیں سایہ عشقِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم
اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کے طرز بیاں سے ہم

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں
یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اُس کو ہم سے ربط مگر اسقدر کہاں
اک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذّت زخم جگر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دعا ترک عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں
حالی نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقت صبح رہے رات بھر کہاں

کچھ ہنسی کھیل سنبھلنا غمِ ہجراں میں نہیں
چاک دل میں ہے مرے جو کہ گریباں میں نہیں
کھو دیا یاس نے ذوقِ خلشِ فکرِ وصال
اک مزا تھا سو وہ اب کاوشِ پنہاں میں نہیں
یاں بھی ہے کون و مکاں سے دلِ وحشی آزاد
جسکو ہم قید سمجھتے ہیں وہ زنداں میں نہیں
کس طرح اُس کی لگاوٹ کو بناوٹ سمجھوں
خط میں لکّھا ہے وہ القاب جو عنواں میں نہیں
دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھ
ایسے اُلجھاؤ تری کاکلِ پیچاں میں نہیں
بے قراری تھی سب اُمیدِ ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں
حالئی زار کو کہتے ہیں کہ ہے شاہد باز
یہ تو آثار کچھ اُس مردِ مسلماں میں نہیں

رنج کیا کیا ہیں ایک جان کے ساتھ
زندگی موت ہے حیات نہیں

کچھ پتا منزلِ مقصود کا پایا ہم نے
جب یہ جانا کہ ہمیں طاقت رفتار نہیں
بات جو دل میں چھپائے نہیں بنتی حالی
سخت مشکل ہے کہ وہ قابل اظہار نہیں

دھوم تھی اپنی پارسائی کی
کی بھی اور کس سے آشنائی کی

منہ کہاں تک چھپاؤ گے ہم سے
تم کو عادت ہے خود نمائی کی

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت
ہم کو طاقت نہیں جدائی کی

نہ ملا کوئی غارتِ ایماں
رہ گئی شرم پارسائی کی

موت کی طرح جس سے ڈرتے تھے
ساعت آ پہونچی اُس جدائی کی

یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

یا کھینچ لائے دیر سے رندوں کو اہلِ وعظ
یا آپ بھی ملازم پیر مغاں رہے

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

کر دیا خوگرِ جفا تو نے
خوب ڈالی تھی ابتدا تو نے

دُور ہو اے دل مآل اندیش
کھو دیا عمر کا مزا تو نے

رہروِ تشنہ لب نہ گھبرانا
اب لیا چشمۂ بقا تو نے

خوش ہے اُمیدِ خلد پر حالی
کوئی پوچھے کہ کیا کیا تو نے

حق وفا کا جو ہم جتانے لگے
آپ کچھ کہہ کے مسکرانے لگے

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

وھاں پرسش نہ یاں تابِ سخن ہے
محبت ہے کہ دل میں موجزن ہے

بہت لگتا ہے دل صحبت میں اُسکی
وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے

تقاضائے محبت ہے وگرنہ
مجھے اور جھوٹ کا تم پر گماں ہو

منظومات

انتخاب برکھا رت

گرمی سے تڑپ رہے تھے جاندار   اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار
بھوبل سے سوا تھا ریگ صحرا   اور کھول رہا تھا آبِ دریا
تھی لوُٹ سی پڑ رہی چمن میں   اور آگ سی لگ رہی تھی بن میں

رستوں میں سوار اور پیدل   سب دھوپ کے ہاتھ سے تھے بے کل
گھوڑوں کے نہ آگے اُٹھتے تھے پاؤں   ملتی تھی کہیں جو رُوکھ کی چھاؤں
تھی سب کی نگاہ سوئے افلاک   پانی کی جگہ برستی تھی آگ
پنکھے سے نکلتی جو ہوا تھی   وہ بادِ سموم سے سوا تھی

بازار پڑے تھے سارے سنسان   آتی تھی نظر نہ شکل انسان
چلتی تھی دوکان جن کی دن رات   بیٹھے تھے وہ ہاتھ پر دھرے ہات
خلقت کا ہجوم کچھ اگر تھا   یا پیاؤ پہ یا سبیل پر تھا
بچوں کا ہُوا تھا حال بے حال   کملائے ہوئے تھے پھول سے گال
آنکھوں میں تھا انکا پیاس سے دم   تھے پانی کو دیکھ کرتے مم مم
ہر بار پکارتے تھے ماں کو   ہونٹوں پہ تھے پھیرتے زباں کو
پانی دیا گر کسی نے لا کر   پھر چھوڑتے تھے نہ منہ لگا کر

کل شام تلک تو تھے یہی طور   پر رات سے ہے سماں ہی کچھ اور
برسات کا بج رہا ہے ڈنکا   اک شور ہے آسماں پہ برپا
ہے ابر کی فوج آگے آگے   اور پیچھے ہیں دَل کے دَل ہوا کے
ہیں رنگ برنگ کے رسالے   گورے ہیں کہیں، کہیں ہیں کالے
ہے چرخ پہ چھاؤنی سی چھاتی   اک آتی ہے فوج، اک ہے جاتی
جاتے ہیں مہم پہ کوئی جانے   ہمراہ ہیں لاکھ توپ خانے
توپوں کی ہے جبکہ باڑ چلتی   چھاتی ہے زمین کی دہلتی

پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار
دولہا سے بنے ہوئے ہیں اشجار
پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل
ہے گونج رہا تمام جنگل
کرتے ہیں پپیہے پیہو، پیہو،
اور مور چنگھاڑتے ہیں ہر سو،
کوئل کی ہے کوک جی لبھاتی
گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی
جاتا ہے کوئی ملار گاتا
ہے دیس میں کوئی گنگناتا
بھنگی ہیں نشے میں گاتے پھرتے
اور بانسریاں بجاتے پھرتے
سرون کوئی گا رہا ہے بیٹھا
چھیڑا ہے کسی نے ہیر رانجھا

کھم باغوں میں جابجا گڑے ہیں
جھولے ہیں کہ سُو بہ سُو پڑے ہیں
کچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کم سن
جن کے ہیں یہ کھیل کُود کے دن
ہیں پھول رہی خوشی سے ساری
اور جھول رہی ہیں باری باری
جب گیت ہیں ساری مل کے گاتی
جنگل کو ہیں سر پہ وہ اٹھاتی
اک سب کو کھڑی جھلا رہی ہے
اک گرنے سے خوف کھا رہی ہے
ہے ان میں کوئی ملار گاتی
اور دوسری پینگ ہے چڑھاتی
گاتی ہے کبھی کوئی ہنڈولا
کہتی ہے کوئی "بدیسی ڈھولا"
اک جھولے سے وہ گری ہے جاکر
سب ہنستی ہیں قہقہے لگا کر

انتخاب حُبِ وطن

اے سپہر بریں کے سیّارو
اے فضائے زمیں کے گلزارو
اے پہاڑوں کی دلفریب فضا
اے لبِ جُو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے عنادل کے نغمۂ سحری
اے شب ماھتاب تاروں بھری
اے نسیمِ بہار کے جھوکو
دھرِ نا پائیدار کے دھوکو
تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز
تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز
جب وطن میں ہمارا تھا رہنا
تم سے دل باغ باغ تھا اپنا
تم سے مٹتا تھا رنج تنہائی
تم سے پاتا تھا دل شکیبائی
آن اک اک تمہاری بھاتی تھی
جو ادا تھی وہ دل لبھاتی تھی

اے وطن اے میرے بہشتِ بریں   کیا ہوئے تیرے آسماں و زمیں
رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا   وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا
تیری دوری ہے موردِ آلام   تیرے چھُٹنے سے چھٹ گیا آرام
کاٹے کھاتا ہے باغ بِن تیرے   گل ہیں نظروں میں داغ بِن تیرے
مٹ گیا نقش کامرانی کا   تجھ سے تھا لطف زندگانی کا
جو کہ رہتے ہیں تجھ سے دور سدا   اُن کو کیا ہوگا زندگی کا مزا
ہو گیا یاں تو دو ہی دن میں یہ حال   تجھ بن ایک ایک دن ہے اک اک سال

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو !   اٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو !
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ   ورنہ کھاؤ پیو ' چلے جاؤ
جب کوئی زندگی کا لطف اٹھاؤ   دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ
پہنو جب کوئی عمدہ تم پوشاک   کرو دامن سے تا گریباں چاک
کھانا کھاؤ تو جی میں شرماؤ   ٹھنڈا پانی پیو تو اشک بہاؤ
کتنے بھائی تمہارے ہیں نادار   زندگی سے ہے جن کا دل بے زار

جاگنے والو غافلوں کو جگاؤ   تیرنے والو ڈوبتوں کو بچاؤ
ہیں ملے تم کو چشم و گوش اگر   پوچھ لیجائے کور و کر کی خبر ؟
تم اگر ہاتھ پاؤں رکھتے ہو   لنگڑے لولوں کو کچھ سہارا دو

ہو مسلماں اس میں یا ہندو   بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برھمو
جعفری ہووے یا کہ ہو حنفی   جین مت ہووے یا ہو بیشنووی
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو   سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ملک ہیں اتفاق سے آزاد   شہر ہیں اتفاق سے آباد

قوم پر کرتے ہو اگر احسان   تو دکھاؤ کچھ اپنا جوش یہاں
کچھ دنوں عیش میں خلل ڈالو   پیٹ میں جو ہے سب اگل ڈالو
علم کو کر دو کُو بہ کُو ارزاں   ہند کو کر دکھاؤ انگلستاں

قوم کی عزت اب ہنر سے ہے علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے
کوئی دن میں وہ دور آئیگا بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا
نہ رہیں گے سدا یہی دن رات یاد رکھنا ہماری آج کی بات
گر نہیں سنتے قول حالی کا
پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

انتخاب چُپ کی دَاد

اے ماؤ ! بہنو ! بیٹیو ! دنیا کی عزت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمہیں قوموں کی عزت تم سے ہے
تم گھر کی ہو شہزادیاں شہروں کی ہو آبادیاں
غمگیں دلوں کی شادیاں دُکھ سُکھ میں راحت تم سے ہے
تم ہو تو غربت ہے وطن ' تم بن ہے ویرانہ چمن
ہو دیس یا پردیس جینے کی حلاوت تم سے ہے
نیکی کی تم تصویر ہو عفت کی تم تدبیر ہو
ہو دین کی تم پاسباں ' ایماں سلامت تم سے ہے
فطرت تمہاری ہے حیا ' طینت میں ہے مہرو وفا
گُھٹی میں ہے صبر و رضا انساں عبارت تم سے ہے

میکے میں سارے گھر کی تھیں گو مالک و مختار تم
پر سارے کنبے کی رہیں ' بچپن سے خدمتگار تم
ماں باپ کے حکموں پہ پتلی کی طرح پھرتی رہیں
غم خوار باپوں کی رہیں ' ماؤں کی تابعدار تم
دن بھر پکانا ' ریندھنا ' سینا پرونا ' ٹانکنا
بیٹھیں نہ گھر پر باپ کے خالی کبھی زنہار تم
راتوں کو چھوٹے بھائی بہنوں کی خبر اٹھ اٹھ کے لی
بچہ کوئی سوتے میں رویا اور ہوئیں بیدار تم

سسرال میں پہونچیں تو واں اک دوسرا دیکھا جہاں
جا اتریں گویا دیس سے پردیس میں اک بار تم
واں فکر تھی ہر دم یہی ناخوش نہ ہو تم سے کوئی
اپنے سے رنجش کے کبھی پاؤ نہ واں آثار تم
بدلے نہ شوہر کی نظر سسرے کا دل میلا نہ ہو
آنکھوں میں ساس اور نند کی کھٹکو نہ مثل خار تم
پالا بروں سے گر پڑے بد خُو ہوں سب چھوٹے بڑے
چتون پہ میل آنے نہ دو گو دل میں ہو بیزار تم
غم کو غلط کرتی رہو سسرال میں ہنس بول کر
شربت کے گھونٹوں کی طرح پیتی رہو خونِ جگر
افسوس ! دنیا میں بہت تم پر ہوئے جور و جفا
حق تلفیاں تم نے سہیں بے مہریاں جھیلیں سدا
اکثر تمہارے قتل پر باندھی ہے قوموں نے کمر
دیں تاکہ تم کو یک قلم خود لوحِ ہستی سے مٹا
گاڑی گئیں تم مدتوں مٹی میں جیتی جاگتی
حامی تمہارا تھا نہ یاور کوئی جُز ذاتِ خدا
زندہ سدا جلتی رہیں تم مردہ خاوندوں کے ساتھ
اور چین سے ظالم رہا یہ سب تماشے دیکھتا
بیاهی گئیں اُس وقت تم جب بیاہ سے واقف نہ تھیں
جو عمر بھر کا عہد تھا وہ کچے دھاگے سے بندھا
بیاها تمہیں ماں باپ نے اے بے زبانو ! اس طرح
جیسے کسی تقصیر پر مجرم کو دیتے ہیں سزا
گزری اُمید و بیم میں جب تک رہا باقی سہاگ
بیوہ ہوئیں تو عمر بھر پھر چین قسمت میں نہ تھا
تم سخت سے سخت امتحاں دیتی رہیں پر رائگاں
کیں تم نے جانیں تک فدا ، کہلائیں لیکن بے وفا
گو صبر کا اپنے نہ کچھ تم کو ملا انعام یاں
پر جو فرشتے سے نہ ہو وہ کر گئیں تم کام یاں

کی تم نے اس دارالمحن میں جس تحمل سے گزر
زیبا ہے گر کہئے تمہیں فخرِ بنی نوعِ بشر

تم نے تو چین اپنے خریداروں سے بھی پایا نہ کچھ
شوھر ھوں اس میں یا پدر یا ھو برادر یا پسر
گو نیک مرد اکثر تمھارے نام کے عاشق رھے
پر نیک ھوں یا بد رھے سب متفق اس رائے پر
جب تک جیو تم علم و دانش سے رھو محروم یاں
آئی ھو جیسی بے خبر' ویسی ھی جاؤ بے خبر
تم اس طرح مجھول اور گمنام دنیا میں رھو
ھو تم کو دنیا کی نہ دنیا کو تمھاری ھو خبر
جو علم مردوں کے لئے سمجھا گیا آب حیات
ٹھہرا تمھارے حق میں وہ زھرِ ھلاھل سر بسر
آتا ھے وقت انصاف کا نزدیک ھے یوم الحساب
دنیا کو دینا ھوگا ان حق تلفیوں کا واں جواب

انتخاب مسدس حالی

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا غریبوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ
خطاکار سے در گُزر کرنے والا بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا قبائل کا شِیر و شکر کرنے والا
اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
مِسِ خام کو جس نے کندن بنایا کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جھل چھایا پلٹ دی بس اک آن میں اُسکی کایا
رھا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رخ ھوا کا

کڑک تھی وہ بجلی کی یا صوتِ ہاوی عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگا دی اک آواز میں سوتی بستی جگا دی

پڑا ہر طرف غل یہ پیغام حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نام حق سے

سبق پھر شریعت کا ان کو پڑھایا حقیقت کا گُر ان کو اک اک بتایا
زمانے کے بگڑے ہوؤں کو بنایا بہت دن کے سوتے ہوؤں کو جگایا

کُھلے تھے نہ جو راز اب تک جہاں پر
وہ دکھلا دئے ایک پردہ اٹھا کر

شریفوں کی اولاد بے تربیت ہے تبہ انکی حالت بری انکی گت ہے
کسی کو کبوتر اڑانے کی لت ہے کسی کو بٹیریں لڑانے کی دھت ہے

چرس اور گانجے پہ شیدا ہے کوئی
مدک اور چنڈو کا رسیا ہے کوئی

سدا گرم انفار سے ان کی صحبت ہر اک رند اوباش سے انکی ملت
پڑھے لکھوں کے سایہ سے انکو وحشت مدارس سے' تعلیم سے ان کو نفرت

کمینوں کے جرگے میں عمریں گنوانی
انہیں گالیاں دینی اور آپ کھانی

نہ علمی مدارس میں ہیں ان کو پاتے نہ شائستہ جلسوں میں ہیں آتے جاتے
یہ میلوں کی رونق ہیں جا کر بڑھاتے پڑے پھرتے ہیں دیکھتے اور دکھاتے

کتاب اور معلّم سے پھرتے ہیں بھاگے
مگر ناچ گانے میں ہیں سب سے آگے

اگر کیجئے ان پاک شہدوں کی گنتی ہوا جن کے پہلو سے بچ کر ہے چلتی
ملی خاک میں جن سے عزت بڑوں کی مٹی خاندانوں کی جن سے بزرگی

تو یہ جس قدر خانہ برباد ہوں گے
وہ سب ان شریفوں کی اولاد ہوں گے

ہوئی اُن کی بچپن میں یوں پاسبانی کہ قیدی کی جیسے کٹے زندگانی
لگی ہونے جب کچھ سمجھ بوجھ سیانی چڑھی بھوت کی طرح سر پر جوانی

بس اب گھر میں دشوار تھمنا ہے ان کا
اکھاڑوں میں تکیوں میں رہنا ہے اُن کا

نشے میں مئے عشق کے چور ہیں وہ صفِ فوجِ مژگاں میں محصور ہیں وہ
غم چشم و ابرو میں رنجور ہیں وہ بہت ہاتھ سے دل کے مجبور ہیں وہ

کریں کیا کہ ہے عشق طینت میں اُن کی
حرارت بھری ہے طبیعت میں اُن کی

اگر شش جہت میں کوئی دلربا ہے تو دل اُن کا نادیدہ اُس پر فدا ہے
اگر خواب میں کچھ نظر آ گیا ہے تو یاد اُسکی دن رات نامِ خدا ہے

بھری سب کی وحشت سے رُو داد ہے یاں
جسے دیکھئے قیس و فرہاد ہے یاں

اگر ماں ہے دُکھیا تو اُن کی بلا سے اپاھج ہے باوا تو اُن کی بلا سے
جو ہے گھر میں فاقہ تو اُن کی بلا سے جو مرتا ہے کنبہ تو اُن کی بلا سے

جنھوں نے لگا لی ہو لَو دلربا سے
غرض پھر اُنہیں کیا رہی ماسوا سے

وہ اسلام کی پود شاید یہی ہے ؟ کہ جسکی طرف آنکھ سب کی لگی ہے
بہت جس سے آئندہ چشم بہی ہے بقا منحصر جس پہ اسلام کی ہے

یہی جان ڈالے گی باغِ کُہن میں
اس سے بہار آئے گی اس چمن میں

یہی ہیں وہ نسلیں مبارک ہماری ؟ کہ بخشیں گی جو دین کو اُستواری ؟
کریں گی یہی قوم کی غم گساری ؟ انہیں پر اُمیدیں ہیں موقوف ساری ؟

یہی شمع اسلام روشن کریں گی ؟
بڑوں کا یہی نام روشن کریں گی ؟

انتخاب دھلی کی آخری دھوم

(مرثیہ حکیم محمود خاں مرحوم)

اے جہان آباد اے اسلام کے دارالعلوم
اے کہ تھی علم و ہنر کی تیرے اک عالم میں دھوم
تھے ہنر ور تجھ میں اتنے، جتنے گردوں پر نجوم
تھا افاضہ تیرا جاری ہند سے تا شام و روم
زیب دیتا تھا لقب تجھ کو جہان آباد کا
نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا

تیری طینت میں ودیعت تھا مذاقِ علمِ دین
جیسے اُمی تجھ میں تھے عالم نہ تھے ایسے کہیں
ہند میں جو تھا محدّث تھا وہ تیرا خوشہ چین
تھی محدّث خیز اے پا تخت تیری سر زمیں
تھا تفقہ بھی مسلّم تیری خاک پاک کا
بیہقّی وقت تھا ایک اک فقیہہ اس خاک کا

شاذ و نادر تھا تصوّف میں کوئی تیرا نظیر
آب و گلِ کا تیری تھا گویا تصوف سے خمیر
تیرے کھنڈروں میں پڑے سوتے ھیں وہ ماہ منیر
تھا کبھی انوار سے جنکے زمانہ مستنیر
آج جس دولت کا بازارِ جہاں میں کال ھے
تیرا قبرستان اس دولت سے مالا مال ھے

طب میں گو یونانیوں کا سب سے آگے تھا قدم
آنکر اس نے لیا تھا دوسرا تجھ میں جنم
جب کہ تو آباد تھا دنیا میں اے باغِ اِرم
بھرتے تھے تیرے اطبّا بھی مسیحائی کا دم

ہند میں جاری تجھی سے طب یونانی ہوئی
شہر شہر اس جنس کی یاں تجھ سے ارزانی ہوئی
خاک سے اٹھے ہیں تیری جیسے جیسے نکتہ ور
اک جہاں شیوہ بیانی سے ہے انکی با خبر
راس تھی آب و ہوا تیری سخن کو جس قدر
سرو کو ہوگی نہ راس اتنی ہوائے غاتفر[1]
حسنِ صورت میں اگر ضرب المثل نوشاد[2] تھا
حسنِ معنی تیرا حصہ اے جہان آباد تھا

جا چکی تھی تجھ سے گو اے شہر عظمت قوم کی
ہو چکی تھی آبرو مدت سے رخصت قوم کی
پر کچھ اک محمود خاں کے دم سے تھی پت قوم کی
اٹھ گیا وہ بھی جہاں سے آہ ! قسمت قوم کی
کیا دکھا کر اب دلائے گا سلف کو یاد تو
ناز اب کس پر کرے گا اے جہان آباد تو

تجھ میں ہے دلّی ! کوئی اب ایسا مقبولِ جہاں ؟
نازشِ دارالخلافت مرجعِ ہندوستاں
ہند سے لے تا عرب ، کشمیر سے لے تا انڈماں
بچے بچے کی زباں پر نام ہے جسکا رواں
نیم جانوں کا مسیحا اور غریبوں کا طبیب
خود حکیموں کا معالج اور طبیبوں کا طبیب

ہے کوئی اب تجھ میں ہیرو ایسا یکتائے زماں
واقعاتِ زندگی کر دیجئے گر اس کے بیاں
سمجھیں اک افسانہ ناواقف آسے اور داستاں
ہے تعجّب خیز الحق سیرتِ محمود خاں
یا وہ اک جوہر الگ تھا جوہرِ انسان سے
یا نکلتے اب نہیں ایسے جواہر کان سے

---

1 - غاتفر سمرقند کے قریب ایک قطعہ زمین ہےجہاں کا سرو خوبی و زیبائی میں ضرب المثل ہے

2 - نوشاد اور فلخ دو شہر قدیم ترکستان میں تھےجو حسن خیزی میں مشہور تھے ۔

مولانا شبلی نعمانی

مولانا شبلی نعمانی

محمد شبلی نام ۔ شبلی تخلص ۱۸۵۷ء میں موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے ۔ شبلی کے والد مولوی شیخ حبیب اللہ صاحب اعظم گڑھ میں وکالت کرتے تھے اور اُن کا شمار بڑے معزز کھاتے پیتے لوگوں میں ہوتا تھا ۔ یہی وجہ تھی کہ شبلی کو اپنے دیگر ادبی معاصرین کے برعکس بڑے اطمینان و یکسوئی کے ساتھ تعلیم جاری رکھنے کے مواقع ملے ۔ مولانا شبلی کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی ۔ جہاں اُنہوں نے فارسی و عربی کی ابتدائی کتابیں مولوی شکر اللہ نامی ایک بزرگ سے پڑھیں ۔ پھر اپنے وقت کے مشہور مولوی محمد فاروق صاحب چڑیا کوٹی سے عربی کی منتہی کتابیں پڑھیں ۔ اس کے بعد رام پور کے معروف علماء مولوی عبدالحق خیر آبادی اور مولوی ارشاد حسین سے اُنہوں نے کلام و حدیث کی تحصیل کی ۔ ان تعلیمی مراحل سے گزرنے کے بعد وہ علوم معقول و منقول کی سیر حاصل تحصیل کے لئے سہارنپور ' لکھنؤ اور لاہور وغیرہ مقامات کی سیاحت کرتے رہے ۔ لیکن ۱۸۷۶ء میں جبکہ ان کی عمر اُنیس سال کی تھی ' اور پورے طور پر فارغ بھی نہ ہونے پائے تھے کہ اُن کے دل میں ارض مقدس کی زیارت کا شوق پیدا ہوا اور حج کرنے چلے گئے ۔

حج سے واپس آنے کے بعد گھر والوں کو فکر ہوئی کہ وہ کوئی دنیاوی کام بھی کریں چنانچہ زمینداری کا کام آپ کے کاندھوں پر رکھ دیا گیا مگر مولانا اس بے کیف شغل سے عہدہ برآ نہ ہو سکے آخر رفقا کے اصرار پر وکالت کا امتحان پاس کر کے اعظم گڑھ میں وکالت شروع کر دی ۔ لیکن چند ہی ماہ گزرنے کے بعد یہ پیشہ اپنی اُفتاد طبع کے خلاف پایا اور اسے ترک کر کے امین دیوانی کی سرکاری ملازمت اختیار کی ۔ کچھ دنوں بعد مولانا شبلی کی حوصلہ مند طبیعت یہاں بھی گھبرائی اور علم و ادب کے ذوق نے اپنی طرف ایسا کھینچا کہ وہ مستعفی ہو کر گھر بیٹھ رہے اور دن رات علمی مشاغل میں گزارنے لگے ۔ ۱۸۸۲ء کا سال مولانا موصوف کی زندگی میں بہت ہی مبارک سال تھا جب وہ اپنے بھائی مہدی علی سے جو اُس زمانے میں علی گڑھ کالج میں تعلیم پا رہے تھے ملنے علی گڑھ گئے ۔ یہاں مولوی سمیع اللہ صاحب کے توسط سے اُن کی ملاقات سر سید مرحوم سے ہوئی جنہوں نے اُنہیں فارسی کی پروفیسری عطا فرمائی ۔ اور وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے ۔

علی گڑھ کی فضا شبلی کی علمی نشو و نما میں بڑی مفید ثابت ہوئی ۔ اور انہوں نے سر سید کے تقرب سے سب سے بڑا فائدہ یہ اٹھایا کہ ان کا سارا کتب خانہ کھنگال ڈالا ۔ جس سے ان کی علمی لیاقت و وسعت نظر میں بڑا اضافہ ہوا ۔ اس کے علاوہ سر سید ھی کے طفیل نہ صرف حالی و آرنلڈ جیسے اہل علم حضرات سے ان کی شناسائی ہوئی بلکہ بڑے گہرے روابط ہو گئے ۔ اور ان دونوں قابل قدر ہستیوں نے شبلی پر اپنے گہرے اثرات چھوڑے ۔ حالی کے تاثر نے شبلی کی فطری شاعرانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر انہیں اپنی جدید شاعری و قومی پیغام کا ہمنوا اور پروفیسر آرنلڈ نے انہیں انگریزی اور فرانسیسی زبانوں سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ جدید طرز تحقیق و تنقید کا شیدائی بنا دیا ۔ ۱۸۹۲ء میں انہوں نے آرنلڈ کے ساتھ ممالک اسلامیہ کا سفر کیا تاکہ کچھ کتابوں کی تصنیف کے لئے ضروری مواد اکٹھا کیا جائے ۔ اس سفر کے مشاہدات انہوں نے ایک کتاب کی صورت میں پیش بھی کر دئے ۔

۱۸۹۸ء میں سر سید کے انتقال کے بعد یہ صحبتیں ختم ہو گئیں اور وہ کالج سے قطع تعلق کر کے گھر چلے آئے تا کہ ہمہ تن علمی کاموں میں مصروف ہوں مگر مولوی سید علی بگرامی کے اصرار پر حیدرآباد جانا پڑا جہاں دائرۃ المعارف کی نظامت ان کے سپرد ہوئی ۔ چار سال تک یہ خدمت انجام دیتے رہے اسی دوران میں انہوں نے اپنی قابل قدر تصنیف ''الغزالی'' ''سوانح رومی'' ''علم الکلام'' ''الکلام'' اور ''موازنہ انیس و دبیر'' تصنیف کر کے شائع کیں ۔

ندوۃ العلماء کا مدرسہ ۱۸۹۴ء میں قائم ہو چکا تھا اور شبلی کو ایک گونہ سکون ہو چلا تھا کہ وہ اس طرح سے جدید طریقہ تعلیم کی اصلاح کر سکیں گے ۔ چنانچہ انہوں نے اس ادارہ کے بنیادی مقاصد میں نصاب تعلیم کی اصلاح ' علوم دین کی ترقی ' علماء کے باہمی نزاع کے انسداد ' عام مسلمانوں کی بہبودی وغیرہ کو شامل کیا ۔ مولوی محمد علی کانپوری اس کی روح رواں تھے لیکن ان کے استعفیٰ دینے پر جب مدرسہ کی حالت ابتر ہونے لگی تو مولانا شبلی حیدرآباد سے مستعفی ہو کر لکھنؤ پہنچے اور دارالعلوم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔ ۱۹۱۳ء تک یہ خدمت بحسن و خوبی سر انجام دیتے رہے مگر حاسدین کی رخنہ اندازیوں سے بد دل ہو کر آخر سبکدوش ہو گئے اور اپنے وطن اعظم گڑھ میں ''دارالمصنفین'' کی بنیاد ڈالی ۔ جسکا مقصد یہ تھا کہ عمدہ مصنفوں کی ایک جماعت تیار کی جائے ۔

اب وہ وقت آ چکا تھا جب شبلی نہ صرف ہندوستان میں ایک عالم و فاضل انسان گردانے جا رہے تھے بلکہ بیرونی ممالک بھی ان کی علمی خدمات کا اعتراف کر رہے تھے ۔ ۱۸۹۲ء میں سلطان ٹرکی نے انہیں ''تمغہ مجیدی'' عنایت فرمایا اور ۱۸۹۴ء میں انہیں سرکار انگریزی کی طرف سے ''شمس العلما'' کا خطاب ملا ۔ اس زمانے میں نظام دکن نے ان کے لئے سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کیا جو ۱۹۱۲ء میں تین سو روپیہ ہو گیا ۔

مولانا شبلی لکھنؤ سے اعظم گڑھ جانے کے بعد علمی مشاغل میں مصروف ہو گئے سب سے آخری اور اہم تصنیف ''سیرۃ النبی'' ان کے زیر تالیف تھی اور ابھی پہلی جلد

بھی تمام نہ ہوئی تھی کہ پندرہ روز کی علالت کے بعد ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو علم و ادب کے اس محسن نے وفات پائی ۔

مولانا شبلی ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے اُن کے علمی کارنامے بڑے مختلف النوع قسم کے ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا موصوف اپنی نثری کاوشوں میں بہت زیادہ مصروف رہے اور اُنہیں کی بدولت تاریخ و تنقید کے میدان میں اُن کا نام آب زر سے لکھا جاتا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اُن کی مختصر مگر وقیع اُردو شاعری کو نظر انداز کر دیا جائے ۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ علی گڑھ کی اصلاحی تحریکات میں بے انتہا مصروف رہے اور اپنی تمام قابلیتوں کے باوجود اُردو شاعری کی طرف زیادہ توجہ نہ دے سکے ۔ ورنہ اُن کی فطری شاعرانہ صلاحیت ' عربی و فارسی شاعری پر گہری نظر ' جدید انگریزی ادب سے آگاھی ' اور فلسفیانہ نکتہ آفرینی ایسی امتیازی خصوصیات تھیں جو اُنہیں اپنے معاصر شعرا آزاد و حالی سے کہیں زیادہ بہتر و برتر شاعر بنانے میں ضرور کامیاب کر دیتیں ۔ باایں ہمہ شبلی نے فارسی کے علاوہ اُردو شاعری میں جو اپنا ایک مختصر مجموعہ کلام چھوڑا ہے وہ دو باتوں کی وجہ سے بہت ہی قابل قدر ہے ۔ اول یہ کہ شبلی نے بھی اپنی شاعری کے ذریعہ حالی کی اصلاحی تحریکات میں بڑی شدومد کے ساتھ ھاتھ بٹایا ہے گویا نصب العین کے اعتبار سے حالی و شبلی کی شاعری ایک ہے ۔ دوسرے مولانا حالی کی منظومات کے قنوطی انداز کے برعکس شبلی کی منظومات میں ایک رجائی کیفیت کارفرما ہے اور ساتھ ھی سنجیدہ غورو فکر کے لئے بھی اُن میں بہت سے خیالات ملتے ہیں ۔

شبلی ابتدائی دور شاعری میں علی گڑھ کی اصلاحی تحریکات میں سرسید کی معاونت اور حالی کی ھمنوائی کرتے رہے ۔ حالی نے مسدس کی شکل میں مسلمانوں کے تنزل کا مرثیہ لکھا اور شبلی نے حالی کی اس سوز خوانی میں شرکت کی مگر اس دور میں بھی اُن کے کلام میں فنی پختگی ' بلند خیالی اور روانی و صفائی سے قطع نظر اُنکے تیور ' لب و لہجہ اور حقائق کے استدلال میں مولانا حالی کے مقابلے میں نمایاں فرق رہا ۔ چنانچہ حالی اپنے مسدس نیز دوسری معرکہ آرا نظموں میں مسلمانوں کے زوال و ادبار کا باعث اُنکی مادی زندگی کی پستی بتاتے رہے ۔ مگر شبلی نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے اسکی اصل وجہ مذہبی اصول اور روایات قومی سے انحراف بتایا ۔ چنانچہ ایک موقع پر کہتے ہیں ۔

ان حقائق کی بناء پر سبب پستئی قوم   ترک پابندئی اسلام ہے اسلام نہیں

اور یہی وجہ ہے کہ قوم پرستی کا جو تصور شبلی نے پیش کیا اسی کو اکبر و اقبال نے صحیح مانا اور اُسی پر عمل کیا ۔ مولانا کے اس دور کے معروف کارنامے مثنوی ''صبح اُمید'' اور اُن کی مشہور نظم ''مسلمانونکی گزشتہ تعلیم'' ہیں جنکی بدولت اُنہیں جدید شاعری کے بانیوں میں ایک قابل قدر جگہ ملی ۔

شبلی کی شاعری کا دوسرا دور وہ ہے جس میں وہ علی گڑھ کی تحریکات سے الگ ہو کر جدید طریقہ تعلیم کی اصلاح و سیاسیات حاضرہ کی طرف متوجہ ہوئے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ علی گڑھ کی تحریک کے زیر اثر قوم میں جو ایک نئی زندگی پیدا ہو رہی تھی

ایک طرف اس کے معترف تھے اور دوسری طرف آن کی دور بینی انہیں بتا رہی تھی کہ تقلید مغرب کے نتائج بہت ہی خطرناک ہونگے اور مسلمانوں کی آئندہ نسلیں دینی خیالات و قومی روایات سے یکسر نابلد ہو جائینگی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی بہت سی نظموں میں اپنے ان خیالات کو بڑی خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے ۔ سیاسی اعتبار سے وہ حصول آزادی کے مقابلے میں ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آن کے بعض معاصرین نے انہیں علیگڑھ تحریک کا مخالف قرار دیا اور سرسید کے سیاسی نکتہ نظر کا بھی دشمن گردانا ۔ لیکن ان اختلافات کے باوجود شبلی اپنی جگہ پر پورے اعتماد کے ساتھ ڈٹے رہے ۔ آن کے اس دور کی شاعری خیالات کے عمق اور اسلوب بیان کی پختگی و روانی کے باعث ایک امتیازی شان رکھتی ہے ۔ آن کے کلام میں بلا کا جوش و خروش ہے لیکن لہجہ میں بڑی متانت و سنجیدگی ہے ۔

بحیثیت مجموعی مولانا شبلی اپنے ہم عصروں میں کم عمر ہونے کے باوجود شاعرانہ اعتبار سے بہت ہی کامیاب شاعر تھے ۔ آن کا رنگ سخن نہایت پختہ و رواں اور خیالات بہت پاکیزہ تھے ۔ انہوں نے حالی کے اصلاحی پروگرام میں ایک سرگرم کا رکن کی حیثیت سے کام کر کے تحریک کے مقاصد کو بہت فروغ دیا آن کی سیاسی ' قومی اور اسلامی نظمیں دلکش ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی سنجیدہ و پرمغز ہیں ۔

انتخاب کلام

انتخاب مثنوی صبح امید

کیا یاد نہیں ہمیں وہ ایام — جب قوم تھی مبتلائے آلام
وہ قوم کہ جان تھی جہاں کی — جو تاج تھی فرقِ آسماں کی
گُل کر دئے تھے چراغ جس نے — قیصر کو دئے تھے داغ جس نے
وہ نیزۂ خوں فشاں کہ چل کر — ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر
روما کے دھوئیں آڑا دئے تھے — اٹلی کو کوئیں جھکا دئے تھے

جس چشمہ سے اک جہاں تھا سیراب — وہ سوکھ کے ہو رہا تھا بے آب
ہستی نے دبا لیا فلک کو — خورشید ترس گیا چمک کو
اب خضر کو گمرہی کا ڈر ہے — عیسیٰ کو تلاشِ چارہ گر ہے

جو ابر ابھی برس گیا ہے   اک بوند کو اب ترس گیا ہے
کس نیند میں سو گئیں تھیں آنکھیں   بیکار سی ہو گئی تھی آنکھیں
بیکار تھا بے نظام تھا دل   پہلو میں برائے نام تھا دل

ماتم تھا یہی کہ آئی ناگاہ   اک سمت سے اک صدائے جانکاہ
اس شان سے تھی وہ آہ دلگیر   پہلو میں اثر، بغل میں تاثیر
ڈوبی ہمہ تن جو تھی اثر میں   نشتر سی اتر گئی جگر میں
جس سمت سے آئی تھی وہ آواز   وہ جلوہ نمائے سحر و اعجاز
جنبش جو ہوئی رگ اثر کو   دل تھام کے سب بڑھے ادھر کو
دیکھا جو وہاں بجاہ و تمکیں   آیا نظر اک پیرِ دیریں
صورت سے عیاں جلال شاہی   چہرے پہ فروغِ صبح گاہی
وہ ریشِ دراز کی سپیدی   چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں اک ذرا خم   توقیر کی صورتِ مجسم
وہ ملک پہ جان دینے والا   وہ قوم کی ناؤ کھینے والا
اٹھتے ہوئے جوش سے بہ رقّت   ہے مرثیہ خوان قوم و ملّت

وہ کشتۂ قوم وہ فدائی   اٹھا لئے کاسۂ گدائی
ایک ایک سے عرض حال کرتا   در در وہ پھرا سوال کرتا
ہر بزم، ہر انجمن میں پہونچا   ہر باغ میں ہر چمن میں پہونچا
کاوش سے غرض تھی کچھ نہ کد سے   ملتا تھا ہر ایک نیک و بد سے
مردانِ خدا پرست سے بھی   رندانِ سیاہ مست سے بھی
گزرا وہ ہر ایک راہ گزر پر   دی اس نے صدا ہر ایک در پر
کس بزم میں یہ فغاں نہ پہنچی ؟   آہ اس کی کہاں کہاں نہ پہنچی ؟

اے مدّعیانِ حبِ اسلام !   حجروں میں تو اب کرو نہ آرام
انداز عرب اگر ہے خُو میں !   باقی ہے وہ جوش اگر لہو میں !
موقع ہے یہی ہنر دکھاؤ !   جو کہتے تھے آج کر دکھاؤ

کر دو جو گزشتہ کی تلافی !
ثابت ہو زمانے پر کہ اب بھی !
گو دَورِ فلک ہوا دگر گوں
پھر بھی تو رگوں میں ہے وہی خون
اسلاف کے وہ اثر ہیں اب بھی
اس راکھ میں کچھ شرر ہیں اب بھی
اس حال میں بھی روش وہی ہے
دن ڈھل بھی گیا طپش وہی ہے
اس جام میں ہے شراب باقی !
اب تک ہے گہر میں آب باقی
گو خوار ہیں طرز و خُو وہی ہے
مرجھا گئے پھول بُو وہی ہے

شہر آشوب اسلام

(ہنگامہ طرابلس و بلقان)

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اُٹھے گا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دئے پرزے
فضائے آسمانی میں اُڑینگی دھجیاں کب تک
مراکش جا چکا ، فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ سخت جاں کب تک
یہ سیلابِ بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اُسے روکے گا مظلوموںکی آہوںکا دھواں کب تک
یہ سب ہیں رقصِ بسمل کا تماشا دیکھنے والے
یہ سیر انکو دکھائیگا شہیدِ نیم جاں کب تک

یہ وہ ہیں ، نالۂ مظلوم کی لَے جن کو بھاتی ہے
یہ راگ انکو سنائیگا یتیمِ ناتواں کب تک

کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے اُستادو
یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک

یہ جوش انگیزئی طوفانِ بیداد و بلا تا کے
یہ لطف اندوزئی ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک
یہ مانا تمکو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک
نگارستانِ خوں کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی
تو ہم دکھلائیں تم کو زخمہائے خونچکاں کب تک
یہ مانا گرمئی محفل کے ساماں چاھئیں تم کو
دکھائیں ہم تمہیں ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک
یہ مانا قصّہ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے
سنائیں تم کو اپنے دردِ دل کی داستاں کب تک
یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کب تک
عروسِ بخت کی خاطر تمہیں درکار ہے افشاں
ہمارے ذرّہ ھائے خاک ہونگے زرفشاں کب تک
کہاں تک لوگے ہم سے انتقامِ فتح ایّوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک
سمجھ کر یہ کہ دھندے سے نشانِ رفتگاں ہم ہیں
مٹاؤ گے ہمارا اسطرح نام و نشاں کب تک

زوالِ دولتِ عثماں ، زوالِ شرع و ملّت ہے
عزیز و فکر فرزند و عیال و خان ماں کب تک
خدا را تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں ؟
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھو گے تم یہ چیستاں کب تک

پرستارانِ خاکِ کعبہ دنیا سے اگر اٹھے
تو یہ پھر احترامِ سجدہ گاہِ قدسیاں کب تک
جو گونج اٹھے گا عالم شورِ ناقوسِ کلیسا سے

تو پھر یہ نغمۂ توحید گلبانگِ اذاں کب تک
بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراقِ اسلامی
چلیں گی تند بادِ کفر کی یہ آندھیاں کب تک
کہیں اڑ کر یہ دامانِ حرم کو بھی نہ چھو آئے
غبارِ کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک
حرم کی سمت بھی صیدافگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کے آشیاں کب تک
جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کدھر جائیں
کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کب تک

جزر و مد

الہلال کا لب و لہجہ

دیکھ کر حریتِ فکر کا یہ دورِ جدید
سوچتا ہوں کہ یہ آئینِ خرد ہے کہ نہیں؟
رہنماؤں کی یہ تحقیر، یہ اندازِ کلام
اس میں کچھ شائبۂ رشک و حسد ہے کہ نہیں؟
اعتراضات کا انبار جو آتا ہے نظر
اس میں کچھ قابلِ تسلیم و سند ہے کہ نہیں؟
نکتہ چینی کا یہ انداز، یہ آئینِ سخن
بزمِ تہذیب میں مستوجبِ رَد ہے کہ نہیں؟
جس نئی راہ میں ہیں بادیہ پیما یہ لوگ
کوئی اس جادۂ مشکل کا بلد ہے کہ نہیں؟
شاعروں نے جو نئی آج بچھائی ہے بساط

اس میں آن پر بھی کہیں سے کوئی زد ہے کہ نہیں ؟
پہلے گر شانِ غلامی تھی تو اب خیرہ سری
اس دوراہے میں کوئی بیچ کی حد ہے کہ نہیں ؟
فیصلہ کرنے سے پہلے میں ذرا دیکھ تو لوں
''جزر'' جیسا تھا' اسی زور کا ''مد'' ہے کہ نہیں؟

کفرانِ نعمت

(منکرِ مے بودن و همرنگِ مستاں زیستن)

معترض ہیں مجھ پہ میرے مہربانانِ قدیم
جرم یہ ہے میں نے کیوں چھوڑا وہ آئینِ کہن ؟

میں نے کیوں لکھے مضامین سیاست پے بہ پے
کیوں نہ کی تقلید ' طرز رہنمایانِ زمن ؟
'' کانگرس '' سے کوئی اظہارِ برأت کیوں نہیں
کیوں حقوقِ ملک میں ہوں ہندوؤں کا ہم سخن ؟

خیر ! میں تو شامتِ اعمال سے جو ہوں سو ہوں
آپ تو فرمائیے کیوں آپ نے بدلا چلن ؟
آپ نے شملہ میں جا کر کی تھی جو کچھ گفتگو
ماحصل اسکا فقط یہ تھا پس از تمہیدِ فن
سعئی بازو سے ملیں جب ہندوؤں کو کچھ حقوق
اس میں کچھ حصہ ملے ہم کو بھی بہرِ '' پنجتن ''
یعنی جا کر شیر جب جنگل سے کر لائے شکار
لومڑی پہونچے کہ کچھ مجھکو بھی اے سرکارِ من

لیکن اب تو آپ کی بھی کُھلتی جاتی ہے زباں
آپ بھی اب تو اڑاتے ہیں وہی طرزِ سخن
اب تو ''مسلم لیگ'' کے بھی خواب آتے ہیں نظر
اب تو ہے کچھ اور طرزِ نغمۂ مرغِ چمن
ملک پر اپنی حکومت چاہتے ہیں آپ بھی
تھا یہی تو منتہائے فکر ' یارانِ وطن

آپ نے بھی اب تو نصب العین رکھّا ہے وہی
''کانگرس'' کا ابتدا سے ہے جو موضوعِ سخن

آپ بھی تو جادۂ '' سیّد '' سے اب ہیں منحرف
اب تو اوراقِ وفا پر آپ کے بھی ہے شکن

جب یہ حالت ہے تو پھر ہم پر ہے کیوں چشمِ عتاب
'' مُنکر مَے بودن و همرنگِ مستاں زیستن ''

''سر سیّد کی سیاسی بلاغت کا آمد و آورد''

کوئی پوچھے تو میں کہہ دوں گا ہزاروں میں یہ بات
روشِ سید مرحوم خوشامد تو نہ تھی
ہاں مگر یہ ہے کہ تحریک سیاسی کے خلاف
اُن کی جو بات تھی آورد تھی آمد تو نہ تھی

''قال کے بجائے حال درکار ہے''

لیگ والوں سے کہا میں نے کہ باتیں کب تک ؟
یہ تو کہئے کہ عمل کی بھی بناء ڈالی ہے ؟
ایک صاحب نے کہا آپ نہ گھبرائیں ابھی
''حال'' بھی آئیگا اب تک تو یہ ''قوّالی'' ہے''

عدل جہانگیری

قصرِ شاہی میں کہ ممکن نہیں غیروں کا گذر
ایک دن نور جہاں بام پہ تھی جلوہ فگن
کوئی شامت زدہ راہگیر اُدھر آ نکلا
گرچہ تھی قصر میں ہر چار طرف سے قدغن
غیرتِ حسن سے بیگم نے طمنچہ مارا
خاک پر ڈھیر تھا اک کشتۂ بے گور و کفن

ساتھ ہی شاہِ جہانگیر کو پہنچی جو خبر
غیظ میں آ گئے ابروئے عدالت پہ شکن
حکم بھیجا کہ کنیزانِ شبستانِ شہی
جا کے پوچھ آئیں کہ سچ یا کہ غلط ہے یہ سخن

نخوت حسن سے بیگم نے بصد ناز کہا
میری جانب سے کرو عرض بآئینِ حسن
ہاں مجھے واقعۂ قتل سے انکار نہیں
مجھ سے ناموسِ حیا نے یہ کہا تھا کہ بزن
اُس کی گستاخ نگاہی نے کیا اس کو ہلاک
کشورِ حسن میں جاری ہے یہی شرعِ کہن

مفتیٔ دیں سے جہانگیر نے فتویٰ پوچھا
کہ شریعت میں کسی کو نہیں کچھ جائے سخن
مفتیٔ دیں نے یہ بے خوف و خطر صاف کہا
شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اُڑا دو گردن
لوگ دربار میں اس حکم سے تھرّا اٹھے
پر جہانگیر کے ابرو پہ نہ بل تھا نہ شکن
ترکنوں کو یہ دیا حکم کہ اندر جا کر
پہلے بیگم کو کریں بستۂ زنجیر و رسن

پھر اسی طرح اسے کھینچ کے باہر لائیں
اور جلّاد کو دیں حکم کہ ہاں تیغ بزن
یہ وہی نور جہاں ہے کہ حقیقت میں یہی
تھی جہانگیر کے پردے میں شہنشاہِ زمن
اس کی پیشانئی نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ
جا کے بن جاتی تھی اوراقِ حکومت پہ شکن
اب نہ وہ نورجہاں ہے نہ وہ اندازِ غرور
نہ وہ غمزے ہیں نہ وہ عربدۂ صبر شکن
ایک مجرم ہے کہ جس کا کوئی حامی نہ شفیع
ایک بیکس ہے کہ جس کا نہ کوئی گھر نہ وطن
خدمتِ شاہ میں بیگم نے یہ بھیجا پیغام
خُوں بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امرِ حسن
مفتئ شرع سے پھر شاہ نے فتویٰ پوچھا
بولے جائز ہے رضامند ہوں گر بچہ و زن
وارثوں کو جو دئے لاکھ درھم بیگم نے
سب نے دربار میں کی عرض کہ اے شاہِ زمن
ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص
قتل کا حکم جو رک جائے تو ہے مستحسن

ہو چکا جبکہ شہنشاہ کو پورا یہ یقیں
کہ نہیں اس میں کوئی شائبہ حیلہ و فن
اٹھ کے دربار سے آہستہ چلا سُوئے حرم
تھی جہاں نور جہاں معتکف بیتِ حزن
دفعتاً پاؤں پہ بیگم کے گرا اور کہا
''تو اگر کشتہ شدی آہچہ می کردم من''

محمد اسماعیل میرٹھی

محمد اسماعیل نام ۔ اسماعیل تخلص ۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے ۔ اور روش زمانہ کے مطابق عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ لیکن خانگی حالات کے پیش نظر انہیں بہت جلد تلاش معاش کے لئے تگ و دو کرنی پڑی ۔ چنانچہ سولہ سال کی عمر میں محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوگئے پہلے کچھ دن دفتر میں کام کرتے رہے پھر علمی قابلیت کی بدولت جلد ہی فارسی کے ہیڈ مولوی ہوگئے اور سہارن پور و میرٹھ کے اسکولوں میں یہ خدمت انجام دیتے رہے ۔ ۱۸۸۸ء میں سنٹرل نارمل اسکول آگرہ بھیج دئے گئے جہاں بارہ سال تک بحسن و خوبی کام انجام دینے کے بعد ۱۸۹۹ء میں پنشن لی اور اپنے وطن میرٹھ واپس آکر بقیہ عمر تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے ۔ سرکار انگریزی نے انہیں ادبی خدمات کے صلے میں ''خان صاحب'' کا خطاب بھی عنایت کیا تھا ۔ یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو مولوی صاحب نے انتقال فرمایا ۔

مولوی اسماعیل مولانا حالی سے سات آٹھ سال چھوٹے تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مولانا حالی کا عہد بخوبی دیکھا تھا ۔ اگرچہ وہ مجددین شاعری کے ساتھ اصلاحی تحریکوں میں شریک نہ ہو سکے تاہم حالی و شبلی کے انداز شاعری سے بے حد متاثر ہوئے ''قلعہ اکبر آباد'' ''قصیدۂ جریدہ عبرت'' ''مسلمان اور انگریزی تعلیم'' جیسی نظموں میں دونوں مصلحین شاعری کا رنگ صاف جھلکتا نظر آتا ہے ۔ ان کے علاوہ ان کی وہ نظمیں جو انگریزی نظموں کا ترجمہ ہیں براہ راست اس تحریک کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے اردو شاعری میں اولین نقش کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسماعیل کی ان نظموں کی تصنیف کا زمانہ بھی ۱۸۶۷ء کے قریب کا ہے جبکہ پنجاب میں آزاد و حالی کی اصلاحی کوششیں شروع ہوئی تھیں ۔

مولوی اسماعیل کا سب سے بڑا کارنامہ انکی وہ اردو ریڈریں ہیں جو انہوں نے بچوں کے لئے لکھیں ۔ اس میں شک نہیں کہ اس معاملہ میں مولانا آزاد کی نگارشات اولیت کا درجہ رکھتی ہیں تاہم مولوی اسماعیل نے جس انہماک اور بچوں کے صحیح نفسیاتی مطالعہ کے بعد یہ کتابیں لکھی تھیں وہ مولانا آزاد کو بھی نصیب نہ ہو سکا ۔ اور یہ حقیقت ہے کہ انھی ریڈروں کی بدولت انہیں شہرت نصیب ہوئی ۔ انکے نئے انداز نغمہ سرائی

سے نہ صرف آن کے مخاطب بچے متاثر ہوئے بلکہ پیران کہن سال کی نظریں بھی آن کی طرف آٹھنے لگیں ۔ اسماعیل کی ان نظموں میں بلا کی حسن کاری، سادگی اور تعلیمی خصوصیات موجود ہیں ۔ بلا شبہ آزاد و حالی نے مقامی رنگ کو اپنایا مگر اسماعیل نے اسے جتنا صاف ، واضح اور جاندار طریقے سے برتا ہے وہ آنہیں کا حصہ تھا ۔ اسماعیل کے کلام کی ایک بڑی خوبی آن کے موضوعات ہیں ۔ وہ اپنی نظموں کے لئے ہماری روزمرہ زندگی سے متعلق چیزوں کو منتخب کرتے ہیں لیکن ان پیش پا آفتادہ اور کم اہم موضوعات پر جس چابکدستی کے ساتھ اظہار خیال کرتے اور آنہیں دلکش و قابل توجہ بنا دیتے ہیں وہ ان کے علاوہ بہت کم لوگوں کے بس کی بات رہی ہے ۔

اسماعیل کی منظر نگاری بہت ہی قابل توجہ ہے ۔ ہمارے مراثی میں انیس و دبیر کی بلیغ منظر نگاری بہت معروف ہے مگر اس میں ایک عمومیت ضرور پائی جاتی ہے اس کے مقابلے میں اسماعیل کے یہاں شروع سے آخر تک سارے مناظر خالصتاً ہندوستان اور ہندوستان کے دیہاتی ماحول کے لئے مخصوص ہیں ۔ وہ زیادہ تفصیلات میں نہیں جاتے مگر حقیقت و کیفیت کو ہمیشہ مد نظر رکھتے ہیں جسکی وجہ سے آن کی منظرنگاری میں سادگی و خوبصورتی کے ساتھ ساتھ بڑی جاذبیت پائی جاتی ہے ۔ آن کی تشبیہات بڑی لطیف ہوتی ہیں جو آنکےطرز بیان کی سادگی، سلاست و روانی اور منظر کی دلاویزی میں مزید اضافہ کا کام کرتی ہے ۔ اسماعیل کا مشاہدہ اس قدر تیز اور مذاق اس درجہ نفیس ہے کہ وہ معمولی معمولی چیزوں کے مشاہدے کے بعد آن کے حسین پہلوؤں کا انتخاب کر لیتے ہیں اور منظوم صورت میں وہ جب ہمارے سامنے آتی ہیں تو انوکھی اور جاذب نظر معلوم ہونے لگتی ہیں ۔ غرض اسماعیل نے حالی کے رنگ سے فائدہ آٹھایا ہے لیکن آن کے طرز کی سادگی میں خارجی واقعات کا رنگ بھر کر ایک نئے انداز کی بنا ڈالی جو بالاخر انہی سے مخصوص ہو کر رہ گیا ۔

اسماعیل کا کلام قومی اصلاح سے بھی خالی نہیں آنکی اکثر نظموں میں اصلاحی رجحان کار فرما نظر آتا ہے ۔ وہ اتحاد و اتفاق کی تعلیم بھی دیتے ہیں اور مخاطبین کی عملی قوتوں کو بھی آکسانے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی ان پند و نصائح کو سوثر و کامیاب بنانے کے لئے شاندار ماضی کا مقابلہ حال کی پستی سے کر کے دکھاتے ہیں کبھی انگریزی فیشن کی کمزوریوں کو آجاگر کرتے اور کبھی کبھی دوسری سماجی کمزوریوں کی طرف لطیف اشارے کرتے ہیں اس میں شک نہیں کہ بعض جگہ جذبات کی فراوانی اور احساس کی شدت انہیں سخت گو بنا دیتی ہے لیکن حقائق و واقعات کا وہ ایسا صحیح نقشہ کھینچتے ہیں کہ پڑھنے والا بیان کی تلخی کے باوجود متاثر ضرور ہوتا ہے ۔ مثال کے طور پر آن کے قصیدہ ''جریدۂ عبرت'' کے چند شعر ملاحظہ ہوں جن میں وہ شعر و شاعری کا تذکرہ کرتے ہیں ۔

سخنورانِ زماں کی بھی ہے یہی حالت — کہ اس قدیم ڈگر کو نہ چھوڑئے زنہار

سوائے عشق نہیں سوجھتا انہیں مضمون — سو وہ بھی محض خیالی گھڑت کا اک طومار

نہ لکھتے ہیں کبھی نیرنگ حکمت و قدرت — نہ واقعات کے وہ کھینچتے ہیں نقش و نگار

ہے شاعری میں یہ پہلا اصولِ موضوعہ — کہ جھوٹ موٹ کے بن جائیں ایک عاشقِ زار

تمام اگلے زمانے کا ہے یہ پس خوردہ
کہ کر رہے ہیں جگالی وہ جسکی سو سو بار
وھی ہے شاعر غرا جو بے تکی ھانکے
یہی ہے شعر کا اس دور میں بڑا معیار
یہ آن کی طبع بلند اور معنی رنگیں
جو طبع گدھ ہے تو معنی سڑا ھوا مردار
نہ جس سے طبع کو تفریح ھو نہ دل کو خوشی
غزل ہے یا کوئی هذیانؔ ہے بوقتِ بخار

اسماعیل کے آخری دور کی شاعری میں تصوف کا رنگ زیادہ گہرا ھو گیا تھا آنہیں حضرت غوث علی شاہ پانی پتی سے بڑی عقیدت تھی ۔ انہی کے فیض صحبت کا نتیجہ صوفیانہ خیالات کی صورت میں جلوہ گر ھوا ۔ اور آنہوں نے اپنی اکثر غزلوں میں تصوف کے مسائل نظم کئے ۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی غزلوں میں عشقیہ مضامین نہیں پائے جاتے ۔ البتہ آن کی اس طرح کی غزلوں میں شوخی و تاثیر کی کمی ضرور محسوس ہوتی ہے ۔ لب و لہجہ کے اعتبار سے وہ غالب کے پیرو ھیں ۔ بلکہ غالب کی بہت سی غزلوں پر آنہوں نے غزلیں بھی کہی ھیں مگر ان میں وھی فرق ہے جو اصل و نقل میں ھوتا ہے ۔

بحیثیت مجموعی اسماعیل بڑے قادرالکلام شاعر تھےاور انہوں نے بہت سی اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی تھی چنانچہ آن کے کلیات میں غزل ' قصیدہ ' رباعی ' سلام ' مرثیہ وغیرہ سب کچھ ملتے ھیں مگر حقیقت یہ ہے کہ آن کا لازوال کارنامہ آنکی وھی چھوٹی چھوٹی نظمیں ھیں ۔ جن میں آنہوں نے خارجی واقعات کی بڑی دلکش مصوری کی ہے ۔ آنہوں نے اپنی انہی نیچرل نظموں کی وجہ سے جدید شاعری کے مصلحین میں جگہ پائی اور باوجودیکہ وہ آزاد ' حالی اور شبلی جیسے کارکنان کے ساتھ مل کر کام نہیں کر سکے لیکن آنہوں نے ان حضرات کے کام سے متاثر ھو کر خود بھی بڑی خاموشی کے ساتھ اسی ڈگر پر چلنا شروع کیا اور بلا شبہ نہایت ھی گراں قدر خدمت انجام دی ۔ ان کے کلام کی وقعت و مقبولیت کا اس سے بہتر ثبوت کیا ھو سکتا ہے کہ خود مولانا شبلی کا قول تھا کہ ''حالی کے بعد اگر کسی نے سننے کے لائق کچھ کہا ہے تو وہ مولوی اسماعیل میرٹھی ھیں'' ۔

انتخاب کلام

خدا کی صنعت

جو چیز خدا نے ہے بنائی
اس میں ظاہر ہے خوش نمائی
کیا خوب ہے رنگ ڈھنگ سب کا
چھوٹی بڑی جس قدر ھیں اشیاء
روشن چیزیں بنائیں اس نے
اچھی شکلیں دکھائیں اس نے
ھر چیز کی ہے ادا نرالی
حکمت سے نہیں ہے کوئی خالی

ہر چیز ہے ٹھیک ٹھیک لاریب   ہیں اُس کے تمام کام بے عیب
ننھی کلیاں چٹک رہی ہیں   چھوٹی چڑیاں پھدک رہی ہیں
اُس کی قدرت سے پھول مہکے   پھولوں پہ پرند آ کے چہکے
چڑیوں کے عجیب پر لگائے   اور پھول ہیں عطر میں بسائے
چڑیوں کی ہے بھانت بھانت آواز   پھولوں کا جدا جدا ہے انداز
محلوں میں امیر ہیں بہ آرام   ہے در پہ کھڑا غریب ناکام
ہے کوئی غنی تو کوئی محتاج   بے گھر ہے کوئی کسی کے گھر راج
روزی دونوں کو دی خدا نے   معمور ہیں قدرتی خزانے
تاروں بھری رات کیا بنائی !   دن کو بخشی عجب صفائی
موتی سے پڑے ہوئے ہیں لاکھوں   ہیرے سے جڑے ہوئے ہیں لاکھوں
کیا دودھ سی چاندنی ہے چھٹکی   حیراں ہو کر نگاہ ٹھٹکی
تارے رہے صبح تک نہ وہ چاند   آگے سورج کے ہو گئے ماند
نیلا نیلا اب آسماں ہے   وہ رات کی انجمن کہاں ہے
شام آئی تو اُس نے پردہ ڈالا   پھر صبح نے کر دیا اُجالا
جاڑا، گرمی، بہار، برسات   ہر رُت میں نیا سماں نئی بات
جاڑے سے بدن ہے تھرتھراتا   ہر شخص ہے دن میں دھوپ کھاتا
سردی سے ہیں دست و پا ٹھٹھرتے   سب لوگ الاؤ پر ہیں گرتے
سرسوں پھولی بسنت آئی   ہولی پھاگن میں رنگ لائی
پھوٹیں نئی کونپلیں شجر میں   اک جوش بھرا ہوا ہے سر میں
جاڑے کی جو رُت پلٹ گئی ہے   دن بڑھ گیا رات گھٹ گئی ہے
گرمی نے زمین کو تپایا   بھانے لگا ہر کسی کو سایہ
برسات میں دَل ہیں بادلوں کے   ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے
رو آئی ہے زور شور کرتی   دامانِ زمین کو کترتی
کس زور سے بہہ رہا ہے نالا   اونچے ٹیلے کو کاٹ ڈالا
بل کھا کے ندّی نکل گئی ہے   رخ اپنا اُدھر بدل گئی ہے
دریا ہے رواں پہاڑ کے پاس   بستی ہے بسی اُجاڑ کے پاس
بستی کے اِدھر اُدھر ہے جنگل   جنگل میں ہی ہو رہا ہے منگل
مٹی سے خدا نے باغ اُگائے   باغوں میں اُسی نے پھل لگائے
میوے سے لدی ہوئی ہے ڈالی   دانوں سے بھری ہوئی ہے بالی
سبزے سے ہرا بھرا ہے میداں   اونچے اونچے درخت ذیشاں

هم کھیلتے ھیں وھاں کبڈی
میری ھے کوئی، کوئی پھسڈی

گائیں بھینسیں عجب بنائیں
کیا دودھ کی ندیاں بہائیں

پیدا کئے اونٹ، بیل، گھوڑے
ہر شے کے بنا دئے ھیں جوڑے

روشن آنکھیں بنائیں دو دو
قدرت کی بہار دیکھنے کو

دو ھونٹ دئے کہ منہ سے بولیں
شکر اس کا کریں زباں کھولیں

ہر شے اس نے بنائی نادر
بے شک ھے خدا قوی و قادر

برسات

وہ دیکھو اٹھی کالی کالی گھٹا
ھے چاروں طرف چھانے والی گھٹا

گھٹا کے جو آنے کی آھٹ ھوئی
ھوا میں بھی اک سنسناھٹ ھوئی

گھٹا آن کر مینہ جو برسا گئی
تو بے جان مٹی میں جان آ گئی

زمیں سبزے سے لہلہانے لگی
کسانوں کی محنت ٹھکانے لگی

جڑی بوٹیاں پیڑ آئے نکل
عجب بیل پتے عجب پھول پھل

ہر اک پیڑ کا اک نیا ڈھنگ ھے
ہر اک پھول کا اک نیا رنگ ھے

یہ دو دن میں کیا ماجرا ھو گیا
کہ جنگل کا جنگل ھرا ھو گیا

جہاں کل تھا میدان چٹیل پڑا
وھاں آج ھے گھاس کا بَن کھڑا

ہزاروں پھدکنے لگے جانور
نکل آئے گویا کہ مٹی کے پر

شفق

شفق پھولنے کی بھی دیکھو بہار
ھوا میں کھلا ھے عجب لالہ زار

ھوئی شام بادل بدلتے ھیں رنگ
جنھیں دیکھ کر عقل ھوتی ھے دنگ

نیا رنگ ھے اور نیا رُوپ ھے
ہر اک روپ میں یہ وھی دھوپ ھے

طبیعت ھے بادل کی رنگت پہ لوٹ
سنہری لگائی ھے قدرت نے گوٹ

ذرا دیر میں رنگ بدلے کئی
بنفشی و نارنجی و چمپئی

یہ کیا بھید ہے کیا کرامات ہے ۔ ہر اک رنگ میں اک نئی بات ہے
یہ مغرب میں جو بادلوں کی ہے باڑ ۔ بنے سونے چاندی کے گویا پہاڑ
فلک نیلگوں اس میں سرخی کی لاگ ۔ ہرے بن میں گویا لگا دی ہے آگ
اب آثار ظاہر ہوئے رات کے
کہ پردے چھٹے لال بانات کے

قلعہ اکبر آباد

یا رب یہ کسی مشعلِ کشتہ کا دھواں ہے
یا گلشنِ برباد کی یہ فصلِ خزاں ہے
یا برھمئی بزم کی فریاد و فغاں ہے
یا قافلۂ رفتہ کا پس خیمہ رواں ہے
ہاں دورِ گزشتہ کی مہابت کا نشاں ہے
بانئی عمارت کا جلال اس سے عیاں ہے
اڑتا تھا یہاں پرچمِ جم جاہی اکبر
بجتا تھا یہاں کوسِ شہنشاہی اکبر

وہ قصرِ معلیٰ کہ جہاں عام تھا دربار
آئینہ نمط صاف ہیں جس کے در و دیوار
اور سقف زر اندود ہے مانندِ چمن زار
اور فرش ہے مرمر کا مگر چشمۂ انوار
اب بانگ نقیب اس میں نہ چاؤش کی للکار
سرھنگ کمر بستہ نہ وہ مجمعِ حضّار
کہتا ہے کبھی مرکز اقبال تھا میں بھی
ہاں قبلہ گہ عظمت و اجلال تھا میں بھی
وہ چتر وہ دیہیم وہ سامان کہاں ہیں
وہ شاہ وہ نوئین وہ خاقان کہاں ہیں

وہ بخشی و دستور وہ دیوان کہاں ہیں
خدّام ادب اور وہ دربان کہاں ہیں
وہ دولتِ مغلیہ کے ارکان کہاں ہیں
فیضی و ابوالفضل سے اعیان کہاں ہیں
ستسان ہے وہ شاہ نشیں آج صد افسوس
ہوتے تھے جہاں خان و خوانین زمیں بوس

وہ بارگہ خاص کی پاکیزہ عمارت
تاباں تھے جہاں نیّر شاہی و وزارت
بڑھتی تھی جہاں نظم و سیاست کی مہارت
آتی تھی جہاں فتح ممالک کی بشارت
جوں شحنۂ معزول پڑی ہے وہ آکارت
سیّاح کیا کرتے ہیں اب اس کی زیارت
کہتا ہے سخن فہم سے یوں کتبہ دروں کا
تھا مخزنِ اسرار یہی تاج وروں کا

ہاں کس لئے خاموش ہے او ! تختِ جگر ریش
کس غم میں سیہ پوش ہے؟ کیا سوگ ہے درپیش
کملی ہے ترے دوش پہ کیوں صورت درویش
جوگی ہے ترا پنتھ کہ صوفی ہے ترا کیش
بولا کہ زمانے نے دیا نوش کبھی نیش
صدیاں مجھے گزری ہیں یہاں تین کم و بیش
صدقے کبھی مجھ پر گہر و لعل ہوئے تھے
شاہانِ معظّم کے قدم میں نے چھوئے تھے

درشن کے جھروکے کی پڑی تھی یہیں بنیاد
ہوتی تھی تُلا دان میں کیا کیا دہش و داد
وہ عدل کی زنجیر ہوئی تھی یہیں ایجاد
جو سمع شہنشاہ میں پہنچاتی تھی فریاد

وہ نور جہاں اور جہاں گیر کی آفتاد
اس کاخِ ہمایوں کو بہ تفصیل ہے سب یاد
ہر چند کہ بیکار یہ تعمیر پڑی ہے
قدر اس کی مورّخ کی نگاہوں میں بڑی ہے

اب دیکھئے وہ مسجد و حمّام زنانہ
وہ نہر وہ حوض اور وہ پانی کا خزانہ
صنعت میں ہر اک چیز ہے یکتا و یگانہ
ہے طرزِ عمارت سے عیاں شان شہانہ
کیا ہو گئے وہ لوگ کہاں ہے وہ زمانہ
ہر سنگ کے لب پر ہے غم اندوز ترانہ
چغتائیہ گلزار کی یہ فصلِ خزاں ہے
ممتاز محل ہے نہ یہاں نور جہاں ہے

وہ دور ہے باقی نہ وہ ایام ولیالی
جو واقعہ حسّی تھا وہ ہے آج خیالی
ہر کوشک و ایوان ہر اک منزلِ عالی
عبرت سے ہے پُر اور مکینوں سے ہے خالی
آقا نہ خداوند، آہالی نہ موالی
جز ذات خدا کوئی نہ وارث ہے نہ والی
یہ جملہ محلات جو سنسان پڑے ہیں
پتھر کا کلیجہ کئے حیران کھڑے ہیں

اچھا زمانہ آنے والا ہے

تنے گا مسرت کا اب شامیانہ
بجے گا محبت کا نقّار خانہ
حمائت کا گائیں گے مل کر ترانہ
کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

نہ ہم روشنی دن کی دیکھیں گے لیکن چمک اپنی دکھلائیں گے بھلے دن
رُکے گا نہ عالم ترقی کئے بن کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

ہر ایک توپ سچ کی مددگار ہوگی خیالات کی تیز تلوار ہوگی
اسی پر فقط جیت اور ہار ہوگی کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

زبانِ قلم سیف پر ہوگی غالب دبیں گے نہ طاقت سے پھر حق کےطالب
کہ محکومِ حق ہوگا دنیا کا قالب کرو صبرو آتا ہے اچھا زمانہ

زمانہ نسب کو نہ پوچھے گا ہے کیا مگر وصفِ ذاتی کا ڈنکا بجے گا
اسی کو بڑا سب سے مانے گی دنیا کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

لڑائی کو آسان سمجھیں گے ڈائن تفاخر پہ ہوگی نہ قوموں میں اَن بَن
مشیخت کی خاطر اڑے گی نہ گردن کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

عقیدونکی مٹ جائے گی سب رقابت مذاہب کو ہوگی تعصب سے فرصت
مگر ان کی بڑھ جائے گی اور طاقت کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

کریں سب مدد ایک کی ایک مل کر یہی بات واجب ہے ہر مرد و زن پر
لگے ہاتھ سب کا تو اٹھ جائے چھپر کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

صبح کی آمد

خبر دن کے آنے کی میں لا رہی ہوں اجالا زمانے میں پھیلا رہی ہوں
بہار اپنی مشرق سے دکھلا رہی ہوں پکارے گلا صاف چِلاّ رہی ہوں
اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

میں سب کار ہموار کے ساتھ آئی میں رفتار و گفتار کے ساتھ آئی
میں باجوں کی جھنکار کے ساتھ آئی میں چڑیوں کی چہکار کے ساتھ آئی
اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

اذاں پر اذاں مرغ دینے لگا ہے خوشی سے ہر اک جانور بولتا ہے
درختوں کے اوپر عجب چہچہا ہے سہانا ہے وقت اور ٹھنڈی ہوا ہے
اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

یہ چڑیاں جو پیڑوں پہ ہیں غل مچاتی ادھر سے اُدھر اڑ کے ہیں آتی جاتی
دُموں کو ہلاتی پروں کو پھلاتی مری آمد آمد کے ہیں گیت گاتی
اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

جو طوطے نے باغوں میں ٹیں ٹیں مچائی تو بلبل بھی گلشن میں ہے چہچہائی
اور اونچی منڈیروں پہ شاما بھی گائی میں سو سو طرح دے رہی ہوں دہائی
اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

ہر اک باغ کو میں نے مہکا دیا ہے نسیم اور صبا کو بھی لہکا دیا ہے
چمن سرخ پھولوں سے دہکا دیا ہے مگر نیند نے تم کو بہکا دیا ہے
اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

ہوئی مجھ سے رونق پہاڑ اور بن میں ہر اک ملک میں دیس میں ہر وطن میں
کھلاتی ہوئی پھول آئی چمن میں بجھاتی ہوئی شمع کو انجمن میں
اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

جو اس وقت جنگل میں بوٹی جڑی ہے سو وہ نولکھا ہار پہنے کھڑی ہے
کہ پچھلے کی ٹھنڈک سے شبنم پڑی ہے عجب یہ سماں ہے عجب یہ گھڑی ہے
اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

ہرن چونک اٹھے چوکڑی بھر رہے ہیں کلیلیں ہرے کھیت میں کر رہے ہیں
ندی کے کنارے کھڑے چر رہے ہیں غرض میرے جلوے پہ سب مر رہے ہیں
اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

میں تاروں کی چھاں آن پہونچی یہاں تک زمیں سے ہے جلوہ مرا آسماں تک
مجھے پاؤ گے دیکھتے ہو جہاں تک کرو گے بھلا کاہلی تم کہاں تک
اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

پجاری کو مندر کے میں نے جگایا مؤذن کو مسجد کے میں نے اٹھایا
بھٹکتے مسافر کو رستہ بتایا اندھیرا گھٹایا - اجالا بڑھایا
اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

لدے قافلوں کے بھی منزل میں ڈیرے کسانوں کے ہل چل پڑے منہ اندھیرے

چلے جال کندھے پہ لے کے مچھیرے   دلدر ہوئے دُور آنے سے میرے
آٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

بگل اور طنبور، سنکھ اور نوبت   بجانے لگے اپنی اپنی سبھی گت
چلی توپ بھی دَن سے حضرت سلامت   نہیں خوب غفلت، نہیں خوب غفلت
آٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

لو ہوشیار ہو جاؤ اور آنکھ کھولو   نہ لو کروٹیں اب نہ بستر ٹٹولو
خدا کو کرو یاد اور منہ سے بولو   بس اب خیر سے آٹھ کے منہ ہاتھ دھو لو
آٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

بڑی دھوم سے آئی میری سواری   جہاں میں ہوا اب مرا حکم جاری
ستارے چھپے رات اندھیری سدھاری   دکھائی دئے باغ اور کھیت کیاری
آٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

میں پورب سے پچھم پہ کرتی ہوں دھاوا   زمیں کے کُرے پر لگاتی ہوں کاوا
میں طے کر کے آئی ہوں چین اور جاوا   نہیں کہتی تم سے کچھ اس کے علاوہ
آٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں

محنت سے راحت ہے

جو تو نے غفلت میں وقت کھویا، نہ کھیت جوتا نہ بیج بویا
تو ایسی ڈوبی ہوئی آسامی سے کوئی حاصل بٹائے گا کیا؟
رہے گا یہ کھیت ہاتھ اُس کے جو ہل سے کشتی لڑے گا دن بھر
جو ہار بیٹھے گا اپنی ہمت، تو وہ زمیں کو آٹھائے گا کیا؟
خوراک و پوشاک کے ذخیرے دبے پڑے ہیں زمیں کے اندر
جو کر کے محنت نہ کھودے گا، تو خاک پہنے گا، کھائے گا کیا؟

سب سے زیادہ بد نصیب کون ہے

اُس سے دنیا میں نہیں کوئی زیادہ بد بخت
جو نہ دانا ہو نہ داناؤں کا مانے کہنا
آج آفت سے بچی جان تو کل خیر نہیں
ایسے نادان کا مشکل ہے سلامت رہنا

اکبر الہ آبادی

لسان العصر سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی ، جدید اردو شاعری میں ایک فقیدالمثال شخصیت کے مالک ہیں ۔ انہوں نے اردو شاعری میں ایک ایسی نئی طرز کی بنا ڈالی جس کے موجد اور خاتم دونوں کا شرف خود انہی کو حاصل ہے ۔ ان کا کلام لفظی صنعت کا اعلیٰ نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان تمام ادبی و معاشرتی رجحانات کا حامل ہے جو ہندوستان میں مغرب کے اولین اثرات سے پیدا ہوئے ۔ اکبر نے اگرچہ حال کے واقعات اور تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے مگر در اصل وہ ماضی پرست تھے اور انہیں مشرقیت سے عشق تھا ۔ اردو شاعری میں ایک نظام زندگی سے اس طرح کا عشق رکھنے ، ایسی ہنسی ہنسنے والا اور ہنس ہنس کر دلوں میں چٹکیاں لینے والا کوئی دوسرا شاعر ڈھونڈھے سے نہیں ملتا ۔

اکبر ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء کو بمقام بارہ ضلع الہ آباد پیدا ہوئے ۔ ان کے مورث اعلیٰ سید علی عرب ۱۲۳۴ء میں نیشا پور (ایران) سے ہندوستان آئے تھے ۔ اکبر کے دادا سید فضل محمد نواب آصف‌الدولہ کے عہد کے ممتاز مذہبی علما میں شمار ہوتے تھے اور ان کے والد سید تفضل حسین رضوی ایک اچھے عالم ہونے کے علاوہ حضرت شاہ محمد قاسم دانا پوری کے ایسے عقیدت مند تھے کہ ان کے فیضان صحبت سے آخری عمر میں تارک دنیا ہوگئے ۔ یہی وجہ تھی کہ اکبر کا خاندان مرفہ‌الحال نہ تھا اور انہوں نے عربی ، فارسی اور ریاضی وغیرہ کی معمولی تعلیم مختلف مدارس میں حاصل کر کے چھوٹی عمر میں ہی ملازمت اختیار کر لی ۔

وہ سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے محکمہ تعمیرات میں ملازم ہوئے ۔ لیکن یہ کام انہیں پسند نہ آیا اور نوکری چھوڑ کر قانون پڑھنے لگے ۔ ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان پاس کیا اور ۱۸۶۹ء میں نائب تحصیلداری کے عہدے پر مامور ہوئے ۔ مگر اکبر اس سے بھی مطمئن نہ ہوئے اور ۱۸۷۲ء میں انہوں نے وکالت کے امتحان میں کامیابی حاصل کر کے وکالت کرنا شروع کر دی ۔ یہ سلسلہ ۱۸۸۰ء تک جاری رہا پھر سرکاری ملازمت کی طرف میلان طبع ہوا ۔ ۱۸۸۱ء میں انہیں منصفی کی خدمت مل گئی جس سے رفتہ رفتہ ترقی کر کے وہ ۱۸۹۴ء میں عدالت خفیفہ کے جج مقرر ہوئے ۔ چند سال اس عہدہ جلیلہ پر کام کر کے ۱۹۰۳ء میں ملازمت سے کنارہ کش ہوئے اور ہمہ تن علمی مشاغل میں مصروف ہو گئے ۔

اس طرح گویا اکبر نے ملازمت میں ابتدائی درجے سے ترقی کر کے خاصی عزت اور سماجی حیثیت حاصل کی ۔ وہ اُن خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جو ادب اور سوسائٹی کے اور حکومت و سیاست کی نکتہ چینی کے باوجود عوام اور حکومت دونوں کی نظروں میں قابل احترام رہے ہیں ۔ سرکاری اور علمی خدمات کے صلہ میں اُنہیں حکومت نے ''خان بہادر'' کا خطاب عطا فرمایا ۔ عرصہ تک الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی رہے۔ لیکن ان تمام کامیابیوں کے باوصف اکبر مرحوم کی زندگی کا آخری زمانہ بڑی دل شکستگی اور اندوہ کا زمانہ تھا ۔ اُن کی اھلیہ اور محبوب بیٹے ھاشم کی وفات نے اُن کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا اور وہ مستقلاً بیمار رہنے لگے آخر ۱۹۲۱ء میں ۷۲ سال کی عمر پا کر الہ آباد میں انتقال فرمایا ۔

اکبر کو شعر و سخن کا ذوق ابتدا ھی سے تھا اور وہ حضرت وحید الہ آبادی شاگرد خواجہ آتش لکھنوی سے مشورہ سخن کیا کرتے تھے ۔ یہ شاگردی اتفاق سے اکبر کے حق میں مفید بھی ثابت ہوئی اور مضر بھی ۔ مفید اس لحاظ سے کہ اُنہیں زبان، روزمرہ، محاورہ اور فن عروض میں مہارت حاصل ھو گئی اور مضر اس خیال سے کہ جوانی میں وحید جیسے رنگین مزاج اُستاد کی صحبت نے اُنہیں حسن پرست بنا دیا ۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ابتدائی کلام میں لکھنو کا تغزل ذرا شوخ اور جاندار نظر آتا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ رفتہ رفتہ اکبر کا یہ تقلیدی رنگ ختم ھو گیا اور اُن کی غزل اخلاق، معرفت، فلسفہ اور سیاسیات کے مسائل کی حامل ھوتی گئی ۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ غزل میں اکبر کو کوئی اجتہاد کا درجہ نہیں حاصل ھو سکا ۔ غزل گو شاعر کی حیثیت سے اُنہیں قبول عام کی سند کبھی نہ ملی ۔

اکبر کے کلام کی نمایاں خصوصیت ظرافت، بذلہ سنجی اور لطیف طنز ہے ۔ یوں تو اکبر فطری طور پر بڑے زندہ دل اور شوخ مزاج واقع ھوئے تھے لیکن ۱۸۷۷ء میں جب ایک طرف اودھ پنچ نکلا اور دوسری طرف سرسید کی تحریک نے مشرق و مغرب کو ملانا چاھا تو اُن کی شوخی اور زندہ دلی کو ایک موقعہ مل گیا۔ اور وہ مشرقی تہذیب و تمدن کی پاسداری میں سر سید سے بدظن اور اودھ پنچ نیز سر سید کے دوسرے مخالفوں سے زیادہ قریب ھو گئے ۔ اسی زمانے سے اکبر کی شاعری میں ظرافت کا رنگ نمایاں ھونے لگا اور بالآخر یہی ظرافت اُنکی شاعری کا طرہ امتیاز بنی ۔ اُنہوں نے مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید، غلامانہ ذہنیت، کاروباری نقطہ نظر اور قدیم تہذیبی سرمایہ سے بے تعلقی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ۔ اُنہوں نے گمراھوں کے دل و جگر میں چٹکیاں لیں اور اُنکی دکھتی ھوئی رگ کو نصیحت کے نشتر سے چھیڑا بھی ۔ مگر لطف کی بات یہ ھے کہ اپنی ظرافت کی رنگینی سے اُنہیں روٹھنے یا بگڑنے کے بجائے خفت آمیز ھنسی ھنسنے پر مجبور کر دیا ۔

غرض اکبر کی شاعری کا ایک خاص مقصد اور نصب العین تھا ۔ وہ چاھتے تھے کہ ھندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو مغرب کے اثرات سے محفوظ رکھ کر اُنہیں اپنے مذھب اور اپنی تہذیبی اور تمدنی روایات کا شیدائی بنایا جائے ۔ یہاں اس بات کا ضرور اعتراف کرنا پڑتا ھے کہ اکبر بے حد قدامت پرست واقع ھوئے تھے اور قدیم نظام تمدن میں وہ کسی طرح کی تبدیلی کے روا دار نہ تھے ۔ چنانچہ مشرقی تمدن سے محبت کرنے ھی کا

نتیجه تھا کہ انہوں نے اس کے بدلنے اور نئی وضع قطع اختیار کرنے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا ۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ایک گراں بہا خدمت ضرور انجام دی ۔ اور وہ یہ کہ انہوں نے قومی زندگی کے مضحکہ خیز پہلوؤں اور قومی فطرت کے مخالف عناصر پر دل کھول کر نکتہ چینی کی ۔

اکبر در اصل مغربی تعلیم کے مخالف نہیں تھے لیکن مغربی تعلیم کی وجہ سے نئی نسل میں قدیم علوم و فنون اور شائستگی سے جو بیزاری پیدا ہو چلی تھی اسکو وہ اطمینان کی نظر سے نہیں دیکھ سکتے تھے ۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ جدید تعلیم یافتہ گروہ کے خیالات، عادات اور اطوار ایک سطحی رنگ میں رنگے جا رہے ھیں اور وہ اپنے قابل احترام ماضی سے منہ موڑ کر مغربی تہذیب و شائستگی کی ذھنی غلامی قبول کرتے جا رہے ھیں ۔ یہ چیز اکبر جیسے قدامت پسند شاعر کے لئے انتہائی صبر آزما تھی چنانچہ انہوں نے ھماری ایسی کمزوریوں کا نہایت لطیف انداز میں خاکہ اڑانا شروع کر دیا تا کہ ھماری حس متاثر ھو اور سوسائٹی کی اصلاح ھو سکے ۔

جہاں تک اکبر کے اسلوب کا تعلق ھے ۔ وہ ان کی فکر سے علیحدہ نہیں ھے ۔ ان کے جذبات کی شدت، ان کی ماضی پرستی، ان کی پر خلوص سطحیت انہیں حالی اور اقبال کے حکیمانہ اسلوب کی طرف نہیں بلکہ اودھ پنچ کے مزاحیہ اور ظریفانہ انداز کی طرف لے گئی ۔ انہوں نے غزل میں تغزل کے بجائے ظرافت سے کام لیا ۔ ان کے قطعات، رباعیات اور فردیات میں ظرافت کی وجہ سے انگریزی الفاظ کا کافی استعمال ھے ۔ نئی اور انوکھی تشبیہات ھیں، محاوروں کا مخصوص استعمال ھے، لفظی صنعتیں ھیں، قافیوں کی بہار ھے ۔ پھر خاص خاص مطالب کو ادا کرنے کے لئے اکبر نے خاص خاص الفاظ اور علامتیں ایجاد کی ھیں مثلاً مس، شیخ، سید، اونٹ، گائے، گرجا، مندر، بت، کالج، برھمن، لالہ، بدھو، جمن، کلو، ٹٹو، ریل وغیرہ اور یہ عام چیزیں ادبی نقطۂ نظر سے اس لئے اھم ھیں کہ اکبر نے انہیں بڑی قدرت، چابکدستی اور ھوشیاری سے استعمال کیا ھے ان میں ایک سلیقہ اور نفاست بھی ھے اور خوبی و لطافت بھی ۔ پھر ان کے اسلوب کی یہ سب چیزیں اس لحاظ سے بھی اھم ھیں کہ ان کے اشعار میں زندگی کے مختلف پہلوؤں اور معاشرت کے مختلف گوشوں کی جو مصوری کی گئی ھے اس سے ادب اور سماج کا مورخ بہت کچھ حاصل کر سکتا ھے ۔ سرسید کی تحریک، خلافت، گاندھی، علی برادران یونیورسٹی کی تحریک، متوسط طبقے کی بدلتی ھوئی معاشرت، ھندی اردو کی کشمکش، مسجد و مندر کی آویزش، غرض اس دور کی نہ جانے کتنی تحریکات اور کتنے تہذیبی مسائل ھیں جن کی تصویریں ھمیں اکبر کے کلام میں ملتی ھیں ۔ لیکن ان تصویروں کو دلکش اور غیر فانی بنانے میں جو چیز سب سے زیادہ ممدو معاون ثابت ھوئی ھے وہ اکبر کا ظریفانہ اسلوب بیان ھے ۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ اکبر کا آرٹ در اصل الفاظ کے در و بست کا آرٹ ھے جیسا کہ وہ خود کہتے ھیں :-

اکبر کا قلم صنعت لفظی میں ھے کامل

"وہ اپنے کافیہ ھائے لطیف کی سب سے داد چاھتے ھیں اور بلاشبہ وہ اس کے مستحق بھی ھیں ۔ انہوں نے اپنے اسی آرٹ کا جادو جگا کر ھمارے ادب میں لطف و انبساط کے ایسے بیش بہا سرمائے کا اضافہ کیا ھے جس کا جواب کم از کم اب تک نظر نہیں آتا ۔ اس لحاظ سے ھم اکبر کی جتنی بھی قدر کریں کم ھے ۔

آردو شاعری کی تاریخ میں اکبر سے پہلے اور آن کے بعد بھی ظریف شاعر گزرے ھیں ۔ لیکن آن کے پیش روؤں میں سے اکثر شخص ھجویات کا شکار ھو کر رہ گئے ۔ معدودے چند شعرا جنھوں نے مزاح کے دلکش نمونے پیش کئے ھیں آن کا مزاحیہ سرمایہ اکبر کے مقابلہ میں بہت ھی مختصر ھے ۔ اب رھے وہ لوگ جو اکبر کے بعد آئے تو آن کے متعلق یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ھے کہ وہ اکبر ھی کے متبعین تھے جو اتفاق سے نقال ھی رھے ناقل بھی نہ بن سکے ۔ غرض اپنے مخصوص ظریفانہ رنگ میں اکبر شروع سے آخر تک اکبر ھی نظر آتے ھیں اور آن کے مزاح کا نصب العین اصلاح خیال اور تہذیب اخلاق ھونے کے باعث اگر آن کی شاعری ھر زمانہ میں مقبولیت حاصل کرے تو یہ کوئی عجیب بات نہ ھو گی ۔ اکبر مرحوم کے چار کلیات زیور طبع سے آراستہ ھو چکے ھیں ۔ ان میں سے دو آن کی حیات میں اور دو آن کی وفات کے بعد شائع ھوئے ۔

انتخاب کلام

سیّد سے آج حضرتِ واعظ نے یہ کہا
چرچا ھے جا بجا ترے حالِ تباہ کا
سمجھا ھے تو نے نیچر و تقدیر کو خدا
دل میں ذرا اثر نہ رہا لا الہ کا
ھے تجھ سے ترکِ صوم و صلوٰۃ و زکوٰۃ و حج
کچھ ڈر نہیں جناب رسالت پناہ کا
شیطان نے دکھا کے جمالِ عروسِ دھر
بندہ بنا دیا ھے تجھے حُبِ جاہ کا
اُس نے دیا جواب کہ مذھب ھو یا رواج
راحت میں جو مخل ھو وہ کانٹا ھے راہ کا
افسوس ھے کہ آپ ھیں دنیا سے بے خبر
کیا جانئے جو رنگ ھے شام و پگاہ کا
یورپ کا پیش آوے اگر آپ کو سفر
گزرے نظر سے حال رعایا و شاہ کا
وہ آب و تاب و شوکت ایوانِ خسروی
وہ محکموں کی شان وہ حلوہ سپاہ کا
آوے نظر علومِ جدیدہ کی روشنی
جس سے خجل ھو نورِ رُخِ مہر و ماہ کا

دعوت کسی امیر کے گھر میں ہو آپ کی
کمسن مسوں سے ذکر ہو اُلفت کی چاہ کا
نو خیز ، دلفریب ، گل اندام ،نازنیں
عارض پہ جن کے بار ہو دامن نگاہ کا
رُکئے اگر تو ھنس کے کہے ایک بُتِ حسیں
ویل مولوی یہ بات نہیں ہے گناہ کا
اُس وقت قبلہ جُھک کے کروں آپ کو سلام
پھر نام بھی حضور جو لیں خانقاہ کا
پتلون و کوٹ و بنگلہ و بسکٹ کی دُھن بندھے
سودا جناب کو بھی ہو ٹرکی کلاہ کا
ممبر پہ یوں تو بیٹھ کے گوشے میں اے جناب
سب جانتے ہیں وعظ ثواب و گناہ کا
۱۸۷۷ء

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر
مجھے تو اُن کی خوشحالی سے ہے یاس
یہ عاشق شاہدِ مقصود کے ہیں
نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس
سناؤں تم کو اک فرضی لطیفہ
کِیا ہے جس کو میں نے زیبِ قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے
کہ بیٹا تو اگر ایم اے کرے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے
بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی
کُجا عاشق کُجا کالج کی بکواس
کُجا یہ فطرتی جوشِ طبیعت
کُجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احسس
بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے
ھرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس
یہ اچھی قدردانی آپ نے کی
مجھے سمجھا ہے کوئی ھرچرن داس
دل اپنا خون کرنے کو ھوں موجود
نہیں منظور مغز سر کا آماس
یہی ٹھہری جو شرط وصل لیلیٰ
تو استعفیٰ مرا با حسرت و یاس
۱۸۹۵ء

مشرق گھر کی محبت کا مزا بھول گئے
کھا کے لندن کی ہوا عہدِ وفا بھول گئے

پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروا نہ رہی
کیک کو چکھ کے سوئیوں کا مزا بھول گئے

بُھوے ماں باپ کو اغیار کے چرچوں میں وہاں
سایہٗ کفر پہ انوارِ خدا بھول گئے

موم کی پتلیوں پر ایسی طبعیت پگھلی
چمنِ ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے

کیسے کیسے دلِ نازک کو دُکھایا تم نے
خبر فیصلہٗ روزِ جزا بھول گئے

بخل ہے اہلِ وطن سے جو وفا میں تم کو
کیا بزرگوں کی وہ سب جُود و عطا بھول گئے

نقلِ مغرب کی ترنگ آئی تمھارے دل میں
اور یہ نکتہ کہ مری اصل ہے کیا بھول گئے

کیا تعجب ہے جو لڑکوں نے بُھلایا گھر کو
جبکہ بوڑھے روشِ دینِ خدا بھول گئے

اک مسِ سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد
اس خطا پر سن رہا ہوں طعنہ ہائے دلخراش

کوئی کہتا ہے کہ بس اس نے بگاڑی نسلِ قوم
کوئی کہتا ہے کہ یہ ہے بد خصال و بدمعاش

دل میں کچھ انصاف کرتا ہی نہیں کوئی بزرگ
ہو کے اب مجبور خود اس راز کو کرتا ہوں فاش

ہوتی تھی تاکید لندن جاؤ انگریزی پڑھو
قوم انگلش سے ملو سیکھو وہی وضع و تراش

جگمگاتے ہوٹلوں کا جا کے نظارہ کرو
سوپ و کاری کے مزے لو چھوڑ کر یخنی و آش

لیڈیوں سے مل کے دیکھو اُن کے انداز و طریق
ہال میں ناچو، کلب میں جا کے کھیلو اُن سے تاش

بادۂ تہذیبِ یورپ کے چڑھاؤ خُم پہ خُم
ایشیا کے شیشہ تقوی کو کردو پاش پاش
جب عمل اس پر کیا پریوں کا سایہ ہو گیا
جس سے تھا دل کی حرارت کو سراسر انتعاش
سامنے تھیں لیڈیاں زہرہ وش و جادو نظر
یاں جوانی کی اُمنگ اور ان کو عاشق کی تلاش
اس کی چتون سحر آگیں ' اس کی باتیں دلربا
چال اس کی فتنہ خیز ' اس کی نگاہیں برق پاش
وہ فروغِ آتشِ رخ جس کے آگے آفتاب
اس طرح جیسے کہ پیش شمع پروانے کی لاش
جب یہ صورت تھی تو ممکن تھا کہ اک برق بلا
دست سیمیں کو بڑھاتی اور میں کہتا دور باش
دونوں جانب تھا رگوں میں جوشِ خونِ فتنہ زا
دل ہی تھا آخر نہیں تھی برف کی یہ کوئی قاش
بار بار آتا ہے اکبر میرے دل میں یہ خیال
حضرتِ سید سے جا کر عرض کرتا کوئی کاش
درمیان قعرِ دریا تختہ بندم کردۂ
بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

برقِ کلیسا

رات اس مِس سے کلیسا میں ہُوا میں دو چار
ہائے وہ حسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ ابھار
زلفِ پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مرید
قد رعنا میں وہ چم خم کہ قیامت بھی شہید
آنکھیں وہ فتنہ' دوراں کہ گنہگار کریں
گال وہ صُبح درخشاں کہ ملک پیار کریں

گرم تقریر جیسے سننے کو شُعلہ لپکے
دل کش آواز کہ سُن کر جیسے بلبل چہکے
دلکشی چال میں ایسی کہ ستارے رُک جائیں
سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جُھک جائیں

آتشِ حسن سے تقوے کو جلانے والی
بجلیاں لُطفِ تبسم سے گرانے والی
پہلوئے حسنِ بیاں شوخیٔ تقریر میں غرق
ٹرکی و مصر و فلسطین کے حالات میں برق

پس گیا لوٹ گیا دل میں سکت ھی نہ رھی
سر تھے تمکین کے جس گت میں وہ گت ھی نہ رھی
ضبط کے عزم کا اس وقت اثر کچھ نہ ھوا
یا حفیظؒ کا کیا وِرد مگر کچھ نہ ھوا

عرض کی میں نے کہ اے گلشنِ فطرت کی بہار
دولت و عزت و ایماں ترے قدموں پہ نثار
تُو اگر عہدِ وفا باندھ کے میری ھو جائے
ساری دنیا سے مرے قلب کو سیری ھو جائے

شوق کے جوش میں میں نے جو زباں یوں کھولی
ناز و انداز سے تیوری کو چڑھا کر بولی
غیر ممکن ھے مجھے اُنس مسلمانوں سے
بُوئے خوں آتی ھے اس قوم کے افسانوں سے

لن ترانی کی یہ لیتے ھیں نمازی بن کر
حملے سرحد پہ کیا کرتے ھیں غازی بن کر
کوئی بنتا ھے جو مہدی تو بگڑ جاتے ھیں
آگ میں کودتے ھیں، توپ سے لڑ جاتے ھیں

گل کھلائے کوئی میداں میں تو اِترا جائیں
پائیں سامانِ اقامت تو قیامت ڈھائیں
مطمئن ھو کوئی کیونکر کہ یہ ھیں نیک نہاد
ھے ھنوز انکی رگوں میں اثرِ حکمِ جہاد

دشمنِ صبر کی نظروں میں لگاوٹ پائی
کامیابی کی دل زار نے آھٹ پائی
عرض کی میں نے کہ اے لذتِ جاں راحتِ روح
اب زمانہ پہ نہیں ھے اثرِ آدم و نوح
شجرِ طور کا اس باغ میں پودا ھی نہیں
گیسوئے حور کا اس دور میں سودا ھی نہیں
اب کہاں ذھن میں باقی ھیں براق و رفرف
ٹکٹکی بندھ گئی ھے قوم کی انجن کی طرف
ھم میں باقی نہیں اب خالدِ جاں باز کا رنگ
دل پہ غالب ھے فقط حافظِ شیراز کا رنگ
یاں نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوش سپاہ
سب کے سب آپ ھی پر پڑھتے ھیں سبحان اللہ
جوھرِ تیغِ مجاھد ترے ابرو پہ نثار
نورِ ایماں کا ترے آئینۂ رُو پہ نثار
اٹھ گئی صفحۂ خاطر سے وہ بحث بد و نیک
دو دے ھو رھے ھیں کہتے ھیں اللہ کو ایک
موج کوثر کی کہاں اب ، ھے مرے باغ کے گردِ
میں تو تہذیب میں ھوں پیرِ مغاں کا شاگرد
مجھ پہ کچھ وجہ عتاب آپکو اے جان نہیں
نام ھی نام ھے ورنہ مَیں مسلمان نہیں
جب کہا صاف یہ میں نے کہ جو ھو صاحبِ فہم
تو نکالو دلِ نازک سے یہ شبہ اور یہ وھم
میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو
ھنس کے بولی کہ "تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو"

شُو میکری شروع جو کی اک عزیز نے — جو سلسلہ ملاتے تھے بہرام گور سے
بولا کہ بھائی تم تو تھے تلوار کے دھنی — مورث تمہارے آئے تھے غزنی و غور سے
کہنے لگے ھے اس میں بھی اک بات نوک کی — روٹی ھم اب کماتے ھیں جوتے کے زور سے

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں ‖ اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا ‖ کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو
بس خدا سمجھا ہے اُس نے برق کو اور بھاپ کو
برق گر جائے گی اک دن اور اُڑ جائے گی بھاپ
دیکھنا اکبر بچائے رکھنا اپنے آپ کو

ہوتی ہے نصیب تلخ کامی تم کو ‖ محسوس نہیں ہے اپنی خامی تم کو
اغیار بنا سکتے نہیں تم کو غلام ‖ ہے اپنے ہی نفس کی غلامی تم کو

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے ‖ بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی ‖ یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

جب نکیرین آئے مری قبر میں بہرِ سوال
میں نے یہ چاہا کہ لکھوا دوں انہیں سب اپنا حال
ہاتھ پاکٹ میں جو ڈالا مجھ کو حیرت ہو گئی
یعنی تھی جو نوٹ بک وہ اس سفر میں کھو گئی
کہدیا میں نے کہ میں اب ہر طرح معذور ہوں
رہ گئی دنیا میں میری نوٹ بک مجبور ہوں

قوم کے دل میں کھوٹ ہے پیدا ‖ اچھے اچھے ہیں ووٹ کے شیدا
کیوں نہیں پڑتا عقل کا سایہ ‖ اس کو سمجھیں فرضِ کفایہ
بھائی بھائی میں ہاتھا پائی ‖ سلف گورنمنٹ آگے آئی
پاؤں کا ہوش اب فکر نہ سرکی ‖ ووٹ کی دُھن میں بنگئے پھرکی

گئے برھمن کے پاس لے کر جو اپنے قصے کو شیعہ سنی
بگڑ کے بولا کہ جاؤ بھاگو ملکش تم بھی ملکش وہ بھی
بڑھی جو تکرار تو وہ لے کر اُنہیں فرنگی کے پاس پہنچا
وہ بولا بس دور ہو یہاں سے کہ تم بھی نیٹو ہو وہ بھی نیٹو

فلک نے آخر یہ سُن کے سب کی، کہا کہ تم سب ہو مستِ غفلت
سمجھ لو اس کو کہ تم بھی فانی ہو وہ بھی فانی ہے یہ بھی فانی

اٹھ گیا پردہ تو اکبر کا بڑھا کون سا حق
بے پکارے جو مرے گھر میں چلا آتا ہے
بے حجابی مری ہمسائے کی خاطر سے نہیں
صرف حکام سے ملنے میں مزا آتا ہے

بھائیو ! تم کبھی ہندی کے مخالف نہ بنو
بعد مرنے کے کُھلے گا کہ یہ تھی کام کی بات
بسکہ تھا نامہ، اعمال مرا ہندی میں
کوئی پڑھ ہی نہ سکا، مل گئی فی الفور نجات

کون کہتا ہے کہ تعلیم زناں خوب نہیں
ایک ہی بات فقط کہنا ہے یاں حکمت کو
دو اسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم
قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

ہر چند کہ ہے مِس کا لونڈر بھی بہت خوب
بیگم کا مگر عطرِ حنا اور ہی کچھ ہے
سائے کی بھی سَن سَن ہوس انگیز ہے لیکن
اس شوخ کے گھنگرو کی صدا اور ہی کچھ ہے

تھے کیک کی فکر میں سو روٹی بھی گئی چاہی تھی شے بڑی سو چھوٹی بھی گئی
واعظ کی نصیحتیں نہ مانیں آخر پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں، مرے اسپتال جا کر

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اِس زمانے میں

هم ایسی کُل کتابیں لائقِ ضبطی سمجھتے هیں
کہ جِن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے هیں

آونٹ نے گایوں کی ضِد پر شیر کو ساجھی کیا
پھر تو مینڈک سے بھی بد تر سب نے پایا آونٹ کو

رزولیوشن کی شورش ہے مگر اس کا اثر غائب
پلیٹوں کی صدا سنتا هوں اور کھانا نہیں آتا

خدا کے فضل سے بی‌بی میاں دونوں مہذب هیں
حجاب اُس کو نہیں آتا ' اُنھیں غصه نہیں آتا

غریب اکبر نے بحث پردے کی کی بہت کچھ ' مگر هوا کیا
نقاب اُلٹ هی دی اُس نے کہہ کر که کر هی لے گا مرا مُوا کیا

مغربی ذوق ہے اور وضع کی پابندی بھی
آونٹ په چڑھ کے ''تھیٹر'' کو چلے هیں حضرت

تمہارے کھیت سے لے جاتے هیں بندر چنے کیوں کر
یه بحث اچھی ہے اس سے ' حضرت آدم بنے کیونکر

شیخ کہتے هیں که پیروں کی پرستش بھی ہے فرض
ماسٹر کہتے هیں الله کو بھی یاد نه کر

اِس بزم میں مجھ سے کہتے ھیں موقع کے مطابق بات کہو
اور ھم نے یہ دل میں ٹھانی ھے یا دل کی کہیں یا کچھ نہ کہیں

اس شرط پر ھم سے فلک سے صلح آخر ہو گئی
قبریں مہیا وہ کرے تزئین اُن کی ھم کریں

جیسا موسم ھو مطابق اُس کے میں دیوانہ ھوں
مارچ میں بلبل ھوں، تو جولائی میں پروانہ ھوں

شِرک چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا میری کوئی سوسائٹی ھی نہیں

جستجو ھم کو آدمی کی ھے وہ کتابیں عبث منگاتے ھیں

کیوں سِول سرجن کا آنا روکتا ھے ھم نشیں
اس میں ھے اک بات آنر کی شفا ھو یا نہ ھو
مولوی صاحب نہ چھوڑیں گے خدا گو بخش دے
گھیر ھی لیں گے پولیس والے سزا ھو کہ نہ ھو
ممبری سے آپ پر تو وارنش ھو جائے گی
قوم کی حالت میں اس سے کچھ جلا ھو یا نہ ھو

تیری تنخواہ بڑھی شُکر ھے لیکن اے دوست
تیری تو کچھ نہ ترقی ھوئی تنخواہ کے ساتھ

سرافرازی ھو اونٹوں کی تو گردن کاٹیے اُن کی
اگر بندر کی بن آئے تو فیضِ ارتقا کہیئے
یہ اُن کا کورس کیا کم ھے کہ میں بھی کچھ کہوں اُن سے
مری جانب سے بس کالج کے لڑکوں کو دُعا کہیئے

تاکید عبادت پہ ہے اب کہتے ہیں لڑکے پیری میں بھی اکبر کی ظرافت نہیں جاتی

عزت ہی تو شناخت نہیں ہے مگر مجھے لذّت ضرور ملتی ہے کونسل کی سِیٹ سے

غریب خانے کی یہ اداسی یہ نادُرستی نہیں قدیمی
چہل پہل بھی کبھی یہاں تھی، کبھی یہ گھر بھی سنور چکا ہے

پالسی کے باغ میں جُھولے اُمیدوں کے بہت
جسکا جی چاہے وہ برسوں بے تکلف جھول لے

خدا کی راہ میں بے شرط کرتے تھے سفر پہلے
مگر اب پوچھتے ہیں ریلوے اس میں کہاں تک ہے

اللہ ہی ہے ان لڑکیوں کا فَر فَر بھی بنیں حد میں بھی رہیں
ہے کورس بھی ان کا اِسکیمی اور پاس شُدہ اُستانی بھی

رقیب سرٹیفکٹ دیں تو عشق ہو تسلیم یہی ہے عشق تو اب ترکِ عاشقی اَولیٰ

اک ڈنر میں کھا گیا اتنا کہ نکلی تن سے جان
خدمتِ قومی میں بارے جاں نثاری آ گئی

اسلام کے دعویٰ سے میں باز آتا ہوں صاحب
یہ کون بتائے تمہیں اللہ کہاں ہے

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہے جواں بھی
شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

نجد میں بھی مغربی تعلیم جاری ہو گئی　　لیلیٰ و مجنوں میں آخر فوجداری ہو گئی

قومی ترقیوں کی زنانے میں دھوم ہے　　مردانے سے زیادہ زنانے میں دھوم ہے

صیّاد ہُنر دکھلائے اگر تعلیم سے سب کچھ ممکن ہے
بلبل کے لئے کیا مشکل ہے الّو بھی بنے اور خوش بھی رہے

شوہر افسردہ پڑے ہیں اور مُرید آوارہ ہیں
بی بیاں اسکول میں ہیں شیخ جی دربار میں

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بی بیاں نکلیں

ملک الموت نے نوٹس نہ دیا تھا افسوس
اس کمیٹی کے بہت کام رہے جاتے ہیں

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتون خانہ ہوں وہ سبھائی پری نہ ہوں

کافی ہیں امیروں کو قوانینِ گورنمنٹ
مذہب کی ضرورت تو غریبوں کے لئے ہے

مرا ٹٹو زیادہ مشرقی ہے شیخ صاحب سے
کہ وہ موٹر پہ چڑھتے ہیں یہ موٹر سے بھڑکتا ہے

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں، وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

یہ آپ کا فرمانا ہے بجا قرآن بھی ہے اللہ بھی ہے
مشکل تو یہ ہے لیکن کہ ادھر آنر بھی ہے اورتنخواہ بھی ہے

مورّخ اور صوفی میں بھی ہے یہ فرق اے اکبر
کہ وہ مصروف ماضی ہے اور اس کو حال آتا ہے

انقلاب آیا ، نئی دنیا نیا ہنگامہ ہے
شاہنامہ ہو چکا اب وقتِ گاندھی نامہ ہے

اِدھر تائید باری ہے اُدھر تعلیم گاندھی ہے
درِ مقصود کو کھولے خدا ، ہمت تو باندھی ہے

نیٹو کی ہے تنخواہ اگر سو سے زیادہ
اس وقت ہے وہ قیصر و خسرو سے زیادہ

عہدہ دیتے ہیں ، سند دیتے ہیں ، زر دیتے ہیں
خانساماں وہ مجاہد کو بھی کر دیتے ہیں

چور کے بھائی گرہ کٹ تو سنا کرتے تھے
اب یہ سنتے ہیں ایڈیٹر کے برادر لیڈر

مجھے بھی دیجئے اخبار کا ورق کوئی
مگر وہ جس میں دواؤں کا اشتہار نہ ہو

مناسب تھی ہماری شاعری اک وقت میں اکبر
مگر اب وہ زمانہ کے موافق ہو نہیں سکتی
غنیمت تھی ادائے خانقہ آسکی نگاہوں میں
کمیٹی اور رزولیوشن پہ عاشق ہو نہیں سکتی

ہے دو روزہ قیام سرائے فنا، نہ بہت کی خوشی نہ ہے کم کا گِلہ
یہ کہاں کا فسانۂ سُود و زیاں جو گیا وہ گیا، جو مِلا وہ مِلا
نہ بہار جمی نہ خزاں ہی رہی، کسی اہلِ نظر نے یہ خوب کہی
یہ کرشمۂ شانِ ظہور ہیں سب، کبھی خاک اُڑی کبھی پھول کِھلا
نہیں رکھتا ہوں خواہشِ عیش و طرب، یہی ساقئی دہر سے بس ہے طلب
مجھے طاعتِ حق کا چکھا دے مزہ نہ کباب کھلا نہ شراب پلا
ہے فضول یہ قصّہ زید و بکر، ہر اک اپنے عمل کا چکھے گا ثمر
کہو ذہن سے فرصتِ عمر ہے کم، جو دِلا تو خدا کی ہی یاد دِلا

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا
ہوتا ہے انبساط غذائے لطیف سے
غنچے کو دیکھئے کہ ہوا کھا کے کِھل گیا

اک عکسِ ناتمام پہ عالم کو وجد ہے
کیا پوچھنا ہے آپ کے حسن و جمال کا

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سِرا ملتا نہیں

دوں گا ذرا سمجھ کے جواب اُن کی بات کا
رُخ دیکھتا ہوں سلسلۂ واقعات کا

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا
بُت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا
بزمِ یاراں سے پھری بادِ بہاری مایوس
ایک سر بھی اُسے آمادہ سودا نہ ملا
گُل کے خواہاں تو نظر آئے بہت عطر فروش
طالبِ زمزمۂ بلبلِ شیدا نہ ملا
واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے
کر دیا کعبہ کو گم اور کلیسا نہ ملا
سیّد اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتا پھرا پیسا نہ ملا

علامہ اقبال

ترجمانِ حقیقت ڈاکٹر شیخ محمد اقبال متخلص بہ اقبال اُردو کے اُن معدودے چند سخنوروں میں سے ہیں ۔ جنہیں زندگی ھی میں شہرت عام اور بقائے دوام کی سند حاصل ھوگئی تھی ۔ وہ نہ صرف اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر تھے بلکہ اُردو شاعری کی تاریخ میں ایک نئے عصر کے معمار بھی تھے ۔ اُنھوں نے حالی ' شبلی اور اکبر کے اصلاحی کام کو تکمیل کی حد تک پہنچایا اور اپنی قومی شاعری کے ذریعے ملت اسلامیہ کے سامنے استقبال ؟ کا صحیح نقشہ پیش کیا ۔ اقبال ایک عظیم المرتبت شخصیت کے مالک تھے ۔ وہ ایک بلند پایہ مفکر اور فلسفی بھی تھے اور اُردو فارسی کے قادرالکلام اور بالغ نظر شاعر بھی ۔ اُنھوں نے اُردو زبان کو خیالات اور الفاظ کا بیش قیمت سرمایہ عطا کیا اور زبان شعر میں وہ حقائق و معارف بیان کئے جن کو ھم میں سے بہت سے لوگ محسوس تو کرتے ھیں مگر ادا نہیں کر سکتے ۔

اقبال ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو سیالکوٹ (پنجاب) میں پیدا ھوئے ۔ وہ کشمیری برھمنوں کے ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جس کے بعض افراد نے تقریباً سوا دو سو سال پہلے اسلام قبول کیا اور کشمیر سے نقل سکونت کر کے پنجاب میں آ بسے ۔ اقبال کے والد شیخ نور محمد صاحب بڑے دیندار اور عبادت گزار انسان تھے چنانچہ اُنھی کی تربیت کا فیضان تھا کہ اقبال بچپن ھی سے ایک عارفانہ رنگ میں رنگے گئے اور اُنھیں اولیائے عظام اور صوفیائے کرام سے خاص عقیدت پیدا ھوگئی ۔ اُن کی ابتدائی تعلیم ایک قدیم طرز کے مکتب میں ھوئی پھر جب وہ انگریزی تعلیم کے لئے اسکاچ مشن میں داخل ھوئے تو خوش قسمتی سے اُنھیں مولانا سید میر حسن جیسا رھبر فرزانہ مل گیا ۔ مولوی صاحب عربی اور فارسی کے متبحر عالم تھے اور اُنکی تدریس کا یہ اعجاز تھا کہ اپنے شاگردوں میں ان زبانوں کا صحیح مذاق پیدا کر دیتے تھے ۔ عربی اور فارسی سے اقبال کو طبعی مناسبت اجداد سے ترکے میں ملی تھی اس پر میر حسن ایسے عالم کی صحبت نے سونے پر جلا کا کام کیا ۔

اقبال نے اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے ایف ۔ اے کا امتحان پاس کیا ۔ عربی اور انگریزی زبانوں میں امتیازی کامیابی حاصل کرنے کی وجہ سے اُنھیں چند تمغے بھی ملے اور وظیفہ بھی دیا گیا ۔ یہاں سے فارغ ھو کر اقبال گورنمنٹ کالج لاھور میں داخل ھوئے اور اپنا

اختیاری مضمون فلسفہ منتخب کیا ۔ حسن اتفاق کہئے یا اقبال کی خوش قسمتی کہ اس درسگاہ میں انہیں فلسفہ پڑھانے کے لئے ایک ایسا فاضل استاد مل گیا جسکی فلسفہ‌دانی کا زمانہ قائل تھا اور جو عیسائی ہونے کے باوجود مشرق اور خصوصاً اسلام کا شیدائی تھا ۔ یہ علی گڑھ کے معروف پروفیسر آرنلڈ تھے جنھوں نے اپنے علی گڑھ کے دوران قیام میں مولانا شبلی کے علمی مذاق کو پختہ کیا تھا اور اب اقبال کی تیز فہمی اور فلسفہ سے فطری لگاؤ دیکھ کر اُن کے خیالات کو سنوارا ۔ پروفیسر آرنلڈ ھی کی صحبت میں اقبال کا فلسفیانہ کردار بنا اور یہی وہ تعلق ہے جس نے اُردو کو ایک مفکر شاعر عطا کیا ۔

گورنمنٹ کالج سے بی ۔ اے کرنے کے بعد اقبال نے ۱۸۹۹ء میں پنجاب یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم ۔ اے کی سند حاصل کی ۔ اور کچھ عرصہ اورینٹل کالج لاہور میں فلسفہ و تاریخ کے پروفیسر رہے پھر کچھ مدت کیلئے گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کی تعلیم دیتے رہے ۔ اسی زمانے میں اُنہوں نے اپنی اُردو کتاب ''علم‌الاقتصاد'' تصنیف کی ۔ بالاخر ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کیلئے یورپ تشریف لے گئے ۔ جہاں ٹری نیٹی کالج کیمرج سے اُنہوں نے فلسفہ و اخلاق کی ڈگری لی ازاں بعد جرمنی جا کر میونچ یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی ۔ اس ڈگری کے سلسلے میں اُنہوں نے جو مقالہ لکھا تھا اُسکا موضوع ''ایران اور مابعدالطبیعات'' تھا ۔ انھی دنوں میں وہ بیرسٹر بھی ہو گئے اور عارضی طور پر پروفیسر عربی کی حیثیت سے لندن یونیورسٹی میں ڈاکٹر آرنلڈ کی قائم مقامی بھی کی ۔ ۱۹۰۸ء میں اقبال ولایت سے وطن واپس ہوئے اور تھوڑے عرصہ کے بعد گورنمنٹ کالج کی ملازمت ترک کر کے وکالت شروع کر دی ۔ یہ سلسلہ کم و بیش ۱۹۳۴ء تک جاری رہا ۔

۱۹۲۲ء میں سرکار برطانیہ نے ڈاکٹر اقبال کی ادبی خدمات کے صلے میں اُنہیں ''سر'' کا معزز خطاب عطا فرمایا ۔ ۱۹۲۶ء میں وہ احباب کے اصرار پر صوبہ پنجاب کی مجلس قانون ساز کی رکنیت کے لئے بطور اُمید وار کھڑے ہوئے اور منتخب ہو کر حلقہ لاہور کی نمائندگی کی ۔ ۱۹۲۸ء میں مدراس یونیورسٹی کی دعوت پر جنوبی ہند تشریف لے گئے اور اسلامی مذھبی افکار کی جدید تشکیل پر چند اھم لکچر دئے ۔ ۱۹۳۰ء میں موصوف نے آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے الہ آباد کے اجلاس میں اپنا وہ تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا جس میں ھندوستان کی مشکلات کا حل پاکستان کی تجویز کی صورت میں پیش کیا گیا تھا ۔ ۱۹۳۱ء میں شاعر مشرق نے لندن گول میز کانفرنس میں شرکت کی اور واپسی پر ھسپانیہ ، فلسطین اور ٹرکی وغیرہ اسلامی ممالک کی بھی سیر کی ۔ ۱۹۳۳ء میں مولانا سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کی معیت میں نادرشاہ شہید کی دعوت پر کابل کے جشن استقلال میں شریک ہوئے اور ان تینوں حضرات نے مل کر افغانوں کی تعلیم کے سلسلے میں شاہ شہید کے حسب ارشاد ایک اسکیم مرتب کر کے پیش کی ۔ جس کا مقصد نظام تعلیم کو بہتر بنانے کے علاوہ کابل یونیورسٹی کا قیام بھی تھا ۔ آخر دنیائے علم و ادب اور عالم اسلام کا یہ آفتاب جہاں تاب ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو علی‌الصبح غروب ہو گیا ۔ اور مرحوم کے جسد خاکی کو بادشاھی مسجد لاھور کے ایک پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا ۔

اقبال کو شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا ۔ یوں تو مشن کالج کی تعلیم کے دوران میں ھی اُنہوں نے شعر گوئی شروع کر دی تھی ۔ لیکن اُن کی حقیقی عظمت کا سنگ بنیاد

لاہور میں رکھا گیا ۔ جہاں کی ادبی فضا نے اقبال کی طبعیت میں ایک ہیجان پیدا کر دیا اور وہ مشاعروں میں حصہ لینے لگے ۔ اس زمانہ میں لاہور کے بازار حکیماں میں مرزا ارشد گورگانی نبیرہ بہادر شاہ ظفر اور میر ناظر حسین ناظم لکھنوی نے شعر و سخن کی ایک پر رونق بساط بچھا رکھی تھی اقبال بھی ۔ رفتہ رفتہ ان ..شاعروں میں شریک ہونے لگے اور مرزا ارشد کے فیض صحبت سے انہیں مستفید ہونے کا موقع مل گیا ۔ اقبال کی اس نومشقی کے زمانے کا یہ شعر بہت معروف ہے ۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے   قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

اور مرزا ارشد گورگانی نے اس شعر کی بہت تعریف کی تھی ۔ یہی وہ زمانہ تھا جب دلی کے آخری شاعر نواب مرزا خاں داغ کا طوطی تمام ہندوستان میں بول رہا تھا اور آن کے دکن میں ملازمت اختیار کر لینے کے باوجود آن کا فیض تمام ہندوستان میں جاری تھا ۔ اقبال بھی داغ کے رنگ شاعری سے متاثر ہوئے اور آنہوں نے خط و کتابت کے ذریعہ شرف تلمذ حاصل کیا ۔ لیکن تھوڑے ھی عرصہ بعد آستاد نے شاگرد کا کلام ان الفاظ کے ساتھ واپس کر دیا کہ ''ایسا کلام اصلاح کا محتاج نہیں'' ۔ اس میں شک نہیں کہ یہ واقعہ اقبال کے ابتدائی دور شاعری میں بڑی اھمیت رکھتا ھے لیکن اقبال چونکہ شروع سے ھی سنجیدہ مزاج واقع ہوئے تھے اس لئے وہ اس رنگ میں ثابت قدم نہ رہ سکے ۔ اور داغ کی شاعری کا اثر آن پر سے بہت جلد دور ہوگیا ۔

فصیح الملک داغ دھلوی کی محاورہ بندی اور چاشنی زبان سے سیر ہو جانے کے بعد وہ فطری طور پر غالب کی فکری شاعری سے متاثر ہوئے ۔ اور پھر آن کی غزلوں میں وھی صوری و معنوی کیفیت پیدا ہونے لگی جو کلام غالب کا طرۂ امتیاز ھے ۔ چنانچہ آن کی وہ غزل جسکا مطلع ھے ۔

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی   ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

اپنے انداز خیال ، مشکل پسندی اور تراکیب کے اعتبار سے ہو بہو غالب کے رنگ تغزل میں رنگی ہوئی ھے ۔ غرض اقبال نے مرزا ارشد کی صحبتوں سے استفادہ کیا ، داغ سے اصلاح لی اور غالب سے معنوی فیض حاصل کیا ۔ یہ آخری تاثر چونکہ آنکی طبیعت سے مناسبت رکھتا تھا اسلئے زیادہ دیر پا ثابت ہوا بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آخر تک کسی نہ کسی صورت میں جلوہ گر ہوتا رہا ۔

اس وقت تک گویا اقبال آردو شاعری کی عام ڈگر یعنی غزل پر چلتے رہے ۔ اتفاق سے اس دوران میں آن کے چند بے تکلف دوستوں نے آنہیں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں قومی نظمیں پڑھنے پر آمادہ کیا اور آنہوں نے اس نوعیت کی اپنی سب سے پہلی نظم ''نالہ یتیم'' انجمن کے ایک اجلاس میں پڑھی ۔ اس کے بعد ''ابر گہر بار'' اور ''فریاد آمت'' وغیرہ اس سلسلے کی دوسری کڑیاں بنیں اور انجمن کا پلیٹ فارم اقبال کی قومی نظم نگاری کا باعث بن گیا ۔ ادھر شیخ عبدالقادر صاحب اپنے شہرہ آفاق رسالہ ''مخزن'' کے ذریعہ جدید آردو شاعری کی تحریک کو پنجاب میں مقبول عام و خاص بنا رہے تھے ۔ آنہوں نے اقبال جیسے طباع اور ہونہار شاعر کو مختلف ادبی صحبتوں میں جب اپنا

کلام پڑھتے سنا تو وہ بہت متاثر ہوئے اور اقبال سے ''مخزن'' کیلئے کچھ لکھنے کی درخواست کی ۔ اس طرح اقبال کی فطری اور وطنی شاعری کا آغاز ہوا اور اُنہوں نے ''ہمالہ'' ''چاند'' ''ایک آرزو'' ''تصویر درد'' اور ''ترانہ ہندی'' جیسی شاہکار نظمیں لکھ کر اپنی فطرت نگاری اور وطن دوستی کا ثبوت پیش کیا ۔

غرض یورپ جانے سے پہلے پہلے اقبال ایک اچھے غزل گو ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی قومی' وطنی اور منظریہ نظم نگاری میں بھی خاص شہرت حاصل کر چکے تھے یورپ جا کر اقبال نے ایک طرف تو مغربی علوم و فنون اور وہاں کے مختلف شعرا ' اُدباء فلسفیوں اور مستشرقین سے کسب فیض کیا اور دوسری طرف اہل مغرب کی ذہنیتوں اور اُنکی سیاسی و معاشرتی زندگی کا بغور مطالعہ کیا ۔ ان مشاهدات اور ذاتی تجربات نے اقبال کے نکتہ نظر میں بلا مبالغہ ایک انقلاب پیدا کر دیا ۔ اور اُنہیں یقین ہو گیا کہ نئی تہذیب کی بنیادیں کھوکھلی ہیں اور تنگ نظر قومیت کا جذبہ دنیا میں امن و سلامتی کا ضامن ہونے کی بجائے بنی‌نوع انسان کےلئے انتہائی مہلک ہے ۔ اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد وہ قدرتی طور پر ایک ایسے مہتمم بالشان اُصول زندگی کے متلاشی ہوئے جو رنگ و نسل وغیرہ کے امتیازات سے بالاتر رہ کر تمام دنیا کے لوگوں میں اخوت اور مساوات پھیلا سکے ۔ یہ خصوصیت اُنہیں صرف اسلامی عقائد اور اُصولوں میں نظر آئی ۔ اور چونکہ وہ علوم مشرق پر اچھی نظر رکھنے کے علاوہ اسلامی فلسفہ کی تحقیق میں بھی اپنا خاصا وقت گزار چکے تھے اسلئے اُنہیں اسلام ھی کے سادہ ترین مگر انتہائی باعظمت فلسفہ حیات میں دنیا والوں کی نجات دکھائی دی ۔ خیالات کی یہی تبدیلی تھی جس نے اقبال سے ''ترانہ ہندی'' یا ''نیا شوالہ'' جیسی نظموں کے بجائے اب یہ کہلوایا کہ ۔

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہ حجاز ہوجا

لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ مغربی تہذیب کے انجام سے مایوس ہو کر اقبال نے اہل مغرب سے کچھ سیکھا ھی نہیں ۔ اُنہوں نے یورپ کے مشاہیر اُدباء شعرا اور مفکرین مثلاً شیکسپیر' کانٹ ' براؤ ننگ ' گوئٹے ' نٹشے ' ٹالسٹائے ' کارل مارکس' ھیگل ' برگسان وغیرہ کی تحریروں سے بہت کچھ حاصل کیا اور اُنکی خوبیوں کی دل کھول کر تعریف بھی کی ۔ مزید براں اہل یورپ کی تحقیق ' آگہی ' یقین اور عمل سے تو وہ کچھ اس حد تک متاثر ہوئے کہ آئندہ اپنی اُردو اور فارسی شاعری میں ان صفات کی برابر تلقین کرتے رہے ۔ اور غالباً یورپی اقوام کی انہی خصوصیات کا اثر تھا کہ اقبال شاعری کو بیکاروں کا مشغلہ سمجھ کر اسے ترک کرنے پر تل گئے تھے مگر خدا بھلا کرے شیخ عبدالقادر صاحب اور پروفیسر آرنلڈ کا جنھوں نے اُنہیں اس خیال سے باز رکھا ورنہ شاید دنیا بالخصوص دنیائے اسلام اقبال جیسے بلند پایہ شاعر کے کلام و پیام سے محروم رہ جاتی ۔ ھاں اس سلسلے میں ایک بات کا ذکر اور ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اسی دوران میں اقبال کو فارسی میں شعر کہنے کی رغبت پیدا ہوئی ۔ یہ تغیر مذاق اقبال کی شاعری اور اُس کے اثر کے حق میں بہت مفید ثابت ہوا ۔ یعنی ایک طرف تو وہ اپنے دقیق فلسفیانہ خیالات اور عارفانہ جذبات کو اُردو کے مقابلہ میں زیادہ بہتر صورت میں ادا کر سکے دوسرے یہ کہ بیرون ہند کے مسلمانوں تک اُن کے خیالات کی رسائی فارسی کے ذریعہ ممکن ہو گئی ۔

چنانچه یورپ سے لوٹنے کے بعد اقبال نے اپنی زیادہ توجہ فارسی شاعری پر صرف کی گو اردو میں بھی وہ برابر لکھتے رہے۔

یورپ سے واپس آ جانے کے بعد اقبال کی شاعری کا زریں دور شروع ہوا۔ اسی دور کے افکار و خیالات نے اقبال کو حیات جاوید بخشی اور اُن کی شاعری کو ساحری میں تبدیل کر دیا۔ اب اُنکی بصیرت بہت بڑھ گئی تھی اور احساس نہایت ذکی ہو گیا تھا۔ اس لئے اُن کے فکری ارتقا کی منزلیں بہت جلد طے ہونے لگیں۔ اور عشق کی وہ چنگاری جو بچپن سے اُنکے سینے میں دبی ہوئی تھی اب دھک کر انگارہ بن گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اقبال کو کائنات کی ہر چیز سے ایک والہانہ محبت ہو گئی۔ اور فطرت کا ہر منظر اُن کے لئے ایک راز کا حامل بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں اقبال نے ''عشق'' کی تلقین بڑے شدومد کے ساتھ کی ہے۔ لیکن یہ عشق محض عشق تک ہی نہیں رک گیا بلکہ اُسی میں عمل کا سبق بھی موجود تھا۔ ''مور ناتواں'' سے وہ ''لطف خرام'' سیکھتے تھے اور چاند بھی اُن سے یہی کہتا تھا کہ

چلنے والے نکل گئے ہیں   جو ٹھیرے ذرا کچل گئے ہیں

اب ناکامی اور موت اُن کو ہیچ معلوم ہوتی تھی اور اُنہیں یقین ہو گیا تھا کہ یہ چیزیں عمل کے لئےسد راہ نہیں ہوسکتیں۔ اس منزل پر پہنچنے کے بعد ایرانیفلسفہ کے مطالعہ نے اُن کے خیالات کو مہتمم بالشان بنانے میں مدد دی با لخصوص مولانا روم کے افکار و خیالات نے اقبال کی بڑی رہنمائی کی چنانچہ اقبال کا فلسفہ خودی جو اس دور کی ایک لازوال چیز ہے۔ درحقیقت مولانا ہی سے متاثر ہے۔ البتہ اس خودی کے احساس سے اقبال نے جو کام لیا ہے وہ اُن کا اپنا قابل قدر کارنامہ ہے۔ اصل نظم ''اسرار خودی'' تو فارسی میں ہے لیکن اُسکے بعض پہلوؤں پر اقبال نے اردو میں بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہی وہ مرکزی خیال ہے جسکے گردا گرد شاعر مشرق کی فکری دنیا تعمیر ہوئی۔

علامہ اقبال کا یہی وہ دور شاعری ہے جس میں اُنہوں نے مسلمانوں کو توحید، اخوت، عمل اور عشق کا درس دیا اور سب سے زیادہ اس بات پر زور دیا کہ وہ ''خودی'' کو صحیح طور پر سمجھ لیں اور ایسے اصولوں پر کاربندھوں جو اُنہیں ترقی کی معراج تک پہنچا دیں۔ اُنہوں نے صبر، توکل، تسلیم، رضا اور فقر کے پوشیدہ معنی اور غرض کے گورکھ دھندوں کو توڑ کر پھینک دیا اور اُنکی اصلی غرض وغایت اور اُنکے صحیح استعمال کی طرف قوم کو راغب کیا۔ اس سلسلے میں اقبال کے ''مرد مومن'' کی طرف بھی اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے جسکے کردار کی مختلف خصوصیات کی طرف اقبال نے اپنی شاعری میں بڑی تفصیل سے کام لیا ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ اقبال نے ''مومن'' کے کردار کی وضاحت اس دور میں اسی لئے کی ہے کہ وہ مسلمانوں کو ''بندۂ مومن'' بنانا چاہتے تھے۔

رفتہ رفتہ اقبال کی شاعری کا وہ دور آیا جسے اُن کے فکر کی منتہا کہا جا سکتا ہے۔ اس منزل میں قدم رکھنے کے بعد اقبال درحقیقت اُن فضاؤں میں پرواز کرتے ہیں جہاں انسان، اُسکی انسانیت، انسانیت کی قدر و قیمت، بندگی و خدائی، جبرو اختیار، عشق و عقل جیسے مسائل کی تشریح و تفسیر کی جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ اب

اقبال کائنات کے رازوں کی چھان بین اور حیات کے بنیادی حقائق اور مابعد الطبیعاتی مسائل کی تفسیر میں منہمک ہو جاتے ہیں اور اُن کی شاعری معین روحانی اور اخلاقی مقاصد کیلئے وقف ہو جاتی ہے ۔ کلام اقبال کا یہ وہ حیات آفریں دور ہے جہاں سے شاعری اور پیغمبری کی حدیں ملنے لگتی ہیں اور وہ ایک پیغمبرانہ شان کے ساتھ کہہ اٹھتے ہیں کہ

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ　　　که میں ہوں محرم راز درون میخانہ

آخر میں اقبال کے اسلوب بیان کے متعلق بھی چند باتیں جاننا بے حد ضروری ہیں ۔ اس سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ ہر بڑے شاعر کی طرح اقبال نے بھی اپنے خیالات کے لئے نئے سانچے تیار کئے ہیں اور شاعری کو روزمرہ و محاورہ کا کھیل سمجھنے کے بجائے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا ہے آنہوں نے نادر تشبیہات ، لطیف استعارات ، اچھوتی تراکیب ، جدید مصطلحات اور نئے نئے الفاظ کثیر تعداد میں استعمال کر کے نہ صرف دامن اُردو کو مالا مال کیا بلکہ اپنے مخصوص اسالیب ، لفظیات اور حسین تراکیب سے آئندہ نسلوں کو زبان کے برتنے کا ایک نیا گر بھی سکھا دیا ۔ اس میں شک نہیں کہ شروع شروع میں اشعار کو عروض کے کانٹوں پر تولنے والے اور شخصی اور صنعتی معیار رکھنے والے لوگوں نے اقبال کی زبان پر اعتراضات کئے مگر تھوڑے ہی دنوں بعد جب اقبال نے اپنے دور پر اثر انداز ہونا شروع کیا ، اُن کا رنگ مقبول ہوا اور دوسرے شعرا غیر شعوری طور پر اُن کا اتباع کرنے لگے تو کوتاہ بیں معترضین کی بھی سمجھ میں آ گیا کہ اقبال جیسے بلند پایہ شاعر کا کام قواعد کی پابندی نہیں ۔ قواعد کا کام ہے کہ اس کی مقرر کردہ شاہراہوں پر چلے اور اس کی طرز کو دیکھ کر اپنے قوانین مرتب کرے ۔

مختصر یہ کہ اقبال کی شاعری ہر لحاظ سے اُردو میں ایک قابل قدر اضافہ ہے ۔ اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک درس ، ایک پیام اور ایک دعوت فکر و عمل ہوتے ہوئے بھی زبان و بیان کا سارا حسن و لطافت اور طرز ادا کی تمام دلکشی و رعنائی موجود ہے ۔ اُردو کی فرسودہ شاعری میں غالب نے کچھ جان ڈال دی تھی ۔ حالی نے مسلمانوں کو اُن کا ماضی یاد دلا کر تڑپا دیا تھا اور غیرت دلائی تھی ۔ اقبال نے استقبال کا رنگ دکھایا اور مسلمانوں کو اُن کے اقبال مند مستقبل کی اُمید دلائی ہے ۔ اور سچ پوچھئے تو اقبال اپنے وقت کا مسیح ہے جسکی روح پرور تعلیم نے مردوں کو زندہ کر دیا۔

شاعر مشرق نے جو منظوم تصانیف اپنی وفات تک سخن فہم دنیا کی ضیافت طبع کے لئے پیش کیں وہ حسب ذیل ہیں ۔ اسرار خودی ، رموز بے خودی ، پیام مشرق ، زبور عجم ، جاوید نامہ ، مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' ، بانگ درا ، بال جبریل اور ضرب کلیم ۔ ان میں سے اول الذکر چھ کتابیں فارسی زبان میں ہیں اور آخرالذکر تین اُردو زبان میں ۔ گو سب سے پہلے اسرار و رموز طبع ہوئیں تاہم بانگ درا کا بیشتر حصہ اسرار و رموز سے پہلے ہی جزواً جزواً اشاعت پذیر ہو چکا تھا ان مثنویوں کے بعد اقبال کا اُردو کلام بانگ درا کے نام سے شائع ہوا ۔ پھر یکے بعد دیگرے پیام مشرق ، زبور عجم ، جاوید نامہ ، بال جبریل ، ضرب کلیم اور مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' شائع ہوئیں ۔

اقبال کا آخری کلام آنکی وفات کے بعد ''ارمغان حجاز'' کے نام سے شائع ہوا اس کا بیشتر حصہ فارسی زبان میں ہے البتہ آخر میں کچھ اردو کا کلام بھی دیا گیا ہے۔

انتخاب کلام

تغزل

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی — مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا — خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا — تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی
تامل تو تھا اُن کو آنے میں قاصد — مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی

لاؤں وہ تنکے کہاں سے آشیانے کیلئے — بجلیاں بیتاب ہوں جن کو جلانے کیلئے
جمع کر خرمن تو پہلے دانہ دانہ چن کے تو — آھی نکلے گی کوئی بجلی جلانے کیلئے

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے — قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

علاج درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں
جو تھے چھالوں میں کانٹے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں
نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی
نشیمن سیکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں
نہیں بیگانگی اچھی رفیقِ راہِ منزل سے
ٹھہر جا اے شرر ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں

وہ میکش ہوں فروغِ مے سے خود گلزار بن جاؤں
ہوائے گُل فراقِ ساقئی نامہرباں تک ہے
چمن زار محبت میں خموشی موت ہے بلبل
یہاں کی زندگی پابندیٔ رسمِ فغاں تک ہے

گدائے میکدہ کی شان بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبُو

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل　　عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی
بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق　　عقل تھی محو تماشائے لب بام ابھی

پردہ چہرہ سے اُٹھا انجمن آرائی کر　　چشم مہر و مہ و انجم کو تماشائی کر
تو جو بجلی ہے تو یہ چشمکِ پنہاں کیسی؟　　بے حجابانہ مرے دل سے شناسائی کر
نفس گرم کی تاثیر ہے اعجاز حیات　　تیرے سینے میں اگر ہے تو مسیحائی کر
اس گلستاں میں نہیں حد سے گزرنا اچھا　　ناز بھی کر تو بہ اندازۂ رعنائی کر

مل ہی جائیگی کبھی منزل لیلیٰ اقبال
کوئی دن اور ابھی بادیہ پیمائی کر

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں　　مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی　　کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں
کوئی دم کا مہماں ہوں اے اھلِ محفل　　چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی　　بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

مری نگاہ میں وہ رندھی نہیں ساقی　　جو ہوشیاری و رندی میں امتیاز کرے
کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے　　جو بے عمل پہ بھی رحمت وہ بے نیاز کرے

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر
باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینہ کائنات میں

میرے شرر میں بجلی کے جوہر　　لیکن نیستاں تیرا ہے نمناک
ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے　　جس سے سیئے ہیں تقدیر کے چاک
کامل وہی ہے رندی کے فن میں　　مستی ہے جس کی بے منّتِ تاک

منظومات

ہمالہ

اے ہمالہ ! اے فصیل کشورِ ہندوستاں　　چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں　　تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو　　پاسباں اپنا ہے تو، دیوار ہندوستاں ہے تو
مطلع اوّل فلک جسکا ہو وہ دیواں ہے تو　　سوئے خلوت گاہِ دل دامن کشِ انساں ہے تو
برف نے باندھی ہے دستار فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالمتاب پر

تیری عمر رفتہ کی اک آن ہے عہد کہن　　وادیوں پر ہیں تری کالی گھٹائیں خیمہ زن
چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سر گرمِ سخن　　تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن
چشمہ، دامن ترا آئینہ، سیال ہے
دامن موجِ ہوا، جس کے لئے رومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوار ہوا کے واسطے　　تازیانہ دیدیا برق سر کہسارِ نے
اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے　　دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لئے
ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

جنبش موج نسیم صبح گہوارہ بنی　　جھومتی ہے نشہ، ہستی میں ہر گل کی کلی
یوں زبان برگ سے گویا ہے اسکی خامشی　　دست گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی
کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا
کنج خلوت خانہ، قدرت ہے کاشانہ مرا

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی
چھیڑتی جا اس عراقِ دلنشیں کے ساز کو
اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو

لیلئی شب کھولتی ہے آ کے جب زلفِ رسا دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی، جس پر تکلّم ہو فدا وہ درختوں پر تکلّم کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

اے ہمالہ! داستاں اُسوقت کی کوئی سنا مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اُس سیدھی سادھی زندگی کا ماجرا داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھادے اے تصور! پھر وہ صبح و شام تُو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تُو

ایک آرزو

دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یا رب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

آزاد فکر سے ہُوں عزلت میں دن گزاروں
دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو

ہو ہاتھ کا سرہانہ سبزہ کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے خلوت جلوت میں وہ ادا ہو

مانوس اسقدر ہو صورت سے میری بلبل
ننھے سے دل میں اسکے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دلفریب ایسا کوھسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کے اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو

آغوش میں زمیں کے سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جسدم
امید انکی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

بجلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھا دے
جب آسماں پہ ہرسو بادل گھرا ہوا ہو

پچھلے پہر کی کوئل ' وہ صبح کی موذن
میں اسکا ہمنوا ہوں وہ میری ہمنوا ہو

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر حرم کا احساں
روزن ہی جھونپڑی کا مجھکو سحر نما ہو

پھولوں کو آئے جسدم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو ' نالہ مری دعا ہو

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہر دردمند دل کو رونا مرا رلادے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگادے

چاند اور تارے

ڈرتے ڈرتے دم سحر سے
تارے کہنے لگے قمر سے
نظارے رہے وہی فلک پر
ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا
چلنا ، چلنا ، مدام چلنا
بیتاب ہے اس جہاں کی ہر شے
کہتے ہیں جسے سکوں ، نہیں ہے
رہتے ہیں ستم کش سفر سب
تارے ، انساں ، شجر ، حجر سب
ہوگا کبھی ختم یہ سفر کیا ؟
منزل کبھی آئیگی نظر کیا ؟
کہنے لگا چاند ، ہم نشینو !
اے مزرع شب کے خوشہ چینو !
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ
کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس رہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں !
جو ٹھہرے ذرا ، کچل گئے ہیں
انجام ہے اس خرام کا حسن
آغاز ہے عشق ، انتہا حسن

انتخاب "شمع و شاعر"

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دھقاں ذرا !
دانہ تو ، کھیتی بھی تُو ، باراں بھی تُو ، حاصل بھی تُو
آہ ! کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو ، رہرو بھی تو ، رہبر بھی تو ، منزل بھی تُو
کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تو ، بحر تو ، کشتی بھی تو ، ساحل بھی تُو

دیکھ آ کر کوچۂ چاک گریباں میں کبھی
قیس تو ، لیلیٰ بھی تو ، صحرا بھی تو ، محمل بھی تُو
وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا
مے بھی تو، مینا بھی تو ، ساقی بھی تو ، محفل بھی تُو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو
خوف باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تُو

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایّام ہے
تو زمانہ میں خدا کا آخری پیغام ہے

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل ذرا
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحر بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسم ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
سینہ ہے تیرا امیں آس کے پیامِ ناز کا
جو نظامِ دھر میں پیدا بھی ہے ، پنہاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے
اب تلک شاھد ہے جس پر کوہ فاراں کا سکوت
اے تغافل پیشہ ! تجکو یاد وہ پیماں بھی ہے ؟
تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے
دل کی کیفیت ہے پیدا پردۂ تقریر میں
کسوت مینا میں مے مستور بھی ، عریاں بھی ہے
پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے
اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے
راز اس آتش نوائی کا مرے سینے میں دیکھ
جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ .

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچہ کی نوا ہو جائے گی
آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی!
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی
دیکھ لینا سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موج مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغام سجود
پھر جبیں خاک حرم سے آشنا ہو جائے گی
نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور
خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

انتخاب ''خضر راہ''

زندگی

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں ، پیہم رواں ، ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے ، ضمیرِ کُن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جُوئے شیر و تیشۂ و سنگ گراں ہے زندگی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جُوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوّت تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی
خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو

ہو صداقت کیلئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوّتِ پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
سُوئے گردوں نامۂ شبگیر کا بھیجے سفیر
رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے
یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے !

سرمایہ و محنت

بندۂ مزدور سے جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ، ہے یہ پیامِ کائنات !
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آھو پر رھی صدیوں تلک تیری برات

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
ساحرِ الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات
نسل ' قومیّت ' کلیسا ' سلطنت ' تہذیب ' رنگ
"خواجگی" نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے !

ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک
نغمۂ بیدارئ جمہور ہے سامانِ عیش
قصّۂ خواب آورِ اسکندر و جم کب تلک
آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک
توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دورئ جنت سے روتی چشم آدم کب تلک
باغبانِ چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخم گل کے واسطے تدبیر مرہم کب تلک
کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

انتخاب طلوع اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زور بازو کا ؟
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت ، پادشاہی ، علم اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتہ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینہ میں بنا لیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندۂ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں
یقیں محکم ، عمل پیہم ، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے مشربِ نابے
دل گرمے ، نگاہ پاک بینے ، جان بیتابے

تو راز کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا ، خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا ، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی ، وہ خراسانی ، یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِّ زندگانی ہے
نکل کر حلقہ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
مصاف زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا
ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھکر ساز فطرت میں نوا کوئی

انتخاب از مسجد قرطبہ

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثبات و دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانہ کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جنکا نہیں کوئی نام!
عشق دم جبرئیل، عشق دل مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام!
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہہ حرم، عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل اسکے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات
عشق سے نور حیات عشق سے نار حیات

اے حرمِ قرطبہ عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خون جگر سِل کو بناتا ہے دل
خون جگر سے سوا سوز و سرور و سرود !
وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب !
سادہ و پرسوز ہے دخترِ دھقاں کا گیت
کشتیٔ دل کے لئے سیل ہے عہدِ شباب !
آبِ روانِ کبیر ! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب !
عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اُسکی سحر بے حجاب
پردہ اُٹھا دوں اگر پردۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب !
صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب !
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

انتخاب از ''ذوق و شوق''

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندّیاں رواں !

حسنِ ازل کی ہے نمود ، چاک ہے پردۂ وجود
دل کے ہزار سُود ہیں ایک نگاہ کا زیاں !
سُرخ و کبُود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب
کوہ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں !
گرد سے پاک ہے ہوا برگ نخیل دُھل گئے
رنگ نواح کاظمہ نرم ہے مثلِ پر نیاں !
آگ بجھی ہوئی ادھر ٹوٹی ہوئی طناب ادھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں !
آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی
اہل فراق کیلئے عیش دوام ہے یہی

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب !
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب !
عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّہ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب
شوق تیرا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب ! میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو ! عشق حضور و اضطراب !
تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے !
طبع زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے !

جبریل و ابلیس

جبریل

ہمدمِ دیرینہ ! کیسا ہے جہانِ رنگ و بُو ؟

ابلیس

سوز و ساز درد و داغ و جستجو و آرزو !

جبریل

ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاکِ دامن ہو رفو ؟

ابلیس

آہ ! اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سر مست مجھکو ٹوٹ کر میرا سبُو !
اب یہاں میری گزر ممکن نہیں ، ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالم بے کاخ و کو
جسکی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات
اسکے حق میں تقنطو اچھا ہے یا لا تقنطو ؟

جبریل

کھو دئے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبُرو !

ابلیس

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پور

دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفان کے طمانچے کھا رہا ہے ؟ میں کہ تو ؟
خضر بھی بے دست و پا ' الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جُو بہ جُو !
گر کبھی خلوت میسّر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصّہ' آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو ؟
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ھُو ' اللہ ھُو ' اللہ ھُو !

مومن

(دنیا میں)

ہو حلقہ' یاراں تو بریشم کی طرح نرم   رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن !
افلاک سے ہے اسکی حریفانہ کشا کش   خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن
جچتے نہیں کنجشک و حمام اسکی نظر میں   جبریل و سرافیل کا صیّاد ہے مومن !

(جنت میں)

کہتے ہیں فرشتے کہ دل آویز ہے مومن   حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن !

عورت

وجود زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریّا سے مشتِ خاک اسکی
کہ ہر شرف ہے اسی دُرج کا دُرِ مکنوں

مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

دین و ہنر

سرود و شعر و سیاست ، کتاب و دین و ہنر
گہُر ہیں انکی گرہ میں تمام یکدانہ !
ضمیر بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی
بلند تر ہے ستاروں سے انکا کاشانہ ؛
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون وافسانہ !
ہوئی ہے زیر فلک اُمتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

رباعیات

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے ؟
بتا کیا تُو مرا ساقی نہیں ہے ؟
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزّاقی نہیں ہے !

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

تری دنیا جہان مرغ و ماہی
مری دنیا فغان صبح گاہی !
تری دنیا میں ہیں محکوم و مجبور
مری دنیا میں تیری پادشاہی !

متفرقات

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اٹھائے کچھ ورق لالہ نے کچھ نرگس نے کچھ گُل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

نہ کر تقلید اے جبریل ، میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

بجلی ہوں نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری
میرے لئے شایاں خس و خاشاک نہیں ہیں

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اول ، طاؤس و رباب آخر

خدا وندا ! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیّاری ہے ، سلطانی بھی عیّاری

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے ؟

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم رازِ درونِ میخانہ

محسن کاکوروی

محمد محسن نام ۔ محسن تخلص ۱۸۲۷ء میں قصبہ کا کوری ضلع لکھنو میں پیدا ہوئے ۔ محسن صاحب نسبتاً علوی سید تھے ۔ ان کے بزرگ حجاز سے ہجرت کر کے کچھ عرصہ بغداد و خراسان میں رہے پھر ہندوستان چلے آئے ۔ ہندوستان آنیوالوں میں قاری محمد صدیق خاندان کے پہلے فرد تھے ۔ اور قصبہ کا کوری میں سب سے پہلے سکونت اختیار کرنے والے بزرگ قاری امیر سیف الدین صاحب تھے ۔ محسن کے والد مولوی حسن بخش چونکہ وکالت کے سلسلہ میں مین پوری میں مقیم تھے اسلئے محسن نے اپنے دادا مولوی حسین بخش شہید جو سرکار انگریزی میں منصف تھے ' کے سائیہ عاطفت میں پرورش پائی ۔ اور اس تعلق کی بنا پر دادا کا زہد و ورع پوتے نے ورثے میں پایا ۔ ۱۸۴۶ء میں جب مولوی حسین بخش صاحب اٹاوہ میں عین حالت نماز میں شہید کر دئے گئے تو محسن تقریباً سولہ سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ مین پوری میں رہنے لگے ۔ لیکن پاکبازی و پرہیزگاری کے جو ابتدائی نقوش انکے ذہن میں جاگزیں ہو چکے تھے وہ اس قدر گہرے تھے کہ پھر بقیہ عمر اُن کا شغل و عمل برابر جاری رہا ۔

محسن کی تعلیم بچپن میں قدیم طرز پر ہوئی لیکن علوم متداولہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ اور باپ دادا کے پیشہ کی مناسبت سے عدالتی شعبوں سے متعلق ہوئے ۔ کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں اُنہوں نے کچھ دن مین پوری میں عہدہ نظارت پر کام کیا مگر یہ کام چونکہ اُن کے مزاج و مذاق کے مطابق نہ تھا اسلئے جلد ہی اس سے سبکدوش ہو کر ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کیا اور آگرہ میں پریکٹس کرنے لگے ۔ محسن چونکہ ذہین اور طباع انسان تھے اسلئے اُن کی وکالت خوب چمکی حتیٰ کہ اُن کی قانونی لیاقت سے متاثر ہو کر حکام نے اُنہیں منصف بنانا چاہا مگر اُنہوں نے آزاد رہنا زیادہ پسند کرتے ہوئے یہ پیشکش منظور نہ کی ۔ ۱۸۵۷ء میں غدر کا ہنگامہ برپا ہوا تو یہ آگرہ ہی میں تھے ۔ لیکن اس تباہی کے بعد آگرہ چھوڑ کر اپنے وطن ثانی یعنی مین پوری چلے گئے۔ جہاں مرتے دم تک رہے اور وکالت جاری رہی ۔ آخر ۲۳ اپریل ۱۹۰۵ء کو دوشنبہ کے دن اس دار فانی سے کوچ کیا ۔

محسن کو بچپن سے ہی شعر گوئی کا شوق تھا ۔ شروع شروع میں اُنہوں نے اپنا کلام اپنے ایک عزیز مولوی ہادی علی اشک کو دکھایا ۔ پھر اصلاح کی ضرورت ہی باقی نہ رہی اور کسی سے اصلاح کلام کی نوبت نہ آئی ۔ ابتدائی نو مشقی کے عالم میں لکھنوی فضا اور عام رنگ شاعری سے متاثر ہو کر غزلیں کہتے رہے ۔ لیکن بہت جلد اُنکی عبادت

و ریاضت اور فطری سلامت روی نے انہیں جادہ مستقیم پر لگا دیا اور انہوں نے نعت گوئی کو اپنا شعار بنا لیا ۔ چنانچہ پہلا نعتیہ قصیدہ ''گلدستہ رحمت'' تھا جسکا ملطع یہ ہے ۔

پھر بہار آئی کہ ہونے لگے صحرا گلشن   غنچہ ہے نام خدا نافہ آ ہوئے ختن

جس میں اصلیت و صداقت اور خلوص و محبت کے ساتھ ساتھ شاعرانہ انداز بیان کو ہر موقع پر بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا گیا ہے ' یہ قصیدہ انہوں نے صرف سولہ سال کی عمر میں کہا تھا ۔ نعتیہ شاعری کے میدان میں اس کامیاب قدم کے بعد انہوں نے پھر اسکی وسیع فضا میں ایسی پرواز کی اور اپنی جودت طبع کے ایسے ایسے جوہر دکھائے جو اپنی نظیر آپ ہیں ۔ اور نظم اردو بالخصوص لکھنوی دور شاعری کی خوش نصیبی سمجھنا چاہئے ۔ کہ اسے ایک ایسا جوہر قابل مل گیا جس نے تقلیدی شاعری کے سیل بے پناہ کو نہ صرف روکا بلکہ اسے رفعت و امتیاز بھی بخشا ۔ یہی ایک بڑی وجہ ہے کہ ہم نے انہیں جدید شاعری کے طبقہ متوسطین میں اولین شاعروں میں رکھا ہے ۔ عمر کے اعتبار سے ظاہر ہے محسن آزاد اور حالی دونوں سے بڑے تھے مگر چونکہ مصلحین شاعری میں نہ وہ شامل تھے نہ متاثر ' اسلئے انہیں یہ جگہ دی گئی ہے ۔

یوں تو محسن سے پہلے بہت سے شاعروں نے نعت گوئی کی تھی لیکن اس کے باوجود ان کے امتیاز و افتخار کے دو اہم وجوہ ہیں ۔ اول یہ کہ شعرائے پیشین میں سے کسی نے نعت گوئی کو اپنا مسلک شعری نہیں بنایا تھا ۔ دویم یہ کہ انہوں نے اس میں ایک مخصوص تخلیقی شان پیدا کی ۔ موضوع کے اعتبار سے انہوں نے نعتیہ مضامین میں بڑی جدت سے کام لیا ہے اور صحیح اسلامی عقائد اور ہندی تصورات کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ پیوند کیا ہے کہ دل وجد کرنے لگتا ہے ۔ اس مذاق شاعرانہ کے ساتھ ان کے معنی آفرینی اور خلوص و محبت کے اظہار میں متانت کا پاس بہت ھی قابل قدر ہے ۔ جہاں تک ان کے اسلوب کا تعلق ہے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ان کا کلام سراسر ہموار اور نہایت ھی شگفتہ ہے ۔ ان کی کوثر کی دھلی ہوئی زبان ' چست بندشیں اور بے انتہا نادر و حسین تشبیہات و استعارات قابل صد ستائش ہیں ۔ قصائد میں تشبیب و گریز کے کمالات اور مثنویوں میں قصائد کی سی شان و شوکت انکی امتیازی خصوصیات کہی جا سکتی ہیں ۔ مجملاً انکی یہی شاعرانہ خصوصیات ہیں ۔ جن کی بدولت وہ نعت گوئی کی معراج کمال کو پہونچے اور مدح رسول صلعم میں انہوں نے جو کچھ اور جسقدر بھی لکھا شوق و اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں سے لیا اور حسن قبول و شہرت عام نے اپنے دل میں جگہ دی ۔

محسن کا نعتیہ کلام دو چار قصائد اور پانچ مثنویات پر مشتمل ہے ۔ لیکن ان دونوں اصناف میں وہ فنی اعتبار سے اس درجہ کامیاب ہیں اور انہوں نے اپنے لئے ایسی نئی راہ نکالی ہے کہ حیرت ہوتی ہے ۔ مثال کے طور پر ان کے مشہور رزمیہ قصیدے کی تشبیب ایسی نادر و زوردار ہے کہ سودا و ذوق جیسے مشاق قصیدہ گویوں کو بھی نصیب نہ ہو سکی ۔ پھر قصیدہ ہو یا مثنوی ان کے مضمون کی بلندی ' شکوہ الفاظ کی ہمیشہ ہم پہلووہم آہنگ رہتی ہے۔جو یقیناً انکی قادرالکلامی پر دال ہے۔ظاہر ہے مضمون کی مناسبت سے الفاظ کا صحیح استعمال اچھے شعر کے لئے ایک ضروری شرط ہے اور اس معاملہ میں محسن جس قدرت کا ثبوت پیش کرتے ہیں وہ تعریف و توصیف سے مستغنی ہے ۔

اس نعتیہ کلام کے علاوہ آن کے سرمائے میں چند غزلیں ، ایک ناتمام عشقیہ مثنوی ''نگارستان الفت'' ، ایک مثنوی ''فغان محسن'' اور ایک قصیدہ ''چتر شاہی'' واجد علی شاہ اختر کی تعریف میں اور چند قطعات تاریخ و رباعیات ہیں ۔ لیکن رباعیات کو چھوڑ کر جن کا رتبہ بھی خاصا بلند ہے باقی کلام نسبتاً کمتر درجہ کا ہے ۔ جس میں شاعر کی جدت ذہانت ، اور طباعی کا غیر معمولی کارنامہ نظر نہیں آتا ۔

انتخاب کلام

انتخاب قصیدۂ بہاریہ نعتیہ

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لائی ہے صبا گنگا جل

گھر میں اشنان کریں سرو قدانِ گوکل
جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طولِ امل

خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل

کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی
ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل

جانبِ قبلہ ہوئی ہے یورشِ ابرِ سیاہ
کہیں پھر کعبہ پہ قبضہ نہ کریں لات و ہبل

نہ کھُلا آٹھ پہر میں کبھی دو چار گھڑی
پندرہ روز ہوئے پانی کو منگل منگل

دیکھئے ہوگا سری کرشن کا کیونکر درشن
سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بے کَل

کبھی ڈوبی کبھی اُچھلی مہ نو کی کشتی
بحرِ اخضر میں تلاطم سے پڑی ہے ہلچل

شاہد کفر ہے مکھڑے سے اٹھائے گھونگٹ
چشم کافر میں لگائے ہوئے کافر کاجل

جو گیا بھیس کئے چرخ لگائے ہے بھبوت
یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمّل

جگنو پھرتے ہیں جو گلبن میں تو آتی ہے نظر
مصحف گل کے حواشی پہ طلائی جدول

س طرف دیکھئے بیلے کی کھلی ھیں کلیاں
لوگ کہتے ھیں کہ کرتے ھیں فرنگی کونسل
صاف آمادۂ پرواز ھے شاما کی طرح
پر لگائے ہوئے مژگانِ صنم سے کاجل
خوب چھایا ھے سرِ گوکل و متھرا بادل
رنگ میں آج کنھیا کے ھے ڈوبا بادل
شاھد گل کا لئے آج ھے ڈولا بادل
برق کہتی ھے مبارک تجھے سہرا بادل
جب تلک برج میں جمنا ھے یہ کھُلنے کا نہیں
ھے قسم کھائے اٹھائے ہوئے گنگا بادل
راجہ اندر ھے پریخانہ سے کا پانی
نغمۂ نَے کا سری کرشن کنھیا بادل
جوش پر رحمت باری ھے چڑھاؤ خمِ ہے
چشمک برق سے کرتا ھے اشارا بادل
دیکھتا گر کہیں محسن کی فغان و زاری
نہ گرجتا کبھی ایسا نہ برستا بادل

مطلع

پھر چلا خامہ قصیدے کی طرف بعد غزل
کہ ھے چکّر میں سخن گو کا دماغ مختل
ھے سخن گو کو نہ انشا کی نہ املا کی خبر
ھو گئی نظم کی انشا و خبر سب مہمل
دل میں کچھ اور ھے پر منہ سے نکلتا ھے کچھ اور
لفظ بے معنی ھیں اور معنی ھیں سب بے الشکل
کتنا بے قید ھوا کس قدر آوارہ پھرا
کوئی مندر نہ بچا اس سے نہ کوئی استل
اک ذرا دیکھئے کیفیت معراج سخن
ھاتھ میں جام زحل شیشہ مہ زیرِ بغل

گرتے پڑتے ہوئے مستانہ کہاں رکھا پاؤں
کہ تصور بھی وہاں جا نہ سکے سر کے بَل
یعنی اُس نور کے میدان میں پہونچا کہ جہاں
خرمن برق تجلی کا لقب ہے بادل
نار بارانِ مسلسل ہے ملائک کا درود
پئے تسبیحِ خداوندِ جہاں عزّ و جل
کہیں طوبیٰ کہیں کوثر کہیں فردوس بریں
کہیں بہتی ہوئی نہر لبنُ و نہر عسل
کہیں جبریل حکومت پہ کہیں اسرافیل
کہیں رضواں کا کہیں ساقئی کوثر کا عمل
باغ تنزیہہ میں سرسبز نہالِ تشبیہہ
انبیاء جسکی ہیں شاخیں عرفا ہیں کوپل
گلِ خوشرنگ رسول مدنی و عربی
زیبِ دامانِ ادب طرّۂ دستارِ ازل
نہ کوئی اسکا مشابہ ہے نہ ہمسر نہ نظیر
نہ کوئی اُسکا مماثل نہ مقابل نہ بدل
مہر توحید کی ضَو اوج شرف کامہِ نو
شمع ایجاد کی لو بزم رسالت کا کنول
ہفت اقلیم ولایت میں شہ عالی جاہ
چار اطراف ہدایت میں نبیؐ مرسل
ہے تمنا نہ رہے نعت سے تیری خالی
نہ مرا شعر نہ قطعہ نہ قصیدہ نہ غزل
دین و دنیا میں کسی کا نہ سہارا ہو مجھے
صرف تیرا ہو بھروسہ تیری قوت ترا بل

صف محشر میں ترے ساتھ ہو تیرا مدّاح
ہاتھ میں ہو یہی مستانہ قصیدہ یہ غزل

کہیں جبریل اشارے سے کہ ہاں بسم‌اللہ
سمتِ کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

انتخاب مثنوی صبح تجلّی

بیضاوی صبح کا بیاں ہے
تفسیر کتاب آسماں ہے

ہے خاتمۂ شب دل افروز
دیباچہ نگار نسخۂ روز

آثار سحر ہوئے نمایاں
سیپارہ لئے ہوئے ہے دوراں

واللّیل کو ختم کر چکا ہے
آمادۂ دور والضّحیٰ ہے

عنوانِ فلک ہے دُرِّ منثور
لوحِ زرّیں سورۂ نور

اطرافِ بیاض مطلع صاف
والفجر کے حاشیے پہ کشّاف

معمورۂ دہر تا بیاباں
ہم طالع کشور بدخشاں

ہر دشت ہے مثلِ دشت ایمن
ہر کوہ برنگ طور روشن

عالم میں ہے آفتاب تاثیر
آبِ حلب و ہوائے کشمیر

گردوں کے غلاف میں ہے پنہاں
مشکوٰۃ شریف مہر تاباں

آنکھیں نظارے کی طلبگار
نظارے کا بخت خفتہ بیدار

منظور ہے حسن کا تماشا
ہر دیدۂ ہے دیدۂ زلیخا

ہے شرق سے غرب تک پریشاں
نور عینین پیر کنعاں

وہ سورۂ یوسفِ تجلّی
بہ مطلع مصر کی عزیزی

ہستی کا دماغ آسماں پر
اوجِ افلاک مہر گستر

وہ ہے بلغ العلا کی تفسیر — یہ ہے کشف الدّجیٰ کی تعبیر
مضمون طلوع صبح صادق — مشہور روایت مشاروق
موقوف حدیثِ شب کی تصحیح — رکھ دیجئے طاق پر مصابیح
ظلمت کا چراغ بے ضیا ہے — انجم کا ستارہ ڈوبتا ہے
مہتاب کی چاندنی ڈھلی ہے — مریخ کی شست مشتری ہے
روپوش دبیرِ چرخ اخضر — ظلمت کا سیاھہ کر کے آبتر
اھلمدِ کہکشاں ہے مغرور — پروانہ نویسِ شمع کافور
زھرہ کا سفید ھو گیا رنگ — نظم پرویں کا قافیہ تنگ
ہے فکر سپہر رات بھر کی — کیا بات ہے مطلع سحر کی
ہر مطلع صبح صادق آستاد — ازویدہ نوشت صاد بر صاد
ہے وقت اخیر شب خلاھا — الواحِ زبر جد فلک کا
ھنگام سپیدۂ سحرگاہ — ساعات میں روز و شب کے واللہ
اک مخبر صادق البیاں ہے — پیغمبر آخرالزماں ہے
کیفیت وحی میں ہے بلبل — ہے وقت نزول مصحف گل
سبزہ ہے کنار آب جو پر — یا خضر ہے مستعد و ضو پز
نوبت ہے صدائے قمریاں کی — تیاری ہے باغ میں اذاں کی
محو تکبیر فاختہ ہے — قد قامت سروِ دلربا ہے
اک شاخ رکوع میں رکی ہے — اور دوسری سجدے میں جھکی ہے
سوسن کی زبان پر مناجات — جاری لب جو سے التحیات
تشبیح شگوفہ یا مصور — تحریمہ تاک رب اعفر
پھیلی ہوئی بوئے گل چمن میں — اور صلّ علیٰ کا غل چمن میں
غنچے میں ہے خامشی کا عالم — یا صومِ سکوت میں ہے مریم

کیاری ہر ایک اعتکاف میں ہے
اور آبِ رواں طواف میں ہے

چراغِ کعبہ

آغاز روایت

بھیگی ہوئی رات آبرو سے
داخل ہوئی کعبہ میں وضو سے

اوڑھے ہوئے لیلیِ گل اندام
شبنم کی ردا بقصدِ احرام

گویا کہ نہا کے آئی فی الحال
جھک جھک کے نچوڑتی ہوئی بال

کیا سعیِ صفا سے رنگ فق ہے
سر سے پا تک عرق عرق ہے

نامحرموں سے چھپائے چہرہ
پرویں کو بنائے منہ کا سہرا

آنا کھلتا ہوا نہ جانا
انداز خرام صوفیانہ

سنائے کا دم انیس ہمدم
انفاس ہوا رفیق و محرم

خوشبو ہے کہ ہار یاسمن کے
لپٹے ہوئے بالوں میں دلہن کے

یا تازہ بسی ہوئی ختن کی
کلیاں یوسف کے پیرہن کی

ناخن کی جگہ ہلال کی مَد
دفتر سے طلوع کے ندارد

گرتے ہوئے ٹوٹ کر ستارے
ہیں رمی حجار کے اشارے

قربانِ رہ ضرورت ھدی
ثور و حمل سپہر تا جدی

قطبین کے سایۂ ضیا میں
مشغول دگانے کی ادا میں

خلوت کی جائے انجمن کو
پردے میں چھپائے ما و من کو

صورت میں خلاف محترم کے
در پردہ طواف میں حرم کے

مدح جبریل

عمّانِ کرم کے دُرِ منشور
قرآن شرف کے سورۂ نور

مانند دوا زمیں پہ نازل
مانند دعا سپہر منزل

منشور اوامر و نواہی
عنوان صحیفۂ الٰہی

فہرست اخبار اصفیا کی
تاریخ فرشتہ انبیا کی

دُرجِ گہر کلام باری
پیغامبر و پیام باری

وارد ہوئے ابرساں زمیں پر
ساتھ آن کے براق برق پیکر

تمہید صفتِ براق

پہنچا ہے براق تک جو نامہ
دو ہاتھ اچھل پڑا ہے خامہ

شوخی پہ ہے کلک تیز رفتار
جل جائے سپند سبع سیّار

قطبین ہے سُن میان انجم
دُکڑی کی ہوئی ہے چوکڑی گم

چکر میں ہے چار موج دریا
نشّہ سا ہرن ہے چوکڑی کا

مضمون کے جست میں ہے گرمی
یا جستِ کے تار میں ہے بجلی

ہاں اے مرے خامۂ سبک گام
آہستہ خرام بلکہ مخرام

دو چار قدم وہ چل سنبھل کر
حرف اُڑ کے نہ جا سکے فلک پر

گو ہو نہ سکے گا کچھ مگر خیر
لکھ وصف براق آسماں سیر

چھوٹا سا فرس فرشتہ ہیکل
کھیت اُس کا بہشت خلد جنگل

مہ پارہ فلک سے آنے والا
اطلس کو کتاں بنانے والا

یوں چرخ سے نکلے وہ سبک رَو
فانوس سے جس طرح کہ پرتو

شیشے سے پری، چمن سے شبنم
سیپی سے گہر حباب سے دم

گلشن سے بہار جسم سے جاں
آنکھوں سے نیند دل سے ارماں

صحرائے شہود میں رمِ غیب
چلتی ہوئی راہِ عالم غیب

محو روش فراخ بالی
مشتاق خرام لا اُبالی

آدم سے ملک تک ایک رم میں
امکاں سے قدم تک ایک قدم میں

شوخی میں سلوک شوق کا حال
رفتار میں جذب عشق کی چال

نیرنگ طلسم حیرت آئیں
یا گنج روانِ دولتِ دیں

اقبال کا یا کہ بال دیگر
یا روح الامیں کا تیسرا پر

یا دیدۂ منتظر میں نقشا
اُڑتی ہوئی وصل کی خبر کا

بالجملہ وہ دونوں محرمِ قرب
پروانہ و شمع عالمِ قرب

یوں آئے ہو جس طرح سے عاجل
پروانہ چراغ کے مقابل

یا جیسے کہ عاشقان مضطر
اپنا خطِ شوق آپ لے کر

حاضر ہوئے اُس کے آستاں پر
جس کا کہ مکاں ہے لامکاں پر

رباعیات

مولیٰ کی نوازش نہاں کھلتی ہے
عزت مری پیش قدسیاں کھلتی ہے
کہہ دو کہ ملک گوش بر آواز رہیں
مدّاح پیمبر کی زباں کھلتی ہے

اک شان خدا ہے سیّد عالی جاہ
ملک قدم و حدوث کا شاہنشاہ
جس دل پہ کُھلی اس کی حقیقت محسن
بے ساختہ بول اٹھا کہ اللہ اللہ

رہ جاؤ گے ہاتھ زندگی سے دھو کر
پچھتائیں گے اقربا تمہارے ہو کر
محسن ! کیا پوچھتے ہو چھوڑو گھر بار
جنت لو چلے چلو مدینے ہو کر

نظم طباطبائی

سید علی حیدر نام ' نظم تخلص - "نواب حیدر یار جنگ بہادر" خطاب - ۱۶ صفر ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۲ء لکھنؤ کے ایک معزز و معروف خاندان میں پیدا ہوئے - آن کے جد اعلیٰ نواب مختار الدولہ بہادر نواب آصف الدولہ کے نائب السلطنت تھے - نظم کے والد ماجد سید مصطفیٰ حسین ایک سپاھی منش بزرگ تھے جو آخر دم تک خاندانی روایات کے ساتھ دربار لکھنؤ کی بڑی جاں نثارانہ خدمات انجام دیتے رہے - نظم کا ننھیال نواب معتمدالدولہ آغا میر کا خاندان تھا - اس خاندان کے علم و فضل اور ادبی ذوق کا اندازہ ایک بات سے کیا جا سکتا ھے کہ اس خاندان میں کئی شاعر گزرے ھیں - اور اسے نظم کی خوش نصیبی سمجھنا چاھئے کہ اُنھوں نے بچپن ھی سے اپنے ننھیال میں پرورش پائی - نظم کے نانا کے دوستوں میں ایک صاحب منشی منیڈولال زار تھے - جو اپنے زمانے کے اچھے شاعر ھونے کے علاوہ مشہور نثرنگار اور فن عروض و بلاغت میں بھی ماھر تھے - علی حیدر کی ابتدائی تعلیم انھیں بزرگ کے ذمے رھی - اور آن کی معقول تربیت کا یہ اثر ھوا کہ علی حیدر نے پندرہ سال کی عمر تک فارسی کی متداولہ کتابیں ختم کر لیں - پھر عربی کی ابتدائی کتابیں ملا طاھر نحوی سے پڑھیں ابھی عربی درس کی تکمیل بھی نہ ھونے پائی تھی کہ نظم کو کلکتہ جانا پڑا -

نظم طباطبائی مٹیا برج کلکتہ میں شاھزادہ مرزا کام بخش کے اتالیق ھو کر گئے تھے - چنانچہ عرصہ تک وہ یہ خدمت انجام دیتے رہے لیکن ساتھ ھی علامہ قائمۃ الدین مرزا محمد علی مجتہد کے یہاں عربی کی تکمیل بھی کر لی - کچھ عرصہ کے بعد جب مٹیا برج میں شاھزادوں کی تعلیم کے لئے مدرسہ قائم ھوا ' تو انھیں بھی اتالیق مقرر کیا گیا - ۱۹۰۵ء میں نواب واجد علی شاہ اختر کے انتقال کے بعد جب مٹیا برج کی محفل درھم برھم ھو گئی تو نظم بھی وھاں سے نکل کھڑے ھوئے اور میر افضل حسین جو اس وقت حیدرا آباد دکن میں میر مجلس عدالت العالیہ تھے کے توسط سے حیدرآباد پہنچے - یہاں اُنھیں نظام کالج حیدرآباد میں عربی و فارسی کے پروفیسر کی جگہ مل گئی - جس پر وہ تیس سال تک فائز رہے لیکن عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے بعد ان کا تعلق دارالترجمہ سے ھو گیا جہاں وہ ناظر ادب کی حیثیت سے اُردو میں ترجمہ کی ھوئی کتابوں کی زبان و اُسلوب کی اصلاح کی خدمت انجام دیتے تھے - آخر میں اس عہدے سے وظیفہ لیکر علیحدہ ھوئے - مگر مرتے دم تک وہ اس ادارہ کے روح و رواں رہے اور باھر رہ کر بھی بہت سی گراں قدر خدمات انجام دیں - حکومت نظام نے ان کی قابلیت و حسن

خدمات کے صلے میں انہیں وظیفہ عنایت کیا اور ولی عہد بہادر کی اتالیقی کے شرف کے ساتھ ساتھ ''نواب حیدر یار جنگ بہادر'' کا خطاب بھی عطا کیا ۔ غرض اس طرح ایک وقیع علمی و ادبی زندگی گزار کر ۲۳ مئی ۱۹۳۳ء کو نظم نے داعی اجل کو لبیک کہا ۔

نظم طبا طبائی در حقیقت قدیم و جدید شاعری کا ایک سنگھم ہیں ۔ اُن کے مجموعہ کلام میں قدیم شاعرانہ صناعی اور جدید شاعرانہ دلچسپیاں دونوں موجود ہیں ۔ اُنہیں بچپن میں جیسی رنگین شاعرانہ فضا ملی تھی نا ممکن تھا کہ اُس ماحول میں رہ کر وہ شعر و شاعری سے دلچسپی نہ لیتے ۔ چنانچہ حالات کے اقتضا کے موافق اُنہوں نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے شروع کی ۔ لیکن غزل گوئی اُن کا اصل میدان نہ تھی ۔ چنانچہ اس بارے میں وہ خود لکھتے ہیں کہ ''یہ سب غزلیں مشاعروں کی ہیں یا گلدستوں کی طرحوں میں یا بعض احباب کی فرمائشی زمینوں میں ہیں ۔ میں خود سے کبھی غزل نہیں کہتا ۔ ردیفیں پوری نہیں ہیں اور الف بے کا پورا کرنا میں ہمیشہ سے فضول سمجھتا ہوں ، غزل میں مقطع کا ہونا نہ ہونا میرے نزدیک یکساں ھے'' یہی وجہ ھے کہ اُن کی غزلوں میں گرمی نہیں ھے مگر زبان و بیان اور اُصول و ضوابط کے لحاظ سے ہر شعر کانٹے میں تلا ہوا ھے نظم نے جیسا کہ مذکورالصدر بیان سے ظاہر ہوتا ھے اس صنف سخن سے بہت کم دلچسپی لی ھے ۔ ظاہر ھے ایسی صورت میں وہ کیفیت جو غزلوں میں درد و اثر پیدا کرتی ھے کہاں پیدا ہو سکتی ھے ۔

لیکن طباطبائی کا اصلی جوہر اُن کی نظموں میں کھلتا ھے جس کی وجہ سے وہ لکھنؤ کے دبستان شاعری سے نکل کر جدید شعرا کی صف اول میں جگہ پاتے ہیں ۔ نظم نے چونکہ خاصی طویل عمر پائی تھی اس لئے وہ جدید شعری تحریکات سے بھی پوری طرح متاثر ہوئے اور مغربی خیالات و ادب کو اُردو نظموں کے سانچے میں ایسا ڈھالا کہ ملک بھر میں اُن کی شہرت ہو گئی ۔ وہ اُردو شاعری کے اُن ممتاز محسنوں میں سے ہیں ۔ جنہوں نے پہلے انگریزی نظموں کے خیالات اور پیمانے اُس میں رائج کئے ۔ اور ترجمے میں اصل کی شان پیدا کر دی ۔ اُنہوں نے انگریزی شاعر '' گرے '' کی اکثر نظموں کا کامیاب منظوم ترجمہ کیا ھے جن میں ایلے جی (Elegy) کا ترجمہ ''گور غریباں'' بہت ہی مقبول و مشہور ہوا ۔ اس نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے اُن کے شاگرد رشید مولانا عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں ۔ ''ترجمہ۔۔۔۔اس کمال کے ساتھ کیا ھے کہ وہی انگریزی کا سوز و گداز اُردو میں بھی پیدا ہو گیا ھے ۔ اس کی خوبی کا اظہار اختیار سے باہر ھے ۔ ایسی جانگداز نظمیں اوریجنل طور پر بھی اُردو میں کم لکھی گئی ہیں'' اس کے علاوہ نظم نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں مثلاً مناظر فطرت ، اخلاقیات ، تاریخ وغیرہ اور ہر ایک میں خیال و حقیقت کے ساتھ شاعری کا لطف پوری طرح قائم رکھا ھے مناظر فطرت کے سلسلے میں اُن کی نظم ''گلاب کا پھول'' باوجودیکہ ایک مختصر سی نظم ھے مگر اس اختصار میں اُنہوں نے دنیا کی بے ثباتی اور انجام کا جو نقشہ پیش کیا ھے وہ ایک بلیغ کارنامہ ھے ۔ اُن کا ساقی نامہ بھی اپنے منفرد اُسلوب بیان اور اثر آفرینی کے جوہر کے باعث ایک معرکہ آرا نظم

ہے ۔ نظم نے اپنی اس اخلاقی نظم میں شراب کی مذمت نہایت موثر طور پر کی ہے ۔ اُن کی یہ نظم در حقیقت ''خطاب بہ اہل اسلام'' کی طرح قومی نظموں میں سے ہے جو اُنہوں نے مولانا حالی کی قومی نظموں کے زیر اثر لکھی تھی ۔

نظم نے غیر مقفیٰ نظموں کو بھی اُردو میں رائج کرنے کی پہلی کوشش کی تھی جس میں اُن کے شاگرد مولانا شرر اُن کے ساتھی تھے ۔ اُن کی یہ کوشش اگرچہ اُس زمانے میں بار آور نہ ہوئی کیونکہ قدیم نقادان شعر نے اسے سرے سے نظم ہی تسلیم نہ کیا تا ہم اُن کی یہ سعی رائیگاں نہیں گئی اور موجودہ دور میں اس نے ایک مانوس صنف نظم کی صورت اختیار کر لی ہے ۔

طباطبائی کے ان اجتہادات و کمالات شاعری کے علاوہ اُن کی شہرت کو چار چاند لگانے میں موصوف کے قصائد نے بھی کچھ کم حصہ نہیں لیا ۔ اس زمرے میں وہ محسن کاکوروی سے بہت متاثر ہوئے اور اُنہیں کی طرح نعتیہ قصائد لکھے ۔ البتہ فرق صرف اتنا ہے کہ محسن کے قصائد کی سادگی نظم کے یہاں فلسفیانہ خیالات اور علمیت سے بدل گئی ہے ۔ اس کے علاوہ تاریخی عنصر بھی اُن کے قصائد میں موجود ہے چنانچہ معرکہ آرائیوں کا ذکر وہ ایسی فصاحت کے ساتھ کرتے ہیں کہ جنگ کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ واقعات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے اور لوگوں کی سیرت کا بھی پورا اندازہ ہوتا ہے ۔ اُن کے کم و بیش تمام نعتیہ قصائد کی یہ خصوصیت ہے کہ اُن کی تشبیہوں میں فلسفیانہ و تصوفانہ مضامین نظم کئے گئے ہیں ۔ بعض قصائد کی تشبیب میں اخلاقی مضامین بھی باندھے ہیں مثال کے طور پر اُن کے یہ دو شعر دیکھئے ۔

کیا اشارے کر رہی ہے دیکھ چشم روزگار
کیا شرارے بھر رہا ہے ابلقِ لیل و نہار

کاروانِ ابر تر کی قطرہ افشانی کو دیکھ
ایک، ہے وقتِ سفر وادی و دشت و کوہسار

ان میں پند و تلقین موجود ہے مگر اسے بھی طباطبائی کے شاعرانہ اُسلوب نے دلکش و دلچسپ بنا دیا ہے ۔

نظم کے کلام میں عام طور پر زبان و محاورہ کی خوبی اور تشبیہات میں ندرت و شگفتگی پائی جاتی ہے ۔ اُن کی نظمیں روانی اور نشست الفاظ کی وجہ سے بڑی مترنم ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اُن میں دلکشی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ۔ مبالغہ و ابتذال کا کہیں نام نہیں ۔ البتہ کہیں کہیں فارسی و عربی کے الفاظ آ جانے سے ثقالت ضرور پیدا ہو گئی ہے ۔ جسکی وجہ شاید طباطبائی کا وہ ماحول ہے جس میں اُنہوں نے پرورش پائی اور فارسی و عربی کا بہت گہرا اثر اُن کی طبیعت پر ہوا ۔ تا ہم اُن کی مجموعی خصوصیات کلام کے مقابلہ میں یہ نا خوشگوار پہلو کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا ۔

انتخاب کلام

تغزل

ادا میں سادگی میں کنگھی چوٹی نے خلل ڈالا
شکن ماتھے پہ ابرو میں گرہ گیسو میں بل ڈالا
کھلے دو پھول نیلوفر کے آنکھیں اس نے جب کھولیں
ستم کیسا کیا شرمانے ہاتھوں سے جو مل ڈالا
شکن ماتھے پہ آئی اب بھلا کیوں رخ لگے کرنے
تعلّی بڑھ گئی مُوباف جو پہلے پہل ڈالا

خوشبو سے یوں ہی ہوش رُبا وصل کی شب تھی
گیسو ہوئے برہم تو کھلا نافۂ چیں اور
اللہ رے ساقی کا بضد ہو کے پلانا
کہتا ہوں میں بس بس تو وہ کہتا ہے نہیں اور

دیکھتا ہوں کبھی حسرت سے تو کہتا ہے وہ شوخ
تو مجھے دیکھ کے جلتا ہے تو جل کیا ہوگا

اڑ کے باقی ہے مری خاک ادھر گاہ ادھر
کچھ پتہ دے نہ گئی عمر گریزاں اپنا

اسیری میں بہار آئی ہے فریاد و فغاں کر لیں
نفس کو خوں فشاں کر لیں قفس کو بوستاں کر لیں

دل اس طرح ہوائے محبت میں جل گیا
بھڑکی کہیں نہ آگ نہ اٹھّا دھواں کہیں

مجھے پیری اور شباب میں جو ہے امتیاز تو اس قدر
کوئی جھونکا بادِ سحر کا تھا مرے پاس سے جو گزر گیا

ہنسی ہنسی میں وہ بات کہدی کہ رہ گئے آپ دنگ ہو کر
چھُپا ہوا تھا جو راز دل میں کھُلا وہ چہرے کا رنگ ہو کر
شباب و پیری کا آنا جانا غضب کا پُر درد ہے فسانہ
یہ رہ گئی بن کے گردِ حسرت وہ اڑ گیا رخ سے رنگ ہو کر

یہ کس دھوکے میں جان اپنی دئے دیتے ہیں پروانے
انہوں نے شمع کے شعلے کو شاید تاجِ زر جانا
ذرا سی آبرو جو قطرۂ شبنم سے بھی کم تھی
سنا جوہر شناسوں نے اُسے آبِ گہر جانا

سارے عالم کو بنایا ہدفِ تیرِ اجل
قادر انداز نے یہ فعل حکیمانہ کیا
آج گردوں میں کیا شہرۂ آفاق جسے
کل اُسے محفلِ احباب کا افسانہ کیا
الحذر نظم بہت جھک کے فلک ملتا ہے
خوف کی بات ہے دشمن نے جو یارانہ کیا

ادھر جوانی کی شام آئی اُدھر ہوئی صبحِ عہدِ پیری
یہ کیسی شام و سحر الٰہی کہ جس میں شب درمیاں نہیں ہے
اگرچہ ہے بے ثبات عالم ٹھہر کوئی دم تو اور شبنم
ترا قدم تو سبک ہے ایسا کہ برگِ گل پر گراں نہیں ہے

ہستی کا شور تو ہے مگر اعتبار کیا
جھوٹی خبر کسی کی اُڑائی ہوئی سی ہے
منزل اسے سمجھ کے کمر کھولتے ہیں ہم
بستی جو رہزنوں کی بسائی ہوئی سی ہے

مجھے دوڑا رہا ہے شوق منزل کا یہ کہہ کہہ کر
کہ گرنا بار بار اچھا ہے اٹھنا دم بدم اچھا

گور غریباں

(انگریزی شاعر گرے کی نظم کا آزاد ترجمہ)

وداعِ روز روشن ہے گجر شام غریباں کا
چراگاہوں سے پلٹے قافلے وہ بے زبانوں کے
قدم گھر کی طرف کس شوق سے اٹھتا ہے دھقاں کا
یہ ویرانہ ہے میں ہوں اور طائر آشیانوں کے

اندھیرا چھا گیا دنیا نظر سے چھپتی جاتی ہے
جدھر دیکھو اٹھا کر آنکھ ادھر اک ہُو کا ہے عالم
مگس لیکن کسی جا بھیرویں بے وقت گاتی ہے
جرس کی دُور سے آواز آتی ہے کبھی پیہم

کبھی اک گنبدِ کہنہ پہ بومِ خانماں ویراں
فلک کو دیکھ کر شکووں کا دفتر باز کرتا ہے
کہ دنیا سے الگ اک گوشۂ عزلت میں ہوں پنہاں
کوئی پھر کیوں قدم اس کُنجِ تنہائی میں دھرتا ہے

قطار اک سامنے ہے مولسریوں کے درختوں کی
وہاں قبریں بھی ہیں مٹی کے جیسے ڈھیر ہوتے ہیں
ہر اک نے مر کے بس دو گز کفن گز بھر زمیں پائی
بسانے والے جو اس گاؤں کے تھے سب وہ سوتے ہیں

نفس بادِ سحر کا، نالۂ پُر درد بلبل کا
ہوئے بیکار سب ان کو اٹھا سکتا نہیں کوئی
رہی بے فائدہ مستوں کی ہُو حق، شور قلقل کا
ہیں ایسے نیند کے ماتے جگا سکتا نہیں کوئی

نہ چولھے آگ روشن ہے نہ اب اُن کے گھڑے پانی
نہ گھر والوں کو کچھ اب کام ہے فکرِ شبستان سے
نہ بی‌بی کو سرِ شام انتظار اور اب نہ حیرانی
نہ بچے دوڑتے ہیں اب کہ لپٹیں آکے داماں سے

وہی ہیں یہ جنہیں وقت ورد مہلت نہ تھی دم بھر
وہی ہیں ہاتھ چلتے رہتے ہی تھے بیشتر جن کے
وہی ہیں یہ جنہوں نے ہل چلائے گیت گا گا کر
بڑے سرکش درختوں کو گراتے تھے تبر جن کے

نہ دیکھیں حال ان لوگوں کا ذلت کی نگاہوں سے
بھرا ہے جن کے سر میں غرۂ توّابی و خانی
یہ اُن کا کاسۂ سر کہہ رہا ہے کج کلاہوں سے
عجب ناداں ہیں وہ جنکو ہے عُجب تاجِ سلطانی

نہیں شایاں فخر و ناز و نوبت اور نقّارہ
جو نازاں جاہ و ثروت پر ہیں اُن پر موت ہنستی ہے
وہ ساعت آنیوالی ہے نہیں جس سے کوئی چارہ
کہ فانی ہے جہاں ' ہر اوج کا انجام پستی ہے

نظر آتے نہیں کتبے مزاروں پر تو کیا غم ہے
چراغاں اور صندل اور گل و ریحاں نہ ہو تو کیا
نہیں نمگیر اور کمخواب کی چادر تو کیا غم ہے
جو خوش آہنگ کوئی قاریٔ قرآں نہ ہو تو کیا

بناتے ہُو بہُو تصویر اگر مدفن پہ رکھنے کو
پلٹ کر اُس سے کچھ نکلی ہوئی سانس آ نہیں سکتی
دُعا ہو فاتحہ ہو مرثیہ ہو آہ و زاری ہو
کوئی آواز اُن کے کان ہی تک جا نہیں سکتی

خدا جانے تھے ان لوگوں میں کیا کیا جوہرِ قابل
خدا معلوم رکھتے ہوں گے یہ ذہنِ رسا کیسے
خدا ہی کو خبر ہے کیسے کیسے ہوں گے صاحب دل
خدا معلوم ہوں گے بازوئے زور آزما کیسے

زمانے نے مگر کوئی ورق ایسا نہیں آلٹا
کہ بارِ فکر سے مہلت یہ پاتے سر آٹھانے کی
مصیبت نے طبیعت کی روانی کو کیا پسپا
کہ بار آنے نہ پائی جوہرِ ذاتی دکھانے کی

بہت سے گوہرِ شہوار باقی رہ گئے ہونگے
کہ جن کی خوبیاں سب مٹ گئیں تہ میں سمندر کی
ہزاروں پھول دشت و در میں ایسے بھی کھلے ہونگے
کہ جن کے مسکرانے میں تھی خوشبو مشکِ ازفر کی

یہ صاحب عزم ہیں گو رزم کی نوبت نہیں آئی
حکومت اپنے قریہ میں کی لیکن دوست دشمن پر
وہ فردوسی یہ ہیں جن کی زباں کُھلنے نہیں پائی
وہ رستم ہیں نہیں سہراب کا خوں جن کی گردن پر

مقّدر نے انہیں مصروف رکھا قلبہ رانی میں
وگرنہ حکمرانی کا بھی یہ جلوہ دکھا دیتے
عجب کیا شہرۂ آفاق ہوتے خوش بیانی میں
اور اپنے کارنامے اہلِ عالم کو سنا دیتے

رہے مصروف نیکی میں بچے ہر اک برائی سے
نہ زورِ مردم آزاری نہ شورِ فتنہ انگیزی
نہ دولت کی طمع میں بیگناہوں کے گلے کاٹے
نہ کی خلقِ خدا کے ساتھ بے رحمی و خوں ریزی

نہ صحبت میں امیروں کی کبھی خوں جگر کھایا
نہ اونٹایا کبھی اپنا لہو جھوٹی خوشامد سے
نہ مل کر روغنِ قاز آتشِ نفرت کو بھڑکایا
کہ جس سے خود پسندوں کا تبختر بڑھ چلے حد سے

الگ ہر نیک و بد سے دور دنیا کے مکائد سے
گئے بیگانہ وار اور خلق میں بیگانہ وار آئے
رہے محفوظ ابنائے زمانہ کے مفاسد سے
قدم راہِ توکل سے کبھی ڈگنے نہیں پائے

نہ دیکھ ان استخواں ہائے شکستہ کو حقارت سے
یہ ہے گورِ غریباں اک نظر حسرت سے کرتا جا
نکلتا ہے یہ مطلب لوح تربت کی عبارت سے
" جو اس رستے گزرتا ہے تو ٹھنڈی سانس بھرتا جا "

لکھے ہیں نام ان قبروں پہ گو کاواک حرفوں میں
مگر بھولے ہوؤں کو ٹھیک رستہ یہ بتاتے ہیں
زیادہ اس سے بڑھکر اور کیا ہوگا اگر سوچیں
کہ جو مرنے سے ناواقف ہیں رستہ سیکھ جاتے ہیں

جو آیا ہے جہاں میں یاں سے جانا ہے اسے اک دن
یہ ہوتا ہے کوئی چاہے گا دل سے یا نہ چاہے گا
مگر جاتے ہوئے پھر کر نہ دیکھے یہ نہیں ممکن
دلوں سے یاد بھی مٹ جائے یہ حاشانہ چاہے گا

کوئی زانو کسی کا ڈھونڈتا ہے دم نکلنے کو
کہ دیکھے اشک گرتے چاہنے والے کے دامن میں
کسی کو ہے یہ خواہش دوست کاندھا دیں جنازے کو
پھر اسیر فاتحہ کی آرزو ہے کُنجِ مدفن میں

حقیقت غور سے دیکھی جو ان سب مرنے والوں کی
تو ایسا ہی نظر آنے لگا انجام کار اپنا
انہیں کی طرح جیسے مل گئے ہیں خاک میں ہم بھی
یوں ہی پرسانِ حال آ نکلا ہے اک دوست دار اپنا

یہ اس سے ایک دھقانِ کہن سال آکے کہتا ہے
کہ ہاں ہاں خوب ہم واقف ہیں دیکھا ہے اُسے اکثر
پھر اسکے بعد دل ہی دل میں کچھ غم کھا کے کہتا ہے
کہ اب تک پھرتا ہے آنکھوں میں پھرنا اُس کا سبزہ پر

وہ اس کا نور کے تڑکے ادھر گلگشت کو آنا
وہ پو پھٹنے سے پہلے آ کے پھرنا سبزہ زاروں میں
وہ کچھ کم دن رہے اُس کا لب جُو کی طرف جانا
وہ اُس کا مسکرانا دیکھ کر شور آبشاروں میں

کبھی ایسی ھنسی لب پر کہ ظاہر جس سے کچھ نفرت
اور اسکے ساتھ ہی کچھ زیرِ لب کہتے ہوئے جانا
کبھی تیوری چڑھائے منہ بنائے رنج کی صورت
کہ جیسے دل پہ صدمہ ہے زباں جس سے ہے بیگانا

غرض کیا کیا کہوں اک روز کا یہ ذکر ہے صاحب
کہ اس میداں میں پھرتے صبح دم اسکو نہیں دیکھا
ہوا پھر دوسرا دن اور نظر سے وہ رہا غائب
خیاباں پر اسے پایا نہ دریا پر کہیں دیکھا

پر اس کے تیسرے دن دیکھتا کیا ہوں جنازے کو
لئے آتے ہیں سب پڑھتے ہوئے کلمہ شہادت کا
تمہیں پڑھنا تو آتا ہوگا آؤ پاس سے دیکھو
یہ اس کی قبر ہے اور یہ کتابہ سنگِ تربت کا

اب آغوشِ لحد میں سو رہا ہے چین سے کیسا
گیا افسوس لیکن یہ جواں ناکام دنیا سے
دکھایا جاہ و شہرت نے نہ بھولے سے بھی منہ اپنا
پھر ایسے نامرادوں کا بھلا کیا کام دنیا سے

ہر اک کے درد دُکھ سے اس کو رہتا تھا سدا مطلب
ہوا ممکن تو یاری کی نہیں تو اشک باری کی
دیا دستِ تہی کے ساتھ طینت میں کرم یا رب
میں تیری شان کے قربان کیا اچھی تلافی کی

خدا بخشے اسے ' بس دوست کا رہتا تھا وہ جویا
تو نکلا دوست آخر اک خداوندِ کریم اُس کا
اب اس کے نیک و بد کا ذکر کرنا ہی نہیں اچھا
کہ روشن ہے خدا پر عالمِ اُمید و بیم اُس کا

جوش گل

وہ موسم ہے کہ خوبانِ چمن بنتے سنورتے ہیں
یہ عالم ہے کہ جیسے رنگ تصویروں میں بھرتے ہیں
ہے خوابیدہ جو سبزہ آئینہ خانہ میں شبنم کے ٭
نفس دزدیدہ بادِ صبح کے جھونکے گزرتے ہیں

پرِ طوطی پہ ہوتا ہے دُم طاؤس کا دھوکا
ہوا سے اڑ کے برگِ گل جو سبزہ پر بکھرتے ہیں
ملا ہے سبزۂ نوخیز کو کیا رنگِ زنگاری
ہوا لگنے سے جس کی ' زخم دل لالہ کے بھرتے ہیں
شگوفہ ریز ہو کر ڈالیاں مدھوش کرتی ہیں
کہ میکش جانتے ہیں طاق سے شیشے اترتے ہیں
نزاکت سے ادا سے جُھوم کر کہتی ہے شاخِ گل
یونہیں اک جام پی کر رنگ مستوں کے نکھرتے ہیں

بشاشت کنہہ رهی هے چهرهٔ گل کی ادهر دیکهو
یونہیں محفل میں هنس دیتے هیں پیمانے جو بهرتے هیں
چمن کی بڑھ کے شاخیں ابر سے کرتی هیں گل بازی
گلوں کی آئینه داری پرِ طاؤس کرتے هیں
گماں هوتا هے ' کی لشکر کشی بادِ بهاری نے
زره پوش آب هو جاتا هے جب بادل گزرتے هیں
دمِ صبحِ بهاری هے رخ خور پر نقاب افگن
کسی آئینه پر تارِ نفس جیسے بکھرتے هیں
وهیں جا کر تھمے گا کاروانِ لاله و گل بھی
نسیمِ صبح کے جھونکے جہاں جا کر ٹھہرتے هیں
نہالانِ چمن کر لیں گے قبضه سارے عالم پر
وهاں سے پهر نہیں هٹتے جہاں په پاؤں دهرتے هیں
زمیں پر جال پهیلایا هے کوسوں زلف سنبل نے
عنادل ان دنوں آتے هوئے گلشن میں ڈرتے هیں
جواب جشنِ جم هے گرمئی هنگامهٔ گلشن
که لے کر کشتئی مے تخت پریوں کے اترتے هیں
عنادل مل چکے هیں خاک میں جو' کیا خبر ان کو
که شاخیں جهومتی هیں پهول تربت پر بکهرتے هیں

نزول وحی

قدم چالیسویں منزل میں اس یوسف نے جب رکها
تو پهنچا کاروانِ وحی آوازِ جرس هو کر
عجب آهنگ تها جس نے جگایا بهی سلایا بهی
که دل تو جاگ اٹها آنکهوں میں غفلت نیند کی چهائی
هوا سینه میں اس سے موجزن ایک لُجّهٔ عرفاں
که تاب اس جزر و مد کی فطرت انساں نہیں لائی
بڑها جوش اس کا بڑھ کر ساحلِ افلاک تک پهونچا
اٹهی موج اس سے اٹھ کر عرش کی زنجیر کهڑکائی

جھروکہ عرش کا روح‌القدس نے کھول کر دیکھا
تو نکلا مدتوں کا ربط برسوں کی شناسائی
ہوئیں جاری زباں پر آیتیں وہ نور کی جس پر
فدا ہو لحنِ داؤدی و انفاس مسیحائی

شرکتِ محفل

تو ہمیشہ رھتا ہے چیں بر جبیں افسردہ دل
پھر کسی کی بزم عشرت میں نہ جا بہر خدا
خود ھی اپنی جاں سے بے زار تو انصاف کر
تجھ سے اھلِ بزم پھر کس طرح خوش ہوں گے بھلا
چاھئے اس طرح جانا محفل احباب میں
باغ میں جس طرح خوش خوش آتی ہے بادِ صبا
خیرمقدم کا اشارہ جھوم کر کرتی ہے شاخ
اور چٹک کر دیتی ھیں کلیاں صدائے مرحبا
جس شجر کے پاس سے گزرے، لگا وہ جھومنے
پہنچی جس غنچے تک، افسردہ تھا وہ ھنسنے لگا
دل پہ جو گزرے وہ گزرے کیوں کسی کو ھو خبر
سب سے بڑھ کر ہے خدا تو حال دل کا جانتا
شادی و غم جب کہ دونوں ھیں جہاں میں بے ثبات
وقت اپنا کاٹ دے ھنس بول کر بہرِ خدا

ساقی نامہ (چند شعر)

بیں یہ عہد اور ہے ساقی
اھلِ یورپ کا دور ہے ساقی
کی ہے کوشش انھوں نے خاطر خواہ
پائی ہے مدتوں میں ھند کی راہ
کر کے زحمت جو آئے اتنی دور
محض ترویجِ بادہ تھی منظور
جو مسلماں ھیں امتِ انگریز
مے کشی سے انھیں نہیں پرھیز

بادہ خواری کا شغل گھر گھر ہے   اور تاڑی تو شیرِ مادر ہے

پہلے پاسی چار پیتے تھے   مردم بے وقار پیتے تھے

اب تو اہل علوم پیتے ہیں

ماحیان رسوم پیتے ہیں

شوق قدوائی

احمد علی نام شوق تخلص - ۱۸۵۳ء میں مضافات لکھنؤ میں قصبہ جگور میں پیدا ہوئے - اُن کے والد شیخ کاظم علی قدوائی بھی شاعر تھے اور قیس تخلص کرتے تھے - لیکن شوق کی کم سنی میں اُن کے انتقال ہو جانے نیز ۱۸۵۷ء کے غدر کے ہنگامے میں آبائی جائداد کے تلف ہونے کے باعث شوق کا بچپن بڑی مصیبت اور پریشانی میں گزرا - چند رفقاء کی اعانت سے اُنہوں نے ابتدائی فارسی و عربی کی کتابیں پڑھیں - پھر ایک عزیز کے یہاں بدایوں میں رہ کر سرکاری اسکول میں انگریزی کی تحصیل کی - مگر ابھی تکمیل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اُنہیں رامپور جانا پڑا جہاں وہ عرصہ تک تعلیم پاتے رہے - پھر تلاش معاش کی طرف متوجہ ہوئے - پہلے کچھ مدت تک فیض آباد میں تحصیلدار رہے لیکن اس میں اپنے ادبی مذاق کی تسکین نہ پاتے ہوئے جلد استعفیٰ دے دیا اور صحافت کو اپنا پیشہ بنانا چاہا - لکھنؤ آ کر ایک اخبار ''آزاد'' نکالنا شروع کیا - لیکن اس سعی میں اُنہیں کامیابی نہ ہوئی - چنانچہ اسے بھی چھوڑا اور پرتاب گڈھ میں ملازم ہو گئے - اس کے بعد ریاست بھوپال پہنچے اور مختلف عہدوں پر فائز رہ کر آخر عمر میں رامپور آ گئے - جہاں وہ سرکاری کتب خانہ میں ''حامداللغات'' کی تدوین کا کام سر انجام دیتے رہے - لیکن کچھ عرصہ کے بعد علالت و ضعیف العمری کی وجہ سے پنشن لے کر بارہ بنکی میں سکونت اختیار کی جہاں اُن کے خاندان کے بہت سے افراد متوطن تھے - بالاخر ۱۹۲۸ء میں گونڈہ میں انتقال کیا -

شوق کو بچپن سے شعر و شاعری کا ذوق تھا - اُن کا زمانہ قدیم و جدید رجحانات شاعری کی آمیزش و آویزش کا دور تھا - ایک طرف ناسخ و امانت لکھنوی کا رنگ بھی باوجود ہلکا پڑ جانے کے لکھنؤ میں موجود تھا دوسری طرف انیس و دبیر جیسے اعلیٰ فنکاروں کی منظرنگاری و جذبات نگاری کا دور دورہ تھا - مظفر علی خاں اسیر بھی اسی عہد میں تھے جو اپنے اُستاد مصحفی کے رنگ کو چمکا رہے تھے چنانچہ امیر مینائی کی طرح شوق بھی اسیر کے شاگرد ہوگئے - اس کے ساتھ ساتھ شوق نے قلق لکھنوی کی صحبتوں سے بھی خاصا فیض حاصل کیا - یہ فیضان اُن کے کلام میں محلات کی زبان و محاورہ کی بھرپور قدرت کی شکل میں ظہور پذیر ہوا -

شوق نے کافی عرصہ تک غزل گوئی کی اور ایک پورا دیوان مرتب کیا - ابتدائی غزلیں تو بالکل قدیم طرز کی ہیں لیکن آخری دور کا کلام نسبتاً صاف ہے - اس میں عورتوں کی گفتگو کا پورا حسن نظر آتا ہے اُنہوں نے اپنی شاعری میں محاورات و اسلوب کا ایک ایسا مخصوص رنگ اختیار کر لیا ہے جو اُنہیں کا ہو کر رہ گیا - اس میں شک

نہیں کہ اُن کی غزلوں میں کہیں کہیں تکلف و تصنع کے آثار بھی پائے جاتے ھیں لیکن اس کے ساتھ ھی ھندی ماحول اور جذبات کے جیسے کامیاب نقشے اُنہوں نے کھینچے ھیں وہ اُنہیں کا حصہ ھیں ۔ تاھم شوق کی شہرت کا دار و مدار اُن کی مثنویات پر ھے ۔ اس میدان میں اُن کا پہلا کارنامہ ''ترانہ شوق'' ھے جو ۱۸۸۷ء میں شائع ھوئی ۔ اور اس کی بدولت وہ شاعروں کی صف میں اُبھرے ۔ اس مثنوی میں شوق نے قدیم محاسن شاعری کو ھی معیار بنایا اور حقیقت میں ''گلزار نسیم'' کی خصوصیات کو اپنایا ھے ۔ لیکن اس کی ابتدا شوق کی مثنوی ''عالم خیال'' کی صورت میں جلوہ گر ھوئی جو یقیناً اُن کی شعری قابلیت کا معراج کمال ھے ۔ یہ مثنوی اُردو نظم میں بالکل انوکھی ھے ۔ اس کا موضوع ایک فراق زدہ ھندوستانی عورت کی یاد شوھر ھے ۔ جس میں شوق نے صنف لطیف کے نازک اور مشکل جذبات کو انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ دلکش پیرائے میں نظم کیا ھے پوری نظم نسوانی جذبات کا ایک ایسا مرقع ھے جس میں یکے بعد دیگرے لطیف سے لطیف تر نقوش اُبھرتے ھیں ۔ اس پر صاف ، سادہ ، نازک اور شیریں زبان نے شوق کو اور بھی چار چاند لگا دئے ھیں ۔ یہی وجہ ھے کہ جب یہ پہلی مرتبہ شائع ھوئی تو متعدد اھل قلم حضرات نے اس پر اظہار خیال کیا اور اسے انگریزی نظموں کے ھم پلہ قرار دیا ۔ اس سلسلے میں سر شاہ سلیمان مرحوم کی تنقید کا ایک فقرہ یادگار بن چکا ھے ۔ وہ لکھتے ھیں کہ اس نظم میں ''عورت کا دل مرد کا قلم بن کر بول رھا ھے'' ۔ اس نظم کی دیگر اھم خصوصیات سے قطع نظر ایک خوبی یہ بھی ھے کہ اس نظم کی زبان میں شروع سے آخر تک ایک بھی اضافت استعمال نہیں کی گئی ھے ۔ اور یہ التزام شوق نے اس اصلیت کے پیش نظر روا رکھا کہ لکھنوی عورتوں کی زبان میں اضافت جائز نہیں سمجھی جاتی ۔ بحیثیت مجموعی یہ مثنوی اُردو ادب میں ایک بلند پایہ تخلیق ھے اور اس کی بدولت شوق قدوائی زندہ اور لکھنوی دبستان شاعری میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ھیں ۔

لیکن شوق کی شعری کائنات غزل و مثنوی ھی پر ختم نہیں ھو جاتی بلکہ نظم جدید کا بھی احاطہ کرتی ھے ۔ اُنہوں نے جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ھے چونکہ خاصی طویل عمر پائی اور تقریباً پچاس برس تک شعر و شاعری کرتے رھے اسلئے انہیں عصری انقلابات سے متاثر ھونے کا موقع ملا ۔ اور اُنہوں نے سر سید اور اُنکے رفقاء کی تحریکات کے زیر اثر اخلاق و قومی شاعری میں بھی حصہ لیا ۔ جس کے ثبوت میں اُن کی بہت سی نظمیں پیش کی جا سکتی ھیں بالخصوص اُن کا مسدس ''لیل و نہار'' جو اُنہوں نے خود مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے ایک اجلاس منعقدہ ۱۸۸۹ء میں پڑھا تھا ۔ اس مسدس کو دیکھ کر بلا خوف تردید کہا جا سکتا ھے کہ وہ اصلاح شاعری کے علمبردار تھے ۔ صرف ایک بند ضمناً دیکھتے چلئے ۔

ایشیائی شاعری انسان کو اک روگ ھے
ضعف ھے دل کو جگر کو جان کو اک روگ ھے
دین کو پیغمبروں کی شان کو اک روگ ھے
کعبے کو اک روگ ھے ایمان کو اک روگ ھے
عقل سے جو ھٹ کے کوسوں جا پڑا شاعر بنا
جو بڑا جھوٹا بنا گویا بڑا شاعر بنا

لکھنوی رنگ تغزل سے یہ بیزاری اُن کی اخلاق و قومی منظومات کا حسین روپ دھار کر ظاہر ہوئی ۔ اس رنگ میں شوق کی شاعری متنوع ہے اور اُنہوں نے شاعرانہ و علمی موضوعات ' دونوں کو خوب خوب برتا ہے ۔ ''حسن'' ''بہار'' ''ہندوستان کی برسات'' ''ایک حسین لڑکی'' اور ''بندھیا چل کی چاندنی رات'' جیسی نظموں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جس طرح اُنہیں جذبات کی صورت کشی پر عبور حاصل تھا اُسی طرح منظر نگاری میں بھی وہ بڑی چابکدستی کے ساتھ قلم اُٹھاتے تھے ۔ شوق کی ایسی نظمیں اسماعیل کے ہم پلہ ہیں لیکن ان میں اسماعیل کی حسن کارانہ سادگی ' بیان کی طوالت اور عمق و گہرائی میں بدل گئی ہے ۔ اور مشاہدے کی قوت و رنگا رنگی قابل داد ہے ۔ اس پر ان نظموں کے مقامی رنگ اور حسن کے بسیط تخیل نے ان کی خوبی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے ۔ اس سلسلے میں اُن کی نظم ''برسات'' کا ایک منظر ملاحظہ ہو ۔

ھو چکے تالاب لبریز اور نہریں بھر چلیں
ندیاں اپنی حدوں سے بڑھ کے قبضہ کر چلیں

پیچ و خم کے ساتھ بہنے سے کھلا مستی کا حال
ندیاں چلتی ہیں میدانوں میں متوالوں کی چال

کس لئے غصے کی حالت ان پہ طاری ہو گئی
کف لبوں پر آ گیا آواز بھاری ہو گئی

کیوں بھنور چکر میں ہیں موجونکو کیوں ہے پیچ و تاب
کیوں غضب کے جوش میں آنکھیں دکھاتے ہیں حباب

مفت پا کر ' کی زمیں نے ابر کی دولت تلف
کسقدر پگھلی ہوئی ' چاندی بہائی ہر طرف

ندّیوں کو لے کے یوں دریا سمندر سے ملے
لے کے ارمانوں کو عاشق جیسے دلبر سے ملے

شوق کی طبیعت میں بے حد جدت طرازی اور یگانہ روی تھی اور وہ بے حد محنت و کاوش سے اپنے کلام کو سر انجام دیتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے قدیم و جدید دونوں معیار شاعری کے تحت جو کچھ بھی کہا ہے اُس میں اپنی ایک الگ راہ ضرور نکالی ہے ۔ اُن کی زبان روز مرہ کی سلیس زبان اور بندش بڑی چست و نفیس ہے ۔ اُنہوں نے بعض خشک موضوعات پر بھی نظمیں لکھی ہیں لیکن ان کے پیچیدہ و دقیق مسائل پر جس شگفتہ و دلکش انداز میں اُنہوں نے خامہ فرسائی کی ہے وہ اُن کی قادرالکلامی پر دال ہے ۔

انتخاب کلام

غزل

روح کو آج ناز ہے اپنا وقار دیکھ کر
اس نے چڑھائیں تیوریاں میرا قرار دیکھ کر

قصدِ گِلہ نہ تھا مگر حشر میں شوق جوش سے
ہاتھ مرا نہ رک سکا دامنِ یار دیکھ کر

دیکھ کے ایک بار اُنہیں دل سے تو ہاتھ دھوچکے
دیکھئے کیا گزرتی ہے دوسری بار دیکھ کر

آتے ہیں وہ تو پہلے ہی رنج سے صاف ہو رہوں
آکے کہیں پلٹ نہ جائیں دل میں غبار دیکھ کر

وصل سے گزرے اے خدا ہاں یہ شگون چاہئے
صبح کو ہم اُٹھا کریں روئے نگار دیکھ کر

کعبہ کو جا نہ شوق ابھی نیّتِ زندگی بخیر
ہم بھی چلیں گے تیرے ساتھ اب کی بہار دیکھ کر

انتخاب مثنوی

عالم خیال

(دوسرا رخ)

(عورت اپنے شوہر کے آنے کی اُمید میں ہے ۔ لیکن شوہر کا خط پردیس سے اس عذر کے ساتھ آیا کہ وہ ابھی نہیں آ سکتا ۔ عورت بے چین ہو کر شوہر کو خط لکھ رہی ہے اور اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہے)

پا کے تمہارے خط کو آج دل کی تڑپ بڑھی کچھ اور
دل میں بھڑک کے غم کی آگ جسم پہ تپ چڑھی کچھ اور

در کی طرف جو تھی نگاہ یاس سے اب زمیں پہ ہے
ہاتھ کبھی جگر پہ ہے اور کبھی جبیں پہ ہے

خط سے پڑی جگر پہ چوٹ ' داغ ہرے ہوئے ہیں آج
تم سے ہزارہا گلے دل میں بھرے ہوئے ہیں آج

خط ہے تمہارے ہاتھ کا پڑھتی ہوں اس کو بار بار
کھولتی ہوں ہزار بار ' چومتی ہوں ہزار بار

جن سے لکھا گیا ہے خط کاش وہ انگلیاں ملیں
میرا خیال چوم لے جا کے وہیں جہاں ملیں

سب کے جگر میں خون ہے میرے جگر میں درد ہے
سب کا شباب لال ہے ' میرا شباب زرد ہے

ایک تمہیں تھے میرا عیش ' بن گئے غم تو کیا کروں
پہلے تمہیں تھے میرا چین ' اب ہو ستم تو کیا کروں

دل میں جمے ہوئے ہو تم چوس رہے ہو خون کو
سر میں خیال بن کے تم دیتے ہو شہ جنون کو

رکھتے نہیں یہ ہونٹ رنگ ' رکھتے نہیں یہ گال رنگ
تم نہیں تو نظر میں ہے خون کا رنگ لال رنگ

خاک میں چوڑیاں ملیں ' جی کو جلا رہی ہیں یہ
بھاڑ میں جائیں بجلیاں آگ لگا رہی ہیں یہ

تم میں وفا ہو یا نہ ہو میں یہ کہوں گی ' ہے ضرور
ہاں یہ کہوں گی راہ کو روکے ہے کوئی شے ضرور

جذب میں کاش یہ ہو زور ' جو تمہیں لائے کھینچ کر
گھر مری پتلیوں کے ہیں ان میں بٹھائے کھینچ کر

کانپ کے دل میں لاؤ خوف اپنے خدا کا تم کبھی
اپنی وفا سے دو جواب میری وفا کا تم کبھی

آتی ہیں ہم نشیں مگر ' مجھ میں نہیں ہنسی مری
شرم سے کیا کہوں کہ ''وہ'' لے گئے دل لگی مری

پوچھتی ہیں تو کیا کہوں ' چھیڑتی ہیں تو کیا کہوں '
سادہ کے چپ لہو کے گھونٹ بیٹھی ہوئی پیا کروں

جھولنے کو جو وہ کہیں ' جاؤں میں اٹھ کے جبر سے
گائیں تو گاؤں انکے ساتھ غم کو چھپا کے صبر سے

کی نہیں میں نے کچھ خطا ، کی ہو تو بھول جاؤ تم
مجھ کو نہ دیکھنا مگر خیر سے گھر کو آؤ تم
آؤ جو تم تو رخ پہ میں آنچل اٹھا کے ڈال لوں
اس میں تو کچھ ھرج نہیں جھانک کے دیکھ بھال لوں
عورت اگر میں ہو پڑی ، اس میں مری خطا نہیں
یہ تو کہو کہ تم پہ کچھ میرا بھی حق ہے یا نہیں
پردہ میں رہ کے عورتیں مرتی ھیں گو قضا نہ ہو
شرم کا حق ادا کریں چاہ کا حق ادا نہ ہو
مجھ کو یقین ہے کہ تم آ کے مجھے نہ پاؤ گے
آ کے نہ پاؤ گے تو کیا ، میری لحد پہ آؤ گے
فاتحہ بھی پڑھو گے تم ھاتھ اٹھا کے یا نہیں
روح کو خوش کرو گے تم پھول چڑھا کے یا نہیں

ایک حسین لڑکی

چہرہ یہ پیارا پیارا آنکھیں یہ کالی کالی !
لب گُل کی پتیاں ھیں صورت ہے بھولی بھالی
نازک بدن ہے اسکا یا نخل گل کی ڈالی
چہرے کا رنگ دیکھو کہدو کہ پھول والی
رخ پر جو آ رھی ھیں اڑ کر لٹیں ہوا سے
سرکا رھی ہے آنکو کس ناز سے ادا سے
ناز اس کے قدرتی ھیں ان سے ہے بے خبر خود
دلکش نظر ہے لیکن واقف نہیں نظر خود
بالوں میں بن رہے ھیں گھونگر ادھر ادھر خود
وارفتہ ہو رہا ہے حسن اسکی شکل پر خود
وارستگی تو دیکھو بے خود ہے کسقدر یہ
آنچل زمیں پہ لوٹا لیکن ہے بے خبر یہ
چوٹی نہیں بندھی ہے بال اڑتے ھیں ہوا سے
بُندے الجھ گئے ھیں بالوں سے تو بلا سے
بالوں پہ جمتی ہے گرد اڑ اڑ کے جابجا سے
سر پر چمک رہے ھیں ذرّے ذرا ذرا سے

کُرتا کریپ کا ہے کانٹوں پہ ہے وہ اٹکا
دامن پھٹا وہ دیکھو کھینچا جو دیکے جھٹکا

کُرتے کو دیکھ کر یہ پہلے تو مسکرائی
پھر کچھ جو دھیان آیا حیرت سی رخ پہ چھائی
پوچھے گی ماں کہاں سے کرتے کو پھاڑ لائی
یہ ڈر نہیں تو چھوٹی چہرے پہ کیوں ہوائی

کرتے کو دیکھتی ہے کانٹوں کو دیکھتی ہے
ماں سے یہ کیا کہے گی بس سوچ اسے یہی ہے

ٹہلی پھر اٹھ کے اب کچھ تسکین پا رہی ہے
رنگت اڑی ہوئی پھر چہرے پہ آ رہی ہے
چھوٹی سی آرسی کو نظروں میں لا رہی ہے
خود منہ چڑھا رہی ہے خود مسکرا رہی ہے

لائی ہوا جو اپنے دامن میں گرد بھر کے
آنچل میں منہ چھپایا آنکھوں کو بند کر کے

چل نکلی اور ٹھٹک کر مجھ پر نگاہ ڈالی
میں اس کو دیکھتا ہوں یہ بات اس نے پالی
آنکھیں اٹھا کے دیکھا اور پھر نظر بچا لی
یہ قدرتی حیا ہے دل کو لبھانے والی

دیکھے جو پھر تو شاید ترچھی نظر سے دیکھے
پھیرا ہے۔ رخ تو شاید مڑ کر ادھر سے دیکھے

دیکھا تو اس نے لیکن گردن جھکا کے دیکھا
آنچل کو سر پہ ڈالا اور مسکرا کے دیکھا
کیا ترچھی چتونوں سے آنکھیں چرا کے دیکھا
دیکھا پھر اس نے دیکھو آنچل ہٹا کے دیکھا

پایا نیا جو مجھ کو کچھ شرم آئی اس کو
فطرت کی یہ ادا ہے بتنے کا فہم کس کو

چشمے کی راہ لی ہے شاید پئے گی پانی
پہنچی تو دیکھتی ہے چپ سن کھڑی روانی
عکسِ فلک کی رنگت سورج کی ضوفشانی
پانی تو ہے سنہرا اور تہ ہے آسمانی

لہروں میں چلتی پھرتی سورج کی جو چمک ہے
اس سے چمک رہی ہے کیا بجلیوں کا شک ہے
وہ پائنیچے سنبھالے ' پانی تو خیر کم ہے
ٹخنوں ہی تک ہے گہرا اور چند ہی قدم ہے
لیکن لچک بدن میں چلنے سے دم بدم ہے
نازک ہے پاؤں پھسلے پانی میں تو ستم ہے
وہ اوڑھنی نہ سنبھلی پانی سے تر ہوئی ہے
وہ لڑکھڑائی دیکھو دہری کمر ہوئی ہے
نالا اتر کے پہنچی زیرِ شجر کھڑی ہے
ننھے سے دل میں اسکے ہمت بہت بڑی ہے
کچھ اوڑھنی بدن پر کچھ خاک پر پڑی ہے
خوشے پکے ہوئے ہیں ان سے نظر لڑی ہے
میں جامنیں گرا دوں پہلے یہیں تو اچّھا
کھیلے یہیں تو اچھا ٹہلے یہیں تو اچّھا

بندھیا چل کی چاندنی رات

چاندنی رات اور بندھیا چل کا جنگل پر فضا
مالوے کی شب کہ گرما میں بھی سرد اسکی ہوا
چاندنی کا صاف ستھرا فرش صحن کوہ پر
سائیہ اشجار سے چھٹکے ہوئے آس پر شجر
چاندنی کے پھول روشن چاندنی کے نور سے
چاندنی ایسی کہ تم پتوں کو گن لو دور سے
گر رہا ہے کوہ کے جھرنوں سے پانی جابجا
دے رہی ہے لطف نہرونکی روانی جابجا
چاندنی کے نور سے شفاف نہروں کی چمک
چاند کے پرتو سے ان نہرونمیں لہرونکی چمک
برگِ برگ نخل کو جنبش میں لاتی ہے ہوا
ڈالیونکو دے کے جھٹکے پھل گراتی ہے ہوا
پھول پھل سب ہِل رہے ہیں وجد میں آئے ہوئے
پیڑ جتنے ہیں کھڑے ہیں ہاتھ پھیلائے ہوئے
سبز سبزہ جابجا ہے ' لال لالہ جابجا
ان سے پتھر بھی عیاں ہے کالا کالا جابجا

جابجا پھولوں کے غنچے جابجا بیلوں کے جال
جابجا کھولے ہیں برگد کی جٹائیں اپنے بال

وہ پپیہے کی صدا جو کہہ رہا ہے "پی کہاں"
کوئل اب بولی، خدا جانے یہ اب تک تھی کہاں

ہاں میں سمجھا، ہوگی یہ آموں کے باغوں میں کہیں
اس دم آ نکلی مگر جنگل سے لطف اسکو نہیں

کوئی نیچی کوئی اونچی ہر پہاڑی مختلف
شکل میں پھیلاؤ میں جھاڑی سے جھاڑی مختلف

شپرّ اڑتے پھرتے ہیں پیڑوں پہ پھل کھاتے ہوئے
جا رہے ہیں زاغ اڑتے اور بل کھاتے ہوئے

وہ ادھر سرخاب پانی میں پڑے ہیں دیکھنا
وہ کنارے پر تنے سارس کھڑے ہیں دیکھنا

گونج اٹھتا ہے پہاڑ ان سارسوں کے شور سے
تھوڑی تھوڑی دیر میں بول اٹھتے ہیں کس زور سے

جانور جنگل میں آتے ہیں نظر پھرتے ہوئے
پہنچے کھانے کو ثمر دیکھے جہاں گرتے ہوئے

پیتے ہیں چشموں کا پانی لیکن اندیشے کے ساتھ
خوف ہے انکو کہ پڑ جائیں نہ یہ شیروں کے ہاتھ

ہیں ستارے تو بہت لیکن درخشاں چند ہیں
چاندنی کے نور کی چادر میں پنہاں چند ہیں

نیلگوں رنگ سما اس پر ستارے جلوہ گر
جیسے آئیں بلبلے جمنا کے پانی پر نظر

چاند پھرتا ہے زمیں کے گرد کس انداز سے
کوئی خوش رُو جس طرح ٹہلے ادا سے ناز سے

ہے زمیں سے انس اسے گو فاصلے پر ہٹ گیا
یہ زمیں کے دل کا ٹکڑا ہی تو ہے جو کٹ گیا

کون گھر جائے بھلا منہ اس ہوا سے موڑ کر
میں نہیں جانے کا شوق ایسی فضا کو چھوڑ کر

برسات کی شام

دن ہے کم دیکھو ہٹا مغرب سے وہ ابرِ سیاہ
کُھل گئی دنیا میں آنے کے لئے کرنوں کی راہ
بن گیا خورشید ہلکے رنگ کے سونے کا طشت
دھوپ سے کچھ کچھ سنہرے ہو گئے اشجار و دشت
وہ شفق کی سرخ رنگت اور فلک کا مرغزار
ساؤنی پُھولی ہوئی گویا دکھاتی ہے بہار
کوہ کے دامن ہیں یا لالے کا تختہ ہے عیاں
یا جسے کہتے ہیں چرخ اک کوہ ہے آتش فشاں
جلوہ گر ہے چرخ پر سورج کے پر تو سے دھنک
یا اڑا پردہ کُھلی محرابِ ایوانِ فلک
یا کسی کے واسطے کھولے ہے آغوش آسماں
یا لئے ہے دوش پر تُرکِ فلک اپنی کماں
دستکاری اپنی کی معمارِ قدرت نے عیاں
سات رنگوں سے رنگا ہے طاقِ قصرِ آسماں

بے نظیر شاہ

سید محمد بے نظیر نام ۔ بے نظیر تخلص ۱۸۶۳ء میں کڑا مانک پور ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے ۔ آن کے والد ماجد مولانا شاہ احسان علی قادری ایک مبلغ دین اور منبع رشد و ھدایت تھے جنھیں مولانا شاہ عبدالعزیز محدث جیسے بزرگ کے خلیفہ ہونے کا شرف بھی حاصل تھا ۔ بے نظیر شاہ کے اس مختصر خاندانی تعارف سے ھی اندازہ ھو سکتا ھے کہ آنھوں نے کیسے گھریلو ماحول اور دینی فضا میں آنکھ کھولی ھوگی ۔ اسی فضا کا اثر تھا کہ بے نظیر شاہ بھی باپ کی طرح ایک صوفی صافی اور درویش منش انسان بنے اور مسلک پدری کو اپنا شعار زندگی بنایا ۔ آن کی تعلیم بالکل قدیم طرز پر ھوئی اور آنھوں نے عربی و فارسی میں بڑی فضیلت حاصل کی ۔ فقہ ' حدیث اور قرآن وغیرہ کے درس بھی گھر پر ھی لئے ۔ تصوف تو آنکی گھٹی میں پڑا تھا ۔ اور آنکی پوری زندگی پر اس کے بہت گہرے اثرات تھے ۔ چنانچہ علم و ادب کی حسب حوصلہ تکمیل کے بعد آنھوں نے ترویج دین اور ھدایت خلق اللہ کو اپنا شیوۂ زندگی بنایا اور حیدر آباد دکن میں فروکش ھو گئے ۔ جہاں بہت جلد آن کے معتقدین و مریدین کا ایک خاص حلقہ بن گیا اور پھر اس میں روز بروز اضافہ ھو رھا تھا کہ موصوف نے ایک پاک، و بے ریا زندگی گزار کر داعی اجل کو لبیک کہا ۔

بے نظیر شاہ کو شعر و شاعری سے فطری لگاؤ تھا ۔ اور وہ اپنے جدید رنگ سے قطع نظر ایک مشاق غزل گو بھی تھے ۔ لیکن افسوس کہ آن کا بیشتر کلام کسی سفر کے دوران میں ضایع ھو گیا ۔ غزل میں وہ وجہہ اللہ الہ آبادی اور مثنوی میں حضرت امیر مینائی سے مشورہ لیتے تھے ۔ لیکن مرحوم دور جدید کے آن چند بد قسمت قادرالکلام شعرا میں سے ھیں ۔ جن کا تعارف بھی شاذ و نادر ھی ھوا ھے ۔ حالانکہ آن کا کلام ایسا جاندار اور اور صاف ستھرا ھے کہ آنھیں اپنے عصر کے اچھے شعرا میں شمار کرنا چاھئے ۔ خدا بھلا کرے پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب کا جنھوں نے آن کی مختصر سوانح اور کلام پر بحث کر کے مرحوم کو زندہ جاوید بنایا اور پروفیسر الیاس برنی نے آن کی منظریہ شاعری کے بہت سے انتخابات اپنی انتخابی جلدوں میں شائع کر کے آن کی شاعری کو آردو داں طبقہ سے روشناس کرایا ۔ ورنہ آردو ادب کے طالب علموں کے لئے اس مشاق سخنور کے کلام سے لطف اندوز ھونا تو درکنار نام جاننا بھی مشکل ھو جاتا ۔

در حقیقت بے نظیر شاہ کی شہرت کا باعث آنکی ایک شاھکار مثنوی ھے جو ۱۸۹۰ء میں مکمل ھوئی اور ''کتاب مبین'' اور ''جواھر بے نظیر'' کے نام سے دو جلدوں میں شائع

ہوئی ۔ یہ مثنوی خاصی طویل ہے اور باوجودیکہ اس کی تصنیف کا مقصد مریدین کی دینی رہنمائی ہے اور اس میں انسان کے عشق حقیقی تک پہنچنے میں جو مراحل پیش آتے ہیں اُن کا بیان استعارے کے پیرائے میں کیا گیا ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ جدید شاعری کا بھی ایک اعلیٰ نمونہ ہے ۔ چونکہ پوری مثنوی میں بے شمار مواقع ایسے ہیں جہاں شاہ صاحب موصوف نے مناظر قدرت کے ہو بہو مرقعے پیش کئے ہیں ۔ اور مثنوی کے یہی وہ حصے ہیں جو ادبی پاروں کی حیثیت سے کبھی فراموش نہیں کئے جا سکتے ۔ ان میں بے نظیر شاہ کے مشاہدے ، فکر اور اسلوب کے وہ جوہر پوشیدہ ہیں جو ادب و شعر کے ہر نقاد سے خراج تحسین ضرور حاصل کر لیتے ہیں ۔ بہت ممکن ہے یہ مثنوی لکھتے وقت بے نظیر شاہ کے پیش نظر مثنوی ''سحرالبیان'' ہو چونکہ اسکے اکثر بیانات اس سے ملتے ہیں لیکن اس کے باوجود ''الکلام'' کے محاسن کی داد ضرور دینی پڑتی ہے ۔ بے نظیر شاہ کی منظر یہ شاعری میں حسن و سادگی کا ایسا عجیب و غریب امتزاج ملتا ہے جو ''سحرالبیان'' کے بعد دوسری اُردو کی مثنوی میں نظر نہیں آتا ۔ اُن کا مشاہدہ کوئی انفرادیت نہیں رکھتا بلکہ اُس میں ایک عام مشاہدہ کی جھلک پائی جاتی ہے بایں ہمہ وہ اتنا قوی اور اُس کا اظہار اس درجہ دلکش ہے کہ پڑھنے والے کی روح وجد کرنے لگتی ہے ۔

اصل بات یہ ہے کہ حالی و آزاد کی جدید شاعری کی تحریک ایک ایسی زندہ حقیقت تھی جس کو وقتی طور پر تو پرانی روش کے پرستاروں اور تقلیدی رنگ کے شیدائیوں نے برا بھلا کہہ لیا ۔ لیکن اُسکے برق رفتاری کے ساتھ ملک کے طول و عرض میں پھیلنے میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہو سکی اور اس سے ارادی و غیر ارادی دونوں صورتوں میں شعرا متاثر ہوئے ۔ وہ لوگ جو ان مصلحین کے حلقہ اثر میں رہے وہ تو خیر نیا راگ الاپ ہی رہے تھے لیکن ایسے لوگ جو دور دراز علاقوں میں پڑے تھے اُنہیں بھی یہ بات اس درجہ معقول معلوم ہوئی کہ اُنہوں نے اس سے متاثر ہو کر نئے سر چھیڑے ۔ بے نظیر شاہ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک ہیں ۔ حالانکہ وہ شمالی ہند میں پیدا ہوئے چونکہ وہ بہت جلد حیدر آباد چلے گئے ۔ اس لئے محض یہ سمجھ لینا کہ اُن پر یہ تاثر شمالی ہند میں ہی ہوا زیادہ مناسب نہیں معلوم ہوتا' بلکہ واقعہ یہی ہے کہ وہ باوجود دکن میں رہنے اور دینی نصب العین کے انسان ہونیکے اس جدید شعری رجحان سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ اُنہوں نے جو کچھ کہا اُس میں اس رجحان کی بڑی صاف و واضح جھلک نظر آتی ہے ۔

بے نظیر شاہ کا اسلوب بڑا صاف و سادہ ہے ۔ اُن کے بیانات میں تسلسل کے ساتھ ساتھ بڑی روانی پائی جاتی ہے اور وہ تفصیلات کو ایسے دلکش پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ بیانات طویل ہوتے ہوئے بھی اپنا جذب و تاثر کھونے نہیں پاتے ۔ بے نظیر شاہ کی زبان بھی شستہ و سلیس ہے ۔ اور اپنی اس مثنوی کیلئے اُنہیں جیسے موزوں لب و لہجہ اور الفاظ کی ضرورت تھی اُنہوں نے وہی استعمال کئے ہیں ۔ جس سے مثنوی کا حسن اور بھی دوبالا ہو گیا ہے ۔ بحیثیت مجموعی بے نظیر شاہ کا کلام نیچرل شاعری کا ایک عمدہ نمونہ ہے جس میں اعلیٰ شاعری کی وجدانی کیفیات موجود ہیں ۔

انتخاب کلام

طلوع آفتاب

ہے اب دھوپ کا عکس کہسار پر
تری اوس کی دھوپ کھونے لگی
پرندے زمیں پر اترنے لگے
اڑے کھول کر قاز و سرخاب پر
وہ کھیتوں میں چڑیاں بھی آنے لگیں
ہوا پھر وہی کار و بار جہاں
ہوا میں ابھی تک نہیں کچھ غبار
مگر شہر میں یہ نہیں آب و تاب
بلندی پہ کچھ دھوپ آنے لگی
منڈیروں پہ کچھ کچھ جھلکنے لگی
چڑھا دن کرن جُلبلانے لگی

شعاعیں چمکتی ہیں اشجار پر
ہوا بھی ذرا گرم ہونے لگی
ہرن کھل کے جنگل میں چرنے لگے
گرے مرغ آبی وہ تالاب پر
وہ چن چن کے دانے اٹھانے لگیں
ہوئے لوگ مصروف کار جہاں
رطوبت لگی اڑنے بن بن کر بخار
کہ ٹیلوں کی ہے اوٹ میں آفتاب
وہ کلسوں پہ سونا چڑھانے لگی
اتر کر وہ در پر چمکنے لگی
کڑی دھوپ تیزی دکھانے لگی

کمندِ شعاعی پکڑ کر شتاب
سر بام وہ چڑھ گیا آفتاب

آسدِ ابر

گھٹا اودی اودی سی کیا چھا گئی
پروں کو ادھر سور تولے ہوئے
وہ کوئل غضب نے بجاتی ہوئی
ہوا دوش پر شال ڈالے ہوئے
گھٹا میں وہ بگلوں کی ہر سو قطار
سیاہی میں یہ اجلی اجلی لکیر
یہ کہسار ہیں راہ چھوٹی ہوئی

بہارِ چمن رنگ پر آ گئی
گھٹائیں ادھر بال کھولے ہوئے
پپیہوں سے تانیں لڑاتی ہوئی
گھٹاؤں کے آنچل سنبھالے ہوئے
کہ ظلمت میں آبِ حیات آشکار
رواں دامنِ کوہ میں جوئے شیر
سڑک سنگ مرمر کی کوٹی ہوئی

زمین و فلک پر ہے مستی کا شور
گرجتے ہی بادل کے چلاّئے مور

کبھی ابر گریاں کبھی خندہ زن
ہے دیوانے کا سوانگ چرخِ کہن

فلک پر گرجتا ہے ابرِ مطیر
زمیں پر نہ کیوں رند گائیں کبیر

رونق بارش

جو سوکھی زمیں پر ترشح ہوا
نکلتی ہے بو سوندھی سوندھی سی کیا

گرجتے ہیں بادل چمکتی ہے برق
ہُوا صحن کا صحن پانی سے غرق

گئی نیند آچٹ پانی کے شور سے
بہی جاتی ہیں نالیاں زور سے

ٹپکتی ہے بنگلے کی وہ اولتی
کہ ہے تار سیمیں کی چلمن پڑی

ہوا زور سے چلتی ہے بار بار
پہنچتی ہے کمروں کے اندر پھوھار

بنا ہے جو وہ ٹین کا سائیباں
ہے اس وقت ارگن کا آس پر گماں

عجب نے سے پانی برستا ہے آج
کہ زاهد بھی مے کو ترستا ہے آج

چٹانوں پہ کیا لطف نظارہ ہے
کہ جو بوند ہے ایک فوّارہ ہے

صبا کے طمانچے جو کھائے ہیں آج
تو پودے سرونکو جھکائے ہیں آج

چلی آتی ہے بدلیوں کی قطار
ہوا کے ہیں گھوڑے پہ بادل سوار

دھواں دھار اسوقت چھایا ہے ابر
فلک پر سیہ مست آیا ہے ابر

اٹھی شاخِ گل سبزہ کو چوم کر
برستی ہے کیا کیا گھٹا جھوم کر

ہیں آراستہ سبز پوشانِ باغ
ہوا غسل سے ہر شجر کو فراغ

یکایک رکی بوند ٹھیری ہوا
نظر آتی ہے اور ہی کچھ فضا

وہ باغوں میں جھولے پڑے بے شمار
وہ ساون بھی گانے لگے گلعذار

وہ آمونکے اشجار پر سامنے
کوئی کُوکتا ہے بڑے زور سے

یہ ہے اس صدا کا اثر کان پر
کہ دل لوٹ جاتا ہے ہر تان پر

ادھر کہہ رہا ہے کوئی پی کہاں
سنا یہ تو قابو میں پھر جی کہاں

کہیں کوئی چلاّ رہا ہے کہ ہاں
ذرا دیکھنا اس گھڑی کا سماں

پروں کو سمیٹے ہوئے وہ طیور
درختوں پہ بیٹھے ہیں کیا دور دور

چاندنی رات

وہ مہتاب کی آسماں پر نمود — مزیّن کواکب سے چرخِ کبُود
وہ کرنوں کی شبنم کے اندر بہار — اڑایا ہے چاندی کا گویا غبار
لرزتی ہے پانی پہ یہ چاندنی — کہ دریا میں بجلی کی ہے روشنی
وہ لہریں کہیں تلملاتی ہوئی — چمک آئینے کی دکھاتی ہوئی
نہیں نام کو بھی کہیں تیرگی — کہ عکسِ تجلی ہے سائے میں بھی
رواں ہے یہ چاروں طرف موجِ نور — کہ اڑتے ہیں دن کی طرح کچھ طیور
شعاعوں کی اللہ رے تیزیاں — قمر کے وہ جوبن کی نوخیزیاں
مگر چھوٹے چھوٹے ستارے ہیں ماند — کہ آج اپنے جلوے میں پورا ہے چاند
شعاعوں کا وہ جگمگانا کہیں — ستاروں کا آنکھیں چُرانا کہیں
گرا چھن کے پتوں سے نور قمر — کہ ہیرے کے ٹکڑے پڑے ہیں ادھر
ہوا پچے کاری کا یہ اہتمام — کہ مر مر پہ ہے سنگ موسیٰ کا کام
یہ سائے میں اوراق سے نور کے — کہ گل سنگ موسیٰ پہ بلّور کے
کہیں چہچہائے ہیں کچھ کچھ طیور — کہیں شور کووں کا ہے دُور دُور
ستارے جو رہ رہ کے ٹوٹے ادھر — وہ مہتاب کے پھول تھے سر بہ سر
ہوئی چاندنی یہ تجلّی فشاں — کہ ہے عالم وجد میں آسماں
صفا بام و در میں سمائی ہوئی — درختوں پہ حیرت سی چھائی ہوئی

یہ کہتا ہے ہر اک شجر کا سکوت
فسبحانہ الذّی لا یموت

نمودِ صبح

نجومِ فلک جھلملانے لگے — چراغ سحر ٹمٹمانے لگے
وہ ٹھنڈی ہوا اور تاروں کی چھاں — نزولِ صفا کا وہ پیارا سماں
وہ شہنا میں سوھنی کی دھن دلفریب — شہانے سے وہ شادیانے کی زیب
کھنچے کس لئے دل نہ ہر تان پر — کہ نے کر رہی ہے اثر جان پر
سریلی صدا ہوش کھونے لگی — ستاروں کو وحشت سی ہونے لگی
وہ بوٹوں میں کلیاں چٹکنے لگیں — وہ شاخوں پہ چڑیاں چہکنے لگیں

وہ شبنم نے چھڑکا چمن پر گلاب — نہ رہ جائے تا کوئی سر گرم خواب
نسیم سحر گل کھلانے لگی — فضائے چمن رنگ لانے لگی
ضیا آسماں سے اترنے لگی — نظر دور تک کام کرنے لگی
عنادل گلستاں میں گانے لگے — طیور سحر دل لُبھانے لگے
وہ پو پھٹ کے والصبح پڑھنے لگی — ضیا دم بدم اور بڑھنے لگی
وہ اللہ اکبر کی آئی صدا — نہا دھوکے مسجد چلے پارسا
وہ سب اوّل وقت پڑھکے نماز — ہوئے محو ترتیل با سوز و ساز
وہ مینا پہاڑی وہ کاکا توا — ہوئے آکے شاخوں پہ نغمہ سرا
ہوئی آسماں پر وہ سرخی نمود — بنا کان شنجرف چرخ کبود
شعائیں دکھانے لگیں وہ جھلک — ہوئی زعفرانی بساطِ فلک
شفق میں بستی کرن ضو فشاں — گلے مل رہی ہے بہار و خزاں
وہ زردی ذرا اور گہری ہوئی — پہاڑوں کی چوٹی سنہری ہوئی

مطلاّ ہوا گنبدِ ہر شجر
برسنے لگا ہر طرف آبِ زر

تارے

کہاں ہے تو اے ساقیٔ بزم زیب — کہ تاروں بھری رات ہے دلفریب
کواکب پہ افلاک پھوے ہوئے — کنول حوضِ گردوں میں پھوے ہوئے
سمندر میں بہتے ہوئے یہ چراغ — بنے صحن گردوں میں تاروں کا باغ
نہیں چاند کا گو فلک پر نزول — کھلے ہیں مگر چاندنی کے یہ پھول
مسہری سجی قدرت پاک کی — بسی سیج پھولوں سے افلاک کی
قنادیل روشن عجائب نگار — مصابیح آیاتِ پروردگار
ستاروں کا یہ عکس تالاب میں — کہ لہراتی ہیں بجلیاں آب میں
تناسب سے قدرت نے چھوٹے بڑے — زبرجد کے گنبد میں ہیرے جڑے
یہ خورشید تاباں کے آنکے ہوئے — گہرُ چترِ گردوں میں ٹانکے ہوئے
غضب جگمگاتی ہوئی خردیاں — بنا کامدانی کا تھان آسماں
بھری بوٹیوں سے ردائے فلک — بنی بیل خود کہکشاں کی سڑک
شب تارکی شال تانے ہوئے — جہاں نیند کی دل میں ٹھانے ہوئے

مگر چشم انجم جھپکتی نہیں
ستاروں کی بوندیں ٹپکتی نہیں
کچھ ایسا ہی خوف شب تار ہے
کہ ہر نجم اک چشم بیدار ہے
کھلے کوڑیالے سر کوھسار
کہ شبنم سے بھیگا ھوا سبزہ زار
جو سیّارے رہتے ھیں ان میں رواں
وہ ھیں اُن کی ترتیب کے پاسباں
جو ثابت ھیں محور بدلتے نہیں
کہ گِرد اپنے پھرتے ھیں چلتے نہیں
مرتب جو یہ شکل تنجیم ہے
مہ و سال کی اُن سے تقسیم ہے
ھوا بوجھ سب کا سنبھالے ھوئے
فضا میں کُروں کو اچھالے ھوئے
بہم ان میں جو ربط جذبات ہے
علیٰ قدرِ جسم و مسافات ہے
کشش ان میں ہے اور تاثیر بھی
جدا گانہ تکثیف و تنویر بھی
کچھ آباد کچھ ان میں خالی بھی ھیں
جلالی بھی ھیں کچھ جمالی بھی ھیں
وسیع اس قدر ہے فضائے جہاں
ھیں ذروں سے کم یہ کُرے بے گماں
تپش دن کو خورشید تاباں کی تھی
خبر کس کو اس بزم شاہاں کی تھی
فضا آبِ انجم سے دھوئی ھوئی
شبِ ماہ حیرت میں کھوئی ھوئی

صبح

ضیا صبح کی پھیلی اطراف میں
شب ھجر جا کر چھپی قاف میں
شفق پھول کر رنگ لانے لگی
نئی آگ دل میں لگانے لگی
کھڑی ہے الگ شمع بھی کیا اداس
پتنگوں کے کچھ ڈھیر ھیں آس پاس
اڑا ھر طرف رنگ صبح بہار
فلک پر کھلا یک بیک سبزہ زار
نمایاں ھوئے خوب آثار صبح
جہاں میں ھوا گرم بازار صبح
ھُوا صبح صادق کا جسدم یقیں
تو بستر سے اٹھنے لگے نازنیں
کوئی شاخ گل کی طرح جھومتا
اٹھا کوئی ساغر کا لب چومتا
اٹھا کوئی سر گرمِ حمد و سپاس
کوئی نیند کی جھونک میں بد حواس
کسی کو کوئی گدگداتا اٹھا
کوئی منہ چھپا کر لجاتا اٹھا

وحیدالدین سلیم

سید وحیدالدین نام ۔ سلیم تخلص ۱۸۶۹ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے آبا و اجداد نے پانی پت میں توطن اختیار کر لیا تھا ۔ سلیم نے اس اعتبار سے شروع ہی سے ایک ایسے غریب مگر دیندار گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں دولت و ثروت کے بجائے دینداری و درویشی کا دور دورہ تھا ۔ آپ کے والد حاجی مولوی فریدالدین صاحب ایک متقی بزرگ تھے جنھیں شاہ شرف بو علی قلندر کے مزار کی تولیت کا شرف حاصل تھا ۔ مولانا سلیم نے اسی درویش صفت و پرہیزگار باپ کی آغوش شفقت میں اپنا بچپن گزارا اور پاک نفسی و دینداری کی صفات ترکے میں پائیں ۔ سلیم کی ابتدائی فارسی اور عربی کی تعلیم وطن ہی میں ہوئی اس کے بعد وہ لاہور چلے آئے جہاں انہوں نے مولانا فیض‌الحسن سہارنپوری سے ادب عربی کی تکمیل کی اور معقول و منقول مولانا عبداللہ ٹونکی سے پڑھا ۔ فارسی میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا اور دسویں جماعت تک انگریزی بھی پڑھی ۔ پھر علم طب کی طرف رجوع کیا اور بڑی محنت سے اس کی تکمیل کی ۔ طب سے فراغت حاصل کرنے کے بعد قانون کی طرف متوجہ ہوئے لیکن اسے اپنے مذاق کے مطابق نہ پاتے ہوئے چھوڑ دیا ۔ اب تلاش معاش کی فکر دامن گیر ہوئی ۔ شروع شروع میں آنہیں ایجرٹن کالج بھاولپور میں ایک جگہ ملی جہاں کچھ عرصہ رہکر وہ رام پور ہائی اسکول چلے گئے ۔ جہاں آنہیں ہیڈ مولوی کا عہدہ ملا ۔ لیکن یہاں بھی وہ زیادہ عرصہ نہ رہے تھے کہ آن کے قدر دان و مربی جنرل عظیم‌الدین خاں کے قتل کا ناگوار واقعہ پیش آیا ۔ اس حادثہ سے مولانا اس درجہ متاثر ہوئے کہ ملازمت ترک کر کے وطن واپس چلے آئے اور مطب شروع کر دیا اس دوران میں مولانا حالی کی وساطت سے آنہیں سر سید کی خدمت میں باریابی کا ایک نادر موقع مل گیا ۔ سر سید مرحوم کی مردم شناسی مشہور ہے ۔ آنہوں نے جب اس جوہر قابل کو پرکھا اور اس میں ترقی کے آثار دیکھے تو بہت خوش ہوئے اور انہیں اپنا ادبی مددگار بنا لیا ۔ سلیم نے یہ خدمت سر سید کے مرتے دم تک انجام دی ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مولانا سلیم کی زندگی کا یہی وہ درخشاں دور ہے جب آنہوں نے سر سید ، حالی ، شبلی اور اس گروہ کے دوسرے عالی خیال پیشواؤں کی صحبت میں رہ کر اپنے ادبی مذاق کی صحیح معنوں میں پرورش کی ۔

سر سید کے انتقال کے بعد سلیم کی علمی و ادبی سر گرمیاں شروع ہوئیں۔ سب سے پہلے انہوں نے صحافت کو اپنی جولانگاہ بنایا اور رسالہ ''معارف'' نکالا جو کچھ عرصہ تک کامیابی کے ساتھ چلتا رہا پھر نواب محسن الملک کے اصرار سے وہ ''علیگڈھ گزٹ'' کے ایڈیٹر ہو گئے۔ مگر تھوڑے دنوں کے بعد جب اس مردہ گزٹ میں زندگی و توانائی کی لہر دوڑی تو مولانا خود ناتواں ہوگئے اور علالت سے مجبور ہو کر مستعفی ہوگئے۔ اس کے بعد ''مسلم گزٹ'' لکھنؤ کے ایڈیٹر ہوئے۔ اور آخر میں ''زمیندار'' کے مدیر بنے مگر اس کی ضمانت ضبط ہو جانے پر قطع تعلق کر کے خاموشی کے ساتھ مضمون نگاری شروع کردی۔ اب مولانا کی بلند پایہ صحافت اور ترجمہ کے شہرہ کی بدولت دارلترجمہ حیدر آباد نے آپ کو اپنی طرف کھینچا۔ جہاں پہنچ کر آپ نے وضع اصطلاحات کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ مولانا موصوف کی یہ خدمت ہر ادبی حلقہ میں بہت ھی ممنون ہوئی۔ جب جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا تو انہیں اُردو کے مددگار پروفیسر کی حیثیت سے منتخب کر لیا گیا۔ اس عہدہ پر کام کرنے کے بعد وہ پروفیسر کے عہدۂ جلیلہ تک پہنچے اور تقریباً آٹھ سال تک درس و تدریس کی خدمت قابل رشک خوبی کے ساتھ انجام دینے کے بعد موصوف نے ۱۹۲۷ء میں انتقال کیا۔

مولانا سلیم ایک جامع حیثیات شخص تھے۔ وہ عربی و فارسی کے جید عالم ' وضع اصطلاحات کے ماہر ' بلند پایہ ادیب ' اعلیٰ درجے کے صحافی ' لائق اُستاد اور جدت طراز شاعر تھے۔ شاعری اُن کی زور طبیعت کا نتیجہ تھی اور باوجودیکہ اُنکا شعری سرمایہ مختصر ہے لیکن اُس کا پایہ اتنا بلند ہے کہ اُنہیں اچھے شعرا کی صف میں نہ لانا ایک بہت بڑا ادبی جرم ہے۔ اُنکی شعر و شاعری کی ابتدا نو عمری میں ہوئی مگر مولانا نے اس کی طرف زیادہ توجہ اپنے مدیرانہ فرائض کے دوران میں دی اور بہت سی نظمیں زیر ادارت اخبارات و رسائل میں شائع کیں جو ''لبرل مسلمان'' کے نام سے چھپتی تھیں اور اپنے نصب‌العین کے اعتبار سے اصلاحی رنگ کی ہوتی تھیں۔ ظاہر ہے حالی و شبلی جیسے مصلحین کے زیر سایہ جس شاعر کی ذہنی و فکری پرورش ہوئی ہو وہ آزاد خیال اور فکری شاعر ضرور ہوگا۔ مظاہر فطرت سے اُنہیں بے پناہ شیفتگی تھی چنانچہ ان کی اکثر نظمیں اس فطرت پرستی کی پیداوار ہیں۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے حالی کی طرح اخلاق نگاری بھی کی ھے لیکن اُن کی ایسی منظومات میں حسن بیان کا پہلو حالی سے زیادہ اُجاگر ھے یہی وجہ ھے کہ سلیم کی ایسی نظمیں ذہن پر بار نہیں ہوتیں بلکہ بڑی موثر ثابت ہوتی ہیں۔

سلیم کی شاعرانہ خصوصیات مجملاً دو ہیں۔ اول متنوع موضوعات۔ موضوعات کے تنوع سے مراد یہ ھے کہ اُنہوں نے موضوعات کے انتخاب میں بڑی یگانہ روی و آزاد خیالی کا ثبوت پیش کیا ھے۔ اُنہوں نے شاذونادر ھی ایسے موضوع اختیار کئے ہیں جو قدیم یا معاصر شعرا کے شاعری میں موجود ہیں۔ اس معاملہ میں وہ حقیر سے حقیر چیز کو جسے کسی شاعر نے بھی نظر التفات سے نہ دیکھا ہو اپنی سخن طرازی کے لئے چھانٹ لیتے ہیں اور اس بے تکلفی و لطافت کے ساتھ اظہار خیال کرتے ہیں کہ وہ حقیر موضوع بھی دلچسپ بن جاتا ھے۔ لیکن اُن کا کمال صرف یہ دلچسپی پیدا کر دینا ھی نہیں بلکہ یہ ھے کہ وہ اپنے فلسفیانہ غور و فکر کی بدولت اس سخن گستری میں ایک عمق بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ سلیم کی دوسری خصوصیت اُن کے کلام کا جوش ھے۔ اس سلسلے میں پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب کے چند فقرے ملاحظہ ہوں ''عبرانی شاعری

کا جوش مشہور ہے ۔ اس کا ایک مختصر نمونہ اُردو شاعری میں دیکھنا ہو تو سلیم کے کلام کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے'' اور یہ تنقید بالکل بجا ہے چونکہ اول تو مولانا خود ایک مضطرب دل اور بے چین دماغ لے کر آئے تھے دوسرے اُنہوں نے تخاطب بھی نوجوانوں سے کیا ہے جن میں اُمنگ ، ترنگ اور جولانی بھری ہوتی ہے اس لئے ان کی اصلاح کیلئے مولانا نے جو کچھ کہا ہے اُس میں بھی قدم قدم پر ایسا جوش و ولولہ بھر دیا ہے کہ پڑھنے والے کی روح تڑپ اُٹھتی ہے ۔

مولانا سلیم نے اُردو زبان کو وسیع کرنے میں جو سعی بلیغ کی ہے وہ محتاج تعارف نہیں ۔ فطری طور پر اس کا اثر اُن کی شاعری کی زبان پر بھی ہوا اور اُنہوں نے اپنی زبان دھلی و لکھنؤ کی قید سے بڑی حد تک آزاد کر لی ہے ۔ اُنہیں الفاظ اور جملوں کے توازن میں بڑا ملکہ حاصل تھا ۔ اس کے علاوہ تشبیہات و استعارات کی لطافت اور مترنم بحور کا استعمال اُن کے نغموں کو اور بھی سریلا کر دیتا ہے ۔

مولانا سلیم بہت ھی زندہ دل انسان تھے ۔ اُن کی زندگی کی یہ خصوصیت اُن کی شاعری میں رجائیت کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے ۔ وہ کائنات و حیات انسان میں مسرت و دلچسپی کے خزانے دیکھتے ھیں اور انہیں کو اپنی شاعری کا پیغام بنا کر نوجوان نسلوں تک پہنچاتے ھیں ۔ بحیثیت مجموعی سلیم ایک بلند پایہ شاعر ھیں جن کا شعری سرمایہ مختصر ہوتے ہوئے بھی بہت ھی قابل قدر و باعث صد احترام ہے ۔

انتخاب کلام

مجاز سے حقیقت تک

چہرے سے نقاب اپنے ھٹا دے مرے گلفام
پھر دیکھ کہ کس طرح چمکتا ہے لب بام
مہتاب سے جاتی ہے بدل تیرگئی شام
آتے ھیں قدم چومنے کو چرخ سے اجرام
بجلی سی ابھی کوندنے لگتی ہے فضا میں
اس نور کا دریا نظر آتا ہے ھوا میں

کر چشم فسوں ساز کو آمادہ ادا پر
پھر دیکھ کہ پریاں تری ہوتی ھیں مسخر
سجدے میں ترے سامنے گرتے ھیں فسوں گر
کھلتے ھیں اشاروں میں ترے حسن کے دفتر
شہرت تری پھیلے ابھی جادو نظروں میں
ھو جائے قیامت سی بپا عشوہ گروں میں

رکھ سامنے آئینہ ذرا اے بت خوشرنگ
پھر دیکھ کہ ہوتا ہے وہ جلوہ سے ترے دنگ
ہو جائے مقابل جو ترے حسن کا نیرنگ
تاروں کی تجلی بھی ٹھہرتی نہیں پاسنگ
چشمہ تری شوخی کا اگر یار ابل جائے
آغوش سے آئینہ کے سیماب نکل جائے

جنبشِ میں تو لا اپنے قد جلوہ فگن کو
پھر دیکھ کہ آتی ہے حیا سروِ چمن کو
بھولے گا ابھی کبک دری اپنے چلن کو
یاد آئے گی یہ چال نہ آہوئے ختن کو
شوخی ہے تری چال میں مستی بھی ادا بھی
ہر نقشِ قدم پر ترے جھکتی ہے ہوا بھی

ہستی ہے تری حسن کا بے تھاہ سمندر
ہر ذرہ ترے جسم کا ہے چشمۂ خاور
رگ رگ میں تری برق سی اک رہتی ہے مضطر
رکھئے گا نہاں پردہ میں کب تک رخ انور
گیتی پہ نظر ڈال ذرا ناز و ادا سے
آتی ارنی کی ہے صدا ارض و سما سے

اے حسن جہاں سوز دکھا جلوۂ عریاں
تارے بھی ترے شوق کے رستے میں ہیں رقصاں
ہے نور سحر ذہن میں ترے چاک گریباں
ہے باد صبا بھی تری منزل میں شتاباں
گل کھول کے آنکھیں تری آمد کو ہیں تکتے
مرغان چمن یاد میں تیری ہیں چہکتے

ملبوس مجازی میں تو اب تک ہے ضیا پاش
لازم ہے کہ اب حسن حقیقت کو کرے فاش

دیکھیں تجھے بے پردہ ہم اے حسن ازل کاش
باقی نہ رہے صورت و معنی میں یہ پرخاش
دھوکا جو نظر کا ہے وہ اٹھ جائے نظر سے
قطرہ کا کھلا رشتہ ہو تا بندہ گہر سے

میں قطرۂ شبنم ہوں تو خورشید درخشاں
یہ قطرہ ترے نور کے چشمے میں ہو پنہاں
میں دستۂ خاشاک ہوں تو شعلۂ عریاں
کر صورتِ گلدستہ تو اس دستہ کو خنداں
گُل ہو کے مری شمع رخ صبح دکھا جائے
ہستی مری مٹ کر تری ہستی میں سما جائے

حسن کی زبان سے

جہاں میں ہے ضیا میری، میں حسنِ جلوہ کار ہوں
میں رونق اس چمن کی ہوں، میں فصلِ نو بہار ہوں
میں زیب کائنات ہوں، میں فخر روزگار ہوں
میں شاہد نہفتہ کا جمال آشکار ہوں
کہ آئینے میں دھر کے میں عکسِ کردگار ہوں

کلیم کو میں اپنا رخ نہ بے خطر دکھا سکا
سراغ میرے نور کا نہ کوہ طور پا سکا
نہ میں نظر میں آ سکا، نہ عقل میں سما سکا
خیال میرے اوج پر، نہ پر لگا کے جا سکا
میں حصنِ بے شکست ہوں، میں راہِ نا گزار ہوں

پڑی ہے اک خفیف سی نجوم پر کرن مری
کہ رکھتی ہے طواف میں سدا انہیں لگن مری

چھپی حجابِ قدس میں ہے شمع انجمن مری
ستارے جل کے خاک ہوں جو دیکھ لیں پھبن مری
میں گنج آب و تاب ہوں ' میں بحر نور و نار ہوں

یہ چاندنی کی ٹھنڈکیں یہ دھوپ کی حرارتیں
یہ صبح کی صباحتیں ' یہ شام کی ملاحتیں
زمین کی یہ زینتیں ' فلک کی یہ لطافتیں
یہ بجلیوں کی شوخیاں ' یہ بادلوں کی رنگتیں
یہ رنگ روپ ہیں مرے ' میں ان میں آشکار ہوں

ہر ایک شاخسار میں مجھی سے آب و رنگ ہے
پھپکتے ہیں درخت جو یہ میری ہی امنگ ہے
پھدکتے ہیں پرند سب ' مجھی سے یہ ترنگ ہے
کرشمے دیکھ کر مرے ' ہر ایک عقل دنگ ہے
ہیں کھیل نت نئے مرے ' میں وہ طلسم کار ہوں

گلوں کے رنگ رنگ سے عیاں ہیں جھلکیاں مری
چمن کے غنچے غنچے میں شمیم ہے نہاں مری
زباں پہ پتے پتے کی رواں ہے داستاں مری
سرنگ پود پود کی جڑوں میں ہے دواں مری
میں روحِ سبزہ زار ہوں ' میں نازشِ بہار ہوں

آریوں کی پہلی آمد ہندوستان میں

وہ دیکھ ' کہ موجیں رقص کناں ہیں سطح زمیں پر گنگا کی
نو وارد آریہ حیرت میں ہیں دیکھ کے شان اس دریا کی
گنگوتری سے آتی ہے چلی اٹھکھیلیاں کرتی دھار اس کی
آزادی ہے تیور سے عیاں ' متوالی ہے رفتار اس کی

آتر کی طرف جب آٹھتی ہے ، اس قافلہ مغرب کی نظر
پڑتی ہوئی کرنیں سورج کی ، ہیں دیکھتے برف کے تودوں پر
پر قلّہ کوہ ہمالیہ پر ، عظمت کے ہیں بادل چھائے ہوئے
سینوں کو ہیں تانے دیو کھڑے ، امبر سے سروں کو ملائے ہوئے

برگد کے درختوں سے جنگل ، پھیلے ہیں پہاڑ کے دامن میں
شاخیں ہیں جو آن کی سایہ فگن ، ظلمت کا سماں ہے ہر بن میں
پھرتے ہیں وہ فیل مست یہاں ، ہے دیو کا جن کے قد پہ گماں
یہ کالی گھٹا جب دوڑتی ہے ، آتا ہے نظر ہیبت کا سماں

ہیں رنگ برنگ کے پھول کھلے ، زینت ہے چمن کی شباب آن کا
کھولا ہے نسیم سحر نے ابھی ، کس شان سے بند نقاب آن کا
آئے ہیں مسافر ہند میں جو خیبر کے دروں سے آتر کے ابھی
دیکھے تھے آنہوں نے لالہ و گل پامیر کی وادی میں نہ کبھی

طائر بھی یہاں پیدا ہیں کئے قدرت نے عجب گلرنگ و حسیں
گر زمزمے آن کے رشی سن لیں ، یاد آئے آنہیں فردوس بریں
اندر کے اکھاڑے کی پریاں ، گاتی ہیں جو دلکش راگنیاں
یہ لوچ سروں میں آن کے نہیں ، یہ سوز گلوں میں آن کے کہاں

سورج کی چمکتی ہوئی کرنیں ہیں چھیڑتی ٹھنڈی ہواؤں کو
بھر دیتی ہیں نور و حرارت سے ، باغوں کو اور آن کی فضاؤں کو
سوئی ہوئی سوتیں چشموں کی ، آٹھتی ہیں سب آنکھیں مل مل کر
دھاریں جو برف کے پانی کی ، آتی ہیں پہاڑوں سے چل کر

اے آریو ، آؤ قدم رکھو ، ان حسن بھرے گل زاروں میں
جنت کے مزے لوٹو گے سدا ، اس پاک زمیں کی بہاروں میں
تم گنگ و جمن کے کناروں پر ، شہر اپنے نئے آباد کرو
گا گا کے بھجن ، کر کر کے ہون ، ہو جاؤ مگن دل شاد کرو

زندگی

ذرے ذرے میں دواں ' روح و رواں پاتا ہوں میں
زندگی کو ایک بحرِ بے کراں پاتا ہوں میں
غنچہ غنچہ نطق پر آمادہ آتا ہے نظر
پتے پتے کی زباں کو نغمہ خواں پاتا ہوں میں
زندہ ہستی کی خبر دیتی ہے رفتار نفس
بوئے گل کو زندگی کا ترجماں پاتا ہوں میں
برق کی جنبش ہو یا بادِ صبا کا ہو خرام
زندگی کا ہر تموّج میں نشاں پاتا ہوں میں
اس سے آگے بھی ہیں روحیں اڑتی پھرتی بے شمار
طائر سدرہ کا جس جا آشیاں پاتا ہوں میں
ہو چکی ہے حکمراں جس نخل پر بادِ خزاں
اس کی رگ رگ میں بہار بے خزاں پاتا ہوں میں
چار سُو راہِ سفر پر دوڑتی ہے جب نظر
زندگی کو کارواں در کارواں پاتا ہوں میں
جانے والوں کی تباہی کے نشانوں میں نہاں
آنے والی ہستیوں کی بستیاں پاتا ہوں میں
الغرض سمجھے ہو جن کو موت کی بربادیاں
زندگی کے انقلاب ان میں نہاں پاتا ہوں میں

سرور جہان آبادی

درگا سہائے نام ۔ سرور تخلص دسمبر ۱۸۷۳ء میں جہان آباد ضلع پیلی بھیت میں پیدا ہوئے ۔ ان کا خاندان قصبہ جہان آباد کا مقتدر کائستھ خاندان سمجھا جاتا تھا اور بزرگ قصبہ کے قدیم رئیس و زمیندار تھے ۔ منشی درگا سہائے کے والد منشی پیارے لال کا مشغلہ طبابت تھا ۔ سرور کی ابتدائی تعلیم وطن ہی میں ہوئی ۔ اور انہوں نے جہان آباد کے تحصیلی اسکول سے اردو مڈل کا امتحان پاس کیا ۔ پھر مولوی کرامت حسین بہار سے فارسی کی تحصیل کی ۔ ساتھ ہی شعر و شاعری کا بھی شوق ہوا چنانچہ پڑھنے لکھنے سے جو وقت بچتا اسے یہ شعر گوئی اور دواوین دیکھنے میں صرف کرتے ۔ ابتدائی مشق سخن کی اصلاح بہار صاحب کے ذمہ تھی بعد میں وہ بیان یزدانی میرٹھی کے شاگرد ہوئے ۔ کچھ عرصہ کے بعد انہیں انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا تو قصبہ کے پوسٹ ماسٹر سے دو سال تک انگریزی پڑھنے کے بعد انہوں نے انگریزی مڈل کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے ۔ پھر طب پڑھی ۔ اور مطب بھی شروع کیا ۔ لیکن افسوس کہ موصوف کے حصے میں جو غربت و افلاس آیا تھا اس میں اس پیشہ کی بدولت کوئی فراخی نصیب نہ ہوئی ۔ کہتے ہیں کہ انہیں معاشی فکروں سے نجات حاصل کرنے کے لئے انہوں نے کچھ عرصہ کے لئے کسی امیر زادے کی اتالیقی بھی اختیار کر لی تھی ۔ لیکن اس تمام عرصہ میں ان کی شعر و شاعری برابر ترقی کی منازل طے کرتی رہی ۔ ۱۸۹۹ء سے ان کا کلام ادبی رسائل بالخصوص ''ادیب'' اور ''مخزن'' میں شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہونا شروع ہوا ۔ شروع میں وحشت تخلص کرتے تھے بعد میں سرور ہوئے اور اس تخلص کی مناسبت سے وہ اپنے کلام میں ایک امتیازی سرور وکیف بھر ہی رہے تھے کہ دفعتاً ان کی ساری امنگوں کا خون ہو گیا ۔ اور پہلے انکی محبوب بیوی پھر کچھ دنوں کے بعد اکلوتے بیٹے کا انتقال ہو گیا ۔ یہ حادثات سرور کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب کا باعث ہوئے ۔ انہوں نے غم غلط کرنے کے لئے دخت رز کو منہ لگایا ۔ رفتہ رفتہ یہ یارانہ اس درجہ بڑھا کہ کئی کئی دن تک مست و بے خود پڑے رہتے تھے ۔ آخر ۳ دسمبر ۱۹۱۰ء کو ان کا انتقال ہو گیا ۔ اور چرخ کجرفتار نے ''خمخانہ سرور'' کے بعد ان کے دوسرے مجموعہ کلام ''جام سرور'' کو جسکی طباعت کی تگ ودو میں وہ زندگی کے آخری ایام میں بڑی کوشش کر رہے تھے ' کو چھپ کر ان کے ہاتھوں تک پہونچنے تک کی مہلت نہ دی ۔

مرحوم بڑے حلیم طبیعت ' نیک اور راستباز قسم کے انسان تھے ۔ آنکی منکسر المزاجی کا یہ عالم تھا کہ بقول ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب ''بندہ نواز'' اُن کا تکیہ کلام ہو گیا تھا ۔ سرور کی باتوں میں بڑی مٹھاس تھی اور آنکی اسی شیریں کلامی ' زندہ دلی اور ظرافت کی وجہ سے لوگ اُن کے بڑے گرویدہ تھے ۔ مذھبی تعصب تو اُنھیں چھو بھی نہیں گیا تھا ۔ نمائش اور دکھاوے سے موصوف کو ازلی نفرت تھی بلکہ اس کے برعکس اُن کی زندگی سادگی و بے پروائی کا ایک عمدہ نمونہ تھی ۔ شعر و شاعری کے اثر سے طبیعت میں وارستگی پیدا ہو گئی تھی اور وہ عزلت و تنہائی زیادہ پسند کرنے لگے تھے ۔

سرور کی زندگی ایک شاعر کی حیات کا مکمل نمونہ ھے ۔ وہ صحیح معنوں میں ایک فطری شاعر تھے اور اُنھیں شعر و سخن کا بے حد شوق تھا ۔ بنا بریں وہ معمولی تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بھی اُفق شاعری پر کچھ اس طرح جلوہ فگن ہوئے کہ آج بھی جب جدید اُردو شاعری کا تصور ذھن میں آتا ھے تو اُس کے معزز ارکان میں سرور کا خیال ضرور آتا ھے ۔ سرور اُن شعرا میں سے ھیں جنھوں نے حالی و آزاد کے رنگ میں بہت خوب کہا ھے ۔ اس میں شک نہیں کہ اُنھوں نے تغزل میں قدیم رنگ کی پیروی کی ھے مگر اول تو اُنھوں نے غزلیں برائے نام کہی ھیں دوسرے اُن کا یہ حقیقی رنگ بھی نہیں ۔ سرور کے زور طبع کے جوھر اُن کی نظموں میں کھلتے ھیں جس میں اُنھوں نے بیشتر ایسے موضوعات پر طبع آزمائی کی ھے جن کی طرف اس وقت دوسرے شعرا کا خیال تک بھی نہیں گیا تھا ۔ تاریخی آثار و واقعات اور ملکی مناظر پر اُنھوں نے پہلے پہل توجہ دی ۔ اس کے علاوہ ملک و قوم سے جو بے انتہا محبت اور دلی لگاؤ تھا اُس کا اظہار بھی اُن کی اکثر نظموں میں ملتا ھے ۔ اس سلسلے میں 'خاک وطن' 'حسرت وطن' 'یاد وطن' 'مادر ھند' آنکی ایسی نظمیں ھیں جن کے ایک ایک لفظ سے خاک وطن سے عقیدت و محبت کا دریا اُمڈتا ہوا نظر آتا ھے ۔

سرور کے کلام کی ایک اور امتیازی خصوصیت جذبات کی ترجمانی اور مناظر کی تصویر کشی ھے ۔ اُنھیں عام جذبات انسانی کے اظہار پر بڑی قدرت حاصل تھی وہ قدرت کی طرف سے ایک ایسا حساس دل لے کر آئے تھے کہ قدرت کی ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز سےزندگی کا سبق لے کر اُسکے رموز و حقائق کی تہ تک پہونچ جاتے تھے۔ اس معاملہ میں آنکی وسیع النظری بہت ھی قابل داد ھے ۔ لیکن آنکی حقیقی کامیابی کا راز اس ایک بات میں پوشیدہ ھے کہ وہ خالصتاً ھندوستانی شاعر ھیں ۔ اور انکی شاعری کے روح و قالب دونوں بالکل ھندوستانی معلوم ہوتے ھیں ۔ اس سلسلے میں ایک طرف تو اُنھوں نے پردیسی چیزوں کے دوش بدوش دیسی چیزوں کو بھی ممتاز جگہ دی ھے مثلاً عرب و ایران کے دریا پہاڑ ' اشخاص اور جانوروں کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے ھندوستان کی گنگا ' جمنا ' دمن ' پدمنی ' نور جہاں ' کوئل ' بھونرا ' ھنس ' سارس ' مرغابی وغیرہ کو بھی جذبات انگیز و سامان صد بہار بنا دیا ھے ۔ دوسری طرف پرانی ٹھیٹ ھندی اور بھاشا کے الفاظ اپنے کلام میں ایسی اُستادی اور چابکدستی سے جڑ دیتے ھیں کہ منظومات کا لطف دوبالا ہو گیا ھے ۔

سرور نے انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کئے ھیں جو یقیناً اُن کی شاعرانہ طبیعت اور فکر رسا پردال ھیں اگرچہ اُن کا انگریزی زبان کا علم بہت محدود تھا

تا هم اُن کے ترجمے لفظی نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ اصلی معلوم ہوتے ہیں ۔ مرغابی، ترانہ خواب ، بچہ اور ھلال ، کار زار ہستی موسم سرما کا آخری خواب وغیرہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں ۔ ایسی ھی نیچرل نظموں میں ''بیر بہوٹی'' اور ''کوئل'' اُن کی شہرہ آفاق اور نہایت ھی دلکش نظمیں ہیں ۔

سرور کے کلام میں صداقت جذبات ، جوش ، سادگی اور سوز و گداز کے عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں ۔ وہ خیالی باتوں کی جگہ روزمرہ زندگی کے عام واقعات کو ایسے دلچسپ پیرائے میں بیان کرنے پر قادر تھے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ھے ۔ اُن کا اسلوب بیان بہت ھی دلکش و رواں ھے جس میں فارسی تراکیب کے استعمال سے بڑی چستی پیدا ہو گئی ھے ۔ سرور الفاظ کے انتخاب میں بڑے محتاط تھے ۔ اسی احتیاط کی بدولت آنکے کلام میں بڑا ترنم اور ایک مخصوص کیف محسوس ہوتا ھے ۔ اُن کی نظموں میں تغزل کے رنگ نے بڑا درد و اثر پیدا کر دیا ھے ۔ اس میں شک نہیں کہ سرور بڑے زودگو اور کثرت نگار شاعر واقع ہوئے تھے جسکی وجہ سے اُن کے کلام میں کہیں کہیں ضعف ، سستی نیز بعض دیگر اسقام پیدا ہو گئے ہیں لیکن یہ خامیاں ایسی ہیں اُن جیسی لاآبالی طبیعت کے ہر شاعر کے یہاں ملتی ہیں پھر اُن کے کلام میں بحیثیت مجموعی جیسی شعریت ، لطافت اور اور نفاست پائی جاتی ھے اُسکے مقابلے میں یہ عیوب کوئی حقیقت نہیں رکھتے اور بلاشبہ اُن کا کلام اُردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا ۔

سرور کی شاعری کے بارے میں دوباتیں اور کہنا ضروری معلوم ہوتی ہیں ۔ ایک تو یہ کہ جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا ھے کہ وہ بڑے محب وطن و محب قوم شاعر تھے اور اُنہوں نے مذہبی و ملکی نظمیں کہی ہیں اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہ نکالنا چاہئے کہ وہ متعصب تھے اس کے برخلاف شاعرانہ تنگ نظری یا مذہبی تعصب اُن میں نام کو نہ تھا ۔ اس کے ثبوت میں آنکی بہت سی نظمیں پیش کی جا سکتی ہیں بالخصوص ''نور جہاں کا مزار'' اور اُن کی وہ نظم جس میں اُنہوں نے اپنے اُستاد بیان یزدانی کی غزل پر تضمین کی ھے ۔ دوسری بات یہ ھے کہ سرور غریب چونکہ شروع سے ھی خانگی زندگی کی پریشانیوں میں مبتلا رہے اس لئے اُن کا بہت سا کلام دوسروں نے ہتھیا لیا یعنی کچھ روپے دیکر اُن سے چند نظمیں کہلوائیں اور پھر اپنے نام سے شایع کرا دیں ۔ لیکن افسوس کہ اس طرح کلام فروخت کرنے پر بھی مرحوم کی تنگ حالی و عسرت نے آخر دم تک اُن کا ساتھ نہ چھوڑا اس پر بیوی اور اولاد کا غم، نتیجہ یہ ہوا کہ اُن جیسا ظریف و خوش فکر انسان بھی کسی حد تک قنوطی ہوگیا اور اُن کے کلام میں مایوسی وحرماں نصیبی کے اثراتظاہر ہونے ۔ لیکن اس سے سرور کی شاعری کو ایک فائدہ بھی پہونچا ھے اور وہ یہ کہ اُن کے خارجی بیانات کے مقابلے میں داخلی جذبات کی ترجمانی زیادہ موثر و کامیاب ہو گئی ھے ۔

غرض سرور ایک فطری شاعر تھےاُن کا کلام اپنی لطافت و بو قلمونی کے باعث اُردو ادب میں ایک امتیاز کا حامل ھے اور اسی کی بدولت اُنہیں بجا طور پر جدید شاعری کا ایک رکن رکین تصور کیا جاتا ھے ۔

کسی مستِ خواب کا ہے عبث انتظار سوجا
کہ گزر گئی شب آدھی ' دلِ بیقرار سوجا

یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ھوا کے تیز جھونکے
تجھے دے رہے ھیں لوری ' دلِ بیقرار سوجا

یہ تری صدائے نالہ مجھے متّہم نہ کر دے
مرے پردہ دار سوجا ' مرے رازدار سوجا

مجھے خوں رلا رہا ہے ترا دم بدم تڑپنا
ترے غم سے آہ کب سے ھوں میں اشکبار سوجا

ابھی دهان پان ہے تو نہیں عاشقی کے قابل
یہ تپش کا آہ شیوہ نہ کر اختیار سوجا

نہ تڑپ زمیں پہ ظالم تجھے گود میں اٹھا لوں
تجھے سینے سے لگا لوں تجھے کر لوں پیار سوجا

تجھے جن کا ہے تصور ارے مست جام الفت
انھیں انکھڑیوںکے صدقے مرے بادہ خوار سوجا

تجھے پہلا سابقہ ہے شب غم بری بلا ہے
تجھیں مرمٹے نہ ظالم دل بے قرار سوجا

بھونرے کی بے قراری

نہ وہ کیتکی کی پھبن رہی
نہ وہ موتیا کی ادا رہی

نہ وہ نسترن کی سمن رہی
نہ وہ گل رہے نہ فضا رہی

نہ کلوں کے اب ھیں وہ قہقہے
نہ وہ بلبلوں کے ھیں چہچہے

نہ غزل سرا وہ کوئی رہے
نہ وہ قمریوں کی صدا رہی

نہ وہ سرو ہے نہ وہ اب جو
نہ وہ ہم صفیر ہیں خوش گلو
نہ بنفشہ ہے نہ وہ ناز بو
نہ وہ جعفری نہ حنا رہی
نہ وہ صبح کی ہیں تجلّیاں
نہ شفق کی آہ ! وہ جھلکیاں
نہ وہ اودی اودی ہیں بدلیاں
نہ وہ بھینی بھینی ہوا رہی
نہ اُمنگیں ہیں وہ شباب کی
نہ وہ پتیاں ہیں گلاب کی
نہ ہوا میں بوُ ہے شراب کی
مجھے مست تھی جو بنا رہی
وہ کنول غضب کے تھے دل رُبا
وہ جو اُڑتے تھے مرے ہم نوا
مگر اب نہ انکی وہ ہے ادا
نہ وہ بو رہی نہ صفا رہی
لب آب جُو تھی فضا غضب
وہ بہار کی تھی ہوا عجب
مرے کنج میں مجھے روزوشب
مئے بے خودی تھی پلا رہی
وہ غضب کی کُوکُو وہ زمزمہ
وہ سریلی درد بھری صدا
سر شام سرو پہ فاختہ
مجھے لوریاں تھی سنا رہی
ہیَں کنول کی خشک جو پتیاں
مری خواب گہ تھی کبھی یہاں
یہیں شب کو دے دے کے تھپکیاں
تھی نسیم مجھ کو سلا رہی
یہاں ننھی جوھی کی اک کلی
جو بہار نازوں کی تھی پلی
مجھے لگتی جس کی ادا بھلی
مجھے کنج میں تھی بلا رہی
یہاں گل شگفتہ تھے جابجا
یہاں ننھا ڈیزی تھا ھنس رہا
یہاں مسکراتی تھی موتیا
یہاں چمپا ادا تھی دکھا رہی
نہ گلوں میں بوئے وفا رہی
نہ وہ دل فروز ادا رہی
نہ چمن رہا نہ فضا رہی
نہ وہ دن رہے نہ ہوا رہی
نہ روش ہے آج وہ سیر کی
نہ گلوں میں بو ہے وہ مہر کی
کہ ہوا ہے گلشن دہر کی
مجھے سبز باغ دکھا رہی

لکشمی جی

شبھ مہورت وہ عجب تھی ، وہ عجب شبھ تھی لگن
کہ جب آکاش سے آترا تھا ترا سنگھا سن
نظر آئی تری صورت میں عجب حسن کی جوت
تو نے دیوی ہمیں اپنے جو دکھائے درشن

اک چکا چوند کا عالم دم نظارہ تھا
گورا گورا تن نازک تھا سراپا کُندن
شعلۂ حسن دل افروز بھڑک اٹھتا تھا
رخ روشن پہ جو پڑ جاتی تھی سورج کی کرن
تھی چمک آہ ترے چاند سے رخساروں کی
کسی مندر میں تھے یا گھی کے دئے دو روشن
ترچھی بانکی وہ کمانیں تھیں کڑی دونوں بھنویں
لئے پھرتے تھے کبھی من میں جنھیں رام و لکھن
رخ تاباں پہ برستا تھا ترے نورِ ازل
بن کے ساون کی جھڑی اور کبھی بھادوں کی بھرن
کوکلا سی وہ تری ہائے سریلی آواز
میٹھے میٹھے ترے ڈوبے ہوئے امرت میں بچن
گوری گوری تھی جبیں برج کی سندر کوئی نار
زلف تھی یا کوئی متھرا کی سکھی شام برن
خوشنما کانوں میں کنڈل تھے تو ہاتھوں میں کنول
اوڑھنی ہلکی سی ریشم کی تھی اک زیب بدن
تو اس انداز و ادا سے جو زمیں پر اتری
دیکھنے والوں نے جُھک جُھک کے لئے تیرے چرن
اہل نظّارہ سے تصویر تری بول اٹھی
لکشمی ہوں تمھیں دینے کو ہوں آئی درشن

کوئل

او چمن کی اجنبی چڑیا! کہاں تھی آہ تو
کیا کسی صحرا کے دامن میں نہاں تھی! آہ تو
تیرے دلکش زمزمے تھے سبزہ زاروںمیں خموش
آشیانہ تھا ترا گلشن میں بزم بے روش
کھینچتی وقت سحر دل کو تری کُو کُو نہ تھی
چھاؤں میں تارونکی محوِ نغمۂ دل جُو نہ تھی

موسم سرما میں اے سرمایۂ صبر و شکیب
بے صدا تیرا پس پردہ تھا ساز دل فریب
مرحبا اے پیکرِ پیک سُبک گامِ بہار
بے کے پھر تو گرمیوں میں آئی پیغام بہار
تو ادھر آئی فضائے گل کا دور آیا اُدھر
تو نے گائے گیت اور آموں پہ مور آیا اُدھر
طائران باغ نے چھیڑا ہے ساز انبساط
تیرے مقدم میں ہیں شاخوں پر ہم آہنگ نشاط
پہنی ننھی ننھی کلیوں نے قبائے شبنمیں
آ رہی ہے کان میں تیری صدائے دل نشیں
کوئی انجم آسماں کا آو سبک پرواز شوق
رہنما ہے کیا ترا ، دلدادۂ اندازِ شوق
تو جو آنے والے موسم کا نشاں پاتی ہوئی
اپنی منزل پر پہونچ جاتی ہے یوں گاتی ہوئی
تیرے مقدم میں شکیب خاطر ناشاد میں
موسم گل کو بھی دیتا ہوں مبارک باد میں
تو چمن میں اڑ کے کیا پہونچی کہ آ پہنچی بہار
گا رہی ہیں چھوٹی چڑیاں سبز کنجوں میں بہار
سوسن رنگیں میں اک دوشیزۂ ناکتخدا
چن رہی ہے ننھی ننھی سرخ کلیاں خوشنما
اور تجھ سے ہم سرود نغمۂ اعجاز ہے
بزم قدرت میں تری گویا شریک ساز ہے
میٹھے نغمے گانے والی او چمن کی نازنیں
ہے تر و تازہ ہمیشہ ترا کنج دل نشیں
اور مصفّا ہے فضائے آسماں تیرے لئے
ہے شفق جامِ شرابِ ارغواں تیرے لئے
تیرے نغموں میں اثر اندوہ و حرماں کا نہیں
سال میں تیرے گزر فصل زمستاں کا نہیں
مجھ کو قسّام ازل دیتا اگر دو بال و پر
اڑ کے ہوتا میں بھی تیرے ساتھ سرگرم سفر

بن کے ہم دونوں رفیق موسم جوش بہار
کرتے خوش خوش ہربرس گلگشتِ دشت و کوہسار

گنگا جی

اے آب رود گنگا ! اف ری تری جوانی
یہ تیرا حسن دلکش ! یہ طرز دلربائی
تیری تجلیاں ہیں جلوہ فروش تیری
تنویر میں ہے تیری اک شان کبریائی
جمنا تیری سہیلی گو ساتھ کی ہے کھیلی
اس میں مگر کہاں ہے تیری سی جانفزائی
بے لوث تیرا دامن ہے داغ معصیت سے
موزوں ہے تیرے قد پر ملبوس پارسائی
حسن ازل کی گویا تو اک سگھڑ ہے مورت
صانع نے تیری صورت کیا موہنی بنائی
اے نازشِ زمانہ ! اے نقشِ ناز عصمت !
بھارت کی پاک دیوی تو ہے ہماری مائی

دلبند ہم ہیں تیرے لخت جگر ہیں تیرے
نخل مراد ہے تو اور ہم ثمر ہیں تیرے

مینو سواد تجھ سے ہیں وادیاں ہماری
او کشتِ آرزو ہے رشک جہاں ہماری
وہ دن بھی ہوگا، ہونگے جب ہم غریق رحمت
اور تیری نذر ہوں گی یہ ہڈیاں ہماری
گنگا میں پھینک آنا بعد فنا اٹھا کر
برباد ہو نہ مٹی او آسماں ہماری

یا رب نہ دفن کر کے احباب بھول جائیں
لے کر ہمارے خوش خوش گنگا کو پھول جائیں

او پاک نازنیں ! او پھولونکے گہنے والی
سر سبز وادیوں کے دامن میں بہنے والی
او ناز آفریں ! او صدق و صفا کی دیوی
اور عفّتِ مجسم پربت کے رہنے والی
صل علیٰ ! یہ تیری موجوں کا گنگنانا
وحدت کا یہ ترانہ او چپ نہ رہنے والی

حسن غیور تیرا ہے بے نیاز ہستی
تو بحر معرفت ہے او پاکباز ہستی

ہاں تجھکو جستجو ہے کس بحر بیکراں کی
ہم پر تو کچھ حقیقت کھلتی نہیں جہاں کی
اے پردہ سوز امکاں ! اے جلوہ ریز عرفاں
تو شمع انجمن ہے کس بزم دل ستاں کی
کیوں جادۂ طلب میں پھرتی کشاں کشاں ہے
تجھ کو تلاش ہے کس گم گشتہ کارواں کی

جاتی ہے تو کہاں کو آتی ہے تو کہاں سے
دل بستگی ہے تجھکو کس بحر بیکراں سے

آئی نظر تجلی جب شاہد ازل کی   ذرّوں میں جاکے چمکی، پھولوںمیں جاکے جھلکی
ہندوستان ہے اک دریائے حسن قدرت   اور اسمیں پنکھڑی ہے تو خوشنما کنول کی
نکلی ہمالیہ سے محو خروش ہو کر   تو آہ تشنہ لب تھی وہ جلوۂ ازل کی
کرتی ہوئی زمیں پر موتی نثار آئی
درشن کو آہ! ہر ہے تو ہردوار آئی

یہ جوش سبزۂ گل، یہ تیری آب یاری   قدرت کے چپہ چپہ پر یہ شگوفہ کاری
ہندوستاں کو تو نے جنت نشاں بنایا   نہریں کہاں کہاں ہیں تیرے کرم کی جاری
اے آب رودِ گنگا! موجوں میں تیری مل کر   موج سراب ہستی ہو بے نشاں ہماری
بعدِ فنا ہمارے پھولوں میں بو ہو تیری
گم ہوں رہِ طلب میں اور جستجو ہو تیری

آئے اجل کی زد پر جب اپنی عمر فانی   اور ختم رفتہ رفتہ ہو سیل زندگانی
دنیا سے آہ جب ہو اپنے سفر کا ساماں   بالیں پہ اقربا ہوں سرگرم نوحہ خوانی
جب ہونٹ خشک ہوں اور دشوار ہو تنفس   احباب اپنے منہ میں ٹپکائیں تیرا پانی
ہنستے ہوئے جہاں سے ہم شاد کام جائیں
دنیا سے پی کے تیری اُلفت کا جام جائیں

گلزار وطن

پھولوں کا کنج دلکش بھارت میں اک بنا ہے
حب وطن کے پودے اس میں نئے لگائیں

پھولوں میں جس چمن کے ہو بُوئے جاں نثاری
حب وطن کی قلمیں ہم اس چمن سے لائیں

خون جگر سے سینچیں ہر نخل آرزو کو
اشکوں سے بیل بوٹونکی آبرو بڑھائیں

ایک ایک گُل میں پھونکیں روحِ شمیم وحدت
اک اک کلی کو دل کے دامن سے دیں ہوائیں

فردوس کا نمونہ اپنا ہو کنج دلکش
سارے جہاں کی جس میں ہوں جلوہ گر فضائیں

چھایا ہو ابر رحمت کاشانۂ چمن میں
رم جھم برس رہی ہوں چارونطرف گھٹائیں

مرغانِ باغ بن کر اڑتے پھریں ہوا میں
نغمے ہوں روح افزا اور دلربا صدائیں

حبِ وطن کے لب پر ہوں جانفزا ترانے
شاخوں پہ گیت گائیں پھولوں پہ چہچہائیں

چھائی ہوئی گھٹا ہو موسم طرب فزا ہو
جھونکے چلیں ہوا کے اشجار لہلہائیں

اس کنجِ دل نشیں میں قبضہ نہ ہو خزاں کا
جو ہو گلوں کا تختہ، تختہ ہو اک جناں کا

بلبل کو ہو چمن میں صیّاد کا نہ کھٹکا
خوش خوش ہو شاخ گل پر غم ہو نہ آشیاں کا

حبِ وطن کا مل کر سب ایک راگ گائیں
لہجہ جدا ہو گرچہ مرغانِ نغمہ داں کا

ایک ایک لفظ میں ہو تاثیر بوئے الفت
انداز دل نشیں ہو ایک ایک داستاں کا

مرغانِ باغ کا ہو اس شاخ پر نشیمن
پہونچے نہ ہاتھ جس تک صیّاد آسماں کا

موسم ہو جوشِ گل کا اور دن بہار کے ہوں
عالم عجیب دلکش ہو اپنے گلستاں کا

مل جل کے ہم ترانے حُبِ وطن کے گائیں
بلبل ہیں جس چمن کے گیت اُس چمن کے گائیں

نوبت رائے نظر

منشی نوبت رائے نام ۔ نظر تخلص ۱۸۶۶ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے ان کا خاندان لکھنؤ کے معزز کائستھ گھرانے میں سے تھا ۔ نظر کے اجداد شاہی زمانے میں نوابان اودھ کے ہاں ممتاز عہدوں پر فائز رہے نظر کی تعلیم و تربیت لکھنؤ ہی میں ہوئی اُنہوں نے اُردو فارسی اور انگریزی کی ضروری تعلیم حاصل کرنے کے بعد شہر کی شاعرانہ فضا سے متاثر ہو کر شعر و شاعری شروع کی اور اس فن میں آغا مظہر لکھنوی کے شاگرد ہوئے ۔ لیکن چونکہ ابتدا ہی سے طبع موزوں کے مالک تھے اس لئے تھوڑے ہی عرصے کی مشق کے بعد خود بھی اُستادوں میں شمار ہونے لگے ۔

منشی نوبت رائے اُردو زبان کے اُن قابل قدر خدمت گزاروں میں سے ہیں جنہوں نے اپنی بیشتر زندگی اسی کی توسیع و ترقی میں صرف کی اور ادبی سر گرمیوں میں بڑے انہماک و دلچسپی کا ثبوت دیا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں ادبی رسائل و جرائد کے بجائے ''گلدستوں'' کا عام رواج تھا ۔ جن میں‌مشاعروں کا طرحی کلام شائع ہوا کرتا تھا ۔ اتفاق سے نظر کے اُستاد مرزا مظہر کی کوششوں سے اُس وقت لکھنؤ میں بڑے دھوم دھام کے مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے چنانچہ نظر نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا اور اُن مشاعروں کے کلام کو گلدستہ ''خدنگ نظر'' کی شکل میں ادبی قدردانوں کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا ۔ یہ گلدستہ ستمبر ۱۸۹۷ء سے لکھنؤ سے جاری ہوا اور ''پیام یار'' کے بعد لکھنؤ کا سب سے قدیم و مشہور گلدستہ تھا ۔ کچھ دنوں کے بعد نظر نے اس میں ایک معقول اضافہ یہ کیا کہ نظم کے حصہ کے ساتھ ساتھ کچھ نثر کے مضامین بھی لکھتے شروع کر دئے ۔ اُن کی یہ کوشش ادبی حلقوں میں بڑی مستحسن قرار دی گئی مگر اس کے باوجود وہ کچھ عرصہ بڑی کامیابی کے ساتھ نکل کر غالباً ۱۹۰۰ء میں بند ہوگیا ۔

۱۹۰۳ء سے نظر کا تعلق رسالہ ''زمانہ'' سے ہوگیا وہاں اُنہوں نے نائب مدیر کی حیثیت سے اس جریدہ کی جیسی قابل قدر خدمت کی ہے وہ اُس زمانے کے رسالہٗ مذکور کے مضامین کی عمدگی اور اُس کی مقبولیت سے بخوبی ظاہر ہے ۔ جنوری ۱۹۱۰ء سے جب انڈین پریس الہ آباد سے اُردو کا معروف رسالہ ''ادیب'' نکلنا شروع ہوا تو نظر ہی اُس کی ایڈیٹری کے لئے منتخب ہوئے ۔ اور باوجودیکہ وہ یہاں صرف ڈیڑھ دو سال ہی رہے لیکن اس قلیل وقفہ میں بھی اُن کی محنت و کاوش کی بدولت اس رسالہ کو بہت جلد ادب میں ایک ممتاز و منفرد جگہ نصیب ہوگئی ۔ ۱۹۱۲ء میں وہ چند وجوہ کی بنا پر ''ادیب'' سے قطع تعلق کر کے پھر ''زمانہ'' کے ادارہ میں شامل ہو گئے ۔ اور دو سال اس پرچہ سے دوبارہ متعلق رہ کر ۱۹۱۴ء میں لکھنؤ پہنچے ۔ یہاں اُردو کے

ایک محسن بیرسٹر حامد علی خاں نے آن کا تعارف منشی نول کشور سے کروایا۔ منشی نولکشور نے نظر کی ادبی صلاحیتوں کے پیش نظر آنہیں پہلے اپنے ایک اخبار ''تفریح'' کی ایڈیٹری سونپی پھر ''اودھ اخبار'' جو آس زمانہ کا بہت ھی مشہور و مقبول اخبار تھا ' کا ایڈیٹر بنا دیا ۔ اس اخبار سے آن کا تعلق نو دس سال تک رھا لیکن اس عرصہ میں آنہوں نے اس درجہ محنت و جانفشانی سے کام کیا کہ آن کی صحت خراب ہو گئی ۔ اس پر طرہ یہ کہ موصوف کا لاڈ لا نواسہ اور آس کے بعد آن کی چہیتی اکلوتی بیٹی دنیا سے چل بسی ۔ ان جانکاہ حادثات نے نظر کی کمر ھمت توڑ دی اور وہ ملازمت سے مستعفی ھو گئے ۔ منشی نوبت رائے کی زندگی کا یہ آخری زمانہ بڑی جسمانی و روحانی تکلیفوں میں گزرا ۔ بالاخر ۸ اپریل ۱۹۲۳ء کو ۵۶ سال کی عمر میں آردو زبان کے اس شیدائی نے بعارضۂ ضیق النفس انتقال کیا ۔ مرزا کاظم حسین محشر لکھنوی نے کیا خوب مادہ تاریخ نکالا ھے ۔

کلک محشر نے لکھا سال وفات　　　　شاعر کامل نظر سے چھپ گیا

۱۹۲۳ء

نظر ایک فطری شاعر تھے اور یہی قدرتی میلان طبع اور کہنہ مشقی آن کی قدرت زبان و کمال شاعری کا راز تھی ۔ آنہوں نے چند دیگر ھم عصر ھندو شعرا کی طرح غزل اور نظم جدید دونوں میں طبع آزمائی کی ھے اور حق یہ ھے کہ دونوں اصناف میں خوب خوب جوھر دکھائے ھیں ۔ یہ الگ بات ھے کہ آن کی نظموں کے مقابلے میں غزل کا رنگ زیادہ کامیاب ھے ۔ آن کی غزلیں بہت صاف ' سادہ اور پر معنی ھوتی ھیں اور آن کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت سوز و گداز ھے ۔ یہی درد و سوز آن کی غزلوں کو پر تاثیر بھی بناتا ھے اور مقبول بھی ۔ آن کی غزلیات میں الفاظ و محاورات کا بہت عمدہ و پسندیدہ انتخاب ملتا ھے اس پر بندشوں کی چستی اور محاورات کا بر محل استعمال بھی کلام کے حسن کو چمکانے میں بہت ممدو معین ثابت ھوتا ھے ۔ غرض آن کی غزلیں اپنی جدت طرازی ' صفائی اور پختگی ھر لحاظ سے ایک امتیازی شان کی حامل ھیں ۔

جہاں تک نظر کی منظومات کا تعلق ھے وہ بھی سنجیدگی ' صفائی اور سادگی کی سرمایہ دار ھیں لیکن آن کے مطالعہ سے ایسا محسوس ھوتا ھے کہ یہ آن کا فطری رنگ نہیں ھے بلکہ غزل کے ساتھ ساتھ آنہوں نے رفتار زمانہ اور نیچرل شاعری کی مقبولیت سے متاثر ھو کر نظم جدید پر بھی قلم آٹھایا ھے اور یہی وجہ ھے کہ اس رنگ میں وہ غزل کی طرح کامیاب نہیں ھوئے ۔ تاھم آنہوں نے اپنی نظموں میں جہاں جہاں تغزل کی چاشنی پیدا کر دی ھے وھاں وھاں تاثیر ضرور پیدا ھو گئی ھے ۔ کہیں کہیں آنہوں نے مناظر کی دلکش تصویریں بھی کھینچی ھیں جو اپنی حسن کاری و تفصیل کے لحاظ سے بڑی عمدہ ھیں ۔

مختصر یہ کہ نظر ایک اعلیٰ درجے کے غزل گو شاعر تھے جنہوں نے بتقاضائے حالات نیچرل شاعری میں بھی حصہ لیا اور ھر چند کہ آن کا کلام کسی نئے

پیام کا حامل نہیں تاہم کلام کی سلاست و روانی اور پاکیزگی ایسی خوبیاں ہیں جو انہیں اپنے ممتاز ہم عصر منشی درگا سہائے سرور کے ہم پلہ ضرور بنا دیتی ہیں۔

انتخاب کلام

غزلیات

گردش دھر بھی اک گردش پیمانہ ہے
ذرہ ذرہ میں ترا جلوۂ مستانہ ہے

اک طبیعت کی اداسی کا اثر اتنا ہے
ساری دنیا نگہ یاس میں ویرانہ ہے

حالت محفل عشرت ہے رقم سب اس میں
ایک دفتر کے برابر پر پروانہ ہے

پر توِ مہر کجا ذرۂ ناچیز کجا
کیوں یہ دل حسرتیٔ جلوۂ جانانہ ہے

تیرے ملنے کی وہ تقریب جو ہے یاد اب تک
جس سے کہتا ہوں وہ کہتا ہے اک افسانہ ہے

نظر اب چل کے کرنا چاہے آباد مرقد کو
بہت ہے منتظر اپنی زمیں گور غریباں کی

موت سے کیا ساز کر رکھا ہے آسنے اے نظر
مدتیں گزریں سبب کھلتا نہیں تاخیر کا

یاس و نا کامی سے بے حس قلب مضطر ہو گیا
اب ترا ملنا نہ ملنا سب برابر ہو گیا

وہ نگاہ شرمگیں ہو یا کسی کا انکسار
جھک کے جو مجھ سے ملا وہ ایک خنجر ہو گیا
اس سے بڑھکر اور کیا ہے سادہ لوحی عشق کی
آپ نے وعدہ کیا اور مجھ کو باور ہو گیا
خاکساری کی جو عادت تھی تو آخر اے نظر
خاک میں ملنے کے قابل جسم لاغر ہو گیا

دل کی حالت نہیں سنبھلنے کی
اب یہ دنیا نہیں بدلنے کی
حسرتیں دل میں گھٹ رہی ہیں ہنوز
راہ نکلی نہ کچھ نکلنے کی
دلِ سوزاں کو شمع کیا کہئے
اُس کو حسرت کہاں ہے جلنے کی
ہم ہیں مجبور زندگی معذور
دم میں طاقت نہیں نکلنے کی
میں کہاں اور خیالِ دوست کہاں
ایک صورت ہے جی بہلنے کی
جل گئے ہم بھی صورتِ خرمن
انتہا یہ تھی ہاتھ ملنے کی

راحت کی جگہ گلشن امکاں میں نہیں دیکھا
کس گل کو یہاں خار بداماں نہیں دیکھا
بیساختگیٔ جوشِ جنوں داد طلب ہے
چل نکلے ہیں گو ہم نے بیاباں نہیں دیکھا
جس بحر میں ڈوبی دلِ مایوس کی کشتی
اُس میں کبھی اُٹھتے ہوئے طوفاں نہیں دیکھا
بے چارگیٔ عشق پہ بھی دل کو ہے اک ناز
ڈھونڈھا اُسے جس درد کا درماں نہیں دیکھا
اس ہستیٔ موہوم کی تعبیر عدم ہے
دنیا میں بجز خوابِ پریشاں نہیں دیکھا
جب رخ سے نقاب اُسنے سرِ بزم اُلٹ دی
پھر ہم نے کسی شمع کو سوزاں نہیں دیکھا
آتی ہیں کدھر سے ترے وحشی پہ بلائیں
کُھلتے ہوئے برسوں در زنداں نہیں دیکھا

ہر سال نظر فصل جنوں آتی ہے لیکن
مدت سے تجھے چاک گریباں نہیں دیکھا

مدت سے ڈھونڈتا ہوں ملتا مگر نہیں ہے
وہ اک سکون خاطر جو بیشتر نہیں ہے
دل تھا تو ہو رہا تھا احساس زندگی بھی
زندہ ہوں اب کہ مردہ مجھ کو خبر نہیں ہے
آہیں بھریں بہت کچھ دم توڑنا ہے باقی
اس آہ میں بھی دیکھوں ہے یا اثر نہیں ہے
تاریک ہو گئی ہو دنیا ہی جب نظر میں
پھر کوئی امتیاز شام و سحر نہیں ہے
دنیا سے جا رہے ہو کیا لے کے اے نظر تم
زاد سفر نہیں ہے رختِ سفر نہیں ہے

ہر قدم پر ایک نالہ ہر نفس پر ایک آہ زندگی کیا ایک شرح سخت جانی ہو گئی
مے کو دنیا آتشِ سیال کہتی ہے نظر
لیکن اپنے جام میں آتے ہی پانی ہو گئی

زندگی کی کشمکش سے مر کے پائی کچھ نجات
اس سے پہلے اے نظر فرصت کبھی ایسی نہ تھی

ہمدموں نے جان لے لی پرسش آزار سے
یہ محبت اک عداوت تھی ترے بیمار سے
اب بھی تُو ملتا ہے مجھکو زندگی میں یا نہیں
تیز جاتا ہوں میں اپنی عمر کی رفتار سے
کچھ برا ایسا نہیں واعظ کے منہ سے ذکرِ مے
زہر مل جاتا ہے لیکن تلخیٔ گفتار سے
کثرت صحرانوردی نے اسے بھی کھو دیا
وہ جو اک لطف خلش ملتا تھا نوکِ خار سے

دل میں کتنا خون تو نے بھر دیا تھا اے خدا
کم نہیں ہوتی روانی دیدۂ خونبار سے
اب نہیں معلوم کیا دنیا میں ہے رنگ بہار
اک زمانہ ہو گیا چھُوٹے ہوئے گلزار سے
باغ عالم میں رہے بے لوث ہم سب سے نظر
سیر گلشن کی مگر دامن نہ اُلجھا خار سے

ذکرِ شباب

عمر انساں میں جوانی گرچہ ہے ہر دل عزیز
اور باغ زندگی کی ہے یہی فصلِ بہار
لیکن اپنی بے ثباتی میں یہ ہے ضرب المثل
مثل خواب خوش نہیں اک رات بھی اس کو قرار

یاد ایآمے کہ تھی اپنی جوانی کی نمود
ہائے وہ عالم کہ اپنا بھی تھا زندونمیں شمار
صبح تھی صبح تمنا ، شام تھی شام مراد
طالع بیدار تھا کالشمس فی نصف النہار

دل میں جودت تھی طبیعت میں اُمنگیں موجزن
چڑھتے دریا کی طرح جوش جوانی آشکار
آنکھ پڑتی جس طرف دنیا نظر آتی بہشت
دامن دل کھینچنے کو حسن گل رکھتے تھے خار

دل کہ جوش عشق سے اک بحر طوفاں خیز تھا
روکنے سے رک نہ سکتا جذبۂ بے اختیار
جمگھٹے تھے لعبتانِ حوروش کے گرد و پیش
حسنِ آفت خیز پر جن کے دلِ عالم نثار

بھولی بھالی پیاری پیاری اُن کی دلکش صورتیں
لوٹ لے جائیں دلوں سے مایۂ صبر و قرار
بانکی بانکی وہ ادائیں تیر و خنجر کی طرح
ترچھی ترچھی وہ نگاہیں مثلِ تیغِ آبدار

ایک خنجر تھا نیامِ ناز سے نکلا ہوا
اُن کی چشم نرگسیں میں سرمۂ دنبالہ دار
شوخیوں میں وہ ادائیں تھیں کہ بجلی مات تھی
گفتگو میں وہ شرارت تھی کہ اڑتے تھے شرار

جسم وہ نازک اٹھا سکتے نہ جو بارِ نظر
آنکھ بھر کر دیکھنا بھی تھا کسی کا ناگوار
سحر تھا نغموں میں اُن کے نور کے اُن کے گلے
تان لیتے تھے تو ہو جاتے تھے ناوک دل کے پار

مجمع یارانِ صادق اور بھی دیتا تھا لطف
نام پر جن کے وفاؤ دوستی ہوتی نثار
خون جو اپنا بہاتے تھے پسینے کی جگہ
جنکا مذہب تھا محبت دوستی' جنکا شعار

شعلۂ اُلفت تھا جنکے دل میں یکساں مشتعل
شمع ساں دل سوز تھے' قربان تھے پروانہ وار
ظاہر و باطن تھا یکساں صاف مثل آئینہ
منہ پہ کہہ دیتے تھے کچھ دل میں جو آتا تھا غبار

الغرض تھی ہر طرف ارزانئی عیش و نشاط
جام زریں میں چھلکتی تھی شرابِ خوشگوار
دن تھے اپنے عید کے دن' اپنی راتیں شب برات
روز رہتی تھی عروسِ کامرانی ہمکنار

کیا زمانہ تھا موافق طالع بیدار سے
چلتی تھی اپنے اشاروں پر ہوائے روزگار
دل کی قوت سے ارادے ہو رہے تھے کامیاب
سہل اپنے سامنے تھی ہر رہِ مشکل گزار

دفعۃً ایسی ہوا بدلی کہ ٹوٹا وہ طلسم
ہو گئی صرفِ خزاں باغ جوانی کی بہار
اڑ گئے باغ طرب سے سب حسیں بلبل کی طرح
غنچہ و گل کے عوض کانٹے ہیں یا گرد و غبار

صحبتِ یاران ہمدم ہو گئی خواب و خیال
اٹھ گئے دنیا سے کتنے ہی رفیق و دوستدار
اب وہ باتیں ہیں نہ وہ راتیں نہ وہ دل کی امنگ
ہر گھڑی ہے فکرِ دنیا اور ہجومِ کاروبار

شادمانی و مسرت سے جو دل لبریز تھا
اب وہی ہے حسرتِ مردہ کا گویا اک مزار
دل ہے تربت داغِ دل ہے شمع تربت کی طرح
طبع افسردہ ہے' مردہ حسرتوں کی سوگوار

عالمِ امکاں ہے گویا اک تغّیر کا طلسم
ایک حالت پر نہیں کیفیّت لیل و نہار
شام ہے لاریب دیباچہ کتاب صبح کا
صبح ہے اک دفتر بے معنی و بے اعتبار

باغ عالم کی فضا سے دل لگائے کیا کوئی
موسم گل چند روزہ زندگی نا پائدار
آنکھ مثلِ غنچہ کھولی تھی کہ آ پہنچی خزاں
اک گلِ پژ مردہ ہو کر رہ گیا جسم نزار

اس زمانے کی نہیں اب کوئی شے باقی مگر
غم غلط کرنے کو ہے اک طبع موزوں یادگار
شاعری جسکو سمجھتے تھے ہم اک شوقِ فضول
اب دل اندوھگیں کی اک وہی ہے غمگسار

یاد ایّام جوانی جب ستاتی ہے بہت
شعر کہنے میں نکل جاتا ہے کچھ دل کا غبار
طبع میں ہے شعر گوئی سے جو اک وارستگی
برق کی صورت نہیں دم بھر کہیں دل کو قرار

خانہ بر دوشِ صبا رہتا ہوں مثل بوئے گُل
اپنی ھی خوشبو سے جیسے مست آھوئے تتار
خواب سا دیکھا تھا ہم نے ھاں جوانی خواب تھی
خواب بھی ایسا نہیں تعبیر جسکی زینہار

فصل بہار

کہاں ھیں جرعہ کشِ لطفِ ابتدائے بہار
وہ آئے ابر کے ٹکڑے چلی ھوائے بہار
وہ جھوم جھوم کے چاروں طرف گھٹا چھائی
ھوا نے کھول دی وہ زلف مشکھائے بہار

وہ شور رعد سے سارا جہان گونج اٹھا
ہوئی وہ دھوم سے پھر آج ابتدائے بہار
کڑک رہی ہے وہ بجلی ' گرج رہا ہے وہ ابر
بجا رہی ہے وہ سازِ طرب ہوائے بہار
فضائے دہر دھواں دھار ہے گھٹاؤں سے
چراغ ابر اندھیرے میں اب دکھائے بہار
پیام موسم گُل لے کے ابر آیا ہے
ترانہ سنج ہیں مرغانِ خوشنوائے بہار
وہ کوہ و راغ میں مستی سے مور چنگھاڑے
سنائی کُوک کے کوئل نے وہ صدائے بہار
چہک کے دی یہ صدا شاخ گل پہ بلبل نے
بہار میرے لئے اور میں برائے بہار
گیا فلک پہ پپیہا وہ "پی کہاں" کہتا
نقیب موسم گل ' پیک خوشنوائے بہار
زباں پر ہیں کنیری کے زمزمے دلکش
وہ نغمہ سنج چمن ' وہ غزل سرائے بہار
چلی ہیں جانب دریا وہ صف بہ صف قازیں
دکھا رہی ہیں وہ مرغابیاں ادائے بہار
ہوا میں آئی وہ اُڑتی قطار بگلوں کی
کُھلا ہے بیلے کا تختہ کوئی برائے بہار
چمک رہی ہے یہ ابر سیاہ میں بجلی
چڑھا ہوا ہے کسوٹی پہ یا طلائے بہار
گزر گیا ہے تقاضائے نامیہ حد سے
نقاب عارضِ گل سے بس اب اٹھائے بہار
چمن میں ابر کے چھینٹے کریں مسیحائی
خزاں کی فصل کے کشتوں کو پھر جلائے بہار
زمیں سے سبزۂ خود رو کی کونپلیں پھوٹیں
جہاں میں ہو گل نورس سے ابتدائے بہار

رہے نہ تن پہ کسی کے قبائے بوسیدہ
نئے لباس درختوں کو پھر پنہائے بہار

کرے جہان کو روشن کھلا کے غنچہ و گل
چراغ کوہ و بیاباں میں پھر جلائے بہار

کمر کمر کسی وادیٔ کوہ میں سبزہ
مویشیوں کو چراگاہ کے دکھائے بہار

صدائے آب میں اک دلکشی سی ہو پیدا
زبانِ موج پہ جاری ہوں نغمہ ہائے بہار

ہو میکشوں کے لئے صحن میکدہ جنّت
عیاں ہو ہر در و دیوار سے فضائے بہار

خم و سبو کے گلے میں ہوں ہار بیلے کے
بہک بہک کے ہر اک بادہ کش منائے بہار

پڑا ہو ہاتھ کس کا گلے میں ساقی کے
ملہار گا کے کوئی ابر کی دکھائے بہار

اگرچہ اپنے لئے قہر ہے یہ موسم گل
بہار سب کو دکھائے نظر خدائے بہار

قطرۂ باراں

آسماں سے چلے وہ قطرۂ آب جن سے پیاسی زمین ہو سیراب
چمن و سبزہ زار ہوں شاداب اور پیدا ہوں بحر میں گرداب
ساری دنیا کو پالنے والے
جان مردوں میں ڈالنے والے

ناز پروردۂ حریم سحاب مایۂ کائنات موج و حباب
تازگی بخش گلشن شاداب قدر افزائے رنگ و بوئے گلاب
بانئی کارگاہ برگِ و نوا
حاصل دُودمان آب و ہوا

سخت تھا انتظار بارش آب قطرہ قطرہ تھا گوہر نایاب
تابش مہر تھی جہاں کو عذاب دل تڑپتے تھے صورتِ سیماب

ابر نے کی جو قطرہ افشانی
ساری گرمی پہ پھر گیا پانی

ہو گئے دل شگفتہ و شاداب چمنِ آرزو ہوا سیراب
نکلے پردے سے نغمہ ہائے رباب شوق تار نفس کو ہے مضراب

جی آٹھے دل کے ولولے سارے
جان میں جان آ گئی بارے

کس طرح ہیں یہ چند قطرۂ آب رونق ہستیٔ جہان خراب
یہی بنتے بخار سے ہیں سحاب بڑھ کے ہوتے یہی ہیں اک سیلاب

کبھی مینہ ہیں کبھی یہی شبنم
اک طلسمات کا سا ہے، عالم

قطعه

نہیں بدلتی یہ دنیا، بدلتے رہتے ہیں ہم
کہ ہم کو ہوتے ہیں محسوس راحت و آلام
جو انقلاب بھی ہو زندگی میں انسان کی
اسی کو کہنے لگے لوگ گردش ایام

تلوک چند محروم

تلوک چند نام ۔ محروم تخلص ۱۸۸۷ء میں عیسیٰ خیل ضلع میانوالی میں پیدا ہوئے والد کا نام بھگت رام دیال تھا ۔ محروم کے بزرگ کاشتکاری کرتے تھے لیکن موروثی آراضی کے دریا برد ہو جانے پر تجارت کو ذریعہ معاش بنایا ۔ محروم کا بچپن دریائے سندھ کے کنارے گزرا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ انہیں مظاہر فطرت سے ہمیشہ بڑی شیفتگی رہی ہے ۔

محروم کی ابتدائی تعلیم وطن ہی میں ہوئی جہاں انہوں نے اردو مڈل کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا ۔ اس کے بعد میونسپل بورڈ ہائی اسکول بنوں سے میٹرک کیا ۔ ۱۹۰۸ء میں وہ ٹرننگ کالج لاہور سے جے ۔ اے ۔ وی کا امتحان پاس کر کے مشن ہائی اسکول ڈیرہ اسماعیل خاں میں ملازم ہو گئے ۔ لیکن درس و تدریس کے مشغلہ کے ساتھ اپنا ذاتی مطالعہ بھی جاری رکھا اور کچھ عرصے کے بعد یہیں سے خانگی طور پر ایف ۔ اے کا امتحان پاس کر لیا ۔ نومبر ۱۹۱۵ میں محروم کو ایک بہت ہی جانکاہ حادثے سے دو چار ہونا پڑا یعنی ان کی جواں سال شریک حیات کا انتقال ہو گیا اس سوہان روح واقعہ سے متاثر ہو کر محروم نے بہت ہی غم انگیز نظمیں کہیں جو یقیناً ان کی بہترین نظموں کا ایک حصہ ہیں اور ان کے مجموعہ کلام ''گنج معانی'' میں ایک مستقل عنوان ''طوفان غم'' کے تحت درج ہیں ۔ جواں مرگ اہلیہ کے سانحہ ارتحال کے بعد محروم صاحب کے لئے ایک سب سے بڑی مصیبت کا سامنا اپنی ننھی بچی ''ودیا'' کی پرورش و پرداخت تھی ۔ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انہیں وطن ہی میں زیادہ سہولتیں نظر آئیں چنانچہ ۱۹۱۶ء میں وہ ملازمت سے مستعفی ہو کر عیسیٰ خیل واپس چلے آئے جہاں انہیں کچھ دنوں کے بعد اپنی قدیم درسگاہ میں ملازمت بھی مل گئی ۔ وطن میں رہ کر جب محروم صاحب کو کچھ سکون حاصل ہوا تو انہوں نے پھر مطالعہ شروع کیا اور پہلے بی ۔ اے اور پھر ایس ۔ اے ۔ وی کے امتحانات پاس کئے ۔ اب اعزہ و رفقاء نے دوسری شادی کے لئے مجبور کرنا شروع کیا تو محروم صاحب نے بزرگوں کے اصرار پر وطن ہی میں دوبارہ شادی کر لی ۔ ۱۹۲۵ء تک آپ عیسیٰ خیل میں سیکنڈ ماسٹر اور ہیڈ ماسٹر کے فرائض انجام دیتے رہے اس کے بعد آپ کا تبادلہ کلور کوٹ ہو گیا جہاں تقریباً ساڑھے آٹھ سال تک آپ ہیڈ ماسٹر رہے۔

۱۹۳۲ء میں آپ بچوں کی تعلیم کے خیال سے راولپنڈی چلے آئے جہاں وہ کنٹونمنٹ بورڈ اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے ۔ کئی سال تک یہ خدمت انجام دینے کے بعد جب انہوں نے پنشن لے لی تو گارڈن کالج والوں نے آپ کی خدمات حاصل کر لیں ۔ اس معروف ادارے سے آپ کا تعلق تقسیم ہند سے پہلے تک رہا ۔ قیام پاکستان کے بعد آپ دہلی چلے گئے اور تا دم تحریر وہیں تشریف فرما ہیں ۔

محروم صاحب بچپن ہی سے شعر و سخن کے دلدادہ رہے ہیں ۔ ابتدا میں اردو میں اظہار خیال ذرا مشکل نظر آیا تھا لیکن مولانا آزاد مرحوم کی تصانیف کے مطالعہ سے زبان پر جلا ہوگئی ۔ اور ۱۹۰۶ء میں جبکہ آپ دسویں جماعت کے طالب علم تھے آپ کا کلام اتنی جان پکڑ چکا تھا کہ ''مخزن'' اور ''زمانہ'' جیسے مشہور ادبی رسائل میں شائع ہونے لگا تھا ۔ اس لحاظ سے محروم صاحب جدید اردو شاعری کے بڑے قدیم و معزز پرستاروں میں سے ہیں اور آپ کو سرور ، نادر اور چکبست جیسے قادر الکلام و شہرہ آفاق شعرائے اردو کی ہمعصری کا شرف حاصل ہے ۔

محروم صاحب جملہ اصناف سخن پر قادر ہیں لیکن اُن کی سوشل ، قومی ، سیاسی اور اصلاحی نظموں کا پلہ دوسری اصناف سخن پر بہت بھاری ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی انہیں نیچرل منظومات کی بدولت شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کر چکے ہیں ۔ محروم صاحب کو جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے مظاہر فطرت سے ابتدا ہی سے بڑا اُنس رہا ہے چنانچہ اُنہوں نے مناظر قدرت پر بہت سی نظمیں کہی ہیں جو بڑی دلچسپ و لطیف ہیں ۔ ان میں سے اکثر نظموں کی خصوصیت یہ ہے کہ شاعر نے ڈوبے ہوئے انداز میں مختلف مظاہر کی تصویر کشی سہل مگر رنگین الفاظ میں کی ہے ۔ اور ان نظموں کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ شاعر دلفزا مناظر قدرت سے پورے طور پر محظوظ ہوتا ہے مگر ساتھ ہی حوادث روز گار نے اُسے کچھ اس درجہ غم آشنا بنا دیا ہے کہ بسا اوقات وہ حسین سے حسین منظر کی قربت کے باوجود اُس سے لطف نہیں اُٹھاتا ۔

اُن کی منظومات میں پندو نصائح کی بھی کمی نہیں ۔ بظاہر اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ محروم صاحب کی زندگی درس و تدریس میں گزری ہے اس لئے اُنہیں بچوں اور نوجوانوں کے لئے نصیحت آموز باتیں سوچنے کا موقع ملا ہے اور یہ خیالات نظم کی صورت میں ڈھل کر اُن کے کلام کا ایک مستقل جزو بن گئے ہیں ۔ لیکن خوبی یہ ہے کہ وہ نصیحت آموز باتوں ایسے دلکش پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو گراں نہیں گزرتیں اور یہی وہ گر ہے جو اُنہیں اس فن میں کامیاب بناتا ہے ۔ مثال کے طور پر شراب کی مذمت کے سلسلے میں اُن کی پند رنگیں کا نمونہ ذیل کے چند اشعار میں ملاحظہ ہو ۔

فریب دھر نے تدبیر جاں ستانی کی — کہ شکل آگ نے کی اختیار پانی کی
یہ آب وہ ہے کہ جسکے حباب شعلے ہیں — یہی تو آتش مے کے جناب ! شعلے ہیں
نہ حور ہے نہ یہ کوئی پری ہے شیشے میں — رہے خیال کہ آتش بھری ہے شیشے میں

اس میں شک نہیں کہ کہیں کہیں آن کی نصیحت صرف منظوم نصیحت ہوکے رہ گئی ہے لیکن بحیثیت مجموعی وہ اس خارزار سے کامیاب گزرے ہیں ۔

بقول سر عبدالقادر مرحوم ''محروم صاحب کی درد بھری طبیعت دوسروں کے درد کو بھی معمول سے زیادہ محسوس کرتی ہے'' چنانچہ آنہوں نے اپنے بعض معاصرین کی اچانک موت پر اظہار تاسف کیا ہے ۔ آن کی یہ نظمیں ''یاد رفتگان'' کے عنوان سے مجموعۂ کلام میں درج ہیں ۔ ان میں سے سرور' نادر اور چکسبت سے متعلق نظموں میں آن کی سچی محبت کا جلوہ نظر آتا ہے اور ان مرثیوں کے ایک ایک لفظ سے محبت و اخلاص کی بو آتی ہے ۔

اس کے علاوہ اس دور میں انگریزی نظموں کے منظوم تراجم کا جو ایک رواج ہو چلا تھا اور جس میں نظم طباطبائی نے خاصی شہرت حاصل کر لی تھی ۔ اس کے زیر اثر محروم صاحب نے بھی انگریزی و فارسی اشعار کے سادہ اور دلچسپ ترجمے کئے ہیں ۔ آن کے بعض بعض منظوم ترجمے تو اس قدر رواں اور دلکش ہیں کہ طبع زاد معلوم ہوتے ہیں ۔

جہاں تک اسلوب بیان کا تعلق ہے آنہیں بلاشبہ زبان پر بڑا عبور حاصل ہے ۔ اور سچ پوچھئے تو آردو کی یہ خوش قسمتی ہے کہ صوبۂ پنجاب کے میانوالی جیسے ضلع میں پرورش پا کر محروم صاحب نے وہ شستہ' رفتہ اور رواں زبان استعمال کی ہے کہ خود اهل زبان نے بے ساختہ آن کے کلام کی داد دی ہے ۔ اس سلسلے میں اکبر الہ آبادی مرحوم کی وہ مشہور رباعی یاد آتی ہے ۔

ہے داد کا مستحق کلام محروم لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے آن کا سخن مفید دانش آموز آن کی لفظوں کی ہے بجا ملک میں دھوم

غرض آپ کے کلام میں الفاظ کی برجستگی' بندش کی چستی اور خیالات کی پاکیزگی ہر جگہ نمایاں ہے ۔ صلح و محبت کی جو تلقین آنہوں نے سادہ و جاذب انداز میں اپنے دیس باسیوں کو کی ہے گو وہ اس زمانہ میں تقریباً ہر اچھے شاعر کی زبان پر تھی لیکن یہ چیز محروم کی شاعری کا ایک جزو خاص بن گئی اور آن کی گداز طبیعت نے اس میں درد و اثر کا ایسا رنگ بھرا کہ ہر پڑھنے والا جھوم آٹھا ۔ آردو ادب کی یہ خوش نصیبی ہے کہ سرور ' نادر ' چکسبت وغیرہ کا ایک ہم عصر آج بھی زندہ ہے ۔ خدا کرے محروم صاحب جیسے ''یادگار زمانہ لوگ'' دیر تک آردو کی خدمت کے لئے زندہ و سلامت رہیں ۔

انتخاب کلام

کنارِ راوی

غم دل آفت ساوی ہے زندگی موت کے مساوی ہے
زخم پنہاں جگر پہ حاوی ہے اشک ریزی جگر تراوی ہے
شام غم ہے کنار راوی ہے
مَیں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے !

ہم کہاں اور سیر باغ کہاں ذوق و شوق و دل و دماغ کہاں
گلشن دھر میں فراغ کہاں چین دیتے ہیں دل کے داغ کہاں
شام غم ہے کنار راوی ہے
مَیں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے !

آڑ چلے طائر آشیانوں کو ملا آرام باغبانوں کو
نغمے یاد آئے نغمہ خوانوں کو کیا کروں سُن کے مَیں ترانوں کو
شام غم ہے کنار راوی ہے
مَیں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے !

خواہ چرواھے ' خواہ چوپائے شوق سے اپنے گھر کو پھر آئے
خانہ ویراں کو گھر جو یاد آئے . کیا کرے ھائے ! کوئی بتلائے
شام غم ہے کنار راوی ہے
مَیں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے !

سہرِ تاباں تھا مائل آرام کوہِ مغرب میں جا کیا بسرام
سو گیا ے کے تن پہ چادر شام اُس کے آرام سے مجھے کیا کام
شام غم ہے کنار راوی ہے
مَیں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے !

آنکھ کھولی ادھر ستاروں نے جلوے دکھلائے ماہ پاروں نے
گو اشارے کئے ہزاروں نے آنکھ آٹھائی نہ غم کے ماروں نے
شام غم ہے کنار راوی ہے
مَیں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے !

جلوے دکھلائے گورے کالوں نے　　جال پھیلائے کالے بالوں نے
دل کئے نذر شوق والوں نے　　مجھ کو گھیرا میرے خیالوں نے

شام غم ہے کنار راوی ہے
مَیں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے !

کئی بچھڑے ہوئے ملے ہونگے　　شکوے کچھ ہونگے کچھ گلے ہونگے
آرزوؤں کے گُل کِھلے ہوں گے　　دامنِ شوق میں صلے ہوں گے

شام غم ہے کنار راوی ہے
مَیں ہوں.! اور میری سینہ کاوی ہے

میکدوں میں چراغ روشن ہیں　　نور مے سے ایاغ روشن ہیں
کرمک شب چراغ روشن ہیں　　یا مرے دل کے داغ روشن ہیں

شام غم ہے کنار راوی ہے
مَیں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے !

بیقراری ہے، کیا خبر، کیوں ہے؟　　آہ وزاری ہے، کیا خبر، کیوں ہے؟
دلفگاری ہے، کیا خبر، کیوں ہے؟　　اشکباری ہے، کیا خبر، کیوں ہے؟

شام غم ہے کنار راوی ہے
مَیں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے !

آہ ! اے درد نوجوانی ، آہ !　　آہ ! اے موت کی نشانی ، آہ !
کیا ہوئی دل کی شادمانی ، آہ !　　ہے کدھر مرگ ناگہانی ، آہ !

شام غم ہے کنار راوی ہے
مَیں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے !

دل وحشی کا مدعا غم ہے　　ابتدا غم ہے انتہا غم ہے
یوں تو دل پر مرے سدا غم ہے　　غم مرگِ پدر نیا غم ہے

شام غم ہے کنار راوی ہے
مَیں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے !

المدد ! سیل گریۂ خون تاب　　سوز پنہاں سے ہو چلا ہوں کباب
گلخن غم میں ہے دل بے تاب　　کہ تڑپتا ہے صورت سیماب

شام غم ہے کنار راوی ہے
مَیں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے !

عید بھی ہو مجھے محرم ہے　　میرا سینہ ہے، خنجر غم ہے
خوں فشاں کب سے چشم پرنم ہے　　دشتِ غربت ہے شام ماتم ہے
شام غم ہے کنار راوی ہے
مَیں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے !

پروانہ

آفرین ! ننھے سے کیڑے آفرین !　　یہ ذرا سی جاں، یہ عشقِ آتشیں
بڑھ گیا فرہاد و مجنوں سے کہیں　　تیرے مرنے کی ادا ہے دل نشیں
شکوۂ حسنِ تغافل کیش کیا
جز فنائے عشق بیش از بیش کیا

شہپرِ ذوقِ فنا پر اُڑ چلا　　سوز اُلفت کی ہوا پر اُڑ چلا
عشق کے اوج سما پر اُڑ چلا　　اُڑ چلا راہ وفا پر اُڑ چلا
گھر سے نکلا جستجوئے یار میں
تا کہ گم ہو جائے کوئے یار میں

اُڑتے اُڑتے آن پہونچا شمع پر　　وہ جھلس کر رہ گئے نازک سے پر
ہو گیا افسانۂ غم مختصر　　جل بجھا بے شکوۂ سوزِ جگر
حسن کے شعلے سے لپٹا آن میں
جینے مرنے کو نہ لایا دھیان میں

اُف ! یہ تیرا تھرتھرانا گرد شمع　　اضطرابِ عاشقانہ گرد شمع
یہ ترا چکر لگانا گرد شمع　　ہے طواف مخلصانہ گرد شمع
شام کو چھپ چھپ کے یہ آنا ترا
چپکے چپکے ہائے ! جل جانا ترا

بسکہ ہے دلدادۂ سوزِ وفا　　ہو گیا ہے بہرہ اندوزِ وفا
ظلمتِ شب تجھ کو نو روز وفا　　تیرا جلنا طلعت افروزِ وفا
یہ ترے ننھے سے پر پتلے سے بال
ہیں سراپا دفتر شرح وصال

عشق پروانے کا ہے باقی ہوس — جس کو جلنے میں نہیں کچھ پیش و پس
بوالہوس لاکھوں ہیں یاں مثلِ مگس — ہیں جو شہرِ عشق میں خاشاک و خس
ایسے عاشق ہر جگہ ہیں خیل خیل
عاشقی بد نام ہے جن کے طفیل

ایکہ تجھکو آرزوئے عشق ہے — شامہ سرمست بوئے عشق ہے
جانتا بھی ہے جو خوئے عشق ہے — مشہد عشاق کوئے عشق ہے
شمع پر پروانے کو دیکھا نہیں
عشق بازی کھیل بچوں کا نہیں

سیکھ پروانے سے آئینِ وفا — جسکا جل بجھنا ہے تلقینِ وفا
شمع خود ہے پیروِ دینِ وفا — قدر دان و منزلت بینِ وفا
ساتھ ڈھلتی رات کے ڈھلتی ہوئی
تا سحر روتی ہے یہ جلتی ہوئی !

دل میں پیدا ہمتِ پروانہ کر — ورنہ مرغِ شوق کا پَر وا نہ کر
راز تنہائی کسی پر وا نہ کر — اپنی ہستی کی ذرا پروا نہ کر
دل کو تو پہلے جلا پھر آپ جل
عشق کا دعویٰ ہے تو چپ چاپ جل

موت کا موسم

(ترجمہ از انگریزی)

موسم خاص میں ہوتے ہیں شجر برگ فشاں
پھول مرجھاتے ہیں جب باغ میں آتی ہے خزاں
صبح کے ہونے پہ ہوتے ہیں ستارے پنہاں
لیکن اے موت ! مقرر ہے ترا وقت کہاں

دن کو ہوتا ہے ہر اک کو غم دنیا سے کام
دوست مل جائیں بہم ، آتی ہے اس واسطے شام

رات ہوتی ہے کہ ہو سب کو میسّر آرام
لیکن اے موت ! ترے آنے کے ہیں وقت تمام

ہم کو معلوم ہے کب بدر کو ہونا ہے ہلال
اڑ کے کب جانا پرندوں کو ہے پھر سُوئے شمال
ہونا گلشن کو ہے کب باد خزاں سے پامال
کون بتلائے کہ کب کیجیے ترا استقبال

کیا وہ موسم ہے ترا جب کہ بہار آتی ہے
اور صبا حسن گُل تر کو نکھار آتی ہے
یا کہ جب باد خزاں لے کے غبار آتی ہے
نہیں ، ہر فصل میں تو بہرِ شکار آتی ہے

بحر و بر دونوں کو منظور اطاعت تیری
کر رہی کام ہوا میں بھی ہے طاقت تیری
دل سے راحت میں بھی جاتی نہیں ہیبت تیری
ہم جہاں جائیں نظر آتی ہے صورت تیری

تو وہاں بھی ہے جہاں ملتے ہیں دو سینہ فگار
دکھڑے رونے کے لئے بیٹھ کے زیر اشجار
تو وہاں بھی ہے جہاں ملتی ہیں فوجیں خونخوار
اور جوہر ہے جہاں اپنے دکھاتی تلوار

نوحہ چکبست

بپا زمین سخن پر ہے محشرِ شیون گرا ہے آج کوئی آسمانِ اوجِ سخن
اماں کسی کو نہیں یوں تو زیرِ چرخ کہن ہے فلک بلند خیالوں کا خاص ہے دشمن
تلا ہے جوہر عالی کو پست کرنے پر
دیا نجوم کو بھی ڈوبنا ابھرنے پر

سخن طرازوں میں چکبست بے مثال رہا — شہید جلوۂ معنی وہ خوش خصال رہا
متاعِ سوزِ قدیمی سے مالا مال رہا — کہ شمع انجمنِ دانش و کمال رہا

مٹا دیا اسے سفّاک نے مٹانا تھا
کہ زد پہ تیرِ اجل کی بڑا نشانہ تھا !

خموش اگرچہ ہوا وہ فدائے حب وطن — ہوا میں گونجتے ہیں نغمہ ہائے حب وطن !
نہ کیوں مناظر حسرت دکھائے حب وطن — کہ ماتمی ہے سواد فضائے حب وطن !

وطن کو تیری ضرورت تھی آہ ! اے چکبست
چلا ہے کے عدم کی تو راہ ، اے چکبست

دلوں کو انس نہانی تھا نام سے تیرے — تڑپ تڑپ گئے جوش کلام سے تیرے
کوئی نہ تشنہ رہا فیض عام سے تیرے — بقدر ذوق ملی سب کو جام سے تیرے

دکھا کے معنئی پرنور سے پرستوں کو
سئے سخن سے کیا ہوشیار مستوں کو

سخنوری کا تری سب سے ہے جدا آئیں — سخن کو رنگ حقیقت سے کر دیا رنگیں
اگر ہیں شعر نفاست میں تیرے لبعت چیں — تو شان و وقر میں کوہِ گراں سے ہیں سنگیں

ملا جو فیضِ ازل اس کی قدر کی تو نے
نیا وقار ایا تجھ سے نظم اردو نے

ہر ایک شعر ہے صدق و صفا کا آئینہ — ہر ایک لفظ ہے حسن ادا کا آئینہ
بیاں ترا ہے دل خوش نما کا آئینہ — وطن پرستی و مہر و وفا کا آئینہ

وہ جوت قلب مصفا میں تیرے روشن تھی
کبھی جو وادئی گنگا میں عکس افگن تھی

کہیں ہیں گنگ و جمن کی روانیاں دلکش — کہیں ہمالہ کے دامن کا ہے سماں دلکش
کہیں ہے گائے کی توصیف دلستاں دلکش — ہر ایک نظم دل افزا، ہر اک بیاں دلکش

کہیں ہیں گلشن کشمیر کی وہ تصویریں
ادائے حور جناں کی ہیں جن میں تاثیریں

زباں پہ جب کبھی آتا تھا لکھنو کا نام تو اس خیال سے ہوتا تھا خوش دلِ ناکام

کبھی تو آئے گی ایسی سعادتِ ایّام ملینگے حضرت چکبست سے بہ شوق تمام

ملیں گے اب بھی مگر آہ ! کب ؟ کہاں ؟ کیونکر ؟

یہ راز اپنی نگاھوں سے ہے نہاں یکسر

غزل

عشق کی دنیا میں جنس غم کو ارزاں کر دیا
ہم غریبوں کے لئے جینے کا ساماں کر دیا
حسن کو جاں بخشیاں دیں تو نے اے حسن آفریں
آہ لیکن پھر اسی کو دشمنِ جاں کر دیا
میں تو جب جانوں کہ میرے دل کی بیتابی مٹے
کیا ہوا گر آئینے کو تم نے حیراں کر دیا
ہے یہ دنیا ایک ہی افسانۂ ناکام شوق
جس نے جو چاہا الگ تجویز عنواں کر دیا
طبع رنگیں نغمہ زار شوق تھی میری ، مگر
حادثات شوق نے اس کو بیاباں کر دیا

سورج نرائن مہر

منشی سورج نرائن متخلص به مہر دھلی کے رھنے والے اور ایک معززکائستھ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ افسوس که آن کے ابتدائی حالات و کوائف زندگی معلوم نہیں ہو سکے۔ البته آن کے پہلے مجموعۂ کلام ''کلام مہر'' کے دیباچے سے اتنا ضرور معلوم ہو سکا ھے که وہ ۱۸۸۲ء میں گورنمنٹ کالج لاھور میں طالب علم تھے۔ اور اس زمانه میں آنہیں شعر و سخن سے نه صرف نہایت دلچسپی تھی بلکه وہ اس فن میں خاصی دستگاہ حاصل کر چکے تھے جسکا ثبوت آن کے زمانۂ طالب علمی کی غزلیات اور وہ قومی نظم ھے جو آنہوں نے اکتوبر ۱۸۸۶ء میں کائستھ سبھا منعقدہ شمله کے سالانه جلسے میں پڑھی تھی۔ گورنمنٹ کالج لاھور سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد آنہیں سر رشتۂ تعلیم پنجاب میں ملازمت مل گئی اور وہ عرصه دراز تک انسپکٹر مدارس حلقۂ دھلی و راولپنڈی کی خدمات انجام دیتے رھے۔

مہر کو آردو، فارسی، سنسکرت اور انگریزی زبانوں پر بڑا عبور حاصل تھا اور وہ شعر و شاعری کا بڑا شسته و پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔ چنانچه ''کلام مہر'' کے دیباچے میں رقم طراز ھیں که ''نظم کا موازنه مرصع اشعار اور مصرعات سے کرنا بڑی بھاری غلطی ھے۔ جن زبانوں میں معیار موازنه کا درجه ایسا اسفل ھو جاتا ھے آن میں اصلی شاعری مفقود ھو کر محض لفاظی رہ جاتی ھے۔ چستئ بندش اور طمطراق و شوکت الفاظ ایسی چیزیں ھیں که جدت و قدرت معانی کی سنجیدگی و متانت طبیعت میں ضرور اثر پیدا کرتی ھے لیکن یه اثر پھڑکا دینے والا نہیں۔ آلٹا خاموشی اور حیرت پیدا کر دینے والا ھے'' اس سے صاف معلوم ھوتا ھے که وہ ساده و نیچرل شاعری کے بڑے دلداده تھے۔ اور حقیقت یه ھے که آنہوں نے اپنے سلجھے ھوئے مذاق سخن کی بدولت آردو شاعری کی بڑی قابل قدر خدمت انجام دی ھے۔ مہر کو غزلگوئی سے فطری لگاؤ نه تھا یہی وجه ھے که آنہوں نے ایسے وقت میں جبکه آردو کی فضا میں غزل کا نغمه گونج رھا تھا اور مستقل نظموں کی طرف لوگوں کا التفات کم تھا نه صرف طبع زاد موضوعات پر نظمیں لکھیں بلکه انگریزی کی نظموں کو شعر کا جامه پہنا کر آردو زبان میں حتی المقدور وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس میں شک نہیں که آنکی نظمیں بیشتر لفظی ترجمے کی حیثیت رکھتی ھیں تاھم یہی کیا کم ھے که آنہوں نے مغربی خیالات کو آردو داں طبقه سے روشناس کر کے آزاد و حالی کی بنائے شاعری کو اور زیاده استوار کیا۔

مہر کی طبع زاد نظموں کی سب سے بڑی خصوصیت آن کا عارفانه و صوفیانه رنگ ھے۔ آنہوں نے اپنی آن نظموں میں راہ سلوک کی اکثر ایسی باتیں لکھی ھیں جن سے اندازہ ھوتا ھے۔ که شاعر کے خیالات و اقوال رسمی نہیں ھیں بلکه ایک ایسے شخص کی زبان سے نکلے ھیں جو خود عشق الٰہی میں چور اور سالک راہ فنا ھے۔ یہی وجه ھے که مہر نے

اخلاقی نظموں کے علاوہ اکثر ایسے مستقل عنوانات پر بھی طبع آزمائی کی ہے جیسے رموزِ عشق رموز عرفان ترک خودی ' ہمہ اوست ' اور طلب حق وغیرہ ۔ اور اپنی ان نظموں میں انہوں نے نفس کشی و دنیا سے بیزاری کی زبردست تعلیم دی ہے ۔ بظاہر اس مسلک زندگی کے دو ہی بڑے وجوہ سمجھ میں آتے ہیں ۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے سنسکرت ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا جس میں بیراگ اور ترک لذات کی تعلیمات نے انہیں بہت متاثر کیا دوسرے عملی زندگی میں انہیں مہاتما شیوبرت لال ایڈیٹر رسالہ ''سادھو'' جیسے رشی و عامل بزرگ سے ایک والہانہ عقیدت تھی ۔ یہی درویش ہیں جن سے اظہار عقیدت کے طور پر مہر نے ''کلام مہر'' کے دوسرے حصے مطبوعہ ۱۹۱۰ء کا انتساب کیا ہے ۔ ظاہر ہے ایسے دنیدار و پاک نہاد انسان کے فیضان صحبت کا لازماً یہی نتیجہ ہونا چاہئے تھا جسکا اظہار مہر نے اپنے کلام کے ایک ایک شعر بلکہ ہر ہر لفظ سے کیا ہے ۔

اس کے علاوہ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا مہر نے چونکہ عمر کا بیشتر حصہ صیغۂ تعلیم کی ملازمت میں گزارا تھا اس لئے انہوں نے مولوی اسمٰعیل کی طرح بچوں کے لئے نظمیں بھی لکھی ہیں ۔ جن کی استعداد و دلچسپی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ایک طرف تو مترنم بحروں کا استعمال کیا ہے دوسری طرف زبان بھی خاص طور پر بڑی نرم و شیریں استعمال کی ہے ۔ ساتھ ہی ایسے کارآمد اور سبق آموز موضاعات پر خامہ فرسائی کی جن کا فیض بچے تو بچے بوڑھوں و جوانوں تک کے لئے عام نظر آتا ہے ۔

غرض مہر ایک حقیقت نگار شاعر تھے ۔ انہوں اردو ادب کی تقریباً تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی لیکن اس خوبی کے ساتھ کہ ان کا سارا کلام ابتذال و رکاکت سے یکسر پاک ہے ۔ کلام میں سادگی و صفائی خوب ہے البتہ کہیں کہیں شعریت ضرور کم ہو جاتی ہے ۔ ویسے طرز بیان نہایت صاف اور ستھرا اور کلام خلوص کا آئینہ ہونے کے ساتھ ساتھ زبان و محاورات کا منتخب ذخیرہ ہے ۔ موصوف نے ۱۹۳۳ء میں وفات پائی ۔

انتخاب کلام

سائیں کی صدا

یہ دنیا جائے گزشتن ہے سائیں کی ہے یہ صدا بابا
یاں جو ہے رُو بر رفتن ہے تو اس میں دل نہ لگا بابا
گیانی نہ رہے ' دھیانی نہ رہے ' جو جو تھے لاثانی نہ رہے
تھے آخر کو فانی نہ رہے ' فانی کو کہاں بقا بابا
تھے کیسے کیسے شاہ زمیں ' تھے کیسے کیسے محل رنگیں
ہیں آج کہاں وہ مکان و مکیں ' نہ نشان رہا نہ پتا بابا

نہ وہ سور رہے ، نہ وہ پیر رہے ، نہ وہ شاہ رہے نہ وزیر رہے
نہ امیر رہے نہ فقیر رہے مولا کا نام رہا بابا

اے ہم سفرانِ طریقِ عدم نہیں چھوڑے تم نے نشان قدم
گم گشتۂ راہِ فنا ہیں ہم کہو کوئی تو کیا ہے بقا بابا

چیز یہاں ہے فانی ہے جو شے ہے آنی جانی ہے
دنیا وہ رام کہانی ہے کچھ حال ہمیں نہ کُھلا بابا
گزری یہ جہاں گزراں ہے اور جنس عمل کی ارزاں ہے
پر نفع بھی یاں کا نقصاں ہے کچھ دیکھ کے کر سودا بابا
مال اعمال کو لاتے ہیں پھل ساتھ اپنے لے جاتے ہیں
جو دیتے ہیں سو پاتے ہیں یوں ہی تار لگا بابا
آنے جانے کا ہے تار لگا دنیا ہے اک بازار لگا
دل اس میں نہ تو زنہار لگا کب نکلا وہ جو پھنسا بابا
یاں مرد وہی کہلاتے ہیں جو جا کر پھر نہیں آتے ہیں
جو آتے ہیں اور جاتے ہیں ، وہ مرد نہیں اصلا بابا
کیوں عمر عبث تو نے کھوئی کچھ کرلے اب بھی خدا جوئی
میں کہتا ہوں تجھ سے یہاں کوئی نہ رہا نہ رہا نہ رہا بابا
تہ تہ کر بستر اپنا باندھ اُٹھ کر رخت سفر اپنا
دنیا کی سرا کو گھر اپنا تو نے ہے غلط سمجھا بابا
کیا گھوڑے بیچ کے سویا ہے کیا وقت رائیگاں کھویا ہے
جو سویا ہے وہ رویا ہے کہتے ہیں مردِ خدا بابا
وہ پیک اجل کا آتا ہے اور تجھے ساتھ لے جاتا ہے
سب جیتے جی کا ناتا ہے پھر کون یہاں تیرا بابا
جتنا یہ مال خزانہ ہے اور تو نے اپنا مانا ہے
سب چھوڑ کے یاں سے جانا ہے کرتا ہے اکھٹا کیا بابا

کیوں دل دولت میں لگایا ہے سچ کہتا ہوں جُھوٹی مایا ہے
یہ چلتی پھرتی چھایا ہے کیا اعتبار اس کا بابا

دنیا کو نہ کہہ تو میری ہے غافل دنیا کب تیری ہے
سائیں کی جیسے پھیری ہے پھرتا ہے تو اس جا بابا
یہ ملک و مال یہ جاہ و چشم یہ خویش و اقارب جو ہیں بہم
سب جیتے جی کے ہیں ہمدم پھر چلنا ہے تنہا بابا

جو نیک کمائی کرتے ہیں جو سانسوں پار اترتے ہیں
جو جیتے جی ہی مرتے ہیں جینا ہے بس اُن کا بابا
کیوں مہر یہ عالم نسیاں کا دنیا ہے سودا نقصاں کا
ہے ذوق تجھے تو عرفاں کا تجھ کو دنیا سے کیا بابا

دلِ صافی

دلِ صافی پہ ہو اے مہر خدا کی رحمت
میں نے محسوس کیا ہے بہت آرام یہاں
گوشۂ عافیت اس کو کہیں تو زیبا ہے
کیسی تسکین کا ہے کیسے سکوں کا یہ مکاں
جس طرح شہر سے کچھ دور کوئی معبد ہو
شارع عام سے ہٹ کر کہ نہ ہو بھیڑ وہاں
کوئی جائے بھی جو اس جا تو ارادہ کر کے
یہ نہ ہو ہر کس و ناکس ہو وہاں گشت کناں
جائے تنہا ہو مکاں گوشۂ عزلت سا ہو
جس طرف دیکھو نظر آئے خموشی کا سماں
سایہ افگن ہوں کہن سال درخت اس جا پر
ایسی ٹھنڈک ہو کہ بس آئے وہاں جان میں جان
صحن میں آبِ مصفّا کا پڑا حوض بھی ہو
اور وہ ایسا مسکن کہ نہ ہو جس کا بیاں
گرد میں ہوں روشیں بیش بہا پتھر کی
صاف ایسی کہ نہ تنکا بھی نظر آئے وہاں

سامنے آنکھ کے معبد کا ہو برج سنگیں
جس کی تعمیر کو برسوں ہوئے ہوں یا صدیاں
غرض ایسا ہو مکاں اور تو واں بیٹھا ہو
اور خموشی و سکوں چار طرف سے ہو عیاں
تو وہاں بیٹھا ہو آرام سے اور تیرے سوا
آدمی زاد کا ڈھونڈھے نہ نظر آئے نشاں
دیکھ کر آنکھ میں ہو نور طبیعت میں سرور
تو یہ سمجھے کہ زمیں پر ہے یہی باغ جناں
ہے یہی حال جو دیکھو تو دل صاف کا
وہی تسکین و سکوں اور وہی راحت ہے یہاں
وہی ٹھنڈک ہے وہی نور و سرور و موفور
ہے یہاں بھی وہی تسکین و خموشی کا سماں
میں یہاں بیٹھ کے اے مہر مزے لیتا ہوں
اور سمجھتا ہوں زمیں پر ہے یہی باغِ جناں

آئینہ دیکھنا

آئینہ دیکھنے کا شوق ہے وہ
اس کا ہر شخص مبتلا دیکھا
سامنے آئینے کے بن ٹھن کر
ہم نے احباب کو کھڑا دیکھا
کوئی موچھوں پہ تاؤ دیتا ہے
کوئی ڈاڑھی سنوارتا دیکھا
کوئی کپڑوں کو صاف کرتا ہے
کوئی منہ دیکھتا ہوا دیکھا
شانہ ہے یا برش ہے یا رومال
ہاتھ خالی نہ ایک کا دیکھا
شوق ہے عام جامہ زیبی کا
جس کو دیکھا ہے خود نما دیکھا
دیکھا سب نے ہی اپنا جسم و لباس
لیک یہ طرفہ ماجرا دیکھا
دیکھنے سے کبھی نہیں سیری
روز گو چہرہ بارہا دیکھا
اپنی صورت کے سب ہیں شیدائی
سب کو اپنا فریفتہ دیکھا
صورت ظاہری مگر اے دوست
جس نے دیکھی ہے اس نے کیا دیکھا
دیکھنے والا اس کو کہتے ہیں
جس نے باطن بھی بر ملا دیکھا
دل کا آئینہ پاس ہے سب کے
صاف ایسا کم آئینہ دیکھا

مجھ سے پوچھو تو وہ ہے نیک نصیب   جس نے یہ آئینہ ذرا دیکھا
صورت حال سے خبر پائی   اور اپنا بُرا بھلا دیکھا
نطق و اطوار ' دین اور ایمان   سب کو جیسے ہیں بر ملا دیکھا
نقص اپنا جسے نظر آیا   عیب جس نے نہیں چھپا دیکھا
اور پھر لے کے سعی کا رومال   نقص جو جو کہ جابجا دیکھا
اسکی اس طرح سے صفائی کی   کہ نہ آنکھوں نے پھر ذرا دیکھا

یہ ہے آئینہ دیکھنا اے دوست
دیکھا اس طرح تو بجا دیکھا

خواب دنیا

(ورڈز ورتھ کی نظم "All the world's afleeting show" کا ترجمہ)

ہے جہان گزراں خواب کا بالکل نقشہ   دیدۂ حضرتِ انسان کیلئے دھوکا سا
شادمانی کا تبسم ہے کہ آنسو غم کا   یہ بھی جھوٹا ہے جو میری سنو وہ بھی جھوٹا
یاں ہے جو چیز وہ سچی نہیں جز نام خدا

نام وشہرت کے یہ چمکارے بھی بالکل جھوٹے   مثل نیرنگ شفق ہم نے بدلتے دیکھے
عشق و امید ہے کیا حسن سمجھتے ہو کسے   یہ وہ ہیں پھول چنے جائیں جو قبرونکے لئے
یاں ہے جو نور وہ قائم نہیں جز ذات خدا

بحر طوفانئی دنیا میں ہیں ہم سرگشتہ   موجِ غم میں ہے جہاز اپنا تھپیڑے کھاتا
روشنی عقل کی ہے وہم کا یا چمکارا   آن سے طوفاں کے سوا ہم نے نہ کچھ بھی دیکھا
یاں ہے جو شے وہ مسکّن نہیں جز نام خدا

رباعیات

ہر شے میں جمال دلربا کو دیکھا   ہر چیز میں شان کبریا کو دیکھا
مخلوق میں خالق نظر آیا جسکو   اُس دیکھنے والے نے خدا کو دیکھا

بے خود نہیں ہاں خودی سے بیزار ہوں میں   جام وحدت سے مہر سرشار ہوں میں
دیوانہ مجھے کہیں تو پروا کیا ہے   دیوانہ نکار خویش ہشیار ہوں میں

خود عبد ہے خود عبادت و خود معبود   خود شاہد و خود شہود و خود ہی مشہود
اے مہر خودی میں ہے خدائی مضمر   لیکن وہ خودی جس میں تعیّن نہ قیود

اے عشق ستم پیشہ ترا راز متیں   کچھ ایسا ہے سربستہ کہ کُھلتا ہی نہیں
حیراں ہوں منڈھے چڑھے گی کیونکر یہ بیل   میں طالب دیدار ہوں وہ پردہ نشیں

بھوے جو عزیزوں کو وہ مستانہ ہے   بھوے جو یگانوں کو وہ بیگانہ ہے
حیرت ہے کہ بھولا ہوں میں خود اپنے تئیں   مجھ سا بھی جہاں میں کوئی دیوانہ ہے

تحصیل کیا علم تو کیا ملتا ہے   کی بحث تو خاک اسکا صلہ ملتا ہے
اخلاص طبیعت میں ذرا پیدا کر   اخلاص سے اے مہر خدا ملتا ہے

قطعہ

کُھلا ہے ابر ابھی اور ہوائے عطر آگیں   چلی ہے باغ سے کیسی قدم بڑھائے ہوئے
برہمنی کوئی جیسیے کنارِ گنگا سے   علی الصباح چلے شہر کو نہائے ہوئے
گلے میں ہار ہوں پھولوں کے اور جبیں و گلو   دکن کی صندلی خوشبو میں ہو بسائے ہوئے
دماغ آن سے معطر ہو راہ گیروں کا   جو اتفاق سے ہو رہگذر میں آئے ہوئے
وے خیال خود اسکو ہو یہ کسی سے میں
چھُوئی نہ جاؤں چلے آپ کو بچائے ہوئے

چکبست لکھنوی

پنڈت برج نرائن چکبست دور متوسطین کے اُن معروف شعرا میں سے ہیں جو وطن اور قومی شاعری کے سبب خاص اہمیت اور شہرت کے مالک تھے - چکبست اگرچہ کشمیری پنڈت تھے لیکن اُنکے اجداد عرصہ سے لکھنؤ میں آکر آباد ہو گئے تھے - چکبست کی ولادت ۱۸۸۱ء میں فیض آباد میں ہوئی - لیکن اوائل عمر ہی میں لکھنؤ آ گئے اور وہیں اُن کی نشو و نما ہوئی - ابتدائی تعلیم سے فراغت کے بعد چکبست نے ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی - اے کی ڈگری حاصل کی - پھر ۱۹۰۸ء میں وکالت کا امتحان پاس کر کے وکالت شروع کر دی اور اس پیشہ میں ایسی کامیابی حاصل کی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اُن کا شمار لکھنؤ کے ممتاز وکلاء میں ہونے لگا - چکبست جیسے ہونہار انسان سے بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ ہو چلی تھیں مگر افسوس کہ وہ عین شباب میں ہی اس دنیا سے چل دئے اور بڑی حسرتناک موت پائی - ہوا یہ کہ ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو کسی مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں قریب کے ایک ضلع رائے بریلی گئے اور مقدمہ ختم کر کے جب واپس ہوئے تو گاڑی میں بیٹھے بیٹھے فالج گرا اور زبان بند ہو گئی - حتی الوسع دوڑ دھوپ ہوئی مگر دورہ اس درجہ شدید تھا کہ کوئی علاج کارگر نہ ہوا آخر سات بجے رات کو اُن کے بڑے بھائی رائے بہادر پنڈت مہاراج نرائن چکبست لاش کو لکھنؤ لائے - کاظم حسین محشر لکھنوی نے مرحوم ہی کے ایک مصرعے سے تاریخ وفات کہی -

اُن ہی کے مصرعے سے تاریخ ہے ہمراہ عزا
موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

۱۳۴۴ھ

چکبست کو بچپن ہی سے شعر و شاعری کا ذوق تھا - کہا جاتا ہے کہ اُنہوں نے نو (۹) سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دئے تھے - ابتدا ہی سے اساتذہ اُردو کا کلام اُنکی روحانی غذا بنا رہا - چنانچہ غالب ' انیس اور آتش کے سر چشموں سے وہ خاصے سیراب ہوئے - مگر اس فن شریف میں وہ نہ تو کسی کے شاگرد ہوئے اور نہ کوئی تخلص ہی

اختیار کیا ۔ البتہ کہیں کہیں صرف لفظ ''چکبست'' پر جو آن کا خاندانی نام تھا ' اکتفا کی ہے خود کہا ہے ۔

ذکر کیوں آئے گا بزم شعرا میں اپنا
میں تخلص کا بھی دنیا میں گنہگار نہیں

چکبست نے حسب معمول شاعری کی ابتدا غزل ھی سے کی اور کچھ عرصہ تک اس کی مشق کرتے رہے مگر بدلے ہوئے حالات زمانہ اور خود اپنے سلجھے ہوئے ذوق شاعری کی بدولت اس میں بھی ایک خاص جدت اور ترقی ضرور کی ۔ آنہوں نے غزل کے قدیم مضامین کو صداقت و اصلیت کا رنگ دیکر لکھنؤ کی ٹکسالی زبان میں کچھ اس سادگی و سلاست کے ساتھ سمویا ہے کہ وہ اس پامال صنف سخن میں بھی بڑے مقبول ہوئے ۔ ویسے غزلگوئی میں آنہوں نے ابتدائی تاثرات آتش و غالب کے قبول کئے ہیں اور آن کی اکثر غزلوں میں ان اساتذہ کا رنگ جھلکتا ہے ۔ لیکن غزلگوئی کی محدود فضا سے نکل کر نیچرل شاعری کی وسیع دنیا میں قدم رکھا اور اس میدان میں آنیس کے رنگ سخن کی رہبری میں آنہوں نے بڑی شاندار سیاسی ' قومی اور ملکی منظومات کی تکمیل کی ۔

چکبست کی جدید شاعری اکثر و بیشتر مسدسوں پر مشتمل ہے اور آنہوں نے یہ صنف آنیس ھی کے زیر اثر استعمال کی ہے ۔ آن کے اس مجموعۂ کلام کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) حب قومی (۲) حب وطنی (۳) سیاسی (۴) احباب اور لیڈروں کے مراثی لیکن ان میں وطن و قوم کے محرکات سب سے زیادہ قوی ہیں ۔ آن کی شاعری کا خاص مقصد وطن کو بیدار کرنا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ قومی احساس حالی ھی کے زمانے میں پیدا ہو چکا تھا لیکن آهستہ آهستہ یہ احساس زیادہ قومی ہونا شروع ہوا اور اکبر ' اقبال اور چکبست کے زمانے تک اس میں اور بھی نکھار پیدا ہو گیا ۔ چنانچہ چکبست آن شعرا میں سے ہیں جو از ابتدا تا انتہا وطن و قوم کی محبت میں ڈوبے رہے اور سیاسی و معاشرتی آزادی ہمیشہ آن کا نصب‌العین رہی ۔

چکبست کی ملکی و قومی نظموں میں کوئی بلند فلسفیانہ تخیل نہیں ہے بلکہ وہ سادگی سے جذبات کا اظہار کرتے چلے جاتے ہیں ۔ جہاں کہیں پند و نصیحت کا موقع آتا ہے وهاں آن کے ناصحانہ انداز میں بجائے بے لطفی کے ایک عجیب وارفتگی و سرمستی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ وہ اپنی رائے کا اظہار بڑی آزادی سے کرتے ہیں ۔ آن کی شاعری کا دوسرا دلکش پہلو آن مناظر میں نظر آتا ہے جہاں وہ ہندوستان کے واقعات و مناظر کو بڑے لطیف انداز میں پیش کرتے ہیں ۔ چکبست کی یہ نظمیں منظر نگاری کی اکثر خوبیوں کی حامل ہیں ۔ خاص طور پر ''سیر ڈیرہ دون'' تو بہت ھی نفیس نظم ہے ۔

چکبست نے اپنے احباب اور جاننے والوں کے مرثیے بھی کہے ہیں اس سلسلے میں لیڈران قوم کی وفات پر شاعر نے جو پر زور نظمیں کہی ہیں وہ یقیناً انتہائی صداقت و خلوص کا آئینہ ہیں ۔ ان نظموں میں مرحوم علمبرداران آزادی کی سچی سیرت اور انفرادی خصوصیات کو جس خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے وہ لائق صد ستائش ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ چکبست کی ایسی نظموں میں اپیل کا مادہ بدرجۂ آتم پایا جاتا ہے ۔

چکبست کا اسلوب بیان نہایت ہی سادہ مگر شستہ ہے ۔ اس سلسے میں آنکے مثنوی گلزار نسیم کے دیباچے کے یہ الفاظ خاص طور پر دیکھنے سے تعلق رکھتے ھیں ''یاد رہے کہ محض عبارت سادہ نظم کرنا شاعری نہیں ہے ۔ شاعری کی عام تعریف یہ ہے کہ نثر سے زیادہ دلکش ہو اور پر تاثیر ہو ...... برخلاف نثر کے شاعری میں یہ اصول مد نظر رهتا ہے کہ جو مضمون باندھا جائے وہ محض ایک حالت کا اشارہ کرے لیکن ترکیب الفاظ ایسی ہو کہ اس حالت کی نسبت مختلف نقشے پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے گذر جائیں'' ۔ ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ وہ شاعری کو ایک سادہ صنعت گری کا نمونہ خیال کرتے تھے اور بندش الفاظ کے معاملے میں آتش کی مرقع سازی کے ضامن تھے ۔ آن کی زبان صاف و شیریں ہونے کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کی خالص ٹکسالی زبان ہے ۔ اس میں کہیں کہیں آنہوں نے ھندی کے مناسب الفاظ کا استعمال کر کے کلام کی شیرینی و اثر میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے ۔ اس کے علاوہ چستئی بندش و حسن تراکیب بھی آنکی زبان کی اھم خصوصیات ھیں ۔

غرض چکبست ھر لحاظ سے قدر اول کے شعرا میں شار ہونے کے لائق ھیں ۔ اور آن کا مجموعہ کلام ''صبح وطن'' باوجودیکہ بہت مختصر ہے لیکن اپنی نوعیت و تاثیر کے لحاظ سے اس کا پلہ بہت سے ضخیم دواوین پر بھاری ہے ۔

انتخاب کلام

تغزل

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

دفتر حسن پہ مہرید قدرت سمجھو
پھول کا خاک کے تودے سے نمایاں ہونا

گل کو پامال نہ کر لعل و گہر کے مالک
ہے اسے طرۂ دستار غریباں ہونا

فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا
اجل کیا ہے خمارِ بادہ ہستی آتر جانا

عروسِ جاں نیا پیراہنِ ہستی بدلتی ہے
فقط تمہید آنے کی ہے دنیا سے گزر جانا

سدھاری منزل ہستی سے کس بے اعتنائی سے
تن خاکی کو شاید روح نے گردِ سفر جانا

وہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انسان سہتا ہے
نہیں تو ہے بہت آسان اس جینے سے مر جانا

کہاں بزدلی ہے پست ہونا اپنی آنکھوں میں
اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا

اُبھرنے ھی نہیں دیتی یہاں بے مائگی دل کی
نہیں تو کون قطرہ ھے جو دریا ھو نہیں سکتا

اپنا ھی دم ھوا ھے گلو گیر وقت نزع
غیروں کا زندگی میں ھو پھر اعتبار کیا
جس کی قفس میں آنکھ کھلی ھو مری طرح
اُسکے لئے چمن کی خزاں کیا بہار کیا

اگر درد محبت سے نہ انساں آشنا ھوتا
نہ مرنے کا الم ھوتا نہ جینے کا مزا ھوتا

لئے دریا نے موتی ' گل شجر نے ' لعل پتھر نے
خریدا ھم نے سودا درد اُلفت کا بشر ھو کر

ھم سوچتے ھیں رات میں تاروں کو دیکھکر
شمعیں زمین کی ھیں جو داغ آسماں کے ھیں
جنّت میں خاک بادہ پرستوں کا دل لگے
نقشے نظر میں صحبتِ پیر مغاں کے ھیں
اپنا مقام شاخِ بریدہ ھے باغ میں
گل ھیں مگر ستائے ھوئے باغباں کے ھیں
اک سلسلہ ھوس کا ھے انساں کی زندگی
اس ایک مشت خاک کوغم دو جہاں کے ھیں

یہ رنگ شفق ھے کہ لہو اھل وفا کا
کچھ داغ نظر آتے ھیں دامنِ سحر میں

کیوں رلانے کو سناتے ھو وفا کے قصے
دوستو اب تو محبت کا یہ دستور نہیں
تپش شوق کو موسیٰ کی نظر ھے درکار
ورنہ دنیا میں تجلی نہیں یا طور نہیں
ختم ھوتا نہیں کیوں ھستئی ناشاد کا راگ
پا بہ گلِ جسم سہی روح تو مجبور نہیں

ایک ساغر بھی عنایت نہ ھوا یاد رھے
ساقیا جاتے ھیں محفل تری آباد رھے

نیا بسمل ھوں میں واقف نہیں رسم شہادت سے
بتادے توھی اے ظالم تڑپنے کی ادا کیا ھے

ھمارے اور واعظوں کے مذھب میں فرق اگر ھے تو اسقدر ھے
کہینگے ھم جسکو پاسِ انساں وہ اُسکو خوفِ خدا کہینگے

سیر ڈیرہ دون

یہیں بہار کا پہلے پہل ہوا تھا شگون
عجیب خطۂ دلکش ہے شہرِ ڈیرہ دون

ازل میں تھی جو فضا اُسکی یادگار ہے یہ
نشیبِ کوہ میں گہوارۂ بہار ہے یہ

سپرد ابر کے ہے انتظام پانی کا
ہوائے سرد کو ہے حکم باغ بانی کا

تمام شہر ہے گرد و غبار سے خالی
جدھر نگاہ اُٹھے اُس طرف ہے ہریالی

طلسم حسن کا ہے بیچ میں یہ گلدستہ
کھڑے ہیں کوہ و شجر پہلوؤں میں صف بستہ

یہاں جو آ کے مسافر قیام کرتے ہیں
یہ سنتری انھیں پہلے سلام کرتے ہیں

جو دور جائیے بستی سے اور ہی ہے سماں
یہ سوچتا ہے پہاڑوں کو دیکھ کر انسان

بشر پہ رعب یہ قدرت کا چھا گیا کیسا
یہ بل زمین کی تیوری پر آ گیا کیسا

بلندیوں سے جو ہو مائلِ نشیب نظر
فریب دیتا ہے ندی کا پیچ و خم اکثر

نگہ کو دور سے پانی ہے یوں نظر آتا
سپید ناگ چلا جا رہا ہے بل کھاتا

اثر دکھاتا ہے قدرت کا نغمۂ دلگیر
شجر حجر سے ٹپکتی ہے راگ کی تاثیر

یہ راگ وہ ہے جو مضراب کا اسیر نہیں
یہ صرف کان کے پردوں میں گوشہ گیر نہیں

وہی سنے گا اسے دل گداز ہے جس کا
ہو دل میں سوز تو رگ رگ میں ساز ہے اس کا

خاک ہند

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض قدرت تیرے لئے رواں ہے
تیری جبیں سے نور حسن ازل عیاں ہے
اللہ رے زیب و زینت کیا اوج عزّ و شاں ہے

ہر صُبح ہے یہ خدمت خورشید پُر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

اس خاکِ دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری
چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری
چشم و چراغ عالم تھی سر زمیں ہماری

شمع ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیٔ کہن میں

گو تم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو
سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جام اُلفت بخشا اس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو
سب سور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا اُنکی ہڈیاں ہیں
دیوار و در سے اب تک اُن کا اثر عیاں ہے
اپنی رگوں میں اب تک اُن کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے
فردوس گوش اب تک کیفیت اذاں ہے
کشمیر سے عیاں ہے جنت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک
اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں
کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں
پستی سی آ گئی ہے پر دل کے حوصلوں میں
گُل شمع انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حُبِ وطن نہیں ہے خاک وطن وہی ہے
برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا
دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خواب گراں ہمارا
اک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا
علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں
اے صورِ حب قومی اس خواب سے جگا دے
بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے
اُٹھتے ہوئے شرارے اس خاک سے دکھا دے
حب وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

شیدائے بوستاں کو سر و سمن مبارک
رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک
ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک
غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا
آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشکِ مہر ذرّہ اس منزلِ کہن کا
تلتا ہے برگِ گُل سے کانٹا بھی اس چمن کا
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

رامائن کا ایک سین

(رامچندر جی ماں سے رخصت ہوتے ہیں)

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نو نہال
خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدّتِ ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے
کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ
نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ
لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ

چہرہ کا، رنگ حالت دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا
رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں
میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں
لیکن میں اپنے منھ سے نہ ہر گز کہوں گی ہاں
کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیجدوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں
لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم
ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم
تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم
میں خوش ہوں پھونکدے کوئی اس تخت و تاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگاؤں گی راج کو
سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ
منجدھار میں جو یوں مری کشتی ہوئی تباہ
آتی نظر نہیں کوئی امن و اماں کی راہ
اب یاں سے کوچ ہو تو عدم میں ملے پناہ
تقصیر مری خالقِ عالم بحل کرے
آساں مجھ غریب کی مشکل اجل کرے

گوپال کرشن گوکھلے

لرز رہا تھا وطن جس خیال کے ڈر سے — وہ آج خون رلاتا ہے دیدۂ تر سے
صدا یہ آتی ہے پھل، پھول اور پتھر سے — زمیں پہ تاج گرا قوم ہند کے سر سے
حبیب قوم کا دنیا سے یوں روانہ ہوا
زمیں اُلٹ گئی، کیا منقلب زمانہ ہوا
بڑھی ہوئی تھی نحوست زوال پیہم کی — ترے ظہور سے تقدیر قوم کی چمکی
نگاہ یاس تھی ہندوستاں پہ عالم کی — عجیب شے تھی مگر روشنی ترے دم کی
تجھی کو ملک میں روشن خیال سمجھے تھے
تجھے غریب کے گھر کا چراغ سمجھے تھے

وطن کو تو نے سنوارا کس آب‌وتاب کے ساتھ　　سحر کا نورُ بڑھے جیسے آفتاب کے ساتھ
چنےُ رفاہ کے گل حسن انتخاب کے ساتھ　　شباب قوم کا چمکا ترے شباب کے ساتھ

جو آج نشو و نما کا نیا زمانہ ھے
یہ انقلاب تری عمر کا فسانہ ھے

رھا مزاج میں سودائے قوم خُو ھو کر　　وطن کا عشق رھا دل کی آرزو ھو کر
بدن میں جان رھی وقف آبرو ھو کر　　رگوں میں جوش محبت رھا لہو ھو کر

خدا کے حکم سے جب آب و گلِ بنا تیرا
کسی شہید کی مٹی سے دل بنا تیرا

وطن کی جان پہ کیا کیا تباھیاں آئیں　　امنڈ امنڈ کے جہالت کی بدلیاں آئیں
چراغِ امن بجھانے کو آندھیاں آئیں　　دلوں میں آگ لگانے کو بجلیاں آئیں

اس انتشار میں جس نور کا سہارا تھا
اُفق پہ قوم کے وہ ایک ھی ستارہ تھا

حدیث قوم بنی تھی تری زباں کے لئے　　زباں ملی تھی محبت کی داستاں کے لئے
خدا نے تجھ کو پیمبر کیا یہاں کے لئے　　کہ تیرے ھاتھوں میں ناقوس تھا اذاں کے لئے

وطن کی خاک تری بارگاہ اعلیٰ تھی
ھمیں یہی نئی مسجد نیا شوالہ تھی

غریب ھند نے تنہا نہیں یہ داغ سہا　　وطن سے دور بھی طوفان رنج و غم اٹھا
حبیب کیا ھیں حریفوں نے یہ زباں سے کہا　　سفیر قوم جگر بندِ سلطنت نہ رھا

پیام شہ نے دیا تیری تعزیّت کے لئے
کہ تو ستوں تھا ایوانِ سلطنت کے لئے

دلوں میں نقش ھیں اب تک مری زباں کے سخن　　ھماری راہ میں گویا چراغ ھیں روشن
فقیر تھے جو ترے در کے خادمانِ وطن　　انہیں نصیب بھلا اب کہاں ترا دامن

ترے الم میں وہ اس طرح جان کھوتے ھیں
کہ جیسے باپ سے چھٹ کر یتیم روتے ھیں

اجل کے دام میں آنا ہے یوں تو عالم کو مگر یہ دل نہیں تیار تیرے ماتم کو
پہاڑ کہتے ہیں دنیا میں ایسے ہی غم کو مٹا کے تجھ کو اجل نے مٹا دیا ہم کو
جنازہ ہند کا در سے ترے نکلتا ہے
سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

رہے گا رنج زمانے میں یادگار ترا وہ کون دل ہے کہ جس میں نہیں مزار ترا
جو کل رقیب تھا ہے آج سوگوار ترا خدا کے سامنے ہے ملک شرمسار ترا
پلی ہے قوم ترے سایہ کرم کے تلے
ہمیں نصیب تھی جنت ترے قدم کے تلے

نادر کاکوروی

منشی نادر علی خاں نام نادر تخلص ۱۸۸۷ء میں کاکوری ضلع لکھنؤ کی مردم خیز سر زمین میں پیدا ہوئے ۔ افسوس کہ آن کے حالات زندگی معلوم نہ ہو سکے ۔ لیکن وثوق کے ساتھ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ علوم متداولہ سے آگاہ تھے اردو و فارسی پر عبور رکھتے تھے اور انگریزی زبان و ادب کا بھی اچھا مطالعہ تھا ۔ لارڈ بائرن اور سر ٹامس مور کی نظموں کے آنھوں نے جو قابل رشک منظوم ترجمے کئے ہیں آن کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آنہیں نہ صرف انگریزی لٹریچر بالخصوص نظم سے دلچسپی تھی بلکہ وہ اس زبان کے رموز و نکات سے بھی بخوبی واقف تھے ۔ آردو سے آنہیں عشق تھا اور وہ چاہتے تھے کہ حالی و آزاد کا لگایا ہوا پودا ''نظم جدید'' جلد پھلے پھولے اور پروان چڑھے ۔ اس سلسلے میں آنہوں نے نیچرل شاعری کے جو طبع زاد نمونے چھوڑے ہیں وہ نہایت ہی گراں مایہ ہیں ۔ اس کے علاوہ مغربی شعرا کے رنگ کو آنہوں نے جس سلاست روی و عمدگی سے آردو میں سمونے کی کوشش کی وہ آن کا ایک زندہ جاوید کارنامہ ہے ۔

نادر ذاتی طور پر بڑے ملنسار' با وضع اور نیک نہاد انسان تھے ۔ البتہ مکروہات دنیوی اور متواتر حادثات کے صدمے آٹھانے سے بیچارے بڑے رنجور و مغموم رہا کرتے تھے ۔ بالخصوص اپنی رفیقۂ حیات کے انتقال کے بعد سے تو آن پر ایک عجیب کیفیت طاری رہتی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ آن کے آخری زمانہ کا کلام زیادہ پر سوز اور درد انگیز ہو گیا تھا ۔ چنانچہ موصوف کو اپنا ایک شعر نہایت پسند تھا جو دراصل شاعر کے واردات قلبی کی سچی تصویر ہے ۔

نوا سنجی کو کیا کچھ بلبلیں اس باغ میں کم تھیں
مجھے تکلیف ناحق دی چمن پیرائے عالم نے

حضرت نادر مرنے سے کچھ عرصہ پہلے مرض خناق میں مبتلا ہوئے ۔ پہلے لکھنؤ کے مشہور و معروف اطبا و ڈاکٹروں سے مشورہ کیا ۔ لیکن جب کوئی علاج پوری طرح سود مند نہ ہوا تو ملیح آباد کے ایک ڈاکٹر حافظ عبدالکریم صاحب کے زیر علاج ہوئے اور کاکوروی سے وہیں چلے گئے ۔ لیکن دوران علالت میں بھی جبکہ آن کی گردن پر نشتر سے شگاف دئے جا چکے تھے وہ فکر سخن سے اپنے دلی ذوق و شوق کا اظہار کرتے رہے چنانچہ اپنے ایک ہم وطن مولانا سفیر کاکوروی کو اپنے حال کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

ہوتے ہیں بیمار سب پر تم نے سادھی ایسی چپ
حال بھی کہتے نہیں نادر تم اپنا صاف صاف
ہائے میں کمبخت حال اپنا کہوں تو کیا کہوں
ایک زخم اندر گلے کے اور اک باھر شگاف

انہیں دنوں کا ایک اور قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ نادر صاحب کے چھوٹے بھائی مولوی شاکر علی صاحب نے جو ان ایام میں آن کے تیاردار تھے ، نزع کی شب حسب ذیل مصرعہ اولیٰ پڑھا تو موصوف نے فی‌البدیہہ مصرعہ ثانی لگا کر یہ بامزہ شعر سنا دیا ۔

قفس میں مرغ بسمل کے تڑپنے کا مزا کیا ہے
"نکل جان حزیں اس جسم خاکی میں دھرا کیا ہے"

مگر کون جانتا تھا کہ یہ مرحوم کی شاعری کا آخری نمونہ ہے ۔ غرض علالت کی یہ رات گزری اور دوسرے دن یعنی ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو صبح کے نو بجے آردو کا یہ ذہین و خوش فکر شاعر ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا ۔

نادر مرحوم سرور ، نظر ، محروم وغیرہم کے ہم عصر شعرا میں سے تھے اور آس زمانے کے معروف رسائل مخزن ، زمانہ اور ادیب کے محبوب قلمی معاونین میں آن کا شمار ہوتا تھا ۔ چنانچہ آن کی بیشتر نیچرل نظمیں انہیں پرچوں میں چھپی ہیں ۔ اول اول انگریزی نظموں کے تراجم کی بدولت مشہور ہوئے لیکن آس کے بعد آنہوں نے مختلف موضوعات پر جو طبع زاد نظمیں پیش کیں آن میں اس بلا کی سادگی و پرکاری تھی کہ طرز جدید کے پرستاروں میں نادر کے نام کی دھوم مچ گئی ۔ اور آن کی "رات کے بے چین گھنٹے" "شاعری" "اے ھمسفیر میرے سینے میں دل نہیں ہے" "اکثر شب تنہائی میں" "بوڑھے دنیا پرست کی موت" "حسن و عشق" وغیرہ جیسی پیاری ، سبک اور شگفتہ نظمیں بہت مقبول ہوئیں ۔

نادر کے جذبات و محسوسات بڑے لطیف اور خیالات ارفع و اعلیٰ تھے نیز آن کے کلام میں حقیقت گوئی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ۔ آنہیں عامیانہ تغزل اور پرانے دقیانوسی رنگ کے طرز تحریر سے حد درجہ نفرت تھی ۔ آن کا مذاق اپنا تھا جو بہت کھرا اور رچا ہوا مذاق تھا ۔ اس صحیح مذاق کی بدولت آنہوں نے ایک جداگانہ راستہ اختیار کیا اور آس میں کامیاب بھی ہوئے ۔ لیکن افسوس کہ آن کا انتقال عین جوانی یعنی پنتالیس سال کی عمر میں ہو گیا اور اس بے وقت سانحہ سے ادبی دنیا نے ان کی ذات سے جو آمیدیں وابستہ کی تھیں آن پر پانی پھر گیا ۔

نادر کے کلام میں سادہ گوئی کے ساتھ ساتھ فکر بلند پرواز کے نمونے بھی نظر آتے ہیں اس رنگ میں "شمع و پروانہ" "شعاع آمید" "پیکر زبان" "فلسفہ شاعری"

''سیر دریا'' وغیرہ آن کی چوٹی کی نظمیں ھیں ۔ آن کے کلام کی ایک اور اھم خصوصیت درد و اثر ھے اور یہ خصوصیت براہ راست آن کی پر سوز طبیعت کا نتیجہ معلوم ھوتی ھے ۔ اس کے ساتھ ھی ساتھ آن کی سادہ و شگفتہ زبان بھی قابل داد ھے جس نے آن کے فکری نقوش کو بڑے دلکش اور موہ لینے والے انداز میں پیش کرنے میں بڑی معاونت کی ۔ آن کی زبان بڑی ستھری اور منجھی ھوئی ھے اس میں تکلف نام کو نہیں ۔ کہیں کہیں وہ اپنی ذھانت و پختگی کی بدولت بڑی خوبصورت تشبیہیں اور اچھوتی تراکیب استعال کرتے ھیں ۔

آردو علم و ادب کی عمدہ اور موزوں خدمات انجام دینے کے سوا ملکی بہی خواھی میں بھی وہ خاموشی کے ساتھ حصہ لیتے رھے چنانچہ مولوی عزیز مرزا مرحوم نے آن کے مجموعہ کلام ''جذبات نادر'' کا مقدمہ لکھتے ھوئے آن کی وطن دوستی کے بارے میں لکھا ھے کہ ـــــــ

''مسٹر نادر علی خاں کے دل میں اپنے ملک کی محبت کا شعلہ بھی موجزن ھے اور آن کی حب الوطنی کے قطعات ھمارے اعلیٰ جذبات میں شور پیدا کر دیتے ھیں .... اس طرح کی نظموں میں ''مقدس سرزمیں'' ''بہارستان ربیع'' اور ''مادر ھند'' خصوصیت سے دیکھنے کے قابل ھیں''

غرض نادر ، اس دور کے شعراء میں ایک ممتاز و ناموَر شاعر تھے جنھیں کسی طرح بھی سرور سے کمتر درجہ کا شاعر نہیں کہا جا سکتا بلکہ بعض اعتبارات سے انھیں بلا شبہ سرور پر فوقیت حاصل ھے ۔ آن کا کلام 'جذبات نادر'' کے نام سے دو حصوں میں طبع ھو چکا ھے ۔ اس کے علاوہ سرٹامس مور کی مشھور کتاب ''لالہ رخ'' کے طرز پر آنھوں نے بھی ایک مثنوی لکھی ھے اور اس کا نام بھی ''لالہ رخ'' رکھا ھے ۔

انتخاب کلام

تغزل

اب نہ حسرت نہ یاس ھے دل میں — کوئی بھی اس مکان میں نہ رہا
کیا شکایت جو کٹ گئے گاھک — مال ھی جب دکان میں نہ رہا
مر کے رھنا پڑا اب آس میں آہ — جیتے جی جس مکان میں نہ رہا

نادر افسوس قدر دان سخن
ایک ھندوستان میں نہ رہا

پھیر لیتا ھے مکدّر ھو کے منہ جس سے کہیں
ھائے جو جی پر گزرتی ھے وہ ھم کس سے کہیں
مانعِ عرض تمنا کیوں نہ ھو رشک رقیب
اُن سے ھم کہنے نہ پائیں اُن کے مونس سے کہیں
نادر اُس محفل میں ھیں وہ نام کے صدر انجمن
آپ کو کہنا ھو جو کچھ اھل مجلس سے کہیں

شکایت کر کے غصہ اور اُن کا تیز کرنا ھے
ابھی تو گفتگوئے مصلحت آمیز کرنا ھے
یہ دنیا جائے آسایش نہیں ھے آزمایش ھے
یہاں جو سختیاں تجھ پر پڑیں انگیز کرنا ھے
غزل خوانی کو تو اس بزم میں آیا نہیں نادر
تجھے یاں وعظ کہنا ' پند سود آمیز کرنا ھے

اس خرابہ سے کوئی گزرا ھے نادر نام بھی
جا بہ جا دیوار پر اشعار ھیں لکھے ھوئے

نوا سنجی کو کیا کچھ بلبلیں اس باغ میں کم تھیں
مجھے تکلیف دی نا حق چمن پیرائے عالم نے

میں سمجھا تھا مرے حق میں دعائے خیر کرتے ھو
مجھے تم کوستے ھو ھمدمو اندھیر کرتے ھو

سہ مصرعی

خوشی سے خوشی کا نہ ھونا ھی اچھا یہاں جان رو رو کے کھونا ھی اچھا
رولانا ھی اچھا ھے رونا ھی اچھا

یہ قصر اور یہ گھر ھے سب چار دن کا یہ فرش معطّر ھے سب چار دن کا
تو خاک لحد کا بچھونا ھی اچھا

بھری تلخیوں سے ہے یاں جان شیریں سم آلودہ ہے پارۂ نان شیریں
غذا سے یہاں ہاتھ دھونا ہی اچھا
تماشے جہاں کے کبھی کم نہ ہوں گے زمانہ رہے گا مگر ہم نہ ہوں گے
نہ ہوں ہم ہمارا نہ ہونا ہی اچھا
کہے جا اسی طرح اشعار نادر نہ اشکوں کا ٹوٹے ترے تار نادر
یہ لڑیوں میں موتی پرونا ہی اچھا

سیر دریا

سیر دریا ' لطف کشتی اور گھٹا چھائی ہوئی
بڑھ چلی حد سے جوانی جوش پر آئی ہوئی
دست ہائے گل سے کشتی کو بنا کر مہد گل
لے چلا تفریح کو عہدِ شباب اور عہد گل
عاشق و معشوق دونوں سیر کرنے کو چلے
آشنایانِ محبت ڈوب مرنے کو چلے

کیا سرور افزا نشاط انگیز چھائی ہے گھٹا
بوندیاں پڑتی ہیں یا کیوڑا چھڑکتی ہے گھٹا
بوئے گل کے مختلف کپڑے بدلتی ہے نسیم
پنکھیاں پھولوں کی گویا منہ پہ جھلتی ہے نسیم
لیتی ہے نظارۂ ہر برگ میں لذت نگاہ
چاٹتی ہے سبزۂ شاداب پر امرت نگاہ
جسطرح دریا میں موجوں سے کوئی کشتی نشیں
کھیلتا ہو ڈال کر پانی میں دست نازنیں
کشتی چشمِ طراوت آشنا سے کود کر
تیرتی ہے سبزۂ موّاجِ ساحل پر نظر
دُور کوسوں دوُر جاتی ہے فضائے آب میں
ڈبکیاں کھاتی ہوئی امواج اور گرداب میں

تیرتی ہیں وہ بطیں گرتی ہیں وہ مرغابیاں
اور وہ کشتی میں بیٹھا جا رہا ہے اک جوان
خوب۔ اک مہ پارۂ نوخیز بھی پہلو میں ہے
آدمی کے ایک دریائی پری پہلو میں ہے
ہائے وہ مستانہ انداز اور وہ رغبت کی نگاہ
وہ گلابی آنکھ وہ نشہ میں متوالی نگاہ
بے خودی میں زانوئے عاشق دبائے پیار سے
اور وہ سینے پہ اسکے سر جھکائے پیار سے
عالم خلوت ہے اور معشوق در آغوش ہے
لطف سیر و لطف وصل و لطف ناؤ نوش ہے

اے ہوس آلودہ! اے لذت کش آغوش یار
چین ہی چین اب تو لکھتا ہے ترا نامہ نگار
چین ہے! کیا در حقیقت چین اس کا نام ہے؟
کیا شبابِ چند روزہ کا یہی اک کام ہے؟
عیش کہتا ہے اسے، سمجھا نہ تو مفہوم عیش
تیرتی ہے بحر غم پر کشتیٔ موہوم عیش
تیری کشتی گرچہ او کشتی نشیں جاتی ہے تیز
کشتیٔ عمر رواں اس سے کہیں جاتی ہے تیز
بس ہوا و حرص کی موجوں کو اپنے ساتھ روک
ٹھہر، کشتی پھیر، ہتے چھوڑ، اپنے ہاتھ روک
زورِ طوفاں سے کہیں گرداب میں تو آ نہ جائے
دیکھ ساحل سے کہیں کشتی تری ٹکرا نہ جائے
ہے حباب بحر کے مانند انجام حیات
ایک غوطہ کھاتے ہی لبریز ہے جام حیات

اے حبابِ بحر ، اے پروردۂ آغوشِ موج
تیری ہستی اک جنازہ ہے رواں بر دوشِ موج
لذّتِ گہوارہ ہے جسکی تجھے ہر لہر میں
ایک تختہ بھی نہ اُبھرا ڈوب کر اس بحر میں
دیکھ ہوتی جا رہی ہے اب گھٹا تاریک تر
اور جھونکے آمدِ طوفاں کی دیتے ہیں خبر
روک ہتے ، پھیر رخ کشتی کا ناداں ، لوٹ آ
جان دینے کو نہ جا اے دشمنِ جاں لوٹ آ
سامنے تو دیکھ خطرے میں ہے تیرا ہم نشیں
آہ ! تو اس نازنیں کو بھی نہ لے ڈوبے کہیں
تو نہیں سنتا کسی کی خیر ، جاتا ہے تو جا
اپنی بربادی کی کرنے سیر جاتا ہے تو جا
جا پر اس آغاز اُلفت کا بخیر انجام ہو
تیرا بیڑا پار ہو ، ساحل پہ تجھ کو شام ہو

حسن و عشق

تیرگی صبح ازل پر شب کی تھی چھائی ہوئی
دفعۃً اس تیرگی میں محفل آرائی ہوئی
رنگ آمیزی ہوئی اور جلوہ پیرائی ہوئی
اور پھر درکار اک چشم تماشائی ہوئی
آفرینش عشق کی خود حسن کی تعریف تھی
ورنہ یہ بزم تماشا محفل تاریک تھی
دفن تھا زیر زمیں گنجینۂ اسرار حسن
سربہ مہر اندھیارے تہ خانے میں تھا طومارِ حسن

گرم تھی اندر ہی اندر محفلِ انوارِ حسن
تھا دھواں رہ رہ کے دیتا کوہ آتشبار حسن
ناگہاں اک شمع اس محفل میں روشن ہو گئی
ہر شعاعِ جلوہ باہم جلوہ آفگن ہو گئی
ہر وجودِ جلوہ تھا صد مایۂ جلوہ بہ جیب
ہر تماشہ سو طرح سے دل رُبا اور دلفریب
ہر ادائے دلربائی غارتِ صبر و شکیب
ایک تو حسن اور پھر آسپر بلا کا جامہ زیب
ذرّے ذرّے سے شرر اُلفت کا پیدا ہو گیا
آئینے میں حسن اپنا آپ شیدا ہو گیا
جلکے سوزِ شمع پروانہ لگن سے لے اڑا
مر کے بسمل جانِ نو چاکِ کفن سے لے اڑا
ہر گُلِ تازہ کو اک بلبل چمن سے لے اڑا
ہر پری کو ایک دیو اس انجمن سے لے اڑا
ذرہ ذرہ سے تھی پیدا شانِ حسن و طورِ عشق
چلگیا اس میکدے میں اک سرے سے دورِ عشق
عشق کس کا ؟ عشق مر کر خاک ہو جانے کا عشق !
ڈوب کر یا آہ جلکر پاک ہو جانے کا عشق
آب و آتش پر خس و خاشاک ہو جانے کا عشق !
بحر میں اک دیدۂ نمناک ہو جانے کا عشق
عشق کیا ہے ؟ حسن کا اک خونچکاں افسانہ ہے
عشق کا جو ظرف ہے وہ حسن کا پیمانہ ہے

شعاع اُمید

زندگی کیا ہے بس اک دور تسلسل کا ہے نام
یہ اُمیدوں کی سحر اور آہ یہ حرماں کی شام

اک سمندر کا سفر ہے ہم کو اس دن رات میں
تیرتی جاتی ہے کشتی نور اور ظلمات میں

ہٹ گیا پھر ابر اور پھر سایہ افگن ہو گیا
پھر اندھیری چھا گئی پھر روز روشن ہو گیا

اے اُمید ! اے غم غلط کن !! اے مسرت آفریں !
اے متاعِ زندگی ! اے مایۂ جانِ حزیں

اے شعاع رہنمائے کشتی بحرِ وجود !!!
کس قدر ہے قوّت افزا دور سے تیری نمود

لیکن اے اُمید ! تو اتنا تو بتلا دے مجھے
آنیوالی زندگی دیتی ہے کیوں دھوکے مجھے

کون جانے لے چلے کس راہ پر قسمت مجھے
بخشی دے عزت مجھے یا آہ ! دے ذلت مجھے

موتیوں کا نرخ اب بازار میں اچھا نہیں
کوڑیوں کے مول کوئی پوچھنے والا نہیں

لائے جنس بے بہا بھی ہم تو کیا لائے یہاں
اٹھ گئے بازار سے گاہک تو ہم آئے یہاں

اس ہجوم یاس میں دیتی ہے تو ہمت مجھے
اور کہتی ہے دکھا کر اک درِ دولت مجھے

اپنے گھر کی چار دیواری سے تو باہر نکل
سامنے وہ قدرداں بیٹھے ہیں اُن کے پاس چل

بس یہی تیری ادا ہم کو بہت خوش آئی ہے
تو نے اچھی شکل ہی دکھلائی جب دکھلائی ہے

زہی بہارِ روح پرور بلبلِ دل شاد باد
یا رب این معمورۂ اُمیدِ ما آباد باد

اے مری خون گشتہ اُمید! اے مری کھوئی ہوئی
اے زمانہ کی اندھیری قبر میں سوئی ہوئی
میری لوحِ دل پہ کندہ سالِ رحلت ہے ترا
اور ہر آنسو مرا تابوتِ میّت ہے ترا
عیش کے تجھ سے کہیں جلسے کہیں ماتم کے ہیں
رونے والے ہنسنے والے سب ترے ہی دم سے ہیں
خود مرتّب ساختی خود درہم و برہم زدی
خود شدی دستان زن و خود سینہ از ماتم زدی

مرحومہ کی یاد میں

(ترجمہ از ''آئرش میلوڈیز'' مصنفہ ٹامس مور)

رات کے پچھلے پہر روتی ہیں جب چشم نجوم
اُلفت دیرینہ کی وادی میں اُڑ جاتا ہوں میں
اور اس وادی میں مرحومہ جو یاد آتی ہو تم
محو ہو جاتا ہوں کچھ ایسا مزا پاتا ہوں میں

وہ مکاں وہ قصر وہ تم وہ تمہاری حسرتیں
وہ گلے وہ عذر وہ گزری ہوئی دلچسپیاں
دیر تک کرتا ہوں میں یاد آہ اُن ایام کو
ہائے وہ راتیں کہاں وہ دن کہاں وہ تم کہاں

اس سکوت اس محویّت میں پھر یہ آتا ہے خیال
روحیں منڈلاتی ہیں گر اوجِ فضائے عرش پر
اور چھپ کر آتی ہیں اس خاکدانِ عشق میں
تاکہ دیرینہ علائق دیکھ لیں پھر اک نظر

ق

شاید آ جائے تمہاری روح بھی اور یہ کہے
کیا بتاؤں جنت الماویٰ میں میں کیسی رہی
اس جدائی میں رہا میرا تمہارا ایک حال
تم یہاں روتے رہے اور میں وہاں روتی رہی

پھر سراپا شوق ہو کر وہ غزل گاتا ہوں میں
تم جو تنہائی میں چپکے چپکے گاتی تھیں کبھی
گونج کر جب نغمہ ٹکراتا ہے تو کہتا ہوں میں
یہ تمہاری روح مضطر آتی ہے گاتی ہوئی

یہ لب و لہجہ وہی ہے یہ سریلا پن وہی
لیکن اب اس میں تو کچھ کچھ ضعف کا انداز ہے
اور پھر کچھ سوچ کر پہچان کر کہتا ہوں میں
یہ وہی آواز ہے ، بے شک وہی آواز ہے

امجد حیدرآبادی

سید امجد حسین نام ، امجد تخلص ۱۸۸۶ء میں حیدرآباد (دکن) میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے والد صوفی سید رحیم علی بڑے خدا رسیدہ بزرگ تھے جن کا انتقال امجد کے بچپن ہی میں ہو گیا ۔ لیکن باپ کے حالات و روایات زندگی کی رہبری میں اُنھوں نے اپنے تصوف کا جیسا اعلیٰ مذاق پیدا کیا وہ قابل قدر ہے ۔ امجد ابتدائی قدیم طرز کی مذہبی تعلیم کے بعد مدرسۂ نظامیہ حیدرآباد دکن میں داخل ہوئے اور درس نظامیہ کی تکمیل کرتے رہے لیکن جب مولوی انوار اللہ صاحب کے انتقال کے بعد مدرسہ کا شیرازہ بکھر گیا تو امجد بھی مدرسہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ۔ اور خانگی طور پر درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا ۔ اتفاق سے اُنھیں مولانا نادر الدین اور سید آقا علی شوستری جیسے عربی و فارسی کے بامذاق علماء کی صحبت نصیب ہو گئی ۔ انھیں دو بزرگ علماء کی علمی صحبتوں میں امجد کے ادبی مذاق و بصیرت کی تشکیل ہوئی ۔ تکمیل تعلیم کے بعد وہ پہلے مدرسۂ دارالعلوم میں مدرس کی حیثیت سے ملازم ہوئے پھر سرکاری ملازمت اختیار کر لی اور محکمۂ صدر محاسبی میں ۲۵ سال تک مددگار محاسب کی خدمات انجام دینے کے بعد آپ وظیفۂ حسن خدمت حاصل کر کے اپنے وطن حیدرآباد (دکن) ہی میں پر سکون زندگی گزار رہے ہیں ۔ امجد کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ۱۹۰۸ء میں رود موسیٰ کی قیامت خیز طغیانی ہے ۔ جس میں اُن کی والدہ، بیوی اور عزیز بچی نذر اجل ہوئے ۔ اس جانکاہ حادثہ نے امجد کی طبعیت کا رنگ ہی بدل ڈالا اور وہ تصوف کی طرف راغب ہو گئے ۔ کچھ عرصہ بعد اُن کے شفیق اُستاد مولانا نادر الدین نے اپنی دختر کا عقد اُن سے کر دیا ۔ یہ بیوی بڑی فرزانہ اور صاحب باطن تھیں ان کی ظاہری و باطنی خوبیوں کا اثر بھی حضرت امجد پر بہت پڑا ۔ مگر افسوس کہ حج بیت‌اللہ کی واپسی کے بعد وہ بھی اُنھیں دائمی داغ مفارقت دے گئیں ۔ اس سانحہ کے بعد سے امجد صاحب صحیح معنوں میں ایک تارک دنیا کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں اور دنیاوی زندگی کی تمام خواهشات سے بے نیاز ہو چکے ہیں ۔

امجد صاحب میں شعر و شاعری کا ذوق بچپن ہی سے پیدا ہو گیا تھا ۔ ابتداً چندے حبیب کنتوری اور ترکی کو اپنا کلام دکھایا پھر کسی سے اصلاح نہیں لی ۔ امجد صاحب کا ذوق شعری فطری جذبات کا پرورش یافتہ ہے اس لئے اُن کی شاعری حسن و عشق کے جھوٹے تذکروں اور بے سرو پا خیالی باتوں سے یکسر پاک ہے ۔ بلکہ سچ تو یہ ہے

کہ آن کا کلام خود آن کی وضع زندگی اور طرز تفکر کا آئینہ دار ہے ۔ وہ ایک کہنہ مشق شاعر ہیں آنہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں لیکن وہ اپنی نظموں اور بالخصوص رباعیات کی بدولت کافی سے زیادہ شہرت حاصل کر چکے ہیں ۔

حضرت امجد کی نظموں کے دو مجموعے ''ریاض امجد'' حصہ اول و دوم کی صورت میں طبع ہو چکے ہیں ۔ جن میں زیادہ تر اخلاق و متصوفانہ نظمیں ہیں اور جو اپنی واقعہ نگاری ' وصف نگاری اور اخلاق و تصوف کے نکات کے لحاظ سے بہت عمدہ نظمیں ہیں ۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ قابل قدر وہ نظمیں ہیں جن میں شاعر کی ذہنیت اپنے مخصوص رنگ میں ظاہر ہوتی ہے ۔ ان میں '' فریاد مجنوں '' ''آجا'' ''دعائے یتیم'' ''دنیا اور انسان'' وغیرہ بہت ہی قابل قدر ہیں ۔

امجد صاحب نے اکثر تضمینیں بھی لکھی ہیں اور بڑی زور دار لکھی ہیں ۔ آنہوں نے عربی ' فارسی اور ہندی کی بعض غزلوں و نظموں کی جو تضمینیں لکھی ہیں آن میں سے بیشتر اپنے حکیمانہ خیالات کی بنا پر ہماری ادبیات میں ہمیشہ زندہ رہیں گی ۔

امجد صاحب کے یہ کارنامے آنہیں آردو شعرا کی صف اول میں لانے کے لئے کافی تھے مگر آنہوں نے اس پر اکتفانہ کرتے ہوئے صنف رباعی کو نہ صرف اپنایا بلکہ صحیح معنوں میں اپنے لئے مخصوص کر لیا اور اس مختصر سی صنف سخن میں حقائق و معارف ' توحید و رسالت ' عبادت الہی ' اخلاق و فلسفہ اور تصوف غرضیکہ سب کچھ آنہوں نے سمونے کی نہایت ہی کامیاب کوشش کی ہے ۔ اور چونکہ وہ طبعاً صوفی منش انسان ہیں اس لئے آن کی رباعیاں اعلیٰ متصوفانہ خیالات میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں ۔ لیکن موضوع کی بلاغت و گہرائی کے ساتھ ساتھ آن کی رباعیات میں بے انتہا زور بیان ' نکتہ آفرینی ' اختصار اور حسن کارانہ سادگی بھی پائی جاتی ہے ۔ آنہوں نے رباعی میں جس حسن و خوبی کے ساتھ اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے پر قدرت حاصل کر لی ہے اس کو دیکھ کر مولانا وحید الدین سلیم مرحوم نے کہا تھا کہ ''امجد کی ٹکر کا کوئی رباعی کہنے والا شاعر نہیں ہے'' اور حضرت گرامی مرحوم کی زبان سے بے ساختہ یہ رباعی نکلی تھی ۔

امجد بہ رباعی ست فرد امجد — کلک امجد کلید گنج سرمد
گفتم کہ بود جواب سرمد امروز — روح سرمد بگفت '' امجد امجد ''

اور بلا مبالغہ امجد دنیائے سخن میں اقلیم رباعی کے بادشاہ ہیں ۔ متصوفانہ شاعری میں درد کے بعد فارسی کے مایۂ ناز رباعی نگار صوفی شاعر سرمد کا اگر کوئی مد مقابل ہو سکتا ہے تو وہ یقیناً امجد ہیں ۔ جنہوں نے اپنی فنی صناعی میں سادگی و دلکشی کا ایسا حسین امتزاج پیدا کیا ہے کہ آن کی رباعیات کے مطالعہ سے دل و دماغ دونوں کو کو ایک خاص فرحت و کیف حاصل ہوتا ہے ۔ نقادان شعر کے نزدیک رباعی کی خوبی کا معیار یہ ہے کہ اس میں ایک ہی مضمون شروع سے آخر تک بیان کیا جائے لیکن پہلے مصرعے میں جو بات کہی جائے اسے باقی دو مصرعوں میں بڑھا کر چوتھے مصرعے میں انتہا تک پہونچا دیا جائے ۔ گویا چوتھا مصرع باقی تینوں مصرعوں کا نچوڑ ہونا چاہیئے ۔ اس اعتبار سے رباعی کا اصل آصول ڈرامائی زور قرار پاتا ہے اور امجد صاحب کی رباعیوں

میں یہ وصف بدرجہ کمال موجود ہے ۔ اُن کا آخری مصرعہ اس قدر پر زور اور برجستہ ہوتا ہے کہ ہر رباعی منہ سے بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے ۔

غرض حضرت امجد عصر حاضر کے اُن بزرگ شعرا میں سے ہیں جو ایک پختہ ادبی شعور اور رچی ہوئی شعریت کے مالک ہیں ۔ اُن کا کلام تصوف و فلسفہ کا معدن اور حقیقت و اصلیت کا مخزن ہے ۔ جس میں سادگی ، تاثیر اور گداز جیسے اعلیٰ محاسن شعری بڑی فرا وانی سے پائے جاتے ہیں ۔

انتخاب کلام

تغزّل

یوں تو کیا کیا نظر نہیں آتا — کوئی تم سا نظر نہیں آتا
ڈھونڈتی ہیں جسے مری آنکھیں — وہ تماشا نظر نہیں آتا
ہو چلی ختم انتظار میں عمر — کوئی آتا نظر نہیں آتا
جھولیاں سب کی بھرتی جاتی ہیں — دینے والا نظر نہیں آتا

زیر سایہ ہوں اُس کے اے امجد
جس کا سایہ نظر نہیں آتا

اک آفتابِ وحدت ہے جلوہ بخشِ کثرت — نکلی ہوئی ہیں کلیاں صدہا تری گلی میں
ہے فیض کی تجلی گھری اندھیریوں میں — بکتا ہے رات ہی کو سودا تری گلی میں
موت اور حیات میری دونوں ترے لئے ہیں — مرنا تری گلی میں ، جینا تری گلی میں

حیلہ خوب آتا ہے ہم کو پائے بوسی کا — رکھ دیا قدم پر سر جب اُنہیں خفا پایا

بندگی میں یہ کبریائی ہے — خیر گزری کہ میں خدا نہ ہوا

دل کی شکستگی نے آج ، جوڑ دیا کسی کے ساتھ
دیکھ لیا رخِ حسیں اس درِ نیم باز سے

کس طرح نظر آئے وہ پردہ نشیں امجد
ہر پردہ کے بعد اور اک پردہ نظر آتا ہے

وہ کرتے ہیں سب چھپ کر تدبیر اسے کہتے ہیں
ہم دھر لئے جاتے ہیں تقدیر اسے کہتے ہیں

منتخب منظومات

قیامت صغریٰ

وہ رات کا سناٹا وہ گھنگور گھٹائیں   بارش کی لگا تار جھڑی سرد ہوائیں
گرنا وہ مکانوں کا وہ چیخوں کی صدائیں   وہ مانگنا ہر ایک کا رو رو کے دعائیں

پانی کا وہ زور اور وہ دریا کی روانی
پتھر کا کلیجہ ہو جسے دیکھ کے پانی

دم لینے کی طاقت نہ تھی سستانے کی تاب آہ   تھی زندگی خورد و کلاں نقش بر آب آہ
کرتی تھی الگ سیلِ رواں خانہ خراب آہ   طوطے کی طرح آنکھیں بدلتے تھے حباب آہ

جاں لینے کو ہر اک متنفس کی بڑھی تھیں
بے وجہ نہیں تیوریاں موجوں کی چڑی تھیں

تاریکی میں دریا نے اک اندھیر مچایا   سیلاب فنا بن کے کیا سب کا صفایا
پاؤں سے گزرتا ہوا پھر سینہ تک آیا   آگے جو بڑھا موت نے بس حلق دبایا

شب بھر رہے سب پانی میں فوارے کی مانند
ہوتے ہی سحر ڈوب گئے تارے کی مانند

مادر کہیں اور میں کہیں بادیدۂ پر غم   بی بی کہیں اور بیٹی کہیں توڑتی تھی دم
عالم میں نظر آتا تھا تاریکی کا عالم   کیوں رات نہ ہو ڈوب گیا نیّر اعظم

سب سامنے آنکھوں کے نہاں ہو گئے پیارے
وہ غم تھا کہ دن کو نظر آنے لگے تارے

دعائے یتیم

دونوں جہاں کے مالک ہے لطف عام تیرا تسکین دہ جہاں ہے مشکل میں نام تیرا
فضل و کرم جہاں پر ہے صبح و شام تیرا بچھڑوں سے بھی ملانا یا رب ہے کام تیرا
ماں باپ سے ملا دے او آسماں والے

اپنا وسیلہ یا رب گردانتی ہوں تجھ کو حاجت روائے عالم میں مانتی ہوں تجھ کو
ہوں بے شعور لیکن پہنچانتی ہوں تجھ کو ماں باپ سے زیادہ میں جانتی ہوں تجھ کو
ماں باپ سے ملا دے او آسماں والے

ماتم میں ہمدموں کے دم اپنا توڑتی ہوں دنیا نے مجھ کو چھوڑا میں اسکو چھوڑتی ہوں
باب کرم پہ تیرے سر اپنا پھوڑتی ہوں منت سے تیرے آگے اب ہاتھ جوڑتی ہوں
ماں باپ سے ملا دے او آسماں والے

رباعیات

اس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے کیا ذکرِ صفات ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی ، جاہل سہی ، نادان سہی سب کچھ سہی، تیری بات رکھ لی میں نے

جی اُس کا بھی بھر آیا رلا کر مجھ کو ٹھنڈا نہ رہا خود بھی جلا کر مجھ کو
خود مل گیا خاک میں ملا کر مجھ کو کیا فتح ہوئی شکست پا کر مجھ کو

ہیں مستِ مئے شہود تو بھی ، میں بھی ہیں مدعئی نمود تو بھی ، میں بھی
یا تو ہی نہیں جہاں میں یا میں ہی نہیں ممکن نہیں دو وجود تو بھی میں بھی

گرمی میں غمِ لبادہ نازیبا ہے مستی میں خیالِ بادہ نازیبا ہے
کافی ہے ضرورت کے مطابق دنیا بادہ حد سے زیادہ نازیبا ہے

کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے
مانند حباب ابھر کے اتراتا ہے
کرنے ہیں ذرا سی بات پر فکر حسیں
تنکا تھوڑی ہوا سے اڑ جاتا ہے

ہر قطرے میں بحر معرفت مضمر ہے
ہر ذرے میں کچھ نہ کچھ جوہر ہے
ہو چشم بصیرت تو ہے ہر چیز اچھی
گر آنکھ نہ ہو تو لعل بھی پتھر ہے

مر مر کے لحد میں میں نے جا پائی ہے
یاں تک مجھے تیری ہی کشش لائی ہے
آ! اے میرے منہ چھپانے والے آجا
خلوت ہے، شب تار ہے، تنہائی ہے

یہ سنگِ نشاں ہے منزل وحدت کا
پیدا نہ ہوا پھر کوئی اس صورت کا
انسان جسے کہتے ہیں دنیا والے
قدِ آدم آئینہ ہے قدرت کا

ہر ذرے پہ فضل کبریا ہوتا ہے
اک چشم زدن میں کیا سے کیا ہوتا ہے
اصنام دبی زبان سے یہ کہتے ہیں
وہ چاہے تو پتھر بھی خدا ہوتا ہے

صنعت تری ہر خار دکھا دیتا ہے
ہر غنچۂ گل تیری صدا دیتا ہے
ہر اصل اصول معرفت ہے یا رب
پتہ پتہ ترا پتہ دیتا ہے

ہر گام پہ ٹھکرا کے گرا جاتا ہوں
نقشِ کف پا بن کے مٹا جاتا ہوں
تو بھی سنبھال میرے دینے والے
میں بارِ امانت میں دبا جاتا ہوں

کچھ وقت سے اک بیج شجر ہوتا ہے
کچھ روز میں اک قطرہ گہر ہوتا ہے
اے بندۂ نا صبور ترا ہر کام۔
کچھ دیر میں ہوتا ہے مگر ہوتا ہے

گردش میں یہ گرد و باد آخر کب تک
طرحِ کون و فساد آخر کب تک
ٹوٹے گا طلسم مادیت اک دن
اضداد میں اتحاد آخر کب تک

پیکِ اجل خانہ خراب آتا ہے — برباد کُنِ شیب و شباب آتا ہے
اے ملکِ عدم کے جانے والو ٹھہرو — اک آبلہ پا بھی ہمرکاب آتا ہے

دنیا کے ہر اک ذرے سے گھبراتا ہوں — غم سامنے آتا ہے جدھر جاتا ہوں
رہتے ہوئے اس جہاں میں مدت گزری — پھر بھی اپنے کو اجنبی پاتا ہوں

گلزار بھی صحرا نظر آتا ہے مجھے — اپنا بھی پرایا نظر آتا ہے مجھے
دریائے وجود میں ہے طوفانِ عدم — ہر قطرہ میں خطرہ نظر آتا ہے مجھے

دو قطعے

کسی اندھے کی بی‌بی زشت رو تھی — کہا اک دوست نے اک دن یہ اُس سے
''تری بی‌بی تو ہے ڈائن سے بدتر'' — کہا ''کوئی مری آنکھوں سے دیکھے''

جہاں کو ناز ہے ہستی پر اپنی — میں اپنی نیستی پر مر رہا ہوں
مِلا ہے جب سے لُطفِ خاکساری — تنزّل میں ترقی کر رہا ہوں

ایک تازہ غزل

برباد نہ کر بیکس کا چمن بیدرد خزاں سے کون کہے
تاراج نہ کر میرا خرمن ، اس برق تپاں سے کون کہے
مجھ خستہ جگر کی جان نہ لے ، یہ کون اجل کو سمجھائے
کچھ دیر ٹھہر جا اے دریا ، دریائے رواں سے کون کہے
سینے میں بہت غم ہیں پنہاں اور دل میں ہزاروں ارماں ہیں
اس قہر مجسّم کے آگے حال اپنا زباں سے کون کہے
ہر چند ہماری حالت پر رحم آتا ہے ہر اک کو لیکن
کون آپ کو آفت میں ڈالے، اُس آفتِ جاں سے کون کہے
قاصد کے بیاں کا اے امجد کیونکر ہو اثر اُن کے دل پر
جس درد سے تم خود کہتے ہو اس طرزِ بیاں سے کون کہے

شاکر میرٹھی

پیارے لال نام ـ شاکر تخلص میرٹھ میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت ہوئی ـ مذہباً عیسائی ہیں مگر زبان اُردو کے اچھے ماہر اور شاعری و انشا پردازی کے دلدادہ ـ اُنہیں شعر و سخن سے فطری ذوق ہے ـ وہ حضرت شوکت میرٹھی کے شاگرد اور اُردو شعر و ادب کے دیرینہ پرستاروں میں سے ہیں ـ شاکر صاحب درحقیقت سرور ' نادر ' محروم اور نظر وغیرہ کے دور کے شاعر ہیں ـ ان میں سے بیشتر راہئی ملک عدم ہوئے مگر محروم و شاکر بفضلہ زندہ و سلامت ہیں اور اُن کی سخنوری باوجود پیرانہ سالی کے اب بھی جاری ہے ـ

شاکر صاحب سرور و نظر کے بڑے گہرے دوستوں میں سے ہیں ـ اُنہوں نے بلاشبہ اپنے اُستاد شوکت میرٹھی سے بھی فن شعر کے رموز و نکات سیکھے ہونگے ـ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُنہوں نے اپنے ان دونوں رفیقوں کے فیض صحبت سے بھی بہت کچھ حاصل کیا ہے ـ اور اُنکا ابتدائی کلام انہیں مرحوم دوستوں کے کلام کے ساتھ اُس دور کے مقتدر رسائل میں برابر چھپتا رہا ہے ـ

شاکر صاحب شروع میں ایک مدت تک اپنے مضامین و کلام مختلف رسائل میں چھپواتے رہے ـ پھر جون ۱۹۱۱ء میں جب اُنکے دوست منشی نوبت رائے نظر بعض وجوہ کی بنا پر رسالہ ادیب (الہ آباد) کی ادارت سے دست بردار ہوگئے تو یہ ذمہ داری ان کے سپرد ہوئی اور اس میں شک نہیں کہ حضرت شاکر نے اس بلند پایہ رسالے کی دھاک جمائے رکھی ـ تقریباً ایک سال سات ماہ یہ خدمت بحسن و خوبی انجام دیکر دسمبر ۱۹۱۲ء میں غالباً ان کی بھی مالکان رسالہ سے نہیں بنی اور یہ بھی مستعفی ہو کر لکھنؤ چلے گئے اور کچھ دنوں بعد وہاں سے العصر نامی ایک با تصویر رسالہ جسے ادیب کا مثل کہنا چاہئے نکالنا شروع کیا ـ لیکن وہ بھی کوئی دو برس سے زیادہ نہ چلا ـ اس کے علاوہ اخبار ''ریاست'' سے بھی آپ کا تعلق رہ چکا ہے ـ فی الوقت کانپور میں مقیم ہیں اور مختلف اخبارات ' رسائل و جرائد وغیرہ میں آپ کے مضامین اور کلام چھپتا رہتا ہے ـ غرض اس طرح حضرت شاکر نے تمام عمر ایک عملی و ادبی زندگی گزاری ہے اور اُردو زبان و ادب کی خدمت ہی آپ کا مشغلہٗ حیات رہا ہے ـ

شاکر صاحب طرز جدید کے شیدائیوں میں سے ہیں اور اُنہوں نے اپنے دیگر ہم عصروں کی طرح بے شمار نیچرل نظمیں کہی ہیں ـ جن کے موضوعات اُس زمانے کے عام موضوعات

ہیں ۔ لیکن انہوں نے ان منظومات سے قطع نظر ایک اور بڑا کارنامہ کالیداس کی نظموں کا ترجمہ کیا ہے جو بجائے خود ایک قابل قدر کام ہے ۔ اس کے علاوہ انہیں صنف رباعی سے شروع سے ہی بڑی شیفتگی رہی ہے ۔ اس صنف میں انہوں اس درجہ مشق بہم پہونچائی کہ عرصہ سے ان کا شمار اچھے رباعی گو شعرا میں ہوتا ہے ۔ شروع میں رباعیوں کارنگ مجازی رہا پھر مجاز سے حقیقت کی طرف بڑھے اور طبیعت کی ترقی نے جلد منازل ارتقا طے کر کے انہیں منزل مقصود تک پہونچا دیا ۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انکی اکثر رباعیاں حقیقت و عرفان کے رنگ میں ڈوبی ہیں ۔

غرض شاکر صاحب قطع نظر ایک دیرینہ ادیب ہونے کے بڑے خوش فکر و کامیاب شاعر ہیں ۔ ان کی نظموں میں جدید شاعری کی تمام خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں ۔ مناظر قدرت سے متعلق نظموں میں ان کی شاعرانہ قدرت کے جوہر کھلتے ہیں ۔ وہ مختلف فطری مناظر کا سماں اپنے مرحوم دوست سرور کی طرح خوب خوب کھینچتے ہیں ۔ اس کے علاہ جذبات نگاری اور درد و اثر بھی ان کے کلام کی خصوصیات ہیں ۔ اس سلسلے میں ان کی ''برکھا رت'' ''فضائے برشگال'' ''غنچہ و گل'' ''کچھ اور دیکھ لیتے'' ''ایک آرزو'' ''حسرت پرواز'' وغیرہ بڑی سادہ و دلکش نظمیں ہیں ۔ اور چونکہ انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان میں وطن دوستی کا جذبہ بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا اور اس دور کے اکثر شعرا نے حب الوطنی کے جذبات کو نظم کا جامہ پہنایا ہے اس لئے شاکر بھی اس موضوع سے الگ نہیں رہے اور انہوں نے بھی کئی ایسی نظمیں کہی ہیں جن میں وطن دوستی کا سچا جوش اور مخلصانہ جذبہ کار فرما ہے ۔ مزید برآں متصوفانہ و عارفانہ خیالات بھی ان کی اکثر نظموں میں جھلکتے ہیں اس سلسلے میں انکی نظم ''زمزمۂ توحید'' بڑی عمدہ نظم ہے ۔

شاکر صاحب کا اسلوب بیان بڑا دلکش اور زبان سلیس و با محاورہ ہے ۔ اور کیوں نہ ہو جبکہ انہیں زبان پر قدرت ہونے کے ساتھ ساتھ قابل تعریف ادبی بصیرت بھی حاصل ہے ۔ ان کا کلام بڑا صاف اور ہموار ہے ۔ اس پر نازک و لطیف تشبیہات اور عمدہ تراکیب کے استعمال نے انکی زبان کو اور بھی جاذب نظر بنا دیا ہے ۔ افسوس ہے کہ شاکر صاحب کا کلام منتشر پڑا ہوا ہے اور اب تک کسی مجموعہ کی شکل میں شایع نہیں ہوا ہے ۔

انتخاب کلام

برکھا رت

(ترجمہ از کالیداس)

وہ فصل ، عیش پرستونکی جو ہے جان نشاط   پھر آ رہی ہے لئے ایک کاروان نشاط

جلو میں ابر سیہ کے ہے ہاتھیونکی قطار   نشان برق سے گردوں پہ اڑ رہے ہیں شرار

ہیں دلفریبئ قدرت کے کچھ عجب انداز
صدائے ساز ہے قرنائے رعد کی آواز

گھٹائیں دوڑ رہی ہیں ہوا میں مستانہ
رواں فلک پہ ہے گویا جلوس شاہانہ

کنول سے سرخ ہیں بادل کہیں شفق آلود
گھٹا فلک پہ کہیں سرمگیں کبود کبود

زمین پر جھکے پڑتے ہیں بوجھ سے بادل ۱
کہ دوش ناز پہ پانی کی ہے گراں چھاگل

ق

خرام ناز سے یوں چل رہے ہیں جھک جھک کر ۲
رواں چمن میں ہو جیسے نسیم رک رک کر

زمین پر ہے چھما چھم برس رہا پانی ۱
نہیں وہ دل میں پپیہے کے سوز پنہانی

ق

وہ العطش کی صدا شاخ آشیاں پہ نہیں ۲
کہ پیاس بجھ گئی، کانٹے وہ اب زباں پہ نہیں

عجیب نغمۂ دلکش سنا رہی ہے گھٹا ۱
کہ بینِ قوس قزح کی بجا رہی ہے گھٹا

ق

اور اس پر برق کا زرکش چڑھا ہوا ہے تار ۲
قریب ہو کے گزرتی ہے مینہ کی جو پھوہار

تو پردے پردے سے دلکش صدا نکلتی ہے ۳
غضب کی بانگِ ترنّم فضا نکلتی ہے

چمن میں سبزۂ نوخیز پھوٹ نکلا ہے
زمین پہ لوحِ زمرّد کا سب کو دھوکا ہے

گلوں کے عکس سے یوں سرخ ہے کنار زمیں
کسی عروس کا آنچل ہو جسطرح رنگیں

یہ کالی کالی گھٹائیں، یہ لطفِ منظر شام ۱
ہیں سبزہ زار میں طاؤس چند مست خرام

ق

لبھا رہے ہیں دلونکو صدائے دلکش سے ۲
زمیں پہ رقص کناں ہیں ادائے دلکش سے

برس گئے جو صحرا میں مینہ کے جھالے
نکل گئے ہیں کناروں سے دشت کے نالے

عجیب بوقلموں ہے فضائے بندھیا چل
ہرا بھرا نظر آتا ہے دور تک جنگل

کہیں ہوا کے ہیں جھونکوں سے جھومتے اشجار
لہک رہا کسی جانب ہے سبزۂ کہسار

کہیں ہیں بن میں ہری دُوب چر رہے آہو
کلیلیں ہیں کسی وادی میں کر رہے آہو

فضا برستی ہے صحرا میں آبشاروں پر
عجب بہار کا عالم ہے کوہساروں پر

یہ کالی کالی گھٹائیں یہ شب کی تاریکی
فضائے عرش میں ہے کس غضب کی تاریکی

اچھلتے اب نہیں گردوں پہ ڈوبکر تارے
فلک پہ اب کہیں آتے نہیں نظر تارے

خروش چرخ پہ ہے رعد کے یہ نالوں کا دھڑک رہا ہے کلیجہ پری جمالوں کا
تڑپ کے برق وشوں کی نگاہ میں بجلی چمک جو اٹھتی ہے ابر سیہ میں بجلی
گلے سے، ڈر کے ہیں عشاق کے لپٹ جاتے
و فور خوف سے خلوت میں ہیں سمٹ جاتے

وہ مہوشیں جو بدلتی ہیں کروٹیں شب بھر رلا رہی ہے لہو جنکو دوریٔ شوہر
برس رہی ہے اداسی اب انکی صورت پر جگر کی آگ قیامت ہے درد فرقت پر
نہ وہ سنگھار، نہ ہے اب وہ ذوق آرائش نہ حسن کی ہے وہ تزئین، نہ شوقِ آرائش
کہاں وہ رنگ حنا کی ہتھیلیوں میں بہار کہاں گلے میں وہ پھولوں کے بھینے بھینے ہار
وہ انکھڑیوں میں کہاں اب فسون عشوۂ و ناز لگاوٹوں کے نگاھوں میں اب کہاں انداز
نظر میں ہیچ ہیں آرائشوں کے سب ساماں
شب فراق میں آنکھوں میں ہے سیاہ جہاں

تلاش شہد میں ہیں مکھیاں سبک پرواز مگر مزاج میں یہ سادگی کے ہیں انداز
کہ ناچتے کبھیں آتے ہیں جب نظر طاؤس فضائے دشت میں پھیلائے بال و پر طاؤس
ترانے گاتی ہوئی جب قریب آتی ہیں
کنول کے پھولونکے دھوکے میں بیٹھ جاتی

عجب بہار کا ہے کوھسار پر عالم فلک سے ابر سیہ ہے برس رہا رِم جِھم
رواں ہیں کوہ کے دامن میں خوشنما جھرنے کہ محو رقص ہیں پانی کے جابجا جھرنے
بہار سبزۂ گل ہے جو سبزہ زاروں میں تو دلفریبئی قدرت ہے کوھساروں میں
غضب کے روح فزا ہیں نسیم کے جھونکے کہ موج آب بقا ہیں نسیم کے جھونکے
نہا کے مینہ کے قطروں میں جب نکھرتے ہیں ۲ زمیں پہ ابر سے ٹکرا کے جب گزرتے ہیں
ق
جو کیتکی کے درختوں کے پاس آتے ہیں ۳ تو جھوم جھوم کے ہر شاخ کو جھلاتے ہیں
فضائے دشت کا منظر ہے دید کے قابل ادائے حسنِ گُلِ تر ہے دید کے قابل
کبھیں کدم کے درختوں پہ چھا رہی ہے بہار ہرے ہرے کسی جا نیم کے اشجار

نسیم گُلِ سے معطر ہوا کے جھونکے ہیں
کہ موج بوئے گل تر ہوا کے جھونکے ہیں

یہ آودی آودی گھٹائیں یہ جوش ابر بہار   سکوت شام میں قوس قزح کے نقش و نگار
یہ دلفریب تبسم یہ برق کے انداز   یہ مہوشونکی ادائیں یہ طرز عشوہ و ناز
یہ زعفران کے پھولونکے بھینے بھینے ہار   یہ لمبے جوڑوں کی بندش، یہ چوٹیوں کی بہار
ہر اک ادا میں ہے رعنائی شباب کا جوش   کہ نیلے نیلے گلِ نیوفر ہیں زینت گوش
غضب کا رنگ نکالا ہے مہ جبینوں نے   دوپٹے سرخ کئے زیب تن حسینوں نے
اگر کی بو سے معطر ہیں گل رخوں کے بدن   تو بھینی بھینی ہے زلف دوتا میں بوئے سمن

سواد شب میں ہیں سر مست خواب عیش و نشاط
پلا رہی ہیں گھٹائیں شراب عیش و نشاط

برس گئے ہیں امڈ کر جو دشت میں بادل   نہا کے آب گہر میں نکھر گئے بادل
ہرے ہرے نظر آتے ہیں ہر طرف اشجار   خنک خنک ہے عجب جانفزا نسیم بہار
کدم کے پھولوں کے دلکش کہیں مناظر ہیں   تو کیتکی کے کہیں دلربا مظاہر ہیں
عجب بہار کا عالم ہے انبساط افزا   کہ لب پہ دشت کے ہے خندۂ نشاط فزا

نہ وہ تپش ہے، نہ خورشید کی تمازت ہے
نسیم سرد میں جاں بخش اب لطافت ہے

سہانی رت ہے غضب کا ہے جانفزا موسم   کہ بن کے آیا ہے شوہر یہ دلربا موسم
گلوں کے ہار ہے لایا سمن بروں کیلئے   دلہن بنا کے سجایا ہے دلبروں کے کیلئے

پہنا رہا ہے حسینوں کو حسن کا زیور
کدم کے پھولوں کی آیا ہے بالیاں لے کر

برس رہی ہے ہر اک کنج دل نشیں میں فضا   غضب کی سبزۂ و گل میں ہے دلفریب ادا
مہک رہی ہے ہوا کیتکی کے پھولوں سے   بسی ہوئی ہے صبا کیتکی کے پھولوں سے
ہر اک روش پہ ہے جمگھٹ پری جمالوں کا   ۱ عجب بناؤ ہے پھولوں کے گہنے والوں کا
ق
چمن میں کرتی ہوئیں صحبدم گل افشانی   ۲ لچک لچک کے ہیں پودوں کو دے رہیں پانی
ٹپک رہا ہے پسینہ کنول کے گالوں سے   ۳ تھکاوٹیں ہیں عیاں دھیمی دھیمی چالوں سے
جھکے ہوئے تھے جو پانی کے بوجھ سے بادل   ق وہ بڑھ کے آ گئے ہیں اب قریب بندھیا چل

نہیں رهی جو وہ اگلی سی طاقت رفتار
برس رہے کسی وادی میں تھک کے هیں ناچار

یہ رُت جو دل لئے جاتی ہے ناز نینوں کے — هیں جس میں عشوہ و انداز مہ جبینوں کے
یہ رُت جو جانِ لطافت شجر شجر کی ہے — یہ رُت جو روحِ رواں قالبِ بشر کی ہے
یہ رُت مدار ہے جس پر نظام هستی کا — یہ رُت کہ کیف ہے جسمیں فروغِ هستی کا

یہ رُت سہانی مبارک هو تجھ کو او پیاری !
هر ایک سال کرے تیرے ساتھ غم‌خواری

سحر موسیقی

یہ چھاؤں تاروں کی کم کم یہ نور کا تڑکا — گلوں پہ شبنم تر کے یہ گوھر شہوار
یہ جوش لالۂ صحرا یہ سبزۂ کُہسار — یہ ٹھنڈی ٹھنڈی هوا یہ نسیم عنبر بار
یہ شاخ شاخ پہ انداز زمزمہ خوانی — یہ طائرانِ ترنّم سرائے فصل بہار
فضائے عرش میں نغمہ طراز کی قدرت — هوا کے پردوں میں بانگِ سرورِ موسیقار
یہ دلفریبئی دریا کا دل رُبا منظر — دم خرام یہ موجوں کی شوخئی رفتار
رواں ہے هلکی سی اک سطح آب پر کشتی
اور اس میں ایک حسینہ بجا رهی ہے ستار
جبیں ہے چاند سی زلف سیاہ بھونرا سی — کنول سے پائے نگاریں هیں پھول سے رخسار
لباس حسن ہے تصویر پاک دامانی — ہے ساری هلکی سی ریشم کی ایک زیب کنار
غرضیکہ حسن کی ہے سر سے پاؤں تک مورت — نظر فریب ادا ' دلفریب نقش و نگار
سہیلی سامنے بیٹھی ہے اک سمن اندام
کہ جس کے باغ جوانی میں ہے شروعِ بہار
عجیب دھن سے ہے چھیڑا ترانۂ شیریں — کہ جھومتے لبِ ساحل هیں وجد میں اشجار
فسونِ نغمہ میں دلکش سکوں کچھ ایسا ہے — ٹھہر ٹھہر کے ہے چلتی صبا دم رفتار
گداز قلب کا عالم ہے قلب دریا میں — هر ایک موج میں ہے اضطراب نبض شرار
قریب هو کے گزرتی ہے جوش مستی میں — عجیب لغزشِ مستانہ سے نسیم بہار

نہیں ہے اب لبِ قمری پہ نالۂ کُو کُو　　شرابِ ذوقِ ترنّم سے ایسی ہے سرشار
صدائے نغمہ نے افسوں کچھ ایسا پھونکا ہے　　کہ ہیں سکوت میں مرغانِ شکریں منقار
غرضیکہ طرفہ ہے جادو فسون موسیقی
بشر تو کیا کہ بہائم کو کرتا ہے یہ شکار

زمزمہ توحید

یہ سبزۂ و گل یہ زمیں　　یہ غنچہ عرش بریں
یہ آفتاب آتشیں　　یہ نجم، یہ ماہ مبیں
مظہر تری قدرت کے ہیں
شاہد تری صنعت کے ہیں
اے صانع ارض و سما!

تاباں جو یہ اجرام ہیں　　روشن جو یہ اجسام ہیں
مینائے آتش فام ہیں　　قدرت کے رنگین جام ہیں
ان سب میں ہے نور ازل
اے خالق صد عزّ و جل
پرتو فگن، جلوہ نما!

یہ جنبش بادِ رواں　　یہ شوخئی آب رواں
یہ نکہتِ عنبر فشاں　　یہ طائران نغمہ زن
اک اک میں قدرت ہے تری
کثرت میں وحدت ہے تری
خلّاقِ بے چون و چرا!

ہر سنگ میں تو ہے شرر　　ہر رنگ میں ہے جلوہ گر
ذروں میں تنویر سحر　　تاروں کے جھرمٹ میں قمر
آنکھوں میں تو ہے، دل میں تو
لیلیٰ ہے ہر محفل میں تو
ہر شے میں جلوہ ہے تیرا!

تو رنگ افروزِ چمن   تو جلوہ سرو و سمن
تو رونقِ بزم کہن   تو زیب شمع انجمن
اُف رے خود آرائی تری
اے شانِ یکتائی تری
آئینہ وحدت نما !

خلّاقِ بے پایاں ہے تو   آسائش دوراں ہے تو
ہر درد کا درماں ہے تو   یعنی شکیبِ جاں ہے تو
اے چارہ ساز ، اے چارہ گر
اے چارۂ درد جگر
اے درد مندوں کی دوا !

اے عفو بخش عاصیاں   اے دستگیر بے کساں
رحمت ہے تیری بادباں   شفقت ہے ساحل کا نشاں
تیرا کرم باد صبا
ہر کشتئی بشکستہ کا
طوفاں میں تو ہے نا خدا !

اے مرجع شاہ و گدا   اے خلق کے حاجت روا
اے گمرھوں کے رھنما   اے ناتوانوں کے عصا
اے مونسِ رنج و الم
چارہ گرِ بیمارِ غم
چٹکی میں ہے تیری شفا !

ہستی میں اک طوفاں ہے تو   ہر موج میں پنہاں ہے تو
اک قلزم جوشاں ہے تو   اک بحر بے پایاں ہے تو
مبدائے سر جوش عطا
تیری نہیں کچھ ابتدا
تیری نہیں کچھ انتہا !

کہسار و دشت و بحر و بر   ارض و سما شمس و قمر
ہستی بے بود بشر   اک اک شجر، اک اک حجر
تیرے سواد فانی ہیں سب
اے کردگار روز و شب
ہے اک فقط تجھکو بقا !

رباعیات

دنیا کی بلا سر سے ہٹی جاتی ہے
ہونے والی ہے قطع زنجیرِ حیات
میعاد اسیری کی گھٹی جاتی ہے
جو پاؤں کی بیڑی ہے کٹی جاتی ہے

یکساں نہیں ہیں ظاہر و باطن جن کے
گر دل میں نہیں چور تمہارے شاکر
چنوانے کی آن کو یہ دو رنگی تنکے
کیوں رکھتے ہو ڈر ڈر کے قدم گن گن کے

گھر کر گئی سینے میں محبت تیری
پتھر کی اکیر جو مٹ سکے گی نہ کبھی
ممکن نہیں دیکھوں جو نہ صورت تیری
کچھ کھیل خدایا نہیں الفت تیری

پردے میں تو اک نمود کی ہے تصویر
ہوتا نہ اگر تُو، تو نہ ہوتی دنیا
اور غیب میں اک شہود کی ہے تصویر
یہ دھر تیرے وجود کی ہے تصویر

خورشید درخشاں میں جھلک تیری ہے
ہیں کون و مکاں نور سے تیرے پرنور
اور گوھر لامع میں دمک تیری ہے
ہر ذرّۂ تاباں میں چمک تیری ہے

مرغان چمن نغمہ سرائی کیسی
اک مجلس غم ہے آہ! دنیا شاکر!
اس پنجرے میں داد خوشنوائی کیسی
اس قید سے جیتے جی رہائی کیسی

اندوہ غم و رنج و محن سے چھُوٹے
مر مر کے ہوا کفن نصیب اے شاکر
دنیا کے وبال جاں شکن سے چھُوٹے
صد شکر کہ فکر پیرھن سے چھُوٹے

وہ شوق وصال کی کہانی نہ رہی
مانا نہ مرا شباب رہتا اے دل!
وہ ھجر کی کاھش نہانی نہ رہی
تیری بھی تو ھائے وہ جوانی نہ رہی

تقلید پہ کیوں اپنی کمر کستا ہے
ہر قطرہ نہیں بنتا ہے نیساں شاکر
کب اس شجر خشک میں پھل لگتا ہے
ہے آب دگر جس سے گہر بنتا ہے

ریاض خیرآبادی

سید ریاض احمد نام ریاض تخلص ۔ ۱۸۵۳ء میں خیر آباد ضلع سیتاپور (اودھ) میں پیدا ہوئے ۔ بزرگ ایران کے رہنے والے تھے ۔ مورث اعلیٰ خلجیوں کے عہد میں ہندوستان آئے اور خیر آباد میں سکونت اختیار کی ۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سید طفیل احمد سے پائی اور ساتھ ہی مدرسہ عربیہ خیر آباد میں بھی تعلیم پاتے رہے مگر فارغ التحصیل نہ ہونے پائے تھے کہ شاعری کا چسکا پڑ گیا ۔ پہلے اسیر سے تلمذ اختیار کیا ۔ بعد میں امیر مینائی سے اصلاح لی ۔ ریاض نے خیر آباد سے ایک رسالہ ''گل کدہ ریاض'' نکالا پھر ''ریاض الاخبار'' جاری کیا ۔ لیکن لکھنؤ کی فضا زیادہ پسند تھی چنانچہ ''ریاض الاخبار'' کے دفتر کو بھی وہیں منتقل کر دیا اور پندرہ سولہ برس تک نہایت کامیابی سے یہ پرچہ نکالتے رہے ۔ اس کے بعد انگریزی ملازمت اختیار کی اور سپرنٹنڈنٹ پولیس گورکھپور کے سر رشتہ دار مقرر ہوئے ۔

ریاض کے لکھنؤ کے دوران قیام میں نواب کلب علی خاں نے اُن کی جودت طبع اور خوش فکری کا شہرہ سن کر رامپور طلب کیا ۔ جہاں اُنہوں نے اخبار کے ساتھ ''فتنہ'' و ''عطر فتنہ'' کے نام سے ضمیمے بھی شائع کئے ۔ لیکن وہاں وہ زیادہ دن قیام نہ کر سکے ۔ گورکھپور میں پندرہ برس تک اپنے عہدہ کے فرائض بڑی خوش اسلوبی سے انجام دئے اور بڑی فراغت کی زندگی بسر کی ۔ اُس کے بعد لکھنؤ واپس چلے آئے ۔ راجہ صاحب محمود آباد اُن کے بڑے قدردانوں میں تھے ۔ لیکن راجہ صاحب کی خواہش اور کوشش کے باوجود آپ لکھنؤ نہ ٹھہرے اور باقی زندگی خیر آباد میں بسر کی ۔ ۱۹۳۵ء میں فوت ہوئے ۔ ان آخری ایام میں خرچ کی زیادتی اور آمدن کی قلت نے قدرے پریشان کیا ۔ مگر قناعت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا تاہم گورکھپور کو ہمیشہ یاد کرتے رہے ۔ چنانچہ کہتے ہیں ۔

وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے
بڑی حسرت سے لب پر ذکر گورکھپور رہتا ہے

ریاض اپنی شاعری کے اعتبار سے خمریات کے امام نظر آتے ہیں ۔ جام و مینا کی ایسی تصویر کھینچتے ہیں ۔ کہ شراب پینے والوں کی نگاہیں وہاں تک نہ پہنچی ہوں گی ۔

اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ریاض خدا معلوم شراب کی کن گہرائیوں میں کھوئے ہوئے ہیں ۔ لیکن شاعری میں اس خوبی کے باوجود ریاض نے زندگی بھر شراب کا قطرہ تک نہیں چکھا ۔ بڑے پاک نفس ، دریا دل اور سچے مسلمان تھے - پانچ وقت نماز ، رمضان کے روزے ، روزانہ قران پاک کی تلاوت اور اورادو وظائف کا سلسلہ زندگی بھر کا ساتھی رہا ۔ ان کی رندی اور سرمستی ان کی شاعری تک محدود تھی ۔ یا یوں کہئے کہ

''جو رنگ قال میں دیکھا وہ ان کا حال نہ تھا''

البتہ اُن کے مزاج میں لا اُبالی پن اور وارفتگی جو رندانہ مزاجی کا جوہر ہے وافر تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ کلام میں شوخی و بے چینی حد سے زیادہ ہے ۔ مگر لطف یہ ہے کہ کہیں عامیانہ پن نہیں آنے پاتا ۔ زبان میں شیرینی ، صفائی اور گھلاوٹ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور اُن کی خمریات کا کیا کہنا ! اُنہوں نے شراب و مضامین شراب کو جس طرح اشعار میں سمویا ہے وہ اُنہیں کا حصہ ہے ۔ سچ پوچھئے تو اپنے اُستاد امیر مینائی کا صحیح معنوں میں نام روشن کرنے والے ریاض ہی ہیں ۔

ریاض نے اپنی بعض خصوصیات شعری ، زبان کی صحت ، لطف زبان ، قدرت بیان ، شوخی ، رندی ، جوانی کی داستان وغیرہ ہم کی طرف اپنے اشعار میں بھی اشارے کئے ہیں ۔ چند شعر سنئے ۔

وہی شباب کی باتیں وہی شباب کا رنگ
تجھے ریاض بڑھاپے میں بھی جواں دیکھا
حصے میں آئی ہے یہ جناب ریاض کے
پاکیزگی زبان کی ادائے بیاں کے ساتھ
میرے بیاں پر آج ہے طرز بیاں کو ناز
میری زباں پر آج ہے ہندوستاں کو ناز

منظور تھی شُستگی زباں کو ۔۔۔ تھوڑی سی شراب ناب پی لی
یہ خاص رنگ ہمیشہ سے تیرا حصہ ہے ۔۔۔ ریاض جانتے ہیں سب تجھے تغزل میں
ہندوستاں میں دھوم ہے کس کی زباں کی ۔۔۔ وہ کون ہے ریاض کو جو جانتا نہیں
شاعری ہے ریاض کے دم تک ۔۔۔ پھر کہاں لوگ اس طبیعت کے

ریاض تغزل کے شیدائی ہیں ۔ اُنہوں نے شراب نہیں پی مگر عشق ضرور کیا ۔ اور ایسا شوخ ، جاندار اور بانکا عشق کہ اُس کی تصویر اُن کے اشعار میں رقصاں نظر آتی ہے ۔ اُن کے جام میں شراب حسن و شباب ہے اور وہ اس کا ذکر بڑے مزے لے لے کر کرتے ہیں ۔ غرض شوخی و شراب کے مضامین کے علاوہ ریاض کی سب سے بڑی خوبی زبان کی صحت اور زبان کا لطف ہے ۔ حضرت نیاز نے ٹھیک کہا ہے کہ ''شاید ریاض کے برابر صحیح شعر کسی اور نے نہیں کہے'' اُن کی زبان مستند ہونے کے ساتھ ساتھ پر لطف بھی ہے ۔ بحیثیت مجموعی ریاض کی شاعری خود اُن کی طرح چلبلی ،

شوخ اور بے باک ہے ، اس پر آن کے مخصوص اشارے اور کنائے اور بھی مزہ دیتے ہیں - ''ریاض رضواں'' کے نام سے آپ کا مجموعہ کلام چھپ چکا ہے ۔

انتخاب کلام

کچھ کام نہیں مے سے ، گو عشق ہے اس شے سے
ہیں رند ریاض ایسے ، دامن بھی نہ تر دیکھا

مئے نورِ خدا ہوتی ، دل عرشِ خدا ہوتا
تھوڑی سی جو پی لیتے ، کیا جانئے کیا ہوتا

سایہ تاک میں واعظ کو جگہ دی ہم نے
آج شیشے میں آسے ہم نے آتارا کیسا
قرض لایا ہے کوئی بھیس بدل کر شاید
مے فروشوں کا ہے واعظ سے تقاضا کیسا
جب یہ مل جائیں کلیجے سے لگائے آن کو
ان حسینوں سے کسی بات کا شکوا کیسا

چُن چُن کے آج شیخ نے انگور کھا لئے
اب کیا کھنچے گی تاک کا حاصل نکل گیا

میں کہیں جاؤں وہ محشر ہو کہ ہو محفلِ وعظ
دوش پر میرے سبُو ہاتھ میں مینا ہو گا

جا جا کے بزم وعظ میں سو بار ہم نے پی
چوری کس کی تھی نہ ہمیں ڈر کسی کا تھا
اہل حرم بھی آ کے ہوئے تھے شریکِ دَور
کچھ اور رنگ آج مری مے کشی کا تھا

ہم ہیں گدائے میکدے ہم کو کمی نہیں
سب کچھ ہمارے گھر ہے خدا کا دیا ہوا

محتسب آیا تو میں خُم پر گرا خُم گرا، مینا گرا، ساغر گرا

توبہ کر کے آئے پھر پی لی ریاض کیا کِیا کم بخت تو نے کیا کِیا

وہ جانا مرا روٹھ کر میکدے سے صراحی کا مجھ کو وہ آواز دینا

جنت سے کم سہی مگر اچھا تھا میکدہ
جب تک تھے ہم وہاں غم فروا تو کچھ تھا نہ

ہم رند سمجھتے ہیں اسے انجمنِ وعظ
جس بزم میں ذکرِ مے و مینا نہیں ہوتا
میخانے میں کیوں یادِ خدا ہوتی ہے اکثر
مسجد میں تو ذکرِ مے و مینا نہیں ہوتا

توبہ سے ڈرایا مجھے ساقی نے یہ کہہ کر
توبہ شکنی کے لئے اصرار نہ ہوگا

دھوکے سے پلا دی تھی اسے بھی کوئی دو گھونٹ
پہلے سے بہت نرم ہے واعظ کی زباں اب

تا صبح میکدے سے رہی بوتلوں کی مانگ
برسیں کہاں یہ کالی گھٹائیں تمام رات

جام چھلکانے لگے بھر کر مئے کوثر سے آپ
حضرتِ واعظ بہت اونچے گئے منبر سے آپ

کوئی منہ چوم لے گا اس نہیں پر شکن رہ جائے گی یوں ہی جبیں پر

اٹھے کبھی گھبرا کے تو میخانے کو ہو آئے
پی آئے تو پھر بیٹھ گئے یادِ خدا میں

عنادل میں صبا میں چل گئی تھی — اُڑا دی بات پھولوں نے ہنسی میں

مزے لُوٹو کلیم اب بن پڑی ہے — بڑی اونچی جگہ قسمت لڑی ہے

چھانٹا وہ دل کہ جس کی ازل میں نمود تھی — پسلی پھڑک اٹھی نگہِ انتخاب کی

چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی — تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی

صد سالہ دَورِ چرخ تھا ، ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

جام سے توبہ شکن ، توبہ مری جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹُوٹے ہوئے پیمانوں کے

کیا حسرت سے رخصت ، صبح کے تاروں کو یہ کہکر
کہ جنکا شام سے تھا آسرا اب تک نہیں آئے

آتے آتے ترے لب تک جو تبسم بن جائے
اس ادا سے کبھی ہم سے بھی ہو پیماں کوئی

اچھی پی لی خراب پی لی — جیسی پائی شراب پی لی

شغل مے اور معاصی سے ہے اچھا زاہد — غم دنیا سے فراغت تو ذرا ہوتی ہے

کم بخت نے شراب کا ذکر اس قدر کیا — واعظ کے منہ سے آنے لگی بُو شراب کی

مئے کوثر جناب شیخ پئیں — ایسی شے اور ناروا جائے
ہے ریاض اک جوان مست خرام — نہ پئے اور جھومتا جائے

بند ہوتا ہے اب در توبہ — درِ مے خانہ وا کرے کوئی

اتری ہے آسمان سے جو کل اٹھا تو لا — طاق حرم سے شیخ وہ بوتل اٹھا تو لا
دھونا ہے داغ جامہ احرام صبح صبح — حجرے سے شیخ پانی کی بوتل اٹھا تو لا
مجھ کو بھی انتظار تھا ابر آئے تو پیوں — ساقی اگر یہ سچ ہے کہ بادل اٹھا تو لا
طاقِ حرم میں شیخ گلابی ہے پھول بھی — اس کام کا ملے گا تجھے پھل اٹھا تو لا
میں کام لوں گا ابر کا اے رند تان کر — تو مجھ فقیر مست کا کمّل اٹھا تو لا

ناصح کا منہ ہو بند چکھادوں شرابِ خلد
ساقی ذرا ریاض کی بوتل اٹھا تو لا

کچھ آئینے نے اور ہی عالم دکھا دیا
دونوں کو ایک دوسرے نے کیا بنا دیا

دیوانگی نے میری مجھے کیا مزا دیا
ان کو بھی ساتھ میرے تماشا بنا دیا

ننھے سے دل کی چھوٹی سی تُربت بنائی تھی
نقش قدم نہ تھا جسے تم نے مٹا دیا

کیسے یہ بادہ خوار ہیں سُن سُن کے پی گئے
واعظ کو کچھ مزا نہ کسی نے چکھا دیا

شوخی سے ہر شگوفے کے ٹکڑے اڑا دئے
جس غنچے پر نگاہ پڑی دل بنا دیا

اس واسطے کہ آؤ بھگت میکدے میں ہو
پوچھا جو گھر کسی نے تو کعبہ بتا دیا

ہم گزرے جس طرف سے ادھر انگلیاں اٹھیں
دیوانہ ان حسینوں نے ہم کو بنا دیا

پاوں تو ان حسینوں کا منہ چوم لوں ریاض
آج ان کی گالیوں نے بہت ہی مزا دیا

روزہ رکھ کر بلا کے دن کاٹے ہیں مے سے دامن بچا کے دن کاٹے ہیں
میخانے میں ہم تشنہ لبوں نے ساقی سینے سے سُبو لگا کے دن کاٹے ہیں

جو ہم آئے تو بوتل کیوں الگ پیرِ مغاں رکھدی
پرانی دوستی بھی طاق پر اے مہرباں رکھدی
خدا کے ہاتھ ہے بکنا نہ بکنا مے کا اے ساقی
برابر مسجدِ جامع کے ہم نے اب دکاں رکھدی
چمن کا لطف آتا ہے مجھے صیّاد کے صدقے
قفس میں لا کے اس نے آج شاخِ آشیاں رکھدی
بِنا ہے ایک ہی دونوں کی کعبہ ہو کہ بت خانہ
اٹھا کر خشتِ خُم ہم نے وہاں رکھدی یہاں رکھدی
یہ قیس و کوہکن کے سے فسانے بن گئے کتنے
کسی نے ٹکڑے کر کے سب ہماری داستاں رکھدی
یہ عالم ہے ریاض ایک ایک قطرے کو ترستا ہوں
حرم میں اب خدا جانے بھری بوتل کہاں رکھدی

ڈھل چکی ہے اب جوانی جائے گی یہ شراب ارغوانی جائے گی
بعد توبہ آتشِ سیالِ خُم میرے گھر سے ہو کے پانی جائے گی
تیغ ہی کیا ہاتھ میں قاتل کے تھی اے جفا تو بھی تو سانی جائے گی
شوخیاں کہتی ہیں کُھل کھلینگے وہ اب حیا کی پاسبانی جائے گی
شیخ نے مانگی ہے اپنی عمر کی میکدے سے اب پرانی جائے گی
پینے آئیں تو فرشتہ خو ریاض
حور کے دامن میں چھانی جائے گی

ہمارے دل میں ہے جو داغ ایسا کم نکلتا ہے
یہ بن بن کر چراغِ محفلِ ماتم نکلتا ہے
تری ٹھوکر کے فتنے کو نہ ایسا ہم سمجتے تھے
یہ ظالم تو قیامت سے قدِ آدم نکلتا ہے

بنائے کعبہ پڑتی ہے جہاں ہم خشتِ خُم رکھدیں
جہاں ساغر پٹک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے
مرے آنے سے کیوں دھومیں مچی ہیں بزم ساقی میں
یہ کیا ہے بعد مدّت کیوں یہ جام جم نکلتا ہے
تمھیں کیوں کر بتا دوں کیا مرے دل پہ گزرتی ہے
تمھیں کیوں کر دکھا دوں تم میں کیا عالم نکلتا ہے
یہاں رونا پڑا دو دو کا ہے آئیں نہ ایسے میں
سِسکتی ہے تمنّا، آرزو کا دم نکلتا ہے
سحر ہوتے وہ اپنا چاک دامن لے کے بیٹھے ہیں
رفو کرنے کو تارِ دامن مریم نکلتا ہے
ریاض ایسا گیا گزرا نہیں شان اجل دیدے
گدائی کے لئے وہ لے کے جام جم نکلتا ہے

زمینِ میکدہ عرشِ بریں معلوم ہوتی ہے
یہ خشت خُم فرشتے کی جبیں معلوم ہوتی ہے
شفق کہہ لے کوئی چاہے شفق گوں آسماں کہہ لے
ہمیں تو کوئی قاتل کی جبیں معلوم ہوتی ہے
ارے ساقی ذرا میری شراب تلخ تو لانا
مئے کوثر تو بالکل انگبیں معلوم ہوتی ہے
یہ اے صیّاد رہ رہ کر چمکتی ہے کہاں بجلی
جہاں میرا نشیمن تھا وہیں معلوم ہوتی ہے
ریاض ایسی مرے دل سے لگی ہے جام کوثر کی
مئے انگور اب اچھی نہیں معلوم ہوتی ہے

کیا کیا خوشامدیں ہیں کہ پی لو بہار میں
بادل کے ٹکڑے سر پہ مرے چھائے جاتے ہیں

اس طرح کہ گھنگرو کوئی چھاگل کا نہ بولے
جب چھم سے چلیں گود میں چپکے سے اٹھا لیں

ریاض موت ہے اس شرط سے ہمیں منظور
زمیں ستائے نہ مرنے پہ آسماں کی طرح

آٹھو اٹھو میز سے مئے و ساغر ریاض جلد   آتے ہیں اک بزرگ پرانے خیال کے

میرا یہی خیال ہے گو میں نے پی نہیں   کوئی حسیں پلائے تو یہ شے بُری نہیں

مری شراب کی کیا قدر جانے تو واعظ
جسے میں پی کے دعا دوں وہ جنّتی ہو جائے

بڑے پاک طنیت بڑے صاف باطن   ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

جلیل مانک پوری

جلیل حسن نام - جلیل تخلص ۱۸۶۹ء میں اپنے وطن مانک پور (اودھ) میں پیدا ہوئے والد کا نام مولوی حافظ عبدالکریم تھا - جلیل کی ابتدائی تعلیم خالص مشرقی انداز میں ہوئی - گھر پر انہوں نے دس گیارہ برس کے سن تک عربی ، فارسی اور اردو کی متداولہ درسی کتب پڑھیں اور ساتھ ھی ساتھ قرآن مجید حفظ کیا - پھر مزید تعلیم کے لئے لکھنؤ آئے جہاں ان کی طالب علمی کا بیشتر زمانہ گزرا - لکھنؤ ھی میں انہوں نے فارسی و عربی کی فاضلانہ استعداد بہم پہنچائی اور زبان اردو کی مسلم الثبوت قابلیت نیز عروض و قوافی کا خاصا ملکہ حاصل کیا - شعر و شاعری کا ذوق بھی اسی سر زمین میں پیدا ہوا - بیس سال کی عمر میں وہ حضرت امیر مینائی کے شاگرد ہوئے اور پھر استاد کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ آخر دم تک ساتھ نہ چھوڑا - رامپور میں جب امیر مینائی نے امیراللغات کی تدوین کے لئے دفتر قائم کیا تو جلیل ان کے سکریٹری مقرر ہوئے اور کافی عرصہ تک یہ خدمت انجام دیتے رہے - امیر مینائی کے ساتھ ھی انہیں بنارس و بھوپال جانے کا اتفاق ہوا اور ۱۹۰۰ء میں جب استاد حیدرآباد دکن گئے تو یہ بھی ان کے ہمراہ تھے - حیدرآباد میں یہ مہاراجہ سر کشن پرشاد کے مہمان رہے اور دو رسائل "محبوب الکلام" اور "دبدبۂ آصفی" کی ترتیب و اشاعت کا کام سر انجام دیتے رہے - اسی اثناء میں استاد کا انتقال ہو گیا - تو جلیل نے وہیں مستقل اقامت اختیار کر لی - امیر مینائی کی وفات کے بعد ان کے بعض تلامذہ مثلاً ریاض خیر آبادی ، مضطر ، نسیم وغیرہ نے جلیل کو مرحوم کا جانشین قرار دیا چنانچہ بعد میں وہ اسی لقب سے مشہور ہوئے - ۱۹۰۵ء میں جب فصیح الملک داغ کا انتقال ہو گیا - تو نواب میر محبوب علی خاں نظام دکن نے جلیل کو اپنا استاد مقرر کیا اور پانچ سو روپے ماہوار وظیفہ اور "جلیل القدر" کا خطاب عطا کیا - پھر جب نواب عثمان علی خاں مسند آرا ہوئے تو انہوں نے جلیل کو اپنا استاد ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر دربار بھی مقرر کیا اور پہلے "نواب فصاحت جنگ بہادر" کا خطاب دیا پھر "امام الفن" کے لقب سے مزید عزت افزائی فرمائی -

شعر و شاعری کے ساتھ جلیل کی علمی و ادبی خدمات بھی جاری رہیں - ۱۹۱۸ء میں انہوں نے تذکیر و تانیث کے موضوع پر ایک نہایت ھی عمدہ اور ضخیم کتاب

جس میں سات ہزار الفاظ کی تذکیر و تانیث مشرح و مفصل طور پر بتائی گئی ہے ' تالیف کی جو مولانا عبدالحلیم شرر کے مقدمہ کے ساتھ زیور طبع سے آراستہ ہوئی ۔ پھر اختر مینائی فرزند امیر مینائی کے ساتھ مل کر سرکار نظام کے ایما سے دکن کی ایک تاریخ لکھی - اس کے علاوہ استاد امیر مینائی کی زندگی کے حالات و کوائف بھی ایک کتاب کی شکل میں پیش کئے جو ۱۹۲۷ء میں طبع ہوئی ۔

غرض اس طرح کی علمی و ادبی زندگی گزار کر کاروان امیر کا یہ آخری مسافر عمر کی ۷۷ منزلیں طے کر کے ماہ جنوری ۱۹۴۶ء میں راهئی ملک بقا ہوا اور حیدرآباد ہی میں اسے سپرد خاک کیا گیا ۔

حافظ جلیل حسن ' امیر مینائی کے شاگرد خاص اور جانشیں اور اردو شاعری میں اپنے استاد کے رنگ کے حقیقی امانت دار تھے ۔ ان کا کلام دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہایت خوبی کے ساتھ امیر مینائی کے قدم بقدم چلتے اور انہیں کے رنگ میں شعر کہتے تھے ۔ وہی شوخی و سادگی جو استاد کے کلام کا جوہر خاص تھی جلیل کے یہاں ایک سلیس و عام فہم انداز میں کچھ اس طرح چمکی کہ ان کی غزلیں ہر طرف چشم زدن میں پھیل گئیں ۔ ان کے کلام کی اس مقبولیت نے اردو زبان کا جو ذوق عوام میں پیدا کر دیا وہ ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے ۔ ان خوبیوں کے علاوہ جلیل کی ہر دلعزیزی کے تین خاص وجوہ ہیں ۔

(۱) سادگئی بیان ' صفائی زبان کے ساتھ ساتھ بلند پردازی اور نازک خیالی جیسی دو متضاد صفات ان کے کلام میں جمع ہو گئی ہیں جس سے کلام کا پایہ بلا مبالغہ بہت بلند ہو گیا ہے ۔

(۲) جلیل اپنی غزلوں میں الفاظ کی ماہرانہ نشست سے ترنم کا ایسا جادو جگاتے ہیں گویا ان کی تخلیق موسیقی ہی کے لئے کی گئی ہے ۔

(۳) بیان حسن و عشق میں روز مرہ و سلاست کی بدولت ایک عجیب دلکشی پیدا ہو گئی ہے جو پڑھنے والے کے دل کو موہ لیتی ہے ۔

انہیں خوصیات کی بدولت جلیل کے کلام نے اس درجہ مقبولیت حاصل کی کہ شاید ہی کوئی محفل سرود ہو گی جس میں ان کی غزلیں نہ گائی جاتی ہوں اور عوام و خواص ان کی وجد آور کیفیات سے متاثر نہ ہوتے ہوں ۔

اس میں شک نہیں کہ ان کے بہت سے اشعار رعایت لفظی اور محاورہ بندی کے طلسم سے باہر نہیں نکلتے ۔ تاہم بندش کی چستی اور بیان کی سلاست اس رنگ کو بھی دلچسپ بنا دیتی ہے ۔ جلیل کے کلام میں اخلاق و صوفیانہ مضامین بھی ملتے ہیں لیکن یہ ان کا خاص رنگ نہیں ۔ ان کا اصل رنگ حسن و عشق کا اظہار اور جذبات نگاری ہے ۔ گویا تغزل میں انہیں خاص ملکہ ہے ۔ لیکن اس میں بھی وہ بلاغت ' متانت ' خوش مذاق اور بلند خیالی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے ۔

جلیل کا اسلوب بیان بڑا سادہ و دلکش ہے جس میں لطف زبان سے نکھار اور زیور محاورہ سے مزید آراستگی پیدا ہو جاتی ہے ۔ انداز بیان کی اسی جادو گری نے جلیل کو، باوجودیکہ وہ قدیم دلبستان غزل کے نہایت وفاشعار ہیرو تھے اور ان کے موضوعات اردو شاعری کے عام موضوعات تھے، شہرت عام و بقائے دوام کا وہی تاج پہنایا جو ان سے پہلے ان کے استاد امیر مینائی کے زیب سر تھا ۔

مرحوم نے ''تاج سخن'' ''جان سخن'' ''معراج سخن'' اور ایک انتخاب کلام یادگار چھوڑے ہیں ۔

انتخاب کلام

فغاں میں درد، دعا میں اثر نہیں آتا — جو تم نہیں ہو تو کوئی ادھر نہیں آتا
شراب عشق کی مستی، عجیب مستی ہے — گیا جو ہوش، تو پھر عمر بھر نہیں آتا

یہ رنگ گلاب کی کلی کا — نقشہ ہے کسی کی کم سنی کا
منہ پھیر کے یوں چلی جوانی — یاد آ گیا روٹھنا کسی کا

دیکھو نہ جلیل کو ستاؤ
مٹ جائیگا نام عاشقی کا

کوئی حسیں ہو ہمیں اک نگاہ کر لینا — جگر کو تھام کے چپکے سے آہ کر لینا
نیاز مند ہوں کافی ہے ناز کرنے کو — سلام جاکے انہیں گاہ گاہ کر لینا
کوئی سنے نہ سنے مجھ کو درد دل کہنا — اثر کرے نہ کرے مجھ کو آہ کر لینا

موسم گل میں عجب رنگ ہے میخانے کا — شیشہ جھکتا ہے کہ منہ چوم لے پیمانے کا
خوب انصاف تری انجمن ناز میں ہے — شمع کا رنگ جمے، خون ہو پروانے کا
میں سمجھتا ہوں تری عشوہ گری کو ساقی — کام کرتی ہے نظر، نام ہے پیمانے کا

جب ترے عشق کا پھندہ مری گردن میں رہا
پھر برابر ہے قفس میں کہ نشیمن میں رہا
لوگ آرام کی خاطر رہے دنیا میں خراب
اور آرام چھپا گوشۂ مدفن میں رہا

چاک دامانئی یوسف تو کوئی بات نہ تھی
ھائے وہ چاک زلیخا کے جو دامن میں رہا
قیس و فرہاد کا بھرتے رہے بہروپ جلیل
یہی سودا تھا ' یہی کھیل لڑکپن میں رہا

دامن سے اب لپٹ کے رہے گا مرا غبار
اچھا کیا جو خاک میں تم نے ملا دیا
آتا نہیں خیال اب اپنا بھی اے جلیل
اک بے وفا کی یاد نے سب کچھ بھلا دیا

یار تک پہنچا دیا بے تابئی دل نے ہمیں
اک تڑپ میں منزلوں کا فاصلہ جاتا رہا

کہہ گیا شمع سے پروانہ کہ نا ممکن ھے
میں جلوں اور کلیجہ رہے ٹھنڈا تیرا

روئے رنگیں پر پسینے کا عجب عالم ھے
آب‌وآتش کو بہم دست و گریباں دیکھا

وہ شوق بھرا دل تھا حسرت سے تڑپ اٹھا
ثابت نہ ھوا مجھ پر ناوک کا خطا کرنا
جاتے ھو خدا حافظ ' ھاں اتنی گذارش ھے
جب یاد ھم آ جائیں ملنے کی دعا کرنا

برا نہ مانو اگر ذکر حور میں نے کیا
غرور تم نے کیا تھا قصور میں نے کیا
اب اسکو پردہ دری سمجھو یا کچھ اور کہو
تمہارے حسن کا چرچا ضرور میں نے کیا

رہا اسیر تو شکوے رہے اسیری کے
رہا ھوا تو مجھے غم ھوا رہائی کا

منتظر موسم گل کے ھیں ترے دیوانے
ھاتھ رکھے ھوئے بیٹھے ھیں گریبانوں پر

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں　　وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

یہ جو سر نیچے کئے بیٹھے ہیں　　جان کتنوں کی لئے بیٹھے ہیں
واعظ چھیڑو نہ رندونکو بہت　　یہ سمجھ لو کہ پیئے بیٹھے ہیں
دست وحشت کو خبر کردے کوئی　　ہم گریبان لئے بیٹھے ہیں

آج سنتے ہیں وہ اپنا مدعا کہنے کو ہیں
کون جانے دل میں کیا ہے منہ سے کیا کہنے کو ہیں
ان بتوں ہی نے کیا ساری خدائی کو تباہ
برہمن کیا ہم آسے پیش خدا کہنے کو ہیں
ساری دنیا جانتی ہے جیسے حضرت ہیں جلیل
جان دیتے ہیں بتوں پر پارسا کہنے کو ہیں

آو آنکھ چرا کے جانے والے　　ہم بھی تھے کبھی تری نظر میں

مزے بیتابیوں کے آ رہے ہیں　　وہ ہم کو ہم انہیں سمجھا رہے ہیں

نہ اشارہ، نہ کنایہ، نہ تبسّم، نہ کلام　　پاس بیٹھے ہیں مگر دور نظر آتے ہیں

بوئے سے پا کے میں چلتا ہوا میخانے کو
ایک پری تھی کہ لگا لے گئی دیوانے کو
کوئی ایسی بھی ہے صورت ترے صدقے ساقی
رکھ لوں میں دل میں اٹھا کر ترے میخانے کو
دمِ زینت انہیں کیا جانیئے کیا یاد آیا
آئینہ توڑ دیا پھینک دیا شانے کو
ہے سبق یاد دو عالم کی فراموشی کا
ہوش اتنا تو ہے اب تک ترے دیوانے کو

اب آنکھ چراتا ہے پلاتے ہوئے ساغر رندوں کی نظر لگ گئی ساقی کی نظر کو
وعدہ رہا نہ یاد تغافل شعار کو اب کیا جواب دوں نگہ انتظار کو

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی
آتے آتے اُن کو آئے گا خیال جاتے جاتے بے خیالی جائے گی
بے سبب اپنی جگر کاوی نہیں عشق کی بنیاد ڈالی جائے گی
فصل گل آئی جنون اچھلا جلیل
اب طبیعت کیا سنبھالی جائے گی

بوئے لیلیٰ جو صبا لائی ہے دشت مجنوں میں بہار آئی ہے
باغ ہستی سے بہت دور تھے ہم بُو کسی گل کی لگا لائی ہے
داغ جو تم نے دیا ہے مجھ کو وہ چراغِ شب تنہائی ہے

دل چرانے کی ادا خاص ہوا کرتی ہے
دیکھ لیتے ہیں وہ دزدیدہ نظر سے پہلے
یار سے پردہ اٹھانے کو ابھی کیا کہئے
ہو بے دامن تو جدا دیدۂ تر سے پہلے
شام غربت کا فسانہ نہ ابھی چھیڑ اے دل
پوچھ لوں حالِ وطن بادِ سحر سے پہلے
کہہ گیا آج وہ بے درد گلے مل کے جلیل
ہم نہ واقف تھے ترے درد جگر سے پہلے

اس شان سے وہ آج پئے امتحاں چلے
فتنوں نے پاؤں چوم کے پوچھا ' کہاں چلے
جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے
جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے

اچھا ہے وہ جو مجھ کو پھراتے ہیں در بدر
آگاہ کر رہے ہیں محبت کی راہ سے

سیر چمن کو آپ گئے تھے یہ گُل کِھلا
پھولوں میں آگ لگ گئی برقِ نگاہ سے

اظہار حال پر مجھے قدرت نہیں رہی — آن کو یہ وہم ہے کہ محبت نہیں رہی
یا عمر بھر کا شوق تھا یا اک نگاہ میں — دیدار کی کلیم کو حسرت نہیں رہی

میں نے پوچھا تھا کہ ہے منزل مقصود کہاں — خضر نے راہ بتائی مجھے میخانے کی
مست کر دیتی ہے پہلے ھی نگاہِ ساقی — آنکھ کے سامنے چلتی نہیں پیمانے کی
بے خودی میں بھی یہی منہ سے نکلتا ہے جلیل
شیشے آباد رہیں خیر ہو میخانے کی

مست کرنا ہے تو خُم منہ سے لگا دے ساقی
تو پلائے گا کہاں تک مجھے پیمانے سے
پارسائی کا بہت کرتے تھے اظہار جلیل
جھومتے آج چلے آتے ہیں میخانے سے

وہ بھی آنے کو ہیں قیامت بھی — دیکھئے کون پیشتر آئے
دل کے داغوں کا ہے وہ رنگ جلیل
باغ جیسے بہار پر آئے

ہم تم ملے نہ تھے تو جدائی کا تھا ملال — اب یہ ملال ہے کہ تمنا نکل گئی

وہ پھر بھی حسن پہ اپنے غرور کرتے ہیں — یہ جانتے ہیں کہ ہے شام ہر سحر کے لئے
شب وصال گئی داغ دے کے فرقت کا — نیا یہ پھول کھلا دامن سحر کے لئے
جلیل دیدۂ خوں بار سے خدا سمجھے — لہو کی بوند نہ چھوڑی دل و جگر کے لئے

سینے سے میں لگائے ہوں تجھ کو خیال میں
او مست ناز کچھ تجھے اپنی خبر بھی ہے

دل کی خوشی یہ ہے کہ لڑے آنکھ یار سے
اس پر نظر نہیں کہ وہ جادو نظر بھی ہے
شوخی بھی ہے نگاہ میں شرم و حیا کے ساتھ
آنکھ اس کی پردہ دار بھی ہے پردہ در بھی ہے

خونِ میرا اگر شریک ہوا — رنگ دے جائے گی حنا تیری
عشق کا آج امتحاں ہے جلیل — مشکل آساں کرے خدا تیری

چھپنے والے تجھے خبر بھی ہے — نگہ شوق پردہ در بھی ہے
کچھ تو بے چین ہیں وہ شوخی سے — کچھ مری آہ کا اثر بھی ہے
ہے تماشا کہ دل فگاروں میں — نام قاتل کا چارہ گر بھی ہے

رات دل سے مرے اس درد کے نالے نکلے
گھر سے اپنے وہ کلیجے کو سنبھالے نکلے
پھر سر چرخ دھواں دھار گھٹائیں آئیں
پھر ہوا کھانے حسیں گیسوؤں والے نکلے
ناز و انداز نے تنہا انہیں چلنے نہ دیا
ساتھ سب گوشۂ دامن کو سنبھالے نکلے

پھر شوق تماشا لئے جاتا ہے کسی سمت — پھر ذوق طلب مجھ کو تماشا نہ بنادے

ہو مزہ تم جو اٹھا دو رخ روشن سے نقاب
شمع نازاں ہے کہ ہے رونق محفل مجھ سے
جذبۂ دل کا اثر ہو کے رہا آن پہ جلیل
اب تو ہوتے ہیں اشارے سرِ محفل مجھ سے

ہمیں کیا اے جنوں کانٹے جو دامن گیر ہوتے ہیں
نہ ہم رکھیں گے دامن کو نہ وہ الجھیں گے دامن سے

خدا جانے حقیقت کیا ہے لیکن میں یہ سنتا ہوں
آٹھے گا فتنۂ محشر تمہاری چشم پُر فن سے

عجب حوصلہ ہم نے غنچوں کا دیکھا تبسم پہ ساری جوانی لٹا دی

تھک کے بیٹھوں تو یہ کہتا ہے جنوں دو قدم کوچۂ رسوائی ہے

ناز بھی ہوتا رہے ہوتی رہے بیداد بھی
سب گوارا ہے جو تم سنتے رہو فریاد بھی
تم جو کہتے ہو بگڑ کر ہم نہ آئینگے کبھی
یہ بھی کہدو اب نہ آئیگی تمہاری یاد بھی

ادا ادا تیری موجِ شراب ہو کے رہی
نگاہ مست سے دنیا خراب ہو کے رہی
کسی میں تاب کہاں تھی کہ دیکھتا اُن کو
آٹھی نقاب تو حیرت نقاب ہو کے رہی
جلیل فصل بہاری کی دیکھئے تاثیر
گری جو بوند گھٹا سے شراب ہو کے رہی

چمن کے پھول بھی تیرے ہی خوشہ چیں نکلے
کسی میں رنگ ہے تیرا کسی میں بُو تیری

کہدو یہ کوھکن سے کہ مرنا نہیں کمال مر مر کے ہجر یار میں جینا کمال ہے

وہ آٹھے ' درد آٹھا ' حشر آٹھا مگر دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے

بیخود دہلوی

سید وحیدالدین احمد نام ' بیخود تخلص۔ خاص دہلی کے رہنے والے ہیں لیکن آپ کی ولادت ۳ رمضان المبارک ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء کو ریاست بھرت پور میں ہوئی جہاں آپکے اجداد ممتاز عہدوں پر فائز تھے۔ بیخود کے والد ماجد سید شمس الدین احمد بھی شاعر تھے اور سالم تخلص کرتے تھے۔ اُن کے پردادا نواب سید احمد میر خاں ملقب بہ امتیاز الدولہ افتخارالملک بہادر ' منصور جنگ عالمگیر ثانی کے وزیر تھے۔ اس لحاظ سے بیخود دلی کے ایک ایسے معزز و ممتاز گھرانے میں پیدا ہوئے جو اپنی وجاہت کے ساتھ ساتھ علم و فضل میں بھی بڑا معروف خاندان سمجھا جاتا تھا۔

بیخود پیدائش کے چند ماہ بعد اپنے آبائی وطن دہلی لائے گئے اور یہیں اُنہوں نے ہوش سنبھالا۔ بچپن میں قرآن کریم اور ابتدائی کتب متداولہ ختم کرنے کے بعد فارسی و اردو کی مزید تحصیل مولانا حالی مرحوم سے کی۔ اُنہیں کی صحبت میں اساتذۂ فن کے دواوین دیکھنے اور نکات شعری سمجھنے کا موقع ملا۔ اسی زمانہ میں اُنہیں شعر و سخن کا ذوق ہوا اور غزلیں کہنا شروع کیں۔ مولانا حالی مرحوم نے ان کے میلان طبع اور جودت کو دیکھ کر فصیح الملک داغ کی شاگردی کا مشورہ دیا چنانچہ مولانا موصوف کے مشورہ کے مطابق بیخود ۱۸۹۱ء میں حضرت داغ کے شاگرد ہوئے اور تقریباً چھ ماہ تک اُستاد کی خدمت میں بسلسلہ شاگردی حیدر آباد دکن میں حاضر رہے۔ پھر وطن واپس آئے اور چند سال کی مشق سخن میں اُستاد کے رنگ، کو ایسا اپنایا کہ اُن کا شمار حضرت داغ کے ارشد تلامذہ بلکہ جانشینوں میں ہونے لگا۔

بیخود نے چونکہ ایک باوقار گھرانے اور دہلی جیسے قدیم شہر میں آنکھ کھولی تھی اسلئے اُن کی تعلیم و تربیت میں پرانی روایات کا خاصا احترام و التزام برتا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہیں شعر و شاعری کے علاوہ فنون سپہ گری سے بھی خاصا شغف رہا۔ اور ساٹھ پینسٹھ برس کی عمر تک وہ کشتی اور سیر و شکار کے بڑے دلدادہ رہے۔ معاشی پریشانیوں سے گونہ سکون حاصل کرنے کے لئے بیخود نے انگریزوں کو اردو و فارسی پڑھانے کا مشغلہ اختیار کیا اور تقریباً ۳۲ سال تک یہ اُن کا ذریعہ معاش رہا۔ اس کے بعد پیرانہ سالی کے باعث

گوشہ نشینی اختیار کر لی ۔ طبعاً بڑے خلیق ' ملنسار ' زندہ دل اور پابند وضع انسان ہیں اور اب چونکہ بہت ضعیف ہو چکے ہیں اسلئے اپنے مٹیا محل والے مکان میں یاد الٰہی میں مشغول رہتے ہیں مشاعروں یا علمی مجالس وغیرہ میں بالکل شرکت نہیں کرتے ۔ البتہ حج بیت اللہ سے مشرف ہو چکے ہیں ۔

جہاں تک بیخود کے رنگ سخن کا تعلق ہے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ وہ اسلوب بیان میں اپنے اُستاد کے قدم بہ قدم چلتے ہیں ۔ خود داغ مرحوم ان کی زبان دانی اور مہارت فن کا اعتراف کیا کرتے تھے ۔ بیخود کی غزلوں میں دلی کی ٹکسالی زبان کا لطف آتا ہے ۔ وہ معمولی خیالات کو فصاحت روز مرہ کے ساتھ ایسے سلیقہ سے باندھتے ہیں کہ اُنکی خیال بندی کی داد دینی پڑتی ہے ۔ لیکن سچ پوچھئے تو موصوف اُنیسویں صدی کے دور آخر کے شاعر ہیں ۔ اُنہوں نے دھلی کی آخری بہار اور رامپور کا دربار دونوں دیکھے ہیں اور اُن کے کانوں میں وہی نغمے گونج رہے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ بیخود نے ابتدا میں اُستاد کے چونچلے اور شوخی کو زندہ رکھا لیکن عمر کے ساتھ یہ چیزیں بھی رخصت ہونے لگیں تو اُنہوں نے تصوف' محاورہ اور الفاظ کے اُلٹ پھیر پر اکتفا کی ۔ ظاہر ہے یہ خصوصیات بیسویں صدی کی تیزی سے بدلتی ہوئی اُردو شاعری کا ساتھ نہیں دے سکتی تھیں اور نہ محض ان کے بل بوتے پر تغزل میں کوئی جدت ' ندرت یا نکھار پیدا کیا جا سکتا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف کی پیرانہ سالی کے ساتھ اُن کی شاعری میں بھی بڑھاپا آتا گیا ۔ تا ہم حضرت بیخود ہماری شاعری کی ایک مجسم روایت اور اُن کا کلام ایک یادگار کی حیثیت رکھتا ہے ۔

بیخود صاحب کا مجموعہ کلام ''گفتار بیخود'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے جو تقریباً سات ہزار ابیات پر مشتمل ہے ۔ اُن کے اکثر اشعار میں زبان کی خوبیاں موجود ہیں ۔ شاگردان داغ میں بلا شبہ یہ خصوصیت زبان انہیں کے حصے میں آئی ہے کہ وہ سلیس و عام فہم زبان میں روز مرہ کی پابندی کو قابل تعریف حد تک نباھتے ہیں ۔ اُن کے اشعار میں سادگی ' بے ساختگی ' سوز و گداز اور دھلی کے اثر سے جا بجا چبھتی ہوئی باتیں بھی ملتی ہیں ۔ کہیں کہیں مقطع میں اُنہوں نے اپنے تخلص سے بھی فائدہ اُٹھایا ہے ۔

انتخاب کلام

دل کو پہلو میں اضطراب رہا   زندگی بھر یہی عذاب رہا
ہو لئے جس کے ہو لئے بیخود   یار اپنا تو یہ حساب رہا

وفا دیکھئے رنگ لاتی ہے کیا کیا   محبت ابھی گل کھلاتی ہے کیا کیا
تمنا سی شاطر نہ دیکھی نہ دیکھیں   تصور میں نقشے جماتی ہے کیا کیا
نہ دیکھا تھا جو بزم دشمن میں دیکھا   محبت تماشے دکھاتی ہے کیا کیا

نگاہ غیر کی جانب ' خطاب ہے مجھ سے تری قسم کا یقیں اب ضرور میں نے کیا

ٹوٹنے سے اور پیدا دل میں جوہر ہو گیا قیمتی شیشہ ہمارا بال پڑ کر ہو گیا
کیا اسی کا نام اُلفت ہے کہ جب دیکھا اُسے خود بخود اک جوش پیدا دل کے اندر ہو گیا
ناپ لیجے اپنے گیسو کی درازی قد سے آپ اب تو یہ فتنہ قیامت کے برابر ہو گیا
آنکھ کہتی ہے کہ اب برباد کرتے ہیں تجھے منہ سے یہ ارشاد ہے دل میں ترا گھر ہو گیا

نصیب داغ جگر لالہ زار میں بھی تھا فسردہ غنچۂ خاطر بہار میں بھی تھا
ہر ایک پھول میں اُسکی جھلک نظر آئی جمال یار کا پرتو بہار میں بھی تھا

رہا داغ اُن کا پسِ ترک اُلفت نہیں کھیل دل سے بھلانا کسی کا
رہے گی دھن میں زباں اپنے جب تک زباں پر رہے گا فسانہ کسی کا

غم میں ڈوبے ہی رہے دم نہ ہمارا نکلا بحر ہستی کا بہت دور کنارا نکلا
آگ بھر دی ہے محبت نے مری رگ رگ میں میرا تو خون بھی دوزخ کا شرارا نکلا

تم نے دیکھا شمع کے دل میں لگا دی جس نے آگ
عشق کا وہ شعلہ اس کمبخت پروانے میں تھا
بیخودِ میخوار کی دیکھی شرارت تو نے شیخ
صبح کو مسجد سے نکلا شب کو میخانے میں تھا

یہ دل کبھی نہ محبت میں کامیاب ہوا مجھے خراب کیا آپ بھی خراب ہوا

مدفن میں اپنی خاک سے آئی صدا مجھے میں نقش پائے یار ہوں لیکن مٹا ہوا

نکل کر آپ پردے سے ذرا باہر تو آ جائیں
قیامت میں جو کل ہوگا وہ اب کیا ہو نہیں سکتا

یہ جوش جنوں رنگ لانے لگا گریباں تک اب ہاتھ جانے لگا

حشر میں یہ انہیں نئی سوجھی بن گئے داد خواہ کیا کہنا

اب کے اگر رقیب سے وہ دل ستاں ملا
ہم دیں گے خاک میں تجھے اے آسماں ملا
ظالم کہیں وہی تو نہ تھا بیخود حزیں
تیری گلی میں کل ہمیں اک نیم جاں ملا

کس کا فسانہ تھا کہ چمن میں ہر ایک گل
سننے کے واسطے ہمہ تن گوش ہو گیا

تیشے سے کوئی کام نہ فرہاد سے ہوا جو کچھ ہوا وہ عشق کی امداد سے ہوا

درد سے آشنا نہ ہو جب تک آدمی کام کا نہیں ہوتا

مرنا فراقِ یار میں دشوار ہو گیا پاس وفا بھی جان کا آزار ہو گیا

بندہ پرور غم فرقت کا اثر دیکھ لیا داغ دل دیکھ لیا داغ جگر دیکھ لیا

دل ملا کر وہ بے وفا نہ ملا دل لگانے کا کچھ سزا نہ ملا

نئی یہ بات دیکھی ہم نے اس کے راز داروں میں
جنہیں آگاہ کچھ سمجھا انہیں کو بے خبر پایا

مٹا دی مٹ کے داغ آرزو نے عشق کی دولت
کوئی دن اور رہ جاتا تو یہ دل کو بنا جاتا

اُس کی نگاہ ناز کبھی چوکتی نہیں کرتی نہیں خطا یہ کبھی تیر کی طرح
بیخود فراق یار میں آئی نہ موت بھی کمبخت یہ بھی ٹال گئی دے گئی طرح

مل جائے وہ تو اُسکی بلائیں ضرور لوں میں ڈھونڈنے چلا ہوں دعا کو اثر کے بعد
نکلی یہ جان یا کوئی کانٹا نکل گیا راحت ملی ہے آج مجھے عمر بھر کے بعد
پیش آئیں راہِ عشق میں وہ سخت منزلیں رہزن کی ہے تلاش مجھے راہبر کے بعد

کیا ہے عرض جو کچھ وہ رہیگا دیکھنا ہو کر
تمہاری بزم سے اُٹھے ہیں ہم دست دعا ہو کر
وہ میری التجا ' میری خوشامد ' میری مایوسی
وہ مجبوری سے اُن کا مسکرا دینا خفا ہو کر
مٹایا نقش پا کی طرح اُس نے میری ہستی کو
ہمیشہ جس کے قدموں میں رہا رنگِ حنا ہو کر
ہمیں معنی تو سمجھا دے ذرا بیخود کے اے بیخود
یہ تو نے نام کیا رکھا ہے اپنا پارسا ہو کر

مٹ گیا غم ہستی اُس پہ مبتلا ہو کر
عشق نے اثر بخشا درد کی دوا ہو کر

بگڑنا اُس کا غصہ میں بھی شوخی سے نہیں خالی
مزے کی بات کہہ جاتا ہے ظالم بے مزا ہو کر

عشق کی کدورت نے صاف کر دیا دل کو
آئینہ کو چمکایا زنگ نے جلا ہو کر

عشق میں ویراں سا ویراں تھا یادش بخیر
مجھ کو دل یاد آگیا سونا بیاباں دیکھ کر

اس گلشن ہستی میں لگتا نہیں دل اپنا آئے ہیں خدا جانے ہم کس سے جدا ہو کر

خدا وقت ایسا نہ ڈالے کسی پر اجل بھی تو روئی مری بے کسی پر
نہیں لگتی دم بھر کی بھی دیر بیخود برا وقت آتے ہوئے آدمی پر

زباں اُستاد کی بیخود تو ہو مضمون مومن کا
بیاں غالب کا ہو اشعار کی یہ شان پیدا کر

زمانہ حضرت بیخود کبھی یکساں نہیں رہتا
کہیں گزرے ہے دنیا میں کسی کی ایک حالت پر
نظر کرتا ہوں میں گزری ہوئی جب اپنی حالت پر
مرے آنسو ٹپک پڑتے ہیں دشمن کی مصیبت پر
وطن کو چھوڑ کر میری طرح کیا یہ بھی نکلی ہے
اداسی کس قدر چھائی ہوئی ہے شامِ غربت پر

مدت ہوئی ہے یار کا دیکھے ہوئے جمال
لیکن گئی نہیں مری خود رفتگی ہنوز

کیوں خضر کے پیرو ہوں تری راہ طلب میں
آوارۂ و گم کردۂ منزل تو نہیں ہم

برق کا گرنا سنا ، صیّاد کا کہنا سنو
چار تنکوں کا اجڑنا داستاں ہوتا نہیں
ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے یہ اُس کے عشق کا
مر گیا ہوں اور مرنے کا گماں ہوتا نہیں

جاتے ہی اُن کے گویا کچھ بھی نہ تھا چمن میں
جوشِ بہار گل کو پامال کر گئے ہیں

کچھ حوصلے ہی پست بہت آدمی کے ہیں
ورنہ ہر اک نگاہ میں جلوے آسی کے ہیں

غم الفت سے دل لاکھوں پریشاں ہوتے جاتے ہیں
یہ گھر آباد ہو جانے سے ویراں ہوتے جاتے ہیں
نہ دیکھے ہوں گے رند لاآبالی تم نے بیخود سے
کہ ایسے لوگ اب آنکھوں سے پنہاں ہوتے جاتے ہیں

گریباں ڈھونڈتے ہیں ہاتھ میرا چمن میں پھول کھل جانے کے دن ہیں

نہ لینا نام دلی کا ہمارے سامنے بیخود
اسی اجڑے ہوئے گلشن کے ہم بھی رہنے والے ہیں

پوچھئے خارِ تمنّا کی خلش کو دل سے
یہ وہ کانٹے ہیں کھٹکنے میں مزا دیتے ہیں

کر دیا خاک مجھے تو نے جلا کر اے دل
جھونک دوں تجھکو دھکتے ہوئے انگاروں میں

بجھائیں شمع کے دل کی لگی پروانے جب جانیں
یہ اپنی آگ میں جلتے ہیں تو کیا گل کترتے ہیں

دعائے با اثر پیدا کروں گا توڑ کر دل کو
دوا اے درد دل مل جائے گی ٹوٹے ہوئے دل میں

نیاز عشق و ناز حسن کی تصویر کھینچی ہے
ہمارے ہاتھ پر دل ہو تمہارا ہاتھ دل پر ہو

زباں استاد کی بیخود ترے حصے میں آئی ہے
پھر اتنا بھی نہیں کوئی خدا رکھے ترے دم کو

وعدے کا ذکر ' وصل کا ایما ' وفا کا قول
یہ سب فریب ہیں دل شیدا کے واسطے
اے ضبط گریہ خاک میں مل جائے کاش تو
آنکھیں ترس گئیں مری دریا کے واسطے
وحشت یہ کہہ رہی ہے دل داغ دار کی
اس باغ کی بہار ہے صحرا کے واسطے
مایوس آرزو بھی ہوں مانوس یاس بھی
دل میں جگہ نہیں ہے تمنّا کے واسطے

جس میں وہ جلوہ نما تھا دل شیدا ہے وہی
ہم سے پردہ ہے مگر محمل لیلا ہے وہی
جو نکل جائے تمنا نہیں کہتے اسکو
جو کھٹکتی رہے پہلو میں تمنا ہے وہی
لے چلے دل میں ترا داغ محبت والے
جان دے کر جو خریدا ہے یہ سودا ہے وہی
عشق کو حسن سے بڑھ کر ہے زمانے میں قیام
گل تو دو دن نہ رہا بلبل شیدا ہے وہی
نام بیخود ہے تو بے خوار بھی ہوگا وہ ضرور
پارسا ہم تو سمجھتے نہیں کہتا ہے وہی

جس سے مہک رہا ہے باغ جناں وہ تُو ہے
پھولوں کو کون سونگھے ان میں خودی کی بُو ہے

نشانی ہم نے رکھ چھوڑی ہے اِک اگلی بہاراں کی
بہار آئی گلے میں ڈال لی دھجی گریباں کی

الٰہی گل پہ کیا گزری چمن میں ؛ کہ پکڑی شکل پھر اُس نے کلی کی

اگر تخم محبت باغباں گلشن میں بو دیتا ؛ بجائے برگ گل شعلے نکلتے شاخساروں سے

مرے افسانۂ دل سے زمانہ ہو گیا واقف
بہت اب شمع سے کھٹکا ہوا پروانہ رہتا ہے

نگاہ شرم میں پیدا شرارت ہوتی جاتی ہے
تری اٹھتی جوانی اب قیامت ہوتی جاتی ہے

بے تاب ہوں کیا چیز چرا لی ہے نظر نے
ہونے کو تو دل بھی ہے مرے پاس جگر بھی

تم کہتے ہو دل میں نہ کوئی میرے سوا ہو
کیا ٹال دوں اُس کو بھی محبت اگر آئے ؟

درد دل میں کمی نہ ہو جائے ؛ دوستی دشمنی نہ ہو جائے
اپنی خُوئے وفا سے ڈرتا ہوں ؛ عاشقی بندگی نہ ہو جائے
بیٹھتا ہے ہمیشہ رندوں میں ؛ کہیں زاھد ولی نہ ہو جائے

سائل دہلوی

ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں نام سائل تخلص ۱۸۶۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے ۔ اُن کا تاریخی نام ''مرزا سراج الدین'' مرزا غالب نے نکالا تھا اور تخلص ' نواب غلام حسین خاں محمود شاگرد مرزا غالب نے قرعہ اندازی کے بعد رکھا تھا ۔ سائل صاحب نوابان لوہارو کے چشم و چراغ تھے ۔ صرف اسی نسبت سے اُن کے خاندانی وقار ' علمی فضل و کمال اور ادبی دلچسپیوں کا کافی اندازہ ہو سکتا ہے ۔ نواب الٰہی بخش خاں معروف اور نواب مرزا خاں داغ اس خاندان میں نامور شعرا گزرے ہیں ۔ مرزا غالب کو بھی اس سے نسبتی تعلق ہے ۔ اس کے علاوہ سائل کے جدا مجد نواب ضیاءالدین احمد خاں رخشاں ونیر ' اُن کے والد بزرگوار نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب اور عم محترم نواب سعید الدین احمد خاں طالب ' دہلی و لوہارو کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے ۔

سائل نواب مرزا خاں داغ دہلوی کے داماد اور انہیں کے شاگرد رشید تھے اور حسن صورت و وجاہت شخصی کے ساتھ وضعداری ' اخلاق اور خلوص کی صفات سے متصف تھے ۔ نہایت شگفتہ طبیعت پائی تھی ۔ زبان دانی تو گویا اُنہیں ترکہ میں ملی تھی ۔ چنانچہ داغ کے بعد اردوئے معلیٰ کے انے گنے نام لیوا بزرگوں میں انہیں کا دم غنیمت تھا ۔ عربی ' فارسی ' سنسکرت ' علم عروض اور طب میں کافی واقفیت رکھتے تھے ۔ اُنہوں نے اپنے ایک شعر میں فصیح الملک داغ دہلوی کے تلمذ کا ذکر کیا ہے ۔

ظہیر و ارشد و غالب کا ہوں جگر گوشہ
جناب داغ کا تلمیذ و یادگار ہوں میں

سائل کی زبان کا کیا پوچھنا ——— پرانی دہلی کی شستہ و رفتہ زبان کا مکمل نمونہ ہے ۔ نہ کبھی ثقیل الفاظ زبان پر لاتے ہیں نہ بے لطف ترکیبیں ۔ اسی لئے روانی و لطافت میں کمی نہیں پیدا ہوتی ۔ پھر موصوف کو محاورات پر جتنا عبور ہے شاید بہت کم لوگوں کو ہوگا ۔ پھر اُن محاوروں کا با محل استعمال مصرعوں کو اور بھی مزے دار بنا دیتا ہے ۔ سائل کو جملہ اصناف سخن پر قدرت حاصل تھی مگر وہ غزل کے مسلم الثبوت اُستاد تھے ۔

ان کا کلام دلی کی شاعری کا بہترین نمونہ ہے ' معاملہ بندی ' محاورہ کی خوبی ' روز مرہ کی گھلاوٹ سلاست و روانی ان کے کلام کی خصوصیات ہیں ۔ ان کی غزل حدود غزل سے باہر نہیں نکلی یہی وجہ ہے کہ حسن وعشق کے علاوہ فلسفہ و تصوف کے مضامین کو اس میں دخل نہیں ۔ ان کے کلام میں شوخی و شگفتگی عجیب لطافت پیدا کر دیتی ہے ۔ مبتذل و عامیانہ مضامین سے ان کی بیشتر غزلیں پاک ہیں البتہ کہیں کہیں ایسے الفاظ ضرور استعمال ہوئے ہیں جو اکثر عوام ہی کی زبان سے سنے جاتے ہیں ۔

سائل حکیم مومن خاں مومن کی طرح مقطع میں اپنا تخلص خوب کھپاتے ہیں جس سے مقطع و تخلص دونوں میں جان پڑ جاتی ہے ۔

سائل آخر دم تک محلہ لال کنواں دھلی میں مقیم رہے اور آخر ۱۰ ستمبر ۱۹۴۵ء میں وہیں انتقال کیا ۔

سائل مرحوم کے کلام کی ضخامت اتنی ہے کہ کئی دیوان تیار ہو سکتے ہیں مگر ہنوز کتابی صورت میں شائع نہیں ہوا ہے ۔

انتخاب کلام

سائل تمہارے شعر کی تعریف کیا کریں
مضموں جو آیا ذہن میں سانچے میں ڈھل گیا

اهل محشر دیکھ لوں قاتل کو تو پہچان لوں
بھولی بھالی شکل تھی اور کچھ بھلا سا نام تھا
محتسب تسبیح کے دانوں پہ یہ گنتا رہا
کن نے پی' کن نے نہ پی' کن کن کے آگے جام تھا

همیشه خون دل رویا هوں میں لیکن سلیقے سے
نہ قطرہ آستیں پر ہے '، نہ دھبا جیب و دامن پر

تیغ نہ تھی ادا تو تھی ' نیّت قتل کیوں پھری
میں نے یہ کب کہا کہ یوں ' میں نے نہیں کہا کہ یوں

اس خطر سے سارے پیراهن کی کر دیں دھجیاں
اشک خوں دامن پہ میرے ' داغ رسوائی نہ ہو

عارض بھی سرخ سرخ ھیں لب لال لال بھی
شان جمال بھی ھے نمایاں جلال بھی
توبہ بھی کرنی پڑتی ھے پی کر اسے مدام
نام اس کا مے بھی ھے عرق انفعال بھی

ھمیں کہتی ھے دنیا زخم دل زخم جگر والے
ذرا تم بھی تو دیکھو ، تم بھی ھو آخر نظر والے

نغمۂ بلبل عجب اک دلگداز آواز ھے
اب یہ صاحب دل سمجھ لیں سوز ھے یا ساز ھے

پروانے سٹ رھے ھیں تری شمع بزم پر
یہ انجمن اک اور تری انجمن میں ھے

ایک گلشن میں ھے ، اک خانۂ صیاد میں قید
گل و بلبل کو میسر نہیں یکجائی بھی

ھوا ھوں اشک ندامت سے پاک دامن میں
یہ پانی وہ ھے کہ داغ گناہ دھوتا ھے

چارہ گر دل کہیں دیتا تو سمجھتا یہ بات
ھچکیاں ھیں کہ یہ آواز شکست دل ھے

فقرے ، فریب دے کے دل مبتلا لیا
مجھ کو غریب جان کے تم نے بنا لیا

بقدر ظرف پلاتا ھے یا بقدر زر
یہ کیوں لگائے ھیں ساقی خطوط ساغر میں

دم رخصت مجھے تم یہ تو بتاتے جاتے
دم رکا جاتا ہے کیوں سینے میں آتے جاتے

پھر ذوق دید یار نے مجبور کر دیا
پھر رہگزار یار کا میں پاسباں ہوا

جس قدر صدمے مرے دل پہ گزر جاتے ہیں
دشمنوں پر یہ گزر جائیں تو مر جاتے ہیں
آہ کرتا ہوں تو آتے ہیں پسینے ان کو
نالہ کرتا ہوں تو راتوں کو وہ ڈر جاتے ہیں
کھل گئی شمع تری ساری کرامات جہاں
دیکھ پروانے کدھر تول کے پر جاتے ہیں

تکلیف انتظار عبث جام کے لئے
بوتل کو توڑ ڈالئے پیمانہ ہو گیا
دو چار مل کے بیٹھ گئے بزم عیش میں
دو چار خم لنڈھا دئے میخانہ ہو گیا
موسیٰ کی طرح مجھ سے بھی ہو جاؤ بے حجاب
تم جاننا اک اور بھی دیوانہ ہو گیا

ہنسی دل لگی سہ جبیں ہو چکی — نہیں اب نہ کہنا نہیں ہو چکی
سنا ہے ترے خیر مقدم کی عید — کہیں آج ہے کل کہیں ہو چکی
مری آہ سے آسماں ہل چکا — مرے اشک سے شق زمیں ہو چکی
ہوئی عشق کی بات ازل ہی میں طے — وہیں ہونیوالی وہیں ہو چکی
جوانی میں بچپن کی شوخی کہاں — طبیعت حلیم و متیں ہو چکی
مکرر گذارش پہ بولا وہ شوخ — نہیں کہہ دیا بس نہیں ہو چکی
نہ سائل کا رد کیجئے گا سوال
خدا کیلئے اب نہیں ہو چکی

اس کو کہتے ہیں قناعت قول یہ سائل کا ہے
گوہر شہوار تبخالہ لبِ ساحل کا ہے

آپ یہ سمجھے کہ گویا تیر مارا آپ نے
ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ جذبہ ہمارے دل کا ہے

دوستوں کی اشک شوئی سے مجھے کیا فائدہ
اُن کو آنکھوں کی پڑی ہے مجھکو رونا دل کا ہے

قصد اُلفت کر رہا ہوں ترک اُلفت کر کے میں
پھر مرے دل میں خیال اک سعئی لا حاصل کا ہے

فکر اُس کے زاد رہ کی چاہئے سائل مجھے
وہ جو باقی مرحلہ اک دور کی منزل کا ہے

وفا کا بندہ ہوں الفت کا پاسدار ہوں میں
حریف قمری و پروانہ و ہزار ہوں میں

چمن میں حسن کے ہم نغمۂ ہزار ہوں میں
ادا سے تیر لگاوے کوئی شکار ہوں میں

جدا جدا نظر آتی ہے جلوہ کی تاثیر
قرار ہو گیا موسیٰ کو بے قرار ہوں میں

خمار جس سے نہ واقف ہو وہ سرور ہیں آپ
سرور جس سے نہ آگہ ہو وہ خمار ہوں میں

سما گیا ہے یہ سودا عجیب سر میں مرے
کرم کا اہلِ ستم سے اُمیدوار ہوں میں

عوض دوا کے دعا دے گیا طبیب مجھے
کہا جو میں نے غم ہجر سے دو چار ہوں میں

شباب کر دیا میرا تباہ الفت نے
خزاں کے ہاتھ کی بوئی ہوئی بہار ہوں میں

قرار داد گریباں ہوئی یہ دامن سے
کہ پرزے پرزے اگر ہو تو تار تار ہوں میں

مرے مزار کو سمجھا نہ جائے ایک مزار
ہزار حسرت و ارماں کا خود مزار ہوں میں

(ق) رفیق کرتے ہیں ایزاد کیوں تخلص پر
ہنر کو چھوڑ کے نسبت سے با وقار ہوں میں
ظہیر و ارشد و غالب کا ہوں جگر گوشہ
جناب داغ کا تلمیذ و یاد گار ہوں میں
امیر کرتے ہیں عزت مری ہوں وہ سائل
گلوں کے پہلو میں رہتا ہوں ایسا خار ہوں میں

فصل گل اب آ گئی وحشت کا ساماں دیکھئے
سنگِ طفلاں دیکھئے خارِ مغیلاں دیکھئے
اشک خونیں کی بہاریں نوکِ ناخن دیکھئے
دیکھنا ہے آپ کو میرا گریباں دیکھئے
دعوئ آہن گدازی گر مرا باور نہیں
تیر کچھ دل میں چبھو کر اُن کے پیکاں دیکھئے
کیوں کسی سے پوچھئے خستہ سری کا ماجرا
قفل کھلوا کر در و دیوار زنداں دیکھئے
غرّہ اہل ورع کو دیکھئے گا تا کجا!
اب گنہگاروں کا رنگ شرم و عصیاں دیکھئے
ایک ساں ہیں جوہر اہل سکوں و اہل درد
صوتِ بلبل ، نگہت گل کو پریشاں دیکھئے
ناخنوں سے ملتمس ہوں توڑ کر تار نفس
کار فرمائے جنوں نبضِ رگِ جاں دیکھئے
جائیے آسیب ہستی سے آسی کو مطمئن
ذرہ ذرہ خاک کا جس کی پریشاں دیکھئے
کھل گیا غنچہ کا جامہ پھٹ گیا بلبل کا دل
آ گیا عہد درازی گریباں دیکھئے
جامہ زیبی ختم ہے سودا ئیان عشق پر
اختصار دامن و طول گریباں دیکھئے
ضامن[1] و گلشن[2] کے در کو جھانک کر سائل بخیر
نوح[3] کے اشعار کا پر جوش طوفاں دیکھئے

1 پروفیسر سید ضامن علی ضامن 2 دیوان رادھے ناتھ گلشن 3 نوح ناروی

همیشہ پی کے مے، جام و صراحی توڑ دیتا ہوں
نہ میرا دل ترستا ہے، نہ فرق آتا ہے ایماں میں

سنا بھی کبھی ماجرا درد و غم کا کسی دل چلے کی زبانی، کہو تو
نکل آئیں آنسو کلیجہ پکڑ لو، کروں عرض اپنی کہانی، کہو تو
تمہیں رنگ مے شیخ مرغوب کیا ہے، گلابی ہو یا زعفرانی، کہو تو
پلائے کوئی ساقئی حور پیکر، مصفّا، کشیدہ، پرانی، کہو تو
وفا پیشہ عاشق نہیں دیکھا تم نے، مجھے دیکھ لو، جانچ لو، آزما لو
تمہارے اشارے پہ قربان کردوں ابھی، یہ زندگانی، کہو تو

ملے غیروں سے، مجھ سے رنج، غم یوں بھی ہے اور یوں بھی
وفا دشمن، جفا جو کا ستم یوں بھی ہے اور یوں بھی
تم آؤ مرگِ شادی ہے، نہ آؤ مرگِ ناکامی
نظر میں اب رہ ملک عدم یوں بھی ہے اور یوں بھی
مجھے باور ہے تم جھوٹے نہیں، وعدے کے سچے ہو
قسم کیوں کھاؤ، ناجائز قسم یوں بھی ہے اور یوں بھی
تجھے نواب بھی کہتے ہیں، شاعر بھی سمجھتے ہیں
زمانے میں تیرا سائل بھرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

صفی لکھنوی

سید علی نقوی زیدی نام ، صفی تخلص ''لسان القوم'' خطاب ۲ جنوری ۱۸۶۲ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے ۔ سلسلۂ نسب زیدالشہید بن حضرت امام زین العابدین بن حضرت امام حسین علیہ السلام پر منتہی ہوتا ہے ۔ مورث اعلیٰ سید نورالدین شاہ مبارک زیدی بن سلطان شمس الدین ایلتمش غزنی سے آ کر دہلی میں سکونت پذیر ہوئے ۔ لیکن پردادا احسان علی دہلی سے فیض آباد چلے گئے ۔ والد سید فضل حسین ، نواب امجد علی شاہ کے شاہزادہ ولیعہد مرزا سلیمان قدر کے اتالیق مقرر ہوئے ۔

صفی کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی اور انہوں نے دس بارہ سال کے سن تک مولوی نجم الدین کاکوروی اور شیخ حافظ علی سے درسیات فارسی و عربی کی تکمیل کی ۔ پھر علوم معقول و منقول کا استفادہ مولوی احمد علی اور اپنے چچا سید محمد حسین صاحب سے کیا ۔ اس دوران میں کیننگ کالیجیٹ اسکول لکھنؤ سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا ۔ ۱۸۸۳ء سے سرکاری ملازمت اختیار کی اور محکمۂ دیوانی میں مختلف عہدوں پر چالیس سال تک کام کرنے کے بعد ۱۹۲۱ء میں پنشن ملی ۔ اور گوشہ نشینی اختیار کر کے جب تک جیتے رہے حتی الوسع اردو ادب کی خدمت کرتے رہے ۔ افسوس کہ ۱۹۵۰ء میں ''بزم لکھنؤ'' کی یہ آخری شمع بھی بجھ گئی ۔

صفی کی ذات ان مبارک ہستیوں میں سے تھی جنہوں نے لکھنؤ کی اردو شاعری کا رخ بدلا اور غزل کے لئے نئی عمارت تیار کی ۔ انہیں شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا لیکن تلمذ کسی سے نہ تھا ۔ انہوں نے اپنے ہی وجدان و ذوق شعری کی رہنمائی میں اس فن میں ترقی کی اور ترقی بھی ایسی کہ بہت جلد صفی کا شمار لکھنؤ کے ممتاز شعرا میں ہونے لگا ۔ صفی نکات عروض اور حقائق فن سے بخوبی واقف تھے اور تمام اصناف سخن پر پوری قدرت رکھتے تھے ۔ غزل ، قصیدہ ، سلام ، نوحہ ، مرثیہ ، رباعی ، مثنوی اور قومی و تاریخی نظمیں سب کچھ لکھا ہے ۔ لیکن ان کے کلام کو خصوصیت کے ساتھ دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اول غزلیات دوئم منظومات ۔

جہاں تک غزل کا تعلق ہے صفی نے لکھنؤ کے بجائے شعرائے دھلی کا اتباع کیا ہے۔ عاشقانہ مضامین بڑی صفائی اور پر زور انداز میں نظم کرنے کا آنہیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ اور خیال و بیان کی سادگی وہ جوہر ہے جس نے صفی کی غزل کو ایک امتیازی شان بخشی ہے۔ زبان پر تو آنہیں اهل زبان ہونے کی حیثیت سے مکمل عبور حاصل تھا مگر آنہوں نے عاشقانہ مضامین کو جیسی سادہ و سلیس زبان میں روز مرہ کی چاشنی دے کر پیش کیا ہے وہ آنہیں کا حصہ تھا۔ محاورات و تشبیہات کا برمحل اور خوبصورت تراکیب کا نہایت جاذب نظر استعمال صفی صاحب سے خوب بن پڑتا تھا۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ ترکیبوں کو مصرعوں کے سانچوں میں ڈھالتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والے کو کبھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ شعر میں قصداً لائی گئی ہیں۔ صفی مرحوم نے مغربی خیالات کو آردو میں سمو کر اپنے کلام میں نہ صرف ندرت سے کام لیا ہے بلکہ آردو ادب میں خیالات کا اضافہ بھی کیا ہے وہ عصر حاضر کے گونا گوں مسائل زندگی کو اپنی غزلوں میں اس خوبصورتی سے نظم کرتے ہیں کہ وہ نہ تو اجنبی محسوس ہوتے ہیں نہ غزل کی زبان و بیان پر بار ھی معلوم ہوتے ہیں۔ آن کے تغزل کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ آنہوں نے نہ کبھی رقیب کا تذکرہ کیا ہے نہ شیخ و برھمن پر پھبتیاں کسی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آن کی غزلوں میں عصر حاضر کے مذاق شعری سے بڑی حد تک مناسبت پیدا ہو گئی ہے۔ اور آن کا کلام ابتذال و رکاکت سے بالکل محفوظ ہو گیا ہے۔

تاہم تغزل کی ان گونا گوں صفات سے متصف ہونے کے باوجود غزل صفی کا اصل رنگ نہیں ہے۔ بلکہ آن کی طبیعت کو نظموں سے زیادہ لگاؤ تھا۔ آن کی نظم نگاری ایک مخصوص رنگ کی حامل ہے۔ جس کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت دلکشی ہے۔ صفی نے نظمیں لکھتے وقت اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا ہے کہ دلکشی کہیں ہاتھ سے نہ جانے پائے تاکہ پڑھنے والے کے ذھن پر بار نہ ہو۔ آن کے شگفتہ بیانات اور اچھوتی تشبیہات میں ایک عجیب حسن پایا جاتا ہے۔ آن کے دل میں حب‌الوطنی کا جو بے پناہ جذبہ پوشیدہ تھا اس کا اظہار آنہوں نے قومی نظموں کی شکل میں کیا ہے۔ اور آن کی یہ قومی نظمیں درد ناک بھی ہیں اور سبق آموز بھی۔ مولانا صفی کی بیانیہ شاعری کے سلسلے میں وہ نظمیں قابل ذکر ہیں جن میں شہروں کے تاریخی مقامات کا بیان اور معروف عمارتوں کا تذکرہ ہے اس ضمن میں الہ آباد ' بمبئی ' جونپور وغیرہ کے متعلق آن کی نظمیں شاہکار ہیں۔ اور آنہوں نے یہ نظمیں جس لطیف و دلکش انداز میں لکھی ہیں وہ بے مثل ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان مقامات کی ہو بہو تصویر کھینچ دی ہے۔ ان طولانی نظموں کی بد مزگی دور کرنے کے لئے جہاں کہیں صفی نے تغزل کا رنگ پیدا کیا ہے وہاں پڑھنے یا سننے والے کی زبان سے بے ساختہ تحسین و آفرین کے کلمات نکل جاتے ہیں بعض جگہ آنہوں نے ایسے مواقع پر مزاح سے بھی کام لیا ہے لیکن اس طرح کہ نظموں کی متانت و سنجیدگی کو ٹھیس نہیں لگنے پاتی اور شگفتگی میں خاصا اضافہ ہو جاتا ہے۔

مولانا صفی کی اکثر بیانیہ نظمیں چھپ بھی چکی ہیں اور ان کا ایک مجموعہ ''لخت جگر'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ تاہم اب تک صفی صاحب کا مجموعی کلام

شائع نہیں ہوا تھا جس کی کمی کا لکھنؤ کے ارباب علم و ذوق کو احساس ہوا اور سنا ہے کہ حال ہی میں اُن کا مجموعہ کلام مسعود حسن صاحب ادیب ، آل احمد سرور صاحب اور احتشام حسین صاحب کے مقدمات کے ساتھ شائع ہوا ہے ۔

مولانا صفی کی ایک مثنوی '' تنظیم الحیات '' ہے جو '' اکانومی آف ہیومن لائف '' کا ترجمہ ہے ۔ یہ مثنوی چھپ چکی ہے اور ہندوستان اکیڈمی نے اس پر مولانا کو پانچ سو روپیہ کا انعام بھی دیا تھا ۔

انتخاب کلام

غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا   ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا
کوئی سیکھ لے دل کی بے تابیوں سے   ہر انجام میں رنگ آغاز دینا

دیکھ لوں دور سے تصویر شباب رفتہ
رخ ادھر بھی کبھی اے عمرِ گریزاں کرنا
دمِ تعمیر صد افسوس نہ سمجھے یہ صفی
گھر کا آباد ہی کرنا تو ہے ویراں کرنا

اے حسن ، اے مجسمۂ رحمت خدا   کافر ہے وہ جسے کہ ترا آسرا نہیں
ہے اختلاف وحدت و کثرت نمائشی   دریا سے موج ، موج سے دریا جدا نہیں
جو دل کہ معتقد نہ ہو اعجاز حسن کا   دنیا میں کوئی اُس سے زیادہ برا نہیں
حسن مجاز چشم حقیقت پسند میں
خوشرنگ ہے ضرور مگر دیرپا نہیں

دنیا کا ورق بنیش ارباب نظر میں   اک تاش کا پتہ ہے کفِ شعبدہ گر میں
کرتی ہے گریبانِ سحر کو شفق آلود   ڈوبی ہوئی اک آہ رسا رنگ اثر میں
پابند نہیں جلوہ آزاد مکاں کا   یکساں ہے صفی دیر و حرم اپنی نظر میں

دیکھتے کیوں ! کوئی تربت ہوگی   دیکھ کر اور ندامت ہوگی
دل میں رہ رہ کے کھٹک ہوتی ہے   خلش درد محبت ہوگی

دل میں رکھیں تو کدورت کہلائے منہ سے : نکلے تو شکایت ہوگی
زہر ہے زہر صفی آب حیات
زندگی بڑھ کے مصیبت ہوگی

الہی زندگی کیا ' موت کیا ' بیمارِ ہجراں کی
پریشاں خواب وہ ' تعبیر یہ خواب پریشاں کی
وہ کیوں در پردہ میرے چاک پیراہن پہ ہنستے ہیں
ذرا آئینہ لانا دیکھ لوں صورت گریباں کی
صفی حکم رہائی مل چکا پھر کیوں توقف ہے
مگر زنداں سے کنجی کھو گئی ہے قفل زنداں کی

بلبلیں شور مچائیں نہ چمن میں کہدو
بسترِ گل پہ کوئی خوابِ گہِ ناز میں ہے
کوئی آزاد ہے لذّت کشِ گلگشتِ چمن
کوئی محبوس قفس حسرت پرواز میں ہے
دیکھ یوں تھک کے نہ بیٹھ اے دلِ حسرت انجام
قدم سعی ابھی سرحدِ آغاز میں ہے
کہنے یہ رمز و کنایات کوئی کیا سمجھے
اُن کی جو بات ہے وہ سلسلہ' راز میں ہے

دیں بھی جوابِ خط کہ نہ دیں کیا خبر مجھے
کیوں اپنے ساتھ لے نہ گیا نامہ بر مجھے
سرمہ ہیں چشمِ دل کے لئے تلخ تجربے
پیری نے کر دیا ہے وسیع النظر مجھے
دو دن کی زندگی میں قویٰ نے دیا جواب
افسوس کام کے نہ ملے ہم سفر مجھے
دل دے دیا صفی مگر اس کی خبر نہ تھی
پینا پڑے گا ہجر میں خونِ جگر مجھے

دل جب نہ پریشاں ہو جمعیت ساماں ہے
ہر غنچہ نورس کی مٹھی میں گلستاں ہے
آ کر جو نہیں جاتی وہ ہے شب تنہائی
جا کر جو نہیں آتی وہ عمرِ گریزاں ہے

سیر گلشن دیکھئے ، سیر بیاباں دیکھئے
دل ہو قابو میں تو سب کچھ دیکھئے ہاں دیکھئے
اپنی اپنی گا رہے ہیں دونوں شیخ و برہمن
طے بھی ہوتی ہے یہ بحثِ کفر و ایماں دیکھئے
دیر اسی کو جانئے کعبہ اسی کو مانئے
پوجئے وہ دل جسے ہمدردِ انساں دیکھئے
تا کجا سر مستئ نظارۂ باغ و بہار
چشم عبرت سے ذرا گورِ غریباں دیکھئے
مہر بر لب دیکھئے محفل کی محفل زیر خاک
بیکسی کو ان خزانوں کی نگہباں دیکھئے
حال اپنا اب یہ ہے بیداریٔ احساس سے
سوتے سوتے جس طرح خواب پریشاں دیکھئے
انقلابات جہاں کی فکر ہی کیا ہے صفی
جو دکھائے گردشِ گردونِ گرداں دیکھئے

دل کے اجزائے پریشاں کو حقارت سے نہ دیکھ
کہیں صدیوں میں یہ سرمایہ بہم ہوتا ہے

کل ہم آئینے میں رخ کی جھرّیاں دیکھا کئے
کاروانِ عمرِ رفتہ کے نشاں دیکھا کئے

جون پور (نظم)

جونپور ! اے مولدِ سلطان عادل شیر شاہ
تیرے آثار قدیمہ تیری عظمت پر گواہ
کہہ رہا ہے قلعۂ شاہی یہ با حال تباہ
مدتوں تک ہند کی ہم بھی رہے ہیں تخت گاہ
ایک غافل قوم کی کھوئی ہوئی عظمت ہیں ہم
ہم سے عبرت کا سبق لو منظر عبرت ہیں ہم

جونپور ارباب علم و فضل کا دارالسرور
کہتے تھے شیرازِ ہند اکثر تجھے اہلِ شعور
تجھ میں تھے شاہانِ شرق کے عمارات و قصور
خود تری تاریخ آبادی ہے شہر جونپور
اب کہاں وہ بام و در سب ہو گئے زیر و زبر ۷۷۲ھ
نام تک میں ہے ترے رنگ تغیّر کا اثر[1]

اے محمد شاہ جوناں کی مکمل یادگار !
کیا ہوئے وہ پھول جن سے اس چمن کی تھی بہار
آہ وہ تیرے مشاہیر انتخاب روزگار
تیری بستی آج تک ہے جن کے غم میں سوگوار
چل بسے یوں مدفنوں کا بھی نشاں ملتا نہیں
یوسف اک کیا کارواں کا کارواں ملتا نہیں

وہ شمالی حصہ میں اک پر فضا بارہ دری
خوشنما فیروز شہ کے وقت کی صنعت گری
دیتی ہے روکار سے یوں داد معنی گستری
میں نے دیکھے ہیں بہت سے دور چرخ چنبری
دُھس بتاتا ہے کہ چوٹوں سے بدن سب چور ہے
قلعہ کہتا ہے کنواں دل کا مرے نا سور ہے

[1] اس ٹیپ کے مصرع ''نام تک میں ہے ترے رنگ تغیّر کا اثر'' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس شہر کا اصل نام جونپور واؤ کے جزم کے ساتھ تھا جس کی تصدیق تاریخ آبادی یعنی ۷۷۲ ھ سے ہوتی ہے مگر رفتہ رفتہ یہ بگڑ کر جونپور واؤ کے زبر سے بولا جانے لگا ۔

جونپور ! اے شاہد پہلو نشیں گومتی
خوب ہی تو نے چنی ہے آستیں گومتی
لکھنؤ کے بعد آو نقش نگیں گومتی
پڑتی ہے تجھ پہ نگاہ دوربین گومتی
کیوں محبت کو تری سمجھیں نہ فرض منصبی
ہم کو تیرے ساتھ ہے اک دعویٰ ہم مشربی

منتخب وہ سبزہ زاروں میں رواں اک آبجُو
بادہ کش دو ایک کاسے میں زلال آرزو
ایک شفاف آئینہ دو مہوشوں کے روبرو
دیکھئے نقشہ جونپور اور شہر لکھنؤ
ایک دریا پر بسے ہیں شان ساحل ایک ہے
دل بظاہر ہیں جدا لیکن رگ دل ایک ہے

نظم

(جو ویدک و طبی کانفرس میں پڑھی گئی)

ہم آج اس بزم میں اک آہ پر تاثیر کھینچینگے
جو دل میں دیر سے پیوست ہے وہ تیر کھینچینگے
نہ ٹوٹیں ارتباطِ باہمی کی خوشنما کڑیاں
سنا ہے قوم کے زور آزما زنجیر کھینچینگے
دکھا دینا ہے نقشہ قوم کی نااتفاق کا
ہم اس دل کی جو سو ٹکڑے ہے اک تصویر کھینچینگے
کرینگے سر کشانِ قوم کو اپنی طرف مائل
جہاں تک ہو کہاں چارۂ تقدیر کھینچینگے
کسی سے داد لینی ہے نہ پیدا نام کرنا ہے
ہمیں کچھ کام کرنا ہے ہمیں کچھ کام کرنا ہے
مگر کمزوری خلق و محبت بڑھتی جاتی ہے
کہ یاران طریقت میں عداوت بڑھتی جاتی ہے

ہماری قوم ! تیرا بھی ستارہ کیا ستارہ ہے
سعادت گھٹتی جاتی ہے نحوست بڑھتی جاتی ہے
زمانہ چونکتا جاتا ہے قومیں جاگتی جاتی
قیامت ہے ہماری اور غفلت بڑھتی جاتی ہے
مرا یہ درد پست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم در کشم ترسم کہ مغز آستخواں سوزد
وہ یونانی شفاخانہ کا اک بیمارِ زندانی
جسے گھیرے ہوئے ہیں آج کل امراض نفسانی
جو آگے دو قدم اپنی جگہ سے بڑھ نہیں سکتا
مریض ناتواں بد بخت ''فن طب یونانی''
جسے آئے ہوئے ہندوستاں میں مدتیں گزریں
جو ہے مانند ویدک چارہ ساز نوع انسانی
وہی موضوع اہل طب ہے ہے موضوع ویدک بھی
جسے کچھ بھی سمجھ ہوگی سمجھ لے گا بآسانی
جداگانہ روش ظاہر میں ہے باطن میں یکساں ہے
علاقہ اک طرح کا طب ویدک میں ہے روحانی
سبب کیا ہے تمہیں کیوں آخر اس ویدک سے نفرت ہے
دواؤں کا ذخیرہ جس میں ہے اس وقت لاثانی
خزانہ تجربوں کا مفت ملتا ہے نہیں لیتے
سمجھتے ہی نہیں کچھ نفع و نقصان وائے نادانی
ملائی طب میں ویدک بھی تو آخر تم خفا کیوں ہو
خلاف مشرب دع ما کدر خذ ما صفا کیوں ہو
خداوندا عطا کر ناتوانوں کو توانائی
ترقی طب کو دینا چاہتے ہیں طب کے شیدائی
بدن میں روح تازہ پھونک دے اس قوم بے حس کے
کہ میدان ترقی میں کرے ہنگامہ آرائی
بزرگوں نے ہمارے کیا نمایاں کوششیں کی تھیں
کہ اب تک صفحۂ ہستی پہ ہیں آثار دانائی
ہمارے اوج علم‌الادویہ کو پا نہیں سکتے
وہ سیارے جنھیں اس دور میں ہے ناز یکتائی

آنہیں کی طرح اے دل چاہئے ہم کو بھی سرگرمی
ہماری بھی رگوں میں ہے وہی تو خون آبائی
یہی دھن ہے منازل طے کرینگے وادی طب کی
سمائی ہے سروں میں پھر ہوائے جادہ پیمائی
پھرینگے گلشنوں میں جنگلوں کی خاک چھانیں گے
چنیں گے جا کے اب گلہائے بستانی و صحرائی
یہی گلہائے تحقیقات لے جا کر چڑھائینگے
مزار بوعلی سینا پہ اک چادر چڑھائینگے

تتلی

تتلی ! اے جامہ زیب تتلی — خوشرنگ نظر فریب ، تتلی
ننھی سی جان ، پیاری ، تتلی ! — نیلی ، پیلی ، سفید ، تتلی
تو حورِ جناں کی پنکھیا ہے — یا پھول ہے ، پنکھڑی ہے ، کیا ہے؟
نازک نازک ترے یہ بازو — یا شوخیٔ حسن کی ترازو
اڑتی پھرتی ہے باغ بھر میں — چپہ چپہ تری نظر میں
رمنہ تیرا ہے سبزہ و گُل — قبضہ میں ترے ہے جز و تاکُل
تو پہلے تھی اک ذلیل کیڑا — ہمت کا مگر اٹھا کے بیڑا
طے کر کے منازل کثافت — پہونچی تا سرحد لطافت
تیری ہر وضع اب ہے دلکش
ہو سادہ لباس یا منقّش
قدرت کی یہ فیض گستری ہے — کیڑا جو تھا اب وہی پری ہے
پرواز میں اس قدر سبک سیر
ہمتا جس کا نہیں کوئی طیر
کچھ شرط سہی اڑے بھنبھیری — بازی میں رہے گی تو ہی میری
گل کے سرِ دوش تو جو چڑھ جائے — حسن اس کا چمن میں اور بڑھ جائے
تو شاخ سے جب اڑے بصد ناز
سمجھیں سب کہ گل ہے گرم پرواز

گونا گوں تتلیوں کی بہتات　　کب ہوتی ہے ؟ خوب جب ہو برسات
ان کے افسانے ہیں نرالے　　یہ بھی کہتے ہیں کہنے والے

ہیں بھیس میں تتلیوں کے روحیں
مصروف بہار دیکھنے میں ! !

روحیں آزاد کی ہوئی ہیں　　ان کو نہ چھوؤ چھوئی موئی ہیں
دیکھو کہ یہ دیکھنے کی ہیں چیز　　چھوؤنا ان کا خلاف تمئیز
کرتے ہو اگر پسند بچو !　　مٹھی میں کرو نہ بند بچو !
ان پریوں کو جان سے نہ مارو　　آہستہ سے شیشے میں آتارو
جس میں کہ بھری ہوئی ہو کچھ دُوب　　یعنی ان کی غذائے مرغوب
یہ عمر بسر کریں مع الخیر　　تم شوق سے بیٹھ کر کرو سیر
راحت سے جو چاہتے ہو رہنا　　مانو اپنے صفی کا کہنا

اُن جانوروں کو دو نہ ایذا
تم کو دیتے ہوں جو نہ ایذا

شاد عظیم آبادی

سید علی محمد نام شاد تخلص ' جنوری ۱۸۴۶ء (۹ محرم ۱۲۶۲ھ) میں عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے ۔ والد کا نام سید عباس مرزا تھا ۔ جنکا سلسلہ' نسب حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے ۔ شاد کے اجداد عراق سے دلی آئے اور پھر نادر شاہ کے حملہ کے بعد دلی سے پٹنہ چلے گئے ۔ بحیثیت مجموعی شاد کا خاندان اپنی منزلت و اعزاز ' دولت و امارت اور علم و فضل کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا تھا ۔ چنانچہ شروع ہی سے شاد نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں خوش حالی و فارغ البالی کے ساتھ ساتھ علم و ادب کا چرچا بھی تھا ۔ اس ماحول میں رہ کر انہوں نے بچپن ہی سے عربی ' فارسی اور اردو میں خاصی مہارت پیدا کر لی ۔ شاد بارہ برس کے تھے کہ ملک میں ۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہوا ۔ اس ہنگامے میں فیض آباد کے ایک بزرگ میر سید محمد نامی جو میر انیس کے ہم عمر اور پڑوسی تھے ' عظیم آباد آئے اور یہیں آباد ہو گئے اور کچھ دنوں بعد یہی محقق زبان اردو شاد کے اتالیق مقرر ہوئے ۔ در حقیقت یہ انہیں بزرگ کی تربیت کا اثر تھا جس نے آئندہ چل کر شاد کی زبان کو اس قدر فصیح و بلیغ بنا دیا ۔

شاد کی شاعری کا دور پندرہ سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے ۔ کلام کی اصلاح شاہ اُلفت حسین فریاد عظیم آبادی نے کی جو اشکی کے شاگرد تھے اور اشکی کو خواجہ میر درد سے تلمذ تھا ۔ ویسے راسخ عظیم آبادی سے بھی شاد کو بڑی عقیدت تھی اور انہوں نے اس وحیدالعصر اُستاد کے کلام سے استفادہ بھی کیا ہے ۔

شاد نے اپنی تمام عمر اردو ادب کی خدمت میں گذاری اور نظم و نثر کی کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں ۔ ان علمی خدمات کے عوض میں گورنمنٹ سے ۱۸۹۱ء میں انہیں ''خان بہادر'' کا خطاب اور ایک ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ ملا ۔ ۳۲ سال تک آنریری مجسٹریٹ رہے اور ۱۹۲۷ء میں پٹنہ میں انتقال کیا ۔

شاد حافظ کی طرح در حقیقت ایک طربی شاعر تھے اور جرأت کی رنگینی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ملاحظہ ہو ۔

رس بھری ھائے وہ آنکھیں تری کالی کالی بے پئے متوالی
سانولا رنگ نمک ریز جراحات جفا آف کہاں دھیان گیا

لیکن زمانہ کی ناساعدت کے ھاتھوں آن پر جو تباھی و بربادی کا طوفان ٹوٹا تو اپنے اس حقیقی رحجان سے ھٹ کر المیہ نگاری کرنے پر مجبور ھو گئے ۔ اور کلام میں حزن و ملال اور درد و کرب کا رنگ بھرنا شروع ھو گیا ۔ حتیٰ کہ آنھیں اپنے تخلص سے بھی ایک طرح کی چڑ سی ھو گئی تھی ۔ کہتے ھیں ۔

خدا گواہ ھے بالکل غلط مسمی تھا عبث زمانے نے مشہور شاد نام کیا
برعکس تخلص ھے مگر شاد کریں کیا مجبور ھیں مشہور اسی نام سے هم ھیں

تاھم شاد کے غم و اندوہ اور میر کے رنج و الم میں فرق ھے ۔ میر کے یہاں غم کوشی اور خوں فشانی میں ایک طرح کی لذت کا احساس ملتا ھے ۔ آنکے غم میں ایک مستقل طنز اور تلخی کی صورت پیدا ھو گئی ھے مگر شاد کے غم میں ایک آرزو مندانہ رنگ پایا جاتا ھے ۔ وہ میر کی سی نفی پر نہیں آتر آئے ۔

شاد کے کلام کی امتیازی شان زبان کی سادگی و صفائی ھے ۔ وہ نہایت شیریں ' مترنم اور منتخب الفاظ استعمال کرکے اشعار کو بلا کا پر تاثیر بنا دیتے ھیں ۔ آن کی قادرالکلامی و کہنہ مشقی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ھے کہ وہ مشکل سے مشکل مضمون کو عام فہم الفاظ اور روز مرہ میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نظم کر دیتے ھیں ۔ آن کے کلام میں فلسفہ ' اخلاق اور توحید کا عنصر غالب ھے ۔ آن کا انداز بیان بہت کچھ میر سے ملتا ھے ۔ محاورات کے استعمال میں شاد کو ید طولیٰ حاصل تھا ۔ شاد نے چونکہ بہت سے کہنہ مشق آستادوں کی صحبت آٹھائی تھی اسلئے آن کے کلام میں بڑی پختگی پیدا ھو گئی ۔ میر انیس و مونس کی صحبتوں میں رہ چکے تھے ۔ اسلئے آن کی زبان و بیان میں انہی یگانۂ روزگار شعرا کا رنگ جھلکتا ھے ۔ خاص طور پر مرثیے میں آنہوں نے میر انیس کی پیروی کی ھے ۔

یوں تو شاد نے قصیدہ ' مرثیہ ' مثنوی ' غزل ' قطعہ ' رباعی تمام اصناف پر طبع آزمائی کی ھے ۔ لیکن مرثیہ و غزل میں آنکی طبع نے خاص جوھر دکھائے ھیں ۔ اور تغزل میں تو آنکی انفرادیت مسلم ھے ۔ آن کی غزلوں میں مضمون آفرینی زیادہ نہیں ملے گی ۔ کیونکہ وہ باتوں ھی باتوں میں مضمون پیدا کر لینے کے عادی ھیں اور قاری یہ محسوس کرتا ھے جیسے وہ کوئی نئی بات کہہ گئے ھیں ۔ شاد کا کلام بہت ھی صاف ستھرا اور ایک وجدانی کیف سے مملو ھے ۔

شاد بڑے پر گو شاعر تھے اور ان کے کلیات نظم میں ایک لاکھ کئی ھزار اشعار تھے ۔ جس میں سے غزل کے ۲۲ ھزار اشعار تھے ۔ ۱۹۳۸ء میں شاد کی غزلوں کا ایک منتخب دیوان آن کے عزیز شاگرد حمید عظیم آبادی نے مرتب کر کے ''نغمۂ الہام'' کے نام سے شائع کیا ۔ پھر ''الہامات شاد'' کے نام سے ایک مختصر سا رسالہ (معہ سوانح و انتخاب) طاق بستان آرہ نے شایع کیا جسکی ترتیب و تہذیب جناب عبدالمالک آروی صاحب نے کی ۔

انتخاب کلام

دل اپنی طلب میں صادق تھا گھبرا کے سوئے مطلوب گیا
دریا سے یہ موتی نکلا تھا دریا میں یہ جا کر ڈوب گیا
پیری میں جوانی کی باتیں کیا عرض کروں اک قصہ ہے
وہ طرز گئی، وہ وضع گئی، انداز گیا، اسلوب گیا
طاقت جو نہیں اب حیرت سے تصویر کا عالم رہتا ہے
وہ آخر شب کی آہ گئی وہ نعرۂ یا محبوب گیا
لاریب خموشی نے تیری تاثیر دکھائی مستوں کو
بے باک جو میکش تھا ساقی اس بزم سے وہ محجوب گیا

نالوں کی کشاکش سہہ نہ سکا خود تارِ نفس بھی ٹوٹ گیا
اک عمر سے تھی تکلیف جسے کل شب کو وہ قیدی چھوٹ گیا
نازک تھا بہت کچھ دل میرا اے شاد تحمل ہو نہ سکا
اک ٹھیس لگی تھی یونہی سی کیا جلد یہ شیشہ ٹوٹ گیا

گھٹ گھٹ کے قیامت ڈھاتا ہے رہ رہ کے دل ناکام مرا
آتے ہیں نظر آثار بُرے کیا دیکھئے ہو انجام مرا
کمبخت بھلا ہو یا کہ برا کہنے کے لئے اک مونس تھا
دل جب سے سدھارا پہلو سے دنیا سے گیا آرام مرا

یہی تو اک شے ہے آدمی میں اسی پہ انسانیت ہے ساری
زباں کا بھی پاس ہو نہ جن کو تو شاد کیا اعتبار ان کا

تری غفلتوں کا ہے یہ اثر کہ اب آپ دل کو ہے اپنے شک
کہ یہ بیان حال ہے واقعی، کہ فسانہ کہتا ہوں خواب کا
وہ جو مر گئے ترے دھیان میں وہ ہیں مست اپنے ہی حال میں
نہ کرینگے شکر ثواب کا نہ گلہ کریں گے عذاب کا

ہو گی جب اپنی آنکھ بند آئے گا وہ ' بھلی کبھی
دیکھ سکا نہ جو سماں دیدۂ نیم باز کا
آئے اگر عروسِ دھر بھول کے میکدے میں اب
کہہ دو یہ صومعہ نہیں زاھدِ پاک باز کا

جفائے یار کا دل کو ملال آ ھی گیا   ھزار دھیان کو ٹالا خیال آ ھی گیا
ذرا سی ٹھیس بھی شیشے کو تھی بہت ساقی   ھزار تو نے بچایا تھا بال آ ھی گیا

غضبِ نگاہ نے ساقی کی بندوبست کیا
شراب بعد کو دی پہلے سب کو مست کیا
کوئی خفا ھو تو ھو امرِ حق مگر یوں ہے
بتوں کی چال نے سب کو خدا پرست کیا

آ کے زنجیر کو آنکھوں سے لگاتا ہے کون
کس کے دل میں ہے ادب آپکے دیوانے کا
خود چل اس کوچے میں چلنا ہے جو اے پائے طلب
کوئی واں ھاتھ پکڑ کر نہیں لے جانے کا

نہ پھر ھم نہ افسانہ گو اے شبِ غم   سحر تک ہے قصہ تمام اپنا اپنا
ھزار شکر میں تیرے سوا کسی کا نہیں   ھزار حیف کہ اب تک ھوا نہ تو میرا

زیست ہے نام تیری فرقت کا   کچھ ٹھکانا ہے اس مصیبت کا
زندگی بھی لقب اسی کا ہے   نام مرنا بھی ہے محبت کا

خوشی بہار کی ' دھڑکا خزاں کے آنے کا   گُلو! فقط یہ اُلٹ پھیر ہے زمانے کا

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ھیں ھم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ھم نفسو وہ خواب ھیں ھم
اے شوق پتہ کچھ تو ھی بتا اب تک، یہ کرشمہ کچھ نہ کُھلا
ھم میں ہے دل بے تاب نہاں ' یا آپ دل بیتاب ھیں ھم

میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے ' آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم
لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں منزل پہ پہنچتے ہیں دو ایک
اے اہلِ زمانہ قدر کرو ' نایاب نہ ہوں کمیاب ہیں ہم
مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے
آ جاؤ جو تم کو آنا ہو ' ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی   نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

ہر وقت خوشی میں کٹتی تھی وہ صبح کہاں وہ شام کہاں
آرام رساں کا ساتھ چھٹا ' کیا پوچھتے ہو آرام کہاں

ابھی نوخیز ہیں رنگت زمانے کی نہیں دیکھی
بِکستی ہیں جو کلیاں بعض غنچے مسکراتے ہیں
جفائیں اُن کی ہیں بے مصلحت عقلوں کے ناخن لو
اب ایسے کیا وہ بھولے ہیں کہ بے سوچے بتاتے ہیں

حسن و عشق ایک ہیں ظاہر میں فقط ہیں دو نام
یہ اگر سچ ہے تو کیا اُن کے برابر ہم ہیں
عقل سے راہ جو پوچھی تو پکارا یہ جنوں
وہ تو بھٹکی ہوئی خود پھرتی ہے رہبر ہم ہیں

ہونگی زیادہ اس سے بھی عشق میں جگ ہنسائیاں
دل نے تو آپ مول لیں اپنے لئے برائیاں
فصلِ خزاں ہے یہ بلا اس سے خدا پناہ دے
منہ پہ صبا کے بھی گُلو ! چھٹنے لگیں ہوائیاں

حشر میں رند تھے خموش صحبت مے سے چھوٹ کر
پیر مغاں کو دیکھ کر دینے لگے دھائیاں

تھی جزو ناتواں کسی ذرے میں زندگی
ہستی کا کیا وجود تری جلوہ گاہ میں

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
ہوں اس کوچہ کے ہر ذرہ سے آگاہ
اُدھر سے مدتوں آیا گیا ہوں
نہیں اُٹھتے قدم کیوں جانبِ دیر
کسی مسجد میں بہکایا گیا ہوں
دلِ مضطر سے پوچھ اے رونقِ بزم
میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں
لحد میں کیوں نہ جاؤں منہ چھپائے
بھری محفل سے اُٹھوایا گیا ہوں

نہ سر میں سودا نہ دل میں آہیں نہ لب پہ ساقی فغاں رہے گی
یہی جو ساماں ہیں یہ نہ ہونگے تو پھر محبت کہاں رہے گی
بنا چلا ڈھیر راکھ کا تو بجھا چلا اپنے دل کو لیکن
بہت دنوں تک دبی دبائی یہ آگ اے کارواں رہے گی
بہت سے تنکے چنے تھے میں نے نہ مجھ سے صیّاد تو خفا ہو
قفس میں گر مر بھی جاؤں گا میں نظر سوُئے آشیاں رہے گی
ابھی سے ویرانہ پن عیاں ہے ابھی سے وحشت برس رہی ہے
ابھی تو سنتا ہوں کچھ دنوں تک بہار اے آشیاں رہے گی
ہزار کھینچ کر جدا ہو مجھ سے ہزار دوری ہو میرے تیرے
جو اک کشش حسن و عشق میں ہے مرے تیرے درمیاں رہے گی
ہزار نقش قدم مٹا کر زمانہ آنکھوں میں خاک ڈالے
جو تجھ سے چھوٹے ہیں اُن کو تیری تلاش اے کارواں رہے گی
بہت سے پھولینگے غنچہ و گل یہی تو اس باغ کی روش ہے
چڑھائے جائنیگے آگ، پر جو اُنہیں کی خوشبو عیاں رہے گی
اجل سلا دے گی سب کو آخر کسی بہانے تھپک تھپک کر
نہ ہم رہیں گے نہ تم رہو گے نہ شاد یہ داستاں رہے گی

شب عمر کی گزری ہم بزموا گر چپ نہ رهیں کیا منه سے کہیں
تھے شمع صفت اس محفل میں، جب صبح ہوئی خاموش ہوئے
آنکھوں سے ہماری تا دامن اشکوں نے بڑھائے اپنے قدم
جو طفل نظر میں ہلتے تھے اب زیب دہ آغوش ہوئے

تصور اُن کا رکھ دل میں جو ہے دیدار کا جویا
لگائے منه جو آئینے کو آئینه اُسی کا ہے
یه بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اُسی کا ہے

نگہبان ہیں کچھ ایسے ادا و ناز اُن کے
که بچتے جاتے ہیں لغزش سے پاکباز اُن کے
تجھی کو نزع میں پوچھا ترے خموشوں نے
آخیر وقت جب آیا چھپے نه راز اُن کے
نظر اُٹھانے میں ہوتا ہے باز پرس کا ڈر
جھکائے رکھتے ہیں گردن کو سرفراز اُن کے

ہے دل کی حکایت حیرت زا کیا اول و آخر اس کا کہیں
اک خاک کا تودا لائے تھے ہم صحرائے قیامت لے کے چلے

کبھی رو دئے کبھی سر دُھنا کبھی سوزِ غم نے فنا کیا
یہی مثل شمع کے صبح تک سر شام سے ہمیں کام ہے

وہ دریچے پر ہوں کشادہ رُو نظر اپنی اُن سے لڑی رہے
نه تو گفتگو سے مراد ہے، نه کلام سے ہمیں کام ہے

اب اپنی عمر شیشۂ نازک کا جام ہے
بس اک ذرا سی ٹھیس میں قصه تمام ہے

اگر مرتے ہوئے لب پر نہ تیرا نام آئے گا
تو میں مرنے سے در گزرا مرے کس کام آئے گا
شبِ ہجراں کی سختی ہو تو ہو لیکن یہ کیا کم ہے
کہ لب پر رات بھر رہ رہ کے تیرا نام آئے گا
عطا کی جب کہ خود پیر مغاں نے پی بھی لے زاہد
یہ کیسا سوچنا ہے تجھ پہ کیوں الزام آئے گا
کہاں سے لاؤں صبر حضرت ایوّب اے ساقی
خم آئے گا، صراحی آئے گی تب جام آئے گا

یہ رات بھیانک ہجر کی ہے کاٹیں گے بڑے آرام سے ہم
ٹلنے کی نہیں یہ کالی بلا سمجھے ہی ہوئے تھے شام سے ہم
تھا موت کا کھٹکا جاں فرسا، صد شکر کہ نکلا وہ کانٹا
گر ہو نہ قیامت کا دھڑکا اب ہیں تو بڑے آرام سے ہم
اے ہم نفسو دم لینے دو وہ بھولے نغمے یاد آ لیں
آئے ہیں چمن میں آڑ کے ابھی چھُوٹے ہیں اسی دم‌دام سے ہم
باتوں میں گزرتے ہجر کے دن اے کاش کہ دونوں مل جاتے
ہم سے ہے دل ناکام خفا آزردہ دل ناکام سے ہم
وہ سمجھے کہ میں نے مار لیا ہم سمجھے ملیں گے آخر وہ
ملتے ہی نگہ کے دونوں خوش آغاز سے وہ انجام سے ہم
دنیا میں تخلص کوئی نہ تھا کیا نیل کا ٹیکا شاد ہی تھا
تم وجہ نہ پوچھو کچھ اس کی چڑجاتے ہیں کیوں اس نام سے ہم

تکیہ وعدہ پہ ہے سب چپکے پڑے ہیں تہہ خاک
حشر کا دن جو نہ آیا تو قیامت ہو گی

زہر کیا چیز ہے اک تلخ دوا ہے ناصح
میں نے جس بات کو اب ٹھان لیا ٹھان لیا

شاد ایسے میں نہ توڑا تھا بھلے کو میں نے
پھول پر ہاتھ بڑھایا تھا کہ دل یاد آیا

زباں پہ مرتے ہوئے اُن کا نام آ ہی گیا
وہ اک خلوص جو تھا دل میں کام آ ہی گیا
کہا تھا میں نے کہ واعظ بتوں کا ذکر نہ چھیڑ
خدا کے باب میں آخر کلام آ ہی گیا

قابل بیاں کے ہجر کی روداد بھی نہیں
سچ پوچھتے ہیں آپ تو اب یاد بھی نہیں
رسوائیوں کی حد نہ رہی میری راہ میں
حد ہے کہ خود ذلیل ہوں اپنی نگاہ میں

ثاقب لکھنوی

مرزا ذاکر حسین قزلباش نام ۔ ثاقب تخلص شب شنبہ ۱۹ رمضان المبارک ۱۲۸۵ھ مطابق ۲ جنوری ۱۸۶۹ء کو محلہ گلاب خانہ آگرہ میں پیدا ہوئے ۔ جہاں اُن کے والد آغا محمد عسکری قزلباش سکونت پذیر تھے ۔ ثاقب کا سلسلۂ نسب حاجی علی قزلباش ماژندرانی المعروف بہ علی قلی خاں شاملو سے ملتا ہے ۔ لیکن انقلاب زمانہ کے ہاتھوں ان کے اجداد ترک وطن کر کے بہ سلسلۂ تجارت ہندوستان چلے آئے اور اکبر آباد کو اپنا مستقر بنایا ۔ ثاقب کی ولادت کے بعد اُن کے والد بعض وجوہ کی بنا پر آگرہ میں نہ رہ سکے بلکہ ملازمت کے سلسلے میں کچھ عرصہ الہ آباد اور پھر بھوپال میں رہے لیکن ۱۸۹۸ء سے اُنہوں نے لکھنؤ میں مستقلاً رہائش اختیار کی ۔ اسی مستقل قیام لکھنؤ کی بدولت ثاقب لکھنؤی کہلائے ۔

مرزا ثاقب کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی وہ فارسی کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے ۔ عربی انگریزی کی تعلیم زیادہ نہ حاصل کر سکے۔ عربی کی صرف ابتدائی کتابیں پڑھیں اور انگریزی میں انٹرنس تک لیاقت حاصل کی ۔ انگریزی کی تعلیم کے لئے ۱۸۸۶ء میں اُنہیں سینٹ جانس کالج آگرہ جانا پڑا ۔ یہاں کی پر کیف و شائشتہ صحبتوں کا ذکر حبیب الرحمن خانصاحب شیروانی نے جو خود بھی اس زمانہ میں سینٹ جانس کالج میں موجود تھے دیوان ثاقب کے دیباچہ میں کیا ہے ۔ تلاش معاش کے سلسلے میں پہلے اُنہوں نے ۱۸۹۶ء میں ایک تاجر کی معیت میں تجارت شروع کی مگر اس میں جب خسارہ ہوا تو قسمت آزمائی کرنے کلکتہ پہنچے اور ۱۹۰۶ء سے ۱۹۰۸ء تک سفیر ایران کے پرائیویٹ سکریٹری رہے ۔ ۱۹۰۸ء سے اُن کا تعلق ریاست محمود آباد سے ہو گیا جہاں وہ میر منشی کے عہدے پر فائز ہوئے اور نواب صاحب کے درباری شاعر کہلائے ۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے کہیں ملازمت نہیں کی ۔ تقسیم ہند کے بعد جب ریاست ختم ہو گئی تو ثاقب صاحب بھی گوشہ نشین ہو گئے اور یاد الہی میں دن گزار کر اوائل ۱۹۴۹ء میں انتقال کیا ۔

مرزا صاحب فطرتاً بڑے با اخلاق ، صاحب مروت ، سیر چشم اور متواضع انسان تھے ۔ ایثار و انکسار اُن کی خاص صفات تھیں ۔ شعر و شعاری سے اُنہیں بچپن سے لگاؤ تھا لیکن اس کی باقاعدہ ابتدا ۱۸۸۴ء کے قریب ہوئی ۔ اس زمانہ کا ذکر مرزا صاحب نے

دیوانِ ثاقب میں کیا ہے ۔ اس مشاعرہ میں ذکی (شاگرد غالب) خواجہ غلام غوث بیخبر اور مولوی ذکاءاللہ موجود تھے ۔ چنانچہ آخرالذکر بزرگ نے آپ کا کلام سن کر کہا تھا کہ ''میاں صاحبزادے اگر زندہ رہے تو اپنے وقت کے میر ہو گے'' اور اس میں شک نہیں کہ یہ پیشین گوئی بہت کچھ صحیح بھی ثابت ہوئی ۔

ثاقب فن شعر کے اصولوں سے کما حقہ آگاہ اور ایک پختہ مشق سخنور تھے ۔ فکر شعر میں انہوں نے میر و غالب جیسے سر آور شعرائے اردو کی تقلید کی اور غالب کی تخیل اور میر کی زبان کو اپنا مسلک بنایا ۔ ان کے کلام میں یہ دونوں خصوصیات جلوہ گر ہیں ' ان کے تغزل میں غزل کے عام مفہوم یعنی محض واردات حسن و عشق کی بجائے زندگی اور اس کے متعلقات پر ایک فلسفیانہ جھلک نظر آتی ہے ۔ انہوں نے خیالات کو بلند کرنے میں بڑی محنت و کاوش سے کام لیا ہے اور بلاشبہ وہ اپنی اس کوشش میں اکثر جگہ کامیاب ہوئے ہیں ۔مزید برآں ان کے کلام میں خود داری و انفرادیت کے نقوش بھی جا بہ جا دکھائی دیتے ہیں ۔ جن سے شاعر کی شخصی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے ۔

طرز بیان اور صفائی زبان کے اعتبار سے انہوں نے میر کا اتباع کر کے اپنے کلام میں جان پیدا کی ہے ۔ پھڑکتے ہوئے پر سوز مصرعے ' نہایت جچے تلے ہوئے الفاظ اور عمدہ محاورے انہوں نے بڑے شاعرانہ تیور کے ساتھ نظم کئے ہیں ۔ غرض پاکیزگی و لطافت کے ساتھ ہمواری کلام خاص طور پر ان کے دیوان میں موجود ہے ۔ کہیں کہیں ثاقب کی پوری پوری غزلیں زبان و بیان اور سوزو گذار میں ڈوبی ہوئی بالکل میر کے رنگ میں ہیں ۔ لیکن میر کی پیروی میں انہوں نے اپنے مجموعہ کلام ''دیوان ثاقب'' کے انتخاب میں دقت نظر سے کام نہیں لیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ تمام رطب ویابس یکجا ہو گیا ہے اور ان کے جواہر پارے زیادہ آب و تاب کے ساتھ چمک نہیں سکے ۔ اس معاملے میں اگر ثاقب صاحب غالب کی نظر انتخاب سے کام لیتے تو دیوان کی ضخامت تو یقیناً اتنی نہ ہوتی لیکن جو کچھ ہوتا وہ خود اپنی طرف متوجہ بھی کرتا اور اس کی معنویت و زبان کا اثر بھی یکساں قائم رہتا ۔

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا حضرت ثاقب کے کلام میں خود داری ' زور کلام اور بلند پروازی کی کوشش نے ایک انفرادی حیثیت حاصل کر لی ہے اور انہیں خصوصیات کی بدولت ان کی غزلوں میں خود فراموشی اور والہانہ پن کی بجائے فلسفیت زیادہ پائی جاتی ہے ۔ اس پر اسیر ' بحر ' قلق ' امیر اور جلال جیسے لکھنؤی شعرا کو بچپن سے لے کر جوانی تک دیکھا اور ان کی صحبتیں اٹھائیں لہذا خالص لکھنؤی رنگ بھی ورثہ میں پایا ۔ چنانچہ کلام میں بپاس وضع اس کا بھی حق ادا کیا ہے ۔ تاہم ناسخیت ان کا اصل رنگ نہیں ۔ ان کا حقیقی رنگ وہی میر و غالب کا تتبع ہے اور ثاقب نے اس مخصوص رنگ میں مضامین نو پیدا کر کے خوب خوب شعر نکالے ہیں ۔

بحیثیت مجموعی ثاقب ایک خالص لکھنؤی شاعر تھے مگر ان کی لکھنویت بھی کچھ ایسی آن بان اور ٹھاٹھ والی ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ لکھنؤ میں حضرت عزیز ' مولانا صفی اور مرزا ثاقب کی کوششوں سے طرز غالب کی پیروی شروع

ہوئی ۔ لیکن ان سب میں ثاقب صاحب کا رنگ زیادہ پختہ ' متوازن اور وقیع ہے ۔ اُن کی زبان ' تخیل اور خاص طور پر مصطلحات باوجودیکہ اپنے معاصرین ہی کی سی ہیں تاہم اس محدود دنیا میں رہ کر انہوں نے ایسے جاندار اشعار کہے ہیں جو پڑھنے والے کے دل و دماغ پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں ۔ بنابریں انہیں لکھنؤ اسکول کا ایک صاحب فکر شاعر کہا جا سکتا ہے ۔

انتخاب کلام

بڑھائے حوصلے دریا دلی نے ساقی کی ذرا سے جام میں سو بار آفتاب آیا
سنائیں کیا تمہیں نیرنگ عشق کا قصہ تمام عمر نہ آنکھیں کھلیں نہ خواب آیا

یہ خندۂ طرب نما مبارک اہل دہر کو
بہت زمانہ ہو گیا کہ میں ہنسی کو رو چکا
نہ دم دے اے شریک غم' تجھے قسم ہے عشق کی
فلک کو چھوڑتا ہے کیوں اگر مجھے ڈبو چکا
رہے وہ دل میں مدتوں مگر سنبھل سکا نہ میں
مزاج حسن و عشق کو بہت دنوں سمو چکا
یہ آشیانۂ ستم چمن میں ہو تو خوب ہے
یہ جی میں ہے کہ دے اڑوں قفس تو میرا ہو چکا

آئینہ جس میں سدا ڈوب کے ابھرا کیا حسن
ایک ٹھہرا ہوا پانی ہے خود آرائی کا
حسن کے ہاتھ بندھے تو ' وہ ذرا دیر سہی
مجھ پہ احسان تری آئی ہوئی انگڑائی کا

جلوۂ حسن اک اشارے میں بہت کچھ کہہ گیا
میں نہیں سمجھا مگر ہاں دل تڑپ کر رہ گیا
اُن کی بزم ناز میں تو سانس بھی دل نے نہ لی
نالہ کش برسوں کا اک تصویر بن کر رہ گیا

عشق میں سہل تھی فرہاد کی تقلید مگر
یہ مری ہمت عالی کو گوارا نہ ہوا

مری قید کا دل شکن ماجرا تھا — بہار آئی تھی آشیاں بن چکا تھا
میں دنیا کو میخانہ سمجھا کہ اس میں — کوئی ہنس رہا تھا کوئی رو رہا تھا
شب غم کی تنہائیوں کو نہ پوچھو — جدھر دیکھتا تھا ' خدا ہی خدا تھا

مری داستان غم کو وہ غلط سمجھ رہے ہیں
کچھ انہیں کی بات بنتی اگر اعتبار ہوتا
کوئی بات ہے جو دل میں تیرا تیر جم کے بیٹھا
نہیں تو ذرا سی جنبش میں جگر کے پار ہوتا
وہ حکایتیں جوانی کی میں سن رہا ہوں دل سے
جنہیں اور کوئی کہتا تو نہ اعتبار ہوتا

تجھے اوروں کی خاطر چھوڑے جاتا ہوں میں اے عبرت
مرے بعد آنے والوں کو مرا قصہ سنا دینا
مرا دل محرم اسرار حسن و عشق تھا ثاقب
قرین مصلحت تھا مجھ کو دیوانہ بنا دینا

بوئے گل پھولوں میں رہتی تھی مگر رہ نہ سکی
میں تو کانٹوں میں رہا اور پریشان نہ ہوا

متاع عشق کا ہو دل کے بعد کیا سودا — کہ گم شدہ کا بھروسہ نہیں ملا نہ ملا

اس کے سننے کے لئے جمع ہوا ہے محشر — رہ گیا تھا جو فسانہ مری رسوائی کا

تڑپوں تو راز کھولوں سنبھلوں تو عشق نا خوش
جس حال کو میں سمجھا اچھا وہی برا تھا

سلسلہ ذکر جنوں کا آج تک باقی ہے کیوں
ختم کب کا قصۂ جیب و گریباں ہو گیا
سیر عالم کے لئے کچھ چھوڑ اے دست جنوں
اب تو دامن کی جگہ میرا گریباں ہو گیا

مجھ کو یقین وعدۂ فردا ضرور تھا مشکل یہ آ پڑی تھی کہ دل نا صبور تھا

جو آنکھ ہو تو دیکھئے ' نہ پوچھئے کہ کیا کیا
چراغ بزم ہو گیا ' جلا کیا ' ہنسا کیا

کیا دیکھتا آثار سحر میں شب فرقت
وہ جوش پر آنسو تھے کہ دل ڈوب رہا تھا

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں ابر سیاہ ' جانب گلزار دیکھ کر
کہتے ہیں دل لگی مری شام فراق کو اچھا یوں ہی سہی مگر اک بار دیکھ کر

تیرے ہوتے گلِ گلشن کو میں دیکھوں ' توبہ
ابھی ایسی تو نہیں قوت تسخیر بہار
میں تو میں گل بھی تو ہیں جامہ دری میں مشغول
سب کو دیوانہ کئے دیتی ہے تاثیر بہار

کعبہ کدھر ہے شکر کا سجدہ ادا کروں اللہ آپ آئے ہیں میرے مکان پر
میری طرح سے حال مرا اُن کا خیر خواہ عاشق ہے اُن کی نیند مری داستان پر
آزار عشق سے کہیں گھبرا نہ جائے دل آنے لگی ہیں یاس کی باتیں زبان پر
قابو میں دل نہ ہو تو غزل کیا کہے کوئی
فرمائشیں عذاب ہیں ثاقب کی جان پر

غنیمت ہے قفس ' فکر رہائی کیا کریں ہمدم
نہیں معلوم اب کیسی ہوا چلتی ہے گلشن میں

خدا آباد رکھے ہم صفیران گلستاں کو
جو کوئی پھول کھلتا ہے تو ہم کو یاد کرتے ہیں
عدو، صیاد و گلچیں کیوں ہوئے میرے نشیمن کے
یہ تنکے بھی ہیں اس قابل جنھیں برباد کرتے ہیں
خود اُن کا حسن میری داد خواہی اُن سے کرتا ہے
وہ آئینہ لئے ہیں اور مجھ کو یاد کرتے ہیں

عشق میں دل گنوا کے حال یہ ہے کچھ میں کھویا ہوا سا رہتا ہوں
پرسش حال اُس نے کی تو مجھے یہی کہتے بنا کہ اچھا ہوں

ہجر کی شب نالۂ دل وہ صدا دینے لگے سننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے
باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے
آئینہ ہو جائے میرا عشق اُس کے حسن کا کیا مزا ہو درد اگر خود ہی دوا دینے لگے

کسی کا رنج دیکھوں یہ نہیں ہو گا مرے دل سے
نظر صیاد کی جھپکے تو کچھ کہہ دوں عنادل سے
چل اے ہمدم ذرا ساز طرب کی چھیڑ بھی سن لیں
اگر دل بیٹھ جائے گا تو اٹھ جائیں گے محفل سے
امید و ناامیدی کا بہم ہونا وہی جانے
کہ جس نے کشتیوں کو ڈوبتے دیکھا ہے ساحل سے
تڑپتا ہے شب غم یوں کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا
بتا دے نا مرادی کون سی باتیں کروں دل سے
غموں کے آسرے پر، ہجر میں تھی زندگی ثاقب
خلش بڑھتی جو یہ کانٹے نکلتے دامن دل سے

مرا رونا شب فرقت تماشا گاہ انجم ہے
مگر ڈوبیں گے آخر کو یہ طوفاں دیکھنے والے
کہے جا بندہ چلا ہے داستاں کا رنگ محفل میں
مری سننے لگے ہیں روئے جاناں دیکھنے والے

کہاں تک جفا حسن والوں کی سہتے جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے
ہجوم تمنا سے گھٹتے تھے دل میں جو میں روکتا بھی تو نالے نہ رہتے
لہو تھا تمنا کا آنسو نہیں تھے بہانے نہ جاتے تو ہرگز نہ بہتے
نشیمن نہ جلتا نشانی تو رہتی ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رہتے
بتاتے ہیں آنسو کہ اب دل نہیں ہے جو پانی نہ ہوتا تو دریا نہ بہتے
زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے
کوئی نقش اور کوئی دیوار سمجھا زمانہ ہوا ہم کو چپ رہتے رہتے

مری ناؤ اس غم کے دریا میں ثاقب
کنارے پہ آ ہی لگی بہتے بہتے

روتے روتے شام ہوئی ہے کب تک اشک بہائیں گی
بہتے بہتے تھمتے ہیں دریا آنکھیں بھی تھم جائیں گی
جاتے جاتے جسم سے جائیں اہل وفا کی جائیں گی
آتے آتے دل لینے کی، تم کو ادائیں آئیں گی
چونکو چونکو صبح پیری غفلت خواب جوانی سے
اٹھو اٹھو سونے والوں راتیں پھر بھی آئیں گی
لاتے لاتے کام میں الفت لانے کی زنجیروں کو
بڑھتے بڑھتے زلفیں تیری طوق کمر ہو جائیں گی
ہوتے ہوتے ہوگا عالم واقف رسم الفت سے
رفتہ رفتہ میری وفائیں راہ پہ آس کو لائیں گی

بہت سی عمر مٹا کر جسے بنایا تھا مکاں وہ جل گیا تھوڑی سی روشنی کے لئے
بلا کے مجھ کو نکالا ہے اپنی محفل سے وہ نیکیاں نہیں اچھی جو ہوں بدی کے لئے

آئینہ ان کو دکھایا جو خود آرائی نے ہاتھ رکھا مری آنکھوں پہ شکیبائی نے
طُور پرتاب رہی یا نہ رہی خیر، مگر کچھ تو دکھلا ہی دیا ذوقِ تمنائی نے

بے شانہ اپنی زلف کو چھوڑا نہ کیجئے
میں دیکھتا ہوں خواب پریشاں کبھی کبھی

اک عمر کاٹ دی ہے سواد گناہ میں
دھوتا ہوں شب کو بیٹھ کے داماں کبھی کبھی

جدائی میں جس کو مثاتی ہے الفت — وہ عمرِ رواں پہلے ہی کٹ گئی ہے
وہی رات میری وہی رات اُن کی — کہیں بڑھ گئی ہے کہیں گھٹ گئی ہے

قفس کی تیلیاں اچھی ہیں تنکوں سے نشیمن کے
یہ سب کچھ ہے مگر صیّاد دل پر کیا اجارہ ہے

تماشا چشم دل سے اہل عرفان دیکھ ہی لیں گے
کسی پردے میں ہو تصویر جاناں دیکھ ہی لیں گے

دل اپنا خوف اسیری سے مطمئن کب تھا — رہے چمن میں مگر آشیاں بنا نہ سکے

صبح وصال دور تو اتنی نہیں مگر — راتیں ہیں بیچ میں تری زلف سیاہ کی

یکایک دل پہ بجلی سی گری تھی — اُٹھا تھا کچھ دھواں جب آشیاں سے
یہ ہے بہتے ہوئے دریا کی آواز — وہیں جانا ہے، آئے تھے جہاں سے

شب کو زنداں میں مرا سر پھوڑنا اچھا ہوا
آج کچھ کچھ روشنی آنے لگی دیوار سے

جفا اُٹھانے کی عادت پڑے تو کیوں کر جائے
ستم سہے مگر اتنے کہاں کہ جی بھر جائے

عدم سے آ کے اس دار فنا میں خوب پچھتایا
یہ اک ماتم کدہ نکلا میں سمجھا تھا کہ محفل ہے

خواہش دنیائے عشق و حسن ہے　　ورنہ پھر میں کس لئے تو کس لئے

اک نیا دل ظلم سہنے کو بنانا چاہیئے　　ہو تو سکتا ہے مگر اس کو زمانہ چاہیئے

میں رو رہا ہوں جو دل کو تو بے کسی کے لئے
وگر نہ موت تو دنیا میں ہے سبھی کے لئے

قفس مجھ کو نشیمن ہو گیا خوف اسیری میں
کوئی پتا کھڑکتا ہے تو پہروں دل دھڑکتا ہے

نظر کر غور سے آئینہ اسرار ہستی پر
جسے تو زندگی سمجھا ہے وہ دھوکا ہی دھوکا ہے

بارہا پلٹا ہوں ان کے در سے بے نیلِ مرام
جی میں ہے پھر آج سعئ آزمانا چاہیئے

آرزو لکھنوی

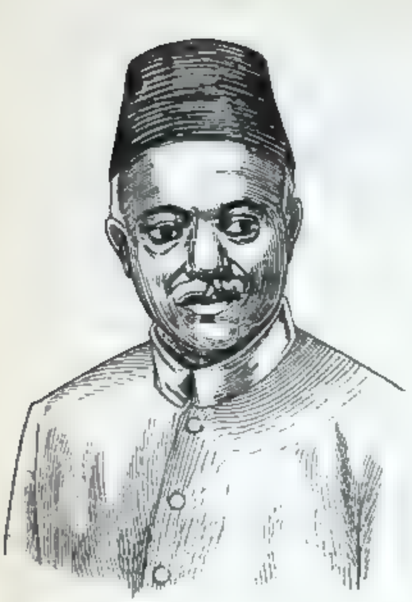

سید انور حسین نام ۔ آرزو تخلص ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ (۱۸۸۲ء) لکھنؤ میں پیدا ہوئے ۔ اجداد میں سے ایک بزرگ سیف الدین خاں المعروف نواب میرزا گل بیگ اجمیر سے لکھنؤ آئے اور یہاں شان و شوکت سے زندگی بسر کی آرزو کے والد میر ذاکر حسین یاس (شاگرد جلال لکھنوی) نے جب آبائی ریاست ختم ہو گئی تو تلوار ہاتھ سے رکھ کر قلم اٹھایا اور قناعت کے ساتھ پرانی وضع داری کو نبھاتے رہے ۔

آرزو کا سلسلۂ تعلیم پانچ سال کی عمر سے شروع ہوا ۔ پہلے فارسی و عربی کی ابتدائی کتابیں حکیم قاسم علی سے پڑھیں اس کے بعد جو کچھ تحصیل علم کیا وہ مجتہدالعصر مولانا سید آغا حسن صاحب سے کیا ۔ بارہ برس کی عمر سے شعر گوئی کا شوق ہوا اور یاس صاحب کے توسط سے اُن کے اُستاد حضرت جلال لکھنوی کے شاگرد ہوئے ۔ اُس زمانہ میں لکھنؤ علمی اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا اور آئے دن مشاعرے ہوا کرتے تھے چنانچہ آرزو نے اپنی سب سے پہلی غزل جو ایک مشاعرے میں پڑھی اُس کا مطلع یہ تھا ۔

ہمارا ذکر جو ظالم کی انجمن میں نہیں　　　جبھی تو درد کا پہلو کسی سخن میں نہیں

غرض اٹھارہ برس کے سن تک آرزو نے جلال جیسے قادرالکلام شاعر کے سامنے زانوئے شاگردی طے کیا ۔ اس کے بعد اُستاد کی دور بین نظروں نے تاڑ لیا کہ ہونہار شاگرد علم عروض کا ماہر اور پختہ کلام ہو چکا ہے لہذا اُس کی غزلوں پر اصلاح دینے کے بجائے اپنے چند شاگرد اس کے سپرد کر دئے ۔ آرزو نے شفیق اُستاد کی زندگی میں کئی برس تک یہ خدمت انجام دی اور آخر کار جلال کے انتقال کے بعد ۱۹۰۹ء میں باتفاق رائے اُن کے جانشین مقرر ہوئے

آرزو بڑے خوش اخلاق اور باغ و بہار قسم کے انسان واقع ہوئے تھے ۔ چنانچہ جو شخص اُن کی صحبت میں ایک مرتبہ بیٹھنے کی سعادت حاصل کر لیتا وہ کبھی اُن کی شگفتہ مزاجی اور محبت کو نہ بھول سکتا ۔ ساتھ ہی اُن میں قناعت و استغنا کا مادہ بھی بہت تھا جسکا ایک خوشگوار اثر اُن کے کلام پر بھی پڑا کہ اُنہوں نے خواجہ آتش کی

طرح اہل دنیا کی قصیدہ خوانی نہیں کی ۔ شعر و شاعری کے سلسلے میں انہوں نے بڑے بڑے معرکے دیکھے اور لکھنؤ اور اس کے نواح میں دور دور تک سینکڑوں مشاعروں میں جہاں اس فن کے اچھے اچھے سورما جمع ہوا کرتے تھے شرکت کی اور ہمیشہ کامیاب ہو کر آئے ۔ لیکن اُن کی کامیابی اور قادر الکلامی کا اس سے بھی بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب اُنہیں معاشی پریشانیوں کے باعث لکھنؤ چھوڑ پہلے ''مدن تھیٹرز کلکتہ'' اور پھر وہاں کافی عرصہ رہ کر عمر کا بقیہ حصہ بمبئی میں گزارنا پڑا اور اکثر فلم کمپنیوں کے لئے گانے اور گیت لکھنے پڑے تو اُس ماحول میں بھی اُنہوں نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ بہتر انداز میں انجام دیا ۔ اور اُن کے گانے اور غزلیں بہت سے فلموں کی عزت و شہرت کا باعث ہوئیں ۔

علامہ آرزو نے ۱۹۵۱ء میں انتقال کیا ۔ اور اپنے کلام کے تین مجموعے بطور یادگار چھوڑے ہیں ۔ (۱) فغان آرزو (۲) جہان آرزو (۳) سریلی بانسری
علامہ آرزو کے کلام کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُنہوں نے ابتدا تو لکھنؤ کی آخری بہار یعنی جلال لکھنوی کی گرہی و چستی سے کی تھی ۔ لیکن ان خصوصیات میں اپنے مخصوص انداز بیان کی سادگی کا اضافہ کر کے اُردو کے ممتاز شعرا کی صف میں جگہ حاصل کی ۔ اُنہیں زبان پر بے پناہ قدرت حاصل تھی ۔ چنانچہ اُن کی غزل میں خیال کی سادگی و نرمی کے علاوہ عام فہم زبان اپنی پوری شیرینی اور گھلاوٹ کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے ۔ جہاں تک بحروں کا تعلق ہے ۔ اُنہوں نے قدیم بحروں کے علاوہ نئی بحروں میں غزلیں کہہ کر اور وہ بھی بالکل عام فہم ، اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ غزل ان قیود سے آزاد ہو کر بھی غزل ہی رہتی ہے اور اُس کے لہجہ و شعریت میں کمی ہونے کے بجائے اور اضافہ ہو جاتا ہے ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آرزو کے یہاں گہرائی زیادہ نہیں پائی جاتی اور بعض اشعار سپاٹ بھی ہو جاتے ہیں ۔ کبھی کبھی وہ کسی خاص لفظ یا محاورے سے بھی کھیلتے نظر آتے ہیں ۔ لیکن اُن کے انداز بیان کی سادگی و بر جستگی ان عیوب کو بڑی حد تک گوارا بنا دیتی ہے ۔ ساتھ ہی ہندی الفاظ کی جادو اثری کلام کو بہت خوشگوار بنا دیتی ہے ۔ آرزو کا کلام اس کی ایک کامیاب مثال ہے ۔ یوں تو انہوں نے اپنے سارے کلام میں ہندی کے نرم ، دھیمے اور رسیلے الفاظ استعمال کئے ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ ان کا آخری مجموعہ کلام ''سریلی بانسری'' ان کے اس رجحان طبع کی معراج ہے ۔ جس کی زبان کو انہوں نے ''خالص اردو'' کا نام دیا ہے ۔ اس مجموعے کی تمام غزلوں میں ایک بھی فارسی یا عربی لفظ یا ترکیب کا استعمال نہیں کیا گیا ۔ اس کے ساتھ ہی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کوئی شعر فصاحت کے درجے سے گرنے نہیں پایا ۔ اس میں شک نہیں کہ اس ''خالص اردو'' کا میدان کسی قدر تنگ ضرور ہے مگر پھر بھی آرزو جیسے باکمال شاعر نے اس میں ایک کامیاب تجربہ کر کے دکھا دیا ہے جو آئندہ نسلوں کے لئے مشعل ہدایت کا کام دے گا ۔

انتخاب کلام

رہنے دو تسلی تم اپنی دکھ جھیل چکے دل ٹوٹ گیا
اب ہاتھ ملے کیا ہوتا ہے جب ہاتھ سے ناوک چھوٹ گیا
آپس کی کشا کش کیا سہتا، نازک تھا تعلق الفت کا
وہ مجھ سے کھنچے میں ان سے کھنچا، بس بیچ سے رشتہ ٹوٹ گیا

موج نے ڈوبی عمر کی کشتی آج پایا نشان ساحل کا

عادی بنا کے لذت آزار نے مجھے غم کی خلش کو دل کی تمنا بنا دیا

جو سینے میں دل ہے تو بار محبت اٹھے یا نہ اٹھے اٹھانا پڑے گا

وحشت انگیزی میں یکرنگی گریباں گیر تھی
جتنے دیوانے تھے سب کا ایک ہی انداز تھا

ہم کو اتنا بھی رہائی کی خوشی میں نہیں ہوش
ٹوٹی زنجیر کہ خود پاؤں ہمارے ٹوٹے

بدلی کی چھاؤں سی ادھر آئی ادھر گئی
جھپکی پلک کہ ختم تھا موسم بہار کا

بڑے مزے کے تھے الزام، گرچہ جھوٹے تھے
پھر آج ہاں کوئی ٹکڑا اسی فسانے کا

جیسی جس کی طینت ہوگی ویسا سب کو بتائے گا
داغی آئینہ جب دیکھو دھبا منہ پر آئے گا

رسوائی مزید کا امکان نہیں رہا
ان دھجیوں کا نام گریباں نہیں رہا

شرح بربادیٔ دل مجھ سے نہ پوچھ
ہے ترا حسنِ سراپا موجود

ہے نگاہِ باغباں میں آج بجلی کی چمک
ہم صفیرو ! اپنے اپنے آشیاں سے ہوشیار

امنگ تھی یہ جوانی کی یا کوئی آندھی
ملا کے خاک میں ہم کو گئی بہار کہاں

ان کی بے جا بھی سنوں آپ بجا بھی نہ کہوں
آخر انسان ہوں میں بھی کوئی دیوار نہیں

کئی چاک ان کے ہاتھوں کے ' کچھ آنسو اپنی آنکھوں کے
دیا ہے جو مقدر نے لئے بیٹھا ہوں دامن میں

ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی

پردہ کی جنبشوں میں بھی لہریں تھیں حسن کی
جو دیکھنا تھا اہل نظر دیکھتے رہے

لپٹی ہوئی دستار کو بھی سر سے اڑی ہے
وہ گرد کہ جو اپنی ہی ٹھوکر سے اڑی ہے

افشائے راز ' شانِ وفا ' امتحانِ صبر
آج ایک خامشی نے بڑے حق ادا کئے

اسی چمن میں کہ وسعت ہے جس کی نا محدود
نہیں پناہ کی جا ایک آشیاں کے لئے

تھا ہمیں ذکر وفا پر آہ کرنا کیا ضرور
سادگی دیکھو کہ دل کا راز خود افشا کیا

ہر سانس ایک شعلہ ہے ہر شعلہ ایک برق
کیا تو نے مجھ کو اے طپش دل بنا دیا

اس شان عاجزی کے فدا جس نے آرزو
ہر ناز ہر غرور کے قابل بنا دیا

اشکوں سے راز کھُلتا کیا خون آرزو کا
آنکھوں تک آتے آتے رنگ اڑ گیا لہو کا

جو سامنے اب تک آئے نہیں کیوں دھیان میں آئے جاتے ہیں
آنکھوں سے ابھی تک اوجھل ہیں اور جی میں سمائے جاتے ہیں
جب اُن کے جھوٹے الہنے بھی سن لینے کو تیار ہیں ہم
چُک جائے جھگڑا آپس میں کیوں لوگ بلائے جاتے ہیں
ہٹ اپنی اپنی بات کی ہے، دھیان اپنی اپنی آن کا ہے
ہم ہیں کہ تلُے ہیں مٹنے پر وہ ہیں کہ مٹائے جاتے ہیں
اب آرزو اس پھلواری میں بسنے کا سہارا کوئی نہیں
دو سوکھے تنکے لا کے رکھو تو وہ بھی جلائے جاتے ہیں

رونے پہ مرے ہنستے کیا ہو بے سمجھے نہ دیوانہ جانو
دل کس سے لگایا ہے تم نے، تم درد کسی کا کیا جانو
رونے پہ کسی کے کوئی ہنسے، ہنسنے پہ کسی کے کوئی روئے
جو بات ہے جسکی وہ جانے ہم کیا سمجھیں تم کیا جانو

کہنے سے نہ کہنا ہی اچھا ' نادان سے پردہ ہی اچھا
هر طرح سے اچھا ہی اچھا ' تم حال نہ جانو یا جانو
مایوس وہ دل ہے پہلو سے ' آخر کہو کس کا ہو کے رہے
جس کو نہ سہیں اچھا سمجھوں ' جس کو نہ تمہیں اچھا جانو
اے آرزو آن سے تم نہ کھنچو ' بڑھ جائے گی وحشت دیکھو تو
اس سلسلۂ بے ربطی کو ' زنجیر جنوں افزا جانو !

غم دے تو دل بھی شمع کا پروردگار دے
جو ساری عمر ایک طرح پر گزار دے
اک انتظار وعدۂ دیدار کے لئے
مہلت کچھ اور زندگی مستعار دے
بے کیف زندگی کا نتیجہ کوئی نہیں
دے اضطراب بھی جو خدا انتظار دے
ہوتا ہے خامشی سے بھی اظہار حال دل
خالق زبان دے کہ نہ دے اعتبار دے

جفا سے پہلے ہمیں خو گر جفا کرتے
گلہ گلہ ہی نہ رہتا تو کیوں گلہ کرتے
صنم کدے سے جدھر بھی نصیب پلٹا دے
یہاں تک آ تو گئے ہیں خدا خدا کرتے
الجھ رہا تھا خود آڑ آڑ کے ہاتھ سے دامن
دراز دستئی وحشت کا کیوں گلہ کرتے
یہ ہے کہ داد رسی پر نہیں ہو تم مجبور
نہ یہ کہ آئی حیا ہم کو التجا کرتے
کٹے کی شرم آدھر آرزو ادھر یہ خیال
دیا تھا درد جنہوں نے وہی دوا کرتے

پانی میں آگ دھیان سے تیرے بھڑک گئی
آنسو میں کوندتی ہوئی بجلی جھلک گئی

کب تک یہ جھوٹی آس کہ اب آئے وہ اب آئے
پلکیں جھکیں ، پپوٹے تنے ، آنکھ تھک گئی
ندی بھی آنسوؤں نے بہا دی تو کیا ہوا
کھولن جو تھی لہو میں نہ وہ آج تک گئی
دونوں کو ایک کرتی ہے بڑھ کر لگی کی آگ
اٹھی یہاں سے آنچ وہاں تک لپک گئی
جس نے اڑا دی راتوں کی نیند اور دن کا چین
جی سے نہ پھر بھی آرزو اس کی للک گئی

کالی گھٹائیں کوندا لپکا ، رو کے جو کوئل کوک گئی
جتنی گہری سانس کھنچی تھی اتنی لمبی ہُوک گئی

خالص اُردو

جس نے بنا دی بانسری گیت اسی کے گائے جا
سانس جہاں تک آئے جائے ایک ہی دُھن بجائے جا
ہاں مری ڈبڈبائی آنکھ دیکھ بندھی رہے یہ دھاک
وہ بھی لگائے جائے آگ تو بھی لگی بجھائے جا
ہونٹوں پہ آئے کیا ہنسی ، جی ہے یہاں بجھا ہوا
پلکوں تک آنسو آ گئے اب تو نہ گدگدائے جا

رس ان آنکھوں کا ہے کہنے کو ذرا سا پانی
سینکڑوں ڈوب مرے پھر بھی ہے اتنا پانی
کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی
جھوم کر آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی
رس ہی رس جن میں ہے اور سیل ذرا سی بھی نہیں
مانگتا ہے کہیں ان آنکھوں کا مارا پانی

کچھ کہو بھی تو اب سنے گا کون   ہونٹ ہلنے پہ اس نے ٹوکا ہے
بہتے آنسو تو روک لے جس نے   ندیوں کا بہاؤ روکا ہے

وہ کہے جاتے ہیں کہ دیکھ ادھر میں سمجھتا ہوں یہ بھی دھوکا ہے
آرزو ہاتھ وہ نہ چھٹنے پائے
جس نے گرنے سے تجھ کو روکا ہے

آہ وہ کھینچی کہ محفل بھر کو برہم کر دیا
آج دو حرفوں میں ہم نے شکوۂ غم کر دیا
راز کیونکر چھپ سکے تدبیر کیونکر بن پڑے
بے خودی کو عشق نے سب پر مقدم کر دیا
بن کے آئینے کا پردہ رخ کے اُڑتے رنگ نے
رازِ پنہاں کا زمانے بھر کو محرم کر دیا
شربت امید تو نے تشنۂ دیدار کو
تھوڑا تھوڑا سا دیا اور وہ بھی تھم تھم کر دیا
او نگاہ بے مروت کھول کر اپنے فریب
اک ذرا سی تھی خوشی دل میں جسے غم کر دیا
بڑھتے بڑھتے روشنی نے شعلۂ جاں سوز کی
رات کیسی ایک حصہ عمر کا کم کر دیا
آرزو بے موت مارا کھنچکے قاتل نے مجھے
اسقدر حسرت میں تڑپایا کہ بے دم کر دیا

وہ سر بام کب نہیں آتا — جب میں ہوتا ہوں جب نہیں آتا
پھر تسکیں وہ کب نہیں آتا — اعتبار آہ اب نہیں آتا
چپ ہے شکووں کی ایک بند کتاب — اُس سے کہنے کا ڈھب نہیں آتا
اُن کے آگے بھی دل کو چین نہیں — بے ادب کو ادب نہیں آتا
زخم سے کم نہیں ہے اُس کی ہنسی — جس کو رونا بھی اب نہیں آتا
منہ کو آجاتا ہے جگر غم سے — اور گلہ تا بہ لب نہیں آتا
زہر نعمت ' نہ موت لائق شوق — کیا کریں چین جب نہیں آتا
بھولی باتوں پہ تیری دل کو یقیں — پہلے آتا تھا اب نہیں آتا
آرزو بے اثر محبت چھوڑ
کیوں کرے کام جب نہیں آتا

دل جن کا گیا ہے رنج انہیں ' جو پا گئے ہیں خوش ہوتے ہیں
یہ اپنی اپنی قسمت ہے وہ ہنستے ہیں ہم روتے ہیں

ہر چند کئے مردے زندہ ' بیمار ہی نام آنکھوں کا رہا
ہوتا نہیں اُن سے علاج اپنا ' دکھ درد جو سبکا کھوتے ہیں

محفل میں ہے مجمع اہل نظر ' رسوائی اُلفت کا بھی ہے ڈر
رہتا جو نہیں قابو دل پر ' ہم آنکھ بچا کر روتے ہیں

ہو چاہے کسی کی بربادی چھُوٹے گی نہ آرائش اُن کی
لڑیاں ہیں یہاں اشکوں کی بندھی بالوں میں وہ موتی پروتے ہیں

دیکھے ہیں جو اُن کے لطف و ستم ' پتُلے ہیں اُمید و بیم کے ہم
شادی ہی مقدر میں ہے نہ غم ' نہ ہنسی آتی ہے نہ روتے ہیں

اُلفت میں سلیقہ جو جس کا انجام بگڑنا یا بننا
کچھ اپنے کئے پر ہنستے ہیں کچھ اپنے کئے پر روتے ہیں

پھر کیا تھا جو دل میں خوف نہ تھا ' عاشق کے خون ناحق کا
کیا شان میں دھبّا لگتا تھا دامن سے جو داغ وہ دھوتے ہیں

فرقت میں کہاں وہ خوش طبعی غم سے ہے طبیعت کھسیانی
روتوں کو ہنسا دیتے تھے کبھی یا آپ ہنسی میں روتے ہیں

بس آرزو اب خاموش رہو ہوتی ہے جو کچھ بیداد سہو
شکوہ نہ کرو منہ سے نہ کہو معشوق سب ایسے ہوتے ہیں

یہ جو دو اک بہار کے دن ہیں
زندگی میں شمار کے دن ہیں

فرق لذت کا ہے اگر احساس
تو خزاں بھی بہار کے دن ہیں

ظلم ہے عمر میں شمار اُن کا
ایسے کچھ انتظار کے دن ہیں

جوشِ گُل میں بھی خار کی ہے خلش
اک مصیبت بہار کے دن ہیں

ہے معیّن نفس کی آمد و شد
عمر کتنی' شمار کے دن ہیں

مدتِ وعدہ دور ہے اے دل
تھم کہ صبر و قرار کے دن ہیں

آرزو ملتفت ہے کوئی حسیں
شکوے چھوڑو کہ پیار کے دن ہیں

غم دیا ہے کہ مسرت دی ہے
سب میں اک طرح کی لذت دی ہے

ہنس نہ اتنا کہ خوشی غم ہو جائے
شے ہر اک حسب ضرورت دی ہے

جام چھوٹا ہے پہ رشک بحرین | دل میں کونین کی وسعت دی ہے
اس عنایت کو کہوں کیا مالک | دل دیا ہے کہ مصیبت دی ہے
میں کہاں اور کہاں دردِ فراق | کرم اُس کا کہ یہ نعمت دی ہے
ترک پر مجھ کو نہیں ہے قابو | اُس سے کہہ جس نے محبت دی ہے

عشق پر آن بان صدقے ہے | دل کی خواہش پہ جان صدقے ہے
دل ہے خود اپنے ولولوں پہ نثار | باغ پر باغبان صدقے ہے
ہو فقیری میں کامل استغنا | تو امیری کی شان صدقے ہے
آرزو دل کی ہے عجب بستی | جس پہ سارا جہان صدقے ہے

سیماب اکبرآبادی

عاشق حسین نام سیماب تخلص جمادی الثانی ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولانا محمد حسین صدیقی بڑے عالم و فاضل بزرگ تھے جو عرصہ تک اجمیر شریف میں ٹائمس آف انڈیا پریس کی شاخ کے افسر اعلیٰ رہے۔ سیماب نے عربی ادب اصول اور منطق کی تکمیل کی اور فارسی میں بھی کافی دستگاہ بہم پہنچائی۔ اس کے بعد انگریزی کی طرف متوجہ ہوئے لیکن ایف اے کا دوسرا سال تھا کہ والد کا انتقال ہو گیا چنانچہ مجبوراً کالج چھوڑ کر تلاش معاش میں کانپور پہنچے جہاں انہیں ریلوے کے محکمے میں ملازمت مل گئی۔

شاعری مولانا سیماب کا فطری ذوق اور آبائی میراث تھی چنانچہ زمانہ طالب علمی ھی میں شعر کہنے لگ گئے تھے لیکن کانپور کے دوران قیام میں لکھنوی شعرا کی صحبتوں نے اس شوق کے لئے مہمیز کا کام کیا۔ ۱۸۹۸ء میں فصیح الملک داغ دھلوی کے شاگرد ہوئے اور اُن کی مشفقانہ نصیحت و مشورہ سے مشق سخن جاری رکھ کر جلد ھی پختگئی کلام کے مدارج طے کر لئے۔ اس دوران میں کانپور کی ملازمت ترک کر کے کچھ عرصہ اجمیر شریف میں بھی بسلسلۂ معاش مقیم رہے۔ بالاخر فطری ذوق شعری اور خدمت زبان و ادب کا جذبہ غالب آیا اور آپ اس ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن آگرہ پہنچے اور رسالہ ''مرصع'' کی ادارت شروع کی۔ پھر ٹونڈلہ میں ''آگرہ اخبار'' کی ادارت سنبھالی۔ کچھ عرصہ اپنے شاگرد رشید ساغر نظامی کے ساتھ لاھور میں بھی قیام کیا لیکن جب یہاں کی فضا ناسازگار ثابت ہوئی تو آگرہ واپس چلے گئے اور ھمہ تن شعر و ادب کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔

مولانا سیماب نے ۱۹۲۱ء میں آگرہ میں ''قصرالادب'' کے نام سے تصنیف و تالیف کا ایک ادارہ قائم کیا جس میں نو مشق شعرا کے کلام پر اصلاح دی جاتی تھی۔ اس ادارہ کی بدولت جہاں مولانا کی تصانیف و تالیفات میں اضافہ ہوا وہاں تلامذہ کا حلقہ بھی بہت وسیع ہو گیا۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء تک بقول خود اُنہوں نے ۲۸۳ کتابیں لکھیں اور تلامذہ و عقیدت مند تو تقریباً ہندوستان کے ہر حصے میں پائے جاتے ھیں۔ رسائل میں مولانا نے ''پیمانہ'' ''ثریا'' اور ''شاعر'' جاری کئے جن میں مؤخرالذکر اصلاح زبان و ادب کا رسالہ تھا یہ رسالہ قیام پاکستان تک آگرہ سے نکلتا رہا۔

تقسیم ھند کے بعد مولانا سیماب کراچی تشریف لے آئے تھے لیکن چونکہ بہت ضعیف ہو چکے تھے اس لئے عموماً بیمار رہتے تھے لیکن بایں ھمہ فکر شعر جاری تھی اور کراچی کے جرائد و اخبارات میں آپ کی نظمیں چھپتی رہتی تھیں آخر ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء کو ۷۱ سال کی عمر میں موصوف نے کراچی ھی میں انتقال فرمایا ۔

حضرت سیماب کا شمار اُردو شاعری کے مشہور اساتذہ میں ہوتا ھے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اُنھیں کے دم سے اُردو شاعری میں آگرہ اسکول کا نام زندہ تھا ۔ اُنھوں نے بڑی سر گرمی و خلوص کے ساتھ اُردو کی خدمت کی اور اُردو شاعری کی تو وہ پوری دنیا اور اُس کے سارے ماحول میں اصلاح کے متمنی تھے ۔ چنانچہ اپنے شاعرانہ معتقدات و مقصد شاعری کے سلسلے میں فرماتے ھیں ''اوائل مشق سخن تک مجھے قدیم تغزل سے دلچسپی تھی لیکن وقت اور زمانے کے ساتھ علم و معلومات کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا گیا رنگ قدیم سے لگاؤ کم ہوتا گیا ۔ اب شاعری میں بلند خیالات اور بلند انسانی جذبات کی ترجمانی کا حامی ہوں ۔ میں شاعری میں ' فلسفہ ' اور حقائق و معارف کے نکات پسند کرتا ہوں ۔ میں اُس شاعری کا منکر ہوں جس کا موضوع صرف عورت اور اُس کے متعلقات ہوں ۔ میری شاعری کا موضوع حسن محض اور عشق محض ھے'' اور اس میں شک نہیں کہ مولانا موصوف کی شاعری اُن کے اس نظریہ کی آئینہ دار ھے ۔

حضرت سیماب نے اگرچہ شاعری کا آغاز غزل ھی سے کیا لیکن اُن کی غزلوں میں تقلید و فرسودگی کے بجائے جدت خیال اور طرز ادا میں شاعرانہ متانت کی جلوہ گری پائی جاتی ھے ۔ بقول ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب ''وہ انگریزی شاعری کے پوپ ' ڈرائیڈن اور جانسن کے کلاسیکی اسکول سے زیادہ ملتے ھیں ۔ اور معشوق حقیقی کے پرستار ہونے کی وجہ سے وہ درد سے بہت مشابہ ھیں ۔ لیکن سپردگی اور استغراق کی ابھی اُن کے ہاں کمی ھے جو درد کی ممتاز صفت ھے ۔ وہ اگر بے اختیار ہونا بھی چاھتے ھیں تو اُن کی کوشش کا عنصر بے نقاب ہو جاتا ھے'' ۔ اور اس سپردگی و استغراق کی کمی کا سبب غالباً یہی ھے کہ باوجودیکہ اُنھیں تصوف سے ذوق بھی تھا اور وہ حضرت حاجی حافظ سید وارث علی شاہ صاحب سے بیعت بھی تھے لیکن چونکہ جذبات سے زیادہ خیالات و فلسفہ کے مضامین کو اپناتے تھے اس لئے سوز و گداز اور اثر کی اُن کے یہاں نمایاں کمی محسوس ہوتی ھے ۔

مولانا سیماب نے غزلوں کے علاوہ جدید رنگ کی نظمیں بھی کہی ھیں ۔ جن کو دیکھ کر اُن کی وسیع النظری اور ھندوستان بلکہ ھمہ گیر مسائل سے دلچسپی کا پتہ چلتا ھے ۔ یہ منظومات اپنی پختگی ' متانت ' صفائی اور سادگی کے لحاظ سے بڑی عمدہ نظمیں ھیں لیکن مولانا کی فطری متانت و سنجیدگی کی وجہ سے ان میں جوش و خروش زیادہ نہیں پایا جاتا ۔ تاھم یہ مسلم ھے کہ مولانا نے عصر جدید کے تمام تحریکی مسائل پر اپنے جذبات کا بھرپور اظہار کیا ھے ۔

مختصر یہ کہ حضرت سیماب عصر حاضر کے خوش گو و خوش فکر شعرا میں سے تھے اور اُن کے کلام سے اس دور کے تمام رحجانات معلوم ہو جاتے ھیں ۔ اُنھوں نے ہر رنگ میں شعر کہے ھیں اور ہر جذبے کی ترجمانی کی ھے ۔ مولانا کو منظر نگاری کا بڑا اچھا

سلیقہ تھا اور اُن کے اُسلوب میں ایک شگفتگی پائی جاتی تھی یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ وہ ایک قادر الکلام اور مشاق سخنور تھے اور اُنھیں ہر اُسلوب سخن پر یکساں قدرت حاصل تھی لیکن وہ اپنی نظموں میں زیادہ پھلے پھولے اور اُن کا کلام علاوہ اور خوبیوں کے لطافت زبان و تکمیل فن کی پوری تصویر ہے۔

انتخاب کلام

تغزل

قفس سے چھٹ کے بڑی دیر میں ٹھکانہ ملا — خیال سے بھی کہیں دور آشیانہ ملا
تعینات کے پردوں میں چھپ کے بیٹھ گئے — حجاب کا یہ اُنھیں اور بھی بہانہ ملا
سنا ہے طور پہ تم بے حجاب آئے تھے — یہ رشک ہے کہ ہمیں کیوں نہ وہ زمانہ ملا

ہو کتنی ہی خوش گوار پھر بھی — ہے دل کے لئے بلا تمنا
دیتے ہو پیام آرزو تم — جب ترک میں کر چکا تمنا

ہستی و نیستی کی حدیں دور رہ گئیں — یہ آ گیا کہاں میں تجھے ڈھونڈتا ہوا

نہ تھا وہ بھید کہ دنیا مجھے سمجھ لیتی
میں خود بھی اپنے سمجھنے میں کامیاب نہ تھا

جب تک غم اُلفت کا عنصر نہ ملا ہوگا
انسان کے پہلو میں دل بن نہ سکا ہوگا

میں ہو کر خاک اے سیماب جزوِ کل ہوا آخر
مرے شیرازۂ ہستی کو راس آیا بکھر جانا

یہ ایک راز تھا اعلانِ عفو میں اُن کے — کہے نہ کوئی کہ انسان گناہ کر نہ سکا

رفتہ رفتہ سمجھ میں آئے گا   میرا نغمہ ہے دور کی آواز

ضبط سے نا آشنا ہم ' صبر سے بیگانہ ہم
انجمن میں ہیں شریکِ قسمتِ پروانہ ہم
خود ہی سازِ بے خودی کو چھیڑ دیتے ہیں کبھی
خود ہی سنتے ہیں حدیث ساغر و پیمانہ ہم
دفعتاً سازِ دو عالم بے صدا ہو جائے گا
کہتے کہتے رک گئے جس دن ترا افسانہ ہم
وحدت و کثرت میں ہیں دو جلوہ گاہیں دوست کی
اک تجلی خانہ دنیا ' اک تجلی خانہ ہم
دل جلا پھر خود جلے پھر ساری دنیا جل اٹھی
سوز لائے تھے بہ مقدار پر پروانہ ہم
جب ہمیں دیوانہ بننا ہے تو کیسی مصلحت
مصلحت کو بھی بنا لیں گے ترا دیوانہ ہم

کبھی پھول بن کر ' کبھی اشک بن کر   ہو رنگینئی دامن و آستیں تم

ہر چیز پر بہار تھی ' ہر شے میں حسن تھا   دنیا جوان تھی مرے عہد شباب میں

شباب اک سانحہ تھا ' ہو چکا ' اب صرف کاہش ہے
مری راتیں مجھے الجھا گئیں خوابِ پریشاں میں

عبودیت بقدر ذوق ' شایان نوازش ہے
خلوص دل سے اک سجدہ بہت ہے زندگی بھر میں

معمورۂ فنا کی کوتاہیاں تو دیکھو
اک موت کا بھی دن ہے دو دن کی زندگی میں

بے خودی میں بھی نہ بھولا میں رہ منزل دوست
سرخوشی میں بھی مرے پاؤں کو لغزش نہ ہوئی

سوزش کدۂ حشر کہاں اور کہاں میں!
یہ دیکھنے آیا ہوں، یہاں تُو تو نہیں ہے

رقص فرما ہیں ہزاروں طور لاکھوں بجلیاں
کون ہے آیا قریب جلوہ گاہ دل مجھے
پہلے وحشت دی مجھے پھر اس کی رحمت دیکھئے
عمر بھر کو دیدیا زندان آب و گل مجھے
اضطراب دل سے اے سیاب کیوں گھبراؤں میں
کچھ سمجھ کر ہی دیا ہے اضطراب دل مجھے

رہ و رسم آشنا ہوں، سعی میری رائیگاں کیوں ہو
جو منزل سے بھٹک جائے وہ میرا کارواں کیوں ہو
ملو تو ہر جگہ، یعنی تعیّن کی حدیں توڑو
نہیں ہے جب مکاں کی قید، قید لامکاں کیوں ہو
جبیں ہم جس جگہ رکھدینگے اک کعبہ بنا لیں گے
سلامت ذوق سجدہ آپ ہی کا آستاں کیوں ہو
جھکا دے سر اسی پر سامنے آ جائے جو ذرہ
کہ جب سجدہ ہی کرنا ہے تو قید آستاں کیوں ہو
شہیدان بہار اپنا تصرف گر نہ فرمائیں
تو پھر رنگین اے سیاب صبح گلستاں کیوں ہو

چمک جگنو کی برق بے اماں معلوم ہوتی ہے
قفس میں رہ کے قدر آشیاں معلوم ہوتی ہے
کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے
سحر تک سعی نالہ رائیگاں معلوم ہوتی ہے
یہ دنیا تو بقدر یک فغاں معلوم ہوتی ہے

کسی کے دل میں گنجائش نہیں وہ بار ہستی ہوں
لحد کو بھی مری مٹی گراں معلوم ہوتی ہے

خزاں کے وقت بھی خاموش رہتی ہے فضا ساری
چمن کی پتی پتی رازداں معلوم ہوتی ہے

چمن کے سانحے کو مدتیں گزریں مگر اب بھی
چمکتی ہے جو بجلی آشیاں معلوم ہوتی ہے

ہوائے شوق کی قوت وہاں لے آئی ہے مجھ کو
جہاں منزل بھی گردِ کارواں معلوم ہوتی ہے

ترقی پر ہے روز افزوں خلش دردِ محبت کی
جہاں محسوس ہوتی ہے وہاں معلوم ہوتی ہے

قفس کی تیلیوں میں جانے کیا ترکیب رکھی ہے
کہ ہر بجلی قریب آشیاں معلوم ہوتی ہے

نہ کیوں سیماب مجھ کو قدر ہو ویرانئی دل کی
یہ بنیادِ نشاط دو جہاں معلوم ہوتی ہے

عہد نو

انقلاب نو کے آنے کا زمانہ آ گیا
ہمتِ دل آزمانے کا زمانہ آ گیا

رات بھر شمعیں جلانے کا زمانہ آ گیا
گرمئی محفل بڑھانے کا زمانہ آ گیا

آتشیں نغمے سنانے کا زمانہ آ گیا
زندگی کی لو بڑھانے کا زمانہ آ گیا

وقت وہ رخصت ہوا جب بن گیا تھا درد دل
درد کو پھر دل بنانے کا زمانہ آ گیا

حسن کے پردے اٹھانے کا محل باقی نہیں
عقل سے پردے اٹھانے کا زمانہ آ گیا

دل کو دیوانہ بنانے کا ہے موقع اب کہاں
ہوش میں دنیا کو لانے کا زمانہ آ گیا

اب مہ و خورشید بننے سے بھی نکلے گا نہ کام

برق بن کر جگمگانے کا زمانہ آ گیا

جھونپڑوں کی سمت ایوانوں سے ہے نقل بہار
غمزدوں کے مسکرانے کا زمانہ آ گیا

آسمانی اک کششِ ہے مژدہ بخش ارتقا
بیکسوں کے سر اُٹھانے کا زمانہ آ گیا

کیجئے کیوں انتظارِ آمدِ ابر بہار
اب تو خود گلشن پہ چھانے کا زمانہ آ گیا

قبر کی سی نیند اب آنکھوں پہ مستولی نہیں
جاگنے کا اور جگانے کا زمانہ آ گیا

کیوں سمٹ کر بٹھیئے گوشوں میں سائے کی طرح
دھوپ بن کر پھیل جانے کا زمانہ آ گیا

پھر وھی رفعت مآبی پھر وھی جوش نشاط
پھر وھی اگلے زمانے کا زمانہ آ گیا

مزدور

گرد چہرے پر، پسینے میں جبیں ڈوبی ھوئی
آنسوؤں میں کہنیوں تک آستیں ڈوبی ھوئی

پیٹھ پر ناقابلِ برداشت اک بار گراں
ضعف سے لرزی ھوئی سارے بدن کی جھریاں

ھڈیوں میں تیز چلنے سے چٹخنے کی صدا
درد میں ڈوبی ھوئی مجروح ٹخنے کی صدا

پاؤں مٹی کی تہوں میں میل سے چکٹے ھوئے
ایک بدبودار میلا چیتھڑا باندھے ھوئے

جارھا ھے جانور کی طرح گھبراتا ھوا
ھانپتا، گرتا، لرزتا، ٹھوکریں کھاتا ھوا

مضمحل واماندگی سے اور فاقوں سے نڈھال
چار پیسے کی توقع، سارے کنبے کا خیال

اپنے ھم جنسوں کی بے مہری سے مایوس و ملول
صفحۂ ھستی پہ اک سطر غلط مدِّ فضول

اپنی خلقت کو گناہوں کی سزا سمجھے ہوئے
آدمی ہونے کو لعنت اور بلا سمجھے ہوئے
زندگی کو ناگوار اک سانحہ جانے ہوئے
بزم کبر و ناز میں فرض اپنا پہچانے ہوئے
راستے میں راہگیروں کی نظر سے بے نیاز
شورش ماتم سے، نغموں کے اثر سے بے نیاز
اس کے دل تک زندگی کی روشنی جاتی نہیں
بھول کر بھی اس کے ہونٹوں پر ہنسی آتی نہیں
ایک لمحہ بھی نہیں فکر معیشت سے نجات
صبح ہو یا شام، ہے تاریک اس کی کائنات
دیکھ اے قارون اعظم! دیکھ اے سرمایہ دار!
نامرادی کا مرقع، بے کسی کا شاہکار

گو ہے تیری ہی طرح انسان، مگر مقہور ہے
دیکھ اے دولت کے اندھے سانپ! یہ مزدور ہے

تاروں کا گیت

ہم برق کے زندہ ٹکڑے ہیں، ہم جنت کے پروانے ہیں
لبریز شراب فطرت سے ہے گردش کے پیمانے ہیں
ہم جلوے ہیں اور خود اپنے جلوے شب بھر چمکاتے ہیں
ہم نغمے ہیں اور خود اپنے معصوم ترانے گاتے ہیں
تخلیق ہماری نور سے ہے، ترکیب آب و کافور سے ہے
ہر وقت تعلق روحانی اک میکدۂ مستور سے ہے
کچھ بھیگی بھیگی آوازیں الہام کدے سے آتی ہیں
گرتے ہی ہمارے ہونٹوں پر شیریں نغمے بن جاتی ہیں
ہم اپنے شیریں نغموں سے برساتے ہیں بیداری سی
بہنے لگتی ہے دنیا کے ایوانوں پر سرشاری سی
مضراب نگاہِ فطرت ہے، مہتاب رباب زرّیں ہے
ان نغموں کی بوچھاروں سے یہ ساز ہستی رنگیں ہے

اے دنیا کے رہنے والو تم کیوں مغموم پستی ہو
هم بهی اُس کی آبادی هیں تم جس دنیا کی بستی هو
تم میں هم میں کچھ فرق نہیں ' مخلوق خدا کی دونوں هیں
وابستہ ایک هی رشتے سے یہ نوری خاکی دونوں هیں
هاں فرق اگر هے تو اتنا هم هنستے هیں تم روتے هو
هم جاگتے رهتے هیں شب بهر ' تم غافل هو کر سوتے هو
هاں فرق اگر هے تو اتنا هم روحانی گہوارے هیں
ملفوف تکدر میں تم هو ' هم نزهت کے فوّارے هیں
هاں فرق اگر هے تو اتنا تم اپنی حقیقت بهول گئے
هم اپنی حقیقت پہچانے ' باطل کی لعنت بهول گئے
هاں فرق اگر هے تو اتنا هم بے خود هیں خوددار هو تم
هم مست جمال عرفاں سے اور بد مستِ پندار هو تم
هاں فرق اگر هے تو اتنا تم غافل هو بیدار هیں هم
اُس نشے سے محروم هو تم جس نشے سے سر شار هیں هم
جو نورِ حقیقت هم میں هے وہ تم میں بهی تابندہ هے
لیکن هے تمهارا دل مردہ اور روح هماری زندہ هے

جب رات کا سنّاٹا سطح عالم پر طاری هوتا هے
تخلیق پہ غفلت کا فرمانِ مُہلک جاری هوتا هے
تاریک شعائیں شعلوں سے دوزخ سے نکالی جاتی هیں
اس تاریکی سے غفلت کی زنجیریں ڈهالی جاتی هیں
پهیلایا جاتا هے اُن کو هستی کے میدانوں پر
پهینکا جاتا هے پهر اُن کو عشرت انداز ایوانوں پر
انسان شعاعِ نور سمجھ کر راحت میں کهو جاتا هے
نادان مقّید خود هی ان زنجیروں میں هو جاتا هے
عشرت جس کو یہ سمجھا هے وہ موت هے غافل انسان کی
تن آسانی کی ظلمت میں لٹتی هے محفل انسان کی

تم رات کو اے دنیا والو ! فکر راحت میں مرتے ہو
یوں ضائع آدھی عمر اپنی اک خواب گراں میں کرتے ہو
ہم اپنے روشن گیتوں سے جب رات جگانے آتے ہیں
آغوش اجل میں خوابیدہ ساری دنیا کو پاتے ہیں
تم سن نہیں سکتے وہ نغمے جن سے غفلت شرماتی ہے
جب آن کی آگ برستی ہے ساری ہستی تھرّاتی ہے
ہم روح کی مستی سے بھر کر پیمانے اپنے لاتے ہیں
پیغام سکونِ ہستی کا انسان کو دینے آتے ہیں

اے غافل انساں جاگ کبھی ' ہم سے فیض روحانی لے
جانِ محزوں کی تسکین لے ' غمگیں دل کی تابانی لے
اے غافل انسان جاگ کبھی ' بے مانگے دولت لٹتی ہے
تو وقت گنواتا ہے سو کر اور شب کو نعمت لٹتی ہے
اے غافل انسان دیکھ کبھی ' پچھلے کو کیا کچھ ہوتا ہے
فطرت ملنے کو آتی ہے اور تو بے پروا سوتا ہے
اے غافل انسان سوچ کبھی ' یہ راز نہیں آئینہ ہے
وہ موت کو خود کیوں دعوت دے ' جسکو دنیا میں جینا ہے
یہ گیت ہے وحیٔ عرشِ خدا ' الہام کی صوتِ راز ہے یہ
جس ساز کا تو اک پردہ ہے ' اس کی رنگیں آواز ہے یہ

اذان ہمالہ

اپنے وطن کا میں دیوتا ہوں — چادر سہانی اوڑھے کھڑا ہوں
فطرت شناس بزم فنا ہوں — خاموش رہ کر کچھ کہہ رہا ہوں
گویا ہے ہر دم میری زبان پر
اللہ اکبر اللہ اکبر
صحرا ہیں دامن میری قبا کے — کہسار سائے ہیں دست اور پا کے
ہیں میری سانسیں جھونکے ہوا کے — مجھ سے عیاں ہیں جلوے خدا کے
ایک آنکھ مسجد ' ایک آنکھ منذر
اللہ اکبر ' اللہ اکبر

گنگ و جمن ہیں میرے ہی آنسو موجوں میں جنکی ڈھلتے ہیں جگنو
جنکی فضائیں دلچسپ و دلجُو ہر سمت جاری ' مواّج ہر سو
رقصاں مسلسل ' جولاں برابر
اللہ اکبر ' اللہ اکبر

دنیا کے دل میں ہیبت ہے میری سب پر مسلّم عظمت ہے میری
مشرق پہ طاری سطوت ہے میری اس کا سہارا قوّت ہے میری
رفعت ہے میری سدِّ سکندر
اللہ اکبر ' اللہ اکبر

میری جٹا سے بادل رواں ہیں اسرار فطرت مجھ میں نہاں ہیں
آثار میرے تا آسماں ہیں میری فلک رس وہ چوٹیاں ہیں
جن تک نہ پہنچا کوئی دلاور
اللہ اکبر ' اللہ اکبر

تیرِ حوادث مجھ پہ چلے بھی مجھ پہ پڑے بھی صدمے ٹلے بھی
نقشے بُرے بھی دیکھے بھلے بھی طوفاں بھی آئے اور زلزلے بھی
لیکن نہ میرا نیچا ہوا سر
اللہ اکبر ' اللہ اکبر

اے اھلِ مشرق مجھ سے سبق لو عظمت سے میری تعلیم حق لو
چاک سحر سے سادہ ورق لو کلکِ شعاع و خونِ شفق لو
خود داریوں کے لکھ جاؤ دفتر
اللہ اکبر ' اللہ اکبر

ہو جاؤ مائل صدقِ و وفا پر آ جاؤ راہِ منزل نما پر
کر کے بھروسہ فضلِ خدا پر پرچم جما دو قلبِ فضا پر
اک دن دکھا دو آزاد ہو کر
اللہ اکبر ' اللہ اکبر

وحشت کلکتوی

رضا علی نام وحشت تخلص ۱۸ نومبر ۱۸۸۱ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد مولوی شمشاد علی مرحوم شہر ہگلی میں رہا کرتے تھے ۔ جہاں وحشت صاحب کے دادا حکیم غالب علی مرحوم غدر ۱۸۵۷ء کے بعد دھلی سے آ کر آباد ہو گئے تھے ۔ وحشت کی تعلیم مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں ہوئی ۔ شعر و شاعری کا ذرق بچپن ہی سے تھا ۔ چنانچہ اس فطری میلان طبع کے باعث طالب علمی ہی کے زمانے سے شعر کہنا شروع کر دئے تھے ۔ ۱۸۹۸ء میں مولوی ابوالقاسم محمد شمس مرحوم شاگرد حضرت داغ دھلوی و خلف‌الرشید مولوی عبدالغفور خاں نساخ سے تلمذ اختیار کیا اور آردو کے ساتھ ساتھ فارسی شاعری سے بھی رغبت رھی بنا بریں آن کے پہلے دیوان میں ' جو دیوان وحشت کے نام سے ۱۹۱۰ء میں ستارۂ ہند پریس کلکتہ میں طبع ہوا تھا ' کچھ فارسی کلام بھی موجود ہے ۔

وحشت صاحب نے اعلیٰ تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد پہلے امپیریل ریکارڈ ڈیپارٹمنٹ کلکتہ میں شعبۂ فارسی کے ''چیف مولوی'' کی حیثیت سے ملازمت کی ۔ ۱۹۲۶ء میں جب اسلامیہ کالج کلکتہ قائم ہوا تو وھاں آردو کے پروفیسر مقرر ہو گئے ۔ ۱۹۳۱ء میں سرکار انگریزی سے ''خان بہادر'' کا خطاب ملا ۔ اور ۱۹۳۶ء میں پنشن ہو گئی ۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد مشرقی پاکستان چلے گئے اور فی‌الحال ڈھاکہ میں سکونت پذیر ہیں ۔

وحشت صاحب بڑے ستھرے ادبی مذاق کے مالک ہیں اور اب چونکہ فراغت کے دن گزار رہے ہیں اس لئے آن کی ادبی سرگرمیوں میں بہت اضافہ ہوگیا ہے ۔ ہند و پاکستان کے معتدد رسائل میں آج بھی وحشت صاحب کے علمی و تنقیدی مضامین برابر چھپتے رہتے ہیں اور آن کی تازہ بتازہ نو بہ نو غزلوں کا تو کیا ہی کہنا ! وحشت صاحب کا تازہ مجموعہ کلام (جس میں دیوان وحشت بطور ضمیمہ شامل ہے) ۱۹۵۰ء میں ''ترانۂ وحشت'' کے نام سے لاہور میں شائع ہوا ہے ۔ جسکے اشعار کی مجموعی تعداد تقریباً چار ہزار ہوگی ۔ مجموعہ میں یوں تو غزلیات ' قطعات ' رباعیات ' سہرے ' مخمس ' مسدس اور چند نظمیں بھی ہیں ۔ لیکن غزلیات سب پر حاوی ہیں اور وحشت صاحب کو غزل ہی سے صحیح معنوں میں مناسبت بھی ہے ۔

وحشت صاحب کے پہلے دیوان کی اشاعت کے بعد مولانا حالی ، علامہ شبلی حضرت ظہیر دہلوی (شاگرد ذوق) علامہ اقبال ، مولانا حسرت موہانی اور دیگر اکابر عصر نے کلام وحشت کی بہت تحسین کی ۔ بالخصوص مولانا حالی نے طرز وحشت کو بڑا سراہا ۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وحشت صاحب نے تتبع غالب کا پورا پورا حق ادا کیا ہے ۔ اور اب ''ترانۂ وحشت'' کے شائع ہونے پر بھی ہند و پاکستان کے مقتدر نقادوں نے وحشت کے تغزل کی بڑی تعریف و توصیف کی ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ وحشت صاحب عصر حاضر کے اُن چند برگزیدہ شعرا میں سے ہیں جن کے حسن کلام اور ذوق شعری پر اُردو شاعری کو ناز ہے ۔ اُنہوں نے اپنے ابتدائی کلام میں فصیح الملک داغ دہلوی ، امیر مینائی اور جلال لکھنوی جیسے اساتذہ کرام کی پیروی کی اور اپنے اس دور کے رنگ میں ان بزرگوں کے اسلوب سے ایک حد تک متاثر بھی ہوئے لیکن ساتھ ہی اُنہیں غالب جیسے نادر و ممتاز فنکار سے برابر عقیدت رہی ۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں رنگ غالب کافی نمایاں نظر آتا ہے ۔ بالخصوص جہاں تک فارسی تراکیب کا تعلق ہے اُنہوں نے غالب و مومن کی طرح بڑی عمدگی سے فارسی ترکیبیں وضع بھی کی ہیں اور اُنہیں بڑے سلیقہ و خوش اسلوبی سے بر محل استعمال بھی کیا ہے ۔ چنانچہ وحشت آباد جہاں ، شیوۂ تسلیم و رضا ، مانع ذوق خرابی ، خراب بادہ اُلفت ، کافر نظری ، شکر بے کیفہائے تمنا ، گریۂ بے اختیار شوق ، تغافل صبر آزما ، پردہ دار شوق وغیرہ اور اس قبیل کی بلا مبالغہ سینکڑوں تراکیب کو پڑھ کر بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب کے اشعار پڑھ رہے ہیں ۔ حالانکہ ان اشعار میں وہ پرواز تخیل اور علوئے مضامین تو نہیں ہے جو غالب کا حصہ تھا لیکن زبان و اظہار خیال کے اعتبار سے وحشت نے غالب کی پوری پوری عکسی کی ہے ۔ مثلاً

بسان دیدۂ بسمل زیارت گاہ حسرت ہوں
مری ہر ہر نگہ فریاد کرتی ہے زباں ہو کر

نہیں آئین استغنا ، حریف عجز مشتاقی
دلِ آئینہ محو بیقراری ہائے جوہر تھا

شہید انتظار جلوہ دیدار ساقی تو
حریف چشم وا گر دیدۂ مشتاق ساغر تھا

شوقِ بہار میں کوئی دیکھے بہارِ شوق
دیوانہ ہوں چمن کا زہے کاروبار شوق

اب جبکہ ''ترانۂ وحشت'' شائع ہو چکا ہے اور جناب وحشت کا مزید چالیس سال کا شعری سرمایہ یکجا صورت میں ہمارے سامنے ہے - ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اب اُن کا تقلیدی انداز ختم ہو چکا ہے اور موجودہ زمانے میں وہ اُردو کے بہترین متغزلین میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں - اُن کے کلام میں فنی پختگی اپنے منتہائے کمال کو پہنچ چکی ہے - ان کی اکثر غزلوں میں جدت خیال اور ندرت بیان کے ایسے ایسے عمدہ نمونے ملتے ہیں جو صحیح معنوں میں بے مثل و بے نظیر ہیں - وحشت کی نازک خیالی و معنی آفرینی ذوق سلیم سے خراج تحسین وصول کرتی ہے اور اُن کے ترانے بجا طور پر وجد آور کہلانے کے مستحق ہیں - اُن کے ابتدائی رنگ سخن میں جو علمیت کی زیادتی اور شعریت کی کمی کا اک احساس ہوتا تھا وہ اب ختم ہو چکا ہے اب بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وحشت کی غزل مجسم شعریت بن چکی ہے - جو پڑھنے والوں کو مسحور کئے بغیر نہیں رہتی - وحشت کے تغزل کی انفرادیت اور اُن کا ایک مخصوص قسم کا رکھ رکھاؤ - اُن کی طباعی پردال ہے جس کی بدولت وحشت اپنے قارئین کے دل میں ایک عجیب طرح کی کشش پیدا کر دیتے ہیں -

وحشت کی غزل میں جدت تراکیب کے ساتھ ' نادر تشبیہات و استعارات کی بھی کمی نہیں - مزید برآں وہ پند و نصائح کی باتوں کو بڑے دلنشین و دلفریب انداز میں پیش کرتے ہیں - زبان کے معاملہ میں وحشت کو جس بلا کا عبور حاصل ہے وہ یقیناً لائق تحسین و داد ہے -

خلاصہ کلام یہ کہ جناب وحشت کا دم غنیمت ہے اور اُن جیسے کہنہ مشق شاعر اُردو کو اب کم ہی نصیب ہوں گے - حسرت موہانی مرحوم نے غزل کے عروق مردہ میں نئی روح پھونک کر دوبارہ صنف غزل کو زندہ کیا اور وحشت صاحب بجا طور پر اُس کی پرورش کر رہے ہیں - اور موصوف کی یہ خدمت ہزار تحسین و آفرین کی مستحق ہے - آخر میں اُن کے کلام کے بارے میں مولانا حسرت موہانی کا یہ شعر نقل کرنے کو بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ -

خوبئ اشعار وحشت کا نہ پوچھو کچھ مزہ
میر و مرزا کا زمان شاعری یاد آ گیا

(حسرت موہانی)

انتخاب کلام

تری مستانہ رفتاری سے ظاہر موج دریا تھی
تری ہنگامہ آرائی سے پیدا شور محشر تھا

ستم اغیار کا سہنا مجھے چنداں نہ تھا مشکل
اُٹھایا جس نے محفل سے مجھے وہ تیرا تیور تھا

چلتا رہا ہمیشہ میں اک طرز خاص پر
یعنی فریب خوردہ دیر و حرم نہ تھا
تیرے ہی ذوق جلوہ سے وا ہو گئی ہے چشم
یاں ورنہ امتیاز وجود و عدم نہ تھا
کیا کیا مجھے تغافل ساقی کا تھا گلہ
دیکھا تو میں ہی در خور لطف و کرم نہ تھا

ہے کمال شوق تیری ناتمامی کیا کہوں
واں حیا آتی ہے اس کو اور شرماتا ہوں میں

مرا تو اس کے نظارے سے ایماں تازہ ہوتا ہے
خدا رکھے سلامت اس عدوۓ دین و ایماں کو

انداز میں ، شوخی میں ، شرارت میں ، حیا میں
واں ایک نہ اک بات نکلتے ہی رہے گی

اسے تھا ناز تمکیں پر کہ شوخی لے گئی بازی
تبسم نے عجیب انداز سے چین جبیں پکڑی
برنگ تیر آنا - اور دل کے پار ہو جانا
یہ خُومژگاں کی تو نے اے نگاہ شرمگیں پکڑی

شوق پھر کوچۂ جاناں کا ستاتا ہے مجھے
میں کہاں جاتا ہوں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

نے چشم التفات ہے نے خنجر عتاب
جینا تمہارے عشق میں دشوار ہو گیا
میں سادہ لوح واقف رسم بتاں نہ تھا
اقرار عشق کر کے گنہگار ہو گیا

زباں بے زبانی کہہ رہی ہے داستاں میری
شکایت سنج ہوں میں کس کے جور بے نہایت کا

یہ دست نازنین اور اُس میں خنجر، کیا قیامت ہے
خدا کے واسطے تم خون کرتے ہو نزاکت کا
شکایت کیا کروں اُن قہر آلودہ نگاہوں کی
ابھی بھولا نہیں احسان تری چشم عنایت کا

خود نما جلوہ ترا، داد طلب ناز ترا کون ہے تیرے سوا پردۂ درِ راز ترا

تغافل تو ادا ہے، پُر خطر ہے التفات اُس کا
مصیبت آئے گی اُس وقت جب وہ مہرباں ہوگا
ابھی تو تیری مایوسی سے اطمینان ہے اے دل
مجھے اُس وقت ہوگا خوف جب تو شادماں ہوگا
نہ مرقد قرار آئے گا کیونکر مرنے والوں کو
جو تم کو دوستوں کا غم نصیب دشمناں ہوگا

ہوئی جو چشم ہوس کامیاب نظارہ کرم ہے یہ بھی ترے شوق خود نمائی کا

معاذ اللہ اتنی نا اُمیدی کہے گی وہ نگاہ آشنا کیا

مجال ترک محبت نہ ایک بار ہوئی خیال ترک محبت تو بار بار آیا

نشانِ منزل جاناں ملے ملے نہ ملے مزے کی چیز ہے یہ ذوقِ جستجو میرا

اُس نگاہ شرمگیں نے کر دیا رسوا ہمیں
ہائے وہ افسوں کہ جو آخر کو افسانہ ہوا

ہے نظر بازوں میں ہلچل سب ہیں گرم جستجو
وہ پری ہے کون وحشت جسکا دیوانہ ہوا

پھر دل نازک پہ بار غم گراں ہونے لگا پھر خیال خدمت پیر مغاں ہونے لگا
پھر لگا پڑھنے وہ کافر بے وفائی کا سبق پھر وفا کا ذکر زیب داستاں ہونے لگا
پھر کسی کی بزم میں مجھ کو ملا اذن سخن پھر طرب انگیز عنوان بیاں ہونے لگا
پھر نوازش آپ کی حد سے زیادہ ہو گئی پھر دل آفت رسیدہ بدگماں ہونے لگا
پھر محبت اُن نگاہوں سے عیاں ہونے لگی پھر وفور لذت شوق نہاں ہونے لگا
پھر ہوا مائل غزل پر وحشت شیریں سخن
پھر رواج شیوۂ حسن بیاں ہونے لگا

خود بخود آ ہی گیا کچھ شیوۂ عرض نیاز
اُس سراپا ناز کو اپنے مقابل دیکھ کر
بے خبر منزل سے ہیں وہ ساکنانِ راہ عشق
جو قدم رکھتے ہیں راہ و رسم منزل دیکھ کر

رخ کی رنگت دیکھ کر ' آنکھوں کی حسرت دیکھ کر
رہ گئی میری تمنا میری صورت دیکھ کر
بند ہی رہتی ہے تیرے دیکھنے والوں کی آنکھ
اور کیا دیکھے گا کوئی تیری صورت دیکھ کر
ناز ہے ہم پا شکستوں کو سہارے پر ترے
اپنی مجبوری سے خوش ہیں تیری قدرت دیکھ کر

کرم کی التجا تھی پہلے ' لیکن اب تقاضے ہیں
ہمارے حوصلے کچھ بڑھ گئے بیدست و پا ہو کر
ادا شوخی کی کیا کم تھی برائے عالم آشوبی
کہ برپا کی قیامت تو نے تصویر حیا ہو کر

گویا ہے کوئی اور بھی مامن زمانے میں !
مایوس ہو کے اُٹھے ہیں اُس آستاں سے ہم
تیور ترے کچھ اور خبر دیتے ہیں ہمیں
گھبرا رہے ہیں اپنے دل شادماں سے ہم

اک یاد عیش جس پہ ہو قربان ہزار عیش
لے کر چلے ہیں ساتھ تری انجمن سے ہم
کیا رنگِ انتقامِ خزاں کا ہو دیکھئے
ڈرنے لگے ہیں جوش بہار چمن سے ہم

پھر اشارہ اُس نگاہ ناز کا پاتے ہیں ہم
مژدہ اے دل پھر فریب آرزو کھاتے ہیں ہم
عقل دور اندیش کی چلتی نہیں کچھ روک تھام
شوق مستانہ لئے جاتا ہے ' اور جاتے ہیں ہم

ہمارے آگے سے وہ جب کبھی گزرتے ہیں
ہم اپنے کھوئے ہوئے دل کو یاد کرتے ہیں
یہ کیا ہجوم تمنا ہے ' خیر ہو یا رب
ہم اُن سے ڈرتے نہیں ' اپنے دل سے ڈرتے ہیں

دل کے کہنے پہ چلوں عقل کا کہنا نہ کروں
میں اسی سوچ میں ہوں کیا کروں اور کیا نہ کروں
کس طرح حسن زباں کی ہو ترقی وحشت
میں اگر خدمت اُردوئے معلیٰ نہ کروں

خفا تم جرم الفت پر ' خجل میں جرم اُلفت سے
نہ تم ملنے پہ آمادہ ' نہ میں ملنے کے قابل ہوں

ملتفت وہ نہیں ہوتا جو مرے دل کی طرف
دل رُبائی کی اسے خاص ادا کہتے ہیں
سادہ دل کتنے ہیں ارباب محبت ہے ہے
کہ ترے عشوۂ پنہاں کو حیا کہتے ہیں

وہی غوّاص ہیں جو ڈوب کر اُبھرے نہ دریا سے
نہیں ہے عشق میں اُن کی سند جو پار اُترتے ہیں
ضرورت تم کو کیا مجھ سے تکلف کی ' تواضع کی
یہی انداز وہ ہیں جو مجھے مایوس کرتے ہیں

بنایا میں نے دلکش اور بھی نقش محبت کو
وفا کا رنگ بھر کر اُس کی تصویر خیالی میں

اس دل نشیں ادا کا مطلب کبھی نہ سمجھے
جب ہم نے کچھ کہا ہے وہ مسکرا دئے ہیں
کچھ شوخ کر دیا ہے چھیڑوں سے ہم نے تم کو
کچھ حوصلے ہمارے تم نے بڑھا دئے ہیں

جھوم رہا ہوں بیٹھ کر وادئی کوہسار میں
جاؤں چمن کی سیر کو ' ہوش کہاں بہار میں
ہو گئی زندگی عذاب کیسی کشا کش آ پڑی
شوق سبک خرام میں ' عقل گراں وقار میں

کبھی جو دیکھتے تھے خواب ہم جمعیت دل کے
وہ اب نذر خیالات پریشاں ہوتے جاتے ہیں
جنوں انگیزیاں بڑھتی چلی ہیں اُس کے گیسو کی
بہت سے ہاتھ اب صرف گریباں ہوتے جاتے ہیں

نہو مجھے جستجوئے منزل ' مگر ہے منزل مری طلب میں
کوئی تو مجھ کو بلا رہا ہے کسی طرف کو تو جا رہا ہوں
خدا ہی جانے یہ سادہ لوحی دکھائے گی کیا نتیجہ وحشت
وہ جتنی اُلفت گھٹا رہے ہیں اُسی قدر میں بڑھا رہا ہوں

وہ نگاہیں مہربانی پر جو مائل ہو گئیں
سچ تو یہ ہے اور بھی غارت گرِ دل ہو گئیں
جو تمنائیں کہ قاتل سے ابھی تک تھیں نہاں
کچھ نمایاں وہ بشکلِ رقصِ بسمل ہو گئیں
اُن نگاہوں سے ہمیں تھی آرزوئے التفات
ملتفت ہو کر وہ برقِ خرمنِ دل ہو گئیں
وہ نگاہوں سے مری بچتے ہیں ، ڈرتے ہیں کہیں
یہ اگر ہم سے کسی مطلب کی سائل ہو گئیں
تابہ منزل جب رسائی ہو گئی 'وحشت' محال
دقتیں ہر ہر قدم پر مجھ کو منزل ہو گئیں

تیرا غمزہ کس قدر بیگانگی آموز ہے
تیری محفل میں کسی کا آشنا کوئی نہیں
بے خودئ عشق نے مجھ کو دیا درسِ خودی
میں ہی میں ہوں ہر طرف ، میرے سوا کوئی نہیں

نشانِ زندگیٔ دل ہے ، بے قراریٔ دل
ہے دل کی موت اگر چین آ گیا دل کو
فریب کھاتا ہے ہر ہر قدم پہ منزل کا
وہ کیا کرے کہ نہ دیکھا ہو جس نے منزل کو

ڈر ہے کہ کھل نہ جائے کسی کی جفا کا راز
اے دل شکایت ستمِ آسماں نہ ہو
مجبور ہو کے میں نے لگائی لبوں پہ مہر
کیا لطف گفتگو جو کوئی ہم زباں نہ ہو
وحشت مری نظر میں مکمل نہیں وہ شعر
جس میں کہ حسن معنی و لطف زباں نہ ہو

نہاں ہے دل میں عشق کا وہ راز جو کبھی عیاں
بطرز گفتگو نہ ہو ' بشکل خامشی نہ ہو
جو ذوقِ درد ہے تجھے ' تو دل کو خستہ تر بنا
گداز کا مزا کہاں اگر شکستگی نہ ہو

بزم اغیار میں معذور نہ تھے وہ 'وحشت'
بات اگر کر نہیں سکتے تھے ' اشارا کرتے

تابہ کے شکل مجازی میں تری جلوہ گری
اس حقیقت کو جو پوشیدہ ہے عریاں کر دے

اک حد ضرور ہوتی ہے صبر و قرار کی
اب نوبت آئی نالۂ بے اختیار کی
آنکھوں نے تیری ہوش اڑائے شراب کے
چہرے نے تیرے بات بگاڑی بہار کی

آپ اپنا روئے زیبا دیکھئے یا مجھے محو تماشا دیکھئے
حسرتوں کا ہائے رے دل میں ہجوم آرزوؤں کا نتیجہ دیکھئے

دور ہوں گے وہ نکالیں گے جو دل کی آرزو
وہ تمنا جان ہے میری جو میرے دل میں ہے
جس سے چاہو پوچھ لو تم میرے سوز دل کا حال
شمع بھی محفل میں ہے پروانہ بھی محفل میں ہے

چشم کو میں نے بہر سو نگراں دیکھا ہے
نہیں معلوم ترا جلوہ کہاں دیکھا ہے
شرم ہے ایک ادا ورنہ تری آنکھوں میں
ہم نے اک میکدۂ شوق نہاں دیکھا ہے

روئے جاناں کے لئے میں ہی نہیں ہوں مضطرب
کوئے جاناں بھی ہے آتش زیر پا میرے لئے
اب خفا ہونے لگے ہو مجھ سے ہر ہر بات میں
تم کہ ہو جاتے تھے دشمن سے خفا میرے لئے

دونوں نے کیا ہے مجھ کو رسوا — کچھ درد نے اور کچھ دوا نے
بے جا ہے تری جفا کا شکوہ — مارا مجھ کو مری وفا نے

ہے یہ اندیشہ کہیں دل کو نہ ہو جائے خبر
آنکھ دیکھی ہے تری آو دل ستاں بدلی ہوئی

نیاز عشق اپنی حد کو پہنچا وائے ناکامی
ابھی نیرنگیاں باقی ہیں ناز فتنہ پرور کی

قفس میں عمر گزری نالہ و آہ و فغاں کرتے
ہم آخر کس توقع پر خیالِ آشیاں کرتے
پتا ملتا نہیں جنسِ وفا کا اب زمانے میں
کہیں سے ہاتھ اگر لگتی تو نذرِ دوستاں کرتے
مزا آتا اگر گزری ہوئی باتوں کا افسانہ
کہیں سے ہم بیاں کرتے کہیں سے تم بیاں کرتے
نہ پروا کی ہماری کارواں نے جب ، تو پھر ہم بھی
بچھڑ کر کارواں سے کیا تلاش کارواں کرتے

گو میں ہوں تجھ سے دور تری آرزو تو ہے
تیرا پتا ملے نہ ملے جستجو تو ہے
وہ آئیں یا نہ آئیں انھیں اختیار ہے
اے ذوقِ انتظار میں خوش ہوں ، کہ تُو تو ہے
پروانے کی ہے موت پر اے شمع مجھ کو رشک
تیرا شہید ناز ترے رو برو تو ہے

مجھے ہمنوا نہ دینا کہیں زحمتِ تکلّم
کہی جائے گی قفس میں نہ حکایت آشیاں کی
مجھے اب شگفتگی کی ہو قفس میں کیا توقع
گئی ساتھ آشیاں کے جو تھی بات آشیاں کی

چین آئے گا کہاں دل کو خدا ھی جانے
دشت سے بھی وھی وحشت ھے جو تھی گھر سے مجھے

بجز خونِ تمنا کیا نتیجہ ھے تمنا کا
بغیر از برقِ خرمن اور کیا حاصل ھے خرمن سے

زخم میں لطف خلش ' درد میں لذت ہوتی
تجھ کو اے دل جو حقیقت میں محبت ہوتی
تم نے جو چاھا کیا کون تمہیں دے الزام
ہم اگر شکر نہ کرتے تو شکایت ہوتی
بے وفائی سبھی معشوق کیا کرتے ھیں
تم اگر مجھ سے وفا کرتے تو جدّت ہوتی
تم اگر آ کے نہ کرتے مرے گھر کو روشن
آتش شوق چراغ شب فرقت ہوتی
کچھ تو ہوتے وہ جفاؤں سے پشیماں وحشت
اگر اظہار وفا کی مجھے جرأت ہوتی

جو مری نیازمندی مجھے دے کبھی اجازت
تو بتوں کی بے نیازی کا گلہ کروں خدا سے

جفا کے بعد وہ آمادہ ھیں وفا کیلئے
اک اور ظلم سہی جان مبتلا کیلئے
امیدوار کرم ہو کے ' نا مراد نہیں
ہوا ہوں وقف ستم ھائے ناروا کیلئے

کرم بغیر ستم تیرا قاعدہ ہی نہیں جفا ادا ہے تری شیوۂ وفا کیلئے
عجب نہیں ہے جو کھل جائے در اجابت کا
تو ہاتھ اٹھا بھی دے 'وحشت' کہیں دعا کیلئے

دیا ہوتا نہ فصل گل کو کار گلشن آرائی اگر دور خزاں کو حکم بربادئی گلشن ہے

فریب خوردۂ عیش جہان کا ہے یہ حال کہ روئے عمر بھر اک لحظ کی ہنسی کیلئے

ہے آتش اُلفت شعلہ فشاں جلتا ہے کوئی تو جلنے دو
ہے شمع کی بے شک شان یہی پروا نہ کرے پروانے کی
اے جلوۂ پنہاں راز ترا پردے میں رہے تو کیسے رہے
گو تجھ کو نہ دیکھے کوئی مگر شہرت ہے ترے افسانے کی
مایوس نہ ہو اے دل میرے کر اپنے خدا سے صبر طلب
ہوتے ہی ہوگا رام وہ بت کچھ بات نہیں گھبرانے کی
ہیں دست و گریباں حسن و عشق اب دیکھیں کس کی بات رہے
دل بھی ہے تڑپنے کا خوگر ' خو اُن کی سہی تڑپانے کی
انداز ہیں دونوں فسوں گر اب دل کی وحشت خیر نہیں
کیا کم ہے تبسم کی شوخی پھر اُس پر ادا شرمانے کی

پھر کرے تازہ کشش پیدا حرم میرے لئے
محو آرائش ہے پھر بیت الصنم میرے لئے
خود بخود محسوس کی میں نے بھی دل میں تاب ضبط
جب گراں ہونے لگا بار الم میرے لئے

علامہ دتاتریہ کیفی

پنڈت برجموہن دتاتریہ نام ' کیفی تخلص۔ ۱۳ دسمبر ۱۸۶۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے ۔ اُن کے بزرگ بادشاہ فرخ سیر کے عہد حکومت میں کشمیر سے دہلی میں آ کر سکونت پذیر ہوئے اور اپنی فارسی دانی کی بدولت حکومت کے مرکزی دفاتر میں عہدہ ہائے جلیلہ پر ممتاز ہوئے ۔ حضرت کیفی کے والد پنڈت کنہیا لال راجہ بھرپور سنگھ کے عہد میں شہر نابھہ کے کوتوال تھے لیکن کیفی صاحب کی صغر سنی ہی میں اُن کا انتقال ہو گیا ۔ کیفی صاحب کی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی ۔ جہاں اُنہوں نے اپنے گھر واقع بازار ستیا رام کے قریب حکیم بوریئے والے کے مکتب میں ابتدائی فارسی کی کتابیں پڑھیں لیکن فارسی کی تکمیل اپنے نانا صاحب سے کی جو اس زبان کے جید فاضل تھے ۔ اس کے بعد انگریزی کی تعلیم سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں حاصل کی ۔ پنڈت کیفی فارسی و انگریزی میں مہارت تامہ رکھتے ہیں ۔ عربی و سنسکرت سے بھی واقف ہیں اور ہندی کے کامل فن اُستادوں میں اُن کا شمار ہوتا ہے ۔

تعلیم سے فراغت کے بعد پنڈت جی کشمیر میں اسسٹنٹ فارن سیکرٹری کے فرائض انجام دیتے رہے ۔ اس ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ریاست چینتی میں کچھ عرصہ تک کلکٹر رہے ۔ تقسیم سے پہلے کیفی صاحب کا قیام زیادہ تر پنجاب میں رہتا تھا مگر قیام پاکستان کے بعد آپ اپنے وطن دہلی چلے گئے اور تاحال وہیں مقیم ہیں ۔

شعر و سخن کا ذوق پنڈت جی نے اپنے ایک بزرگ پنڈت نرائن داس ضمیر دہلوی سے ورثہ میں پایا ۔ اور لڑکپن ہی سے رواج زمانہ کے مطابق غزلگوئی شروع کر دی ۔ بعد میں انقلاب زمانہ سے متاثر ہو کر نیچرل شاعری کی طرف متوجہ ہوئے اور نظم گوئی میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا ۔ پنڈت جی اُن بزرگوں میں ہیں جنہوں نے اُردو شاعری کے کئی دور دیکھے ہیں ۔ اُنہیں پنڈت امر ناتھ ساحر ' رام رچھپال سنگھ شیدا ' جواہر ناتھ ساقی اور حیدر مرزا قلندر جیسے کہنہ مشق شعرا کی ہم مشقی نصیب رہی ' میر مہدی مجروح کی صحبت بھی اُنہوں نے اُٹھائی ' مولانا شبلی ' آزاد ' سرسید اور بالخصوص مولانا حالی کے تو وہ نیاز مندوں میں تھے ۔ بلکہ اُنہیں حالی سے چند غزلوں پر اصلاح لینے کا شرف بھی حاصل ہے ۔ علاوہ ازیں دور حاضر کے شعرا سے بھی اُن کے بڑے گہرے روابط ہیں ۔ جن

میں وحشت ، صفی ، ظریف ، آرزو ، سراج ، قدیر ، آزاد انصاری ، حسرت موہانی ، شاعر قزلباش ، ناظر ، نیرنگ اور علامہ اقبال وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں ۔ غرض یوں سمجھنا چاہئے کہ پنڈت جی بذات خود ایک مجسم روایت اور ایک انجمن ہیں جسکے مغتنم ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ آجکل کے زمانے میں آن ایسے صاحب بصیرت ، وضع دار اور علم دوست انسان کہاں پیدا ہوتے ہیں ۔

پنڈت کیفی کو اُردو زبان اور شعر و ادب سے جیسی گہری دلچسپی رہی ہے اس کا ایک ادنیٰ ثبوت تو آن کی بیش بہا تصانیف ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ قابل قدر بات یہ ہے کہ پنڈت جی نے ادبی خدمات کے سلسلے میں ہندوستان کے تقریباً ہر حصہ میں مختلف کانفرنسوں میں شرکت کی اور اپنے عالمانہ لکچروں سے اہل ذوق کو فیضیاب ہونے کا موقع دیا ۔ آپ کی انہیں خدمات کا نتیجہ ہے کہ آج بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب جیسے لوگ بھی آن کی فضیلت کے معترف ہیں ۔

حضرت کیفی نے جملہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل اور نظم خصوصیت کے ساتھ آنکی توجہ کا مرکز رہی ہیں ۔ اس سے قبل کہ آن کے کلام پر کوئی تبصرہ کیا جائے مناسب ہوگا کہ آنکے طرز کے بارے میں خود آنہیں کے الفاظ پر ایک نظر ڈال لی جائے ۔ وہ فرماتے ہیں ''آخر وہ رنگ ہاتھ آ گیا جو اس وقت میری غزل اور عام کلام میں موجود ہے یعنی تغزل کے رنگ کو کلام میں سمونا اور ہندو ویدانت اور اسلامی تصوف کو شیر و شکر کرنا'' اور یہی دو باتیں ہیں جو ابتدا ہی سے پنڈت جی کے مد نظر رہی ہیں ۔ ابتدائی کلام میں عام رندانہ و عاشقانہ مضامین ہیں ۔ جن میں زبان و محاورے کا لطف ، بیان کی شوخی و بانکپن اور وہ درد و اثر ہے جو دہلی کا خاص رنگ تھا ۔

اس کے بعد آنکی نیچرل شاعری کا دور آتا ہے ۔ اس دور میں آنہوں نے اپنی نظموں میں نہ صرف فطرت کی قصیدہ خوانی کی ہے بلکہ ایک سچے صناع کی طرح کائنات کی ہر چیز میں جو حسن حقیقی کی کارفرمائی دیکھی اسے بے کم و کاست نظم کرنے کی کوشش کی ہے ۔ لیکن آن کے اسلوب میں بیان وادا کی صنعتیں ہر جگہ کارفرما نظر آتی ہیں ۔ اس سلسلے میں ''صبح بہار'' ، ''آغاز عشق'' ، ''شاعر سے خطاب'' وغیرہ ایسی طویل نظمیں ہیں جو اُردو شاعری میں ممتاز حیثیت کی مالک ہیں ۔ اس کے علاوہ اصلاح قوم ، وطن پرستی اور ہنگامی و واقعاتی منظومات میں بھی بلندیٔ تخیل ، جدت اُپج اور زبان و بیان کی ایسی لطافتیں سموئی ہوئی ہیں کہ پڑھنے والا شاعر کی قادرالکلامی کا قائل ہو جاتا ہے ۔

جہاں تک پنڈت جی کی زبان کا تعلق ہے اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اُردوئے معلیٰ آن کی مادری زبان ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ہندی اور سنسکرت کے بھی بڑے عالم ہیں ۔ ابتدائی کلام میں ان زبانوں کے الفاظ بہت نمایاں نظر آتے ہیں ۔ لیکن آخری کلام میں اعتدال کے ساتھ موجود ہیں ۔ مزید برآں کیفی صاحب نے اپنی علمی فضیلت اور وسعت معلومات کی بنا پر کلام میں جابجا مختلف زبانوں کی اصطلاحات و محاورات بھی استعمال کئے ہیں مگر استعمال کی خوبی یہ ہے کہ شعریت میں فرق نہیں آنے پایا ہے ۔ ایک شعر ملاحظہ فرمایئے ۔

مگر کب تک چھپا رہتا وہ یوں اس خاکِ ظلمت میں
ظہور اس کا ہوا اگنی سے پرتھوی کی صورت میں

بحثیت مجموعی حضرت کیفی ایک پختہ مغز اور کہنہ مشق شاعر ہیں ۔ اُن کے تغزل میں پختگی و دلاویزی کے ساتھ ساتھ بڑی روانی پائی جاتی ہے اور نیچرل شاعری کے خشک موضوعات میں تو اُنہیں بڑی حد تک رنگینی و دلکشی بھرنے کا شرف حاصل ہے ۔ اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ کیفی صاحب اُس زمانہ کی یادگار ہیں جب ہندوستان بالخصوص دھلی کے ہندو مسلمان حقیقی بھائیوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے اور اُن کا ایک مذاق ، ایک رنگ اور ایک زبان تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ جناب کیفی میں اسلامی تہذیب و کلچر کے بڑے نمایاں آثار نظر آتے ہیں ۔ خدا کرے کہ ہماری یہ تاریخی یادگار تادیر سلامت رہے ۔ آمین !

کیفی صاحب کی کئی تصانیف زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں ۔ نثر میں آپ کی تصانیف عورت اور اُس کی تعلیم ، چراغ ہدایت ، پریم دیوی ، راج دلاری ، مراری دادا ، تہتا رانا ، کیفیہ اور منشورات ہیں اور نظم میں مرات خیال ، آئینۂ ہند ، صدائے کیفی ، بھارت درپن ، پریم ترنگی ، جنگی نظمیں ، توزک قیصری ، خمخانۂ کیفی اور اُن کا مجموعہ کلام واردات ہیں ۔

انتخاب کلام

تغزل

کہا بخشی ہے مجھ کو ھجر کی تم نے مصیبت کیا
تو فرمایا کہ ناداں وصل کی ہے ہجر لذت کیا
کہا یہ دل سی شے کیا مفت اڑا لے جاؤ گے اس کو
تو فرمایا یہ جنس بے بہا ہے اسکی قیمت کیا ہے
یہ کی عرض آپ پر مرتے ہیں ہم اور آپ غیروں پر
ہوا ارشاد اے ناداں محبت میں رقابت کیا
کہا اب ھجر میں جاں لب پر آئی ہے تو فرمایا
جو ہر دم دل میں ہو کیا اُسکا وصل اور اُسکی فرقت کیا
کہا مرتا ہے تیرے عشق میں ''کیفی'' تو فرمایا
میں کیا جانوں کسے کہتے ہیں الفت اور محبت کیا

باعث کوئی ایسا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
ورنہ مجھے سودا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

تو دیکھ رہا ہے جو مرا حال ہے قاصد !
مجھ کو یہی کہنا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
وہ ضد پہ تلے بیٹھے ہیں کیا بحث سے حاصل
موقع ہی یہ ایسا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
جو رنج عزیزوں نے دئے کیا کہوں ''کیفی''
غیرت کا تقاضا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

کیا ہوا مرکزِ ہستی اگر انسان نہ ہوا
آبرو خاک ہے قطرے کی جو طوفاں نہ ہوا
غم رہا اُن کا جو دوزخ میں پڑے جلتے ہیں
میرے خوش ہونے کا جنت میں بھی ساماں نہ ہوا

بتائیں کیا تجھ کو چشم پرنم ہوا ہے کیا خون آرزو کا
بنا گُلِ داغ یاس و حسرت جو دل میں قطرہ بچا لہو کا
دبے جو گھٹ گھٹ کے دل میں ارماں وہ برق بن کر فلک پہ تڑپے
جو ولولہ دل میں رہ گیا تھا وہ بلبلہ اک ہے آب جُو کا
کھلا لب گور سے یہ عقدہ کہ خواب تھی سب نمود ہستی
وقوف نامحرمئی منزل کہاں ہے میری جستجو کا
طلسم دیر و حرم ہے تجھ پر ہنوز دلی ہے دور ناداں
وہاں ترا خاک دل لگے گا وہ ہے سراسر مقام ہُو کا

کیسی آزادی ؟ اسیری چیز کیا ؟ جب فنا رنگ تمنا ہو گیا
بے خودی نے محو حیرت کر دیا آپ میں اپنا تماشا ہو گیا
جس کو دیکھا آپ ہی آیا نظر رنگ اب کیفی یہ اپنا ہو گیا
ہم نے اس عالم فانی کو تماشا جانا ایک نیرنگئی آشوب تمنا جانا
دل کے ہوتے جسے آئینے کی حاجت ہو آسے محو دلبستگئی لطف تماشا جانا
جسکو تم کہتے ہو موت اسکو میں سمجھا ہوں وصال
دم شمشیر کو میں نے دم عیسیٰ جانا

کرشمہ ریزئی حسن سے کیوں بھٹک رہا ہے تو دنگ ہو کر
شکستہ پا ہو کے کاش گرتا اک آستانے پہ سنگ ہو کر
یہ باغ عالم ہے جائے عبرت دو روزہ دولت ہے حسنِ صورت
وہ پھول کانٹوں میں رُل رہا ہے جو سر چڑھا شوخ و شنگ ہو کر
شباب میں بھی عجب فسوں تھا بہار ہستی تھی یا جنوں تھا
جو سر میں آیا سرور ہو کر تو دل پہ چھایا آمنگ ہو کر
وہ حسن نے پائی رَم شعاری ' ہے جس سے چشم سراغ عاری
ہوا میں بُو ہو کے جا سمایا کھلا رُخِ گُل پہ رنگ ہو کر
کرشمۂ حسن جاں ستاں کی ستم ظریفی کا کیا بیاں ہو
کہ دل میں یہ درد بن کے بیٹھا جگر سے نکلا خدنگ ہو کر
نہ کوہ و صحرا میں نکلی حسرت کہیں بھی پائی نہ جب فراغت
میں نقطۂ دل میں آ سمایا جہاں کی وسعت سے تنگ ہو کر
یہ مجھ کو بے حس کیا ہے کیفی مئے محبت کی بے خودی نے
کہ خواہشیں دل کی اُڑ رہی ہیں گلوں کے چہرے کا رنگ ہو کر

سارے عشاق سے ہم اچھے ہیں — ہاں ترے سر کی قسم اچھے ہیں
اُلجھا ھی رہنے دو زلفوں کو صنم — جو نہ کُھل جائیں بھرم اچھے ہیں
بحث ہو جائے تو سب پر کھل جائے — ہیں بھلے آپ کہ ہم اچھے ہیں
خوب ہے وقت جو کٹ جاتا ہے — جو گزر جاتے ہیں دم اچھے ہیں
پوچھتے کیا ہو مزاج کیفی
آپکا لطف و کرم - اچھے ہیں

پردہ دارِ ہستی تھی ذات کے سمندر میں
حسن خوب کُھل کھیلا اس صفت کے منظر میں
حسن عشق میں ہے یا عشق حسن میں مضمر
جوہر آئینہ میں یا آئینہ ہے جوہر میں
عشقِ محشر آرا کی طُور پر گری بجلی
حسن لن ترانی کی رہ سکا نہ چادر میں

چرخ کیا اُتر آیا آج فرش گیتی پر
رند بھی ھیں چکر میں ، میکدہ بھی چکرّ میں
مئے وہ ھوش بر افگن اور نظر وہ صہبا پاش
مست کیوں نہ ھوں کیفی ایک دو ھی ساغر میں

ھو نور حسن جو دل میں تو ھر نفس تیرا شمیم باغ جناں ھو مشام جاں کے لئے
سمجھ کے زیست کو دو روزہ کیوں ھوامایوس جہاں ھے تیرے لئے اور تو جہاں کے لئے
بنی ھے تیری ھی خاطر تو ساری موجودات زمیں کا لقمۂ نہو جورِ آسماں کے لئے

کبھی جو پاس بھی بیٹھے تو کسمسائے ھوئے
دبے جھکے ھوئے سمٹے ھوئے لجائے ھوئے

نظارہ ذات کا اپنی ھے اس سے دور ھو جانا
جدا ھے جیسے آئینے سے تو اور اس میں شامل ھے
ھمارا دل بڑھاتی ھے درازی راہ اُلفت کی
سمند شوق کو اک تازیانہ بعدِ منزل ھے

وہ اب جرم وفا و عشق کا الزام دیتے ھیں
رھوں چپ تو بھی مشکل ھے ، کہوں کچھ توبھی مشکل ھے

جناب محتسب ھم اور توبہ آپ کے ڈر سے
یہاں تو پینے والے ھیں کفِ ساقئی کوثر سے

لطف ھو حشر میں کچھ بات بنائے نہ بنے
آنکھ بھی شوخ ستمگر سے چرائے نہ بنے
تم سے اب کیا کہیں وہ چیز ھے داغ غم عشق
کہ چھپائے نہ چھپے اور دکھائے نہ بنے

بات وہ کہہ گئے آئے بھی تو کس طرح یقیں
اور سحر اس میں کچھ ایسا ہے بھلائے نہ بنے

جس کو خبر نہیں اسے جوش و خروش ہے
جو پا گیا ہے راز ' وہ گم ہے خموش ہے
وارفتۂ ہوائے طرب یاد رکھ اسے
جو درد کی کھٹک ہے نوید سروش ہے
ساقی کی اک نظر ہی ہمیں مست کر گئی
کس کو صراحی و خم و ساغر کا ہوش ہے

عشق ہی عشق ہو عاشق ہو نہ معشوق جہاں
ایسی اک درگہ توحید مآب اور بھی ہے
ہوش سے کاٹ یہ دن زندہ دلی سے رکھ کام
شیب کے بعد مری جان شباب اور بھی ہے
یار پیمانے اگر کر گئے خالی ' غم کیا ؟
اب بھی ابر آتا ہے اور خم میں شراب اور بھی ہے
گھر کیا غالب و مومن نے جہاں آنکھوں میں
اسی بستی میں کوئی خانہ خراب اور بھی ہے

آباد ہے یہ خانہ دل اک خیال سے
دنیا کے حادثے اسے ویراں نہ کر سکے
ان میں جو تھا نہاں وہی مرکوز دل رہا
جلوے مری نظر کو پریشاں نہ کر سکے

پیکر خاک ہے تو چرخ پہ چھا مثل غبار
تجھ کو مٹی میں ملایا ہے جبیں سائی نے

درد ہی کیا ہے وہ جس درد کا درماں ہو جائے
مشکل ایسی کوئی مشکل ہے جو آساں ہو جائے

جلوے سکھلاتے ہیں نظارے کا انداز مجھے
پردے آتے ہیں نظر سب نظر انداز مجھے

تو ہی بتلا دے مجھے یا رب کہاں سجدہ کروں
ذرے ذرے کو تو جلوے طُور سامان کر چکے

کیا اسی جنت کی یہ تحریص ہے جس میں کچھ دن حضرت آدم رہے
لاگ اک دن بن کے رہتی ہے لگاؤ ہاں لگاوٹ کچھ نہ کچھ باہم رہے
عشق نے جس دل پہ قبضہ کر لیا پھر کہاں اس میں نشاط و غم رہے

جس کو ظاہر نہ کیا شعلۂ سینائی نے راز وہ فاش کیا حسن کی رعنائی نے
چشم دل وا ہوئی اے حسن ! محبت بیدار طرفہ جادو یہ جگایا تری انگڑائی نے
گل پہ بلبل ہے فدا سرو پہ قمری ہے نثار گُل کھلائے ہیں یہ کس کی چمن آرائی نے
کر دیا کثرتِ جلوہ نے نظر کو خیرہ دیکھنا تھا جو نہ دیکھا وہ تماشائی نے

منظومات

بسنت

دشت بنے ہیں گلستاں کھیت ہیں کشت زعفراں
اٹھتی ہے آنکھ جس طرف خُلد نگاہ ہے سماں
آج ہوئی ہے کائنات فیضِ بہار سے جواں
گل ہے کھلاتی کیا بسنت
زر ہے لٹاتی کیا بسنت

باغ نیا ہے بن نیا گل کا ہے پیرھن نیا
پتیوں کی پھبن نئی پھول کا بانکپن نیا
ہر کہیں ہے فضا نئی ہے فلکِ کہن نیا
کیسی ہے جانفزا بسنت
کیسی ہے دلربا بسنت

نشو و نما کا ذکر کیا — ہو گیا ہر شجر نیا
برگ نئے ہیں گل نئے — رنگ ہی سب بدل گیا
چہرۂ ز مہریر پر — نکلا ہے خطّ استوا

شان سے آئی ہے بسنت
دھر پہ چھائی ہے بسنت

پھول ہیں ساغر شراب — غنچہ ہے غمزۂ حجاب
روئے زمیں پہ ہر کہیں — لنڈھتی ہے حسن کی شراب
حسن ہے اور فروغ حسن — کون و مکاں پہ ہے شباب

مایۂ ناز ہے بسنت
حسن نواز ہے بسنت

دامن و دشت و کوھسار — حسن سے بھر گئی بہار
کیوں نہ دلوں کو چھینے — شاھد گل کا یہ نکھار
مہر ہے ذرہ ذرہ آج — قطرہ ہے نافۂ تتار

طرۂ حُور ہے بسنت
روکشِ طُور ہے بسنت

طلوع سحر

تھا دور ایک منزل ابھی لشکر سحر
سرھنگِ شب نے بھانپ کے دنیا کو دی خبر
شبنم کے قاصد آئے غباروں میں بیٹھکر
ان سے صبا نے سن کے خبر کی وہ مشتہر
سرگوشیاں تھیں غنچوں میں ''ھے کس کا انتظار'' ؟
جو رائت شفق ہوا مشرق سے آشکار

چپکے سے کیا نسیم سحر نے سنا دیا
غنچوں کے دل کو فرط طرب سے کِھلا دیا
بادِ سحر نے معجزہ اپنا دکھا دیا
شبنم کے چھینٹے دے کے چمن کو جگا دیا
غنچے بھی کِھل کِھلا کے گلستاں میں ھنس پڑے
انگڑائی لے کے سرو بھی جیسے ہوئے کھڑے

رنگ شفق سے تھا جو آفق فلک زر نگار
یکمشت گل نے کیسۂ زر کر دیا نثار
دلکش عروسِ باغ کا تھا حسن اور نکھار
صدقے ہزار جان سے تھی عندلیب زار
منہ شاھدانِ گُل کے جو شبنم نے دھوئے تھے
سنبل کے بال بال میں موتی پروئے تھے

چھایا ھوا تھا دھر میں اک نور کا سماں
دھویا ھوا تھا آب رخ حُور سے جہاں
انجم کا آسمان سے کھسکا تھا کارواں
مہتاب کے بھی منہ پہ اڑی تھیں ھوائیاں
شب زندہ دار چرخ کا بھی رنگ فق ھوا
غالب ھر ایک رنگ پہ رنگ شفق ھوا

نکلا جو خیمہ سے شہِ گیتی ستانِ صبح
حاضر ھوئے سلام کو دربار یانِ صبح
فوج شعاع کے بڑھا قھرمان صبح
لہرا رھا تھا پیل فلک پر نشان صبح
ڈنکا ھوا طیور چمن کی صفیر کا
اک غل تھا آمدِ شہِ گردوں سریر کا

فوج شعاع کی ھوئی آمد کی جب یہ دھوم
تو ھو گیا فلک سے ھوا لشکر نجوم
مشرق میں جب ھوا شہِ خاور کا یوں قدوم
آنکھوں پہ رکھے سب نے قدم اسکے چوم چوم
اک دم میں شب کی تیرگی کافور ھو گئی
دنیا چمک کے اک کرۂ نور ھو گئی

حسن کی دنیا

دیر و حرم میں کس لئے بھٹکا کرے کوئی
خالق کو خلق ھی میں نہ دیکھا کرے کوئی

حسنِ ازل کی ہر کہیں ظاہر ہے آب و تاب
ہاں شرط ہے کہ دیدۂ دل وا کرے کوئی

ہے ذرہ ذرہ آئینہ زار جمال حق
دریا کو بند کوزے میں پھر کیا کرے کوئی

مشاطۂ ازل نے جہاں کو سجا دیا
اس کا مشاہدہ نہ کرے یا کرے کوئی

دیکھے ہلال کا جو اُفق میں یہ بانکپن
ابروئے ناز پھر نہ اشارہ کرے کوئی

افشاں جبینِ چرخ پہ کیا کہکشاں کی ہے
اختر شمار اس کا نظارہ کرے کوئی

قطرے میں بحر، ذرّے میں خورشید دیکھ لے
یہ آنکھ یہ نگاہ تو پیدا کرے کوئی

یہ تیرہ خاکدان بنے خلد کا سماں
چشم دروں کو گرم تماشا کرے کوئی

تسنیمِ حسن کا ہے رواں چشمہ رات دن
کیا خواہش صراحی و صہبا کرے کوئی

اپنا تو یہ یقین ہے ہر شے میں حسن ہے
موئے میاں سے کیوں اسے باندھا کرے کوئی

دنیا بھری پڑی ہے مناظر سے حسن کے
ہو دل کا تزکیہ جو نظارا کرے کوئی

بد خلقیوں نے خلق کو بدنام کر دیا
وہ شے ہے ورنہ حسن کہ پوجا کرے کوئی

بندہ جو نفس کا ہے نہ ہو بندہ حسن کا
کیوں تنگِ خلق حسن کو رسوا کرے کوئی

جو شے ہے وہ نظر میں ہے اپنی تو دلفریب
اس کو جنوں جو سمجھا ہے سمجھا کرے کوئی

فطرت کا حسن شانِ جمالی کا ہے شہود
پیدا تو ایسی حسن کی دنیا کرے کوئی

کیفی تو اس کی خوبئ ذاتی یہ ہے نثار
ناظورۂ سخن کو سنوارا کرے کوئی

احسن مارہروی

سید علی احسن نام احسن تخلص ۲۱ شوال ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء مارہرہ ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے آپ کے مورث اعلیٰ سید محمد صغریٰ نامی ایک بزرگ اولاً اودھ کے مشہور و مردم خیز قصبہ بلگرام میں ۶۱۶ھ میں آ کر آباد ہوئے انھیں کی اولاد میں سے علامہ میر عبدالجلیل و مولانا غلام علی آزاد وغیرہم مشاہیر زمانہ گزرے ہیں۔ نیز نواب عمادالملک مولوی سید حسین صاحب اور شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی جیسے عالم و فاضل حضرات بھی اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے ۔ میر صغریٰ کی اولاد بلگرام سے منتشر ہو کر جب ہند و ستان کے مختلف علاقوں میں آباد ہوئی تو ان میں سے ایک بزرگ حضرت سید شاہ برکت اللہ صاحب قصبہ مارہرہ میں آباد ہو گئے مولانا احسن کے والد ماجد مولانا حاجی سید مجتبیٰ المتخلص بہ حسن اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے ۔

مولانا احسن نے تقریباً ۱۸۹۴ء تک اپنی خانقاہ کے مکتب میں عربی و فارسی اور حفظ قرآن کی تعلیم پائی لیکن اسی دوران میں سفرحج اور والدین کے انتقال کی وجہ سے آن کی تعلیم مسدود ہو کر رہ گئی ۔ تا ہم آن کا مطالعہ برابر جاری رہا یہاں تک کہ آنھیں عربی بالخصوص فارسی زبان میں خاصی دستگاہ حاصل ہو گئی ۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا احسن کی فارسی دانی کا لوہا اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگ مانتے تھے ۔ مولانا میں شعر و شاعری کا مذاق بھی سوروثی تھا ۔ یہی وجہ تھی کہ چودہ سال کی عمر میں آنھوں نے شعر کہنا شروع کر دئے تھے اور پھریہ مشغلہ زندگی کے دیگر مشاغل کے ساتھ ساتھ آخر عمر تک جاری رہا ۔

اسی شاعرانہ ذوق کی بدولت ۱۸۹۵ء میں آنھوں نے ایک ماہوار گلدستہ ''ریاض سخن'' کے نام سے جاری کیا اس گلدستہ کی ترقی اور مقبولیت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سال ڈیڑھ سال کے اندر اندر میر محبوب علی خاں والیٔ دکن اور ابراہیم علی خاں خلیل والیٔ ٹونک نے اس رسالے پر خاص توجہ فرمائی چنانچہ ۱۸۹۶ء میں ''ریاض سخن'' کا نام آن کے تخلص کی رعایت سے تبدیل کر کے ''ریاض خلیل'' رکھا گیا لیکن بعد ازاں جب ان سرپرستوں کی امداد نہ پہنچ سکی تو مجبوراً گلدستہ کو بند کردینا پڑا ۔

ابتدائی دور میں مولانا کو آستاد کی تلاش ہوئی چنانچہ داغ مرحوم سے بذریعہ خط و کتابت تلمذ حاصل کیا اور جب تک گلدستہ ''ریاض خلیل'' جاری رہا یہ سلسلہ اصلاح بھی قائم رہا مگر بعد میں آستاد کے اشتیاق نے ایسا جوش پیدا کیا کہ ۱۸۹۸ء میں آن کے پاس حیدر آباد دکن جا پہنچے اور مسلسل پانچ چھ برس تک آستاد کی خدمت میں شبانہ روز حاضر رہ کر کسب فیض کرتے رہے ۔ حیدر آباد کے دوران قیام میں مولانا احسن

نے داغ مرحوم کی سوانح عمری موسوم بہ ''جلوۂ داغ'' لکھ کر شائع کی اور محاورات داغ سے متعلق ایک کتاب '' فصیح اللغات '' کی بھی ابتدا کی تھی مگر یہ مکمل نہ ہو سکی۔

مرزا داغ مرحوم کے انتقال سے کچھ عرصہ قبل ہی مولانا احسن کسی ذاتی کام کے سلسلے میں وطن واپس چلے آئے تھے چند ماہ کے قیام کے بعد واپس جانے کا ارادہ تھا کہ داغ کا انتقال ہو گیا چنانچہ یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ پھر ۱۹۰۳ء میں مولانا بسلسلۂ معاش لاہور آئے اور برس ڈیڑھ برس قیام کر کے کچھ دنوں لالہ سری رام کے تذکرہ خمخانۂ جاوید کا مسودہ لکھا۔ زاں بعد استاد داغ کی یاد میں رسالہ '' فصیح الملک '' جاری کیا جو ۱۹۱۰ء تک جاری رہا۔ لالہ سری رام کی ملازمت سے چند ماہ بعد قطع تعلق کر کے مولانا مفید عام پریس لاہور میں کام کرنے لگے مگر ۱۹۰۶ء میں اپنے جد امجد کے انتقال سے مجبور ہو کر وطن واپس چلے گئے اور خاندانی جائداد کے انتظام میں مصروف ہو گئے۔

غالباً ۱۹۲۶ء میں مولانا مسلم یونیورسٹی انٹر میڈیٹ کالج میں اردو فارسی کے لکچرار مقرر ہوئے۔ پھر جب کالج یونیورسٹی میں شامل ہوا تو آپ بھی یونیورسٹی میں چلے گئے اور ۱۹۳۸ء تک اپنے فرائض بحسن و خوبی انجام دے کر ریٹائر ہوئے۔ انتقال سے کچھ عرصہ پہلے مولانا کی پیٹھ پر ایک پھوڑا نکل آیا جو مہلک ثابت ہوا چنانچہ ۳۱ اگست ۱۹۴۰ء کو پٹنہ میں جہاں آپ بغرض علاج تشریف لے گئے تھے ' آپ ہمیشہ کیلئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔

مولانا احسن مرحوم شاگردان داغ میں ایک خصوصی اہمیت کے مالک تھے ایک تو انھیں استاد کی صحبت میں رہنے کا خاصا موقع ملا تھا دوسرے انھوں نے کلام داغ کا مطالعہ اس توجہ سے کیا تھا کہ داغ کے کلام کی بہت سی خصوصیات ان کے ذہن میں بس گئی تھیں۔ چنانچہ ان کی غزلوں میں جو صفائی ' روانی ' برجستگی اور دل نشینی ہے وہ درحقیقت اسی فیض صحبت اور کلام داغ کے بالاستیعاب مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ احسن کی زبان میں بلا کی شستگی و نکھار پایا جاتا ہے۔ آپ کی غزلوں میں کہیں کوئی لفظ بے محل یا کوئی بندش ڈھیلی نہیں نظر آئے گی۔ کہیں کہیں محاورات بھی ایسے برمحل و برجستہ استعمال ہوئے ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ غرض یوں تو گاہے گاہے داغ کی جملہ خصوصیات کی جھلک احسن کے تغزل میں نظر آئے گی لیکن دیانتداری کی بات یہ ہے کہ داغ کے شاگردوں میں علاوہ جگر و اقبال کے اکثر نے استاد کی کسی ایک خوبی کو ہی اپنایا۔ چنانچہ حضرت نوح محاورے کے لئے وقف ہوگئے۔ سائل و بیخود نے داغ کے کلام کی شوخی کو نباہا اور مولانا احسن کی توجہ بالخصوص پختگیٔ کلام کی طرف رہی اور بلا شبہ ان کے کلام کا یہ وصف قابل تعریف ہے۔ مولانا احسن کا مرتبہ ایک کامل الفن استاد کا ہے اور جس طرح ان کی علمیت و ادبیت مسلم ہے اسی طرح ان کے ایک قادرالکلام سخنور ہونے میں بھی کوئی کلام نہیں۔ افسوس کہ موصوف کا دیوان اب تک شائع نہیں ہوا حالانکہ اگر ان کا سارا کلام یکجا کر کے طبع کرایا جائے تو کئی ضخیم دیوان ہو سکتے ہیں۔

انتخاب کلام

دل نے کیا اور خاک نام کیا ؛ مجھ کو رسوائے خاص و عام کیا

غیر عہدِ وصل میں آزار ھجراں لے چلا
تجھ سے جو لینا تھا جس کو وہ مری جاں لے چلا

دل مرا ترجماں ہے گویا ہے عجب ' بے زباں ہے گویا
ہے یہ دل میں خیال کی وسعت بند سارا جہاں ہے گویا
صبر اے دل ' جفا کے پردے میں عشق کا امتحاں ہے گویا
کیا کہوں ناصحوں کا طول سخن ھاتھ بھر کی زباں ہے گویا
ھیچ ہے سب جو ھم نہیں احسن جاں ہے تو جہاں ہے گویا

حشر کیسا ' داد کیسی ' پوچھ کچھ کس بات کی
دو گھڑی کے واسطے آن کا تماشا ھو گیا

چھوڑتا ھوں تیرے سوا سب کو اب نہ کہنا کہ تو مرا نہ ھوا
شکوہ میرا عدو سے کرتے ھو یہ تو غیبت ھوئی گلا نہ ھوا
آج ھو جائے وہ جو ھونا ہے کل خدا جانے میں ھوا نہ ھوا
اب تو بدنام ھو چکا احسن اب بھی کیا آپ کا بھلا نہ ھوا

ادا میں بانکپن انداز میں اک آن پیدا کر
تجھے معشوق بننا ہے تو پوری شان پیدا کر
کہاں کا وصل ' کیسی آرزو اے دل وہ کہتے ھیں
نہ میں حسرت کروں پوری نہ تو ارمان پیدا کر
ھمارا انتخاب اچھا نہیں اے دل تو پھر تو ھی
خیال یار سے بہتر کوئی مہمان پیدا کر
مجھے ہے رشک اس کو بھی رقیب اپنا سمجھتا ھوں
نہ دیکھے جو تجھے ایسا کوئی درباں پیدا کر

خیال ضبط اُلفت ہے تو احسن خوف پھر کیسا
نہ دھڑکے دل بھی سینے میں وہ اطمینان پیدا کر

تہذیب عشق یہ ہے وہ ہم پر کریں ستم
اور اُن سے ہم کہیں یہ کرم ہے ستم نہیں
کرتا ہے دل جو عرض اُسے سن تو لیجئے
ڈریئے نہیں! سفارش لطف و کرم نہیں
وہ کچھ نہ لکھ سکے گا تیری شان کے خلاف
تجھ سا زباں دراز ہمارا قلم نہیں
کچھ ہم کو سختیٔ رہ الفت کا غم نہیں
زحمت اگر بہت ہے تو ہمت بھی کم نہیں
'احسن' کھڑے ہوئے ہیں وہ خنجر لئے ہوئے
بے وجہ میری گردن تسلیم خم نہیں

دل عشق میں ناچار ہے معلوم نہیں کیوں
مجبور یہ مختار ہے معلوم نہیں کیوں
جو کام زمانے میں ہے سب کے لئے آساں
میرے لئے دشوار ہے معلوم نہیں کیوں
ہم رند تو پھر رند ہیں، زاهد کو ہوا کیا
حوروں کا طلبگار ہے، معلوم نہیں کیوں
شوخی تری تصویر میں تجھ سے بھی سوا ہے
پر نقش بہ دیوار ہے، معلوم نہیں کیوں
کچھ اور بھی کیا حق کے سوا اُس نے کہا ہے
منصور سر دار ہے، معلوم نہیں کیوں
ہے روز کا معمول مگر خواب شب غم
مرنے سے بھی دشوار ہے، معلوم نہیں کیوں
دھرے ہوئے جاتے ہیں نزاکت سے کمر کی
پھر ہاتھ میں تلوار ہے، معلوم نہیں کیوں
سب خیر مناتے ہیں اسی کی مگر 'احسن'
تو جان سے بیزار ہے معلوم نہیں کیوں

اُدھر ظرف وضو ہے اور زاهد
ادھر جام و سبو ہے اور میں ہوں
وہ کہتے ہیں کہاں جاتا ہے 'احسن'
ٹھہر جا، آج تو ہے اور میں ہوں

اک آگ لگاتی ہے دل اور جگر میں
کیا قوت برق ہے محبت کی نظر میں
تھمتا ہی نہیں آنسوؤں کا جوش کسی دم
کیا بند سمندر ہے مرے دیدۂ تر میں
کیوں اور کسی چیز سے کرتا ہے اُسے بند
میں آنکھ ہی رکھدوں نا ترے روزن در میں

باقی ہیں بعدِ مرگ بھی آثار ضعف کے آڑنے کی بھی سکت نہیں میرے غبار میں

کچھ تو کم ہوگا شب غم کی درازی کا خیال
خواب ہی کوئی نظر آ جائے طولانی مجھے
تو اگر ملتا تو پھرتا در بدر میں کس لئے
یہ اگر ہوتا تو ہوتی کیوں پریشانی مجھے
سچ ہے دنیا میں بڑی مشکل ہے غیرت دار کو
کی ہیں دشمن نے خطائیں، ہے پشیمانی مجھے

ے پی چکا شراب سرور آ گیا تجھے ہاں شیخ حال حور کا اب تو سنا مجھے

جب اُن کی مجھ سے ملاقات ہی نہ رہی کسی سے پھر رہی دنیا میں دوستی نہ رہی
شب فراق میں اک موت کی رہی تھی کسر وہ آ گئی تو کسی بات کی کمی نہ رہی

تھا خواب لطف خیز مگر کتنی دیر کا کھلنا تھا آنکھ کا کہ وہ دنیا بدل گئی
کیونکر کہوں کہ ہوتے ہوئے فتنہ گر ترے دنیا تری گلی سے سلامت نکل گئی
عقبیٰ کی فکر ہے تو آپے خود سنبھال شیخ ساقی کے فیض سے تری دنیا بدل گئی

ساقی و واعظ میں ضد ہے بادہ کش چکر میں ہے
توبہ لب پر اور لب ڈوبا ہوا ساغر میں ہے
روک لے اے ضبط جو آنسو کہ چشم تر میں ہے
کچھ نہیں بگڑا ہے اب تک گھر کی دولت گھر میں ہے
غم کو پالا ہے تو خون دل پلائیں کیوں نہ ہم
اس میں کیا حجت کرے کوئی جو حاضر گھر میں ہے
جس کو تو چاہے جلا دے جس کو چاہے مار دے
وہ بھی تیری بات میں، یہ بھی تری ٹھوکر میں ہے

نہ اذاں ہو، نہ سحر ہو، نہ گجر ہو شب وصل
کیا مزا ہو جو کسی کو نہ جگائے کوئی

نچوڑ اے زاھد خشک اُس کی رحمت کا اُدھر ھو گا
مری تر دامنی بہتر ھے تیری پارسائی سے
ھمارے پھول سے دل کو وہ ملتے ھیں مسلتے ھیں
کبھی دست حنائی سے کبھی پائے حنائی سے

حسرتوں کا خون میرے دل کی قربانی ھوئی
تب کہیں جاکر غم جاناں کی سمائی ھوئی

سینکڑوں مانگنے والے ھیں یہ تنہا دل ھے
کس کو دوں کس کو نہ دوں ھائے بڑی مشکل ھے
غیر کے باب میں کیا آپ سے تکرار کریں
نہ کوئی اس کا نتیجہ ھے نہ کچھ حاصل ھے

دکھا کر ھر گھڑی تلوار کیا دیتے ھو تم دھمکی
اُڑا دو سر جو ایسی ھی خوشی ھے میرے ماتم کی
قیامت ھے بھڑکنا آتشِ اُلفت کا سینے میں
یہ چنگاری نہیں بجھتی اگر چمکی تو پھر چمکی
نہ پھریئے بے نقاب اس طرح ' ڈریئے چشم بد بیں سے
کہ للچائی ھوئی پڑتی ھیں نظریں ایک عالم کی
کبھی دیکھا نہیں خوش تجھ کو رندوں کی طرح ناصح
ارے کم بخت پیدائش ھے کیا تیری محرم کی
بلا کا ھے یہ نظارہ دل اس میں پھنس ھی جاتے ھیں
کھڑا ھونا کھلے سر پھر ادائیں زلفِ پر خم کی

جب اُن سے اور آئینہ سے بر ملا ھوئی — جتنی خودی سمائی تھی سر میں ھوا ھوئی
کیا ھی ستم ظریف ھے وہ شوخ چشم بھی — یہ پوچھتا ھے ھجر میں تکلیف کیا ھوئی

دل گیا ھے ضرور اُن کے ساتھ — کیوں گیا یہ خبر نہیں مجھ کو
قبر میں بھی تو مر کے پہنچا ھوں — راس کوئی سفر نہیں مجھ کو
اُس کو دل کے سوا کہاں رکھوں — کہ نصیب اور گھر نہیں مجھ کو

نہ چھوڑیں گے تنہا ہم او جانے والے ۔ کہ ہیں تاک میں تیری بھگانے والے
جوانی کو اپنی غنیمت سمجھئے پلٹ کر یہ دن پھر نہیں آنے والے
مجھے کوسنا ' کوس کر مسکرانا یہ انداز ہیں دل میں کھب جانے والے

غلط سمجھے تھے ہم دنیا سے جیتے جی گزر جانا
جو دل آیا تو اب سمجھے کہ یوں ہوتا ہے مر جانا
بہت بڑھ چڑھ کے دعویٰ چودھویں کا چاند کرتا ہے
تمہیں میری قسم آٹھنا ذرا تم بھی سنور جانا
سنا ہے اے اجل کل آئیں گے وہ ' اس سے کہتا ہوں
جہاں اک عمر تو ٹھہری ہے اور اک دن ٹھہر جانا

تیری دھن میں صفتِ گردش ایّام چلے
قدم اپنے نہ تھمے صبح چلے شام چلے
اپنے ہوتے ہوئے کیوں نامہ و پیغام چلے
ایسے ویسوں سے چلا ہے نہ کبھی کام چلے
ھمکلامی کے لئے جائیں سرِ طور کلیم !
اپنی معراج یہی ہے کہ سوئے بام چلے
اوپرے دل سے یہ ہے شرکتِ بزم واعظ
یہ نہ بیٹھینگےوھاں جم کے جہاں جام چلے

غفلتیں دمساز ہیں ' ابتر ہے ساز زندگی
زندہ ہیں لیکن نہیں کچھ امتیاز زندگی
شمع گھل گھل کر دیا کرتی ہے شعلے کو فروغ
سوز ہے مظلوم کا ' ظالم کا ساز زندگی
جان لے گی بے نیازی اس سراپا ناز کی
لوٹتا ہے جسکے قدموں پر نیاز زندگی
دل شکستہ ہوں مگر امید سے وابستہ ہوں
بس یہی وابستگی ہے دلنواز زندگی

قصیدۂ دعائیه

(یہ قصیدہ مولانا موصوف نے ۱۹۱۱ء میں جارج پنجم کی تاج پوشی کے سلسلے میں کہا تھا)

عروس باغ جب تک تاج نوشاہ گل تر ہو
صبا فراش گل جاروب سنبل سبزہ بستر ہو
نگہبانوں میں نرگس چوبداروں میں صنوبر ہو
غرض جب تک یہ نیرنگ بہار روح پرور ہو
الٰہی جارج پنجم بادشاہ ھفت کشور ہو
وہ مثل شاہ خاور ہو تو عالم شکل اختر ہو

زمین دھر پر ھوتے رھیں جب تک شجر پیدا
شجر کرتے رھیں جس وقت تک برگ و ثمر پیدا
ثمر میں لذتیں کرتی رھیں جب تک اثر پیدا
اثر جب تک کرے نیرنگیاں شام و سحر پیدا
الٰہی سایۂ رحمت ترا میری کوئن پر ھو
ترا سایہ ھو سر پر جسکے پھر کون اسکا ھمسر ھو

چمن میں گل ھوں جب تک اور گل میں نکہت تازہ
حسینوں کے لئیے جب تک بنے گلگونۂ و غازہ
اٹھائے سرو جب تک اپنی آزادی کا خمیازہ
بہار عیش پر جب تک ھو وا گلشن کا دروازہ
شمیم فیض سے شاھا تری دنیا معنبر ھو
نہال عیش کی ھر شاخ تیری بار آور ھو

رھے جبتک زمیں اور اس پہ جبتک خشک و تر باقی
تر و خشک زمیں پر ھیں جہاں تک بحر و بر باقی
جہاں تک بحر و بر میں جزر و مد کا ھے اثر باقی
اثر کو ھے دعاؤں سے تعلق کچھ اگر باقی
ترے اقبال کا تارا مثال مہر انور ھو
ترا ھر آئینہ بردار قسمت کا سکندر ھو

بنے جب تک شفق گلگونہ روئے آسمانی کا
فلک جب تک رھے مشتاق انداز جوانی کا
جوانی میں مزا آئے جہاں تک زندگانی کا
دکھائے زندگانی رنگ جب تک کامرانی کا
ترے قلعے میں عیش جاوداں یوں جلوہ گستر ھو
کہ اس کے ساتھ سامان مئے و مینا و ساغر ھو

رھے انداز چرخِ پیر کا جب تک یہی پہلا
کھلے چشم فلک جب تک مثال نرگس شہلا
بنات‌النعش کا دل جب تک آپس میں رھے بہلا
جہاں تک صبح محشر زنگیٔ شب کو نہ دے ٹہلا
ترے انوار کا پر تو یہ ھر دیوار و در پر ھو
کہ 'ونڈسر کیسل' اک تصویر بُرجِ مہرِ انور ھو

کتابوں میں رہے مذکور شاہان سلف جب تک
نہ آنے پائے ان اذکار پر رنگ کلف جب تک
کرے از بر یہ افسانے ہر اک نسل خلف جب تک
نہ ہو گنجینہ تاریخ سے یہ ڈر تلف جب تک

یہ رتبہ بادشاہان جہاں میں تیرا یکسر ہو
کہ تیرا نام نامی سب سے اول سب سے بر تر ہو

رہے جب تک سمندر اور سمندر میں رہے پانی
رہے پانی میں جس دم تک روانی اور جولانی
رہے جب تک روانی میں برابر جوش فیضانی
رہے سیراب جب تک جوش سے شہری و دھقانی

ترے دست سخا کا فیض دریائے کرم پر ہو
تری مٹھی میں آ جائے صدف سے دُر جو باہر ہو

اثر تولید کا جب تک رہے جسم عناصر میں
برابر کی رہے جب تک خوشی باطن میں ظاہر میں
رہیں پیش نظر نیرنگیاں جب تک مناظر میں
رہے جس وقت تک باقی دمِ پرواز طائر میں

ہما اقبال کا تیرے فلک سیر و ملک پر ہو
ترے دست کرم کا سایہ جس پر ہو وہ افسر ہو

زمیں کے پردے میں جبتک چھپے ہیں خاک کے جوہر
جہاں تک جوہروں میں قوتِ نامیّہ ہے مضمر
شجر جس وقت تک نامیّہ سے ہوتے ہیں بار آور
رہے ذروں میں جسدم تک شہِ خاور کرم گسُتر

ترا ہر معتقد یوں با ادب تیرے برابر ہو
کہ جیسے خیل انجم گرد و پیش ماہِ انور ہو

رہے دنیا میں آگ اور آگ میں جب تک رہے حدّت
پھر اس حدت میں بھی ہوتی رہے جس وقت تک شدّت

پھر اُس شدت میں برقی مادّے جب تک کریں جِدّت
پھر اُس جدت کی بھی گزرے نہ جب تک حشر تک عِدّت
ترے دشمن کا دل ٹھنڈا نہ دنیا میں گھڑی بھر ہو
بھسم وہ آتش رشک و حسد میں جل جلا کر ہو

رہے مذہب کی جب تک شان و شوکت رُبع مسکوں میں
بجے جب تک اذاں کی پنج نوبت رُبع مسکوں میں
ادا جب تک خدا کی ہو عبادت رُبعِ مسکوں میں
کلام حق کی ہو جب تک تلاوت ربع مسکوں میں
حمائت پر مسلمانوں کی تو اے بندہ پرور ہو
ترا حامی ہو عیسیٰ مصطفیٰ ہو ربّ اکبر ہو

رہے فنّ ادب میں شاعری جس وقت تک داخل
کریں جس وقت تک ارباب شوق اس علم کو حاصل
اٹھائیں جب تک اہلِ ذوق اس سے لذّت کامل
جہاں تک طبع موزوں شعر گوئی پر رہے مائل
زمانہ مثل 'احسن' تیرا مداح و ثنا گر ہو
کوئی صنفِ سخن تعریف سے تیری نہ باہر ہو

نوح ناروی

محمد نوح نام نوح تخلص خلف مولوی محمد عبدالمجید صاحب مرحوم سب جج، ۱۸ ستمبر ۱۸۸۹ء کو اپنے نا نہال قصبہ بھوانی پور ضلع رائے بریلی (اودھ) میں پیدا ہوئے - لیکن آپ کا وطن مالوف موضع نارہ ضلع الہ آباد ہے جہاں کے آپ رئیس ہیں - پہلے حافظ قدرت علی صاحب و مولوی یوسف علی صاحب ساکنان نارہ پھر حاجی عبدالرحمان صاحب جائسی آپ کی تعلیم کے لئے مقرر ہوئے - ان حضرات کے بعد میر نجف علی صاحب سے جناب نوح نے فارسی کی انتہائی اور عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی - کچھ دنوں تک نجی طور پر گھر میں انگریزی بھی پڑھی - شعر و سخن کا ذوق اپنے اُستاد میر نجف علی صاحب کی صحبت میں پیدا ہوا - اور ابتدا میں اُنھیں سے اصلاح بھی لی - اس کے بعد چند غزلیں امیر مینائی و جلال لکھنؤی کو بھی دکھائیں - لیکن بالاخر ۱۹۰۰ء میں فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کے شاگرد ہو گئے - ۱۹۰۳ء میں حضرت داغ نے اُنھیں اپنے پاس حیدرآباد دکن بلا لیا - جہاں آپ نے اپنے اُستاد و دیگر مشاہیر شعرا کی صحبتوں سے فیضیاب ہونے کے علاوہ جناب داغ و جناب ظہیر دہلوی سے مہری و دستخطی سندیں بھی حاصل کیں -

حضرت داغ کے انتقال کے بعد بہت دنوں تک اُن کی جانشینی کے جھگڑے چلتے رہے - کئی شاگرد اس منصب جلیلہ کے مدعی تھے لیکن سائل مرحوم نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ شرف ایک ہی شخص پر کیوں محدود کیا جائے بلکہ جتنے لائق اور قابل شاگرد ہیں وہ سب جانشینی کے مستحق ہیں سب سے پہلے نوح صاحب کو جانشینی کی سند عطا کی - اور اس میں شک نہیں کہ داغ کے جانشینوں میں آپ کا دم غنیمت ہے - آپ اپنے وطن ہی میں تا ایں دم قیام پذیر ہیں اور الہ آباد و اطراف میں شعرا کی ایک بڑی جماعت آپ کے دامن فیض میں پرورش پا رہی ہے - اس سلسلہ میں خود جناب نوح کے بیان کے مطابق ۱۹۴۱ء میں اُن کے شاگردوں کی تعداد ۴۰۰ سے کم نہ تھی جن میں چالیس پچاس اشخاص نہایت اچھے کہنے والے اور بجائے خود صاحب دیوان و صاحب تلامذہ ہیں - جن میں منشی سکھدیو پرشاد صاحب بسمل الہ آبادی خاص طور پر قابل ذکر ہیں -

حضرت نوح کے کلام میں سلاست ' صفائی اور فصاحت تو وہی ہے جو حضرت داغ کے کلام میں ہے لیکن وہ شوخی و تیکھا پن نہیں جو کلام داغ کی امتیازی خصوصیات ہیں - اُن کی غزلوں میں فلسفہ و صوفیانہ پیچیدگیاں بھی نہیں البتہ عمق ضرور ہے اور بعض اوقات وہ الفاظ اور جملوں کو دھرا کر شعر میں بڑا لطف پیدا کر دیتے ہیں - مگر بحیثیت مجموعی زبان کی صفائی اور محاورے کا بر محل استعمال جناب نوح کی وہ خصوصیت ہے جو شاید اُنہیں کے ساتھ ختم ہو جائے - یہ ٹھیک ہے کہ اُنہوں نے اظہار خیال کے سارے اسالیب چھوڑ کر اپنی دنیا محدود کر لی ہے اور ایک چھوٹی سی چیز کو بہت کچھ سمجھ لیا تاہم اُنہوں نے محاورے کو جس سادگی سے اپنے کلام میں برتا ہے وہ یقیناً اُنہیں کا حصہ ہے - اس سلسلے میں حضرت نوح کی خصوصیات شاعری سے متعلق آل احمد سرور صاحب کے یہ چند فقرے درج کرنا بے محل نہ ہونگے - ''اُن کی مثال اُن لوگوں کی سی ہے جو ساری عمر (Miniature Painting) کرتے رہے - داغ کے یہاں بھی محاورہ ہے اور نوح کے یہاں بھی ' مگر داغ اور نوح میں زمین آسمان کا فرق ہے - ان دو اشعار سے جو نوح نے اپنے منتخب کلام میں شامل کئے ہیں اُن کا رنگ واضح ہو جاتا ہے -

(۱) دکھائے پانچ عالم ' اک پیام شوق نے مجھکو
اُلجھنا ' روٹھنا ' لڑنا ' بگڑنا ' دور ہو جانا

دوسرا مصرعہ اچھا سہی ' مگر پہلے مصرعہ میں گنتی صرف نوح ہی گن سکتے ہیں

(۲) غریق بحر ستم نہ کیوں ہوں' یہ جانفشانی ہے اور ہم ہیں
کہ آپ ہیں آپ کی چھری ہے ' چھری کا پانی ہے اور ہم ہیں

(Foa much of a poor thing) اسی کو کہتے ہیں - مگر سادگئی زبان ایسی بڑی چیز ہے کہ اُس نے نوح کے بہت سے اشعار کو گوارا بنا دیا ہے''

حضرت نوح کے دو دیوان موسوم بہ ''سفینۂ نوح'' و ''طوفان نوح'' چھپ چکے ہیں اور ایک تیسرا دیوان ''اعجاز نوح'' بھی تیار تھا لیکن غالباً ابھی تک طبع نہیں ہوا -

انتخاب کلام

وفا و مہر کے بعد آپ کا مغرور ہو جانا
یہ ایسا ہے کہ جیسے پاس ہو کر دور ہو جانا

دکھائے پانچ عالم اک پیام شوق نے مجھ کو
اُلجھنا ' روٹھنا ' لڑنا ' بگڑنا دور ہو جانا

کبھی دل یہ کہتا ہے کچھ کہو، کبھی ہم یہ کہتے ہیں کیوں کہیں
جو گزر گئی وہ گزر گئی اب اسے کسی کو سنائیں کیا
کبھی پوچھتے ہیں وہ حال دل کبھی سرگزشت غم و الم
یہ بتا دے کاش کوئی ہمیں کہ بتائیں کیا نہ بتائیں کیا

بعدِ فنا مزار سر رہ گزر بنا جب ہم بگڑ گئے تو ہمارا یہ گھر بنا
زاهد حرم میں رہ کے نہ مٹی خراب کر بہتر تو اس سے یہ ہے کسی دل میں گھر بنا
بربادیاں بھی ہوتی ہیں آبادیوں کے ساتھ میں رو دیا کوئی جو زمانے میں گھر بنا
دل کا لگاؤ نوح کوئی دل لگی نہیں اس رنج و غم اٹھانے کے قابل جگر بنا

ادا آئی، جفا آئی، غرور آیا، حجاب آیا
هزاروں آفتیں لے کر حسینوں کا شباب آیا
شب غم کس طرح گزری، شب غم اس طرح گزری
نہ تم آئے، نہ چین آیا، نہ موت آئی نہ خواب آیا

کیا جانے مزا کیا ہے ترے ظلم و ستم میں
لذت کشِ بیداد ہی دیکھا جسے دیکھا

وہ نادم ہوئے قتل کرنے کے بعد ملی زندگی مجھ کو مرنے کے بعد
ترے عشق کا خاتمہ ہو گیا مرے کون اب میرے مرنے کے بعد

جہاں میں اک نہ اک مزے کی نئی کہانی ہے اور ہم ہیں
ابھی تمنا ہے اور دل ہے ابھی جوانی ہے اور ہم ہیں

میں رہا کرتا ہوں کس کس دھیان میں شوق میں، اُمید میں، ارمان میں
دل مرا صرف تمنّا ہو گیا مر مٹا ارمان ہی ارمان میں
کچھ مروت کچھ محبت چاہئیے یہ نہیں تو کچھ نہیں انسان میں
نوح اشک چشم تر کا ہو برا بہہ گئی کشتی مری طوفان میں

ترک اُلفت سے کیا ہوا حاصل — جب بھی مرتا تھا اب بھی مرتا ہوں
تم نہ آگاہ تھے جفاؤں سے — اُس زمانے کو یاد کرتا ہوں

روداد شوق و شرح محبت نہ پوچھئے — بس جان جائیے مری حسرت نہ پوچھئے
کیوں کر بسر ہوئی شب فرقت نہ پوچھئے — سب مجھ سے پوچھئے یہ مصیبت نہ پوچھئے
کعبہ یہی ہے دیر یہی طور بھی یہی — اس بے دلی سے دل کی حقیقت نہ پوچھئے

آپ ہیں، ہم ہیں، مے ہے ساقی ہے — یہ بھی ایک امر اتفاقی ہے
ہو گئیں ختم ہجر کی گھڑیاں — اور تھوڑی سی رات باقی ہے
بے پئے نام تک نہیں لیتا — مجھ کو یہ احترام ساقی ہے

مرنا خیال حق میں معراج زندگی ہے
دار و رسن سے سنیئے منصور کا فسانہ

نکھر آئی، نکھار آئی، سنور آئی، سنوار آئی
گلوں کی زندگی لے کر گلستاں میں بہار آئی
مشیت کو نہیں منظور دو دن پارسا رکھنا
ادھر کی میں نے توبہ اور اُدھر فوراً بہار آئی
اسیران قفس کو واسطہ کیا ان جھمیلوں سے
چمن میں کب خزاں آئی چمن میں کب بہار آئی
مجھے گلشن سے اے جوش جنوں صحرا کو تو لے چل
یہاں اس کے سوا کیا ہے خزاں آئی بہار آئی
ہمیشہ بادہ خواروں پر خدا کو مہرباں دیکھا
جہاں بیٹھے گھٹا اٹھی جہاں پہنچے بہار آئی

دل ہے تو آسی کا ہے جگر ہے تو آسی کا — اپنے کو رہ عشق میں برباد جو کر دے
ناکام مقاصد نہ رہیں اہل تمنا — تقدیر بھی تدبیر کو امداد اگر دے

یہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم کو اس سے نفرت ہے
مگر اتنا سمجھ رکھو محبت پھر محبت ہے

اور تو ہم نے کچھ بھی نہ جانا لیکن اتنا جان گئے
دنیا میں نادان آئے نادان رہے نادان گئے
اللہ اللہ اس کا جلوہ جلوے کے قربان گئے
دیکھیں تو کیا حال ہو اپنا بے دیکھے قربان گئے

کچھ نہ کہنا بھی کسی کے سامنے اک طرح کا انکشاف راز ہے
عشق نے دل کو پکارا اس طرح میں یہ سمجھا آپ کی آواز ہے
ان سے مل کر میں انہیں میں کھو گیا اور جو کچھ ہے وہ آگے راز ہے

نہ حسرت جوش وحشت کی نہ فصل گل کا ارماں ہے
جو خود ہی چاک ہو جاتا ہے وہ میرا گریباں ہے
یہ فرضی رکھ لئے دو نام دستور محبت نے
حقیقت میں نہ میرا دل ' نہ ارماں ہے نہ پیکاں ہے

کیوں رندی و مستی میں لہرائے نہ میخانہ بہتا ہوا دریا ہے چلتا ہوا پیمانہ
رنگینئی عالم کی برعکس یہ تصویریں سو گل ہیں مگر عالم ہر گل کا جدا گانہ
قبروں کے مناظر نے کروٹ نہ کبھی بدلی اندر وہی آبادی باہر وہی ویرانہ

رہ طلب میں بنے وہ نشتر ادھر سے جاتے ادھر سے آتے
چبھے جو کانٹے قدم قدم پر ادھر سے جاتے ادھر سے آتے
کہیں نہ تھک کر رکے کوئی دم طواف بزم حبیب میں ہم
چلے ہیں دیر و حرم بھی اکثر ادھر سے جاتے ادھر سے آتے

بھکانے والے بھکائیں شوق سے دلبر ہم کو تم کو
آنا جانا ملنا جلنا چھپ کر کھل کر ہم کو تم کو

پھر گردوں پر بدلی چھائی بدلی میں بجلی لہرائی
پیتے جائیں دیتا جائے ساقی ساغر ہم کو تم کو
کتنے دنوں تک بزم آرائی ' آپس میں پھر ہوگی جدائی
ایک جگہ رہنے ھی نہ دے گا چرخ ستمگر ہم کو تم کو

اب اور اس سے سوا حال زار کیا ہوگا　　وہ مجھ کو دیکھنے آئے مگر نہ دیکھ سکے
وہ برق کیا جو دوبارہ نہ طور پر چمکی　　وہ حسن کیا جسے ہم دیکھ کر نہ دیکھ سکے

حسن کے ناز جدا عشق کے انداز جدا
ھے یہ مشکل مری دنیا تری دنیا ھو جائے
دینے والے نے فقط دل کو یہ قدرت دی ھے
ابھی گلشن ابھی صحرا ابھی دریا ھو جائے
عشق میں ضبط غم عشق کی خوبی ھے یہی
دم بخود میں رھوں لیکن کوئی رسوا ھو جائے

محفل عالم کی رونق میں کمی ممکن نہیں
چل بسے بے خوار لیکن دور چلتے ھی رھے
وادیٔ الفت میں دیکھی ہم نے کب منزل کی شکل
گر پڑے ' گر کر اٹھے ' اٹھ کر سنبھلتے ھی رھے

مری شامت جو آئی بڑھ کے قدموں پر جبیں رکھ دی
جہاں سے تیغ قاتل نے اٹھائی تھی وھیں رکھ دی

شوق کہتا ھے کہ برق حسن جاناں دیکھئے
دیکھنا مشکل ھو لیکن تا بہ امکاں دیکھئے
ھو اگر ذوق نظر تو کیا ھے جلووں کی کمی
لاکھ پردوں میں ضیائے شمع عرفاں دیکھئے
عالم جوش جنوں کے دونوں منظر ایک ھیں
ھاتھ میں دامن کہ دامن میں گریباں دیکھئے

هر برس معمول اپنا یہ جنوں میں ہو گیا
اس طرف آئے بہار اُس سمت زنداں دیکھئے

هر ناز دلفریب هر انداز دلربا — کیونکر کسی سے قطع محبت کرے کوئی
قربان جائیے ترے حسن خیال پر — اچھی کہی کہ پاک محبت کرے کوئی
جائیگی اپنی جان یہ پہلے هی جان لے — پھر اختیار شیوۂ الفت کرے کوئی
منصور کو اسی پہ ملی هے سزائے دار — کیا انکشاف راز حقیقت کرے کوئی

انداز رہے گا جو یہی بے اثری کا — فریاد بھی کرتی هوئی فریاد رہے گی

جان لینے کے لئے کم یہ پریشانی نہ تھی
دل جو آیا تھا تو مجھ کو موت ابھی آنی نہ تھی
واسطہ مجھ کو رہا دشواریوں سے عمر بھر
مر کے بھی دیکھا تو مرنے میں بھی آسانی نہ تھی

دشت پیمائی کے صدقے کوچہ گردی کے نثار
چلتے پھرتے ختم اپنی زندگانی هو گئی

پھر گئی آپ کی نگاہِ کرم — وہ نظر اب نظر نہیں آتی
کس سے پوچھوں قفس میں حال چمن — اب هوا بھی ادھر نہیں آتی

چپ بھی مجھ سے رہا نہیں جاتا — خامشی دل کا راز کہتی هے
دل محبت میں جان اُلفت میں — ظلم سہتا هے جور سہتی هے
اک طرف یاس اک طرف اُمید — کس کشا کش میں جان رہتی هے
کہا کروں لے کے میں تری تصویر — نہ یہ سنتی هے کچھ نہ کہتی هے

عشق میں مرنا وفا والوں کا پہلا کام ہے
ابتدا ہی انتہا، آغاز ہی انجام ہے

میں محبت بھی کروں ترک محبت بھی کروں
ایک مشکل کام یہ اک سخت مشکل کام ہے

جان کر اس شوخ کا انجان بنتا دیکھئے
نوح سے یہ پوچھنا کیا نوح تیرا نام ہے

جسٹس شاہ دین ہمایوں

میاں محمد شاہ دین نام ۔ ہمایوں تخلص ۱۲ اپریل ۱۸۶۸ء کو باغبان پورہ لاہور میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے والد مولوی نظام الدین صاحب ایک فاضل بزرگ تھے اور دادا مولوی قادر بخش صاحب فارسی و عربی کے جید عالم اور بڑے صاحب ذوق انسان تھے ۔ شعر و سخن کیلئے نہایت موزوں طبیعت پائی تھی اور نادر تخلص کرتے تھے ۔ مولوی نادر صاحب کے علم و فضل کا اندازہ صرف اسی ایک بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں شاہی خاندان کے نوجوانوں کی اتالیقی پر مامور تھے ۔

ہمایوں صاحب کی ابتدائی تعلیم باغبانپورہ میں ہوئی ۔ چھ برس کی عمر میں کلام پاک ختم کیا ۔ مڈل کے امتحان میں اول رہے اور انٹرنس میں انگریزی کے مضمون میں پنجاب بھر میں اول آئے ۔ بی ۔ اے کا امتحان لاہور میں امتیازی حیثیت سے پاس کیا اور ۱۸۸۷ء میں جبکہ آنکی عمر صرف آنتیس سال کی تھی وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے انگلستان تشریف لے گئے ۔ اور چونکہ خدا داد قابلیت کے مالک تھے اسلئے جب انگلستان سے بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے لاہور واپس آئے تو ابتداً کچھ عرصہ تک پریکٹس کرتے رہے پھر پنجاب کی مجلس قانون ساز کے رکن مقرر ہوئے ازاں بعد لاہور ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے ۔ جہاں وہ عارضی طور پر چیف ججی کے عہدۂ جلیلہ تک پہونچے ۔

جسٹس شاہ دین کی تمام عمر عملی سرگرمیوں اور اصلاح قوم میں صرف ہوئی ۔ وہ بڑے مستعد جفاکش اور بلند ہمت انسان تھے ۔ آن کا دل قومی و ملی جذبات سے پر تھا ۔ چنانچہ سرسید آنجہانی نے جب علیگڑھ کالج کی بنیاد ڈالی تو پنجاب کے انتہائی سرگرم کارکنوں میں ایک ہمایوں مرحوم بھی تھے ۔ آن کا ادبی ذوق بڑا ستھرا اور نکھرا ہوا تھا ۔ اور چونکہ وہ انگریزی ادب سے کماحقہ واقف تھے اور انگریزی شاعری کے مذاق ' خیالات ' موضوعات اور رجحانات کا آنہیں بخوبی علم تھا اسلئے آردو شعر و شاعری کے رجحانات کی تبدیلی کے دل سے آرزو مند تھے ۔ اسی لئے لاہور میں مولانا آزاد ' حالی اور ارشد گورگانوی کی سرکردگی میں جو اصلاحی مشاعرے ۱۸۷۲ء سے شروع ہوئے آن میں جسٹس ہمایوں نے نہ صرف شرکت کی بلکہ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے حتی الوسع کوششیں بھی کیں ۔

مطالعہ کتب ہمایوں صاحب کا محبوب مشغلہ تھا جس میں آخر عمر تک انہماک جاری رہا موصوف نے ۲ جولائی ۱۹۱۸ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا ۔ اس سانحہ عظیم سے متاثر ہو کر علامہ سر محمد اقبال نے حسب ذیل تاریخ وفات کہی ۔

درگلستان دهر ہمایوں نکتہ سنج آمد مثال شبنم وچوں بوئے گل رمید
می جست عندلیب خوش آہنگ سال فوت علامۂ فصیح زہر چار سو شنید
۱۳۳۶ھ ۳۳۳ ۳

ہمایوں مرحوم ایک فطری شاعر تھے ۔ اور موصوف کو شعر و شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا ۔ ابتدا میں انہوں نے غزلیات کہیں لیکن یہ سلسلہ صرف انگلستان جانے سے پہلے تک ہی قائم رہا ۔ انگلستان سے واپسی پر قدرتی طور پر رجحان میں تبدیلی پیدا ہوئی چنانچہ انہوں نے اپنا سابقہ کلام ضائع کر دیا اور رسمی شاعری سے الگ ہو کر صحیح جذبات کی ترجمانی شروع کر دی ۔ اس دور کی اصلاحی نظمیں بڑی قابل قدر ہیں ۔ اور ان منظومات کا وہی رنگ ہے جو حالی و آزاد کے ہاتھوں ملک میں ترقی کر رہا تھا ۔ زبان میں بھی سادگی ہے زور خیال اور طرز بیان میں بھی سادگی ہے ۔ لیکن خوبی یہ ہے کہ ان چیزوں کے باوجود کہیں عامیانہ پن نہیں راہ پاتا بلکہ ہر جگہ کلام کی شعریت و دلکشی برقرار رہتی ہے ۔

ہمایوں صاحب کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے لیکن ان کے انتقال کے بعد آپکے صاحبزادہ میاں بشیراحمد صاحب نے جنکی علمی و ادبی سرگرمیاں کسی تعارف کی محتاج نہیں ' آپ کی چند نظموں کو یکجا کر کے ''جذبات ہمایوں'' کے نام سے شائع کر دیا اور آپ کی یاد میں ''ہمایوں'' جیسا ادبی مجلہ جاری ہے جو آج تک زبان و ادب کی بے بہا خدمات انجام دے رہا ہے ۔ اور جس کے سرورق پر جسٹس شاہ دین ہمایوں مرحوم کا شعر موصوف کی یاد دلاتا ہے ۔

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

حضرت ہمایوں ان تلامیذ الرحمن میں سے ہیں جن کی اعجاز کاریاں بھٹکی ہوئی قوم کے گم کردہ راہ کارواں کیلئے چراغ ہدایت کا کام دیتی ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ انکے کلام میں بعض فنی خامیاں پائی جاتی ہیں لیکن جس جذبے کے تحت انہوں نے شعر و شاعری کی ۔ اس کا پلہ ان عیوب کلام پر بہت بھاری ہے ۔ اس سے پہلے ذکر آیا ہے کہ ہمایوں مرحوم نے لاہور کے اصلاحی مشاعروں میں بڑی دلچسپی و انہماک سے حصہ لیا تھا درحقیقت ان کے کلام پر ان مشاعروں کا بڑا اثر ہوا تھا اس پر طرہ یہ کہ وہ انگلستان گئے اور انگریزی شاعری کے مضامین و اسلوب دیکھنے کا انہیں بہت موقع ملا اور ان دونوں اثرات نے انہیں غزلگوئی کے میدان سے نکال کر مقصدی و اصلاحی شاعری کی طرف ڈال دیا ۔ ان کی منظومات پر ایک نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں ملکی ' قومی اخلاق جذبات کا بے پناہ جذبہ موجود ہے ۔ جذبات نگاری اور منظر آرائی پر انکی نظمیں بڑی دلکش ہیں ۔ ان کے کلام کی امتیازی خصوصیت خیالات میں طرفگی اور ادائے بیان میں جدت ہے ۔ ان کا تخیل اک معمولی چیز کے مشاہدے سے ایک نئے خیال کی طرف منتقل ہوتا ہے جو انکی ذہانت کی دلیل ہے ۔ انکے یہاں تشبیہات و استعارات کا بڑا نادر

استعمال ہے اور کہیں کہیں ہندی کے بڑے خوبصورت الفاظ استعمال کر کے اُنھوں نے اپنے اشعار میں نہ صرف جان ڈال دی ہے بلکہ دوسروں کیلئے ایک بڑا اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ غرض باوجودیکہ ہمایوں صف اول کے شعرا میں سے نہیں ہیں لیکن اُن کے فطری شاعری ہونے میں کلام نہیں۔ اُنکی رفعت تخیل، طرفگئی اُسلوب، خیالات کی پاکیزگی تشبیہات کی قدرت اور وہ خوبیاں جو ایک رہنما شاعر میں ہونی چاہئیں، ایسی خوبیاں ہیں جنھوں نے اُنکے کلام کو یادگار ضرور بنا دیا۔

انتخاب کلام

تغزل

یہ کس کے سوز کا ہے بزم جاں میں انتظار اے دل
که آہیں آج سوئے عالم بالا نہیں جاتیں
اُمیدیں جب مری بڑھ آئیں تو ہنس کر لگے کہنے
یہ برسوں قید دل میں رہ کے کیوں گھبرا نہیں جاتیں
نہیں گستاخ آئینہ ۔ مقابل ہے کھڑا کوئی
یہ حیراں ہے کہ کیوں آنکھیں تری شرما نہیں جاتیں
کھڑا ہوں انتظار یار میں جوں شاخ نرگس میں
مجھے حیرت ہے کیوں آنکھیں مری پتھرا نہیں جاتیں
ترے گلشن میں تاروں کی بہار اک ہے عجب جادو
یہ کلیاں پھول بن کر اے فلک کملا نہیں جاتیں
ہمایوں تیرا دل بھی گلشن حسرت کا نغمہ ہے
خوشی میں بھی تری باتیں وہ غم افزا نہیں جاتیں

کیوں مشت خاک پر کوئی دل داغدار ہو
مر کر بھی یہ ہوس کہ ہمارا مزار ہو
بڑھ جائے غم کا سلسلہ کہسار کی طرح
طولانی گر یہ زندگی مستعار ہو
اس صیدگاہ میں وہی نکلے گا بچ کے صاف
جو صید سب سے پہلے اجل کا شکار ہو

آس بو الہوس کی موت کے قربان جائیے
جو پھر دوبارہ جینے کا امیدوار ہو

ہستی کا طوق تو ہے قیامت پس وفات
یا رب کہیں یہ میرے گلے کا نہ ہار ہو

یکساں ہے اہل دل کیلئے انبساط و غم
باغ جہاں میں آئے خزاں یا بہار ہو

رہے گا کب تلک تو محو دیدار رخ انور مجھے دم بھر قدم آنکے دل بیتاب لینے دے

جدا ہونے کو تھے مقتل میں جب وہ جان بسمل سے
ہماری حسرتیں روئیں لپٹ کر تیغ قاتل سے

ملتا نہیں خزاں میں گل لالہ فام کو وہ آئے دیکھنے مرے داغ الم کو آج

متقی واعظ نے پھر چھیڑا ہے ذکر خلد و حور
بے غرض طاعت کا لو اب راز کھل جانے کو ہے

تنہا آٹھا لوں میں بھی ذرا لطف گمرھی اے رہنما مجھے مری قسمت پہ چھوڑ دے

اے ہمایوں چشم ظاہر بیں سے تو اسکو نہ دیکھ
جنگ عالمگیر میں کوئی بہانہ اور ہے

میرے آنے کی غرض خود مجھ سے پنہاں ہو گئی
بزم عالم میں جو میں محو تماشا ہو گیا

ہوا جس روز سے لذت کش درد محبت میں
سمجھ سکتا ہوں لطف زندگی کی کچھ حقیقت میں

هم بھی نماز روزے کے پابند ہوں مگر
حوروں کو کس طرح سے گوارا کرے کوئی

نالوں سے کوئی چرخ کو چکر میں لائے کیوں
سینے میں رکھ کے دل کو کرے ہائے ہائے کیوں ؟
زندہ دلی تمہاری مبارک رہے تمہیں
آتا نہیں یہ دل جو بتوں پر تو آئے کیوں ؟

پیام راز بزم شوق میں بے تار آتا ہے
سمجھ جاتے ہیں دل کی بات ہم اُن کے اشاروں سے

زمیں کے ذرے فلک کے تارے بندھے ہیں اک سلسلے میں سارے
خدا نے ہر ایک شے پہ قانون کا تسلط بٹھا دیا ہے
نتیجہ ہر ایک کا مقرر ہے ' نام اسباب کا ہے دنیا
سنو کہ ہوگا وہی جو قدرت نے قاعدہ اک بنا دیا ہے

یاد آئے تم تو ہنس کر صبح نے جھڑکا مجھے
پھر گئے آنسو مری پلکوں تلک آئے ہوئے

منظومات

چمن کی سیر

غنچوں نے چٹکیوں میں میرا دل لبھا لیا
اے باغباں چمن میں تیرے کیا بہار ہے
لالہ ہے یا کہ حسن کا ہے جل رہا دیا
اُڑتی ہے بُو کہ جاتا ختن کا سوار ہے

هنگام صبح سیر گلستاں بسا خوش است
بر شاخ سبز بلبل شیریں نوا خوش است

سبزہ کا ہے زمیں پہ بچھا فرش مخملی
اور اس پہ ہیں چمک رہی پھولونکی کیاریاں
جاپانیوں نے گویا بہ سحر ہنروری
فیروزہ پر عقیق سے کیں مینا کاریاں

اے آسماں بگو بہ ملائک کہ دیدہ اند ؟
منظر چنیں بہ خلد بریں یا شنیدہ اند ؟

کس نازکس ادا سے اٹھی ہے نسیم ہائے
آفت کی شوخی اور قیامت کی چال ہے
کہہ دو کہ بلبلوں کو نہ اب باغباں ستائے
شاخ شجر تک آج چمن میں نہال ہے

مانند گل ز فیض صبا تازہ شد دلم
بادہ خورم بیاد گل و غم غلط کنم

نہروں میں کس صفائی سے بہتا ہے آب صاف
آئینے ہیں یہ سرو صنوبر کے واسطے
ہر لہر کی زباں سے یہ کہتا ہے آب صاف
روح رواں ہوں میں ہی گُلِ تر کیواسطے

چیزے کزد حیات شود بہرہ وَر منم
در ابر جلوۂ من و در ہر شجر منم

خوشیونکے گیت گاتے ہیں سب طائران باغ
شاخوں پہ پھول مستونکی صورت ہیں جھومتے
محو زیارت آج ہیں کیا زائران باغ
اور جھک کے پاؤں شاہد گل کے ہیں چومتے

گل گفت بس خوش آمدم اینک نوائے تو
بلبل جواب داد - کہ جانم فدائے تو

کالی گھٹا چمن میں ہر ایک سمت چھا گئی
موج ھوا پہ جھونکے لگی لینے بوئے گل
پھر آ کے ان کے کان میں کچھ جو سنا گئی
اڑ اڑ کے بلبلیں چلی جاتی ہیں سوئے گل

از قاصد صبا چه حکایت شنیدهٔ
از من چرا تو بلبل شیدا پریدهٔ

بجلی چمک کے چھپ گئی پھر کیوں سحاب میں
کیا کوئی دید حسن کے لائق نہ تھا یہاں
کب تک چھپے گا چہرہ یہ آخر نقاب میں
لو یک بہ یک پھر آپ کا چہرہ ہوا عیاں

حقّا کہ برق حسن حسیناں شنیدہ ایم
ایں نور شعلۂ رخ رخشاں نہ دیدہ ایم

بجلی نہیں تجلی یزداں ہے ابر میں
اور یہ بھی محض عکس ہے اسکے ظہور کا
جلوہ اسی کا ظاہر و پنہاں ہے ابر میں
صد برق ایک قطرہ ہے دریائے نور کا

اے آفتاب ذرۂ سپہر ضیائے تو
گستاخیِ تمام شد عزم ثنائے تو

بارش کی بوندیں گرنے لگیں آسمان سے
اے خضر! عطر دیکھ لے آب حیات کا
ہیرے نکل رہے ہیں یہ بادل کی کان سے
تاروں کی طرح چمکیں سماں ہو جو رات کا

اے ابر بر تو رحمت پروردگار باد
و ز تو بکوہ و دشت ہمیشہ بہار باد

بادل ہو گل ہو باغ ہو بلبل ہو شاخ پر
ہو حرز جان و راحت دل میری ایک شے
قدرت کی خوبیوں پہ ہمیشہ نظر رہے
بس زندگی کا لطف ہمایوں اسی میں ہے

خوش باش اے چمن کہ مرا شاد کردۂ
ویرانہ بود خاطرم ، آباد کردۂ

''اعجاز'' دیکھ تو سہی ، یاں کیا سماں ہے آج
''نیرنگ'' آسمان و زمیں کا نیا ہے رنگ
''اقبال'' تیری سحر بیانی کہاں ہے آج
''ناظر'' کہاں فکر سے مار ایک وہ خدنگ

از نغمه هائے دلکش این چار یار ما
پنجاب خوش نواست هایون دیار ما

شعرائے قوم سے خطاب

اے شاعران قوم زمانہ بدل گیا پر مثل زلف یار تمہارا نہ بل گیا
پیٹوگے کب تلک سر رہ تم لکیر کو بجلی کی طرح سانپ تڑپ کر نکل گیا
اٹھو وگر نہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
اک تم کہ جم گئے ہو جمادات کی طرح اک وہ کہ گویا تیر کہاں سے نکل گیا
ہاں ہاں سنبھالو قوم کو شاید سنبھل ہی جائے
گر گر کے ملک ہند کچھ آخر سنبھل گیا

وادی سندھ

سندھ کی وادی پہ ہے کالی گھٹا چھائی ہوئی
برقعہ اوڑھے اک دلہن بیٹھی ہے شرمائی ہوئی
منتظر بارش کے ہیں مکی کے اور شالی کے کھیت
تشنگی سے خوشہ کی صورت ہے مرجھائی ہوئی
آج گاندر بل ہوا ہے اس کا منظور نظر
اس کے سر پر کیا گھٹا پھرتی ہے منڈلائی ہوئی
سندھ کے نالے کی آہوں کا دھواں شاید اٹھا
کیسی تاریکی ہے سطح آب پر چھائی ہوئی
قاصد ابر آ رہا ہے بے کے ہاں پیغام فیض
بارگاہ ایزدی میں کس کی شنوائی ہوئی
سوئے مشرق ہے سرِ کہسار پر بارش کا زور
رحمت باری ہے گویا جوش پر آئی ہوئی
اے ہمایوں فیض بارش سے کِھلے ڈل کے کنول
کیوں ترے دل کی کلی ہے آج مرجھائی ہوئی

مولانا ظفر علی خاں

مولانا ظفر علی خان مالک روزنامہ ''زمیندار'' لاھور کی شخصیت کسی طبقے میں بھی محتاج تعارف نہیں - تقریباً نصف صدی سے مولانا ایک صاحب طرز انشاء پرداز ' بے باک صحافی اور قادرالکلام شاعر کی حیثیت سے مشہور چلے آ رھے ھیں - مولانا کی تمام زندگی سیاسیات کی الجھنوں میں پھنسی رھی اور کئی مرتبہ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں لیکن شعر و شاعری کے ذوق میں کسی مرحلے پر بھی خلل پیدا نہ ھوا - ذیل میں صرف مولانا کے کمالات شاعری کو ھی پیش کیا جائے گا -

مولانا ۱۸۷۰ء میں ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں کوٹ مہرتھ میں پیدا ھوئے - ابتدائی تعلیم وزیر آباد میں حاصل کی اور پٹیالہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا - اس کے بعد علی گڑھ کالج میں داخل ھوئے اور ۱۸۹۲ء میں ایف اے کرنے کے بعد ریاست جموں و کشمیر کے محکمہ ڈاک میں ملازم ھو گئے - جہاں ان کے والد مولوی سراج الدین خاں مرحوم پہلے سے ملازم تھے - مگر مولانا اپنی افتاد طبع کے باعث یہاں زیادہ دیر تک نہ رہ سکے اور ایک حاکم سے کسی بات پر ناراض ھو جانے کے بعد آپ ملازمت سے دست کش ھو کر پھر علی گڑھ کالج میں جا داخل ھوئے جہاں سے آپ نے کامیابی کے ساتھ بی - اے کا امتحان پاس کیا -

بی - اے کر لینے کے بعد کچھ عرصہ تک نواب محسن الملک کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرتے رھے اور بعد میں نواب صاحب کی سفارش پر ھی حیدر آباد پہنچے اور دارالترجمہ سے منسلک ھو گئے - مولوی عزیز مرزا مرحوم ھوم سیکرٹری تھے جن کی توجہ سے یہ بہت جلد اسسٹنٹ ھوم سیکرٹری کے عہدے تک پہنچ گئے - عزیز مرزا کی جگہ جب نواب سر بلند جنگ ھوم سیکرٹری مقرر ھوئے - تو ان کی مولانا سے نہ نبھ سکی کیونکہ یہ کچھ چڑچڑے مزاج کے تھے - نتیجہ یہ ھوا کہ مولانا بمبئی چلے گئے اور وھاں ایک دوست کے ساتھ مل کر اسپورٹ و ایکسپورٹ کا ایک دفتر قائم کرلیا - لیکن تجارت ان کو راس نہ آئی -

کچھ مدت کے بعد جب عزیز مرزا دوبارہ ھوم سیکرٹری ھو گئے - تو اُن کے بلانے پر مولانا پھر حیدرآباد چلے گئے اور رجسٹرار مقرر ھو گئے - آپ نے یہاں

لارڈ کرزن کی تالیف ''خیابان فارسی'' کا اردو ترجمہ کیا - جس پر پنجاب یونیورسٹی نے مولانا کو پانصد روپیہ انعام دیا اور تین ہزار روپیہ نظام نے مرحمت کیا - اس سے پہلے مولانا سیر ظلمات ، فسانۂ لندن ، اور سنہری گھونگا کا ترجمہ کر چکے تھے -

مولانا کے والد نے ملازمت سے دستکش ہونے کے بعد وزیر آباد سے ''زمیندار'' کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالنا شرع کیا - ۱۹۰۹ء میں جب ان کا انتقال ہو گیا - تو مولانا ملازمت سے سبکدوش ہو کر واپس آ گئے اور زمیندار کی ادارت سنبھال لی - اخبار کو ہاتھ میں لیتے ہی سب سے پہلا کام آپ نے یہ کیا کہ زمیندار کا دفتر وزیر آباد کی بجائے لاہور میں لے آئے اور ہفتہ وار کی بجائے اسے روزانہ کر دیا جو اب تک شائع ہو رہا ہے -

کچھ عرصہ بعد جب طرابلس و بلقان کے ہنگاموں نے مسلمانوں میں ہیجان پیدا کر دیا تو مولانا ظفر علی خاں کی جرائت و بے باکی نے زبان و قلم کے وہ جوہر دکھائے کہ آن کا نام ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گونجنے لگا - غرض تحریک خلافت ، ترک موالات ، قید و بند ، رہائی اور مختلف انواع کے نشیب و فراز کے بعد مولانا ۱۹۳۷ء میں مرکزی اسمبلی کے ممبر ہو گئے اور ۱۹۴۵ء میں دوبارہ منتخب ہوئے -
مولانا بحیثیت ایک انسان کے بے حد محبت پرور ، شگفتہ مزاج ، بذلہ سنج ، لطیفہ گو ، دوست نواز اور شفیق بزرگ واقع ہوئے ہیں - چائے اور حقے کے بڑے شوقین ہیں اور جب یہ دونوں چیزیں جمع ہو جائیں تو آن کے منہ سے فی‌البدیہہ نظم و نثر کے پھول جھڑنے لگتے ہیں -

مولانا ظفر علی خاں نظم میں ایک بدیع اور خاص طرز کے موجد ہیں - آن کی زبان دانی اہل زبان کے نزدیک بھی مسلم ہے - اب تک آن کی نظموں کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں ''حبسیات ، نگارستان ، بہارستان اور چمنستان'' کے نام کس نے نہیں سنے اور کون نہیں جانتا کہ ان مجموعوں کی نظموں کی تعداد دو ہزار سے کم نہ ہوگی - اس میں شک نہیں کہ مولانا کی بیشتر نظمیں ایسی ہیں جو روز مرہ کے ہنگامی واقعات سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں اور آن کی حیثیت عارضی ہے تاہم ان کو آردو شاعری کے ذخیرے سے خارج نہیں کیا جا سکتا -

مولانا کی شاعری کے خاص موضوعات یہ ہیں:- سرور کائنات کی ذات اقدس سے والہانہ شیفتگی ، اسلام سے بے پناہ محبت ، وطن دوستی ، تاریخ اسلام ، حضور نظام سے اظہار عقیدت اور احرار ، کانگرس ، ہندو مہاسبھا اور قادیانی فرقے کی مخالفت اور خصوصیات کلام مجملاً یہ ہیں - پاکیزہ زبان ، صحیح محاورات ، شوخی ، رنگینی ، منظر نگاری اور قافیہ نوازی وغیرہ —— مولانا کی اس آخرالذکر خصوصیت کے باب میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آردو میں قافیہ کے صحیح ادراک کی مثال موصوف کی شاعری کے علاوہ غالباً کہیں نہیں ملتی - آن کے فن کا انتہائی کمال یہ ہے کہ کار آمد قافیوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں صرف کر دیا جائے - چنانچہ قافیہ آن کی اکثر نظموں میں مضمون کا رہبر ہے -

مولانا نے رسول اکرم کی شان میں بے شمار نعتیہ نظمیں لکھیں ہیں - جن میں سے بیشتر ''بہارستان'' میں موجود ھیں - جن میں خلوص و عقیدتمندی کے ساتھ ساتھ جودت طبع اور ندرت بیان کے وہ وہ کرشمے موجود ھیں کہ قاری پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ھے - ''نعت'' کے معاملے میں بلا شبہ محسن کاکوروی ایک انفرادی شان رکھتے ھیں اور انہوں نے اس مخصوص صنف سخن کو جو چار چاند لگائے ھیں وہ ہر نعت گو شاعر کے بس کا روگ نہیں بایں همه اس رنگ میں مولانا موصوف نے بھی جو کچھ کر دکھایا ھے وہ کسی صورت میں شاھکار سے کم نہیں -

مولانا کے سیاسی اور اخلاقی کلام پر بھی ایک نظر ڈالنے سے مولانا کے متنوع خیالات ، سیاسی نکتہ سنجی اور ندرت کلام کا پورا پورا احساس ھوتا ھے - اور اعتراف کرنا پڑتا ھے کہ مولانا ظفر علی خاں کو مشکل سے مشکل قوافی ڈھونڈ لانے میں ید طولیٰ حاصل ھے - یہ دوسری بات ھے کہ اکثر اُن کی منظومات میں صوتی حسن کے احساس کا پتہ نہیں چلتا تاھم مولانا اپنی قدرت سخن کی وجہ سے ھر قافیے میں ضرور رونق پیدا کر دیتے ھیں -

مولانا ظفر علی خاں کی شاعری کے متعلق عام طور پر کہا جاتا ھے کہ اشعار میں ندرت کلام اور زور بیان کے باوجود ان کا کلام ایسا نہیں کہ وہ شعراء کی محفل میں اپنے لئے کوئی مستقل مقام حاصل کر سکے - ان کی شاعری تمام تر ھنگامی تاثر کی پیداوار ھے اور اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا - لیکن ایسے ھنگامی دور میں مولانا ایسے بزرگ کے لئے مشکل تھا کہ وہ گرد و پیش کے حالات سے متاثر نہ ہوتے اور پھر جب کہ آمد کا یہ عالم تھا کہ حقے کے کش کے ساتھ مشکل اور ادق سے ادق مضمون میں ایسے موتی بکھیر دیتے تھے کہ دیکھنے اور سننے والے دنگ رہ جاتے - ایسے مزاج اور حالات کے مطابق مولانا وھی کر سکتے تھے جو انہوں نے کیا

مولانا کے بعض ممدوحین بھی تھے جن کی شان میں انہوں نے نظمیں لکھیں - لیکن ان کے مقابلے میں ان لوگوں کی فہرست بہت طویل ھے - جو مولانا کے نشتر سہلک کے کچوکوں سے مجروح ہوئے ان میں سے اکثر ایسے بھی تھے - جو کسی وقت مولانا کے ممدوح بھی رہ چکے تھے - اور دیکھا جائے تو ان کے کلام کا بیشتر حصہ ھجو و مخالفت کا سرمایہ دار ھے - تاھم مشکل سے مشکل زمین اور قوافی میں آپ کے شعر ایسے معلوم ھوتے ھیں گویا ٹکسال سے بن کر نکلے ھیں -

سالک اور سہر ادارہ زمیندار میں کام کرتے تھے - جب انہوں نے اپنا پرچہ ''انقلاب'' نکالا تو مولانا نے لکھا -

انقلابات ھیں زمانے کے   مہر و سالک کے انقلاب کو دیکھ

اور جب زمیندار اور انقلاب میں معرکہ کارزار گرم ھو گیا - تو انقلاب کی حمایت پر ''نیازمندان لاھور'' کی پوری جماعت تھی - اور دوسری طرف اکیلے ظفرعلی خاں - کبھی کبھی

اختر شیرانی مرحوم ''عکاس'' کے نام سے نظمیں لکھ کر مولانا کا ھاتھ بٹاتے تھے۔ ورنہ مولانا اکیلے ان سے چومکھی لڑتے رہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

زمیندار ایک آپ اتنے مگر اوج صحافت پر
یہ اک تکل لڑے گا آپ کی ساری پتنگوں سے

علی برادران سے گاڑھی چھنتی تھی مگر جب خلاف ہوئے تو لکھا۔

دونوں نے مل کے ڈالی ہے اسلامیوں میں پھوٹ
ہے صلح و آشتی سے علی بھائیوں کو ضد
منڈلا رہے ھیں آج خلافت کی لاش پر
دھلی کے اور بمبئی کے موٹے موٹے گد

محمد علی جناح سے روٹھے تو لکھا۔

کیونکر اس کی نگہ ناز سے جینا ہوگا زہر دے اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا

گاندھی کی تعریف کی تو آسمان پر چڑھا دیا اور جب بگڑے تو لکھا۔

بھارت میں بلائیں دو ھی تو ھیں اک ساورکر اک گاندھی ہے
اک جھوٹ کا چلتا جھکڑ ہے اک مکر کی اٹھتی آندھی ہے
لب پر ہے صدا آزادی کی اور دل میں ہے شوق غلامی کا
اکھڑی تھی ہوا انگریزوں کی ' ان دونوں نے مل کر باندھی ہے

بہارستان ' نگارستان اور چمنستان کے نام سے آپ کے تین مجموعہ ھائے کلام چھپ چکے ھیں۔ ان میں سب کچھ ہے مگر تغزل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طبقہ ان کو شاعر ھی تسلیم نہیں کرتا۔ تاھم مولانا ھماری زبان ' ھمارے ادب اور ھماری شاعری کے نہایت عزیزالوجود رکن ھیں۔ ان کا دم غنیمت ہے خدا انہیں تادیر سلامت رکھے۔ آمین

سیر کہسار

گزاری میں نے تابستاں کی فرحت کوھساروں میں
دل افزا آبشاروں میں دل آرا مرغزاروں میں
ھم آغوش صبا تھی نکہت گل کی سیہ مستی
جنوں پرور تھے نغمے طائروں کے شاخساروں میں
کھنچی تھی سامنے زنجیر سرجیون پہاڑوں کی
فلک تھا بوسہ افشاں جن کی برفیلی قطاروں میں
نسیم آئی فضائے خُلد سے اور بے حجاب آئی
کرن سورج کی ناچی ھو کے عریاں جوئباروں میں

نعت

وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز جھلکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں
گر ارض و سما کی محفل میں لولاک لما کا شور نہ ہو
یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں یہ نور نہ ہو سیّاروں میں
جو فلسفیوں سے کُھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں
وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکان فلسفہ سے
ڈھونڈھے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں
ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی بوبکر و عمر، عثمان، علی
ہم مرتبہ ہیں یارانِ نبی کچھ فرق نہیں ان چاروں میں

سخنوران عہد سے خطاب

اے نکتہ وران سخن آرا و سخن سنج
اے نغمہ گران چمنستان معانی
مانا کہ دل افروز ہے افسانۂ عذرا
مانا کہ دل آویز ہے سلمیٰ کی کہانی
مانا کہ اگر چھیڑ حسینوں سے چلی جائے
کٹ جائے گا اس مشغلے میں عہد جوانی
گرمائے گا یہ ہمہمہ افسردہ دلوں کو
بڑھ جائے گی دریائے طبیعت کی روانی
مانا کہ ہیں آپ اپنے زمانے کے نظیری
مانا کہ ہر اک آپ میں ہے عرفئی ثانی
مانا کہ حدیث خط و رخسار کے آگے
بے کار ہے مشّائیوں کی فلسفہ دانی
مانا کہ یہی زلف و خط و خال کی رو داد
ہے مایۂ گل کاریٔ ایوان معانی
لیکن کبھی اس بات کو بھی آپ نے سوچا
یہ آپ کی تقویم ہے صدیوں کی پرانی

معشوق نئے ، بزم نئی ، رنگ نیا ہے
پیدا نئے خامے ہوئے ہیں اور نئے مانی
مژگاں کی سناں کے عوض اب سنتی ہے محفل
کانٹوں کی کتھا برھنہ پائی کی زبانی
لذت وہ کہاں لعل لب یار میں ہے آج
جو دے رہی ہے پیٹ کے بھوکوں کو کہانی
بدلا ہے زمانہ تو بدلئے روش اپنی
جو قوم ہے بیدار یہ ہے اس کی نشانی
اے ہم نفسو یاد رہے خوب یہ تم کو
بستی نئی مشرق میں ہے اک تم کو بسانی

سرنگا پٹم

سلطان ٹیپو کے مزار پر دو آنسو

اے سرنگا پٹم ، اے گنج شہیدان کرام
آخری وقت میں اسلام کی غیرت کی نمود
تیری آنکھوں میں ہے اپنوں کا عروج اور زوال
تو نے دیکھا ہے پرایوں کا ھبوط اور صعود
کام میں لا نہ سکی تھی جسے خاک دھلی
تیرے ذروں نے بچھا دی وہ حجازی بارود
کشور ہند کا رنگ اور ہی ہوتا کچھ آج
مکر کا دام بچھاتا نہ اگر چرخ کبود
سو رہا ہے ترے پہلو میں وہ میسور کا شیر
مایۂ ناز تھا ملت کے لئے جس کا وجود
قوت بازوئے اسلام تھی اس کی صولت
اس کی دولت کے ہواخواہوں میں شامل تھے ہنود
کبھی سوتے میں نہ کروٹ یہ مجاھد بدلے
اب بھی اس خوف سے ہیں لرزہ بر اندام حسود

اُس کے اُٹھتے ہی مسلمان کا گھر بیٹھ گیا
تھا قیامت کا قیام اور قیامت کا قعود

آخری قول یہ اُس کا نہ ہمیں بھولے گا
جس سے قائم ہوئیں آئین حمیّت کی حدود

''شیر اچھا ہے جسے مہلت یک روزہ ملی
یا وہ گیدڑ جسے بخشا گیا صد سالہ خلُود''

دل حسرت زدہ میرا بھی گیا ساتھ جب آج
اُس کے مرقد پہ گئے یاس و تمنا کے وفود

پھر گئی آنکھ میں فردوس بریں کی تصویر
ظلّ محدود میں تھا جلوۂ سدرِ مخضود

اُس کی دہلیز سے لپٹی ہوئی تھی رحمت حق
چومتے تھے جسے جھک جھک کے ملائک کے جنود

برسر تربیت من چوں گزری ہمّت خواہ
کہ زیارت گہہ رندان جہاں خواہد بود

میں نے کی عرض کہ اے فطرت آزاد کی روح
توڑلی جس نے سکھائی ہیں غلامی کی قیود

بر زمینے کہ نشان کف پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

''چو'' کی لفظی تحقیق

اشنان کرنے گھر سے چلے لالہ لال چند
اور آگے آگے لالہ کے آن کی بہو گئی

پوچھا جو میں نے لالہ للائین کہاں گئیں
نیچی نظر سے کہنے لگے وہ بھی چو گئی

میں نے دیا جواب انہیں از رہ مذاق
کیا وہ بھی کوئی چھت تھی کہ بارش سے چو گئی

کہنے لگے کہ آپ بھی ہیں مسخرے عجب
اب تک بھی آپ سے نہ تمسخر کی خُو گئی

چو ' ہوشیارپور میں ندی سے ہے مراد
بی بی تمیز بھی وہیں کرنے وضو گئی
میں نے کہا کہ "چو" سے اگر ہے مراد "جُو"
تو یوں کہو کہ تابہ لب آب جُو گئی
کیوں اینٹھتے ہیں ماش کے آٹے کی طرح آپ
دھوتی سے آپ کی نہیں ہلدی کی بو گئی
لطف زباں سے کیا ہو سروکار آپ کو
دامن کو آپ کے نہیں تہذیب چھو گئی
ہندی نے آ کے جیم کو چے سے بدل دیا
چو آئی کوہسار میں گلشن سے جو گئی
لہجہ ہوا درست زباں ہو گئی کرخت
لطف کلام و شستگئی گفتگو گئی
معنی کو ہے گلہ کہ ہوا بے حجاب میں
شکوہ ہے لفظ کو کہ مری آبرو گئی
افسوس ملک میں نہ رہی فارسی کی قدر
مستی اڑی شراب سے پھولوں سے بو گئی

تغزل

پیغمبر جمال تری دل ربا ادا
پروردگار عشق ترا چلبلا چلن
الجھے ہوئے ہیں دل تری زلف سیاہ میں
ہیں جسکے ایک تار سے وابستہ سو ختن
پروردۂ فسوں ہے تری آنکھ کا خمار
آوردۂ جنوں ہے تری بوئے پیرہن
پیمانۂ نشاط تری ساقِ صندلیں
پیمانۂ سرور ترا مرمریں بدن
رونق ہے ہوٹلوں کی ترا حسن بے حجاب
جس پر فدا ہے شیخ تو لٹو ہے برہمن

محو جمال سادہ ہوں سرشار بادہ ہوں
دونوں پہ حق مرا ہے کہ میں پیرزادہ ہوں

پڑتی ہے ہردوار میں ہلچل ہر اک طرف
جس وقت میں جہاد کا کرتا ارادہ ہوں
تہذیب مغربی کی نہ داڑھی ہے اور نہ مونچھ
صورت یہ کہہ رہی ہے کہ نر ہوں نہ مادہ ہوں
جس کو ادب سے بوسہ دیا جبرئیل نے
اُس آستاں پہ دیر سے میں سرنہادہ ہوں
ہندوستاں میں آ کے میں گمراہ ہو گیا
گاندھی ہے جادہ اور میں خم و پیچ جادہ ہوں

منظومات

حکومت التجاؤں سے کبھی حاصل نہیں ہوتی

حکومت التجاؤں سے کبھی حاصل نہیں ہوتی
کوئی اللہ کا بندہ یہ کہدے مالوی جی سے
کبھی بھی سیدھی انگلی سے نہ نکلا ہے نہ نکلے گا
چپڑنا چاہتے ہیں اپنے پھلکے آپ جس گھی سے
رزولیوشن کہاں تک پاس کرتے ہم چلے جائیں
یہ چکی کانگریس بیٹھی ہوئی کس وقت تک پیسے
نہیں ملتی ہے جلسوں اور تقریروں سے آزادی
جو ملتی ہے تو ملتی ہے پچھیتی سے لٹھیتی سے
وہ گوکل کا گوالا جو ہے میٹھی بانسری والا
یہ کہتا ہے کہ بھینس اُس کی جو ہانکے اس کو لاٹھی سے

برما کی یاد میں

برسات میں برما کی دلاویز فضا دیکھ
کشمیر کے بعد آکے یہاں شانِ خدا دیکھ

سورج کا پتہ پوچھتی پھرتی ہے خدائی
بادل کو اس انداز سے گردوں پہ گھرا دیکھ
آئی ہے دبے پاؤں صبا اُس کو جگانے
انگڑائیاں لیتے ہوئے سبزے کی ادا دیکھ
رنگوں کی جھیلوں کے کناروں پہ چلا جا
اور نور کے سانچوں میں حسینوں کو ڈھلا دیکھا
جوڑے کی گل انداز گندھاوٹ پہ نظر ڈال
اور غازۂ رخسار پہ صندل کو ملا دیکھ
لب ہائے عقیقی پہ نہیں پان کی سرخی
اس رنگ میں تو سرخئی خون شہدا دیکھ
سینہ جو برہنہ ہے تو رانیں بھی ہیں عریاں
پھر کر نئی تہذیب کا انداز حیا دیکھ

شان احمد مجتبیٰ

جو رونق عرب کی ہوئی شان احمد
تو زینت عجم کی ہوئی آن احمد
خدا کی محبت کی گیرائیوں نے
قسم جس کی کھائی وہ ہے جان احمد
فرشتے یہ کل عرش پر کہہ رہے تھے
کہ کسریٰ و قیصر ہیں دربان احمد
نہ دیکھی ہو رحمت کی تصویر جس نے
وہ دیکھے سراپائے رخشان احمد
ہوئے ریزہ چیں گبرو ترسا بھی اس سے
وسیع اسقدر ہو گیا خوان احمد
ارسطو کی حکمت ہے یثرب کی لونڈی
فلاطوں ہے طفل دبستان احمد
بنا ماہ نوجھک کے نعل اُس کے سم کی
بڑھا جب سوئے بدریکران احمد
یہ قصہ نہ ہو ختم شام ابد تک
گنانے پہ آؤں جو احسان احمد
یہاں جنس توحید کی بیچتے ہیں
چمکتی اسی سے ہے دکّان احمد
ہوئی ظلمت کفر کافور جب سے
ہے روشن چراغ شبستان احمد
مجھے دین و دنیا کی دولت ملی ہے
کہ ہے میرے ہاتھوں میں دامان احمد
مری مدح کرتی ہے ساری خدائی
ہوا ہوں میں جب سے ثنا خوان احمد
ترانے مرے عرش پر گونجتے ہیں
میں ہوں عندلیب گلستان احمد

یہود اور نصاریٰ کو رہنے نہ دیں گے عرب میں کبھی جاں نثاران احمد
نکالیں گے چن چن کر اُن کو یہاں سے کہ پہنچا ہے ہم کو یہ فرمان احمد
ہے الٹی عجب کھوپڑی قادیاں کی نبی بن گئے ہیں غلامان احمد
اڑائیں گے پرزے "براھین" کے ہم کہ برہان قاطع ہے برہان احمد
مبارک ہو رندانِ ہندوستاں کو
کہ پھر جوش میں ہے خمستانِ احمد

مولانا محمد علی جوہر

محمد علی نام - جوہر تخلص اواخر ۱۸۷۸ء
میں ریاست رامپور میں پیدا ہوئے - جہاں آپ
کے والد ماجد عبدالعلی خاں صاحب دربار سے
منسلک تھے - مولانا دو سال کے تھے کہ اُن
کے والد کا انتقال ہو گیا اور اُنہوں نے اپنی
والدہ کی آغوش میں پرورش پائی - والدہ چونکہ شرع
اور دین کی پابند اور تعلیمات اسلامی کی ایک
جیتی جاگتی تصویر تھیں اسلئے مذہبی خصوصیات
ابتدا ہی سے مولانا کی سرشت میں داخل ہو گئیں - مولانا کی ابتدائی تعلیم رامپور اور بریلی
کے مدارس میں ہوئی - اعلیٰ انگریزی تعلیم کے لئے علیگڑھ کالج بھیجے گئے - ۱۸۹۶ء میں
بی - اے کا امتحان اس امتیاز کے ساتھ پاس کیا کہ الہ آباد یونیورسٹی کے بی - اے کے
امتحان میں اول رہے - اس شاندار کامیابی سے خوش ہو کر اُن کے بڑے بھائی مولانا
شوکت علی نے اُنہیں آئی - سی - ایس کی تکمیل کے لئے آکسفورڈ بھیج دیا - مگر وہاں
جا کر اُنہوں نے لنکن میں تاریخ کا مضمون منتخب کیا اور ساتھ ہی قانون کا مطالعہ
کرتے رہے - ۱۸۹۹ء میں وہاں سے فارغ ہو کر واپس آئے تو کچھ عرصہ رامپور اور بڑودہ
کی ریاستوں میں ملازمت کرتے رہے - کچھ دیر کے بعد اُن کا دل ان ملازمتوں سے آکتا
گیا اور اُنہوں نے کلکتہ میں سکونت اختیار کر کے ۱۱ جنوری ۱۹۱۱ء سے انگریزی کا
ہفت روزہ ''کامریڈ'' جاری کیا - جس نے مولانا کی لا جواب انشا پردازی اور ذہانت طبع
کی بدولت نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند میں بھی بڑی مقبولیت حاصل کی - اسی کامریڈ
میں مولانا محمد علی کے مقالات پڑھ کر مشہور انگریزی ادیب ایچ - جی - ویلز نے مولانا
موصوف کے متعلق کہا تھا کہ '' محمد علی نے برک کی زبان ' میکالے کا قلم اور نپولین
کا دل پایا ہے'' -

انگریزی کے ساتھ ساتھ مولانا کی اُردو کی قابلیت بھی مسلمہ تھی - چنانچہ اُنہوں نے
عوام کی خاطر ایک اُردو روز نامہ ''ہمدرد'' بھی جاری کیا اور پھر مرتے دم تک قوم و ملک
کی خدمت کرتے رہے - اُنہوں نے برطانوی سامراج کے خلاف جس بے باکی اور بے خوفی
کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا وہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک یادگار کارنامہ ہے -
جد و جہد آزادی میں سرگرم حصہ لینے کے جرم میں مولانا کی زندگی کا کافی حصہ قید و بند
میں بسر ہوا - لیکن قید و بند کی یہ سختیاں آپ کے جذبہ آزادی اور حب قوم و وطن کو کم
نہ کر سکیں - بلکہ ہر سزا کے بعد یہ جرم عشق وطن بڑھتا ہی چلا گیا -

۱۹۱۹ء میں مولانا نے خلافت کی تحریک شروع کی ۔ جس میں ہندوستان کے تمام مسلمانوں نے اُن کا پورا پورا ساتھ دیا ۔ پھر اُنھوں نے تحریک خلافت کی تبلیغ و تنظیم اور ملکی آزادی کی خاطر مسٹر گاندھی کے ساتھ ترک موالات کی تحریک شروع کی ۔ اسی زمانہ میں اُنھوں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ ہندوستان میں ایسی درسگاہوں کا قیام نہایت ضروری ہے جن پر حکومت کا کوئی اثر و اقتدار نہ ہو اور جن میں ایسی تعلیم دی جا سکے جو نوجوانوں کی مذہبی، سیاسی، اخلاق اور صنعتی زندگی میں کارآمد ثابت ہو ۔ اسی جذبہ کے پیش نظر اُنھوں نے جامعہ ملیہ دھلی کی بنیاد ڈالی۔ اس ادارہ نے جو قومی خدمت انجام دی ہے وہ بلاشبہ قابل تعریف ہے۔

مولانا کانگرس کے سرگرم کارکن رہے اور تحریک عدم تعاون کے جرم میں کئی سال جیل میں رہے ۔ ۱۹۲۳ء میں جب جیل سے رہا ہوئے تو کانگرس کے صدر منتخب ہوئے اور ہندو مسلم اتحاد کی بڑی کوشش کی ۔ مگر نہرو رپورٹ کی اشاعت نے ہندوؤں کے درپردہ عزائم کو واشگاف کر دیا اور مولانا نے کانگرس سے علیحدہ ہو کر مسلم کانفرنس کی بنیاد رکھی ۔ لیکن اس میں مولانا کو کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی ۔ کیونکہ مسلمانوں کا سرکار پرست طبقہ تو لیگ میں تھا اور آزاد خیال مسلمان کانگرس کے دامن سے اس طرح وابستہ تھے کہ اُن کا علیحدہ ہونا مشکل تھا ۔

ان حالات نے مولانا کی صحت پر بہت برا اثر کیا ۔ مگر اس کے باوجود جنوری ۱۹۳۱ء میں محض قومی درد سے مجبور ہو کر گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے انگلستان تشریف لے گئے ۔ آپ نے باوجود علالت کے بڑی بہادری اور جرأت کے ساتھ انگریز سے اپنا حق مانگا اور فرمایا کہ ”اگر تم میرے ملک کو آزاد نہیں کرو گے تو واپس میں نہیں جاؤں گا اور تمہیں میری قبر بھی یہیں بنانی ہوگی“ ۔ چنانچہ انھی ایام ھی میں مولانا نے لندن میں انتقال فرمایا اور ان کی نعش کو بیت المقدس میں دفن کیا گیا ۔ بہت پہلے آپ نے اپنے متعلق کہا تھا

ہے رشک ایک خلق کو جوھر کی موت پر   یہ اسکی دین ہے جسے پروردگار دے

مولانا محمد علی انگریزی کے بے مثل ادیب ہونے کے علاوہ اُردو نظم و نثر میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے ۔ شعر و شاعری کا ذوق اُنھیں بچپن ھی سے تھا اس پر رام پور کی شاعرانہ فضا نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب رامپور میں فصیح الملک داغ کا طوطی بول رہا تھا اور امیر، تسلیم، جلال، عروج وغیرہ آسمان لکھنؤ کے ٹوٹے ہوئے ستارے رام پور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے ۔ خود مولانا کے بڑے بھائی ذوالفقار علی خاں گوھر کو داغ سے تلمذ حاصل تھا اور اُن کا شمار خوش فکر شعرا میں ہوتا تھا ۔ گوھر ھی کے توسط سے مولانا کی رسائی حضرت داغ کی صحبت میں ہوئی ۔ داغ مولانا کی ذھانت و طباعی سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ جس دن یہ نہ جاتے تو وہ گوھر سے تقاضا کر کے بلواتے ۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مولانا صحیح معنوں میں شعر و سخن کی گود میں پلے اور پروان چڑھے ۔ گیارہ برس کی عمر میں وہ علیگڑھ گئے تو اُن کی جودت طبع و موزوں گوئی سے مولانا شبلی مرحوم اُن کے فریفتہ ہو گئے ۔ کالج کے زمانہ طالب علمی میں سجاد حیدر یلدرم اور مولانا حسرت موھانی جیسے ساتھیوں کی صحبت میں اُنھوں نے شعر و سخن کی محفلوں میں خوب خوب حصہ لیا ۔ لیکن یہ اُن کا اصل رنگ نہ تھا ۔ اُن کے صحیح اور سچے جذبات کی ترجمانی درحقیقت ”ھمدرد“

کے اجرا کے بعد شروع ہوئی اور انہوں نے سیاسی افکار و خیالات کو غزل کی زبان میں بڑی کامیابی کے ساتھ ادا کیا ۔ آخر عمر میں عشق حقیقی رنگ لایا اور تغزل کا زور ہوا مگر افسوس کہ عدیم الفرصتی کے باعث مولانا اس کی طرف زیادہ توجہ نہ دے سکے ۔ تاہم مولانا کے دو مختصر مجموعہ کلام جو ''کلام جوہر'' کے نام سے طبع ہو چکے ہیں کے مطالعہ سے مولانا کی حقیقی شاعری کے جوہر ضرور کھلتے ہیں ایک طرف تو آن کا کلام اکثر و بیشتر آپ بیتی ہونے کی وجہ سے نری الفاظ تراشی و قافیہ بندی کی منزل سے بہت آگے ہے ۔ اس پر مستزاد یہ کہ مولانا موصوف صاحب دل ہونے کے ساتھ صاحب زبان بھی تھے ۔ جسکا نتیجہ یہ ہے کہ آنکی شاعری بڑی شستہ و شیریں ہے ۔ آن کا تغزل شوخئی بیان ' لطف زبان ' حسن ادا ' رنگین خیالی اور عاشقانہ مضمون آفرینی کی اہم خصوصیات سے مالا مال ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا کی فطری متانت و سنجیدگی کی وجہ سے آن کے کلام میں شگفتگی زیادہ نہیں ۔ لیکن درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور ہر شعر جوش و خروش اور جذب و ذوق میں ڈوبا ہوا ہے ۔

انتخاب کلام

ارادہ ہے طواف کعبہ کا اس آفت جاں کا
خدا حافظ مسلمانو ! تمہارے دین و ایماں کا

اسی کے منتظر ہیں ہم بھی تو جسکی ہے اے بلبل
بہار آنے پہ ہوگا فیصلہ دست و گریباں کا

جنوں باقی ہے ابتک گو تیری محفل میں بیٹھا ہے
کہ رہ رہ کر خیال آتا ہے جوہر کو گریباں کا

کر دیا قید قفس نے ہم کو آزاد چمن ... پاس کافی ہو چکا اب خاطر صیاد کا
عزم عاشق ہے خود اپنی کامیابی کی دلیل ... نام بھی لینا نہ ہرگز کوشش برباد کا
آج تک ہے ایک کنعانی سے شہرت مصر کی ... فیض سے حسرت کے ہوگا نام فیض آباد کا

ہو گئے جوہر یہ کیسے بندۂ دام فریب
شور سنتے تھے بہت ہم ''حسرت آزاد'' کا

پیام مرگ ہے ' پیغام یار و مژدۂ وصل ... وہ کام اجل نے کیا جو صبا سے ہو نہ سکا

جوہر مسیح و خضر کو ملتی نہیں یہ چیز ... اور یوں نصیب سے تجھے مل جائے کربلا

دیتا تھی داد تشنہ لبی یوں حسین کو
کوثر کا اک بہانہ بنی کربلائے دوست

هرگز نہ ہو، اے دل غم جاناں کی شکایت
کرتا ہے بھلا کوئی بھی مہماں کی شکایت

ہیں عشق کے بیمار بھی دنیا سے نرالے
ہے درد کے بدلے انہیں درماں کی شکایت

دور حیات آئیگا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

جینا وہ کیا کہ دل میں نہ ہو تیری آرزو
باقی ہے موت ہی دل بے مدعا کے بعد

تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے وے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

لذت ہنوز مائدہ عشق میں نہیں
آتا ہے لطف جرم تمنا سزا کے بعد

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سرِ دار دیکھکر
''دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر''

آساں پسندیوں سے ہیں بیزار اہل عشق
چھانٹا یہ مرحلہ بھی ہے، دشوار دیکھکر

اس شان امتیاز کو دیکھو کہ اہل کفر
مومن سمجھ رہے ہمیں خوار دیکھکر

یاد وطن نہ آئے ہمیں کیوں وطن سے دور
جاتی نہیں ہے بوئے چمن کیا چمن سے دور

مست مئے الست کہاں اور ہوس کہاں
طرز وفائے غیر ہے اپنے چلن سے دور

گر بوئے گل نہیں نہ سہی یاد گل تو ہے
صیاد لاکھ رکھے قفس کو چمن سے دور

پاداش جرم عشق سے کب تک سفر بھلا
مانا کہ تم رہا کئے دار و رسن سے دور

آساں نہ تھا تقرب شیریں تو کیا ہوا
تیشہ کو کوئی رکھ نہ سکا کوہکن سے دور

ہم تک جو دور جام پھر آئے تو کیا عجب
یہ بھی نہیں ہے گردش چرخ کہن سے دور

شاید کہ آج حسرت جوہر نکل گئی
اک لاش تھی پڑی ہوئی گور و کفن سے دور

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں اُن سے خلوت میں ملاقاتیں

ہر آن تسلی ہے، ہر لحظہ تشفی ہے
ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مدا راتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

بیٹھا ہوا توبہ کی توخیر منایا کر
ٹلتی نہیں یوں جوہر اس دیس کی برساتیں

کیا ڈھونڈھتے ہو فصل خزاں میں بہار کو　　اب وہ چمن کہاں ہے وہ رنگ چمن کہاں
فرصت کسے خوشامد شمر و یزید سے　　اب ادّعائے پیرویٔ پنجتن کہاں

عشق مجنوں کیلئے ناقۂ لیلیٰ کے سوا　　شرط یہ بھی ہے کہ اک وادیٔ پر خار بھی ہو
بت پرستی کا نشاں طوق غلامی کم ہے　　کیا ضروری ہے کہ قشقہ بھی ہو زنار بھی ہو
رہے آزاد ، جو رہتا ہو ، تمہیں کیا جوہر　　تم تو زندانیٔ الفت ہو ، گرفتار بھی ہو

سوز دروں سے جل بجھو لیکن دھواں نہ ہو　　ہے درد دل کی شرط کہ لب پر فغاں نہ ہو
پھر ہو رہا ہے شور صلائے نبرد عشق　　ہاں اے دہان زخم جواب الاماں نہ ہو
اس درد لا علاج کی کیوں کر دوا کروں　　وہ حال دل سنیں بھی تو مجھ سے بیاں نہ ہو
خوف رقیب کا تو یہ عالم اور اس پہ عشق　　سب چاہتے ہیں چاہ کا ان پر گماں نہ ہو
ہے وصل یار کی بھی تمنا کا حوصلہ　　ڈر یہ بھی ہے کہ طبع عدو پر گراں نہ ہو

سنتے ہی جس کو خلق میں کہرام مچ گیا
جوہر وہ تیری ہی تو کہیں داستاں نہ ہو

بے خوفِ غیر ، دل کی اگر ترجماں نہ ہو　　بہتر ہے اس سے یہ کہ سرے سے زباں نہ ہو
اک تو جو مہرباں ہو تو ہر اک ہو مہرباں　　اور یوں نہ ہو، بلا سے کوئی مہرباں نہ ہو
ہم کو تو ایک تجھ سے ، دو عالم میں ہے غرض　　سب بد گماں ہوا کریں ، تو بدگماں نہ ہو
ہمت نہ ہار دے کوئی منزل کے سامنے　　پروردگار یوں بھی کوئی ناتواں نہ ہو

جوہر اس ایک دل کے لئے اتنے مشغلے
کی ہے خدا کی چاہ تو عشق بتاں نہ ہو

اس طرح کے مرنے میں بھی جینے کا مزا ہے　　قسمت میں یہی ہے کہ ابھی راہ قضا دیکھ
یہ نور خدا کا ہے بجھائے نہ بجھے گا　　کچھ دم ہے اگر تجھ میں تو آ، تو بھی بجھا دیکھ
ہو حسن طلب لاکھ مگر کچھ نہیں ملتا　　ہو صدق طلب ، پھر اثرِ آہِ رسا دیکھ

سونے کا نہیں وقت تو ہشیار ہو غافل
رنگ فلک پیر ، زمانے کی ہوا دیکھ

میرے لہو سے خاکِ وطن لالہ زار دیکھ　　اسلام کے چمن کی خزاں میں بہار دیکھ
کیا عشق ناتمام کی بتلاؤں سرگزشت　　دار و رسن کا اور بھی اب انتظار دیکھ

ارادہ تھا یہ نالوں کا ھلا دیں ربع مسکوں کو
مگر اے ھم نفس، دل کی تھکن کچھ اور کہتی ھے
یقیں آنے کو تو آ جائے تیرے عہد و پیماں کا
تری آنکھ اے بت وعدہ شکن کچھ اور کہتی ھے
حرم میں کر تو دے اظہار ترک میکشی جوھر
مگر کم بخت کی بوئے دھن کچھ اور کہتی ھے

قید اور قید بھی تنہائی کی شرم رہ جائے شکیبائی کی
کر گئی زندۂ جاوید ھمیں تیغ قاتل نے مسیحائی کی

خوگر جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی اس قدر ظلم پہ موقوف ھے کیا اور سہی
خوف غمّاز، عدالت کا خطر، دار کا ڈر ھیں جہاں اتنے وھاں خوف خدا اور سہی
دین ودل جا ھی چکا جان بھی جاتی ھے تو جائے ترکش کفر میں اک تیر قضا اور سہی
کشور کفر میں کعبہ کو بھی شامل کر لو سیر ظلمات کو تھوڑی سی فضا اور سہی
ھم وفا کیشوں کا ایماں بھی ھے پروانہ صفت شمع محفل جو وہ کافر نہ رہا اور سہی

خاک جینا ھے اگر موت سے ڈرنا ھے یہی ھوس زیست ھو اس درجہ تو مرنا ھے یہی
قید گیسو سے بھلا کون رھے گا آزاد تیری زلفوں کا جو شانوں پہ بکھرنا ھے یہی
اور کس وضع کی جویاں ھیں عروسانِ بہشت ھیں کفن سرخ، شہیدوں کا سنورنا ھے یہی
حد ھے پستی کی کہ پستی کو بلندی جانے اب بھی احساس ھو اس کا تو ابھرنا ھے یہی
نقد جاں نذر کرو سوچتے کیا ھو جوھر
کام کرنے کا یہی ھے تمہیں کرنا ھے یہی

تم یوں ھی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ھے پر غیب سے سامان بقا میرے لئے ھے
پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو خوش ھوں وھی پیغام قضا میرے لئے ھے
توحید تو یہ ھے کہ خدا حشر میں کہدے یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ھے
ھے ظلم بہت عام ترا پھر بھی ستم گر مخصوص یہ انداز جفا میرے لئے ھے
ھیں یوں تو فدا ابر سیہ پر سبھی میکش پر آج کی گھنگھور گھٹا میرے لئے ھے
ھوں لائق تعزیر پر الزام ھے جھوٹا مجرم تو ھوں بے شک پر خطا اور ھی کچھ ھے
خود خضر کو شبیر کی اس تشنہ لبی سے معلوم ھوا آبِ بقا اور ھی کچھ ھے

یوں قید سے چھٹنے کی خوشی کس کو نہ ہوگی — پر تیرے اسیروں کی دعا اور ہی کچھ ہے
یہ صدر نشینی ہو مبارک تمہیں جوہر — لیکن صلۂ روز جزا اور ہی کچھ ہے

طاقتِ پرواز ہی جب کھو چکے — پھر ہوا کیا گر ہوئے بھی پر کھلے
رات تلچھٹ تک نہ چھوڑی تب کہیں — رازہائے بادۂ و ساغر کھلے
رونمائی کے لئے لایا ہوں جاں — اب تو شاید چہرۂ انور کھلے
فیض سے تیرے ہی اے قید فرنگ — بال و پر نکلے قفس کے در کھلے
جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر
مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

ہم نے یہ مانا کہ یاس کفر سے کمتر نہیں — پھر بھی تیرا انتظار دیکھئے کب تک رہے
عشق سو وہ بھی ترا صبر طلب ہے بہت — صبر ہمارا شعار دیکھئے کب تک رہے
سب کو یہاں ہے فنا ایک تجھے ہے بقا — یہ ستم روزگار دیکھئے کب تک رہے
یوں تو ہے ہر سو عیاں آمد فصل خزاں — جور و جفا کی بہار دیکھئے کب تک رہے

دشمنوں سے گر تلطف ہے تو کچھ — دوستوں سے بھی مدارا چاہئے
چاک مت کر جیب بے ایّام گل — کچھ ادھر کا بھی اشارا چاہئے

قید تنہائی کا لذّت آشنا — کیسے کہدوں تارک لذّات ہے
کیا نہ ہوگی میری ہی حاجت روا — جسکا مولا قاضی الحاجات ہے
تیرے بندے آن پہ بھاری ہوں تو پھر — تیرا کیا کہنا تیری کیا بات ہے
تبھ گئی توبہ شب مہ میں اگر — سوچتا ہوں سامنے برسات ہے
لے چلا ہے اس کی رحمت کا یقیں — اپنی تو صاحب یہی اوقات ہے
شمع ایماں کو خدا روشن رکھے
قبر میں جوہر کی پہلی رات ہے

شہد و شراب خلد میں یہ چاشنی کہاں — کچھ خون دل سے بڑھ کے مزا ہو تو جانئے

یہ حالت ہو گئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے
کہ خم کے خم بھرے رکھے ہیں اور میخانہ خالی ہے

یہ ستانے کی نکالی ہے انوکھی ترکیب
ظلم کا نام ستمگر نے حیا رکھا ہے
آپ آئے ہیں عیادت کو دم نزع عبث
جوہر خستہ میں اب کہئے تو کیا رکھا ہے

مہمانِ قفس کیا ترے فریاد کریں گے
اتنی بھی نہ اب خاطر صیاد کریں گے
جو دشت کہ آرام گہہ سبط نبی ہے
اس دشت کو لاکھوں ابھی آباد کریں گے

جسکو دنیا نے نامراد کہا
وہی ناکام ' کام کرتا ہے
اس قدر احتیاط اے صیاد
کہ قفس میں بھی پر کترتا ہے

دے نقد جاں تو بادۂ کوثر ابھی ملے
ساقی کو کیا پڑی ہے کہ یہ مے اُدھار دے
ہے رشک ایک خلق، کو جوہر کی موت پر
یہ اُسکی دین ہے جسے پروردگار دے

دعائے اسیر

(اپنی عزیز بیٹی آمنہ کی علالت پر جس کی اطلاع جیل خانے میں ملی تھی)

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں
امتحاں سخت سہی پر دل مومن ہی وہ کیا
جو ہر اک حال میں اُمید سے معمور نہیں
ہے دعا اور دوا فرض وے حکم خدا
ٹل سکے یہ کسی بندے کا بھی مقدور نہیں
تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اُسکو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں
تُو تو مُردوں کو جلا سکتا ہے' قرآن میں کیا
تخرج الحی من المیتِ مذکور نہیں
تیری قدرت سے خدایا تری رحمت نہیں کم
آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں
یاں بھی ہے یوسف و یعقوب میں زنداں حائل
میں ہوں محصور اگر آپ وہ محصور نہیں
شان قدرت مجھے دکھلا کہ ہو تسکیں کا نزول
دل جوہر ہے یہ یا رب جبل طور نہیں

ہائے غلام حسین

(اپنے عزیز دوست راجہ غلام حسین کی وفات پر جو ''کامریڈ'' کے مرتب کرنے میں مولانا کے دست راست تھے)

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین
کوئی دن اور بھی جئے ہوتے
کچھ تو انعام حق پرستی کے
ہم غریبوں سے بھی لئے ہوتے

اے میرے رند بادۂ حق کے — ابھی دو چار خُم پئے ہوتے
تم تو دل بھی فگار کر کے چلے — زخم ہائے جگر سئے ہوتے
یوں نہ دامن چھڑا کے چل دیتے — تم گر اس بزم کے لئے ہوتے
تم کو ایسا ہی تھا اگر جانا — چند نعم البدل دئے ہوتے
تھی شہادت کی کس قدر جلدی — کام کچھ اور بھی کئے ہوتے
خوب کٹتا بہشت کا رستہ — ساتھ ہم کو بھی گر لئے ہوتے
تم ہی زندہ ہو، لغو ہے یہ خیال — چند دن اور بھی جئے ہوتے

آج جوہر ہیں دل کے قاش فروش
کاش کچھ اور قافئے ہوتے

غلام بھیک نیرنگ

سید غلام بھیک نام نیرنگ تخلص ۔ ستمبر ۱۸۷۶ء میں موضع دورانہ ضلع انبالہ میں پیدا ہوئے ۔ آپ اس موضع کے ایک معزز و خوشحال سادات خاندان کے چشم و چراغ تھے ۔ آپ کی ابتدائی تعلیم انبالہ شہر کے میونسپل بورڈ اسکول میں ہوئی ۔ پھر انگریزی پڑھنا شروع کی اور مشن ہائی اسکول لدھیانہ اور مشن بورڈ ہائی اسکول جگادھری میں مختلف اوقات میں تعلیم حاصل کر کے انٹرنس کا امتحان پاس کیا اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کیلئے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے جہاں سے انہوں نے بی ۔ اے کی ڈگری حاصل کی ۔ کالج کے زمانے میں علامہ اقبال ' سر فضل حسین ' میاں عبدالعزیز فلک پیما اور بخشی ٹیک چند جیسے ہونہار طلباء ان کے ساتھیوں میں سے تھے ۔ تعلیم سے فارغ ہونے پر ۱۹۰۰ء سے میر نیرنگ نے انبالہ شہر میں وکالت شروع کی اور ۱۹۰۹ء تک باقاعدہ پریکٹس کرتے رہے ۔ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۰ء تک انبالہ ہی میں آپ سرکاری وکیل کے عہدے پر فائز رہے ۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۴ء تک انہوں نے تحریک خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔

میر نیرنگ تہذیبی ' اصلاحی ' مذہبی اور مجلسی کاموں میں ہمیشہ بڑی دلچسپی لیتے تھے چنانچہ انہوں نے شروع ہی سے سیاسی و تہذیبی انجمنوں میں سرگرمی سے کام کیا ۔ جس کی نمایاں مثال تو یہی ہے کہ وہ تقریباً پچیس تیس برس تک انجمن حمایت اسلام لاہور کی جنرل کونسل کے ممبر رہے ۔ اس کے ماسوا وہ ندوۃالعلما لکھنؤ ' آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور علی گڑھ یونیورسٹی کی کورٹ و ایگزکیٹو کونسل سے بھی کئی سال تک متعلق رہے ۔ ۱۹۳۴ء میں آپ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے ممبر بنے اور ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۲ء تک مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے ڈپٹی لیڈر کے فرائض انجام دیتے رہے ۔ ان گراں بہا خدمات سے قطع نظر نیرنگ صاحب کو تبلیغی کاموں سے بھی بہت شغف تھا ۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو بے لوث خدمات انجام دیں وہ نہ صرف قابل تعریف بلکہ لائق تقلید بھی ہیں ۔ آپ انبالہ کی بہت بڑی انجمن اسلامیہ کے ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۳ء تک صدر رہے اور انجمن تبلیغ الاسلام انبالہ کے تو بانی مبانی ہونے کا شرف آپ کو حاصل ہے ۔

قیام پاکستان کے بعد سید صاحب کراچی تشریف لے آئے اور ۱۹۵۰ء سے آپ پاکستان

دستور ساز اسمبلی کے ممبر ہوگئے لیکن موصوف نے یہ خدمت زیادہ عرصہ انجام نہیں دی تھی کہ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

سید صاحب محض سیاسی آدمی ہی نہ تھے بلکہ آپ بہت مشہور شاعر اور ادیب بھی تھے۔ شعر و شاعری کا ذوق آنہیں فطری تھا۔ اور وہ کالج کے زمانے میں لاہور کے بازار حکیماں والے تاریخی مشاعروں میں بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں جب سر عبدالقادر مرحوم نے رسالہ ''مخزن'' جاری کیا تو سید صاحب نے بھی اس میں اپنی نظمیں لکھنا شروع کیں اس لحاظ سے آن کا شمار ''مخزن'' کے اولین قلمی معاونین میں ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نیرنگ صاحب زیادہ عرصہ تک شعرو سخن سے دلچسپی نہ لے سکے اور آن کی دوسری اہم مصروفیات اس راستے میں حائل ہوئیں لیکن اس کے باوجود آنہوں نے جو کچھ شعری سرمایہ چھوڑا ہے وہ ہر لحاظ سے نہایت وقیع اور اہم ہے۔ چونکہ موصوف کا شمار پنجاب کے شاعروں کے آس گروہ سے ہے جو مولانا حالی کے بعد سر سید سے متاثر ہوئے اور جنہوں نے آردو شاعری میں زندگی اور زندگی کے مسائل کو داخل کیا۔ اس گروہ کے دوسرے حضرات علامہ اقبال، خوشی محمد ناظر، جسٹس شاهدین ہمایوں اور سید اعجاز حسین صاحب تو پہلے ہی ہم سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہو چکے تھے۔ لے دے کے ایک حضرت نیرنگ باقی تھے جن کی موت سے گویا پنجاب میں سر سید اسکول کی آخری شمع بھی بجھ گئی۔

نیرنگ نے بیشتر نظمیں ہی کہیں ہیں جن کا عام رنگ وہی اصلاحی ہے۔ ان نظموں میں شاعر نے زندگی کے حقائق بڑے دلکش انداز میں پیش کئے ہیں خاص طور پر مناظر فطرت کی عکاسی تو ایسے والہانہ انداز میں کی ہے کہ پڑھنے والا جھوم جھوم جاتا ہے۔ یہ موضوعات باوجودیکہ آس دور کی آردو شاعری میں عام ہو چکے تھے لیکن نیرنگ نے ان میں اپنے حقیقی جذبات و تاثرات اور عینی مشاهدات کا رنگ بھر کر جاذب نظر و سبق آموز بنا دیا ہے۔ آن کے اسلوب میں بڑی روانی و صفائی پائی جاتی ہے۔ زبان بڑی سادہ و شستہ ہے۔ نیرنگ کے کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آنہیں اپنے خیالات کے اظہار پر بڑی قدرت حاصل تھی اور وہ قدرت کی بعض بظاهر کم اہم چیزوں پر بھی جب قلم آٹھاتے تھے تو نہ صرف یہ کہ آنہیں اپنی خوش بیانی سے دلاویز بنا دیتے تھے بلکہ آن میں حیات انسانی کے ایسے فلسفیانہ نکات بھی کامیابی کے ساتھ سمو دیتے تھے جو ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ اس سلسلے میں ''مرجھایا ہوا پھول'' ''تلاش محبت'' اور ''خار'' وغیرہ جیسی نظمیں بہت ہی دلچسپ و نتیجہ خیز ہیں۔

میر نیرنگ نظموں کے علاوہ غزلیں بھی کہتے تھے۔ لیکن غزل میں آنکے یہاں عاشقانہ مضامین کم اور سیاسی و قومی مضامین زیادہ ہوتے ہیں تا ہم کہیں کہیں اس صنف میں بھی آنہوں نے خاصے شعر نکالے ہیں۔

الغرض غلام بھیک نیرنگ ایک فطری شاعر تھے اور آنہوں نے آردو شاعری کے جدید رجحانات سے متاثر ہو کر نیچرل شاعری کے جو نمونے چھوڑے ہیں وہ ایک ایسی مسلمہ اہمیت کے مالک ہیں کہ آنہیں فراموش کر دینا نہ صرف شاعر کے ساتھ بلکہ خود آردو شاعری کے ساتھ بڑی ناانصافی ہے۔ نیرنگ مرحوم کی ادبی یادگار دو کتابیں ''کلام نیرنگ'' اور ''غبار افق'' ہیں۔

انتخاب کلام

منظومات

''تلاش محبت''

(ایک بلی کے بچے کو دیکھکر)

س قدر بے چین کیوں پھرتی ہے اے ننھی سی جاں ؟
شور سے سر پر اُٹھا رکھا ہے کیوں سارا مکاں ؟
دودھ پی لے بھوک نے تجھ کو ستایا ہے اگر
وہ دھرا ہے دودھ چھوٹی سی پیالی میں اُدھر
دودھ بھی پیتی نہیں تو؟ خیر لے تیرے لئے
گوشت تھوڑا سا منگا رکھا ہے یہ بازار سے
گوشت کو بھی تو نہیں چھوتی ؟ تو کوئی کیا کرے ؟
ہاں ! ستایا ہے کہیں شدت کی سردی نے تجھے
آ رضائی میں تجھے اپنی بٹھا لیتا ہوں میں
آ تجھے سردی کے حملے سے بچا لیتا ہوں میں
پر یہاں بھی بیٹھ کر تجھ کو کہاں آرام ہے؟
تلملانے سے تڑپنے سے یہاں بھی کام ہے
بیٹھ کر گھٹنے پہ غر غر کرنے لگتی ہے کبھی
سر کو میرے پاؤں پر تو دھرنے لگتی ہے کبھی
پیار کرتا ہوں تو اس پر بھی نہیں تجھ کو قرار
ناشکیبائی ہے تیری حرکتوں سے آشکار
کس قدر الفت ٹپکتی ہے نگاہوں سے تری !
ہائے کیا حسرت ٹپکتی ہے نگاہوں سے تری !
ہائے اے نادان ! اب سمجھا میں تیرا مدعا
تو تلاش مہر و الفت میں ہے آتش زیر پا
ڈھونڈھتی پھرتی ہے ہاں وہ گوہر نایاب تو
جس کی ہے انساں کو ہم جنسوں میں ناحق جستجو
مجھ کو لو جس چیز کی ہے ابن آدم میں نہیں
بلکہ سچ پوچھے تو موجودات عالم میں نہیں
آنے کا تیری سمجھ میں کس طرح یہ فلسفا

ذوق راحت سے تو پیدا کر دل بے مدعا
ہے تمنائے محبت ایک نخل بے ثمر
آرزوئے مہر و الفت ایک شام بے سحر
بلبل شیدا ہوائے گل میں صرف نالہ ہے
داغ مہر گُل سے دل اس کا برنگ لالہ ہے
ہے دل بلبل میں گل کی سرد مہری کی جلن
کیا خبر اس کو کہ گل کے دل میں ہے کس کی لگن
کس کی فرقت میں گل تر اس قدر غمناک ہے
چشم پرنم ہے، جگر خوں ہے، گریباں چاک ہے
چاند پر ناحق فنا کرتا ہے جاں اپنی چکور
چاند کب سنتا ہے اس مہجور کے نالوں کا شور
مسکراہٹ چاند کی ہے اس کے نالوں کا جواب
اس طرف اتنا سکوں! اور اس طرف یہ اضطراب!
آتش الفت ہی برق خرمن پروانہ ہے
یہ پتنگا بھی ادائے شمع کا دیوانہ ہے
گرد پھر پھر کر طواف کعبۂ الفت کرے!
جان دے اور آتش ذوق فنا میں جل مرے
شمع کو لیکن نہیں اس کی محبت کی خبر
وہ ذرا اس پر نہیں کرتی عنایت کی نظر
کونسی دھن میں خدا جانے وہ ہے آتش بجاں
کس لئے ہیں گرم آنسو اس کی آنکھوں سے رواں
جب محبت کا یہ عالم ہے تو کیا اس کی تلاش؟
کیا تمنائیں، کہاں کی آرزو، کس کی تلاش

عاشق از بے مہریٔ یارِ جفا جُو شکوہ سنج
یار در فرطِ ہوائے دیگرے پامالِ رنج

انسان کی فریاد

ہاں اے مصافِ ہستی! مت پوچھ مجھ سے کیا ہوں!
اک عرصہ بلا ہوں! اک لقمۂ فنا ہوں!

نے مجھ کو جائے ماندن نے مجھ کو پائے رفتن
میں راندۂ قدر ہوں آوارۂ قضا ہوں!
مجبوریوں نے ڈالا گردن میں میری پھندا
خو کردۂ وفا ہوں جاں دادۂ رضا ہوں
جو میری حاجتیں ہیں ساری مصیبتیں ہیں
نکبت کی ابتدا ہوں شامت کی انتہا ہوں
صیاد حادثے کا کرتا ہے میرا پیچھا
مرغِ بریدہ پر ہوں صیدِ شکستہ پا ہوں
ہے ذات میری مجمع ساری برائیوں کا
کہنے کو میں بڑا ہوں لیکن بہت برا ہوں
آزادیوں کی تہمت مجھ پر غلط سراسر
میں قیدیٔ ہوس ہوں میں بندۂ ہوا ہوں
اک بات ہو بتاؤں اک درد ہو سناؤں
روؤں بھلا کہاں تک کب تک پڑا کراہوں
فریاد کی اجازت مجھ کو نہ کوئی فرصت
ظاہر ہمہ خموشی باطن ہمہ بکُا ہوں

کمبخت دل کچھ ایسا میں ساتھ لے کے آیا
اک لمحہ جس کے ہاتھوں دنیا میں سکھ نہ پایا
جو جوش اس میں اٹھا حالات نے دبایا
جو شعلہ اس میں بھڑکا تقدیر نے بجھایا
امید کا یہ غنچہ کھِلتے کبھی نہ دیکھا
یہ آرزو کا پودا پھلتا نظر نہ آیا
دل سوزئی خلائق سو بار اس میں امڈی
ابر جنون الفت سو بار اس پہ چھایا
عزمِ رہِ اخوّت ہر اک طرح سے ٹھانا
فیّاضیوں کا بیڑا سو سو طرح اٹھایا
گو اس میں موجزن تھی قوم و وطن کی الفت
لیکن غرض نے اس کو کچھ اور ہی سکھایا

ہوتی نہیں رسائی اُمید کے اُفق پر
طول امل نے اس کو اک جال میں پھنسایا
جو آرزو ہے اس کی ناکامئی ابد ہے
ارمان اس کا حرماں اُمید اس کی مایا
پائی نہ وائے اس نے طاقت بقدرِ ہمت
بے اختیاریوں نے یہ روزِ بد دکھایا
کی رہبرِ خرد نے ہر چند رہنمائی
اس جہد پر بھی لیکن کھلتی نہیں سچائی
پایا نہ میں نے اب تک مقصد کا اپنے ساحل
کی بحر معرفت سیں دن رات آشنائی
اس جستجو میں میں نے کی سیر طور و ایمن
پربت کو گھربنایا جنگل سے لو لگائی
مندر کو جا کے دیکھا گرجا میں جا کے ڈھونڈھا
مسجد کو چھان مارا اُس کی نہ دید پائی
جوگی کا روپ دھارا بن میں کیا گزارہ
تن پر بھبھوت مل کر دھونی بہت رمائی
جپ تپ میں عمر اپنی کی میں نے تیر اکثر
بن بن کے پیر راھب جا خانقہ بسائی
صوفی بھی بن کے دیکھا اور رند بے ریا بھی
کر نعرۂ اناالحق اک کھلبلی مچائی
پھرتی ہیں ماری ماری مشتاقِ جلوہ آنکھیں
پر اک جھلک سے بڑھ کر دیتا نہیں دکھائی
بے فائدہ ہے ساری یہ عقل کی تگاپو
تا منزلِ حقیقت ممنوع ہے رسائی

اُٹھ جا نظر سے میری ہاں اے حجابِ ہستی
حسن ازل نہاں ہے زیر نقاب ہستی
یہ زندگیٔ انساں ہے خواب اک پریشاں
بیدارئی عدم ہے تعبیر خواب ہستی

میں چاھتا ھوں ساقی نشہ مئے فنا کا
بیگانۂ خرد ھے مست شراب ھستی
طالب ھوں اب سکونِ دنیائے نیستی کا
یہ کشمش کہاں تک اے اضطراب ھستی
دیکھیں اگر تو کیونکر ھم جلوۂ معارف
تو ظلمتِ نظر ھے اے آفتاب ھستی
تسکیں کو زھر قاتل آب و ھوائے عالم
راحت کا دشمن جاں ھر انقلاب ھستی
یہ میرے دل کی حالت یہ میری روح کی دُرگت
کہلاؤں کس صفت پر میں انتخاب ھستی
اے تشنۂ حقیقت دھوکے میں تو نہ آنا
اک دام پُر خطر ھے موجِ سراب ھستی
چاھے اگر رھائی پیش از فنا فنا ھو
پاداشِ جرم ھستی ھے یہ عذابِ ھستی

کوھستان کا نظارہ

ھاں مبارک تجھے اے دید کی مشتاق نظر
ایک باغِ گلِ نظارہ ھے شملے کا سفر
خطّۂ کوہ جو ابھرا ھے تو اک شان کے ساتھ
کھڈ جو گہرائی میں اترا ھے تو اک آن کے ساتھ
چوٹیوں اور کھڈوں پر جو ذرا کیجے نظر
اور روئیدگی کا دیکھئے منظر پہ اثر ق
سبزہ ھی سبزہ ھر اک سمت نظر آتا ھے
ایک دریائے زمرد ھے کہ لہراتا ھے
صفحۂ دلکشِ کہسار عجب گلشن ھے
سبزہ و گل سے جو قلّہ ھے سو اک خرمن ھے

نخلِ بندِ چمن دھر ہے مالی اس کا
گل سے رہتا نہیں دامن کبھی خالی اس کا

یاں جو پودا ہے سو ہے سرو کی صورت آزاد
خوشنوایانِ چمن کو نہیں خوف صیّاد

پھول اک طرز دلاویز سے کھلتے ہیں یہاں
شجر اک جنبش مستانہ سے ہلتے ہیں یہاں

پہنی ہیں پھولوں نے خوشرنگ قبائیں کیا کیا
دل لبھاتی ہیں پرندوں کی صدائیں کیا کیا

دیکھنا اڑتی ہوئی تیتریوں کے انداز
گویا قدرت نے عطا کی ہے گلوں کو پرواز

کس قدر حسن بکھیرا ہے یہاں قدرت نے
کیا ویرانے کو فردوس نشاں قدرت نے

دیکھئے! سامنے اک کھڈ سے وہ بادل اٹھا
اک عَلم نُور کا آکاش میں لہرانے لگا

اے لو! وہ اور بھی کچھ ابر کے پارے آئے
سینکڑوں رنگ سے جوبن کو نکھارے آئے

نہیں بادل کے یہ ٹکڑے یہ ہیں چنچل پریاں
محو سیر کرۂ باد ہیں رقصاں رقصاں

ان میں یہ ناز یہ چھل بل یہ ادا یہ گھاتیں
بادلوں کو کہیں آتی ہیں بھلا یہ باتیں ؟

نیلی پوشاک کسی کی ہے کسی کی ہے ہری
کوئی مٹیالی پری ہے تو کوئی سرخ پری

کیسی اٹھکھیلیاں کرتی ہیں ہوا سے دیکھو !
ناچتی پھرتی ہیں کیا پیاری ادا سے دیکھو !

اے لو! سب چھپ گئیں دامن میں گھٹا کے پریاں
ہو گئے بارشِ باراں کے مہیا ساماں

لو برسنے کو ہے پانی وہ گھٹائیں آئیں
مینھ کا پیغام لئے ٹھنڈی ہوائیں آئیں

ابر نے ڈھانپ لئے سب شجر و کوہ و زمیں
گویا جُز ابر کے دنیا میں کوئی چیز نہیں

رعد نے آ کے جو احکام میں کچھ تیزی کی
وہ لگی دینے گھٹا داد گُہر ریزی کی !

کھل گیا ابر، فلک صاف نظر آنے لگا
نیلگوں حسن کی نیرنگیاں دکھلانے لگا

واہ یہ صاف یہ شفاف یہ گہری نیلک
نہ زمرد میں یہ رنگت نہ یہ نیلم میں دمک

دیکھتا ہے انہیں انسان تو کیا سوجھتی ہے
طائر روح کو پروازِ فنا سوجھتی ہے

سامنے دور افق تک جو نظر جاتی ہے
دھر تلک کوہ کی نیلک ہی نظر آتی ہے

نظر آتا ہے افق میں جو ذرا ابر سفید
شوق نظّارہ طلب کو ہے سحر گاہ امید

اک جھلک نور ازل کی سی دکھا جاتا ہے
دل کو مشتاق رخ یار بنا جاتا ہے

آبشاروں کا سرِ کوہ طرب خیز وہ شور !
ہائے وہ نغمہ مستانہ وہ رفتار وہ زور !

ندیاں دودھ کی بہتی ہیں یہاں بے محنت
دیکھے فرہاد تو حسرت سے کہے ''یا قسمت''!

بحر کی تہ میں کوئی ہوگا پڑا مروارید
آبشاروں کو جو دیکھو تو ہمہ مروارید

آئی وہ دور سے مستانہ جھنجھوٹی کی صدا !
گونج میں ساتھ پیانو ہے بجاتی اپنا

آہ موسیقیٔ جاں بخش ! جہاں سوز آہنگ !
تیری تاثیر سے ذی روح بنا تودۂ سنگ

گونج کیا ہے یہ ہے کہسار کی پر درد صدا
اثر نغمہ سے ہے وجد میں پتھر گاتا

ہائے اس حسن کے مسکن میں بھی آفت ہے وہی!
اس گلستاں میں بھی انساں کی مصیبت ہے وہی!

پیش ہر وقت وہی پیٹ کا دھندا اس کو !
جبر حالات کا ہر دم وہی رونا اس کو !

وہی محنت وہی ذلّت ہے مقدر اس کا !
وہی حرماں وہی حسرت ہے مقدر اس کا !

ورنہ یہ عرصۂ کہسار عجب منظر ہے !
دل کو فرصت ہو تو پوجا کو عجب مندر ہے !

ذرّے ذرّے میں یہاں ہے نظر آتا موہن
نت نئے روپ میں درشن ہے دکھاتا موہن

تغزل

شرم ہے اے نگہ شوق کہ وہ کہتے ہیں تجھ کو بلوا کے میں رسوا سر محفل ہوتا
بھیس مشتاق کا بھرتے نہ کبھی اہل ہوس عشق اے کاش ذرا اور بھی مشکل ہوتا
قہرتو یہ ہے' قیامت ہے وہ جاناں''نیرنگ''
بات ہی کیا تھی اگر ظالم و قاتل ہوتا

وہ قسمیں کہ آن سے ملینگے نہ ہر گز مگر دل کے ہاتھوں سے مجبور رہنا

زیست دو روزہ ہے ہنس کھیل کے کاٹو اس کو
گُل نے یہ راز بتایا مجھے خنداں ہو کر

وہ خندہ لب جو کبھی آ گیا تو دیکھیں گے
چمن میں بندہ تو رہی ہے ہوائے خندۂ گل

ہونے کو گل و لالہ بھی ہیں شمس و قمر بھی
تیری ہی طرف اٹھتی ہیں خلقت کی نگاہیں

کہاں وہ ہمتیں اگلی سی سودائے محبت کی
وہ پائے دشت پیما ' وہ بیاباں یاد آتے ہیں
ھجوم یاس نے کیسی بھری محفل اجاڑی ہے
ہمیں وہ حسرتیں وہ اپنے ارماں یاد آتے ہیں

فریب آرزو نیرنگ تاثیر فغاں تک ہے
طلسم اعتبار عہد و پیمانِ بتاں تک ہے
قفس کھل جائے تو میں پر شکستہ ہی پہنچ جاؤں
کہاں کا فاصلہ ایسا قفس سے آشیاں تک ہے

یہ پیچ و تاب یہ اُلجھن یہ انداز پریشانی
کہانی تیرے گیسو کہہ رہے ہیں مُو بہ مُو میری

پھر وهی هم هیں خیال رخ زیبا ھے وهی
سرِ شوریدہ وهی عشق کا سودا ھے وهی
پھر لگی رهنے تصور میں وہ مژگانِ دراز
رگ جاں میں خلشِ خار تمنا ھے وهی
پھر لگا رهنے وهی سلسلۂ ناز و نیاز
جلوۂ حسن وهی ذوق تماشا ھے وهی
پھر هوا هم کو دل و دیں کا بچانا مشکل
نگہ ناز کا پھر هم سے تقاضا ھے وهی
پھر چمک اٹھی وہ کجلائی هوئی چنگاری
رختِ هستی ھے وهی عشق کا شعلہ ھے وهی
آرزو جی اٹھی پھر پیار جو اس بت نے کیا
پھر لبِ یار میں اعجازِ مسیحا ھے وهی
پاسِ ناموس نے پھر رخصت رفتن چاهی
شهرت حسن وهی الفت رسوا ھے وهی
پھر هوئی لیلیٰ و مجنوں کی حکایت تازہ
آن کا عالم وهی 'نیرنگ' کا نقشہ ھے وهی

کٹ گئی بے مدعا ساری کی ساری زندگی
زندگی سی زندگی ھے یہ هماری زندگی
کیا ارادوں سے ھے حاصل؟ طاقت و فرصت کہاں؟
هائے کہلاتی ھے کیوں بے اختیاری زندگی!
درد الفت کا نہ هو تو زندگی کا کیا مزا؟
آہ و زاری زندگی ھے، بیقراری زندگی

یہی بدا تھا مقدر میں روز اول سے ۔۔۔ کسی کے حسن جہاں سوز پر مرے کوئی
بتوں سے کس کو امید وفائے الفت ھے ۔۔۔ عبث کسی کی محبت کا دم بھرے کوئی

تری جفاؤں نے آکتا کے دل کو سمجھایا   یہ نامراد نہ مانے تو کیا کرے کوئی
پیام مرگ ہے عشق پری رخاں 'نیرنگ'
نہ ہو یہ روگ تو کیوں بے اجل مرے کوئی

دل لگانا کوئی آفت ہی سہی   اب تو جھیلینگے مصیبت ہی سہی
کب کہا میں نے کہ دل سے چاہو   اے وہ منھ دیکھے کی آلفت ہی سہی
ہے مسافر کو نگہ بھی کافی   نہیں آلفت تو مروّت ہی سہی
ہم بھی یاد آئینگے سر چڑھ کے کبھی   بھول جانا تری عادت ہی سہی
کچھ تو لایا تیرے در سے 'نیرنگ'
آخری دید کی حسرت ہی سہی

رھناوں کو نہیں خود بھی پتہ رستے کا
راھرو پیکرِ حیرت ہے خدا خیر کرے

خوشی محمد ناظر

چودھری خوشی محمد نام ناظر تخلص ۱۸۷۲ء مطابق ۱۲۸۹ھ میں ہریا والا ضلع گجرات (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام چودھری مولیٰ داد خان تھا۔ ناظر صاحب نے ابتدائی تعلیم گھر پر مولوی نور الدین صاحب انور سے حاصل کی۔ ثانوی تعلیم کے لئے اُنہیں مدرسے میں داخل کرایا گیا لیکن وہ اوقات مدرسہ کے بعد اپنے گاؤں کے فارسی مکتب میں میں بھی درس لیتے رہے۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے علیگڑھ کالج بھیجے گئے۔ جہاں سے اُنہوں نے ۱۸۹۳ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت پا کر چودھری صاحب ریاست کشمیر میں گورنری کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے اور عرصہ دراز تک اس ممتاز عہدے کے فرائض بحسن و خوبی انجام دینے کے بعد جب آپ ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو چک جھمرہ ضلع لائلپور میں جہاں موصوف کی خاصی بڑی زمینداری تھی، مستقل طور پر اقامت گزیں ہو گئے اور زندگی کے آخری ایام قومی، ملی، اور ادبی خدمات کے لئے وقف کر کے آخر، اکتوبر ۱۹۴۴ء میں انتقال فرمایا۔

چودھری صاحب کو بچپن ھی سے شعر و سخن سے بڑی دلچسپی تھی مگر ابتدا میں فارسی میں شعر کہا کرتے تھے۔ اسی سلسلے میں موصوف کی سب سے پہلی نظم وہ ھے جو اُنہوں نے حضرت غوث الاعظم کی مدح میں ۱۸۸۱ء میں کہی تھی۔ یہ نظم تو ھمارے سامنے نہیں تاھم اس کا ایک مصرعہ ع

بلبل طبعم به باغ وصف تو پرواز کرد

جو اُن کے اُستاد اولین مولوی نور الدین صاحب انور کی اصلاح کے بعد یہ شکل اختیار کر گیا تھا۔

بلبل طبعم به باغ وصف تو رنگیں نواست

دس سال کی مختصر عمر میں چودھری صاحب کی یہ کوشش اُن کی فارسی دانی و موزوں طبعی کی آئینہ دار ضرور ھے۔ تاھم یہ رنگ سخن زیادہ دن قائم نہ رہ سکا اور مڈل کے درجے میں مولانا محمد حسین آزاد کی زندہ جاوید تصنیف ''آب حیات'' اور بعض شعرائے اُردو کے دواوین کے مطالعے نے ناظر صاحب کو اُردو میں شعر کہنے کی طرف مائل کر دیا۔ اُن کی سب سے پہلی اُردو غزل کا مطلع یہ تھا۔

کیا ان دنوں نگاہ ستمگر ھے تیز تیز　　　تیرِ نظر کی چوٹ دلوں پر ھے تیز تیز

اس طرح گویا ثانوی تعلیم کے دوران میں ھی وہ اردو میں شعر کہنے لگ گئے تھے مگر غزل سرائی کا رنگ پختہ نہ ہونے پایا تھا کہ علیگڑھ پہنچے اور وھاں سر سید مرحوم اور پروفیسر آرنلڈ آنجہانی کی ادبی صحبتوں میں نیچرل شاعری کا اُن پر ایسا رنگ چڑھا کہ مرتے دم تک اس کے شیدائی رہے اور شاید انہیں بزرگوں کی ترغیب و تربیت کا اثر تھا کہ اُنھوں نے عصر اصلاح کے علمبردار مولانا حالی مرحوم سے اپنے کلام پر اصلاح لینا شروع کی ۔

چودھری خوشی محمد ناظر کا شمار پنجاب کے شاعروں کے اُس گروہ میں ہوتا ھے جو حالی کے بعد سرسید سے متاثر ہوئے اور جنہوں نے زندگی اور زندگی کے مسائل کو اردو شاعری میں داخل کیا ۔ پنجاب کے شاعروں کے اُس گروپ میں علامہ اقبال ' ناظر ' سید اعجاز حسین ' جسٹس شاھدین ھمایوں اور غلام بھیک نیرنگ شامل تھے اور صحیح معنوں میں پنجاب میں یہی لوگ سر سید اسکول کے نمائندے تھے ۔

حضرت ناظر کے مجموعہ کلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ھے کہ غزل گوئی کی طرف اُن کا طبعی میلان کم تھا یہی وجہ ھے اُن کے یہاں چند غزلوں کے علاوہ اکثر نظمیں ھی ھیں ۔ جن میں سے بعض کالج ' یونین کلب اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرس کے جلسوں کے لئے لکھی گئیں ۔ کچھ مسلمانان پنجاب کے قومی دربار یعنی انجمن حمایت اسلام لاھور کے سالانہ جلسوں کے لئے لکھی گئیں اور مناظر فطرت سے متعلق تقریباً تمام نظمیں اُن کے ریاست کشمیر کے دوران قیام کی کہی ہوئی ھیں ۔ یہاں یہ تذکرہ بھی بے محل نہ ہو گا کہ حضرت ناظر مرحوم نے کشمیر میں چند ادب دوست احباب کی ایک انجمن "انجمن مفرح القلوب" کے نام سے بنائی ہوئی تھی جو ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۶ء تک کشمیر کے باغوں میں مفرحات کی نکہت بکھیرتی رھی ۔ ناظر صاحب کی کئی نظمیں اسی عہد "مفرح" کی یادگار ھیں ۔

بحیثیت مجموعی اُن کی شاعری جدید شاعری کا بڑا اچھا نمونہ ھے ۔ اور اُن کی اکثر نظموں سے نہ صرف پختگی و مشاق ٹپکتی ھے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ھے ۔ کہ وہ جب تک صحیح معنوں میں کسی منظر یا جذبہ سے متاثر نہیں ہوتے شعر نہیں کہتے تھے ۔ چنانچہ اُن کی مناظر فطرت والی نظموں میں مظاھر کی جیسی لطیف تصویر کشی اور ایک حسین فضا ملتی ھے وہ اس بات کی غماز ھے کہ ایک طرف تو شاعر کو قدرت کے ان خوبصورت مناظر سے انتہائی شیفتگی ھے اور دوسری طرف اُس نے اپنے عینی مشاھدات کو اس قدر دلکش انداز میں پیش کیا ھے کہ پڑھنے والا مسحور سا ہو جاتا ھے ۔ اس پر حالی کے اثر سے اُن کے اُسلوب بیان میں جو سادگی ' سلاست اور روانی پیدا ہو گئی ھے وہ اُن کے طرز ادا میں اور بھی جان ڈال دیتی ھے ۔

حضرت ناظر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے بے اختیار اُن کی معرکہ آرا نظم "جوگی" یاد آ جاتی ھے ۔ اُردو کی اس کلاسیکی نظم کی جملہ خصوصیات پر بحث کرنے کا یہاں موقع نہیں تاھم اتنا ضرور کہا جا سکتا ھے ۔ کہ یہ اُردو کی شاھکار نظموں میں

سے ایک ہے ۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شاعر نے اس کی تخلیق کرتے وقت سچ مچ جوگ سادھ لیا ہو ۔ ورنہ ظاہر ہے یہ قلندرانہ ٹھاٹھ جو اس نظم کا طرۂ امتیاز ہے کیونکر پیدا ہو سکتا تھا ۔ نظم کے خیالات ' اُس کے الفاظ اور خاص طور پر وہ بحر جس میں یہ کہی گئی ہے ایک دوسرے سے بہت ہی ہم آہنگ ہیں اور اسی ہم آہنگی کی بدولت اس میں بلا کی نغمگی و ترنم اور درد و اثر پیدا ہو گیا ہے ۔

ناظر صاحب کی اسلامی نظموں اور قومی ترانوں کا وہی رنگ ہے جو حالی و آزاد کا ہے ۔ وہ بدلے ہوئے حالات میں نئے ماحول سے سازگاری حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں لیکن اُن کی تلقین میں وعظ کا انداز کہیں پیدا نہیں ہونے پاتا بلکہ وہ اس معاملے میں بڑے لطیف اشاروں ' کنایوں اور دلچسپ و عبرت ناک مثالوں سے کام لیکر اپنے بیان میں دلکشی پیدا کر دیتے ہیں تاکہ سننے والے کی طبیعت پر بار نہ ہو ۔

مختصر یہ کہ حضرت ناظر عصر اصلاح کے اُن نامور شعرا میں سے ہیں جنھوں نے جدید اردو شاعری میں ایک حد تک اپنے اُستاد مولانا حالی کی پیروی کر کے اُسے سر زمین پنجاب میں پھیلایا ۔ اُن کی شاعری اُسلوب و خیال کی سادگی کی بدولت بہت مقبول ہوئی اور اُن کے کلام میں وہی نیا رنگ و آہنگ ہے جو ہماری جدید شاعری کا جزو لاینفک سمجھا جاتا ہے ۔ موصوف کا مجموعہ کلام ''نغمہ فردوس'' دو جلدوں میں ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا تھا لیکن افسوس کہ اُن کی سوانح حیات اور وہ مقدمہ شاعری جو اُنہوں نے مولانا حالی کے مقدمۂ شعرو شاعری کے انداز پر لکھا تھا اب تک شائع نہیں ہو سکا ورنہ اس مخلص ادب دوست کے حالات زندگی اور اُس کے نظریہ شعر کے متعلق کافی معلومات بہم پہنچتیں ۔

انتخاب کلام

جوگی

کل صبح کے مطلع تاباں سے جب عالم بقعۂ نور ہوا
سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا
مستانہ ہوائے گلشن تھی جانانہ ادائے گلبن تھی
ہر وادی وادئی ایمن تھی ہر کوہ پہ جلوۂ طُور ہوا
جب باد صبا مضراب بنی ہر شاخ نہال رباب بنی
شمشاد و چنار ستار بنے ہر سرو و سمن طنبور ہوا
سب طائر مل کر گانے لگے عرفان کی تانیں اُڑانے لگے
اشجار بھی وجد میں آنے لگے دلکش وہ سماعِ طیور ہوا
سبزے نے بساط بچھائی تھی اور بزم سرور سجائی تھی
بن میں گلشن اور آنگن میں فرش سنجاب و سمور ہوا

تھا دلکش منظر دشت و جبل اور چال صبا کی مستانہ
اس حال میں ایک پہاڑی پر جا نکلا ''ناظر'' دیوانہ
چیلوں نے جھنڈے گاڑے تھے پربت پر چھاؤنی چھائی تھی
تھے خیمے ڈیرے بادل کے کُہرے نے قنات لگائی تھی
یاں برف کے تودے گلتے تھے چاندی کے فوّارے چلتے تھے
چشمے سیاب آگلتے تھے نالوں نے دھوم مچائی تھی
یاں قُلّۂ کوہ پہ رہتا تھا اک مست قلندر بیراگی
تھی راکھ جٹوں میں جوگی کے اور انگ بھبوت رمائی تھی
سب خلقِ خدا سے بیگانہ وہ مست قلندر دیوانہ
بیٹھا تھا جوگی مستانہ آنکھوں میں مستی چھائی تھی
جوگی سے آنکھیں چار ہوئیں اور جھک کر میں نے سلام کیا
تب آنکھ اٹھا کر ناظر سے یوں بن باسی نے کلام کیا
کیوں بابا ناحق جوگی کو تم کس لئے آ کے ستاتے ہو
میں پنکھ پکھیرو بن باسی تم جال میں آن پھنساتے ہو
کوئی جھگڑا دال چپاتی کا کوئی دعویٰ گھوڑے ہاتھی کا
کوئی شکوہ سنگی ساتھی کا تم ہم کو سنانے آتے ہو
ہم حرص و ہوا کو چھوڑ چکے اس نگری سے منہ موڑ چکے
ہم جو زنجیریں توڑ چکے تم لا کے وہی پہناتے ہو
تم پوجا کرتے ہو دھن کی ہم سیوا کرتے ہیں ساجن کی
ہم جوت جگاتے ہیں من کی، تم اس کو آ کے بجھاتے ہو
سنسار سے یاں مُکھ پھیرا ہے من میں ساجن کا ڈیرا ہے
یاں آنکھ لڑی ہے پیتم سے تم کس سے آنکھ ملاتے ہو
اس مست قلندر جوگی نے جب ناظر پر یہ عتاب کیا
کچھ دیر تو ہم خاموش رہے پھر جوگی سے یہ خطاب کیا
ہیں ہم پردیسی سیلانی مت ناحق طیش میں آ جوگی
ہم آئے تھے تیرے درشن کو چتون پر میل نہ لا جوگی
آبادی سے منہ پھیرا کیوں پربت میں کیا ہے ڈیرا کیوں
ہر محفل میں ہر منزل میں ہر دل میں ہے نور خدا جوگی
کیا مسجد میں کیا مندر میں سب جلوہ ہے وجہ اللہ کا
پربت میں نگر میں ساگر میں ہر اترا ہے ہر جا جوگی

جی شہر میں خوب بہلتا ہے واں حسن پہ عشق مچلتا ہے
وان پریم کا ساغر چلتا ہے چل دل کی پیاس بجھا جوگی
واں دل کا غنچہ کھلتا ہے ہر رنگ میں سوھن ملتا ہے
چل شہر میں سنکھ بجا جوگی بازار میں دھونی رما جوگی
ان چکنی چپڑی باتوں سے مت جوگی کو پھسلا بابا
جو آگ بجھائی جتنوں سے پھر آس پہ نہ تیل گرا بابا
ہے شہروں میں غل شور بہت اور حرص و ہوا کا زور بہت
بستے ہیں نگر میں چور بہت ' سادھو کی ہے بن میں جا بابا
ہے شہروں میں شورش نفسانی جنگل میں ہے جلوۂ نورانی
ہے نگری ڈگری کثرت کی بن وحدت کا دریا بابا
ہم جنگل کے پھل کھاتے ہیں چشموں سے پیاس بجھاتے ہیں
راجا کے نہ دوارے جاتے ہیں پرجا کی نہیں پروا بابا
سر پر آکاش کا منڈل ہے دھرتی پہ سہانی مخمل ہے
دن کو سورج کی محفل ہے شب کر تاروں کی سبھا بابا
جب جھوم کے یاں گھن آتے ہیں مستی کا رنگ جاتے ہیں
چشمے طنبور بجاتے ہیں گاتی ہے ملار ہوا بابا
یاں پنچھی مل کر گاتے ہیں پیتم کے سندیس سناتے ہیں
یاں روپ انوپ دکھاتے ہیں پھل پھول اور برگ و گیا بابا
ہے پیٹ کا ہر دم دھیان تمہیں اور یاد نہیں بھگوان تمہیں
سل پتھر اینٹ مکان تمہیں دیتے ہیں سکھی سے چھڑا بابا
تن من کو دھن میں لگاتے ہو پیتم کو دل سے بھُلاتے ہو
ماٹی میں لعل گنواتے ہو تم بندۂ حرص و ہوا بابا
دھن دولت آنی جانی ہے یہ دنیا رام کہانی ہے
یہ عالم عالم فانی ہے باقی ہے ذات خدا بابا

تصویر عبرت

(سر سید میموریل فنڈ کے ایک جلسہ منعقدہ مالیر کوٹلہ میں پڑھی گئی)

سیر دھلی کو ایک دن ناظر — چاندنی چوک سے جو جانے لگا
ایک ساقئی سالخورد و ضعیف — آ کے حقہ مجھے پلانے لگا

آس کے حقہ پہ سرسوں پھولی تھی　　سبزۂ و گل کا لطف آنے لگا
نام پوچھا کہا مبارز خاں　　نام سن کر میں مسکرانے لگا
میرے ھنسنے پہ رو دیا ساقی　　اور یوں درد دل سنانے لگا
نسل تغلق سے ھے یہ ننگ سلف　　آج یوں ٹھوکریں جو کھانے لگا
بزم آباء جو ھو گئی برھم　　نام ساقی کا مجھ کو بھانے لگا
سن کے یہ داستان زھرہ گداز　　منہ کو میرا کلیجہ آنے لگا
کہا میں نے کہ ایسے جینے سے　　نام اسلاف کیوں مٹانے لگا ؟
کہا رو کر کہ سچ کہا لیکن　　کون تقدیر کو مٹانے لگا ؟
میں تو جینے سے اپنے تھا بیزار　　پر مقدر مرا جلانے لگا
مجھ کو عبرت کی کھینچ کر تصویر
شہر و بازار میں پھرانے لگا

پانی میں

(مناظر کشمیر سے متعلق حضرت ناظر کی یہ پہلی نظم ھے جو کشمیر کی مشہور سیر گاہ جھیل ڈل کی شان میں لکھی گئی)

اللہ اللہ ھے کیا حسن چمن پانی میں
سبزۂ ولالہ و گل ، سرو سمن پانی میں !
کیسے کیسے ھیں دل افروز نظارے اس میں !
کوہ پانی میں ، چمن پانی میں ، بن پانی میں
تودۂ سیم ھے یہ ڈل کے خزانے میں نہاں
برف کہسار ھے یا عکس فگن پانی میں
اک طرف کوہ پہ ھے تخت سلیماں قائم
اک طرف سبز پری کا ھے وطن پانی میں
جلوۂ برق سے ھے نور کا عالم شب کو
طور منظر ھے سہاراج بھون پانی میں
عشق پیچاں ھے ادھر اور گل ریحاں ھے آدھر
ھے یہ منصور تو وہ دار و رسن پانی میں
آب ڈل حسن و لطافت میں ھے گر آب حیات
صورت خضر ھے ھر شاخ سمن پانی میں

اک طرف پھول کنول کا وہ سجیلا بانکا
مسکراتا ہے کھڑا غنچہ دھن پانی میں
نیلگوں ڈل میں کنول کی وہ قبائے گلرنگ
حسن کی آگ ہوئی شعلہ فگن پانی میں
اس کے پتوں پہ ہیں شبنم کے چمکتے قطرے
سبز تھانوں میں ہیں یا دُرِّ عدن پانی میں
نچلی رہتی نہیں جس طرح کسی شوخ کی آنکھ
کھیلتی پھرتی ہے سورج کی کرن پانی میں
سطح پر ڈل کے نظر آتا ہے فوّارۂ سیم
عکس مہتاب ہو جب جلوہ فگن پانی میں
آسماں گو ہے وہی چاند ستارے بھی وہی
روپ بھرتا ہے نیا چرخ کہن پانی میں
ہیں شکارے میں سیہ چشم بتانِ کشمیر
یا اترے ہیں غزالانِ ختن پانی میں
عکس مہتاب کا تالاب میں ہے جلوہ فگن
یا نہاتا ہے کوئی سیم بدن پانی میں
ہیں شکاروں کی قطاروں میں مغنی سر خوش
بادف و چنگ و مزامیر مگن پانی میں
ذکر و تسبیح میں ہیں ایک طرف حضرتِ شیخ
برھمن گاتے ہیں اک سمت بھجن پانی میں
ڈل سے کہتے ہیں بہت چاہنے والے اس کے
تیرے عشاق کا ہو گور و کفن پانی میں
بزم ناظر کی بھی مستانہ نوائیں سن کر
رقص کرتے تھے کبھی اہل سخن پانی میں
مغتنم صحبتِ احباب ہے ڈل میں ''ناظر''
غرق کر کشتی افکار و محن پانی میں
آب ڈل کی ہے وہ گلریز و نواخیز فضا
بلبلیں بن گئے ہیں زاغ و زغن پانی میں
لبِ ڈل آپ بھی کاشانہ بنا لیں ''ناظر''
موسمِ گل میں رہے لطفِ سخن پانی میں

انقلاب

دورِ گردوں میں نیا اک انقلاب آنے کو ہے
میکدے میں محتسب مست شراب آنے کو ہے

تاج سلطانی پہ اب وہ ظِلّ سبحانی نہیں
خسروی زیر لوائے انتخاب آنے کو ہے

ٹھن گئی سرمایہ داری اور مزدوری میں جنگ
دیکھیں کون اس معرکہ سے کامیاب آنے کو ہے

اب دلوں سے راحت و صبر و سکوں جانے کو ہے
احتیاج و احتجاج و اضطراب آنے کو ہے

بن گیا ہے کارزار زندگی میدان حشر
ایک نیزے پر مگر اب آفتاب آنے کو ہے

عہد حاضر جس کو کہتے ہیں ترق کا کفیل
کیا اسی پر اب تنزل کا عذاب آنے کو ہے

کارواں آفتاں و خیزاں دشت میں ہے تشنہ لب
دیکھیں آب زندگانی یا سراب آنے کو ہے

ہوگیا جوش عمل برہم زنِ بزم خیال
آسماں پیر میں زور خیال آنے کو ہے

دب گئی ہے بینڈ باجے سے صدائے ارغنوں
بہر پابوس دھل چنگ و رباب آنے کو ہے

اہل تقویٰ اہل دیں اہل یقیں کی شان میں
سادہ لوحی کا زمانے میں خطاب آنے کو ہے

آ رہا ہے خود نمائی خود فروشی کا جلوس
شعلہ خوئی جنگ جوئی ہمرکاب آنے کو ہے

تولے جائیں گے ترازو میں شکم کے خیر و شر
طرفہ معیار صواب و ناصواب آنے کو ہے

دل کہ شمع طور تھا بے نور ہو جانے کو ہے
جوہر تیغ زباں میں آب و تاب آنے کو ہے

ہے حسینوں کا نئے فیشن میں عریانی لباس
حسن بزم عشق میں اب بے نقاب آنے کو ہے

خیرہ کر دے گا نظر کو شعلہ زار حرّیت
بے حیائی کا نگاہوں پر حجاب آنے کو ہے

کاش شیخ و برھمن مل کر کریں کچھ روک تھام
ورنہ بھارت پر کوئی بھاری عذاب آنے کو ھے
بلبل و قمری گلستاں میں رھیں ھم داستاں
ورنہ کوھستاں سے چنگالِ عقاب آنے کو ھے
خانہ جنگی سے کٹے مرتے ھیں بھارت کے سپوت
'ناظر' اس منظر سے با چشم پر آب آنے کو ھے

تغزل

رواں ھیں کارواں جس کی طرف سے   یہی وہ کوچۂ جانانہ ھوگا

نئے نیرنگ دکھلاتا ھے یہ چرخ کہن کیا کیا
جہاں میں گل کھلائے گی ابھی خاک چمن کیا کیا
جہاں کی سر بلندی کا مآل کار پستی ھے
نشاط و عیش منعم پر ھے مفلس خندہ زن کیا کیا
اسی حسن ازل کی لوح عالم پر ھیں تحریریں
وھی اک عشق کا مضموں ھے انداز سخن کیا کیا
ابھی سے رہ نوردِ عشق ھمت ھار بیٹھے ھیں
گزرنی ھیں ابھی تو گھاٹیاں اُن کو کٹھن کیا کیا

بجھائیں پیاس کہاں جا کے تیرے مستانے   جو ساقیا در میخانہ تو نہ باز کرے
نہیں وہ لذت آزار عشق سے آگاہ   ستم میں اور کرم میں جو امتیاز کرے
انھیں کے حسن سے ھے گرم عشق کا بازار   دعا خدا سے ھے عمر بتاں دراز کرے
خدا کا نام بھی لو ' بازوؤں سے کام بھی لو   تو فکر کار خداوند کار ساز کرے
ھوا و حرص سے 'ناظر' رھے جو پاک نظر
تو ھمسری نہ حقیقت کی کیوں مجاز کرے

منزل دل میں تھیں کیا کیا حسرتیں قافلہ یہ بھی روانہ ہو چکا
ناظر اب ذوق نظر بیکار ہے
منظر ہستی پرانا ہو چکا

کس کی چشم مست یاد آتی رہی نیند آنکھوں سے مری جاتی رہی
دل تو شوق دید میں تڑپا کیا آنکھ ہی کم بخت شرماتی رہی
زندگی سے ہم رہے نا آشنا سانس گو آتی رہی جاتی رہی
عمر بھر ''ناظر'' رہے صحرا نورد
بزم گلشن گرچہ یاد آتی رہی

حکیم آزاد انصاری

مشہور نام الطاف احمد ، تاریخی نام نظیر حسین ، ابوالاحسان کنیت ، آزاد تخلص ۲۷ رجب ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) کو ناگپور (سی - پی) میں جہاں آزاد کے والد محمد حسن صاحب اورسیری کے عہدے پر فائز تھے پیدا ہوئے - آزاد نسباً شیخ انصاری تھے جن کا سلسلہ حضرت ایوّب انصاری تک پہنچتا ہے - مقام سکونت خاص شہر سہارنپور تھا - اٹھارہ انیس سال کی عمر تک مختلف درسگاہوں میں فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی - اسی دوران میں شادی ہو گئی اور تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا - لیکن کچھ مدت بعد مولانا حکیم نورالدین صاحب سہارنپوری اور ڈاکٹر احمد خانصاحب لکھنوی نیز اساتذۂ فن سے طبی تعلیم حاصل کرتے رہے اور بالآخر مولوی حکیم معین الدین صاحب ناناتوی سے جو آنکے عزیز بھی ہوتے تھے ، سند طبی حاصل کرکے ۱۹۰۰ء میں دھرہ دون میں مطب کھولا - ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۹ء تک کانپور میں یہی مشغلہ رہا - جہاں آنکی اھلیہ کا انتقال ہوگیا اوروہ مطب چھوڑ کر اپنے وطن سہارنپور چلے گئے - ۱۹۱۱ء میں انبالہ چھاؤنی میں مطب شروع کیا اور آٹھ سال تک وہاں رہے اور جب وہاں سے ہٹے تو علیگڑھ ، دہلی ، حیدرآباد (دکن) میں وقت گزارا - حیدر آباد میں انہوں نے عینک کی تجارت شروع کر دی تھی - ۱۹۴۲ء میں آزاد صاحب کا انتقال ہوا -

آزاد نے ۱۸۹۰ء میں جبکہ آنکی عمر انیس یا بیس سال کی تھی شعر گوئی شروع کی - ابتداً مولانا حبیب الرحمن صاحب بیدل سہارنپوری سے اصلاح لیتے رہے بعد ازاں جب مولانا بیدل ۱۸۹۵ء میں سرکار آصفیہ کے ملازم ہو کر حیدرآباد چلے گئے تو انہوں نے مولانا حالی (جن سے انہیں پہلے ہی سے عقیدت تھی) شرف تلمذ حاصل کیا اور جب تک مولانا زندہ رہے آزاد آن سے برابر اکتساب فیض کرتے رہے - اس طرح چونکہ بیدل اور حالی دونوں غالب کے تلامذہ میں سے تھےاسلئے آزاد کا سلسلۂ شاعری دونوںواسطوں سے غالب پر منتہی ہوتا ہے - چنانچہ خود فرمایا ہے -

پھر رفع نقائص کا محل ہی نہ ملا   پھر چارۂ اغلاط غزل ہی نہ ملا
پھر حالی و بیدل برآ ہی نہ سکی   پھر حسرت اصلاح کا بدل ہی نہ ملا

بہر حال آزاد کے کامل فن ہونے کی ایک یہ بھی واضح دلیل ہے کہ آنہوں نے حالی جیسے کامل الفن مسلم الثبوت آستاد سے کم و بیش بیس سال تک اکتساب فن کیا ۔

آزاد کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت سادگی ہے جو درحقیقت آنہوں نے اپنے آستاد مولانا حالی سے ورثہ میں پائی تھی ۔ ویسے آنکی شاعری پاکیزگی جذبات اور لطافت زبان دونوں کے لحاظ سے بڑی بلند پایہ ہے ۔ وہ تکرار و تقابل الفاظ اور چھوٹے چھوٹے جملوں یا ٹکڑوں سے کلام میں عجیب حسن پیدا کر دیتے ہیں ۔ آنکے اشعار میں بلا کی صفائی اور روانی پائی جاتی ہے اور اس اعتبار سے اگر آن کے کلام کو سہل ممتنع کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا ۔ آزاد کی بلا مبالغہ بیسیوں غزلیں پڑھتے جائیے کہیں ثقالت و ژولیدگی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا ۔

کلام کی ندرت یا انداز بیان کی جدت ایک ایسی خوبی ہے جس پر ہر شاعر قادر نہیں ہوتا ۔ یہی وہ خوبی ہے جو شعر کو سحر اور سحر سے اعجاز میں تبدیل کر دیتی ہے اور یہی وہ کمال ہے جو شاعر کو ساحر بنا دیتا ہے ۔ آزاد میں یہ وصف پورے کمال کے ساتھ پایا جاتا ہے ۔ یہ جدت محض جدت کی خاطر نہیں بلکہ خیال و اسلوب دونوں میں ایک آپج کی حامل ہوتی ہے ۔ پھر لطف یہ ہے کہ اسکے ساتھ دوسرے شعری محاسن بھی اپنے پورے نکھار پر نظر آتے ہیں ۔

آزاد کے کلام کا ایک اور نمایاں وصف تسلسل خیال ہے ۔ یہی وہ خوبی ہے جو غزل نے نظم سے سیکھی اور حسرت و اقبال کے اثر سے دور جدید کی غزل میں یہ رنگ عام ہو چلا ہے ۔ آزاد صاحب کی بھی اکثر غزلیں مسلسل نظر آتی ہیں اور سب نتیجہ خیز ہیں ، بحیثیت مجموعی آزاد کا کلام جذبات عالیہ کی ترجمانی کا آئینہ دار ہے ۔ آن کی غزلوں میں لطیف ترین واردات قلبیہ کی کارفرمائی ہے ۔ جسے آنہوں نے بڑی سلیس اور فصیح زبان میں ادا کیا ہے ۔ آن کا شعری سرمایہ بیہودہ مبالغوں اور صنایع بدایع کی ظاہری ملمع کاریوں سے یکسر پاک ہے ۔

الغرض آزاد انصاری کا کلام آن کی انفرادیت کا حامل ہے ۔ اور آن کا شمار ہمارے اچھے شعرائے متغزلین میں ہوتا ہے آزاد کی سادگی میں حسن و تاثیر کے علاوہ دل کو لبھانے والی ایک کیفیت بھی پائی جاتی ہے ۔ آن کے اکثر اشعار میں زبان و بیان کی لطافتیں اسقدر رچی ہوئی ہیں کہ پڑھنے والا آنہیں دیکھتے ہی پھڑک آٹھتا ہے ۔ آنکے اشعار میں بالخصوص چھوٹی بحر کے شعروں میں بڑی نشتریت سموئی ہوئی ہے ۔ وہ مصرعوں میں الفاظ یا فقروں کے آلٹ پھیر بھی کرتے ہیں لیکن اس طرح کہ اس سے شعر میں جان پڑ جاتی ہے اور کہیں بھی آن کا یہ آرٹ بناوٹ کی شکل اختیار نہیں کرتا ۔ آزاد کو زبان پر بڑا عبور حاصل ہے ۔ وہ الفاظ کا انتخاب بڑی خوش سلیقگی سے اس طرح کرتے ہیں کہ اظہار خیال کا لطف بھی نہیں جاتا اور ساتھ ہی صفائی ، سادگی اور ترنم کی خصوصیات شعر میں پیدا ہو جاتی ہیں ۔

یہ آردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ مرحوم آزاد انصاری جیسے خوش فکر شاعر کا کلام کسی مجموعے کی صورت میں نہ چھپ سکا ۔ خدا کرے کہ کوئی صاحب ذوق یہ ادبی خدمت انجام دے کر اس کمی کو پورے کر دیں ۔

انتخاب کلام

یوں یاد آؤ گے ہمیں اصلا خبر نہ تھی
یوں بھول جاؤ گے ہمیں وہم و گماں نہ تھا
اُمید کے خیال سے میرا گماں غلط
برتاؤ کے خیال سے تو مہرباں نہ تھا

آہ ! کب تک دل کی بے تابانہ حالت دیکھئے
اور اس دل کی ' ہو جس کا آسرا ٹوٹا ہوا
آس کہتی ہے کہ مجھ پر صبر کر ۔ میں مٹ چلی
صبر کہتا ہے کہ دل کو تھام ۔ میں چلتا ہوا
جتنی اُمیدیں تھیں بالآخر غلط ثابت ہوئیں
ہم نے کچھ سمجھا ' وہ کچھ نکلے بڑا دھوکا ہوا
وہ جدائی کا زمانہ ' وہ کمال بے کسی
وہ توحش ' وہ ھجوم غم وہ دل آمڈا ہوا

آہ کس نے مجھے دنیا سے مٹانا چاہا — آہ ! اُس نے کہ جسے حاصلِ دنیا جانا

تم اور دل آزارئی ارباب محبت — ارباب محبت کا یہ شیوہ نہیں ہوتا
اک وہ ہیں کہ بے خوف و خطر گرم شکایات — اک ہم ہیں کہ اظہار تمنّا نہیں ہوتا

ظاہر ہے کہ بے کس ہوں ' ثابت ہے کہ بے بس ہوں
جو ظلم کیا ہوگا ' برداشت کیا ہوگا
بے دل بھی ہوں ' شاداں بھی ' شاکی بھی ہوں نازاں بھی
جو داغ دیا ہوگا ' دلچسپ دیا ہوگا

اک دن گلۂ غفلت سننے کو ترسیئے گا — اک دن الم فرقت کچھ دے کے سلا دے گا
اُمید سکوں رخصت ' تسکین دروں رخصت — اب درد کی باری ہے ' اب درد مزہ دے گا
آزاد گدا مشرب دنیا سے غرض مطلب
کوئی ہمیں کیا دے گا ' دیگا تو خدا دیگا

تم اور چارۂ غم فرقت ، خوشا نصیب ! دکھ کو دوا نصیب، مرض کو شفا نصیب

نرالی آن پیدا کر ، انوکھی شان پیدا کر
جگر زخمی ، دل آشفتہ ، نظر حیران پیدا کر
محبت تجھ کو آداب محبت خود سکھا دے گی
ذرا آہستہ آہستہ ادھر رجحان پیدا کر
جو اُلفت ہے تو اُلفت کی نظر سے مطمئن فرما
جو دعویٰ ہے تو دعوے پر کوئی برہان پیدا کر
اگر آزاد سا درویش نظروں میں نہیں جچتا
تو جا اور جا کے اھل اللہ کی پہچان پیدا کر

طالب ہوں مگر ناکام ، سائل ہوں مگر محروم
تقدیر مری تقدیر ، مقسوم مرا مقسوم
قسمت سے وہ ملزم ہوں ، شامت سے وہ مجرم ہوں
جو داد سے بھی محروم ، بیداد سے بھی محروم
غمخوار یہ کہتے ہیں ، ''ارمان غم آسان ہے''
آثار یہ کہتے ہیں ، ''خیریتِ جاں معلوم''

آؤ پھر موقع ہے کچھ اسرار کی باتیں کریں
صورتِ منصور بہکیں دار کی باتیں کریں

آؤ پھر عہد وصال یار کی باتیں کریں
داستان لطف چھیڑیں پیار کی باتیں کریں
آؤ پھر اُس جلوۂ گل بار کی باتیں کریں
پھول برسائیں گل و گلزار کی باتیں کریں

آؤ پھر اُس ساقئی دلبر کا چھیڑیں تذکرہ
آؤ پھر اُس شاھدِ مے خوار کی باتیں کریں

آؤ پھر اس ہمدم کافر کا چھیڑیں تذکرہ
آؤ پھر اس یار نا دیں دار کی باتیں کریں

آؤ پھر ارمان محراب عبادت بھول جائیں
آؤ پھر اس ابروئے خم دار کی باتیں کریں
آؤ پھر ایقانِ اعجازِ کرامت بھول جائیں
آؤ پھر اس لعلِ افسوں کار کی باتیں کریں

آؤ پھر اس دل شکن انکار کا قصہ سنائیں
آؤ پھر اس جاں فزا اقرار کی باتیں کریں
آؤ پھر اس با مزہ تکرار کا قصہ سنائیں
آؤ پھر اس صلح زا پیکار کی باتیں کریں
حضرت ''آزاد'' سب نا محرم اسرار ہیں
کس سے بے خوفِ فساد اسرار کی باتیں کریں

بیان راز دل کی خواهشیں اور وہ بھی منبر پر
خبر بھی ہے یہ باتیں دار پر کہنے کی باتیں ہیں

نثار اس شوخ کے جس نے شب وصل
خود آئینِ ہم آغوشی سکھایا

عشق میں اپنا جی نہ تیاگ عشق نہیں ہے آگ ہے آگ
کس کی لگاوٹ کس کی لاگ بھاگ بلائے حسن سے بھاگ
زلفوں والو ! یہ اندھیر دُھرے دُھرے کالے ناگ

خیال نگاہ محبت عبث کہ تاب نگاہ محبت کہاں

سلوکِ جا و بے جا دیکھتا ہوں، تحیّر خیز نقشہ دیکھتا ہوں
ابھی اُلفت، ابھی یک لخت فرصت ابھی کیا تھا، ابھی کیا دیکھتا ہوں

وہ دل جس میں تمنا کی خوشی تھی اُسے صرف تمنا دیکھتا ہوں

کبھی دن رات رنگیں صحبتیں تھیں اب آنکھیں ہیں، لہو ہے اور میں ہوں

اگر کار اُلفت کو مشکل سمجھ لوں تو کیا ترک اُلفت میں آسانیاں ہیں
سزائیں تو ہر حال میں لازمی تھیں خطائیں نہ کر کے پشیمانیاں ہیں

نشانِ راہ ہاتھ آیا تو کس سے، صرف اُلفت سے
کہاں رہبری پایا تو کس میں، صرف رہزن میں

ترے ہوتے مری ہستی کا کیا ذکر یہی کہنا بجا ہے، میں نہیں ہوں
تیرے جلووں میں کھو جاتا مگر آہ! جہاں تو جلوہ زا ہے، میں نہیں ہوں

نزاکت ہے کہ قرباں ہے تری ترکیب اعضا پر
قیامت ہے کہ پنہاں ہے تیرے بے ساختہ پن میں

ارمان التفات دل دوستاں درست شایان التفات دل دوستاں کہاں

غزل مسلسل

ہمارے دل کو صرفِ یاس کامل دیکھتے جاؤ
ہمارے خبط بے حاصل کا حاصل دیکھتے جاؤ

وہ دل جو ابتدا سے کامیاب حل مشکل تھا
اُسے ناکامیاب حل مشکل دیکھتے جاؤ

وہ ربط عشق، جس کو خبط عرض حالت دل تھا
اُسے بیزار عرض حالت دل دیکھتے جاؤ

وہ طالب جو کبھی بھر طلب سرتا پا دل تھا
اُسے سو بیدلوں کا ایک بیدل دیکھتے جاؤ

وہ اُمیدِ وفا ' جس سے سکون قلب حاصل تھا
اُسے شکل بلائے یاس نازل دیکھتے جاؤ
وہ ارمانِ لقا ' جو آشنائے عہد باطل تھا
اُسے نا آشنائے عہد باطل دیکھتے جاؤ
وہ شوق وصل ' جو اکدن علاج غم میں کوشاں تھا
اُسے فکر علاج غم سے غافل دیکھتے جاؤ
وہ درد ہجر ' جو اکدن ضرورت مند درماں تھا
اُسے سوئے سکون شام مائل دیکھتے جاؤ
وہ نظریں ' جو کسی دن تم سے لڑکر دل میں نازاں تھیں
اب اُنکو اپنی بد بختی کا قائل دیکھتے جاؤ
وہ آنکھیں جو کبھی پروانۂ رخسار تاباں تھیں
اب اُنکو گریۂ حسرت میں شاغل دیکھتے جاؤ
وہ اُلفت جسکے استحکام پر دنیا کو حیرت تھی
اب اُسکو مثل رنگ خام زائل دیکھتے جاؤ
وہ بد بخت محبت ' جسکی فطرت ھی محبت تھی
اب اُسکو صبر کر لینے کے قابل دیکھتے جاؤ
وہ آزادِ حزیں ' جو آج تک آزاد ناقص تھا
اُسے نازانِ آزادئ کامل دیکھتے جاؤ

الہٰی کامیابی رھنما ھو ' کوئی اُمید وارانہ چلا ھے

اب فریب مہربانی رائیگاں زندگی بھر کو نصیحت ھو گئی

جب ھمیں بزم میں آنے کی اجازت نہ رھی
پھر یہ کیوں پرسشِ حالات ھے ' یہ بھی نہ سہی

تو اور پاس خاطرِ اھل وفا کرے اُمید تو نہیں ھے ' مگر ھاں خدا کرے
میں اور انحراف ' مگر بد نصیب دل میرا کہا کرے نہ تمہارا کہا کرے

سمجھتا ہوں کہ تم بیداد گر ہو   مگر پھر داد لینی ہے تمہیں سے
فسوں گر ! میں تجھے پہچانتا ہوں   وہیں سے بات کرنا بس وہیں سے
خداوندا ! یہ کس کا آستاں ہے   کہ سجدے ٹپکے پڑتے ہیں جبیں سے
مناسب ہو تو اب پردہ اٹھا کر   ہمارا شک بدل ڈالو یقیں سے
زمانے بھر سے جو چاہو سو مانگو   مگر انکو طلب کرنا انہیں سے
جو آزادی کا طالب ہے تو 'آزاد'
نہ دنیا سے علاقہ رکھ نہ دیں سے

اے کاش ذوق درد محبت فنا نہ ہو   اے کاش ! اس ابتدا کی کبھی انتہا نہ ہو !
ہم اور یہ طلب کہ تمہاری خوشی کریں   تم اور یہ غضب کہ ہمارا بھلا نہ ہو !
بے رحم ! جور داخل انداز ہی سہی !   پھر بھی جو بے قصور ستانا روا نہ ہو !
ترک تعلقات کی 'تجویز' بر محل !   لیکن جو اس علاج سے بھی فائدہ نہ ہو !
تو اور چشم لطف نئی واردات ہے   میری نگاہ نے مجھے دھوکا دیا نہ ہو !
جی بھر کے ظلم کر ' مگر اس شرط خاص پر
جب لطف ہو تو لطف کی بھی انتہا نہ ہو

اب حال دل نہ پوچھ کہ تاب بیاں کہاں   اب مہرباں نہ ہو کہ ضرورت نہیں رہی
اک پائمالِ جور سے امید شُکرِ جور   جا شکر کر کہ تاب شکایت نہیں رہی
دل اور تیرے خیال سے راحت نہ پا سکے   شاید مرے نصیب میں راحت نہیں رہی
'آزاد' کیا ارادۂ چون و چرا کروں
امرِ خلاف حکم کی جرأت نہیں رہی

میں تو اظہار درد کرتا ہوں   کوئی درد آشنا نہیں ' نہ سہی
ترک حاجت بھی ممکنات سے ہے   کوئی حاجت روا نہیں ' نہ سہی
رند ہوں اور رندِ پاک نہاد   متقی ' پارسا نہیں ' نہ سہی
آپ نے درد سن لیا ہوتا   درد کی کچھ دوا نہیں ' نہ سہی

نہ سمجھ ' مجھ کو رائیگاں نہ سمجھ
نہ سہی ' تیرے کام کا ' نہ سہی

مری پستی تری رفعت کا مظہر بن کے دم لے گی
مری ہستی ترا راز نہاں معلوم ہوتی ہے
تمہاری ذات اب تک عقدۂ صد راز پاتا ہوں
تمہاری بات اب تک چیستاں معلوم ہوتی ہے
وہ مرگ عشق جس کو اہل ظاہر موت کہتے ہیں
ہمیں شکل حیاتِ جاوداں معلوم ہوتی ہے
خدا چاہے تو اب سعی طلب انجام کو پہونچے
مری گم گشتگی تیرا نشاں معلوم ہوتی ہے

ترا بار گرانِ مہربانی کون اٹھا سکتا ' ترا نا مہرباں ہونا کمالِ مہربانی ہے

کرم ہیں اور طلب سے بھی زیادہ ستم ہے اور بہ انداز دگر ہے

وہی تم کہ خواہش جان و دل ' وہی دل کی کاہش جاں گسل
وہی تم ہو اور وہی جیت ہے ' وہی ہم ہیں اور وہی ہار ہے

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی خوف فساد خلق سے نا گفتہ رہ گئے

آ مگر اس قدر قریب نہ آ کہ تماشا محال ہو جائے

جو بتوں کو خدا سمجھتے ہیں وہ نہیں جانتے خدا کیا ہے

یا درد کے احساس کو لذت بھی عطا کر یا درد کے احساس سے بیگانہ بنا دے

بے خبر ! کار خبر مشکل نہیں بے خبر ہو جا ' خبر ہو جائے گی
جو وہ ملتا نہیں ہے آپ کھو جا کہ اک یہ بھی طریق جستجو ہے

بنایا ' کھیل دیکھے ' توڑ پھینکا یہ کیا انداز تخلیق جہاں ہے

اعتبارات سے بالا ہو جا اعتبارات میں کیا رکھا ہے

عالم تیرے وجود سے تکمیل پا گیا آئندہ ارتقا کی ضرورت نہیں رہی

غیر ممکن ہے کہ اس بزم میں آزاد نہ ہو کہ ہمیں بوئے نفوس فقرا آتی ہے

تجدید محبت کے ارمان

پھر تقاضائے نظر سلسلہ جنباں ہوگا
پھر تماشائے بہار رخ جاناں ہوگا
پھر سکوں عالم وحشت میں بدل جائیگا
پھر جنوں گرم تقاضائے بیاباں ہوگا
پھر نڈر عرصہ آلفت میں قدم رکھوں گا
پھر وہی پائے ثبات اور وہی میداں ہوگا
پھر وہی نغمۂ دل دوز وفا چھیڑوں گا
پھر وہی زخمہ ' وہی تار رگ جاں ہوگا
پھر تعشق کا جنوں اور سوا ابھرے گا
پھر تعلق میں غلو اور دو چنداں ہوگا
پھر نئے سر سے محبت کے مزے آئیں گے
پھر نیا سلسلۂ حسرت و ارماں ہوگا
پھر کوئی غیرت گلزار جہاں دل لیگا
پھر بقدر گل مقصود بہ داماں ہوگا
پھر گلستان محبت میں بہار آئے گی
پھر شبستان تمنا میں چراغاں ہوگا
پھر تمنائے حزیں ساز طرب چھیڑے گی
پھر دل غمزدہ خوش ہو کے غزلخواں ہوگا
پھر مرا دکھ مجھے تسکین دوا بخشے گا
پھر مرا درد مجھے غیرت درماں ہوگا
پھر مری طبع مجھے کفر کی دعوت دے گی
پھر مرا کفر مجھے دعوت ایماں ہوگا
پھر امید کرم یار میں خوش گذرے گی
پھر علاج ستم گردش دوراں ہوگا
پھر مجھے فکر دو عالم سے نجاتیں ہونگی
پھر مجھے زیست کا ہر مرحلہ آساں ہوگا

غلط ' آزاد ترے دل کے یہ شبہات غلط
مطمئن ہوں کہ مرے درد کا درماں ہوگا

بت کافر یہ واضح ہو ' خدا بھی اپنے بندوں پر
فقط ظلم و ستم کر کے خدائی کر نہیں سکتا
جہاں آزاد اب بے خوف سرگرم تکلّم ہے
وہاں روح القدس بھی لب کشائی کر نہیں سکتا

عظمت اللہ خاں

عظمت اللہ خاں ۱۸۸۷ء میں اپنے آبائی وطن دھلی میں پیدا ہوئے لیکن اُن کی عمر ابھی پانچ سال کی تھی کہ وہ اپنے والد نعمت اللہ خاں صاحب کے ھمراہ حیدرآباد دکن چلے گئے۔ حیدرآباد میں اُنہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ گئے۔ جہاں سے بی ۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعدحیدرآباد آ کر محکمۂ تعلیمات میں ملازم ہو گئے اور مدرسہ کی معلمی سے ترقی کرتے کرتے اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے دفتر نظامت تعلیمات میں مددگار ناظم کے عہدۂ جلیلہ تک پہنچے ۔ دوران ملازمت میں اُن کی شہرت شاعر و انشا پرداز کی حیثیت سے خوب چمکی اور باوجودیکہ اُن کا رنگ پختگی کو نہ پہنچنے پایا تھا اور وہ عین جوانی میں ۱۹۲۷ء میں ہم سے رخصت ہو گئے لیکن اس میں شک نہیں کہ ہم پر اُن کا بڑا احسان ھے چونکہ اُنہوں نے حالی کے بعد نہ صرف رسمی غزل کے خلاف سختی سے آواز بلند کی بلکہ اُردو شاعری کو ھندی طرز سے بہت قریب بھی کیا ۔

عظمت اللہ خاں فطرتاً بڑے آزاد فکر ، ظریف مزاج اور بشاش طبیعت واقع ہوئے تھے ۔ اُن کا ادبی مذاق نہایت عمدہ تھا ۔ اُن کے کردار و مزاج کی یہ خصوصیات اُن کی شاعری میں پوری طرح جلوہ گر ھیں اور اُنہیں بلا شبہ اُردو کے آزاد فکر شعرا میں شمار کرنا چاھئے ۔ عظمت اللہ خاں نے سماج کے بعض مذموم پہلوؤں پر بڑی بے باکی و بے تکلفی سے قلم اُٹھایا ھے اور یہی وجہ ھے کہ بعض نقاد اُنہیں فحش گو اور اُن کی چند نظموں کو معیار اخلاق سے گرا ہوا بتاتے ھیں ۔ لیکن حقیقت یہ ھے کہ وہ ایک سچے فنکار تھے جنھوں نے بڑی صناعی کے ساتھ ماحول کے کمزور پہلوؤں کو اجاگر کیا جس کا مقصد تضحیک نہیں بلکہ اصلاح تھا ۔

عظمت اللہ خاں صرف مغربی اثر کے نمائندے ھی نہیں بلکہ اُردو شاعری میں ایک نئے دبستان شاعری کے بانی بھی ھیں ۔ جس کی خصوصیات ھندی شاعری کے اسالیب کی طرف رجعت اور الفاظ اور بحروں کا ترنم ھے ۔ اس لحاظ سے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ھے کہ عظمت اللہ خاں نے اُردو شعراء کی اس بے راہ روی کو محسوس کیا کہ وہ اُسے اپنے ماخذ سے بہت دور ہٹائے لئے جا رھے ھیں اور اس کمی کو بڑی کامیابی کے ساتھ پورا کیا ۔ اُن کی شاعری ھندی شاعری کے لطیف احساسات اور دلکش اسالیب کا بڑا اچھا مجموعہ ھے ۔ ھمیں ان سے پہلے شوق قدوائی کے یہاں عورت کے جذبات کا سچا اورپر خلوص اظہار ضرور ملتا ھے لیکن اُن کے یہاں عظمت اللہ خاں کے کلام کی شیرینی اور گھلاوٹ نہیں ملتی جو یکسر ھندی شاعری کے اثر سے پیدا ہوئی ۔ عظمت صاحب ھندی سے بخوبی واقف تھے لہذا اُنہوں نے ھندی شاعری کی روح اپنے

کلام میں بھر دی ۔ اُن کے نغمے بڑے سریلے اور موضوعات بے حد اچھوتے ہیں ۔ کلام کی انھیں خوبیوں کی بدولت عظمت‌اللہ کی نظمیں خود اُن کی زندگی میں بڑی مقبول ہوئیں اور اُن کے طرز سے متاثر ہو کر بہت سے شعرا نے اُن کی تقلید بھی کی ۔ اس تقلید میں دیگر شعرا کو وہ رتبہ تو نہ مل سکا جو عظمت‌اللہ خاں کا ہے لیکن یہ طرز عام ضرور ہوا اور مقبول احمد پوری ' اندرجیت شرما ' حفیظ ' ساغر ' افسر وغیرہ جیسے غنائی شاعر پیدا ہوئے جن کے یہاں ہمیں ہندی کا گہرا اور رچا ہوا اثر ملتا ہے ۔

عظمت‌اللہ خاں ایک جذبات نگار شاعر تھے چنانچہ اُن کے کلام میں حیات انسانی کی رنگا رنگی اور اُس کی سنگین صداقتوں کا بیان ملتا ہے ۔ وہ روح اور حرکت کے شیدائی تھے اسی لئے زندہ تصویروں کے پیش کرنے میں اُنہیں بڑی کامیابی ہوئی ۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اُنہوں نے بیانیہ و تفصیلاتی نظمیں نہیں کہیں ۔ اُن کے یہاں ایسی نظمیں بھی موجود ہیں اور اُن میں وہی شیرینئی زبان و لطافت بیان پائی جاتی ہے جو اُن کی دوسری نظموں کا خاصہ ہے چنانچہ اس سلسلے میں اُن کی نظم ''پیپل'' مطالعہ کے قابل ہے مگر ایسی نظموں میں وہ روح رقصاں و متحرک نظر نہیں آتی جو اُن کی اکثر نظموں کو ممتاز و منفرد بناتی ہے ۔ اُن کی جذبات نگاری و سراپا نگاری کا کمال اگر دیکھنا ہو تو ''موہنی مورت'' ''اندھرا دیس کی سندر پتری'' ''وہ پھول ہوں جس کا پھل نہیں ہے'' ''میرے حسن کے لئے کیوں مرے تمہیں لینے تھے نہیں یوں مرے'' اور بالخصوص ''مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا'' جیسی نظمیں پڑھئے ۔ جن میں عظمت‌اللہ کی جذبات نگاری اپنے پورے شباب پر ہے ۔ ان نظموں میں اسلوب کی شیرینی اور گھلاوٹ کے علاوہ واقعات و جذبات کا ایسا بے مثل تناسب اور ایسی بھرپور صداقت پائی جاتی ہے جو اُنہیں ایک اعلیٰ ادبی کارنامے کا شرف بخشتی ہے ۔ اس سلسلے میں اُن کی آخرالذکر نظم یعنی ''مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا'' یقینی طور پر عظمت‌اللہ خاں کا شہکار ہے ۔ اس نظم میں شاعر نے ایک لڑکی کے جذبات ' اُس کی محبت ' ضبط اور یاس کو ایسے خاموش حزن ' درد و اثر ' دلکش اور اعلیٰ تر صناعی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ یہ نظم اپنی نوعیت کی عدیم المثال نظم بن گئی ہے اور انہیں گونا گوں خوبیوں کی وجہ سے اسے شوق قدوائی کی معرکہ آرا نظم ''عالم خیال'' پر بھی فوقیت حاصل ہے ۔

مختصر یہ کہ عظمت‌اللہ خاں نے ہماری توجہ اُردو عروض کی طرف دلائی ۔ خود نئے طرز کی نظمیں لکھیں اور ان میں اپنی زبردست شخصیت اور اچھوتے افکار سے ایسی انفرادیت پیدا کی کہ آج وہ ہماری شاعری میں ایک قابل قدر اضافے کا کام دے رہی ہیں ۔ اور یہ اُسی یگانہ شاعر کے شہ‌پاروں کا نتیجہ ہے کہ اُس کے بعد اُردو میں غنائی شاعری کو فروغ ہوا اور غزلوں و مروجہ نظموں کے ساتھ ساتھ گیتوں کی قابل قبول تخلیق ہوئی ۔

انتخاب کلام

مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا

مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا   مرے جی کو یہ آگ لگا سی گئی
مجھے عیش یہاں کوئی پل نہ ملا   مرے جی کو یہ آگ جلا سی گئی

مرے تایا کے پوت تھے تم ، سبھی ہم   رہے ایک جگہ ، پلے ایک ہی ساتھ
مرے باپ نے عمر جو پائی تھی کم   انہیں چھین کے لے گیا موت کا ہاتھ

میں تھی ننھی سی جان غریب بڑی   کبھی بھول کے دکھ نہ کسی کو دیا
نہ تو روٹھی کبھی نہ کسی سے لڑی   مری باتوں نے گھر ہی کو موہ لیا

تھے تو بالے ہی تم پہ تھا تم کو بڑا   مرا دھیان کسی کی مجال نہ تھی
مجھے ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھے ذرا   مجھے کھیل میں بھی تو کیا نہ دُکھی

مرے سر میں تمہارا ہی دھیان بسا   مری چاہ کے راج دلارے بنے
تمہیں دیوتا ماں کے من میں رکھا   مری پھول سی آنکھوں کے تارے بنے

مرا چنو ابھی سے ہے اس پہ فدا   یہ مکھولی ہے موہنی میری بہو
یہ چچی کا کہا مرے دل نے لکھا   وہیں دوڑ گیا مرے منہ پہ لہو

اسی بات کے گھر میں جو چرچے ہوئے   سبھی کہتے تھے مجھ کو تمہاری دلہن
مجھے تم نے بھی اپنے لگا کے گلے   کئی بار کہا مری پیاری دلہن

اسی طرح گزر گئے چند برس ...   بڑھی عمر ہماری حیا بھی بڑھی
تمہیں پڑھنے کی دھن لگی ایسی کہ بس   بڑے شوق سے ساری پڑھائی پڑھی

مجھے تم نے پڑھایا بھی پہلے پہل | مجھے پڑھنے کا خوب ھی شوق ھوا
لگی چلنے ترت نرے اپنے ھی بل | یوں ھی آپ ھی علم کا ذوق ھوا

تمھیں پڑھنے کو دور جو بھیجا گیا | بڑے شوق سے خوب ھی کام کیا
کوئی تم نے دقیقه آٹھا نه رکھا | بڑی محنتیں کی بڑا نام کیا

ھوئے پڑھ کے نچنت تو عہدہ ملا | ھوا گیان کا گُن کا جو شہر میں نام
یه مزے کا نیا ھی شگوفه کِھلا | لگے مینه کی طرح سے برسنے پیام

مرے تایا بڑے تھے زمانه شناس | بڑے اونچے گھرانے میں ٹھیرا پیام
گیا ٹوٹ سا جی ' گئی ٹوٹ سی آس | مری چاہ کا ھو گیا کام تمام

بڑی دھوم سے آئی تمہاری دلہن | میں بھی کام میں بیاہ کے ایسی جتی
کوئی اور تھی گو ''مری پیاری دلہن'' | کہا سب نے بڑی ھے بہن کو خوشی

مرے دل کی کسی کو بھی تھی نه خبر | مری چاہ کسی په نه فاش ھوئی
بنی جان په اپنی کی اُف نه مگر | مرے واسطے بر کی تلاش ھوئی

مرا ایک جگه جو پیام لگا | مرے دل سے تڑپ کے یه نکلی دعا
''نہیں چاہ ھی دل میں تو بیاہ ھے کیا | تو خدایا ! یونہیں مجھے جگ سے آٹھا''

مجھے چاہ نے کھا لیا گھن کی طرح | مری جان کی کل سی بگڑ ھی گئی
مرا جسم بھی بُھن گیا بن کی طرح | یوں ھی بستر مرگ په پڑ ھی گئی

مرا آخری وقت ھے آن لگا | کوئی اور تمہاری ھے ''پیاری دلہن''
مجھے اب بھی تمہارا ھی دھیان بسا | نه بنی ' په رھی ھوں ''تمہاری دلہن''

مجھے جیتے جی پیت کا پھل یہ ملا   مرے تن کو یہ آگ لگا ہی گئی
مجھے پیار کی ریت کا پھل یہ ملا   مرے تن کو یہ آگ جلا ہی گئی

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے

کوئی شے بھلی بری نہیں ہے ' کوئی بات یاں اٹل نہیں ہے
ہے یہ زندگی عجب پہیلی ' کوئی اس کا یاں تو حل نہیں ہے
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے ' وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے
کسی گود ماستا بھری کی میں بھی نازوں میں کبھی پلی تھی
کسی آنکھ کی تھی میں بھی پتلی میں بھی نازوں میں کبھی پلی تھی
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے ' وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے
ابھی کچھ ہوئی نہ تھی سیانی کہ آٹھا بڑوں کا سر سے سایہ
تو زمانے نے یہ پلٹا کھایا کہ کسی کو پھر نہ اپنا پایا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے ' وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے
یہ کڑ دلوں کی طوطا چشمی مرے من میں تیر سی ہی بیٹھی
گئی من کے پھول کی تراوٹ آڑی اوس کی طرح سے نیکی
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے ' وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے
نہ رہا کسی پہ کچھ بھروسا نہ رہا کوئی مرا سہارا
نہ رہی کسی کی میں ہی پیاری نہ رہا کوئی مرا ہی پیارا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے ' وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے
تھیں وہیں پڑوس میں واں طوائف تھا بڑا ہی نامی آن کا ڈیرا
مرے سر پہ ہاتھ انہوں نے رکھا مجھے پیار سے سبھوں نے گھیرا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے ' وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے
مجھے چاؤ چونچلوں سے پالا مری تربیت کا ڈول ڈالا
مجھے گانا ناچنا سکھایا مرے من کو تن بدن میں ڈھالا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے ' وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے
غرض اس طرح کی پا کے سِکھشا نظر آئی زیست ایک میلا
ہیں جہاں جوُئے کی سب دکانیں وہیں ہار جیت کا جھمیلا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے ' وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

تھی حسینوں میں مری نہ گنتی نہ تو حور تھی نہ میں پری تھی
مرا رنگ سانولہ سلونا مری نین بجلیاں بھری تھی
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے ' وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے
مرے بال کالے لانبے کہ اٹھا ہو ابر جیسے کالا
مرا سینہ بھی اٹھتا بادل بھری بجلیوں سے تھر تھراتا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے ' وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے
مرے عاشقوں کی تھی نہ گنتی مرا فن میں تھا بلند پایا
مرے گرد ھُن برس رہا تھا میں دھنی ہوئی وہ دھن کمایا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے ' وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے
جو ھیں نیک آپ کو سمجھتے مجھے بیسوا پکارتے ھیں
وہ مگر ھیں اصلیّت سے کورے نری باتیں ھی بگھارتے ھیں
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے ' وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے
ہو نکاح یا کہ آشنائی کسی رنگ سے ہے پیٹ بھرنا
کہیں عیش اور عشق بازی کہیں رنگ سے ہے پیٹ بھرنا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے ' وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے
مجھے ایک تیتری سمجھئے مرا کام پھول پھول اڑنا
کہیں اس کے واسطے ٹھٹکنا کہیں پنکھڑی پہ جھول اڑنا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے ' وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے
مری زندگی سبق ہے کہ یہاں کی خوب سیر کی ہے
ہے مزے کی چیز یہ دنیا نہ تو شر کی ہے نہ خیر کی ہے
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے ' وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

پیٹ کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

کالی کویل تھی تو حسن رسیلا ترا
نو کلی کویل تھی تو شبد سریلا ترا
پیٹ کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

عشق کی دیوی تھی تو شعر میں یکتا تھی تو
حسن کی پتلی تھی تو ایک کویتا تھی تو
پیٹ کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

باز بہادر ترا حسن کا شیدا رہا
تو نے اُسے دل دیا ایک سراپا وفا
پیت کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

خوب تھی قسمت تری سات برس عیش تھے
شعر و سخن موسیقی حسن حکومت کے مزے
پیت کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

دکھ کی جو آئی گھڑی اور چھڑی راگنی
دن تھا نہ وہ رات تھی عیش کی محفل اٹھی
پیت کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

اکبر کے لشکر کی فوج ایسی ابھر آئی تھی
باز بہادر کی فوج بکھری پھٹی کائی سی
پیت کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

باز بہادر ترا جان چھپا اڑ گیا
آنچ سیں ڈالا گیا تیرا دل بے وفا
پیت کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

باز بہادر کا تھا تیرا جو دل ہو چکا
اور کسی کا بھلا ہو سکے ممکن نہ تھا
پیت کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

ایک طرف تھی وفا ایک طرف جان تھی
سچ کا تقاضا یہ تھا جان ہی قربان تھی
پیت کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

موت تری موت تھی عشق کی دیوی مری
موت وہ تھی جان بھی جس پہ ہے قربان کی
پیت کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

کوئی زبردست ہاتھ تیری کڑی جھیلتا
دل کوئی مردانہ ساتھ جان پہ یوں کھیلتا
پیت کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

چاہ کا اپنی دیا ایسا دیا ہے جلا
اور بھی دے گا جلا سانس اُسے وقت کا
پیت کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

سندر صورت سندر ہی ہے رنگت گوری یا کالی

اندھرا دیس کی سندر پتری کالی کویل سی کالی
بال بھی کالے گھنگھور گھٹا
ہونٹ وہ گدرے جامن کے سے اور آداھٹ میں لالی
دانت وہ اجلے موتی کی جلا

بڑی بڑی سی آنکھ غلافی پتلی بھونرا سی کالی
خمار اک مستانہ چھایا
وہ من موہن مقناطیسی آن میں چمک ناگن والی
آنکھ لڑی اور دل کو لبھایا

اور سراپا گدرا گدرا سانچے میں ڈھلا لچکیلا
جوش جوانی پھٹتا جوبن
بھرا بھرا سا ڈھلا ڈھلایا وہ اک اک عضو سجیلا
وہ ہر چیز کا بے ساختہ پن

اک موج مچلتی مچلاتی چڑھتی اترتی لہراتی
وہ گردن کا نفیس ڈھلاؤ
سینہ متی کا جوالا مکھ کمر لچکتی بل کھاتی
وہ ہوش ربا آتار چڑھاؤ

سندر صورت سندر ہی ہے گوری یا کالی
فطرت نے ہو جس رنگ میں ڈھالی
فطرت کے لئے حسن یہی ہے سج دھج گرمانے والی
جان کی کھیتی جوتنے والی

برکھا رت کا پہلا مینہ

آئے بادل کالے کالے جھومتے ہاتھی متوالے   امڈے پھیلے تُلتے جھکتے
ایک اندھیری دے کر چھائے ڈیرے پار طرف ڈالے   پون کے گھوڑے سہمے ٹھٹکے

جس نے دل پر بوجھ سا رکھا گرماؤ سے دم گھبرایا   ایک خموشی سناٹا سا
وہ آکاش کے بگڑے تیور تیوری پر بل جھلّایا   برسے گا اور برسائے گا

بجلی چمکی انگارا سی آگ کی ناگن لہرائی   لہریا کاڑھا بیل بنائی
بھاپ کے دریا میں قدرت نے نور کی مچھلی تیرائی   ادھر اُدھر تڑپی تڑپائی

بادل گرجے وہ گھڑ گھڑاہٹ آئی لڑھکتی لڑھکاتی   کروڑھا گھوڑے دوڑاتی
باڑھوں پر باڑھیں داغتی آئی اور کڑکتی کڑکاتی   پہاڑ لڑھکاتی ٹکراتی

بجلی چمکی ، بادل گرجے ، پون کے گھوڑے بدکائے   سوندھا سوندھا آیا چھینٹا
بجلی کوندی ، ٹوٹا تارا پردے کڑک نے دہلائے   پون کا جھکڑ مینہ کا تڑیڑا

بجلی چمکے بادل گرجے مینہ اور پون دھواں دھار   زور کا پانی وہ دھائیں دھائیں
بجلی ناچے بھاپ گرج کی مینہ نے چھیڑ دیا ستار   پون کا گانا وہ سائیں سائیں

بجلی چمکے ، بادل گرجے مینہ برسے موسلا دھار   بھر گئے جل تھل بلبلے والے
ہر سو پانی ، نیچے پانی اوپر پانی لگاتار   دریا ندی ، ندی نالے

درخت سارے بھیگ کے چوڑا پکھشی دبکے دبکائے   چونچ پروں میں بعض نے ڈالی
کھڑے مویشی بھیگے بھگائے سمٹے سکڑے سکڑائے   اوگلتا کوئی کرتا جگالی

بجلی چمکی بادل گرجے خوب ہی برسا برسایا   ایک سمندر مینہ کا بہایا
دم لے لے کر زور سے آیا تھم تھم کر زور گھٹایا   برکھا رت کا رنگ جمایا

ہو چلے بادل بھورے بھورے گائے دھنکے دھنکائے   دھواں ہوا میں جوں بل کھائے
بجلی چمکے چاندنی جیسے نور کی چادر پھیلائے   دور گرج بھی ڈھول بجائے

دھیا دھیا مینہ بھی چھم چھم پون ملائم اتراتی اٹھکھیلیاں کرتی اٹھلاتی
چکنے چکنے پتوں پر سے موتی سی بوندیں ڈھلکاتی کھیلتی آتی چھیڑتی جاتی

چُھل دلوں میں آپ ھی پیدا جان تراوت سی پائے جانوروں میں جان سی آئی
اچھلے کوئی کودے پھدکے کوئی ناچے اور گائے ایک خوشی ھر چیز پہ چھائی

پھٹ گئے بادل ابر کے ٹکڑے بہار اپنی دکھلاتے طرح طرح کی شکل بناتے
پھیلتے پھٹتے ' پھٹتے ملتے ' ملتے سمٹتے سمٹاتے دوڑتے تھمتے چلتے چلاتے

بادل بکھرے نیلا امبر ڈوبتے سورج نے جھانکا کرنیں سنہری ترچھی ترچھی
بکھری ھوا میں کھیلتی کھیلتی میگھ کا سارا رنگ جمایا آکاش پہ اک آگ لگائی

نیلا امبر ھنستا سورج رنگ میں ڈوبے ھوئے بادل کھلی پھننگوں پر ھلکی دھوپ
دھوئی نہائی بھومی سندر سر پہ سنہری سا آنچل قدرت کا ایک سہانا روپ

عزیز لکھنوی

مرزا محمد ہادی نام عزیز تخلص ۷ ربیع الاول ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۲ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے ۔ اصل وطن شیراز ہے ۔ جد امجد مرزا محمد جعفر شیراز سے کشمیر آئے اور پھر شاہان اودھ کے دور حکومت میں سارا خاندان کشمیر سے منتقل ہو کر لکھنؤ میں متوطن ہوا ۔ عزیز کے خاندان کا علمی مذاق کئی پشتوں سے ثابت ہے ۔ خود اُن کے والد مرزا محمد علی اپنے زمانہ میں فضل و کمال کے اعتبار سے بلند پایہ رکھتے تھے ۔ چنانچہ عزیز نے اپنے خاندان کی اس روایت کو قائم رکھتے ہوئے تحصیل علم میں بڑے ذوق و شوق کا ثبوت دیا اور اپنے عہد کے نہایت وقیع و ممتاز صاحب علم لوگوں میں شمار ہوئے ۔

عزیز نے لکھنؤ کے اکثر مشاہیر علما و فضلا سے صرف و نحو، فقہ و اُصول، ادبیات، کتب معقول اور درسیات فارسی کی تکمیل کی ۔ لیکن اس کے بعد بھی آخر دم تک تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رہا بالخصوص اساتذہ کے دواوین کا مطالعہ اُنھوں نے بڑے ذوق و انہاک سے کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں ایک اُستادانہ شان پیدا ہو گئی ہے ۔ عزیز کو شاعری کا شوق ابتدا سے تھا اس پر حضرت صفی لکھنوی کی شاگردی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اُنیس برس کی عمر میں اچھے شعر کہنے لگے تھے ۔ رفتہ رفتہ اُستاد کے فیضان صحبت، طبعی رجحان اور کثرت مشق سے بہت جلد خود بھی اُستادی کا درجہ حاصل کر لیا ۔ عزیز کی اُستادی مسلم ہے اور اُن کے دامن تربیت میں مرزا جعفر علی خاں اثر، شبیر حسن خاں جوش، جگت موہن لال رواں جیسے عصر حاضر کے نہایت خوش گو شعرا نے پرورش پائی ہے ۔

عزیز نے اُس زمانہ میں شعر و شاعری شروع کی جب جدید شاعری کے علمبردار اور مصلحین غزل لکھنؤ کی پرانی شاعری کو خاصا متاثر کر چکے تھے ۔ اُن کے اُستاد صفی خود اس انقلاب کے بانیوں میں تھے ۔ ان حالات میں عزیز کا نئے رجحان سے متاثر ہونا ایک فطری امر تھا ۔ چنانچہ اُنھوں نے لکھنوی طرز سخن کو چھوڑ کر دلی کے رنگ میں شعر کہنا شروع کئے ۔ وہ لکھنؤ کے اس قسم کے شعرا کے پیش رو ہیں اور عام طور پر اُنھی کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہے ۔ اس سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد

جیسے مستند ناقد کی رائے قابل ذکر ہے ۔ وہ عزیز کے مجموعہ غزلیات ''گلکدہ'' کے بارے میں لکھتے ہیں ''لکھنؤ کے جدید طرز تغزل میں حضرت عزیز کا کلام ہمیشہ شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے ۔ میں نے اس وقت سرسری طور پر مختلف مقامات سے گلکدہ کے چند صفحات دیکھے ۔ کسی صفحہ کو عمدہ اور دل پسند اشعار سے خالی نہ پایا'' اور اس میں شک نہیں کہ انہوں نے غزلگوئی میں میر و غالب کی پیروی اور مذاق جدید کی ترجمانی کر کے اپنے کلام کو نہایت خیال آفرین و دلکش بنا لیا ہے ۔

عزیز نے غالب کے خیال کی گہرائی اور میر کے سوز و گداز کو اپنے خاص رنگ میں سمونے کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے لیکن لکھنؤ میں مرثیہ کی ہردلعزیزی سے متاثر ہو کر سوز و گداز کو آہ و بکا میں تبدیل کر دیا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آن کی غزلوں میں مرض ، نزع ، موت ، نوحہ ، ماتم ، گور غریباں وغیرہ کے مضامین اس کثرت سے ہیں کہ مرثیت چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے ۔ البتہ جہاں تک زبان کا تعلق ہے عزیز کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے ۔ اور وہ اپنے اشعار میں الفاظ کو اس خوبی سے نظم کرتے ہیں کہ کلام میں ترنم کے علاوہ دلکشی میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے ۔ سلاست و صفائی عزیز کے کلام کی خاص خوبی ہے وہ فارسی تراکیب کا استعمال زیادہ کرتے ہیں ۔

عزیز نے غزل کے علاوہ قابل قدر نظمیں اور مرثیے بھی کہے ہیں لیکن قصائد میں وہ زیادہ کامیاب ہیں ۔ آن کے قصائد میں وہی زور و طنطنہ ہے جو ذوق و سودا کے یہاں پایا جاتا ہے لیکن آن کی زبان ان دونوں سے زیادہ صاف و رواں ہے ۔ غرض ان کے ہر قصیدے میں نئے نئے موضوعات، حسن تخیل شکوہ الفاظ اور نادر تلمیحات و تشبیہات پائی جاتی ہیں ۔

بحیثیت مجموعی عزیز ایک قادر الکلام اور صاحب طرز شاعر تھے ۔ جن کی غزل اور قصیدہ گوئی میں آستادی مسلم ہے ۔ قصیدہ میں وہ نہایت کامیاب ہوئے ۔ لیکن غزل میں میر و غالب کی روح کو اپنانے میں آن کے مقابلے میں آن کے ہم عصر ثاقب زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں چونکہ آن کی روح میر و فانی کی طرح اتنی حزیں نہیں کہ کلام میں نشتریت پیدا ہو جائے ۔ یہی وجہ ہے کہ آن کی غزل میں درد و الم کا اظہار الفاظ سے زیادہ ہے مگر ٹریجڈی کی وہ فضا نہیں ملتی جو میر و فانی کو نصیب ہوئی ۔ اسی طرح تقلید غالب میں بھی وہ پورے طور پر کامیاب نہ ہو سکے ۔ صرف آن حقائق کو بیان کرنے کی کوشش کی جو غالب کا طرۂ امتیاز سمجھے جاتے ہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عزیز خود ان حقائق سے دو چار نہیں ہوئے بلکہ آن کا اظہار و اعلان کر رہے ہیں ۔ تاہم اردو غزل پر آن کا یہی احسان کیا کم ہے کہ انہوں نے قدیم لکھنوی طرز سے بغاوت کی اور غزل کے داخلی پہلو پر زور دے کر اسے قعر مذلت سے نکالا ۔

حضرت عزیز نے ۱۹۳۵ء میں لکھنؤ میں انتقال فرمایا اور دو مجموعے یادگار چھوڑے ۔ غزلیات کا مجموعہ ''گلکدہ'' اور قصائد کا مجموعہ ''صحیفۂ ولا'' کے نام سے موسوم ہے ۔

انتخاب کلام

تغزل

جلوہ دکھلائے جو وہ اپنی خود آرائی کا
نور جل جائے ابھی چشم تماشائی کا
رنگ ہر پھول میں ہے حسن خود آرائی کا
چمن دھر ہے محضر تری یکتائی کا
اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن
بھولتا ھی نہیں عالم تری انگڑائی کا
اف ترے حسن جہاں سوز کی پر زور کشش
نور سب کھینچ لیا چشم تماشائی کا
دیکھ کر نظم دو عالم ھمیں کہنا ھی پڑا
یہ سلیقہ ہے کسے انجمن آرائی کا
گل جو گلزار میں ھیں گوش بر آواز عزیز
مجھ سے بلبل نے لیا طرز یہ شیوائی کا

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ھونا
وہ مرا پہلے پہل داخل زنداں ھونا
واھمہ مجھ کو دکھاتا ہے جنوں کے ساماں
نظر آتا ہے مجھے گھر کا بیاباں ھونا
حادثے دونوں یہ عالم میں اھم گزرے ھیں
میرا مرنا تری زلفوں کا پریشاں ھونا
جوش میں لے کے اک انگڑائی کسی کا کہنا
تم کو آتا ھی نہیں چاک گریباں ھونا
سرخ ڈورے تری آنکھوں کے الھی توبہ
چاھیئے تھا انہیں پیوست رگ جاں ھونا
ھو چلیں آپ کے بیمار کی آنکھیں بے نور
قہر تھا صبح کے تارے کا نمایاں ھونا
ان سے کرتا ہے دم نزع وصیت یہ "عزیز"
خلق روئے گی مگر تم نہ پریشاں ھونا

عہد میں تیرے ظلم کیا نہ ھوا
خیر گزری کہ تو خدا نہ ھوا
نہ ملی داد ضبط عشق "عزیز"
وہ کبھی صبر آزما نہ ھوا

ھجوم شوق کا بس قصہ مختصر یہ ہے
کہ میں جو چاھتا ھوں وہ کہا نہیں جاتا
زبان دل کی حقیقت کو کیا بیاں کرتی
کسی کا حال کسی سے کہا نہیں جاتا

ہمارے چہرے سے کیا کچھ عیاں نہیں ہوتا
نگہ سے دیکھ لو ہم سے بیاں نہیں ہوتا

ہے اُن کی بزم میں ہر شخص اپنے عالم میں
کسی کا راز کسی پر عیاں نہیں ہوتا

اُٹھائے جا کے کہاں لطف جستجو کوئی
جگہ وہ کون سی ہے تو جہاں نہیں ہوتا

یرا قصہ ہے جدا اُس کا ہے افسانہ جدا   گو کہ ہے پاس مگر ہے دل دیوانہ جدا
یں تو بے ہوش ہوا ذوق نظر سے اپنے   تیری تاثیر تھی اے جلوۂ جانانہ جدا

تو نے اس لطف سے دیکھا تھا ازل میں اُس کو
مر بھی جاتے تو کبھی دل نہ ہمارا ہوتا

اب کھل رہا ہے نزع میں یہ راز حسن و عشق
وہ شوخ دل میں تھا میں سمجھتا تھا درد تھا

ڈرتا ہوں دل کا حال بیاں تم سے کیا کروں
تم ایسے زود رنج کا ہے اعتبار کیا

جب وضع احتیاط سے نالہ کوئی رکا   تصویر ضبط بن کے مرے دل میں رہ گیا

بے حقیقت دل کی ہستی کو سمجھتے تھے مگر
اس لہو کی بوند نے عالم تہ و بالا کیا

میں حشر کی حقیقت اتنی سمجھ رہا ہوں   دونوں جہاں ہونگے اُن کا شباب ہوگا

کوسوں دیار عشق میں آبادیاں نہیں   یادش بخیر جب سے مرا دل نہیں رہا

جو حوصلہ تھا ، ضبط سے وہ دل میں رہ گیا
دل فکرِ حلِّ عقدۂ مشکل میں رہ گیا
دم توڑنے کے بعد بھی مدت تک اے ''عزیز''
کچھ اضطراب سا دلِ بسمل میں رہ گیا

شمع جل کر رہ گئی پروانہ بجھ کر رہ گیا
یادگار حسن و عشق اک داغ دل پر رہ گیا

مریض ھجر کی ایسوں کو قدر کیا ہو گی
اٹھے ھیں نیند سے جب سر پہ آفتاب آیا

عشق ہے اک طلسمِ رازِ بقا　　مٹ گیا دل مگر فنا نہ ھوا

وصال دائمی کیا ہے شب فرقت میں مر جانا
قضا کیا ہے دلی جذبات کا حد سے گزر جانا

بسکہ تھی وسعت آرائش گیتی محدود
دونوں عالم کو ترے وصل کا ساماں سمجھا

آگ تو دل کی بجھا لینے دو پھر کچھ پوچھنا
ھوش کس کو جو بتائے کیا رہا کیا جل گیا

یہ اپنا اپنا مقدر یہ اپنا اپنا نصیب　　زمانے بھر کو ھنسائے ھمیں رلائے بہار

کوئی عالم میں با وفا ھی نہیں　　اب کوئی ہم کو پوچھتا ھی نہیں

صدا یہی جرس کارواں سے آتی ہے　　چلو چلو کہ ٹھہرنے کا یہ مقام نہیں

زندگی بھی یاد رہے گی زمانے میں　　میں ہوں قفس میں روح مری آشیانے میں
مجبور ہوں کہ وعدہ خلافی پہ چپ رہوں　　پہلو سکونِ دل کا ہے اُن کے بہانے میں

ہر چند ضبط باعث اخفائے راز ہو　　یہ بات اب نہیں ہے مرے اختیار میں
پھر حسن و عشق میں تھا بھلا امتیاز کیا　　ہوتا اگر یہ دل ہی مرے اختیار میں

وہ نگاہیں کیا کہوں کیوں کر رگ جاں ہو گئیں
دل میں نشتر بن کے ڈوبیں اور پنہاں ہو گئیں
تھیں جو کل تک جلوہ افروزی سے شمع انجمن
آج وہ شکلیں چراغ زیر داماں ہو گئیں
اک نظر گھبرا کے کی اپنی طرف اُس شوخ نے
ہستیاں جب مٹ کے اجزائے پریشاں ہو گئیں
اُڑ کے دل کی خاک کے ذرے گئے جس جس طرف
رفتہ رفتہ وہ زمینیں سب بیاباں ہو گئیں
چند تصویریں مری جو مختلف وقتوں کی تھیں
بعد میرے زینت دیوار زنداں ہو گئیں
اُس کی شامِ غم پہ صدقے ہو مری صبحِ حیات
جس کے ماتم میں تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

تا چند ضبط آہ کہ رکنے لگا ہے جی　　یا آج آساں نہیں یا ہمیں نہیں

بزمِ مطرب میں کبھی سوز نہ ہو ساز نہ ہو
پردۂ ساز میں گر آپ کی آواز نہ ہو
آج صیّاد نے فرمانِ رہائی تو دیا
مگر اُن کو کہ جنھیں طاقتِ پرواز نہ ہو

جلوۂ حسن دکھانے کو وہ راضی تو ہوئے
مگر اُس کو کہ جسے طاقت دیدار نہ ہو
سالکِ راہ فنا صورت شبنم ہوں عزیز
دامنِ گل پہ بھی ٹھہروں تو اُسے بار نہ ہو

بیکار یہ غصہ ہے کیوں اُس کی طرف دیکھو
آئینے کی ہستی کیا تم اپنی طرف دیکھو

پہلے آئینہ اک نظر دیکھو پھر مرا دل مرا جگر دیکھو
کہہ کے بیمار سے یہ بجھ گئی شمع رات ہوتی ہے یوں بسر دیکھو

میری خاموشی کی شرحیں لوگ جو چاہیں کریں
درد دل مَیں کیا کہوں جب ہم زباں کوئی نہ ہو
ہے خدا جانے خیالات جنوں میں کیا اثر
ڈھونڈتا پھرتا ہوں وہ جنگل جہاں کوئی نہ ہو

یہ مشورہ بہم اُٹھے ہیں چارہ جُو کرتے
کہ اب مریض کو اچھا تھا قبلہ رو کرتے
زباں رک گئی آخر سحر کے ہوتے ہی
تمام رات کٹی دل سے گفتگو کرتے
سوادِ شہرِ خموشاں کا دیکھئے منظر
سنا نہ ہو جو خموشی کو گفتگو کرتے
یقین تھا کہ طنابیں زمیں کی کھچ جاتیں
بجدّ سعی اگر اس کی جستجو کرتے
تمام رونے کی لذت اسی پہ تھی موقوف
کہ زندگی میں کبھی تم سے گفتگو کرتے
جواب حضرتِ ناصح کو ہم بھی کچھ دیتے
جو گفتگو کے طریقے سے گفتگو کرتے

پہنچ کے حشر کے میدان میں ہول کیوں ہے "عزیز"
ابھی تو پہلی ہی منزل ہے جستجو کرتے

آج دیکھوں کششِ غم ہو کدھر سے پہلے
دل سے درد اٹھتا ہے پہلے کہ جگر سے پہلے
آنکھ ملتے ہی دگر گوں جو ہوا حال عزیز
ہائے آگاہ نہ تھا تیری نظر سے پہلے

دیکھنا میرا تری جانب عجب ہنگامہ تھا
کر دیا تو نے تماشا گاہِ حیرانی مجھے
پھر تقاضا ہے کہ چلئے بزم جاناں میں عزیز
دیکھئے اب کیا دکھائے دل کی نادانی مجھے

حسن میں اور عشق میں گر ہے تو مشکل ایک ہے
اس طرف ساری خدائی ہے ادھر دل ایک ہے
جس طرف جاتا ہوں میں کہتی ہے ناکامی عزیز
لاکھ تدبیریں ہوں لیکن سب کا حاصل ایک ہے

دل تابع کشش تھا کشش تابع جمال ہاں ہاں محبت آپ سے کی اورضرور کی

جہاں میں کاش پیدا ہی نہ ہوتے نہ بن پڑتی ہے ہنستے اور نہ روتے
عزیز اب ضبط سے بھی کام لے کچھ ارے مر جائے گا کیا روتے روتے

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی
ہجر کی رات کاٹنے والے کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی

دنیا کہاں رہے گی بتا اے نگاہ مست ایسے ہی چند دور جو ساغر کے ہو گئے

تھی صبح اور ستارے کچھ جھملا رہے تھے
بیمار شام فرقت دنیا سے جا رہے تھے

کب اکیلے اس جہاں سے ہم گئے ــ لے کے اپنے ساتھ اک عالم گئے

چند کشتوں کے تڑپنے کا سماں دیکھا ہے
مرنے والوں کو ابھی تم نے کہاں دیکھا ہے
سچ تو یہ ہے کہ جوانی میں کسے ہوش رہا
میں نے اپنا وہ زمانہ ہی کہاں دیکھا ہے
کہیں واعظ ہے، کہیں پیر خرابات عزیز
اس کو ہر رنگ میں دیکھا ہے جہاں دیکھا ہے

ہر گل میں تو ہے تجھ میں ہزاروں تجلیاں ــ دیوانہ کر دیا مجھے فصل بہار نے

وقت کم آرائش ہستی بہت ــ سخت حیرت ہے کہ کیا کیا دیکھئے

اک جہاں روئے گا بال اُن کے پریشاں ہونگے
ہائے اک روز مرے گھر میں یہ ساماں ہونگے

دل نازک کی قدر ہی کب کی ــ بات غصے سے اس نے کی جب کی
دیر و کعبہ میں فرق کیا ہے عزیز ــ صرف پابندیاں ہیں مذہب کی

کوئی کیا اشکِ ندامت کی حقیقت سمجھے
یہ وہ دریا ہے کہ جس کا نہیں ساحل کوئی

پھانس ہو تو نکال لیں احباب
خلشِ دل کو کیا کرے کوئی

ماهتاب

یہ کس نے برج زمرد سے منہ نکالا ہے
ہر اک طرف شب تاریک میں اُجالا ہے
شراب نور اُبل آئی آفتابے سے
تجلیوں کا سمندر بہا قرابے سے
تڑپ اُٹھا اثر چشم مست ساقی سے
چھلک گیا ہے جو پیمانہ دست ساقی سے
چمک ہے ماہ سبک سیر کی سواری میں
چھپا ہوا ہے کوئی بدر کی عماری میں
مگر ہے لیلئی شب کا محافۂ سیمیں
دکھا رہا ہے جھلک اپنی کوئی پردہ نشیں
اُبل پڑا ہے شب آتے ہی چشمۂ پرجوش
ہر ایک چیز زمانے کی ہے تجلی پوش
ہزار نقش طراز جہاں حجاب میں ہے
فروغِ رخ کا اثر کشتِ ماہتاب میں ہے
چڑھا ہے ایک روپہلا ورق زمانے پر
برس رہا ہے تجلی کا ابر خوش منظر
لباس نور کا پہنے ہوئے ہے پیاری رات
سحر کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے ساری رات
کوئی حسین ہے مصروف دشت گردی میں
ترنج نور ہے یا طشت لاجوردی میں
تجلیوں سے زمانہ ہوا ہے مالا مال
بغور دیکھ! یہی ہے مآل کسب کمال
یہ عکس جب ہے تو وہ محو ناز کیا ہوگا
یہ آئینہ ہے تو آئینہ ساز کیا ہوگا
دکھا رہا ہے گل یوسف اپنی تابانی
چمک اُٹھا ہے جو دامان پیر کنعانی
ہر اک طرف سر و سامان ناز پھیلایا
سمٹ کے نور نے دامان ناز پھیلایا
یہ کس کی ضو سے ستاروں کی بزم تاباں ہے
یہ کون شاہد زیبائے گوہر ستاں ہے
کہاں سے پھول یہ آیا ہے دست گلچیں میں
یہ کس نے شمع جلائی رواق رنگیں میں
ردائے نور ہے اور بزم عالم اسباب
زمانہ اوڑھے ہوئے سر پہ چادرِ مہتاب
یہ وقت اور مرا شیشہ و سبو خالی
سنوں زمانے سے آواز اشربو خالی
ہر ایک بحر میں غوطے لگائے ماہ تمام
مگر نہ ہو تو نہ ہو غرق بادۂ گلفام

شمع رسالت

(قصیدۂ نعتیہ)

اگر دیدار کا ہو شوق کہہ دو جا کے موسیٰ سے
لڑائیں کچھ دنوں آنکھیں کسی محو تماشا سے
خرام ناز نے کس کے یہ کی مشق مسیحائی
صدا آتی ہے کانوں میں لب نقش کف پا سے

ہماری خاک کے ذرے بہت بیتاب رہتے ہیں
قیامت ہے لگانا دل کسی خورشید سیما سے

کوئی یوسف لقا جب سے کہ آنکھوں میں سمایا ہے
اُچٹ جاتی ہے نیند افسانۂ خواب زلیخا سے

ہوئی ہے کس قدر گستاخ اے گرد نظر تو بھی
لپٹتی ہے جو دامان نقاب روئے زیبا سے

ارادہ ہے کہ چل کر جلوہ گاہ ناز جاناں میں
ملے تو صبر لوں قرض اب کسی محوِ تماشا سے

کھٹکتے کب نہیں اے دوست دشمن کی نگاہوں میں
وہ تن جو ہوگئے ہیں سوکھ کر فرقت میں کانٹا سے

مطلع

لڑائے ذرّہ ذرّہ کیوں نہ آنکھ آہوئے صحرا سے
کہ آبلی پڑتی ہے شوخی کسی نقشِ کفِ پا سے

خیال جنبش مژگان لیلیٰ ہے جو صحرا میں
چلا جاتا نہیں کانٹوں پہ قیسِ برہنہ پا سے

اُسی کو ڈھونڈھتا ہے جلوہ گاہ ناز ہے جس کا
میں عاجز آ گیا ہوں اب تو دل کے جوشِ سودا سے

وہ آئیں یا نہ آئیں شوق نے کی خانہ آرائی
ہوئی گلکاریٔ دل خون ارمان و تمنا سے

غبار اُس کا ابھی تک ڈھونڈھتا پھرتا ہے لیلیٰ کو
الٰہی کیا تعلق تھا دل مجنوں کو لیلیٰ سے

وہ محو بیخودی تھے دیکھتے کچھ ہوش ہی کب تھا
عبث ہے پرسش اندازِ حسنِ یار موسیٰ سے

بہار آنے پہ جب کوئی کلی کھلتی ہے لالے کی
شکست قلب مجنوں کی صدا آتی ہے صحرا سے

جہاں شاہد وحدت نے باندھی ہے ہوا ایسی
اُڑا جاتا ہے دل بن بن کے ہر ایک ذرہ صحرا سے

ہے حسن و عشق میں اک اتحاد معنوی باہم
بر آمد دونوں یہ گوہر ہوئے ہیں ایک دریا سے

بظاہر عشق ہے سر گشتۂ صحرائے بے تابی
بباطن یہ نہیں لیکن جدا حسنِ خود آرا سے

ادھر ہے شوخیوں سے حسن کو شوق حنا بندی
ادھر رنگینیاں ہیں عشق کی خون تمنا سے

قیامت کی کشش رہتی ہے حسن و عشق میں باہم
اک آفت کا تعلق عشق کو ہے حسن زیبا سے

شبِ معراج کسی خلوت میں محبوب خدا پہنچے
یہ جذب عشق تھا جس نے ملایا حسن یکتا سے

حبیب کبریا جب پردۂ اسرار تک پہنچے
جدائی دو کماں یا کم تھی کچھ حق تعالیٰ سے

نثار اس جذبۂ بے اختیار شوق پر ہر دل
پلٹ کر ایک دم میں آ گئے ہیں عرش اعلیٰ سے

محمد رحمۃ للعالمیں سر حلقۂ فطرت
مخلّے جو ہوئے ہیں خلعت یٰسین و طٰہٰ سے

اگر دریا دلی سے دیں یہ قوت ناتوناں کو
عمود آسمان بن جائیں موجیں اٹھکے دریا سے

مثال ہوش رنگِ چہرۂ تصویر اڑ جائے
بیاں ہو ایک شمّہ گر نہیب روئے زیبا سے

اگر لے سبحۂ تزویر کوئی عہد میں ان کے
جکڑ لے ہتکڑی بن کے وہ فوراً حکمِ مولا سے

کریں حکم سکوں جس دم رواں سیّال فطری پر
نہ جنبش ہو قیامت تک کبھی پانی کہ دریا سے

زر افشانی کبھی حضرت نے کی ہو گی مگر اب تک
نکل سکتی ہے چاندی ذرّہ ہائے ریگِ صحرا سے

لکھے کوئی ستم کو سیم کی صورت کرے پیدا
لکھیں عسرت تو عشرت ہو نمایاں فیض مولا سے

چمک تاروں میں خورشید و قمر میں روشنی آئی
یہ پہنچا فیض طلعت آپ کے رخسار زیبا سے

سخاوت پر جو دست فیض گستر انکا مائل ہو
طلا معدن سے نکلے گنج گوھر قعرِ دریا سے

نہ ہوتی آفرینش آپ کی مقصود اگر مولا
قیامت تک نہ پیدا کوئی ہوتا بطن حوّا سے

نہ رہتا بدر کو کاھیدگی کا خوف ھی بالکل
جو کرتا اکتساب نور حضرت کے کفِ پا سے

خلیق ایسے کہ سب اصحاب کو اپنا سمجھتے تھے
ٹپکتی ہے محبت فقرۂ سلمان منّا سے

جب ان کے جسم کا سایہ امیرالمومنیں خود تھے
زمیں پر کس طرح پھر سایہ پڑتا جسم والا سے

نہ کیونکر دست شہ سے فیض پہنچے خاکساروں کو
زمیں کا رزق ھے قطرۂ نکلتا ھے جو دریا سے

غبار راہ حضرت ناز سے اٹھ اٹھ کے کہتا ھے
مجھے نسبت نہیں گلگونہ رخسار حوّا سے

گدائے آستان شاہ کو قدرت یہ حاصل ھے
بنائے کاسۂ دریوزگی اکلیل دارا سے

نبوّتِ پر دلیل روشن و برھان قاطع ھے
قمر جو ہو گیا شق جنبش انگشت مولا سے

جو اُن کا فیض ھمت زور بخشے خاکساروں کو
ستونِ چرخ بن جائیں بگولے اٹھ کے صحرا سے

ابھی ھو روکش آئینۂ خورشید ھر ذرّہ
اگر حضرت بڑھا دیں مرتبہ ادنیٰ کا اعلیٰ سے

زمیں کو آپ کی تعظیم کی اس درجہ عادت تھی
بگولے سر و قد اٹھتے ہیں اب تک خاک صحرا سے
عزیز نکتہ سنج آخر کہاں تک بزلہ گفتاری
سُن آواز قبول آتی ہے عرش حق تعالیٰ سے
بحسنِ فکر معشوق دعا کو دے وہ آرائش
اثر جاتے ہی لپٹا لے گلے شوق و تمنا سے
جہاں میں ہے جہاں تک ربط حسن و عشق کو باہم
تعلق روح وامق کو رہے جب تک کہ عذرا سے
رہے طاقت ربا جب تک اشارہ چشم دلبر کا
رہے بے چین روح قیس جب تک نام لیلیٰ سے
رہے اسلام روشن دھر میں خورشید کی صورت
الٰہی تیرگی ہو کفر کی نابود دنیا سے

ایک قطعہ

پہاڑ سے کوئی اترا ہے رہبری کے لئے — چلا ہے سوئے جہاں بندہ پروری کے لئے
اس انتخاب سے ثابت ہوا وجودِ خدا — کہ ایسی ذات کو چھانٹا پیمبری کے لئے

ایک رباعی

تفسیر کتاب دیں پناہی تو ہے — زینت دہ تخت بادشاہی تو ہے
واللہ کہ اے شہید دشت غربت — مجموعۂ اخلاقِ الٰہی تو ہے

مولانا حسرت موہانی

سید فضل الحسن نام، حسرت تخلص ''رئیس المتغزّلین'' خطاب، سید اظہر حسن کے صاحبزادے ۱۸۷۵ء میں موہان ضلع آناؤ (یو۔ پی) میں پیدا ہوئے۔ حسرت کا سلسلۂ نسب امام علی موسیٰ رضا سے ملتا ہے۔ امام رضا کی اولاد میں سے ایک بزرگ سید محمود نیشا پوری نے، جو حسرت کے جدّ اعلیٰ تھے، موہان میں سکونت اختیار کی اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ حسرت کی ابتدائی تعلیم موہان کے ایک مکتب میں ہوئی اور وہیں سے انہوں نے ۱۸۹۴ء میں اردو مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اسکے بعد موہان سے فتحپور گئے اور گورنمنٹ اسکول میں انگریزی تعلیم شروع کی۔ لیکن اسکول کے اوقات کے علاوہ وہ مولانا سید ظہور الاسلام سے عربی اور حضرت نیاز کے والد سے فارسی بھی پڑھتے رہے۔ ۱۸۹۵ء میں انٹرنس کرنے کے بعد علیگڑھ چلے گئے اور ۱۹۰۳ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ سید سجاد حیدر یلدرم اور مولانا شوکت علی اُن کے ساتھیوں میں سے تھے۔

حسرت کی سیاسی دلچسپی درحقیقت کالج ہی کے زمانے سے شروع ہو چکی تھی چنانچہ ارباب کالج انہیں اچھی نگاہوں سے نہ دیکھتے تھے۔ گریجویٹ ہونے کے بعد انہوں نے ''اردوئے معلیٰ'' جاری کیا اور اسی زمانے سے عملی سیاست میں حصہ لینے لگے جس کے نتیجہ میں انہیں حکومت نے باغی قرار دیکر کئی بار قید با مشقت کی سزا بھی دی۔ جس کی طرف انہوں نے اپنے ایک شعر میں مزاحیہ انداز میں اشارہ بھی کیا ہے۔

ہے مشق سخن جاری چکّی کی مشقت بھی   اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرت سودیشی تحریک کے بڑے زبردست حامیوں میں سے تھے اور آخر عمر تک انہوں نے کوئی ولایتی چیز استعمال نہیں کی۔ اپنے مذہبی عقاید پر انہوں نے خود ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے کہ ''میں قدامت پرست سنی اور صوفی ہوں۔ تصوف کو مذہب کا جوہر سمجھتا ہوں اور تصوف کا ماحصل میرے نزدیک جذبۂ عشق[1] ہے''

---

[1] حسرت موہانی از عبدالشکور۔

حسرت کی زندگی بڑی درویشانہ بلکہ قلندرانہ قسم کی تھی اور مزاج میں قناعت و استغنا کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا ۔ وہ بڑی سادی وضع کے انسان اور دنیاوی لحاظ سے بڑی مختصر تمنائیں رکھتے تھے ۔ شاید اسی لئے اُن پر کبھی مایوسی کی کیفیت طاری نہیں ہوئی اور اُنھوں نے سخت سے سخت مصائب کا بڑی خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا ۔

مولانا حسرت بڑے وضع دار اور پختہ طبیعت کے انسان تھے ۔ چنانچہ زندگی میں ایک مرتبہ جس سے اُن کا تعلق پیدا ہو گیا وہ نہ صرف کبھی منقطع نہ ہوا بلکہ اپنی مخصوص نہج پر ہمیشہ قائم رہا ۔ وہ بڑے منکسرالمزاج ،خوش طبع اور صلح کل بزرگ تھے۔ نماز روزہ کی بڑی سختی سے پابندی کرتے تھے مگر اس کے باوجود اُن میں کبھی زاھدانہ پندار پیدا نہ ہوا ۔

موصوف نے ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو ۷۵ سال کی عمر میں لکھنو میں وفات پائی ۔ اور انوار باغ لکھنو میں اپنے پیر و مرشد مولانا عبدالوہاب صاحب خلف الصدق مولانا شاہ عبدالرزاق صاحب فرنگی محلی کے پائیں سپرد خاک ہوئے ۔

حسرت شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ جیسا کہ پہلے کہا گیا ھے ایک عظیم انسان بھی تھے ۔ بنا بریں اُنکے یہاں شعرو انسانیت کا جیسا دلکش امتزاج پایا جاتا تھا وہ اپنی نظیر آپ ھے ۔ محض شاعر ہونے کی حیثیت سے وہ کوئی مفکر شاعر نہ تھے ۔ اُنکی شاعری یکسر اسی دنیا کی عاشقانہ شاعری تھی اور اُنھوں نے تمام عمر جو کچھ کہا غزل کی حدود کے اندر رہ کر کہا ۔ لیکن اس رنگ میں یقیناً وہ قدر اول کے شاعر تھے ۔ اُن کی کلیات تقریباً سات ہزار اشعار پر مشتمل ھے اور بقول حضرت نیاز فتحپوری سخت سے سخت انتخاب کے بعد بھی اُن میں چھ سات سو اشعار ھم کو ضرور مل جاتے ھیں ۔

حسرت کا نام اُردو شاعری میں غزل کے احیاء کے باعث ہمیشہ زندہ رھیگا ۔ اُردو غزل کے دور جدید میں جب غزل گوئی کے تمام اسالیب ختم ہوتے نظر آ رھے تھے اور متاخرین کے ھاتھوں معنوی اعتبار سے غزل نہ صرف بے جان ہو چکی تھی بلکہ اس پر ایک سوگواری کی کیفیت طاری تھی ، حسرت نے اُس کے جسد بے جان میں ایک نئی روح پھونکی ۔ اُسے زندگی سے زیادہ قریب کیا ۔ جسکا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اُس میں ایک نئی شگفتگی ، جولانی ، رنگینی ، رعنائی اور نکھار پیدا ہوا ۔ اُن کے تغزل میں کوئی خیال آفرینی یا جدت طرازی نہ ہوتے ہوئے بھی ایک نیا تاثر ضرور ھے ۔ اور ایسا محسوس ہوتا ھے کہ لکھنوی تکلف و تصنع یا گور و کفن کے راگ سے الگ ایک نئی لے چھیڑی گئی ھے جو نئی ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی پختہ و گمبھیر بھی ھے ۔ حسرت کی آواز اپنی تمام ندرت اور تازگی کے باوجود اُردو غزل کی روایت عظمیٰ کی ایک ایسی یادگار ھے جو نئی نسل کے غزل سراؤں کے لئے نمونہ بنی ۔ زندہ ماضی کسے کہتے ھیں ؟ ھم اپنی پرانی میراث کو لے کر ترقی کے راستے میں نیا قدم کیسے اُٹھا سکتے ھیں ؟ اس سوال کا بہترین جواب جہاں تک غزل کا تعلق ھے حسرت کی شاعری ھے ۔ حسرت کو شاعری میں تسلیم لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا ۔ تسلیم کا سلسلہ نسیم دھلوی کے توسط سے حکیم مومن خاں مومن دھلوی تک پہونچتا ھے ۔ لیکن حسرت پر اس سلسلے کے علاوہ دوسرے اساتذہ کا بھی اثر پڑا ھے چنانچہ خود کہتے ھیں ۔

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن طبع حسرت نے آٹھایا ھے ھر آستاد سے فیض

اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی نہ جانے کتنے اساتذۂ فن تھے جن سے وہ متاثر و مستفیض ہوئے ۔ حسرت کے کلام میں ایسے اشعار کافی تعداد میں مل جائینگے جن پر ان اساتذہ کے رنگ کا دھوکا ھوتا ھے لیکن یہ دھوکا محض سطحی ھے ۔ جسکا تعلق آسلوب سے زیادہ ھے اور شعر کے اصلی مزاج سے کم ۔ اصلی مزاج کے اعتبار سے حسرت کا ھر شعر خواہ وہ میر و درد کی یاد دلائے ' خواہ غالب و مومن کی ' چاھے جرائت و مصحفی کی اور چاھے امیر و داغ کی اپنے اندر ایک شدید انفرادیت بھی رکھتا ھے ۔ جس کو ھم صرف حسرت ھی سے منسوب کر سکتے ھیں ۔ اور حسرت کی یہ وسعت ذوق و نظر اور ھمہ گیری درحقیقت آنکی بہت بڑی خصوصیت ھے جس سے پتہ چلتا ھے کہ آنہوں نے اپنے نفس شعری کی تہذیب و تربیت میں کس درجہ ریاضت سے کام لیا ھے ۔

حسرت کے تغزل میں حسن پرستی ایک بنیادی حیثیت رکھتی ھے ۔ لیکن آن کا یہ جذبہ روایتی یا تصوری نہیں حقیقی ھے ۔ آسکی نوعیت انسانی ھے اور اس انسانی حسن کو وہ صنف لطیف میں دیکھتے ھیں ۔ چنانچہ آنکی غزل میں تمام تر نسوانی حسن کا تذکرہ ھے ۔ اس طرح حسرت نے اپنے شعری محبوب اور عام زندگی میں ایک مطابقت پیدا کی ھے ۔ اور یقیناً یہ اسی صحت مند تصور کا نتیجہ ھے کہ آنکی شاعری متاخرین کی ھوس پرستی کے مقابلے میں بے حد ممتاز اور بلند نظر آتی ھے ۔

غزل میں زبان کو بڑا دخل ھوتا ھے اور حسرت کو زبان پر بڑا عبور حاصل تھا ۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ روزمرہ ' محاورہ ' ضرب الامثال یا رعایات لفظی کے کھپانے پر قادر تھے بلکہ زبان کو بے تکلف استعمال کرنے کا آنہیں بڑا ملکہ تھا ۔ آنکے یہاں ھر جذبہ اور ھر خیال اپنی زبان اپنے ساتھ لاتا ھے اور ایسا محسوس ھوتا ھے کہ جس واقع کو آنہوں نے جن الفاظ میں بیان کر دیا ھے اس سے زیادہ بھر پور اور دلنشین انداز میں دوسرے الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ بحیثیت مجموعی حسرت کی زبان بڑی شستہ و رفتہ اور آن کا طرز بیان نہایت رواں اور شگفتہ و خوش نما ھے ۔ آنکی نرالی ترکیبیں ' بولتے ھوئے فقرے ' بانکے اور اچھوتے ٹکڑے از بس پرکیف اور وجد آور ھیں جو سننے والے کے دل میں تیر کی طرح آتر جاتے ھیں ۔ اور سچ پوچھئے تو میر کے بعد غزلگو شعرا نے اپنی غزلوں میں ایسی دلکش اور شیریں زبان بہت کم استعمال کی ھے ۔

حسرت کے تغزل کی یہی نمایاں خصوصیات ھیں جن کی بدولت وہ اپنی زندگی ھی میں قابل رشک بن گئے ۔ آردو شاعروں میں سوائے دو ایک کے کسی غزلگو شاعر کو اپنی زندگی میں اتنی شہرت و مقبولیت حاصل نہیں ھوئی جتنی حسرت کے حصے میں آئی ۔ حسرت نے اپنے تغزل کی فسوں کاری سے آردو غزل کے دھارے کا رخ موڑ دیا اور آسے فن کی نئی دنیاؤں سے روشناس کرایا ۔ اس اعتبار سے ھم کہہ سکتے ھیں کہ حسرت نہ صرف غزل کا احیاء کرنے والے ھیں بلکہ آردو شاعری میں وہ ایک نئے دبستان شاعری کے بانی ھیں ۔ جس کا اصل اصول ذاتی جذبات اور ماحول کے حالات کو غزل میں پوری نمائیدگی عطا کرنا ھے ۔

حسرت کی شاعری سے قطع نظر اُن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے اساتذۂ قدیم کے دواوین فراہم کر کے اُن کا انتخاب شایع کیا اور اُن کی اس سعی و کوشش کی بدولت بہت سے اساتذہ کا کلام محفوظ ہو گیا ہے۔ فنی حیثیت سے نکات سخن، محاسن سخن اور معائب سخن پر اُن کے رسالے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ۴۰ سال تک ''اُردوئے معلیٰ'' جیسے ادبی پرچے کا جاری رکھنا بجائے خود ایک عظیم خدمت ہے جسے تاریخ ادب اُردو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔

انتخاب کلام

دیکھنا بھی تو اُنھیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا
اک نظر بھی تری کافی تھی پئے راحت جاں
کچھ بھی دشوار نہ تھا مجھ کو شکیبا کرنا
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے ''حسرت''
اُن سے مل کر بھی نہ اظہار تمنّا کرنا

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنّا کر دیا
بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

جان پر غم نے بھی الزام لگایا نہ اُنہیں یاس کو خوبیٔ تقدیر سے منسوب کیا
سخت محروم ادب ہے، دل حسرت نے اگر بے وفائی سے ترے جور کو منسوب کیا

شکوہ غم ترے حضور کیا
ہم نے بے شک بڑا قصور کیا
درد دل کو تری تمنا نے
خوب سرمایۂ سرور کیا
یہ بھی اک چھیڑ ہے کہ قدرت نے
تم کو خود بیں ہمیں غیور کیا
آپ نے کیا کیا کہ ''حسرت'' سے
نہ ملے حسن کا غرور کیا

سب سے شوخی ہے اک ہمیں سے حیا　　اے فریب نگاہ یار یہ کیا ؟
اب وہ ملتے بھی ہیں تو یوں کہ کبھی　　ہم سے کچھ واسطا نہ تھا گویا

رہے محو خواب ہوس اہل ظاہر　　گزر بھی گیا کاروان محبت
نہ سمجھا سوا حسن کے اور کوئی　　بیان تمنا ، زبان محبت
سر عجز ''حسرت'' بھی خم کیوں نہ ہوتا　　ترا ناز ہے حکمران محبت

بسکہ زیب انجمن ہے جلوۂ جانانہ آج　　ہے سراپا آرزو ہر عاشق دیوانہ آج
یہ ہوا بے تابیوں پر نشۂ مے کا اثر　　کہہ دیا سب اُن سے حال شوق گستاخانہ آج
ہے فروغ بزم یکتائی جو وہ شمع جمال　　آ گئی ہے دل میں بھی بیتابئی پروانہ آج
میں ہی اے حسرت نہیں محو جمال روئے یار　　پڑ رہی ہیں سب نگاہیں اُسپہ مشتاقانہ آج

نہ چھیڑ اے ہمنشیں کیفیت صہبا کے افسانے
شراب بے خودی کے مجھکو ساغر یاد آتے ہیں
نہیں آتی تو یاد اُنکی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

اب تو آتا ہے یہی جی میں کہ اے محو جفا
کچھ بھی ہو جائے مگر تیری تمنّا نہ کریں
شکوۂ جور ، تقاضائے کرم ، عرض جفا
تم جو مل جاؤ کہیں ہم کو تو کیا کیا نہ کریں
حال کھل جائے گا بے تابئی دل کا حسرت
بار بار آپ اُنھیں شوق سے دیکھا نہ کریں

لطف کی اُن سے التجا نہ کریں　　ہم نے ایسا کبھی کیا نہ کریں
دل رہے گا جو اُن سے ملنا ہے　　لب کو شرمندۂ دعا نہ کریں
صبر مشکل ہے آرزو بیکار　　کیا کریں عاشقی میں کیا نہ کریں

باقی نہیں اک تار بھی دامن میں جو حسرت　　اب اہل جنوں فکر گریباں میں لگے ھیں

نگاہ یار جسے آشنائے راز کرے　　وہ اپنی خوبئی قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے
دلوں کو فکر دو عالم سے کر دیا آزاد　　ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد　　جو چاھے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے
اُمید وار ھیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ　　تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

عرض کرم پہ ترکِ جفا بھی نہ کیجئے　　ایسا نہ ہو کہ آپ ملا بھی نہ کیجئے
اُس بے وفا سے مصلحت شوق ھے یہی　　اپنی ستم کشی کا گلا بھی نہ کیجئے
منظور ھے جو ترک محبت ھی آپکو　　ہم پر ھجوم ناز و ادا بھی نہ کیجئے
حسرت یہ کیا ستم ھے کہ اک بت کے عشق میں　　تو چاھتا ھے یاد خدا بھی نہ کیجئے

زھے نصیب جو ھو میرے حال کو بھی نصیب
وہ ابتری جو تری زلف پر شکن میں رھے
ادب کا ھے یہ تقاضا کہ تیرے شوق کی بات
سنے نہ کوئی، مرے دل میں یا دھن میں رھے

آئینے میں وہ دیکھ رھے تھے بہار حسن　　آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے
ٹوکا جو بزم غیر سے آتے ھوئے اُنھیں　　کہتے بنا نہ کچھ وہ قسم کھا کے رہ گئے

جامہ زیبی نہ پوچھئے اُنکی　　جو بگڑنے میں بھی سنور جائے
شب وھی شب ھے دن وھی دن ھے　　جو تری یاد میں گذر جائے
گریۂ شام سے تو کچھ نہ ھوا　　اُن تک اب نالۂ سحر جائے
شعر در اصل ھے وھی حسرت
سنتے ھی دل میں جو اُتر جائے

یاد ھیں سارے وہ عیش بافراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغاز الفت کے مزے

حسن سے اپنے وہ غافل تھے، میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے
صحتیں لاکھوں مری بیماریٔ غم پر نثار
جس میں آٹھے بارہا اُن کی عیادت کے مزے

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں
بے زبانی، ترجمان شوق بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیش یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں
مٹ رہی ہیں دل سے یادیں روزگار عیش کی
اب نظر کاھے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں
التفات یار تھا اک خواب آغاز وفا
سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں
تیری بے صبری ہے حسرت خام کاری کی دلیل
گریۂ مشتاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں

پہلے آنکھیں ہوئیں گرویدہ پھر آنکھوں کی طرح
چاھنے دل بھی لگا آپ کو دیکھا دیکھی

کہیں وہ آ کے مٹا دیں نہ انتظار کا لطف
کہیں قبول نہ ہو جائے التجا میری

خندۂ اہل جہاں کی مجھے پروا کیا تھی
تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی

چل بھی دیئے وہ چھین کے صبر و قرارِ دل
ہم سوچتے ہی رہ گئے یہ ماجرا ہے کیا

شرح بے مہرئ احباب کہوں کیا حسرت
رنج ایسا دل مایوس کو کم پہنچا تھا

ملتے ہیں اس ادا سے کہ گویا خفا نہیں
کیا آپ کی نگاہ سے میں آشنا نہیں

شائد وہ یاد کرتے ہیں مجھ کو کہ اور بھی
تکلیف اضطراب کی شدت ہے آج کل

عہد یک عمر فراغت سے بھی خوشتر گزرا
وہ جو اک لحظہ تری یاد میں ہم پر گزرا

یاد کر وہ دن کہ تیرا کوئی شیدائی نہ تھا
باوجود حسن تو آگاہِ رعنائی نہ تھا
عشق روز افزوں پہ اپنے مجھ کو حیرانی نہ تھی
جلوۂ رنگیں پہ تجھکو ناز یکتائی نہ تھا
دید کے قابل تھی میرے عشق کی بھی سادگی
جبکہ تیرا حسن سرگرم خود آرائی نہ تھا
کیا ہوئے وہ دن کہ محو آرزو تھے حسن و عشق
ربط تھا دونوں میں گو ربط شناسائی نہ تھا
تو نے حسرت کی عیاں تہذیب رسم عاشقی
ورنہ پہلے اعتبار شان رسوائی نہ تھا

دل کو خیال یار نے مخمور کر دیا ساغر کو رنگ بادہ نے پُر نور کر دیا
مانوس ہو چلا تھا تسلی سے حال دل پھر تو نے یاد آ کے بدستور کر دیا
گستاخ دستیوں کا نہ تھا مجھ میں حوصلہ لیکن ھجوم شوق نے مجبور کر دیا
بے تابیوں سے چھپ نہ سکا ماجرائے دل آخر حضور یار بھی مذکور کر دیا
حسرت بہت ہے مرتبۂ عاشقی بلند
تجھ کو تو مفت لوگوں نے مشہور کر دیا

کوئی اُنکی بزمِ جمال سے کب اُٹھا خوشی سے ' کہاں اُٹھا
جو کبھی اُٹھا بھی اُٹھائے سے تو اُسی طرف نگراں اُٹھا
اثر تغافل یار سے شب تار ھجر میں دفعتاً
ھوئیں سوز غم کی یہ کثرتیں کہ دل و جگر سے دھواں اُٹھا
ھے عجیب دلکش و جانفزا ترے کوئے حسن کا ماجرا
کہ اثر سے قوتِ عشق کے میں گرا تھا پیر جواں اُٹھا
میں وہ رند بادہ پرست ہوں کہ ھوا جو میکدے میں گزر
پئے خیر مقدم ادھر سے میں تو اُدھر سے پیر مغاں اُٹھا
کوئی عشق بازی کا مشغلہ نہیں کھیل اے دل مبتلا
مگر اب کیا ھے یہ حوصلہ تو خوشی سے نازِ بتاں اُٹھا
یہ سزا کہاں یہ جزا ھوئی بخلاف خواهش مدعی
پئے قتل حسرت ملتجی خود اگر وہ جان جہاں اُٹھا

رنگ سوتے میں چمکتا ھے طرح داری کا — طرفہ عالم ھے ترے حسن کی بیداری کا
جور پیہم نہ کرے شان تغافل پیدا — دیکھ بدنام نہ ھو نام ستم گاری کا

سیہ کار تھے ' با صفا ھو گئے ھم — ترے عشق میں کیا سے کیا ھو گئے ھم
نہ جانا کہ شوق اور بھڑکے گا میرا — وہ سمجھے کہ اس سے جدا ھو گئے ھم
جب ان سے ادب نے نہ کچھ منہ سے مانگا — تو اک پیکر التجا ھو گئے ھم
دم واپسیں آئے پرسش کو ناحق — بس اب جاؤ تم سے خفا ھو گئے ھم

بلا کشانِ غم انتظار ھم بھی ھیں — خراب گردش لیل و نہار ھم بھی ھیں
دل ھوس جو نشانہ تری نظر کا ھوا — تو روح شوق پکاری شکار ھم بھی ھیں
نگاہ یار سے اظہار التفات ھوا — تو حال دل نے کہا آشکار ھم بھی ھیں
شکایت اُن کی نہ چاھو یہی کہو حسرت — نشانۂ ستم روزگار ھم بھی ھیں

ستم ھو جائے تمہیدِ کرم ایسا بھی ھوتا ھے
محبت میں بتا اے ضبط غم ایسا بھی ھوتا ھے
جلا دیتی ھیں سب رنج و الم حیرانیاں میری
تری تمکینِ بے حد کی قسم ایسا بھی ھوتا ھے

جفائے یار کے شکوے نہ کر اے رنج ناکاسی
آمید و یاس دونوں ہوں بہم ایسا بھی ہوتا ہے
وقار صبر کھویا گریہ ہائے بے قراری نے
کہیں اے اعتبار چشم نم ایسا بھی ہوتا ہے
بہ دعوائے وفا کیوں شکوہ سنج جور ہے حسرت
دیار شوق میں اے محو غم ایسا بھی ہوتا ہے

توڑ کر عہد کرم نا آشنا ہو جائیے
بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے
میرے عذر جرم پر مطلق نہ کیجیے التفات
بلکہ پہلے سے بھی بڑھکر کج ادا ہو جائیے
خاطر محروم کو کر دیجیے محو الم
درپئے ایذائے جانِ مبتلا ہو جائیے
میری تحریر ندامت کا نہ دیجے کچھ جواب
دیکھ لیجیے اور تغافل آشنا ہو جائیے
مجھ سے تنہائی میں گر ملئے تو دیجے گالیاں
اور بزم غیر میں جانِ حیا ہو جائیے
جی میں آتا ہے کہ اُس شوخ تغافل کیش سے
اب نہ ملئے پھر کبھی اور بے وفا ہو جائیے
ہائے ری بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہومگر
اُس سراپا ناز سے کیوں کر خفا ہو جائیے

جذبۂ شوق کدھر کو لئے جاتا ہے مجھے
پردۂ راز سے کیا تم نے پکارا ہے مجھے
اُس جفا کار سے ملنے کی تمنا ہے مجھے
اب بھی میں کچھ نہیں کہتا یہی کہنا ہے مجھے
التفاتِ نگہ یار کے لائق میں کہاں
مجھ سے بیگانہ رہیں وہ یہی اچھا ہے مجھے
مجھ سے بیکار وہ ظاہر میں خفا ہیں حسرت
جب میں چاہوں گا منا لوں گا یہ دعویٰ ہے مجھے

قسمت شوق آزما نہ سکے
اُن سے ہم آنکھ بھی ملا نہ سکے
دل میں کیا کیا تھے عرض حال کے شوق
اُس نے پوچھا تو کچھ بتا نہ سکے
ہم تو کیا بھولتے آنھیں ''حسرت''
دل سے وہ بھی آنھیں بھلا نہ سکے

غزل مسلسل

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے
با ہزاراں اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق
تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے

بار بار اٹھنا اسی جانب نگاہ شوق کا
اور ترا غرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے

تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بےباک ہوجانا مرا
اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے

کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا ' دفعتاً
اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے

جان کر سوتا تجھے وہ قصد پابوسی مرا
اور ترا ٹھکرا کے سر وہ مسکرانا یاد ہے

تجھ کو جب تنہا کبھی پانا تو از راہ لحاظ
حال دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے

جب سوا میرے تمہارا کوئی دیوانہ نہ تھا
سچ کہو کچھ تمکو بھی کیا وہ زمانہ یاد ہے

غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف
وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے

آ گیا گر وصل کی شب بھی کہیں ذکر فراق
وہ ترا رو رو کے مجھ کو بھی رلانا یاد ہے

دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لئے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

آج تک نظروں میں ہے وہ صحبت راز و نیاز
اپنا جانا یاد ہے تیرا بلانا یاد ہے

میٹھی میٹھی چھیڑ کر باتیں نرالی پیار کی
ذکر دشمن کا وہ باتوں میں اڑانا یاد ہے

دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سو ناز سے
جب منا لینا تو پھر خود روٹھ جانا یاد ہے

چوری چوری ہم سے تم آکر ملے تھے جس جگہ
مدتیں گذریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے

شوق میں مہندی کے وہ بے دست وپا ہونا ترا
اور مرا وہ چھیڑنا وہ گد گدانا یاد ہے

باوجود ادعائے اتقا حسرت مجھے
آج تک عہد ہوس کا وہ فسانہ یاد ہے

فانی بدایونی

شوکت علی خاں نام فانی تخلص ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو قصبہ اسلام نگر ضلع بدایوں میں پیدا ہوئے ۔ اُن کے بزرگ شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں دھلی آئے ۔ جدامجد نواب بشارت خاں صوبۂ بدایوں کے گورنر تھے ۔ فانی کے والد ماجد شجاعت علی خاں سرکار انگریزی کے زمانے میں محکمہ پولیس میں انسپکٹر تھے ۔ غرض فانی نے ایک ایسے فارغ البال اور کھاتے پیتے گھرانے میں آنکھ کھولی ۔ جہاں ابتدائے عمر میں اُنہیں راحت و آسائش کے تمام اسباب حاصل رہے ۔ غدر سے پہلے اُن کا خاندان اچھا خاصا جاگیردار تھا اور غدر میں تلف ہونے کے بعد بھی جو جائداد فانی کے تصرف میں آئی وہ ایسی تھی کہ اگر اُن کی جگہ کوئی ہوش مند دنیا دار ہوتا تو آئندہ کئی پشت تک نہ صرف فراغت کے ساتھ بسر ہوسکتی تھی بلکہ امارت کی وضع بھی نباھی جا سکتی تھی ۔

فانی نے تقریباً تیرہ سال کی عمر تک روش زمانہ کے مطابق مکتب میں عربی، اردو اور فارسی پڑھی ۔ اسکے بعد انگریزی شروع کی اور ۱۹۰۱ء میں بریلی کالج سے بی ۔ اے کا امتحان پاس کیا ۔ کالج چھوڑنے کے بعد کچھ نجی مشکلات فانی کے سد راہ ہوئیں۔ یہ زمانہ اُن کےلئے آرام و آسائش کا زمانہ نہ تھا تاھم شعر و سخن جس کی طرف بچپن ھی سے اُن کی طبیعت مائل تھی، اس زمانہ میں بھی اُن کی دلچسپی و تسکین کا مشغلہ بنے رہے ۔ ۱۹۰۶ء تک اُن کے یہ مشاغل جاری رہے جس کی وجہ سے ابتدائی دور کی غزلوں کا کافی ذخیرہ جمع ہوگیا ۔ پھر اُن کی طبیعت قانون کی طرف متوجہ ہوئی چنانچہ اُس کی با ضابطہ تعلیم کیلئے وہ علیگڈھ کالج میں داخل ہو گئے اور ۱۹۰۸ء میں ایل، ایل، بی کی ڈگری حاصل کی اس کے بعد عرصہ تک لکھنؤ اور پھر بریلی میں وکالت کرتے رہے ۔ بحیثیت مجموعی فانی کی زندگی اُن کی تمام قابلیت و ذھانت کے باوجود بڑی عسرت و درماندگی میں بسر ہوئی ۔ لیکن اسے جس وقار، متانت، فراخدلی و خندہ پیشانی کے ساتھ اُنہوں نے برداشت کیا وہ اُنھیں کا کام تھا ۔ فانی طبعاً فراخ دل، فراخ حوصلہ اور فراح دست انسان تھے ۔ ھر شخص کو اپنا سمجھ کر اُس پر بے دریغ صرف کرتے تھے اور شاید اسی کشادہ دلی کے باعث اُن کے دیکھتے دیکھتے ساری متروکہ جائداد ختم ہو گئی ۔

تاهم سب کچھ ضائع ہو جانے کے بعد بھی اُن کی زندگی کا طرز اور اُس کا معیار وھی رہا ۔ فانی نے ۲۷ اگست ۱۹۴۱ء کو انتقال کیا ۔

فانی اُردو کے اُن چند غزل گو شعرا میں سے ھیں جنھیں شاعری میں اپنے ذوق طبع کے سوا کسی اُستاد کے آگے زانوئے شاگردی تہ نہیں کرنا پڑا ۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا اور بیس بائیس سال کی عمر میں اُن کا ایک پورا دیوان مرتب ہو گیا ۔ ۱۹۰۶ء میں جبکہ اُن کی عمر صرف ۲۷ سال کی تھی دوسرا دیوان بھی تیار ھو گیا لیکن افسوس کہ یہ دونوں دیوان محفوظ نہ رہ سکے اور نہ اُن کے چھپنے کی نوبت آئی ۔ پھر ۱۹۱۷ء تک کا زمانہ بڑی اُلجھنوں و پریشانیوں میں گزرا ۔ اس گیارہ سال کے وقفہ میں فانی شعر و سخن کی دنیا سے بیگانہ رھے ۔ ۱۹۱۷ء کے بعد جو کچھ اُنھوں نے کہا وہ چند پرانی غزلوں کے ساتھ وحید احمد گیلانی مدیر رسالہ ''نقیب'' نے فانی کے پہلے دیوان کی شکل میں شائع کیا ۔ دوسرا دیوان ''باقیات فانی'' کے نام نے ۱۹۲۶ء میں طبع ھوا ۔

فانی نے اپنے اظہار خیال کیلئے صنف غزل کا انتخاب کیا ۔ جو قطعی تقلیدی یا اضطراری نہیں بلکہ فطری عمل تھا ۔ وہ ایک غم رسیدہ ' بیزار و بے دل شخص تھے جو اس سماج کے انسان نما حیوانوں سے بات کرنے سے گھبراتے تھے بلکہ اپنے دل کا حال اپنی آنکھوں سے چھپاتے تھے ۔ ظاھر ھے ایسا شخص نظم کی تفصیل گوارا نہ کرتے ھوئے ایسی ھی صنف کو پسند کریگا جس میں اختصار ' ابہام اور اشاریت کی کارفرمائی ھو ۔ یہی وجہ ھے کہ فانی نے صرف غزل میں طبع آزمائی کی اور اپنے تاثرات و تجربات کو ایسے مکمل و منفرد رنگ میں پیش کیا جو بالاخر اُن کی ذات سے مخصوص ھو کر رہ گئے ۔

فانی کے ابتدائی زمانۂ شاعری میں داغ اُردو شاعری کی دنیا پر چھائے ھوئے تھے یہی وجہ ھے کہ فانی اپنے تمام غم و الم اور انفرادیت کے باوجود حضرت داغ کے رنگ کی زد سے نہ بچ سکے۔ لیکن یہ رنگ اُن پر زیادہ دن تک غالب نہ رہ سکا ۔ چونکہ وہ احساس و تاثر کی بڑی شدید صلاحیت اور فکر و تامل کا نہایت قوی میلان لیکر پیدا ھوئے تھے ۔ لہذا اُنھوں نے کچھ شعوری اور بیشتر غیر شعوری طور پر میر و غالب کا اتباع کیا ۔ جن سے اُن کی فطری مناسبت تھی ۔ دوسرے دور کے شروع میں فانی کے یہاں میر کا مہذب و سنجیدہ سوز و گداز بہت زیادہ نمایاں ھے ۔ لیکن آگے چل کر یہ سوز و گداز غالب کی فلسفیانہ بالغ نظری اور مفکرانہ بصیرت کے ساتھ حل ھو کر بالکل نیا مرکب بن گیا ھے جس کی مثال فانی سے پہلے اُردو غزل میں نہیں ملتی ۔

یوں تو اُردو غزل کو قنوطیت کا مرادف سمجھا گیا ھے اور پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب نے فانی کو ''یاسیات کا امام'' مان لیا ھے لیکن حقیقت یہ ھے کہ جس طرح فانی نے موت کو ایک کائناتی حقیقت اور غم کو ایک بسیط آفاقی عنصر بنا کر پیش کیا ھے وہ اپنی مثال آپ ھے ۔ اس پر طرہ یہ کہ اُن کے اسلوب میں بڑی تربیت یافتہ نزاکتیں اور زبان میں ایک رچا ھوا نکھار پایا جاتا ھے ۔ اُن کے لہجہ میں جو پر گداز

متانت و گہری سنجیدگی ہے وہ ہمارے متغزلین میں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہے بالخصوص غزل کے دور جدید میں تو ایسی گہری شعریت اور ایسی بلیغ نغمگی عنقا ہے۔ انہیں خصوصیات کی بدولت فانی کے اشعار بالکل منفرد بھی ہیں اور پر تاثیر بھی۔

انتخاب کلام

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا
مختصر قصۂ غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں
رازِ کونین خلاصہ ہے اس افسانے کا
ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میّت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

دعا گدائے اثر ہے، گدا پہ تکیہ نہ کر
کہ اعتماد اثر کیا ملا ملا نہ ملا
نشانِ سہر ہے ہر ذرہ ظرف سہر نہیں
خدا کہاں نہ ملا اور کہیں خدا نہ ملا
مری حیات ہے محروم مدعائے حیات
وہ رہ گزر ہوں جسے کوئی نقش پا نہ ملا

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری امیدیں ٹوٹ گئیں، دل بیٹھ گیا، جی چھوٹ گیا
فصل گل آئی یا اجل آئی کیوں در زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا
منزل عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا
فانیؔ ہم تو جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

ملا ازل میں مجھے میری زندگی کے عوض — وہ ایک لمحہ ہستی کہ صرف خواب ہوا
وہ جلوہ مفت نظر تھا ، نظر کو کیا کہئے — کہ پھر بھی ذوق تماشا نہ کامیاب ہوا

وہ بدگماں کہ مجھے تاب رنج زیست نہیں — مجھے یہ غم کہ غم جاوداں نہیں ملتا

ہم کو مرنا بھی میسر نہیں جینے کے بغیر — موت نے عمر دو روزہ کا بہانہ پایا

اب نئے سر سے چھیڑ پردۂ ساز — میں ہی تھا ایک دکھ بھری آواز
کھل گیا میری زندگی کا راز — اے شب ہجر تیری عمر دراز
صور و منصور و طور ارے توبہ ! — ایک ہے تیری بات کا انداز

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا — بات پہنچی تری جوانی تک

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم — رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

سنتے تھے محبت آساں ہے ، واللہ بہت آساں ہے مگر
اس سہل میں جو دشواری ہے وہ مشکل سی مشکل میں نہیں
جب ڈوبنے والے ڈوب چکے اور ساحل و دریا ایک ہوئے
پھر لطف امید و بیم کہاں دریا میں نہیں ساحل میں نہیں

بہار لائی ہے پیغام انقلاب بہار — سمجھ رہا ہوں میں کلیوں کے مسکرانے کو
یہ شعبدے یہ کرشمے کسے میسر تھے — تری نگاہ نے سکھلا دئے زمانے کو
خیال یار بھی کھویا ہوا سا رہتا ہے — اب آن کی یاد بھی آتی ہے بھول جانے کو

ہاں ناخن غم کمی نہ کرنا — ڈرتا ہوں کہ زخم دل نہ بھر جائے

ضبط اپنا شعار تھا ، نہ رہا — دل پہ کچھ اختیار تھا ، نہ رہا
دل مرحوم کو خدا بخشے — ایک ہی غم گسار تھا ، نہ رہا
موت کا انتظار باقی ہے — آپ کا انتظار تھا ، نہ رہا

کیا پھر ترے ناوک نے کیا عزم نوازش   لبیک کی آتی ہے صدا چاک جگر سے

تہ خنجر بھی جو بسمل نہیں ہونے پاتے   مر کے شرمندۂ قاتل نہیں ہونے پاتے
موج نے ڈوبنے والوں کو بہت کچھ پلٹا   رخ مگر جانب ساحل نہیں ہونے پاتے
دل تو سب کو تری سرکار سے مل جاتے ہیں   درد جب تک نہ ملے' دل نہیں ہونے پاتے

دنیا مری بلا جانے ' مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے
آبادی بھی دیکھی ہے ' ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اجڑے اور پھر نہ بسے ' دل وہ نرالی بستی ہے
جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی ' ان داموں تو سستی ہے
وحشت دل سے پھرنا ہے ' اپنے خدا سے پھر جانا
دیوانے یہ ہوش نہیں ' یہ تو ہوش پرستی ہے
آنسو تھے سو خشک ہوئے ' جی ہے کہ امڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے ' کُھلتی ہے ' نہ برستی ہے
دل کا اجڑنا سہل سہی ' بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں ہے ' بستے بستے بستی ہے
فانی جس میں آنسو کیا ' دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے ! وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

وہ نظر کامیاب ہو کے رہی   دل کی بستی خراب ہو کے رہی
نکہ شوق کا مآل نہ پوچھ   سر بہ سر اضطراب ہو کے رہی
تاب نظارہ لا سکا نہ کوئی   بے حجابی حجاب ہو کے رہی
غم سے فانی نہ چھپ سکا غم دوست   آرزو بے نقاب ہو کے رہی

اپنی تو ساری عمر ہی فانی گزار دی   اک مرگ ناگہاں کے غم انتظار نے

زندگی خود کیا ہے فانی یہ تو کیا کہئے مگر
موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

غم وہ راحت جسے قسمت کے دھنی پاتے ہیں
دم وہ مشکل ہے کہ موت آئے تو آساں ہو جائے
ذرہ وہ راز بیاباں کہ جو افشا نہ ہوا!
دشت وحشت ہے وہ ذرہ جو بیاباں ہو جائے
موت وہ دن بھی دکھائے مجھے جس دن فانی
زندگی اپنی جفاؤں پہ پشیماں ہو جائے

بقدر مستئی دل ہے خمار غم بدنام خزاں خراب بہ اندازۂ بہار ہوئی

غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا سے آ کے جگا تو جاتے ہیں
ہم ہیں مگر وہ نیند کے ماتے جاگتے ہی سو جاتے ہیں

حرف تمنا بے معنی سا، نقش وفا سو دھندلا سا
دل کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے، دل کی حقیقت کیا کہئے
حشر بھی گزرا، حشر میں بھی یہ سوچ کے ہم نے کچھ نہ کہا
غم کی حکایت کون سنے گا، غم کی حکایت کیا کہئے

اک فسانہ سن گئے اک کہہ گئے میں جو رویا مسکرا کر رہ گئے

انسان کی ساری ہستی کا مقصود ہے فانی ایک نظر
یعنی وہ نظر جو دل میں اتر کر زخم بنی مرہم نہ ہوئی

تیرا نگاہ شوق کوئی رازداں نہ تھا
آنکھوں کو ورنہ جلوۂ جاناں کہاں نہ تھا

اب تک تری گلی میں یہ رسوائیاں نہ تھیں
اب تک تو اس زمیں پہ کوئی آسماں نہ تھا
ہر شاخ ہر شجر سے نہ تھی بجلیوں کو لاگ
ہر شاخ ہر شجر پہ مرا آشیاں نہ تھا
اللہ رے بے نیازیٔ آدابِ التفات
دیکھا مجھے تو پائے نظر درمیاں نہ تھا
میرے دلِ غیور کا حسن طلب تو دیکھ
گویا زباں پہ حرف تمنا گراں نہ تھا

خود برق ہو اور طور تجلی سے گزر جا
خود شعلہ بن اور وادیٔ سینا سے گزر جا
بے واسطۂ خود نگری اپنی طرف دیکھ
آئینہ اٹھا حسن خود آرا سے گزر جا
اپنی ہی نگاہوں کا یہ نظارہ کہاں تک
اس مرحلۂ سعیٔ تماشا سے گزر جا

مجھ کو مرے نصیب نے روز ازل نہ کیا دیا
دولت دو جہاں نہ دی اک دل مبتلا دیا
دل ہی نگاہ ناز کا ایک ادا شناس تھا
جلوۂ برق طور نے طور کو کیوں جلا دیا
دل میں سما کے بھر گئی ' آس بندھا کے پھر گئی
آج نگاہ دوست نے کعبہ بنا کے ڈھا دیا
یوں نہ کسی طرح کٹی جب مری زندگی کی رات
چھیڑ کے داستانِ غم دل نے مجھے سلا دیا
یاس نے درد ہی نہیں حق تو یہ ہے دوا بھی دی
فانئی نا امید کو موت کا آسرا دیا

نامراد اپنے تک نامراد جیتے ہیں
سانس بن گیا اک اک نالہ نا رسا ہو کر

اور بندے ہیں جنکو دعوئی خدائی ہے
تھی ہماری قسمت میں بندگی خدا ہو کر
بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے مرتے ہیں نہ جیتے ہیں
درد پر خدا کی مار دل میں رہ گیا ہو کر

جی ڈھونڈھتا ہے گھر کوئی دونوں جہاں سے دور
اس آپ کی زمیں سے الگ آسماں سے دور
شاید میں در خور نگہ گرم بھی نہیں
بجلی تڑپ رہی ہے مرے آشیاں سے دور
ہے منع راہ عشق میں دیر و حرم کا ہوش
یعنی کہاں سے پاس ہے منزل کہاں سے دور
تا عرض شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ
ایک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دور
فانی دکن میں آ کے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

گو بیٹھے بھی اٹھے بھی ہم محفل دشمن میں تیری خاطر
بیٹھ گئے دل زار کی صورت ' اٹھے صورت درد جگر ہم
شکوۂ جور بتاں ہم کرتے ' ظاہر درد نہاں ہم کرتے
مانا آہ و فغاں ہم کرتے ' لاتے کہاں سے تجھ کو اثر ہم
دوست تسلی دینے آئے ' لیکے دوائیں چارہ گر آیا
لیجئے آئی زخم جگر پر ' اور اک تازہ آفت مر ہم
ڈوب ہی جائے کشتئی ہستی' کچھ تو ہو آخر ورنہ کہاں تک
بحر تلاطم خیز جہاں میں ' یوں ہی رہینگے زیر و زبر ہم

دل وقف تپش ہے ہائے مگر وجہ تپش دل کوئی نہیں
بسمل ہوں مگر کیوں بسمل ہوں فریاد کہ قاتل کوئی نہیں
کس زعم میں ہے اے رہرو غم دھوکے میں نہ آنا منزل کے
یہ راہ بہت کچھ چھانی ہے اس راہ میں منزل کوئی نہیں
بس آن پہ نہ آن کی یاد پہ ہے ' تقدیر کے کیا کیا پہلو ہیں

تدبیر سے حاصل کچھ بھی نہیں تدبیر سے غافل کوئی نہیں
خود حسن کمال حسن ہے یعنی حسن جہاں ہے کامل ہے
اور عشق مآل عشق ہے یعنی عشق میں کامل کوئی نہیں
ہستی ہی نہیں جو باطل ہو پھر فرق مجاز و حقیقت کیا
ہر عرض حقیقت ہے وہ حقیقت ہستئی باطل کوئی نہیں
فانی ہی وہ اک دیوانہ تھا جو موت سے پہلے مر جاتا
کیا ہوش کی کافر دنیا میں اس موت کے قابل کوئی نہیں

اٹھ اے نشاط شوق اٹھ متاع جاں لئے ہوئے
وہ دامن نگاہ میں ہیں بجلیاں لئے ہوئے
حجاب روزگار میں جھلک ہے یاد یار کی
نشاط آشکار ہے غم نہاں لئے ہوئے
بنائے غم کی خیر ہو کہ آج آہ واپسیں
چلی ہے دل کی وادیوں سے آندھیاں لئے ہوئے
نہ پوچھ اہل ہوش کی کہ دامنوں کی آڑ میں
پھرا کیا ہوں دامنوں کی دھجیاں لئے ہوئے

حساب حسرت جرم نظارہ دل سے پوچھ نظر تو ایک جھلک کی گناہگار ہوئی
بہار نذر تغافل ہوئی خزاں ٹھہری خزاں شہید تبسم ہوئی بہار ہوئی

آزردہ کیوں ہوئے مری آشفتگی سے تم
آخر یہی تو زلف شکن در شکن میں تھی
اس کے سوا نہیں خبر آشیاں مجھے
میں تھا اسیر دام تو بجلی چمن میں تھی
بے پردہ ذکر یار ہے در پردہ یاد یار
میری زباں پہ ہے جو دل برہمن میں تھی
وہ گل ہے گل جسے تری خلوت میں بار تھا
وہ شمع شمع ہے جو تری انجمن میں تھی

بدلا ہوا تھا رنگ گلوں کا ترے بغیر
کچھ خاک سی اڑی ہوئی سارے چمن میں تھی

وہ وعدۂ آساں پر مائل نظر آتا ہے
اب کار تمنا پھر مشکل نظر آتا ہے
دل کھوئے ہوئے برسوں گزرے ہیں مگر اب بھی
آنسو نکل آتے ہیں جب دل نظر آتا ہے
موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانی
گرداب کی ہر تہ میں ساحل نظر آتا ہے

نگاہ ناز و سوز عشق دونوں ایک ہیں لیکن
کہیں ہوتی ہے یہ بجلی کہیں معلوم ہوتی ہے
عجب عالم ہے موج برق کے پہلو میں بادل کا
تری الٹی ہوئی سی آستیں معلوم ہوتی ہے

وحشت تازہ کا نوروز مبارک اے عشق پھر بہار آئی مجھے خلعت عریانی دے
اپنے دیوانے پہ اتمام کرم کر یا رب در و دیوار دئے اب انہیں ویرانی دے

سمائیں آنکھ میں کیا شعبدے قیامت کے
مری نظر میں ہیں جلوے کسی کے قامت کے

اصغر گونڈوی

اصغر حسین نام اصغر تخلص ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے ۔ آبا و اجداد گورکھپور کے رہنے والے تھے لیکن اُن کے والد منشی تفضل حسین قانون گو نے ملازمت کے ساتھ سکونت بھی گونڈہ میں اختیار کرلی تھی ۔ اسی تعلق کی وجہ سے اصغر گونڈوی کہلائے ۔ اصغر کی تعلیم باضابطہ اور مسلسل نہ ہو سکی ۔ پہلے وہ انگریزی اسکول میں داخل ہوئے مگر بعض خانگی مجبوریوں نے انھیں کسی امتحان پاس کرنے سے قبل ھی تعلیم ترک کرنے پر مجبور کر دیا ۔ پھر اصغر نے اپنی توجہ آردو فارسی ادب کی طرف مبذول کی اور محض اپنے ذاتی مطالعہ سے اُس میں کافی عبور و بصیرت حاصل کی ۔ اصغر فطری طور پر بڑے طباع ' محنتی اور صاحب ذوق تھے جس کی وجہ سے انھیں ایک اچھے عالم و فاضل انسان کی سی شائستگی پیدا کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی ۔ یہی فکری شائستگی اُن کے کلام میں حکیمانہ خیالات کی صورت میں جلوہ گر نظر آتی ھے علاوہ ازیں چونکہ انھیں شاہ عبدالغنی منگلوری سے گہری ارادت و بیعت کا شرف حاصل تھا اس لئے اُن کی شاعری میں تصوف کا رنگ بھی غالب ھے ۔ اصغر ابتداً گونڈہ میں چشمہ سازی کا کاروبار کرتے رہے ۔ لیکن بعد میں کافی عرصہ تک رسالہ ''ھندوستان'' کے ایڈیٹر رہے ۔ ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء میں الہ آباد میں وفات پائی ۔

اصغر دور جدید کے اُن غزل گو شعرا میں سے ھیں جنھوں نے حکیمانہ ژرف نگاھی میں بادۂ تصوف کی سرمستی سمو کر ایک منفرد رنگ قائم کیا ھے ۔ اُن کی زندگی بڑی سادہ تھی ساتھ ھی وہ بڑے قناعت پسند انسان تھے ۔ چنانچہ زندگی کی یہ خصوصیات اُن کے کلام کا بھی جوھر بنیں ' انھوں نے بہت نہیں کہا ھے مگر جو کچھ کہا ھے وہ انتخاب ضرور ھے اُن کے کلام کے دو مجموعے پہلا ''نشاط روح'' ۱۹۲۵ء میں اور دوسرا ''سرود زندگی'' ۱۹۳۵ء میں شائع ھوئے جو مختصر ھوتے ھوئے بھی اعلیٰ شاعری کے عمدہ نمونے ھیں ۔ اصغر درحقیقت حسرت و فانی دونوں کا متوازن امتزاج ھیں ۔ حسرت کی سادگی اور فانی کی حکیمانہ بالغ نظری میں لطف بیان اور موسیقیت کی آمیزش سے اصغر کے تغزل کا خمیر اُٹھا ھے ۔ وہ شاعری میں پہلے وجد بلگرامی سے اصلاح لیتے رہے پھر چند غزلیں تسلیم لکھنوی کو دکھائیں ۔ مگر ان اساتذہ سے طرز فکر میں وہ بالکل متاثر نہیں ھوئے بلکہ شعرا میں فانی کے بعد غالب سے وہ بہت زیادہ متاثر ھیں ۔ فانی اپنے مخصوص غمگین تصورات کے ماتحت غالب کا تنوع نہ پیدا کرسکے تھے لیکن اصغر نے

یہ کمی پوری کر دی ہے ۔ اُن کے یہاں یاس افزا خیالات بہت کم اور رجائی نغمے بہت زیادہ ہیں ۔ شعر کے متعلق خود اصغر کا زاویہ نظر یہ ہے ۔

شعر میں رنگینئی جوش تخیل چاہئے مجھ کو اصغر کم ہے عادت نالہ و فریاد کی

اصغر نے نکتہ رس دماغ اور قلب کی گہرائیوں تک پہنچنے والی نظر پائی تھی ۔ اسلئے وہ عام جذبات انسانی کی نزاکتوں کے بیان اور قلب کی گہرائیوں کی صورت کشی میں جس بلندی پر پہنچ گئے تھے اُس کی مثال اُن کے معاصرین میں مشکل سے ملتی ہے ۔ وہ فلسفیانہ حقائق کے بیان میں طرز ادا کی لطافت و دل آویزی کو کبھی نہیں بھولتے ۔ پھر جدید شعری تحریکات بلند اخلاق ، حسن کاری ، فلسفہ بالخصوص خودی کا زبردست احساس اور موسیقیت تک اصغر کی بھی آتنی ہی رسائی ہے جس حد تک اُن کے معاصرین حسرت یا فانی کی ہوئی ۔ چنانچہ اُن کے خامۂ رنگیں نگار کی ھلکی سی جنبش بھی نشاط روح و نظر کا سامان مہیا کر دیتی ہے ۔ انہی خصوصیات شعری نے اُن کی غزل میں ایک امتیازی اور انفرادی شان پیدا کر دی ہے ۔

انتخاب کلام

عشق ھی سعی مری ، عشق ھی حاصل میرا
یہی منزل ہے یہی جادۂ منزل میرا
داستاں اُن کی اداؤں کی ہے رنگیں لیکن
اس میں کچھ خون تمنا بھی ہے شامل میرا

مستی سے تیرا جلوہ خود عرض تماشا ہے
آشفتہ مزاجوں کا یہ کیف نظر دیکھا
ہاں وادئی ایمن کے معلوم ہیں سب قصے
موسیٰ نے فقط اپنا اک ذوق نظر دیکھا

بہت لطیف اشارے تھے چشم ساقی کے
نہ میں ہوا کبھی بے خود نہ ھوشیار ہوا
مری نگاہوں نے جھک جھک کے کر دئے سجدے
جہاں جہاں سے تقاضائے حسن یار ہوا

کہہ کے کچھ لالہ و گل رکھ لیا پردہ میں نے
مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا

فصل گل ، جوش نمو ، طلعت زیبائے بہار
عرض دیدار پہ یک جلوۂ مستور ہے آج
نہیں معلوم یہاں دار و رسن ہے کہ نہیں
خون میں گرمئی ہنگامۂ منصور ہے آج
جس سے کل تک دل بیتاب پھنکا جاتا تھا
اسی شعلہ کو جو دیکھا تو سر طور ہے آج

نہ کچھ فنا کی خبر ہے نہ ہے بقا معلوم
بس ایک بے خبری ہے سو وہ بھی کیا معلوم
ہجوم شوق میں اب کیا کہوں میں کیا نہ کہوں
مجھے تو خود بھی نہیں اپنا مدعا معلوم

اے کاش میں حقیقت ہستی نہ جانتا
اب لطف خواب بھی نہیں ، احساس خواب میں

تیری ہزار برتری ، تیری ہزار مصلحت
میری ہر اک شکست میں میرے ہر اک قصور میں

هزار جامه دری ، صد هزار بخیه گری — تمام شورش و تمکیں نثار بے خبری
غضب ہوا کہ گریباں ہے چاک ہونے کو — تمہارے حسن کی ہوتی ہے آج پردہ دری
اس آستاں سے اٹھائی نہ پھر جبیں میں نے — حرم میں سجدۂ پیہم تھی ایک درد سری

سنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی
کچھ خواب ہے ، کچھ اصل ہے ، کچھ طرز ادا ہے

پاس ادب میں جوش تمنا لئے ہوئے
میں بھی ہوں اک حباب میں دریا لئے ہوئے
ہے آرزو کہ آئے قیامت ہزار بار
فتنہ طرازئ قد رعنا لئے ہوئے
تو برق حسن اور تجلی سے یہ گریز
میں خاک اور ذوق تماشا لئے ہوئے
جوش جنوں میں چھوٹ گیا آستان یار
روتے ہیں منہ پہ دامن صحرا لئے ہوئے

بے محابا ہو اگر حسن تو وہ بات کہاں
چھپ کے جس شان سے ہوتا ہے نمایاں کوئی
کیا کرے زاہد بے چارا اسے کیا معلوم
رحم کرتا ہے بہ اندازۂ عصیاں کوئی

وہیں سے عشق نے بھی شورشیں اڑائی ہیں
جہاں سے تو نے لئے خندہ ہائے زیر لبی
کشش نہ جام نگاریں کی پوچھ اے ساقی
جھلک رہا ہے مرا آب و رنگ تشنہ لبی

جان نشاط حسن کی دنیا کہیں جسے
جنت ہے ایک خون تمنا کہیں جسے
میں ہوں ازل سے گرم روِ عرصۂ وجود
میرا ہی کچھ غبار ہے دنیا کہیں جسے
''اصغر'' نہ کھولنا کسی حکمت مآب پر
راز حیات ساغر و مینا کہیں جسے

حقیقت ایک ہے صدہا لباس رنگیں میں
نظر بھی چاہئے کچھ حسن رہگذر کے لئے
بتوں کے حسن میں بھی شان ہے خدائی کی
ہزار عذر ہیں اک لذت نظر کے لئے

خستگی نے کر دیا اس کو رگ جاں سے قریب
جستجو ظالم کہے جاتی تھی منزل دور ہے

ترے جلووں کے آگے همت شرح و بیاں رکھدی
زباں بے نگہ رکھ دی نگاہ بے زباں رکھدی
مٹی جاتی تھی بلبل ' جلوۂ گل ھائے رنگیں پر
چھپا کر کس نے ان پردوں میں برق آشیاں رکھدی
نیاز عشق کو سمجھا ہے کیا ؟ اے واعظ ناداں
ھزاروں بن گئے کعبے ' جبیں میں نے جہاں رکھدی
الہی کیا کِیا تو نے کہ عالم میں تلاطم ہے
غضب کی ایک مشتِ خاک زیر آسماں رکھدی

میرے مذاق شوق کا اس میں بھرا ہے رنگ
میں خود کو دیکھتا ہوں کہ تصویر یار کو
ھاں اے نگار خوبی و اے جان دلبری
تو نے حیات بخشی ہے صبح بہار کو

صحن حرم نہیں ہے ' یہ کوئے بتاں نہیں
اب کچھ نہ پوچھئے کہ کہاں ہوں کہاں نہیں
اب ہو ' تو سنگ و خشت سے سر کو سکون ہو
وہ آستاں نہیں تو کوئی آستاں نہیں
ہوتا ہے روز عشق و محبت انہیں سے فاش
آنکھیں زباں نہیں ہیں ' مگر بے زباں نہیں
تسلیم مجھ کو خانۂ کعبہ کی منزلت
سب کچھ سہی ' مگر وہ ترا آستاں نہیں
دیکھوں ! ھجوم غم میں وہ لے کس طرح خبر
یہ اس کا امتحاں ہے ' مرا امتحاں نہیں

قفس کیا ؟ حلقہ ھائے دام کیا ؟ رنج اسیری کیا
چمن پر مٹ گیا جو ' ہر طرح آزاد ہوتا ہے
یہاں کوتاھئی ذوق عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وھیں صیاد ہوتا ہے

بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا
وہ پابند قفس ' جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے
بہار انجام سمجھوں اس چمن کا ' یا خزاں سمجھوں
زبان برگ گل سے مجھ کو کیا ارشاد ہوتا ہے

آلام روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اُسے غم جاناں بنا دیا
میں کامیاب دید بھی محروم دید بھی
جلووں کے اژدھام نے حیراں بنا دیا
یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا
اے شیخ ! وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی
کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا
کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیر عشق کی
جب خاک کر دیا اُسے عرفاں بنا دیا
اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے موج زن
آج اُس کو حسن و عشق کا ساماں بنا دیا
وہ شورشیں نظام جہاں جنکے دم سے ہے
جب مختصر کیا اُنھیں انساں بنا دیا
ہم اُس نگاہ ناز کو سمجھے تھے نیش تر
تم نے تو مسکرا کے رگ جاں بنا دیا
کہتے ہیں اک فریب مسلسل ہے زندگی
اس کو بھی وقف حسرت و حرماں بنا دیا

مستی میں فروغ رخ جاناں نہیں دیکھا
سنتے ہیں بہار آئی گلستاں نہیں دیکھا
زاھد نے مرا حاصل ایماں نہیں دیکھا
رخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا
اس طرح زمانہ کبھی ہوتا نہ پر آشوب
فتنوں نے ترا گوشۂ داماں نہیں دیکھا
رو داد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا
کیا کیا ہوا ہنگام جنوں یہ نہیں معلوم
کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا

ذوق سر مستی کو محو روئے جاناں کر دیا
کفر کو اس طرح چمکایا کہ ایماں کر دیا
کچھ نہ ہم سے ہو سکا اس اضطرابِ شوق میں
اُن کے دامن کو مگر اپنا گریباں کر دیا

شاید کہ پیام آیا پھر وادئی سینا سے
شعلے سے لپکتے ھیں کچھ کسوت مینا سے
اسرارِ حقیقت کو اک اک سے پوچھا ھے
ھر نغمۂ رنگیں سے ھر شاھد زیبا سے
رہ رہ کے چمکتی ھے وہ برق تبسم بھی
لہریں سی جو اٹھتی ھیں کچھ چشم تمنا سے
وہ عشق کی عظمت سے شاید کہ نہیں واقف
سو حسن کروں پیدا ایک ایک تمنا سے

یہ عشق نے دیکھا ھے یہ عقل سے پنہاں ھے
قطرے میں سمندر ھے' ذرے میں بیاباں ھے
ھے عشق کی سوزش سے رعنائی و زیبائی
جو خون اچھلتا ھے وہ رنگ گلستاں ھے
اے پیکر محبوبی میں کس سے تجھے پوچھوں
جس نے تجھے دیکھا ھے وہ دیدۂ حیراں ھے
سو بار ترا دامن ھاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ھی گریباں ھے

وہ نغمہ بلبل رنگیں نوا اک بار ھو جائے
کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ھو جائے
نظر وہ ھے جو اس کون و مکاں کے پار ھو جائے
مگر جب روئے تاباں پر پڑے بیکار ھو جائے
تبسم کی ادا سے زندگی بیدار ھو جائے
نظر سے چھیڑ دے رگ رگ مری ھشیار ھو جائے
تجلی چہرۂ زیبا کی ھو کچھ جام رنگیں کی
زمیں سے آسماں تک عالم انوار ھو جائے

تم اس کافر کا ذوق بندگی اب پوچھتے کیا ہو
جسے طاق حرم بھی ابروئے خم دار ہو جائے
سحر لائے گی کیا پیغام بیداری شبستاں میں
نقاب رخ اُلٹ دو خود سحر بیدار ہو جائے
نظر اُس حسن پر ٹھہرے تو آخر کس طرح ٹھہرے
کبھی جو پھول بن جائے کبھی رخسار ہو جائے
چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

رخ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی
شعائیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی
نقاب اُس نے اُلٹ کر یہ حقیقت ہم پر عریاں کی
یہیں پر ختم ہو جاتی ہیں بحثیں کفر و ایماں کی
حقیقت کھول دیتا میں جنوں کے راز پنہاں کی
قسم دے دی ہے لیکن قیس نے چاک گریباں کی
اسیران بلا کی حسرتوں کو آہ کیا کہئے!
تڑپ کے ساتھ اُونچی ہو گئی دیوار زنداں کی

فتنہ سامانیوں کی خو نہ کرے — مختصر یہ کہ آرزو نہ کرے
پہلے ہستی کی ہے تلاش ضرور — پھر جو گم ہو تو جستجو نہ کرے
ماورائے سخن بھی ہے کچھ بات — بات یہ ہے کہ گفتگو نہ کرے

نمود جلوۂ بے رنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں
کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی
چمن میں کس مزے سے چھیڑتی ہے غنچہ و گل کو
مگر موج صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی
اُڑا دیتا ہوں اب بھی تار تار ہست و بود اصغر
لباس زہد تمکیں پر بھی عریانی نہیں جاتی

کثرت مظاہر ہے دفتر فتنہ آموز نیند آ ہی جاتی ہے حسن کے فسانے سے
ایک ایک تنکے پر سو شکستگی طاری برق بھی لرزتی ہے میرے آشیانے سے

هم ایک بار جلوۂ جانانہ دیکھتے پھر کعبہ دیکھتے نہ صنم خانہ دیکھتے
کرنا وہ جھوم جھوم کے رندان مست کا پھر پائے خُم پہ سجدۂ شکرانہ دیکھتے
اک شعلہ اور شمع سے بڑھ کر ہے رقص میں
تم پھاڑ کر تو سینۂ پروانہ دیکھتے

جگت موہن لال رواں

چودھری جگت موہن لال نام رواں تخلص ۱۳ جنوری ۱۸۸۹ء کو آناؤ (مضافات لکھنؤ) میں پیدا ہوئے - نو سال کی عمر میں اُن کے والد چودھری گنگا پرشاد کا انتقال ہوا - اُس کے بعد رواں کی پرورش ' پرداخت اور تعلیم و تربیت اُن کے بڑے بھائی بابو کنھیا لال کے ذمہ رہی - اُنھیں کی نگرانی میں رواں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی - ۱۹۱۳ء میں ایم - اے کرنے کے بعد ۱۹۱۶ء میں رواں نے ایل - ایل - بی کا امتحان پاس کیا اور اپنے وطن آناؤ میں ہی وکالت شروع کر دی - چونکہ فطرتاً بڑے ذہین و طباع واقع ہوئے تھے اس لئے جس طرح دوران تعلیم میں بڑے نمایاں و ممتاز طالب علم رہے - اُسی طرح اس پیشہ میں بھی بہت جلد کامیاب ہوئے اور اُن کا شمار صف اول کے وکلاء میں ہونے لگا -

شعر و سخن کا ذوق رواں کو بچپن سے تھا اور حضرت عزیز لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے - افسوس کہ موصوف نے عین شباب یعنی اکتوبر ۱۹۳۴ء میں جبکہ اُن کی عمر صرف پنتالیس سال کی تھی انتقال کیا ورنہ تھوڑے ہی عرصہ میں وہ اس فن میں جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے -

ابتدائے مشق سخن کے زمانے میں ہی رواں کی جودت طبع ' زور تخئیل اور سنجیدہ مزاجی کو دیکھ کر عزیز مرحوم اُنھیں دل کا شاعر کہتے تھے - رواں غزل و نظم دونوں کہتے تھے - لیکن رباعی سے اُنھیں خاص دلچسپی تھی - غزلوں میں رواں کی زبان بڑی شستہ و رفتہ ہے - وہ فارسی الفاظ و تراکیب کو نہایت منتخب اور خوبصورت انداز میں نظم کرنے کا سلیقہ رکھتے تھے - یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزلوں میں برجستگی ' دلکشی اور تاثیر کے ساتھ ساتھ ندرت و تازگی کے جوہر بھی عام نظر آتے ہیں - اس کے علاوہ اُن کے تغزل کی ایک اور خصوصیت فلسفہ و معنویت ہے لیکن خوبی یہ ہے کہ ان خصوصیات کی بدولت کلام میں کہیں خشکی و بے لطفی پیدا نہیں ہونے پاتی بلکہ اس کی بجائے عام طور پر اُن کے کلام میں درد و کیف کی ایک لہر سی دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے -

صنف نظم میں بھی رواں نے بڑے عمدہ و پرزور نمونے چھوڑے ہیں - خاص طور پر جہاں تغزل کا رنگ دے کر اُنہوں نے واردات حسن و عشق کو بیان کیا ہے وہاں درد و اثر میں بہت اضافہ ہو گیا ہے - اُن کی نظموں میں کردار نگاری و مناظر فطرت کا

بیان بڑے بلند و دلکش انداز میں ملتا ہے ۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنی بلندئ تخئیل ، صاف گوئی اور زور بیان سے کام لے کر اپنی بعض نظموں میں چارچاند لگا دئے ہیں چنانچہ ان کی چتر کوٹ ، عظمت توبہ ، پیام رکمنی ، تتلی ، لا وارث بچہ ، معجزۂ انتظار ، معمائے فطرت ، سرود عشق وغیرہ جیسی نظمیں بڑی دلکش اور عمدہ نظمیں ہیں یہ ضرور ہے کہ رواں کی منظومات عام طور پر رواں و صاف ہونے کے باوجود بعض بعض جگہ ناہموار بھی ہیں لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ نقائص کہاں نہیں ہوتے ۔ عیب و ہنر ہر فنکار کے یہاں پائے جاتے ہیں ۔

جہاں تک رباعیات کا تعلق ہے رواں نے اس صنف سخن میں زندگی کے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے اور اس میں شک نہیں کہ شاعر نے ادق مضامین اور مشکل جذبات کو جس خوبصورتی کے ساتھ نہایت سہل پیرائے میں بیان کیا ہے وہ قابل تعریف ہے ۔

اس صنف سخن میں رواں کی فطری سنجیدگی اور قدرت زبان بہت کام آئی ہے اور انہوں نے بعض وسیع مضامین کو چار مصرعوں میں نہایت خوش اسلوبی سے بیان کر دیا ہے ۔ ساتھ ہی پڑھنے والوں کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لئے رواں نے اپنی رباعیات میں عمدہ و لطیف تشبیہات اور پسندیدہ استعارات سے بھی کام لیا ہے جس سے کلام میں طرفہ تازگی و جاذبیت پیدا ہو گئی ہے ۔ مختصر یہ کہ حضرت رواں کی رباعیات کا مختصر مجموعہ ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے اور اردو شاعری میں بجا طور پر قابل فخر یادگار ہونے کا مستحق ہے ۔ رواں مرحوم کا دیوان ''روح رواں'' جو غزل ، قطعہ رباعی اور نظموں پر مشتمل ہے زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے اور ان کی رباعیات کا ایک مجموعہ بھی ''رباعیات رواں'' کے نام سے علامہ تاجور مرحوم نے اردو مرکز لاہور سے چھاپا تھا ۔ جس میں موصوف کی تقریباً تمام رباعیاں کتابی صورت میں یکجا کر دی گئی ہیں ۔

انتخاب کلام

عناصر ہنستے ہیں ، دنیا کی وسعت مسکراتی ہے
کسی سے پوچھتے ہیں اہل بینش جب نشاں میرا
ابھی تک فصل گل میں اک صدائے درد آتی ہے
وہاں کی خاک سے ، پہلے جہاں تھا آشیاں میرا
''رواں'' سچ ہے محبت کا اثر ضائع نہیں ہوتا
وہ رو دیتے ہیں اب بھی ذکر آتا ہے جہاں میرا

ہمنشیں فصل بہاری میں مزاج دل نہ پوچھ
تو نے دیکھا ہے کبھی دریا کوئی بڑھتا ہوا

نزع میں آ کر کُھلا ہے عالم فانی کا راز
اے مری جاتی ہوئی دنیا بڑا دھوکا ہوا

پیہم دئے وہ رنج کہ انساں بنا دیا ۔ مِنّت پذیر ہوں ستم روز گار کا

کوئی تفسیر باب زندگانی میں نہیں ممکن
حیات و موت بھی اک نام ہے تبدیل عنوان کا

ہنسے بھی روئے بھی لیکن نہ سمجھے ۔ خوشی کیا چیز ہے دنیا میں غم کیا

میں یکجا ہی کرتا تھا اپنے حواس
کہ آن سے مرا سامنا ہو گیا

چمن فروز، چمن سوز لالہ زار ہوں میں
خزاں ہے جس کے تعاقب میں وہ بہار ہوں میں
جہاں میں صورت فوّارہ زندگی ہے مری
کہ آپ اپنی بلندی پہ اشکبار ہوں میں
بساط دھر میں مانند مہرۂ شطرنج
نہ جانے کس لئے سر گرم کارزار ہوں میں.

اسی کو نعمت حسن بیاں بھی کہتے ہیں
کہ چپ بھی رہتے ہیں اور داستاں بھی کہتے ہیں
کسی طرف نظر یاس کر کے رو دینا
مری زباں میں اسی کو فغاں بھی کہتے ہیں

سنگ زمین کعبہ خود بڑھ کے جبیں کو بوسہ دے
ایسے بھی چند سجدے ہیں ناصیۂ نیاز میں

اللہ ری دلفریبی ایوان آرزو کی   ہر منظر فنا کو باقی سمجھ رہا ہوں
آتا ہوں فاصلے سے ' جاتا ہے دور مجھ کو   دلچسپ تھے مناظر دم بھر ٹھہر گیا ہوں

ہستی مجھے خود اپنی معمہ ہے اک رواں
آزاد بھی نہیں ہوں گرفتار بھی نہیں

قفس کے ہمنواؤں میں بھی باہم پھوٹ پیدا ہے
نہ جانے کیا لکھا ہے ہم اسیروں کے مقدر میں
شعاع نور ایماں دل تک آتے دیر لگتی ہے
بڑی دشواریوں سے روشنی ہوتی ہے اس گھر میں

تڑپتی پھرتی ہے اک برق عرفاں میکدے بھر میں
کبھی مینا میں خُم سے اور کبھی مینا سے ساغر میں

دل انساں میں جب فطرت نے رکھیں قوّتیں لاکھوں
تو اک کمزور اُلفت بھی بہ طرز امتحاں رکھ دی

ریاض دھر میں مانند نَے ہے زندگی میری
کہ جب تک سانس ہے نالوں سے فرصت ہو نہیں سکتی

یوں تو کس کو فکر ' کس کو ہوش ' کس کو آرزو
موت سے ہوتا ہے کچھ کچھ امتیاز زندگی
دیکھ ! کتنی بجلیاں رہتی ہیں سر گرم طواف
آہ ! اے آسودۂ ایوان ناز زندگی

ذکر ہے زنداں میں وہ گلزار پر بجلی گری
آج میرے آشیاں میں روشنی ہو جائے گی

کچھ عجب روداد ہے، انسان کی روداد بھی
سو اسیروں کا اسیر، آزاد کا آزاد بھی

ہزاروں پھول مٹ کر اک کلی صورت دکھاتی ہے
یہی قانون فطرت آپ عالمگیر دیکھیں گے
کوئی آزاد ہستی بزم دنیا میں نہیں ملتی
جسے دیکھیں گے بس فریادی زنجیر دیکھیں گے

حسن کی اطاعت بھی اصل میں عبادت ہے
میری بت پرستی میں شان حق پرستی ہے
اگلی صحبتیں ساری خواب کی سی باتیں ہیں
دوستوں سے ملنے کو روح اب ترستی ہے

زمیں سے آسماں تک بھر دیا ہے جوش آزادی
اسیروں نے تمہارے جو کیا آزاد کیا کرتے
جہانِ آرزو کے ذرے ذرے میں تزلزل تھا
''رواں'' ہم حسرت تعمیر بے بنیاد کیا کرتے

نہ گل ہوئی ہے نہ شمع حیات گل ہوگی — ہزار بار یوں ہی انجمن میں آئی ہے
چلو وہیں دل پژمردہ لے چلیں اپنا — جہاں سے باد بہاری چمن میں آئی ہے
ازل سے ہے یہی بابِ بہار کی سرخی — جو آفتاب کی پہلی کرن میں آئی ہے
کل ایک غنچہ نے باد سموم سے یہ کہا — ہزار بار خزاں اس چمن میں آئی ہے

سدِ انوارِ حقیقت ہے مرا پردۂ زیست
توڑ دینا ہے یہ آئینۂ تصویر مجھے

جو لکھا ہے کاتب تقدیر نے ہوگا وہی
اپنی کوشش بھی مگر تا حدِ امکاں کیجئے

عظمت روح کا احساس بھی باقی نہ رہا
ہم کو برباد کیا مشق جبیں سائی نے

ایک ہی دریائے بے پایاں کے قطرے ہم ہیں سب
حیف ہے گر ہم میں کوئی جانب دریا نہ جائے

حسن مغرور میں ممکن نہیں اصلاح فروغ
کیا بھرے کوئی چھلکتے ہوئے پیمانے کو

رباعیات

کس کے جلووں کی یہ فراوانی ہے
کیسی آخر یہ بزم نورانی ہے
یہ ماہ دو ہفتہ اور یہ صبح جمیل
کس کا رخسار، کس کی پیشانی ہے

ہر قلب پہ بجلیاں گراتی آئی
اک آگ سی ہر طرف لگاتی آئی
کھلتے جاتے ہیں زخم ہائے کہنہ
پھر صبح بہار مسکراتی آئی

پھر زلف بدوش ہیں جوانان چمن
اللہ اللہ صبح خندان چمن
ذوق توبہ ہمارا تمت بالخیر
پھر جام بکف ہیں نونہالانِ چمن

جتنے انوار حسنِ صورت کے ہیں
سب نغمہ نواز بزم قدرت کے ہیں
یہ آب و سحاب و برق و باد و باراں
پردے دو چار ساز فطرت کے ہیں

دل صرفِ حصول جام و مینا کر دے
جاں وقف سرور کیف صہبا کر دے
تو راز نشاط پوچھتا کیا ہے رواں
غرق مے ناب دین و دنیا کر دے

میرے ساقی شراب صافی دینا
ہو جس سے گنہ کی کچھ تلافی دینا
اترے نہ خمار زندگی بھر جس کا
ایسی دینا اور اتنی کافی دینا

دل مائل گریہ کس لئے ہوتا ہے — کیوں بے سبب آنسوؤں سے منہ دھوتا ہے
لا حل نہیں عقدۂ صعوبات جہاں — جب موت یقینی ہے تو کیوں روتا ہے

افلاس اچھا نہ فکر دولت اچھی — جو دل کو پسند ہو وہ حالت اچھی
جس سے اصلاح نفس نا ممکن ہو — اُس عیش سے ہر طرح مصیبت اچھی

کیا تم سے بتائیں عمر فانی کیا تھی — بچپن کیا چیز تھا، جوانی کیا تھی
یہ گل کی مہک تھی وہ ہوا کا جھونکا — اک موج فنا تھی زندگانی کیا تھی

اس دار فنا میں مقصد دل کیا ہے — مقصود نمود حق و باطل کیا ہے
جب قلب کو ایک دم بھی راحت نہ ملی — آخر اس زندگی کا حاصل کیا ہے

کیوں تیشۂ باغباں سے دل مضطر ہو — شاید یہ قلم ہی نخل بار آور ہو
مقراض اجل ہے قاطع شاخ حیات — ممکن ہے اسی میں رازِ جاں مضمر ہو

کچھ وقت اگر خوشی میں کٹ جاتا ہے — تسکین ہوتی ہے رنج بٹ جاتا ہے
اکثر تو کچھ ایسا حال ہوتا ہے رواں — بالکل دنیا سے جی اُچٹ جاتا ہے

دریا جو نہیں فضائے بالا بھی نہیں — ذرہ جو نہیں تو کوہ و صحرا بھی نہیں
اے ہستئ بے نوا پہ ہنسنے والے — قطرہ جو نہیں تو موجِ دریا بھی نہیں

تابع ہمیں عقل کا کئے دیتی ہے — آزادئ دل فنا کئے دیتی ہے
تہذیب کی عظمتوں سے ہم باز آئے — فطرت سے ہمیں جدا کئے دیتی ہے

منظومات

غبارہ

زمیں سے جانب بام فلک رواں ہے تو — رحیل منزل بے جادۂ و نشاں ہے تو
ہوا پہ اک فرسِ شعلہ جست کر کے چلا — کہ کوئی طائر زرّیں اڑان بھر کے چلا

بلندیوں کی طرف بن کے برق طور چلا　　کمال شوق سے دامن میں بھر کے نور چلا
حسیں پری کوئی مست مئے صبوح چلی　　نکل کے قالب خاکی سے جیسے روح چلی
تپ دروں سے غبار سراب دشت ہے تو　　فضائے چرخ پہ آواز باز گشت ہے تو
پڑا ہے یا کسی میکش کا صبر رندانہ　　الٹ گیا ہے مئے آتشیں کا پیمانہ
فلک کو اہل زمیں کا پیام ہے کوئی　　کہ دست ساقی کوثر میں جام ہے کوئی
یہ کوئی آگ کا اڑتا ہوا شرارہ ہے　　کہ آسمان کا ٹوٹا ہوا ستارہ ہے
ڈھلک کے دیدۂ سالک سے کوئی اشک نیاز　　چلا ہے ہونے کو دامان عفو پر ممتاز

نظار فروزِ تعلق بہار ہے تیری　　حریف، زندگئی مستعار ہے تیری
فنا کے دوش پہ کچھ اس طرح سوار ہے تو　　کہ بے کسوں کا چراغ سر مزار ہے تو
قدم قدم پہ سنبھلتا ہے ڈگمگاتا ہے　　قدم قدم پہ مچلتا ہے لوٹا جاتا ہے
خبر بھی ہے تجھے، انجام تیرا کیا ہوگا　　مواد زیست ترا باعث فنا ہوگا
قدم بڑھائے ہوئے ہاں قدم بڑھائے ہوئے　　گداز نفس سے دامن مگر بچائے ہوئے

رواں تو ہے سر منزل مگر یہ ڈر ہے مجھے
مری طرح کہیں جلنے سے پہلے جل نہ بجھے

ویران قصر شاہی

آجڑے محلوں سے جو آتی ہے صدائے باز گشت
طرفہ افسانہ سناتی ہے صدائے باز گشت
پہلے کچھ احکام سلطانی سناتی ہے مجھے
قصۂ شان جہانبانی سناتی ہے مجھے
پھر سناتی ہے محافل کی طرب انگیزیاں
شوخئی حسن ملاحت زا کی شکر بیزیاں
کالی کالی وہ گھٹائیں اور بھری برسات میں
ناز سے گانا وہ رقاصوں کا بھیگی رات میں
عہد پیشیں کے لطیفے کچھ سناتی ہے مجھے
کچھ ہنساتی ہے مجھے اور کچھ رلاتی ہے مجھے
عاشقوں نے گفتگو سر مستئی جذبات میں
کی تھی جو آہستہ تنہائی میں بھیگی رات میں

غم کو بتلاتی ہے آ آ کر صدائے باز گشت
دور ماضی کا ہے اک دفتر صدائے باز گشت

اس جگہ کچھ عیش کچھ عشرت کے ساماں دفن ہیں
اس جگہ پر کچھ مرادیں اور کچھ ارماں دفن ہیں
اس جگہ پر ہے مزار شوکت و شان غرور
اس جگہ مدفون ہیں اسباب امکان غرور
آرزوئے حدِ شہرت کی یہاں پر قبر ہے
جستجوئے لطف جنّت کی یہاں پر قبر ہے
دلربائی اور دلآ زاری کی حد ہے اس جگہ
عاشقی اور ناز برداری کی حد ہے اس جگہ
نالۂ شبگیر زاھد اس جگہ پر ختم ہے
حسن عالگیر شاھد اس جگہ پر ختم ہے
تیغ جوھر دار کی حد اس جگہ پر ہو گئی
حسن بدکردار کی حد اس جگہ پر ہو گئی
اس جگہ ہے بیکسی اور نامرادی سو رہی
قبر ہے یاں شوخئی چشم فسوں پرواز کی
دب گئے ہیں کچھ جواھر غیر سفتہ اس جگہ
دفن ہیں کچھ غنچہائے نا شگفتہ اس جگہ
مرقدیں ہیں کچھ جنون فتنہ ساماں کی یہاں
چاکداماں کی یہاں چاک گریباں کی یہاں

ساق توبہ شکن ہے اس ج ہ آرام میں
شاھد نازک بدن ہے اس جگہ آرام میر

دلؔ شاہجہان پوری

حکیم ضمیر الدین نام دل تخلص شاہجہان پور میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے والد ماجد حکیم جمال الدین عرف قدرت علی خاں صاحب شاہجہان پور کے معروف اطبا و شرفا میں شمار ہوتے تھے ۔ دل صاحب کی تعلیم و تربیت آنکے وطن شاہجہان پور ہی میں ہوئی ۔ فارسی کی کتب درسیہ کی تکمیل کے بعد عربی تعلیم کا آغاز ہوا ۔ ابتدائی صرف و نحو کی منزل سے گزرنے کے بعد آنہوں نے علم معقول کی اکثر کتابیں مولوی سید محمد علی خانصاحب خیال اور مولوی نادر الدین صاحب سے جو شاہجہان پور کے فضلا میں سے تھے ' پڑھیں ۔ پھر فقہ ' حدیث اور تفسیر کی تعلیم مولوی بشیر احمد صاحب مرادآبادی اور مولوی عبدالباری خانصاحب شاہجہان پوری سے حاصل کی ۔ بعد ازاں اپنے خاندانی مشغلہ یعنی طبابت کی طرف رجوع کیا اور علم طب کا درس مولوی حکیم محمد صاحب سے لیا ۔

دل صاحب کو پندرہ سولہ برس کی عمر سے شعر و شاعری کا ذوق ہوا ۔ ابتداً چند سال تک بغیر کسی اصلاح کے مشغلۂ شاعری جاری رہا مگر آستاد کامل کی تلاش ضرور رہی چنانچہ بذریعہ خط و کتابت منشی امیر مینائی لکھنوی سے سلسلۂ تلمذ قائم ہوا ۔ بعد ازاں رامپور پہنچ کر آستاد کا شرف نیاز بھی حاصل کیا ۔ امیر مینائی صاحب کے ارشاد کے بموجب خط و کتابت کے ذریعہ خود آن سے نیز دیگر اہل فن حضرات سے استفادہ کرتے رہے ۔ دیگر حضرات میں بظاہر وہ جلال لکھنوی شاگرد امیر مینائی سے کافی متاثر معلوم ہوتے ہیں ۔

دل کے تغزل میں لکھنو کے مقابلہ میں دھلی کے رنگ کی جھلک زیادہ ہے ۔ اسکی وجہ شاید یہی ہے کہ وہ جلال لکھنوی سے خاصے متاثر معلوم ہوتے ہیں ۔ اور جلال نے جس طرح لکھنوی دبستان شاعری کے بہتے ہوئے دھارے کا رخ پھیرا ہے اور لکھنو کی زبان میں دلی کے سوز و گداز کو بھرا ہے وہی حال دل کا بھی ہے ۔ دل کی زبان لکھنو کی ہے مگر خیالات اور اسلوب نظم میں وہ دھلوی رنگ کی تقلید کرتے ہیں ۔ اور حضرت جلال کے کلام کی گرمی آنکے یہاں بھی جلوہ گر نظر آتی ہے ۔

جناب دل کی کہنہ مشقی اور پختگی میں کوئی کلام نہیں ۔ آن کے یہاں جذبات کی فراوانی ہے اور تصنع بہت کم ہے ۔ وہ صحیح مذاق شعر سے آشنا ہیں اور آنکے اشعار میں طرز بیان کی نفاست کے ساتھ ساتھ درد و اثر کی کمی نہیں ۔ دل کے کلام میں بڑی دلاویزی ہے اور فن کے اسرار و رموز سے وہ خوب واقف ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ

وہ بلند و نفیس خیالات کو برجستہ الفاظ میں ادا کرنے پر پوری قدرت رکھتے ھیں ۔ اس پر اُن کی چست بندشیں اور خوبصورت تشبیہات کلام کی جاذبیت میں اور بھی چار چاند لگا دیتی ھیں ۔

دل یوں تو حضرت امیر مینائی کے شاگرد ھیں لیکن اُن کے کلام پر ایک نظر ڈالنے سے اُستاد کے تصرف کا نشان نظر نہیں آتا ۔ غالباً اسکی ایک وجہ تو یہی ہے جو اوپر بیان ہوئی کہ دل جلال لکھنوی سے متاثر ھیں ۔ اسکے علاوہ اُنہوں نے یقیناً اساتذہ کے دواوین کا ذاتی طور پر غائر مطالعہ کیا ہے اور پھر اُنکی فطری ذکاوت و قابلیت اپنے ذاتی رنگ کے قائم کرنے میں بڑی ممد و معاون ہوئی ہے ۔ اُن کے اکثر اشعار میں ایک لطافت پائی جاتی ہے ۔ لیکن اُن کے کلام کی نمایاں خصوصیت با مزا سنجیدگی و متانت ہے ۔ حیرت ہے کہ دل شاہجہان پور کے علاقے میں رہ کر اور لکھنوی دبستان شاعری کے گہوارہ میں ہوتے ہوئے بھی ابتذال ' رکاکت اور سوقیانہ پن سے اپنے کلام کو بالکل بچائے گئے ۔ اُن کے ھاں زلف و کاکل ' سرمہ اور کاجل ' مسی اور افشاں کا بیان نہ ہونے کے برابر ہے ۔ یہ ضرور ہے کہ اُنکے یہاں بعض اشعار بالکل سپاٹ بھی مل جاتے ھیں لیکن اُنکے بہتر اشعار کے مقابلہ میں ایسے اشعار کی تعداد کم ہے ۔

کلام دل کی ایک اور خوبی کا تذکرہ کرنا یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ ہے بحروں کا انتخاب ۔ دل صاحب نے ترنم ریز بحریں منتخب کر کے اپنے کلام میں نغمگی و غنائیت کا جادو خوب جگایا ہے ۔ مثال کے طور پر یہاں اُنکی ایک غزل کے دو شعر دیکھئے جن میں بحر کے انتخاب نے مضمون کا ساتھ دیتے ہوئے ترنم کی بدولت ایک لطافت پیدا کر دی ہے ۔

شباب ڈھلتے ھی آئی پیری ' مآل پر اب نظر ہوئی ہے
بڑی ھی غفلت میں شب گزاری کہاں پہونچکر سحر ہوئی ہے
وہ آہ دل سوز جوش غم میں جناب دل کی جو ھمنفس تھی
جہاں جہاں اُس کو آزمایا وھیں وھیں بے اثر ہوئی ہے

غرض بحیثیت مجموعی حضرت دل ایک کہنہ مشق اور کامیاب غزلگو ھیں اور خوش قسمتی سے اب تک حیات ھیں ۔ خدا کرے کہ وہ برسوں جئیں اور اُردو ادب میں اپنے بیش بہا کلام کی بدولت اور اضافہ کریں ۔ آجکل موصوف کا مشغلہ وھی طبابت ہے اور کچھ زمینداری وغیرہ کا کام بھی ہے ۔ اُن کا ایک مجموعہ کلام ''نغمہ دل'' کے نام سے شایع ہو چکا ہے ۔

انتخاب کلام

چمن دھر میں سر پھول رہا پیش نظر کھینچتا تھا ھمیں نقشہ تری رعنائی کا

نظر آتی ہے مجھے حسن کی دنیا بے حس   کس کو افسانہ سناؤں شب تنہائی کا

کیا جانے کس خیال سے چھوڑا بحال زار   مجھ پر بڑا کرم ہے مرے چارہ ساز کا

نا رسائی کا سبب کیا ہے یہی ذوق طلب   بڑھ گئے ہم اسقدر آگے کہ رہبر رہ گیا

خاک ہو جانا نمود عشق ہے اے اہل دل   جل گیا پروانہ لیکن رنگ محفل بن گیا

وقت رخصت تسلیاں دے کر   اور بھی تم نے بے قرار کیا

چمکی تھی برق طور کہ بے خود ہوئے کلیم   پردہ حجاب کا جو اٹھا بھی تو کیا ہوا

آغاز محبت سے انجام محبت تک   گزرا ہے جو کچھ ہم پر تم نے بھی سنا ہوگا

یاد ہے ہاں یاد ہے طرز نگاہ مست یار
ایک نازک پنکھڑی سے پارہ پارہ دل ہوا

در حقیقت مضطرب دل کے لئے وہ موت تھی
اصطلاح عام میں تسکین جس کا نام تھا
یاد ہے اب تک وہ کیف انگیزئ جوش بہار
شاخ گل تھی دست ساقی ' ہر گل تر جام تھا

رہا اپنے سفینے کا یہ عالم بحر ہستی میں
کبھی ساحل سے مل جانا کبھی کچھ دور ہو جانا

سر بہ سجدہ سوئے بزم ناز جانا ہی پڑا   حسن کی تسخیر پر ایمان لانا ہی پڑا
کھیلتی تھی یوں چمن میں شوخئ موج نسیم   بے تکلف ہر کلی کو مسکرانا ہی پڑا

ہم کو تسلیم زمانہ کا تغیّر لیکن   عشق مظلوم رہا حسن پشیماں نہ ہوا

پھر اعتبار عشق کے قابل نہیں رہا   جو دل تری نظر سے گرا دل نہیں رہا
کیا کہئے اب مآل محبت کی سرگزشت   یاد آسکی رہ گئی ہے مگر دل نہیں رہا

کھینچی ہوئی اک شکل مجسّم نظر آئی   دیکھا کسی مایوس نے یوں جانب در آج

سوز و گداز شمع کو بیکار دیکھ کر   تڑپا ہوں صبح تک یہی آثار دیکھ کر
اے حسن جو سزائے تمنا ہو وہ قبول   لیکن مری نظر کو پھر اک بار دیکھ کر
تم تو سکون خاطر ناشاد بن گئے   سمجھا تھا میں کچھ اور یہ رفتار دیکھ کر
تقویٰ بھی آج ہو گیا قربان میکدہ   ہر جام میں بہار کے آثار دیکھ کر

بڑھے جوش جنوں میں دست وحشت جس قدر چاہے
قیامت کی ہے گنجائش مرے چاک گریباں میں

دفعتاً پھر بھول جاتے ہیں جو کچھ آتا ہے یاد
ہم کسی کے سامنے کیا جانے کیا کہنے کو ہیں

نہ وہ آرام جاں آیا نہ موت آئی شب وعدہ
اسی دھن میں ہم اٹھ اٹھ کے ہزاروں بار بیٹھے ہیں

خود شعلۂ فنا سے ہم آغوش ہو گئے   بزم وفا میں آج شہیدان آرزو
ناکامیوں کے بعد بھی چھوٹا نہ ہاتھ سے   کیا جانے کس خیال سے دامان آرزو

سرِ طُور ایک برق حسن لہراتی نظر آئی
ذرا شوخی سے جھٹکا تھا کسی نے اپنے داماں کو

نہ ہوا دل کسی صوُرت سے بھی مانوس اے دل
گو لبھاتی رہی نیرنگئ دنیا مجھ کو

سپہر اوج پر آنکا دماغ تھا اے دل خرام ناز سے وہ جن کے دل مسلتے تھے

نظروں سے نہاں کیوں رہتے ہو جب جان لیا پہچان لیا
منشائے حجاب آخر کیا ہے تم کو تو خدا بھی مان لیا

یہ شرح غم ہے یہ انجام نالۂ سحری کہ چھا گئی مرے ظلمت کدہ پہ بے اثری

ہو چکا ناکامئی دل تک بیان زندگی عشق نے اب کی مکمل داستان زندگی
ایک آہ سرد میں مضمر ہیں لاکھوں واقعات مختصر یوں کر رہا ہوں داستان زندگی
ہو چکی ہر بارگو اے شمع پروانوں کی خاک ذرہ ذرہ میں ہے پنہاں اک جہان زندگی
حشر بھی شامل ہے اے دل واقعات عشق میں
آپ کہئے گا کہاں تک داستان زندگی

نگہ مست سے او مڑ کے دیکھنے والے تجھے تو ہے ' مجھے اپنی خبر نہیں نہ سہی

کہئے تو کہدوں عرش بریں کو مقام دوست
ہمت مگر کچھ اور ہے اپنے خیال کی

ہو کچھ تو میری ناصیہ سائی پہ التفات اتنا نیاز عشق کو رسوا نہ کیجئے
آن کی نظر اٹھے گی کبھی تو پئے کرم حسن طلب یہی ہے تقاضا نہ کیجئے

مصیبت ہے نگاہ شرمگیں سے واسطہ دل کا
نہ آہ سرد بھرنے دے نہ منہ سے اُف نکلنے دے

ذروں میں کچھ کشش ہمیں محسوس ہو چلی
اے دل سنبھل کہ پیش نظر کوئے یار ہے

بہار جام بکف جھومتی ہوئی آئی شکست عہد نہ کرتے تو اور کیا کرتے

رات آنکھوں میں کٹ جاتی ہے دل پر وہ مصیبت ہوتی ہے
میں تارے گنتا رہتا ہوں جب دنیا غافل سوتی ہے
قدرت کی چمن آرائی کا گو ایک اثر ہے دونوں پر
غنچے ہیں کہ ہنستے رہتے ہیں شبنم ہے کہ روتی رہتی ہے

دل صرف وفا ہوا تو سمجھے کیا چیز یہ جنس رائگاں ہے

اے جوشِ الم کب تک گریہ دل آج تو ڈوبا جاتا ہے
موجیں ہیں کہ بڑھتی جاتی ہیں طوفاں ہے کہ امڈا آتا ہے

یہ مانا سننے والے کی نظر کچھ اور کہتی ہے
ہوائے کوچۂ دلکش مگر کچھ اور کہتی ہے
تمنائے کرم اس کیف پر کچھ اور کہتی ہے
چھلک جاتا ہے جب ساغر نظر کچھ اور کہتی ہے

منظر اداس شمع سحر پیکر خموش اٹھا ہے کوئی گرمئی محفل لئے ہوئے
موج بہار، موج صبا، موج بوئے گل ہر دلکشی ہے طوق و سلاسل لئے ہوئے
آئی صدا کہ تو ابھی منزل سے دور ہے پہونچا جہاں جہاں بھی مجھے دل لئے ہوئے

اٹھے جو بہر کرم وہ نگاہ بے پروا سکونِ اہل محبت ہے عمر بھر کے لئے
تلاش منزل مقصود میں نہ ہو مایوس بہت وسیع ہے دنیا تری نظر کے لئے

اے اہل نظر میں کیا سمجھوں آگاہ نہیں مستقبل سے
انجام محبت کیا ہوگا، آغاز ہی ایک افسانہ ہے

وہ کون سا مقام تھا اے ضبط راز عشق
ہم جن حدوں میں چاک گریباں نہ کر سکے

مایوسِ ازل ہوں یہ مانا ناکام تمنا رہنا ہے
جاتے ہو کہاں رخ پھیر کے تم مجھ کو تو ابھی کچھ کہنا ہے

دکھتا ہے ہمدم اس کوچہ میں ذرّے ہیں قیامت زا جسکے
انجام وفا ہے نظروں میں آغاز ہی سے دکھ ہوتا ہے

خاموش ہے کیوں، ہو نغمہ سرا صیّاد سے بھی کچھ اُنس بڑھا
مدت تک اے طائر وحشی تجھکو قفس میں رہنا ہے
اے گریۂ خوں تاثیر دکھا اے جوش فغاں کچھ ہمت کر
رنگیں ہو کسی کا دامن بھی اشکوں کا یہاں تک بہنا ہے
یہ پاس وفا نے مجھ سے کہا جب درس دیا خاموشی کا
گو درد جگر پہلو بدلے اس حد میں تجھے اب رہنا ہے

شباب ڈھلتے ہی آئی پیری، مآل پر اب نظر ہوئی ہے
بڑی ہی غفلت میں شب گزاری کہاں پہونچکر سحر ہوئی ہے
ستم غریبوں پہ ہو رہے ہیں، ہزاروں جان اپنی کھو رہے ہیں
وہ ضد سے پھر بھی نہ باز آئے ادھر کی دنیا اُدھر ہوئی ہے
کجا وہ شب بھر میں ختم ہونا، کجا یہ جل جل کے عمر کھونا
ترے جگر سوختہ کے آگے خفیف شمع سحر ہوئی ہے
نہ پونچھ دامن سے تو خدا را، لہو بھی شامل ہے اس میں دل کا
یہ اشک رنگیں ہیں ان سے ہمدم ابھی ابھی آنکھ تر ہوئی ہے
وہ آہ دل سوز جوشِ غم میں جناب دل کی جو ہم نفس تھی
جہاں جہاں اُس کو آزمایا، وہیں وہیں بے اثر ہوئی ہے

اثر لکھنوی

جعفر علی خان نام اثر تخلص - ۱۲ جولائی ۱۸۸۵ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے - سلسلہ نسب اس مغل خاندان سے ملتا ہے - جو مغل عہد حکومت میں زمرہ اطباء میں بہت ممتاز رہا ہے - مرزا علی حسین خاں مسیح الدولہ اور مرزا علی خاں حکیم الملک ایسے مشاہیر اسی خاندان میں ہو گزرے ہیں -

فارسی کی درسی کتب پڑھ لینے کے بعد اثر ۱۸۹۶ء میں جوبلی ہائی اسکول لکھنؤ میں داخل ہوئے - ۱۹۰۲ءمیں انٹرنس کا امتحان پاس کر لینے کے بعد کیننگ کالج لکھنؤ میں داخلہ لیا - اور ۱۹۰۶ء میں بی - اے کے امتحان میں کامیاب ہوئے - ایم اے اور ایل ایل - بی کی تیاری میں ایک سال بسر کیا - لیکن اس میں ذہنی مناسبت نہ پا کر ترک کر دیا -

۱۹۰۹ء میں صوبہ متحدہ کی صوبائی انتظامیہ ملازمت میں بطور ڈپٹی کلکٹر شریک ہوئے - ۱۹۳۶ء میں سرکار انگریزی سے خان بہادر اور ۱۹۳۹ء میں ایم - بی - ای کے خطابات ملے -

۱۹۴۰ء میں آپ نے ملازمت سے ریٹائر ہو کر پنشن لے لی - لیکن دوبارہ الہ آباد کے ایڈیشنل کمشنر بنا دئے گئے - الہ آباد سے ہی آپ ریاست جموں و کشمیر کے ہوم ممبر اور وزیر تعلیم ہو کر چلے گئے - کشمیر سے آپ کا تعلق قیام پاکستان تک رہا - اس کے بعد سے آپ اپنے آبائی شہر لکھنؤ میں فروکش ہیں اور ادبی اور شعری خدمات انجام دے رہے ہیں -

اثر صاحب ان خوش نصیب شعرا اور ادباء میں شمار ہوتے ہیں - جنہیں دنیا میں فارغ البالی' آسودگی اور فراغت حاصل ہے - یہی وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے اثر مسلسل ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں -

جناب اثر کا پہلا مجموعہ کلام ۱۹۲۳ء میں ''اثرستان'' کے نام سے لکھنؤ سے شائع ہوا - دوسرا مجموعہ کلام - ''بہاراں'' ۱۹۳۵ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر شائع ہوا - ''رنگ بست'' اور ''لالہ گل'' اس زمانے میں شائع ہوئے جب آپ ریاست جموں و کشمیر میں وزیر تھے -

اثر ایک چابکدست ، مشاق اور پر گو شاعر ھیں ۔ غزل ، نظم ، قطعہ ، رباعی غرض تمام اصناف سخن پر بہت کچھ کہا اور خوب کہا ھے ۔ عزیز لکھنوی سے شرف تلمذ ھے لکھتے ھیں ۔

اثر ھے نام ، وطن لکھنؤ عزیز استاد
نکالتا ھوں نئے راستے ، زباں کے لئے

غزل میں صاف ستھری اور با محاورہ زبان استادانہ مہارت سے استعمال کرتے ھیں دور جدید کے لکھنؤی شعراء میں ان کا شمار اساتذہ فن میں ھوتا ھے ۔ لیکن اثر کا حقیقی استادانہ اور شاعرانہ جوھر دوسری زبانوں کے منظوم ترجموں میں بہت نمایاں نظر آتا ھے ۔ اثر صاحب نے مشرق و مغرب کے نامور شعراء کے منظومات کا ترجمہ اردو نظم میں اس خوبی سے کیا ھے ، کہ ان کے نازک سے نازک احساسات کو مجروح نہیں ہونے دیا اور ترجمے میں اصل کا رنگ پیدا ھو گیا ھے ۔

اثر صاحب اردو زبان کے ان محسنوں میں سے ھیں جنھوں نے اردو شاعری کے دامن کو غیر ملکی زبانوں کے رنگین اور مہکتے ھوئے پھولوں سے حسب مقدور مالا مال کرنے کی کوشش کی ھے ۔

اثر نے یہ تراجم صرف پابند نظموں میں ھی نہیں کئے ۔ بلکہ اسالیب سخن میں وسعت پیدا کرنے کے لئے نظم آزاد اور نظم معریٰ میں بھی منظوم ترجمے کئے ھیں ۔ اثر نے صرف انگریزی زبان کے شہ پاروں کو ھی اردو میں منتقل نہیں کیا بلکہ سنسکرت بنگلہ اور عربی سے معرکے کی نظمیں بھی اردو میں منتقل کی ھیں ۔ کچھ مدت ھوئی آپ مہابھارت کا منظوم ترجمہ کر رہے تھے ۔ معلوم نہیں یہ کام اب کس منزل میں ھے ۔ علاوہ ازیں سر زمین کشمیر نے بھی اثر کی شاعری پر گھرا اثر کیا ھے ۔ یہی وجہ ھے کہ ان کے کلام کا بہت سا حصہ کشمیر کے قدرتی مناظر سے متعلق ھے ۔

انتخاب کلام

نظر اٹھی نظر کے ساتھ اک موج شراب اٹھی
مجسّم کیف رنگیں بن کے وہ مست شباب آیا
کلوں کی گود میں جیسے نسیم آ کر مچل جائے
اسی انداز سے ان پرُ خمار آنکھوں میں خواب آیا

کبھی ھے تکیہ ترے کرم پر ، کبھی ھے خوف عتاب دل میں
یہی ھے جنت ، یہی ھے دوزخ ، عذاب کیسا ثواب کیسا

میں ان کے جلووں کا آئینہ ہوں وہ میری حیرت کا آئینہ ہیں
جہاں یہ عالم ہو محویت کا ' سوال کیسا جواب کیسا

دل کا ہے رونا ' کھیل نہیں ہے ' منہ کو کلیجا آنے دو
تھمتے ہی تھمتے اشک تھمیں گے ' ناصح کو سمجھانے دو
کہتے ہی کہتے حال کہیں گے ' ایسی تمہیں جلدی کیا ہے
دل تو ٹھکانے ہونے دو ' اور آپ میں ہم کو آنے دو
دل کو اثر کے لوٹ لیا ہے ' شوخ نگہ اک کافر نے
کوئی نہ اس کو رونے سے روکو ' آگ لگی ہے بجھانے دو

اب ہاتھ ملتے ہیں کہ دم عرض ماجرا
کہنے کی بات دھیان سے کیسے اتر گئی
کچھ دن کی اور کشمکش زیست ہے اثر
اچھی بری گذرنی تھی جیسی گذر گئی

اک چھلکتا ہوا جام ' آنکھ ملا کر ساقی
جس کے ہر قطرے میں ہو صبح کا جوہر ساقی
رنگ بن جائے پری اور پری ہو رقصاں
اسقدر تیز چلے دور میں ساغر ساقی
دیکھنا ہے مجھے مشاطگئی صبح بہار
جام بلّور میں دے بادۂ احمر ساقی
کسی ترکیب سے حل کر دے تبسّم اپنا
یوں نہیں ' ہونٹوں کے لے جا کے برابر ساقی
ایسی سے پیتے ہیں تھم تھم کے مزے لے لے کے
پھیر لے ایک ذرا چشم فسوں گر ساقی
مجھ کو معلوم ہے میں پی کے بہکنے کا نہیں
بند مجھ پر تو نہ کر میکدے کا در ساقی

پھر پلٹ آئے زمانہ وهی بے فکری کا
آنکھ جب روتی نہ تھی دامن تر پر ساقی
دے وہ بادہ کہ غم دهر فسانہ هو جائے
دل کے مانند فضا بھی ہے مکدّر ساقی
رحم فرما کہ یہ ہے تیرہ شبی کا عالم
زندگی جو تھی عمل ' خواب ہے یکسر ساقی
ان کی رسوائی میں ہے تیری بھی سُبکی مضمر
بھوُلے بھٹکوں کا پھر اک بار هو رهبر ساقی
جب غلط کوش نہ تھے رند صفا کیش ترے
دیکھ لے پھر اثر مست وہ منظر ساقی

دلہن بنی هوئی اب کے چمن میں آئی ہے
بہار هو کے تری انجمن میں آئی ہے
ظہور عشق حقیقت طراز تھا ورنہ
یہ دل کشی کہیں دار و رسن میں آئی ہے
وہ بوئے خوں ہے کہ گھُٹتا ہے دم معاذ اللہ
بہار وادیِ زخم کہن میں آئی ہے
بقدر ذوق نہیں جوئے شیر موج افزا
هوائے تیشہ سر کوهکن میں آئی ہے

ادب لاکھ تھا پھر بھی اُس کی طرف نظر میری اکثر بھٹکتی رهی
اگر هونٹ سی بھی لئے ' کیا هوا نگاهوں سے اُلفت ٹپکتی رهی
نہ کھِلنے پہ بھی میرے دل کی کلی گل تر کی صورت مہکتی رهی

صحرا سے چلے هیں سوئے گلشن خونیں جگرانِ چاک دامن
پیغام بہار دے رهی ہے داغوں کی جھلک دلوں کی اُلجھن
غنچوں کے بدن میں سنسنی ہے مستی میں چھوا صبا نے دامن

دل عشق کی لے سے چھک رہا ہے   اک پھول ہے ، جو مہک رہا ہے
آنکھیں کب کی برس چکی ہیں   کوندا اب تک لپک رہا ہے
اب آئے بہار یا نہ آئے   آنکھوں سے لہو ٹپک رہا ہے

وہ خمار آلودہ آنکھیں دیکھ کر   موج سے لینے لگی انگڑائیاں
زندگی اور زندگی کی یادگار   پردہ اور پردے پہ کچھ پرچھائیاں !

نگاہیں کیوں نہیں ملتیں ، عرق ماتھے پہ کیسا ہے
تو کیا سچ ہے کہ تم نے بھی سنی ہے داستاں میری ؟
تمہیں چاہا ؟ خطا دل کی ، وفا کیوں کی ؟ سزا دل کی
گنہگار محبت ہوں نہ کھُلواؤ زباں میری

کیا شخص اثر بھی تھا ، سمجھا نہ کوئی اب تک
عاشق تھا کہ شاعر تھا ، دیوانہ کہ دانا تھا

خون ناحق تیرا اے دل ، اس پر کیوں کر ثابت ہو گا
وہ تو جیسے مدھ ماتی ، بہکی بہکی باتیں کرتا ہے
پچھلے پہر ہنگام سحر یوں پھول سنورتے نکھرتے نہ تھے
مانوں گا نہ میں تُو پچھلے پہر گلشن کی طرف سے گزرتا ہے
پیغام یہ کس کو جاتے ہیں ، معلوم تو ہو دیوانے اثر
تو خاک پہ بیٹھا کیا لکھتا اور لکھ کے مٹایا کرتا ہے ؟!

دل پُر شوق ہے اور تیرے تصور کے مزے
گل کی آغوش میں اب کچھ نہیں نکہت کے سوا

اُن کی حسرت نہ پوچھ جو تارے   دامن صبح میں بکھر جائیں

نازک لبوں پر ، ہلکی سی لرزش   کھِلتی کلی یا مِسّی گلابی

نشہ آنکھوں میں اُتر آیا باندازِ خمار اور ابھی دور میں وہ نرگس مخمور نہیں

پروانہ اور حریم تجلی میں باریاب ! ذوق تپش نے در خور محفل بنا دیا

مانا وہی چم خم ہے وہی حسن و نزاکت
جنبش بھی اُس ابرو کی سی کیا ہے مہ نو میں ؟

آہ چلی یوں توڑ کے دل کو سنگ سے نکلے جیسے شرارہ
آخری آنسو یوں ہے مژہ پر جیسے اُفق پر چمکے ستارہ

خاکستر پروانہ میں بھی آگ دبی ہے اے باد صبا دیکھ کے دامن کی ہوا دے

ہنگامۂ ہستی کی بس اتنی حقیقت ہے
اک موج تھی جو اُٹھ کر پھر مل گئی دریا سے

افسانہ و افسوں ہے جلووں کی فراوانی وہ جب نظر آتا ہے تنہا نظر آتا ہے

یہ نقش بنا ڈالا وہ نقش مٹا ڈالا ہر آن سنورنے کو اک تازہ بہانہ ہے

محبت نے رگ رگ میں نشتر بھرے ہیں ذرا دل دکھانا خبردار ہو کر

دل و جگر دونوں مل کے باہم مجھی کو الزام دے رہے ہیں
کہ جیسے اُس کی جفا کے بدلے لٹایا اُن کو مری وفا نے
بساط آرا یہاں تو ایسی کہ لحظ لحظہ نئی ہے دنیا
مگر یہ ہستی ، یہ رنگ مستی کہ پائبات شرر نہیں ہے
اُٹھی جو مینا سے موج صہبا ، دلوں میں ڈوبی سرور ہو کر
نظر میں اُبھری تو نور ہو کر ، نظر کو لیکن خبر نہیں ہے

جب آشیاں کی یاد اسیری میں آ گئی اُڑتے ہوئے ہوا میں شرر دیکھتے رہے

جھپکی ذرا جو آنکھ جوانی گزر گئی بدلی کی چھاؤں تھی ادھر آئی ادھر گئی

کیا ہم نے چھلکتے ہوئے پیمانے میں دیکھا
یہ راز ہے میخانے کا افشا نہ کریں گے

یہ اتفاق تو دیکھو بہار جب آئی ہمارے جوش جنوں کا وھی زمانہ تھا

محبت کی اللہ رے پردہ داری تمنا تمنا کی محرم نہیں ہے
خفا تو نہ ہو گے جو اک بات پوچھیں وہ ہے کون وعدہ جو مبہم نہیں ہے
نہ جانے کدھر جا رہی ہے یہ دنیا کسی کا اثر کوئی محرم نہیں ہے

چاہا حریف جلوہ تو ہونا بہار نے
مہلت نہ دی تبسم نیم آشکار نے
آلودۂ سرشک ہے وہ چشم سرمہ سا
یہ کیا ستم کیا دل حسرت شعار نے
ارمان دل سے منہ کو چھپائے نکل گئے
اس طرح دیکھا اُس نگہِ شرمسار نے
غنچہ ہے جیسے "مائیوں بیٹھے" کوئی دلہن
مشاطگی کی حد نہیں رکھی بہار نے
اک اشک خوں مژہ سے اثر یوں ٹپک پڑا
پٹکا ہو جیسے جام کسی بادہ خوار نے

شوریدہ سری آپ کا در ڈھونڈھ رہی ہے
انجام ہے معلوم ، مگر ڈھونڈھ رہی ہے
یہ کس کی جدائی میں ہر اک آنکھ ہے پُرنم
یہ کس کو زمانے کی نظر ڈھونڈھ رہی ہے
اے جلوۂ جاناں ترے جلووں کے تصدّق
دل محو تماشا ہے نظر ڈھونڈھ رہی ہے
میرے بھی سیہ خانے میں دم بھر کو چلا آ
میری بھی شب تار ، سحر ڈھونڈھ رہی ہے

کیا یہی ہے سربلندی ہمت مشکل پسند
آسماں اور آخری منزل تری پرواز کی
چاند کو بدلی میں چھپتے اور نکلتے دیکھ کر
پھر گئی آنکھوں میں صورت اک سراپا ناز کی
آہ وہ کافر جو دے تسکین تڑپانے کے بعد
اور اس پر داد چاہے شوخئی انداز کی

نہ کر ذکر کیا فائدہ ہم نشیں — پلٹتے ہیں بیتے ہوئے دن کہیں
عزائم کی پرواز تیز اور تیز — ستاروں کی جھکنے لگی ہے جبیں
اثر حسن مغرور بھی مست ہو — یہاں تک تو ہو عشق کیف آفریں

اک دل تھا سو اس نے بھی کیا آج کنارا
اب دیکھئے کیوں کر ہو محبت میں گزارا
آغاز محبت ہو کہ انجام محبت
ہے دُور ہمیشہ لب ساحل سے کنارا
کھینچا ہے اثر ''رنج دلی'' تم نے بھی شاید
ملتا ہے بہت ''میر'' سے انداز تمہارا

کوئی نہ ڈھونڈے تیرا سہارا — درد محبت مار اُتارا
اے غم جاناں ، اے غم جاناں — تُو تو نہ کر فرقت میں کنارا
اب ساحل کرتا ہے اشارے — چھوڑ گیا جب کھیون ھارا
موہ ے دل کو ، باتیں ایسی — لیکن ظالم ، تاهم پیارا

رہے جاتے ہیں ہر اک گام پر دو چار تھک تھک کر
رواں ہے سوئے منزل کارواں پر کارواں پھر بھی
سمجھتا ہوں دل ناشاد تڑپانے کی باتیں ہیں
وہ تجھ پر مہرباں کب تھا کہ ہوگا مہرباں پھر بھی
نشیمن جلتے دیکھا تھا ، اسے مدت ہوئی ، لیکن
نواح دل سے اٹھتا ہے تصور میں دھواں پھر بھی

سرمایۂ طرب تھیں اک روز جو نگاہیں
اب یادگار ان کی کچھ اشک ہیں کچھ آہیں
گل پھول چاند تارے ' غنچے ' شگوفے ' بوٹے
جو چاہے اُن کو چاہے بس ایک ہم نہ چاہیں
جوہر سے حسن کے ہو تخلیق جب سحر کی
اس وقت کوئی دیکھے وہ شرمگیں نگاہیں
اپنی بساط میں تو ہم نے کمی نہیں کی
اب تم بتاؤ کیونکر رسم وفا نباہیں
اُن کے بغیر گلشن ماتم کدہ ہے گویا
فریاد ہر شگوفہ ' غنچے تمام آہیں
اے جوش نامرادی بس اتنی التجا ہے
آنکھیں نہ ڈبڈبائیں لب پر نہ آئیں آہیں
سچ سچ اثر بتاؤ دل کس کو دے دیا ہے
افسانہ کہہ رہی ہیں حسرت بھری نگاہیں

متوالی ' رسیلی آنکھوں میں نیند ایسی گُتھی ہے کہ بس توبہ
فتنے تو اٹھانا اک جانب ' جادو ہی جگانا مشکل ہے
طائر ہے ' نہ صید وحشی ہے ' دل ہے ' البتہ تڑپتا دل
دیکھو تو ادھر ' کوشش تو کرو ' کیا ایسا نشانا مشکل ہے
جو عشق کے فن کے ماہر ہیں اُن سے پوچھو ' تم کیا جانو
کب اشک بہانا مشکل ہے اور کب پی جانا مشکل ہے
موسم اور وقت کی باتیں ہیں ' راتیں ہیں نہ وہ برساتیں ہیں
رونے میں کبھی طوفاں تھے ' اب دو اشک بہانا مشکل ہے
میں میر کا دم بھرتا ہوں اثر میں اُس کے کمال کا قائل ہوں
ہاں شعر تو تم کہہ لیتے ہو ' وہ بول بنانا مشکل ہے

امینِ حزیں

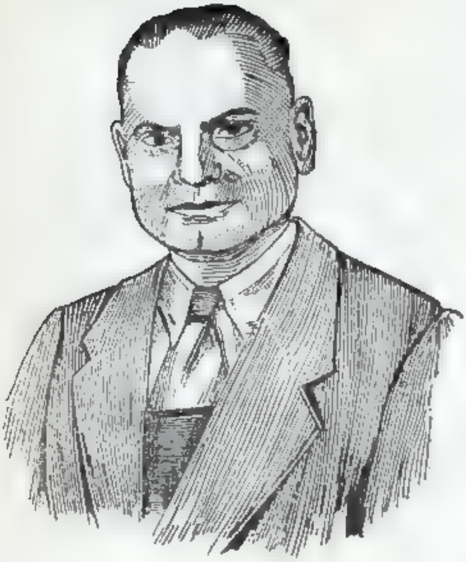

خواجہ محمد مسیح پال نام امین حزیں تخلص ۱۸۸۴ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا آبائی وطن کشمیر ہے جہاں سے آپکا خاندان منتقل ہو کر سر زمین پنجاب میں آباد ہوا۔ خواجہ صاحب کے والد خواجہ احمد دین پال صاحب بڑے دیندار و ذی علم بزرگ تھے اور بلا مبالغہ باپ کی یہ دونوں خوبیاں خواجہ صاحب اور اُن کے چھوٹے بھائی اثر صہبائی میں ورثہ میں آئی ہیں۔ حضرت امین حزیں نے عربی و فارسی کی تعلیم شمس العلما مولوی سید میر حسن صاحب (اُستاد علامہ اقبال مرحوم) سے حاصل کی۔ جن کے متعلق یہ مشہور ہے کہ عربی، فارسی اور اردو ادبیات کا صحیح مذاق پیدا کرنے میں خاص مہارت رکھتے تھے اور یہ ایک مسلمہ حقیقت بھی ہے۔ ہمارے سامنے کم از کم مولوی میر حسن صاحب کے شاگردوں میں اقبال و امین حزیں کی دو روشن مثالیں موجود ہیں۔ مولوی میر حسن مرحوم کے دامن فیض سے وابستہ رہنے کے بعد خواجہ صاحب انگریزی کی تحصیل کی طرف متوجہ ہوئے آپ نے سیالکوٹ کے مشن ہائی سکول اور بعد میں وہاں کے مشن کالج میں تعلیم پائی۔ پھر ڈاکٹری پڑھنے کا شوق ہوا مگر سائنس سے طبیعت کی مناسبت نہ پاکر ملازمت اختیار کر لی اور گلگت میں پولیٹیکل محکمے کے دفتر میں ملازم ہوگئے۔ وہیں سے ترقی کرتے کرتے خطاب ''خان بہادر'' پایا۔ خواجہ صاحب کو ملازمت کے زمانے میں بھی علمی مشاغل کا شوق رہا اور ملازمت سے سبکدوش ہوکر تو آپ ہمہ تن اُردو ادب کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔

ابتدا ہی سے حضرت امین حزیں کا رجحان شعر و شاعری کی طرف تھا۔ لیکن اُنہیں اپنی موزونیٔ طبع کا صحیح احساس ۱۹۰۲ء میں ہوا جب اُنکی ایک غزل لکھنؤ کے رسالہ ''پیام یار'' میں چھپکر مقبول ہوئی۔ چنانچہ اسی احساس سے متاثر ہو کر وہ علامہ اقبال کے پاس شاگرد ہونے کے خیال سے گئے اور اُن سے مل کر اپنے ارادے کا اظہار کیا۔ اقبال مرحوم نے کہا ''شاعری خدا داد چیز ہے اگر شعر گوئی کا جذبہ سچا ہے تو مشق سخن کئے جائیے اور اساتذہ کا کلام بغور پڑھئے تاکہ کان بحروں سے مانوس ہو جائیں اور زبان میں کوئی سقم باقی نہ رہے''۔ اُس دن سے امین صاحب اس مشورے پر عامل ہیں۔ ابتدا میں مولانا ظفر علی خان اور مولانا محمد علی جوہر کے رنگ

سے متاثر تھے بعد ازاں اقبال کو پسند کرنے لگے اور یہ رنگ کچھ ایسا بھایا کہ پھر کسی کا نقشہ نہ جم سکا ۔

خواجہ صاحب ایک مشّاق و قادر الکلام سخنور ہیں ۔ انہوں نے تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے ۔ وہ نظم میں اقبال اور غزل میں غالب کے پیرو ہیں ۔ اُن کے مجموعہ کلام ''گلبانگ حیات'' پر ایک سر سری نظر ڈالنے سے یہ بات آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ امین حزیں صاحب اصلاحی ، اخلاق اور خطیبانہ شاعری کے علم بردار ہیں اور اُن کے خیالات فکر اقبال سے اس درجہ متاثر ہیں کہ انہیں اقبال کا معنوی شاگرد کہنا غلط نہ ہوگا۔اُن کے کلام میں بھی آپ کو زندگی کی تفسیر ، تلاش ، تجسس اور قوت عمل کی اہمیت ، یقین محکم کی توضیح اور چراغ خودی کی تنویر نظر آئے گی ۔ لیکن اُن کا اسلوب یقیناً اقبال کے مقابلے میں زیادہ سلیس اور عام فہم ہے ۔ یہاں ان باتوں کے تذکرے سے امین حزیں اور علامہ اقبال مرحوم کا تقابل مقصود نہیں بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ حضرت امین حزیں کے رنگ سخن کی وضاحت ہو جائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ انہوں نے اپنے اس مخصوص رنگ کے قائم کرنے میں کن کن اساتذہ کا اثر قبول کیا ہے ۔

امین صاحب عہد حاضر کے اُن قابل قدر شعرا میں سے ہیں ۔ جنہوں نے صحیح معنوں میں شاعری میں اپنے سچے و مخلصانہ جذبات کی ترجمانی کی ہے ۔ آپ اُن کی غزل ، نظم ، قطعہ اور رباعی غرضکہ کسی صنف کو پڑھئے اُس میں شاعری کے حقیقی جذبات کا اُمنڈتا ہوا ایک طوفان ضرور پائیے گا اُن کے کلام کی یہی وہ خوبی ہے جو دوسرے کئی محاسن شعری کا پیش خیمہ ہے ۔ مثال کے طور پر وہ جوش و ولولہ گونج اور تڑپ جو کلام امین کا جزو خاص بن چکی ہے آپ کو اسی لئے نظر آتی ہے کہ وہ اشعار میں حقائق کو سموتے اور رسمی باتوں سے یکسر گریز کرتے ہیں ۔ وہ زندگی کی نہ صرف اہمیت کو جتاتے ہیں بلکہ اُسے پر مقصد اور مفید بنانے کے بھی موئید ہیں ۔ اس سلسلے میں انہوں نے یقین محکم اور عمل صالح کی جس دلکش پیرائے میں تلقین کی ہے وہ سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہی دلنشین بھی ہے ۔ لیکن اس سے بھی زیادہ قابل ستائش بات یہ ہے کہ اُن کی مقصدی شاعری میں وعظ و پند کا بہت کم روکھا پھیکا پن پیدا ہونے پایا ہے ۔

بحیثیت مجموعی اُن کے کلام میں بڑا عمق پایا جاتا ہے اور بظاہر اس کے دو ہی وجوہ ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ امین نے میر حسن جیسے عالم و فاضل شخص سے اکتساب علم کیا ۔ دوسرے یہ کہ خود اُن کی زندگی بڑی پاکیزہ اور قومی درد سے مملو رہی ہے ۔ مزید بر اں سونے پر سہاگا یہ ہوا کہ اُن کی طبع موزوں نے ملک کے مشاہیر شعرا کے کلام کا مطالعہ کر کے فکر و اسلوب بیان کے جوہر بھی حاصل کر لئے ۔ چنانچہ ان خصائص کی بدولت اُن کی شاعری میں ایک دوامی رنگ پیدا ہو گیا ہے اور وہ زندگی کے ٹھوس حقائق اور عارفانہ جذبات کو جس سادگی ، برجستگی اور جاذبیت کے ساتھ ادا کرنے پر قادر ہیں وہ یقیناً انہیں کا حصہ ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ وہ خاصے پر گو واقع ہوئے ہیں اور ''گلبانگ حیات'' کے بعد سے اُن کا کلام ملک کے مقتدر رسائل میں بالالتزام چھپتا رہتا ہے بالخصوص قیام پاکستان کے بعد ''ہمایوں'' اور ''ساقی'' میں

تقریباً ہر ماہ اُن کا کلام دیکھنے میں آتا ہے لیکن اس کے باوجود اُن کے کلام میں کیف و سرور ضرور ہے ۔ اور اُس کا محتاط انتخاب بھی ایک ضخیم مجموعے کی شکل میں شائع ہو سکتا ہے ۔

انتخاب کلام

تغزل

درد دل اصل میں تھا ولولۂ جوش نمو   جس سے یہ دانۂ نا چیز شجر ہو کے رہا
عشق میں جوش عبودیّت دل دب نہ سکا   کہیں آنسو کہیں نالہ کہیں پر ہو کے رہا
میں نہ کہتا تھا کہ اے دیدۂ تر ضبط سے کام   خون دل ہو کے رہا خون جگر ہو کے رہا

تھی یہ کس کی آرزو جس کے لئے   تارک صد آرزو ہونا پڑا
عشق کا انجام رنگیں دیکھئے   اشک سادہ کو لہو ہونا پڑا

جس سے ہے بزم عیش منور حضور کی
ہے وہ چراغ میرے ہی سوز و گداز کا
خود پردہ ہے وجود پس پردہ کی دلیل
اور آئینہ سراغ ہے آئینہ ساز کا
نکلے جناب شیخ بھی پھر تو ہوا پرست
گر وصلِ حور اجر ہے اُن کی نماز کا

سر کشی گام گام پر مجھ سے   اس دل بد لگام نے مارا !
ابتدا کی نہ انتہا کی خبر   قصۂ نا تمام نے مارا !
میں ''امیں'' کب فریب کھاتا تھا   دھر کے اہتمام نے مارا !

لائے پڑے ہیں جان کے جینے کا اہتمام کر
جن میں ہو کیفِ زندگی بجر خدا وہ کام کر

تجھ کو تری ہی آنکھ سے دیکھ رہی ہے کائنات
بات یہ راز کی نہیں اپنا خود احترام کر

درد سینے میں نہاں رہ کے اثر رکھتا ہے
ہمنشیں تک سے بیان حسن کی بیداد نہ کر
پھونک دے نغمۂ جاں سوز سے سامان قفس
بلبل تفتہ جگر! شکوۂ صیّاد نہ کر
لطف جینے کا ہے جب ہی کہ "دل‌ست خودی"
آسماں تک سے یہ کہدے "مری امداد نہ کر"
یاس میں پھوڑ کے سر مرتے ہیں کم ظرف "امیں"
ظرف عالی ہے ترا بیعت فرہاد نہ کر

تفکرات کی دنیا میں جستجوئے سکوں — علاج جس کا نہیں کوئی ہے یہی وہ جنوں
اسی کے خون سے رنگیں ہے داستان حیات — محال ہے کہ جیوں اور بے قرار نہ ہوں

وہ مرغ جس کی تگ و دو مجاہدانہ نہیں — گماں یہی ہے کوئی اس کا آشیانہ نہیں
نہ دے اس آگ کو نار خلیل سے نسبت — کہ جس کے سوز میں گلزار جاودانہ نہیں
شکست ہمت عالی ہے بے خودی کی تلاش — کہ کارخانہ ہے دنیا شراب خانہ نہیں

بلبل سوختہ ساماں سے سنا ہے میں نے
عشق اک آتش بے شعلہ ہے گلزار ہے حسن
صاف آتا ہے نظر دیدۂ بینا کو یہی
عشق اقرار حقیقت ہے اور اظہار ہے حسن
عشق بے چارہ ہی آگاہ نہیں ہے ورنہ
روز میثاق سے خود اسکا طلبگار ہے حسن

شباب عشق پرور پوچھ ہم سے — پرستار بہار جلوہ کیوں ہیں؟

اس حقیقت کو خدارا نظر انداز نہ کر
سرد ہو جاتا ہے وہ شعلہ جو بے باک نہ ہو

اگر شمع حقیقت کی ضیا باری نہیں ہر سو
تخیّل کو کہاں سے آ گئے آداب پروانہ ؟
وھی اس بزم ہستی سے سرور اندوز ہوتے ہیں
نگاہیں جنکی ہوں بے باک اور اطوار مردانہ

جن نگاہوں میں ہے جہان سرور ہیچ ہے ان کے آگے میخانہ

چشم میگون یار کے صدقے نگہ سحرکار کے صدقے
حسن ھی حسن سر سے پاؤں تک میں سراپا نگار کے صدقے

نہیں آتے نہ آئیں وہ مرے گھر تصور میں تو ھیں مہمان دل کے

دلیل راہ ''چراغ خودی'' اگر ہو جائے
قدم مسافر ہستی کا تیز تر ہو جائے
مقام عالئی عرفانِ ذات ہے یعنی
خودی یہی ہے کہ تجھ کو تری خبر ہو جائے
تری نگاہ کو رفعت کا خوف ہے ورنہ
نہیں محال کہ تو زیر سے زبر ہو جائے

دل کی بیتابیوں کے عالم کا زندگی نام رکھ دیا کس نے
پی رہا ہوں کہ پڑ گیا پینا سامنے جام رکھدیا کس نے
یہ حقیقت کا آئینہ ہے ''امیں'' اس کا دل نام رکھدیا کس نے

اک برق ہے ھجوم تقاضا لئے ہوئے جانے میں آ گیا ہوں یہاں کیا لئے ہوئے
اک تو کہ بے حجاب نہ ھونا تری ادا اک میں کہ شوق دید کی دنیا لئے ہوئے
اک تو کہ اپنے حسن کی ہے آپ ھی دلیل اک میں کہ تیرے عشق کا دعویٰ لئے ہوئے

تھک گیا ہوں غنودگی سی ہے خواب آلود بے خودی سی ہے
آمد و شد ہے اک تنفس کی بے کسی سی ہے، بے بسی سی ہے
جھلملاہٹ فلک کے تاروں کی چشمک چشم یار کی سی ہے

یہ نہ ہوتا تو مر گئے ہوتے اس دلِ بُرد بار کے صدقے
اس نے دامن کسی کا چوما ہے رہ گزر کے غبار کے صدقے
وہ کریں مجھ سے احتساب وفا ایسے روزِ شمار کے صدقے
بربط قیس مل گیا ہے امیں دامن تار تار کے صدقے

غرقِ حیرت ہے چشم نجم سحر آنکھ کی اشکباریاں توبہ!
خاک سے رنگ و بو کا یہ طوفاں وقت کی دستکاریاں توبہ!

لَا اِلٰهَ اِلَّا الله

حریم ناز خداوند ناز کی سوگند! نگاہ پاک دل پاکباز کی سوگند!
قسم ہے حسن کے انداز بے نیازی کی! جبین عشق سراپا نیاز کی سوگند!
قسم ہے غزنوی بت شکن کے بازو کی! کمند زلف درازِ ایاز کی سوگند!
قسم ہے مہر و مہ و انجم درخشاں کی! کرشمۂ فلکِ شیشہ باز کی سوگند!
قسم ہے عکس رخ مہر و ماہ طلعت کی! کمال صنعت آئینہ ساز کی سوگند!
قسم ہے مطرب ہستی کے ذوق نغمہ کی! اور اس کے درد بھرے تار ساز کی سوگند!
ملی ہے جس کو مئے لا الٰہ الا اللہ
وہ رند میکدہ مغضوب ہو نہیں سکتا

حسن

نقطۂ جاذب شعور ہے حسن نور ہی نور کا ظہور ہے حسن
شمع کا سوز و ساز کہتا ہے نار ہے عشق اور نور ہے حسن

بانیٔ نقشِ ہست و بود ہے حسن
مانیٔ مظہر شہود ہے حسن
جلوۂ شش جہات کی سوگند !
ہو نہ ہو ''جوہر نمود'' ہے حسن

پر تو مہر لامکاں ہے حسن
ایک تنویر جاوداں ہے حسن
ہستیٔ کائنات ہے اس سے
رونق بزم انس و جاں ہے حسن

ہو اگر جستجو تو عام ہے حسن
سامنے دل کے صبح و شام ہے حسن
بوالہوس کی ''امیں'' بلا جانے
اک حقیقت ہے جس کا نام ہے حسن

یقین

طلسم شاہد و شہود ' فروغ حسن کی نمود ' سر نیاز کے سجود
یقین کا ظہور ہے یقین کا
جمال کیا جمیل کیا ' کلیم کیا خلیل کیا ' بیان کیا دلیل کیا
یقین کا سرور ہے یقین کا
خیال کی تعلّیاں ' خیال کی تجلیاں ' تشفیاں تسلیاں
یقین کا شعور ہے یقین کا
یقیں مکان و لامکاں ' یقین روح انس و جاں ' یقیں حیات جاوداں
یقیں مئے طہور ہے یقیں
سمجھ کے رکھ دل حزیں' یقیں نہیں تو کچھ نہیں' کلیم کا ہے قول امیں
یقیں شعاعِ طور ہے شعاعِ طور ہے یقیں

صبح بہار

کرن کرن کے لبوں سے ہے کرنا پیوست
صدا سے حن کی شب تار کھا گئی ہے شکست
جہاں تہاں شہ مشرق کا بول بالا ہے
بلند و پست پہ فرماں رواں اجالا ہے

ستارے ! چشم فلک کے وہ منجمد آنسو
بہ شکل گوہر شبنم بکھر گئے ہر سو
طیور باغوں کے کنجوں میں چہچہانے لگے
ترانے وصل کی صبح حسیں کے گانے لگے
چٹک کے ''مہر لب غنچہ'' ہو گئی خندہ
نگاہِ دیدۂ نرگس ہوئی پراگندہ
کلی کلی ہے کہ بھونروں کا کعبۂ امیّد
منا رہے ہیں مسرت کا جشن ''یہ جمشید''
چراغ لالہ و گل کی ضیا چمن افروز
نوائے بلبل و قمری سے باغ میں نو روز
صبا کے فیض سے رقصاں چمن کے مستانے
ہتھیلیوں پہ لئے رنگ و بو کے پیمانے
گھٹائیں جھوم کے آئیں پھوار برساتی
شکست توبہ کا رندوں کو اِذن فرماتی
سمے اُمنگوں کے پروان چڑھنے کے آئے
خدا کرے کوئی ارماں نہ گھُٹ کے مر جائے
دراز عمر تری اے بہار کے ساقی
انڈیل رندوں کے حلقوں میں بادۂ باقی

زندگی کے دو ممتاز رخ

جوانی

جوانی قہقہے رنگیں فسانے ! جوانی زمزمے نغمے ترانے !
جوانی صبح کی مشاطۂ نور ! ہیں جس کے ہاتھ میں کرنوںکے شانے !
وہ بوسے ہیں جوانی کی نگاہیں جنہیں معلوم ہیں اپنے ٹھکانے
انہیں کی گدگدی ہے جس سے کلیاں لگیں بے تاب ہو کر مسکرانے
جوانی بے خودی کا رقص پیہم نچھاور جس پہ خوشیوں کے خزانے

جوانی کی رگوں میں برق مضطر جسے آتے ہیں سو جادو جگانے
جوانی کی جبیں سے تاب سجدہ ہیں جس کے ہر قدم پر آستانے
جوانی عہد زرّیں زندگی کا
زمانہ مستیوں کا سر خوشی کا

پیری

بڑھاپا سسکیاں آہیں کراہیں کھلی ہیں جس پہ "غم کی درسگاہیں"
بڑھاپا زندگی کا ظلمت آباد جہاں سوئی ہیں آنکھوں میں نگاہیں
قدم اٹھتے ہیں لاٹھی کے سہارے ہیں رعشے سے "لرزتے تار" باہیں
امنگیں مر گئیں ایک ایک کر کے کہاں ڈوبی ہیں جانے دل کی چاہیں
تنفس کا ترنم نوحہ ساماں لبوں پر رہ گئی ہیں جم کے آہیں
خزاں! ظالم خزاں دل کے چمن کی بُجھے گل بوٹے! اجڑی سیر گاہیں
جگر کھانے کو اور پینے کو آنسو! امیں ہیں بند میخانوں کی راہیں
جوانی مژدۂ آفاق گیری
مگر پیری؟ پیام زود میری

قطعات و رباعیات

امتزاج رنج و راحت سے ہے دنیا کا ضمیر
زندگی آزاد بھی ہے اور ہے کچھ کچھ اسیر
ہے تضاد زندگی ہی زندگی کا "سحر حسن"
آشنا ہیں اس حقیقت سے امیں روشن ضمیر

آرزوئے تازہ کاری سے ہے آدم کی نمود
کانپ کر فطرت اسی جوہر کو کرتی ہے سجود
ہے رہین تازہ کاری آبرو افراد کی
اور اسی پر منحصر اقوام کی بود و نبود

دریا کے تموّج میں دریا کی خودی پنہاں
گوہر کے تجمل میں قطرے کی خودی پنہاں

ہر چیز خودی سے ہے ارضی کہ سماوی ہو
مہرومہ و انجم میں اُن کی ہے خودی تاباں

زندگی نام ہے ماحول پہ چھا جانے کا
بزم کو بادۂ کردار سے گرمانے کا
ظرف عالی ہے تو اے رند خرابات عمل
خم بہ آغوش ہے قطرہ تیرے پیمانے کا

نگاہ شوق کے اعجاز کا نہ ہو منکر
خم شعور کا جام جہاں نما ہے یہی
تڑپ سے اس کی نہ ہو بے قرار اے ناداں!
جہاں میں شور ہے جس کا وہ ارتقا ہے یہی

خیال محض کجا اور کجا عمل ناداں!
سراب ہو نہیں سکتا علاج تشنہ لبی
وہ ایک صیدِ زبوں ہے فلک کی نظروں میں
عزیز جس کو نہیں شیوۂ جفا طلبی

ہر کام کو احساس سے نسبت ہے اضافی
اور شدت احساس ہی کا نام ہے مشکل
جس شخص کا احساس نہیں عزم کے بس میں
ناکس ہے وہ اُس کے لئے ہر کام ہے مشکل

آنے کو بہار آئی ہے مگر پژمردہ سی!
کلیاں کثرت سے ہیں لیکن افسردہ سی! افسردہ سی!
دنیا بھی وہی ہے، ہم بھی وہی، لیکن یہ راز نہیں کھلتا
کیا جی پہ بنی! کیوں خاطر ہے آزردہ سی! آزردہ سی!

نہ عیش صحبت گلہائے نو اڑانے دے
چمن تک اڑ کے نہ صیاد مجھ کو جانے دے
ہے تصور رنگیں کی خیز سانگ ''امیں''
قفس ہی باغ بنے گا بہار آنے دے

مولانا تاجور نجیب آبادی

احسان اللہ خاں نام تاجور تخلص ۱۸۹۴ء میں نجیب آباد ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ نسباً درانی افغان تھے ۔ فارسی عربی کی ابتدائی تعلیم تاجور نے اپنے بڑے بھائی سے حاصل کی ۔ ماہ صفر ۱۳۲۶ھ میں جبکہ آن کی عمر دس سال کی تھی دارالعلوم دیوبند کے طالب علم بنے۔ دس سال وھاں رھکر درس نظامیہ کی تکمیل کر کے اگست ۱۹۱۴ء میں لاھور آئے اور شمس العلماء مفتی عبداللہ ٹونکی کے حسب ایما آورینٹل کالج میں داخل ہو گئے ۔ ۱۹۱۵ء میں مولوی فاضل اور ۱۹۱۶ء میں منشی فاضل پاس کیا ۔ پھر اسی سال رسالہ مخزن کے ایڈیٹر بنے۔ ۱۹۲۱ء میں دیال سنگھ کالج لاھور میں آردو و فارسی کے آستاد مقرر ھوئے اور مرتے دم تک اسی ادارے سے منسلک رھے ۔ ۱۹۲۱ء میں رسالہ ھمایوں لاھور کے معاون مدیر بنے ' ۱۹۲۹ء میں رسالہ ادبی دنیا اور ۱۹۳۴ء میں شاھکار جاری کیا ۔ لیکن ادبی دنیا چند سالوں کے بعد مولانا موصوف کی زود اعتمادی کے باعث دوسرے ھاتھوں میں چلا گیا البتہ شاھکار وہ برابر نکالتے رھے ۔

مولانا تاجور نے آردو زبان و ادب کی بے پناہ خدمت کی حتیٰ کہ اپنی کاروباری آمدنی کا تیس ھزار روپیہ کا ذاتی سرمایہ ' اپنی جوانی ' صحت ' طاقت اور متعلقین کا حال و مستقبل سب کچھ اسی کی نذر کر دیا ۔ موصوف نے اسی ادبی خدمت کے ذوق میں ۱۹۲۹ء میں ایک ادارۂ تصنیف و تالیف ''آردو مرکز'' کے نام سے قائم کیا ۔ جس کی ادبی خدمات محتاج تعارف نہیں ۔ اس ادارے نے جیسے بیش قیمت انتخابات ' تراجم اور تصانیف شائع کیں وہ ھر اعتبار سے لائق صد ستائش ھیں اور یہ کہنا بے جا نہ ھوگا کہ پنجاب میں ادب جدید کی تعمیر کرنے والوں میں ۸۰ فیصدی آن کے ھندوستان گیر شہرت رکھنے والے شاگردوں کا حصہ ھے ۔

مولانا تاجور کو شاعری میں منشی حیات بخش رسا رامپوری سے تلمذ حاصل تھا جو داغ دھلوی کے شاگرد تھے ۔ مولانا موصوف کے اوائل مشق کا تو کلام گم ھی ھو گیا تھا مگر اواسط مشق کے ایک مجموعے کے گم ھو جانے کا آنھیں بہت افسوس رھا بلکہ مولانا کے الفاظ میں ''اس مجموعے کے گم ھو جانے سے میری ھمت شکست ھو گئی'' اور پھر سچ مچ کبھی آنھوں نے اپنے کلام کی فراھمی کی جانب توجہ نہیں کی ۔ ویسے آن کا کلام وقتاً فوقتاً پنجاب کے معروف اخبارات اور ماھناموں میں شائع ھوتا رھا ھے ۔

مولانا طبعاً بے حد شگفتہ مزاج ، فراخدل اور ظریف الطبع انسان تھے ۔ جس محفل میں بیٹھتے چھا جاتے تھے اور روتوں کو ھنسا دینا آن کے بائیں ھاتھ کا کھیل تھا ۔ تمام عمر ادبی سرگرمیوں میں بسر کی ، درس و تدریس ، تالیف و تصنیف ، اور صحافت کے کے میدانوں میں ایک کامیاب زندگی گزار کر مولانا موصوف نے جنوری ۱۹۵۱ء میں داعی اجل کو لبیک کہا ۔ مرنے سے بہت پہلے حکومت ھند نے مولانا کی ادبی خدمات کے صلہ میں آنھیں شمس العلما کا خطاب بھی دیا تھا ۔

مولانا تاجور مرحوم کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے سلسلے میں ''انجمن ارباب علم'' کا ذکر کرنا بھی بہت ضروری معلوم ھوتا ھے ۔ یہ ادبی انجمن مولانا موصوف نے سر عبدالقادر صاحب کی سرپرستی میں لاھور میں قائم کی تھی جس کی منعقدہ مجالس میں مختلف مضامین و مقالات اور غزلیں و نظمیں پڑھی جاتی تھیں ۔ بعد میں مولانا ھی کی محنت و کاوش سے نہ صرف یہ انجمن لاھور میں معروف و کامیاب ھوئی بلکہ اس کی شاخیں پنجاب کے بعض دوسرے اضلاع میں بھی قائم ھوئیں اور اس طرح مولانا کی دلی آرزو برآئی کہ اس انجمن کے ذریعہ پنجاب کے اکثر علاقوں میں آردو ادب کی ترویج و اشاعت بھی ھوئی اور نئی پود میں اس کا ذوق بھی پیدا ھوا ۔

الغرض مولانا تاجور ایک عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے ۔ وہ ایک بے بدل ادیب ، جید عالم ، ماھر صحافی اور خوش فکر شاعر غرضیکہ سب کچھ تھے ۔ مگر ھم یہاں آن کی دیگر صفات سے قطع نظر صرف آن کے شاعرانہ کمالات سے بحث کرنا چاھتے ھیں اور اس اعتبار سے یہ کہنا قطعی مبالغہ نہ ھوگا کہ آنھیں شاعری پر بڑا عبور حاصل تھا اور وہ ایک فطری شاعر تھے مگر افسوس کہ وہ اپنی گوناگوں مصروفیات کی بدولت اس طرف پوری توجہ نہ دے سکے ۔ آن کے کلام پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ھوتا ھے کہ آن کے یہاں بڑی رچی ھوئی شعریت تو ضرور موجود ھے مگر آن کی شاعری کسی گہرے اور شدید احساس کا نتیجہ نہیں ۔ آن کے کلام سے آن کی پختہ کاری ، ذھانت اور طباعی کا پتہ چلتا ھے اور وہ اپنے اشعار میں اپنے جذبات و احساسات کی گرمی سمونے پر پوری قدرت رکھتے تھے مگر اس میں وہ سحر و اعجاز نہ پیدا کر سکے جو شاعری کی جان ھے ۔

مولانا تاجور نے ویسے غزلیں اور نظمیں دونوں کہی ھیں مگر آن کی غزلوں کے مقابلے میں نظمیں پھیکی ھیں ۔ غزلوں میں آن کی زبان بڑی پاکیزہ ، شیریں اور رواں ھے ۔ وہ غزل میں اخلاقی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کرتے ۔ آن کے بعض اشعار میں ایسی برجستگی و بے ساختگی ھے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاھتا ھے مثال کے طور پر آن کے یہ چند اشعار ۔

اب عشق سے لو لگائیں گے ھم　　اس درد کو دل بنائیں گے ھم
اب آپ بنیں گے اپنی دنیا　　دلیا تجھے بھول جائیں گے ھم

یہ ستم قید قفس میں صیاد کس نے پوچھا تھا بہار آئی ہے ؟
اہل چمن کو قید قفس کی ہے آرزو صیاد سے بھی بڑھ کے ستم باغبان کے ہیں
خلش عشق مٹے گی مرے دل سےجب تک دل ہی مٹ جائیگا ایسا نظر آتا ہے مجھے
جو دیکھتے ہیں تجھے اور دیکھ سکتے ہیں مری نگاہ میں ذوق نظر نہیں رکھتے
ہے وجہ انبساط محبت میں اعتدال جب حد سے بڑھ گئی رسن و دار ہو گئی

دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں وہ چنگاری ضرور موجود ہے جو بڑھ کر ایک شعلۂ جوالہ بن سکتی تھی ۔ ان اشعار میں زبان و بیان کی وہ خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں جو تغزل کی جان ہیں لیکن ایسے اشعار کی تعداد مولانا کے خود کردہ مختصر انتخاب میں بھی زیادہ نہیں ہے ۔ جس کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں ایک تو یہی جو موصوف نے خودبیان کی کہ اُن کا پورا کلام محفوظ نہ رہ سکا اور اخبارات و رسائل ہی کے اوراق پریشان کی نذر رہا اور بیشتر سعادت مند شاگردوں کی ملکیت بن گیا اور دوسری وجہ وہی جو اوپر بیان کی گئی کہ مولانا کبھی اپنی ساری قوتوں اور صلاحیتوں سے اس میدان میں کام نہ لے سکے ۔

بایں ہمہ مولانا کے فطری شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں ۔ انھیں جذبات و خیالات کے اظہار پر بڑی قدرت اور زبان پر پورا عبور حاصل تھا اور انہیں دو خوبیوں نے انھیں ایک مشاق سخنور بنا دیا تھا ۔ کاش مولانا ادھر زیادہ دلچسپی و رغبت سے کام لیتے تو اُن کی شاعری میں وہ گہرائی و گیرائی یقیناً پیدا ہو جاتی جس سے شاعری کی محراب میں عظمت کا دیا روشن ہوتا ہے ۔

انتخاب کلام

سچ ہے کہ دل فریبٔی رنگ رخ بہار کیا
حسن پہ اعتماد کیوں وقت کا اعتبار کیا
نے غم مرگ بے کسی ' جان ترے سپرد ہے
دوست بہانہ ساز کا کیجئے اعتبار کیا ۔
اپنی نظر میں بھی مجھے وقف جنوں بنائیگی
یہ مری بات بات پر آپکی بار بار کیا
مان لیا کہ تاجور وہ نہیں اختیار میں
کہئے تو اپنے دل پہ ہے آپکو اختیار کیا

محبت آہ جو تُو کامیاب ہو نہ سکی
ہوس میں عمر کو صرف گناہ کردوں گا

جو مجھ سے چھین لیا دہرِ خود غرض نے نہیں
مٹوں گا لیکن اسے بھی تباہ کردوں گا

کہیں رسوا نہ ہوں رنگینیاں دردِ محبت کی
مرا اتنا خیال اے دیدۂ خوں بار کر لینا
بس اتنی داد دینا بعد میرے میری الفت کی
کہ یاد آؤں تو اپنے آپ کو تم پیار کر لینا

اے آرزوئے شوق تجھے کچھ خبر ہے آج
حسن نظر نواز حریف نظر ہے آج
ہر راز داں ہے حیرتئی جلوہ ہائے راز
جو با خبر ہے آج وہی بے خبر ہے آج
کیا دیکھئے کہ دیکھ ہی سکتے نہیں آنکھ
اپنی نگاہِ شوق حجاب نظر ہے آج
کل تک تھی دل میں حسرت آزادئی قفس
آزاد آج ہیں تو غم بال و پر ہے آج

اب قفس میں تو کِسے چھیڑیگی اے باد بہار
رہ گئے ہیں یادگار بلبل ناشاد پر

اب عشق سے لو لگائینگے ہم — اب درد کو دل بنائیں گے ہم
اب آپ بنیں گے اپنی دنیا — دنیا تجھے بھول جائیں گے ہم

دل کے ہاتھوں آہ اٹھوائے گئے محفل سے ہم
آج دل برداشتہ سے ہو رہے ہیں دل سے ہم
بے کسی میں اک انیس کنج تنہائی ہے دل
دل کی باتیں کرتے رہتے ہیں شب غم دل سے ہم

کھٹک رہا ہوں ہر اک کی نظروں میں بچ کے ملتی ہے مجھ سے دنیا
زہے گران بارئی محبت کہ دوشِ ہستی پہ بار ہوں میں

تری محبت میں میرے چہرے سے ہے نمایاں جلال تیرا
ہوں تیرے جلووں میں محو ایسا کہ تیرا آئینہ دار ہوں میں

یہ ستم قید قفس میں صیاد ! کس نے پوچھا تھا بہار آئی ہے ؟

رہ رہ کے برق گرتی ہے ان پر ہی بار بار
گلشن میں چار تنکے مرے آشیاں کے ہیں
اہل چمن کو قید قفس کی ہے آرزو
صیاد سے بھی بڑھ کے ستم باغباں کے ہیں

تجھے کیا سناؤں یہ حادثہ کہ چمن میں جوش بہار ہے
تجھے ہم صفیر ! قفس کی قید میں کیا نوید بہار دوں

غم آشیاں ، مرے بال و پر کے قفس کو پھونک نہ دے کہیں
یہ نوید مرگ ہے ہم قفس ، کہ چمن میں جوش بہار ہے
یہ لٹی ہوئی سی بہار کیوں ہے ، کہاں وہ جان بہار ہے ؟
یہ چمن سے کون چلا گیا کہ کلی کلی کوفشار ہے
یہ انیس غمکدۂ قفس ، ہے عزیز جاں مجھے ہم نفس !
دل داغدار غم بہار میں یادگار بہار ہے

بس رہا ہے مری آنکھوں میں وہی جان بہار
جس کا ہمرنگ کوئی پھول چمن بھر میں نہیں
محفل حشر بھی سونی نظر آتی ہے مجھے
ڈھونڈتی ہیں جسے نظریں وہی محشر میں نہیں

جفائے دوست بنی رہنمائے منزل دوست
وہ کھو رہے ہیں مجھے اُن کو پا رہا ہوں میں
ہے میری خاک کے ذروں میں پھر نمود حیات
کہیں انہیں تو نہیں یاد آ رہا ہوں میں

محبت ! آہ محبت کی زندگی مت پوچھ
بڑی مصیبتوں میں مبتلا رہا ہوں میں
ہے کائنات کا ہر ذرہ ہمنوا میرا
کچھ ایسا محفل ہستی پہ چھا رہا ہوں میں
مرا فسانۂ غم دل نے بھی کبھی نہ سنا
قتیل شکوہ درد آشنا رہا ہوں میں

نہ دل بدلا ، نہ دل کی آرزو بدلی ، نہ وہ بدلے
میں کیسے اعتبار انقلاب آسماں کر لوں
سبب ہر ایک مجھ سے پوچھتا ہے میرے رونے کا
الٰہی ساری دنیا کو میں کیوں کر راز داں کر لوں

خدا مجھ کو تجھ سے ہی محروم کر دے
جو کچھ اور تیرے سوا چاہتا ہوں
میں کیا چاہتا ہوں ؟ بتاؤں تمہیں کیا ؟
میں خود سوچتا ہوں میں کیا چاہتا ہوں
نظر بھر کے جو دیکھ سکتے ہیں تجھ کو
میں اُن کی نظر دیکھنا چاہتا ہوں

برداشت درد عشق کی دشوار ہو گئی
اب زندگی بھی جان کا آزار ہو گئی
ہے وجہ انبساط محبت میں اعتدال
جب حد سے بڑھ گئی رسن و دار ہو گئی
خود دارئ جنوں نے نہ جانے دیا وہاں
کم بخت راہِ دوست میں دیوار ہو گئی
اُف وہ نظر کہ سب کے لئے دل نواز ہے
میری طرف اُٹھی ہے تو تلوار ہو گئی
جنس ہنر مذاق خریدار دیکھ کر
خود بے نیاز چشم خریدار ہو گئی

حشر میں پھر وہی نقشہ نظر آتا ہے مجھے
آج بھی وعدۂ فردا نظر آتا ہے مجھے

خلش عشق مٹے گی مرے دل سے جب تک
دل ھی مٹ جائے گا ایسا نظر آتا ھے مجھے
رونق بزم تماشا ھے مری بزم خیال
اس میں وہ انجمن آرا نظر آتا ھے مجھے
آن کا ملنا ھے نظر بندئی تدبیر اے دل
صاف تقدیر کا دھوکا نظر آتا ھے مجھے
تجھ سے میں کیا کہوں اے سوختۂ جلوۂ طور
دل کے آئینے میں کیا کیا نظر آتا ھے مجھے
دل کے پردوں میں چھپایا ھے ترے عشق کا راز
خلوت دل میں بھی پردہ نظر آتا ھے مجھے
عبرت آموز ھے بربادئی دل کا نقشہ
رنگ نیرنگئی دنیا نظر آتا ھے مجھے

کس کی یاد آ کر تجھے محو تحیّر کر گئی
خود فراموش جنوں اس وقت کسی عالم میں ھے؟
تو ھوا نذرِ قفس اے نو گرفتارِ قفس
باغ میں ھر گل گریباں چاک تیرے غم میں ھے

محبت میں زیاں کاری مراد دل نہ بن جائے
یہ لا حاصل ھی عمر عشق کا حاصل نہ بن جائے
مجھی پر پڑ رھی ھے ساری محفل میں نظر آن کی
یہ دلداری حساب دوستاں در دل نہ بن جائے
کروں گا عمر بھر طے راہ بے منزل محبت کی
اگر وہ آستاں اس راہ کی منزل نہ بن جائے
یہ متوالی نظر، یہ بادۂ بے جام ارے توبہ
کسی پر بے بنی اے ساقئی محفل نہ بن جائے
ترے انوار سے ھے نبض ھستی میں تڑپ پیدا
کہیں سارا نظام کائنات اک دل نہ بن جائے
کہیں رسوا نہ ھو اب شانِ استغنا محبت کی
مری حالت تمہارے رحم کے قابل نہ بن جائے

یہ قطرۂ خون دل نام ہے جس کا اے چشم مست ساق
اس فتنے کو مت چھیڑ مبادا حشر کوئی برپا کر دے
اے دوست ترے ہوتے بھی طلسم راز بنی ہے کیوں ہستی؟
اس چہرے سے بھی نقاب اٹھا اس راز کو بھی رسوا کردے
محروم نظر ہے دل میرا اے حسن اتم اے بحر کرم
اس ذرے کو خورشید بنا ' اس قطرے کو دریا کردے

نہ دے بشارت باد بہار اے صیّاد
چمن سے کیا انھیں جو بال و پر نہیں رکھتے

حسن و عشق سے جنگ

(نظم)

بتان بد خو کے حسن دل جُو پہ دل کو شیدا نہ کیجئے گا
بروں سے اچھا سلوک اگر کیجیئے گا اچھا نہ کیجیئے گا
متاع دل انکی رونمائی ہے انکا بیعانہ نقد جاں ہے
بہت ہی مہنگے پڑیں گے بت بھول کر یہ سودا نہ کیجئے گا
کسی کے درد طلب میں جینا ہے موت کا دردناک منظر
یہ زندگی ہے تو زندگی کی کبھی تمنا نہ کیجئے گا
ادھر ہے ذوق جنوں میں دلکی ہٹ راج ہٹ سے بڑھ کر
ادھر تقاضائے عقل یہ ہے کہ دل کا کہنا نہ کیجئے گا
محبت جاں گداز نے آہ دل کی دنیا تباہ کر دی
خدا جو توفیق دے تو دل میں یہ درد پیدا نہ کیجئے گا
زمانہ سازی ہے التفات جمال بھی ' اس بلا سے بچئے
نظر نوازی پہ حسن رنگیں کی کچھ بھروسا نہ کیجئے گا
نیازمند جمال ہو کر وبال انسانیت نہ بنئے
جو پھٹ پڑی ہے بہت جوانی تو اس کو رسوا نہ کیجئے گا
یہ تاجور خوب پالسی ہے اسی پہ بس کار بند رہیئے
کہ سب سے دنیا چھڑایئے آپ ترک دنیا نہ کیجئے گا

دردِ دل

درد ھی دل کے لئے ھے خود دوائے درد دل
ابتدائے درد دل ھے انتہائے درد دل

دولت دنیا ملی تجھ کو جو درد دل ملا
درد دل کی قدر کر اے مبتلائے درد دل

باغ میں ھر ھر کلی ھے اک پیام دردناک
پتے پتے پر لکھا ھے ماجرائے درد دل

درد بڑھتے بڑھتے آخر شعلۂ غم بن گیا
آتش جاں سوز ھے دل میں بجائے درد دل

درد سے حاصل ھوا ھے دل کو لطف زندگی
دل مرے سینے میں زندہ ھے برائے درد دل

دل بھی درد دل کی صورت کر چکا ھے اختیار
کچھ نہیں سینے میں میرے ماسوائے درد دل

ھاں کوئی فولاد کا ٹکڑا ھے وہ اے تاجور
دل ھے پہلو میں اگر نا آشنائے درد دل

علی اختر اختر

علی اختر نام اختر تخلص ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء ریاست رامپور میں پیدا ہوئے۔ اصل وطن علیگڑھ ہے وہیں انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی لیکن پھر ننھال کے تعلق سے آگرہ سینٹ جانس کالج میں پڑھتے رہے۔ اختر صاحب نے فارسی و عربی کا درس مولانا نصیرالدین صاحب سے لیا اور اس زمانہ کی مروجہ تعلیم کی تکمیل کے بعد اسکول میں انگریزی تعلیم کے لئے داخل ہو گئے۔ بدقسمتی سے کالج کے ابتدائی ایام ھی میں وہ مرض سل میں مبتلا ہو گئے جس کی وجہ سے ایک سال تک اُن کی تعلیم بند رہی۔ پھر جب اس موذی مرض سے نجات پائی اور صحت نسبتاً بہتر ہوئی تو کچھ حالات بدلے اور کچھ اُن کی طبعیت بھی اُدھر رجوع نہ ہوئی نتیجہ یہ ہوا کہ سلسلۂ تعلیم منقطع ہو گیا۔ اس کے بعد غالباً ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء سے حیدرآباد دکن میں بہ سلسلۂ ملازمت مستقلاً قیام پذیر رہے۔ آج کل کراچی میں ھیں۔

شعر و سخن کا ذوق بچپن ھی سے تھا اور اس پر اضافہ یہ کہ خود اُن کے گھر میں شعر و ادب کی فضا پہلے سے موجود تھی۔ اس سازگار فضا نے اختر صاحب کی شاعرانہ فطرت کو اور بھی چمکا دیا۔ چنانچہ وہ اپنے والد حضرت باغ کے شاگرد ہوئے اور چودہ پندرہ سال کی عمر میں خاصے شعر کہنے لگے۔ ذیل کے دو شعر اسی زمانہ کی یادگار ھیں۔

قفس میں سمجھے تھے ھم کہ حالت رہینِ امن و امان رھیگی
کسے خبر تھی کہ برق اب بھی نگاہ بر آشیاں رہے گی

ڈوبی ہوئی پاتا ہوں نبض دل دیوانہ
ھلکی سی پھر اک جنبش اے جلوۂ جانانہ !

البتہ ایک عجیب بات یہ ھے کہ باوجودیکہ اختر کے والد و اُستاد حضرت باغ نیز خاندان کے دوسرے خورد و بزرگ افراد عام طور پر وھی داغ اور امیر کے راستوں پر چل رہے تھے لیکن وہ خود اس رنگ شاعری سے متأثر نہ ہوئے جس کی وجہ غالباً یہی ھے کہ وہ اس نوع کی شاعری کو شروع ھی سے قابل قبول نہیں سمجھتے تھے۔

اختر صاحب غزل و نظم دونوں کہتے ہیں اور دونوں اصناف میں اُن کا رنگ پختہ ہے ۔ غزل گوئی میں اُنھیں پوری مہارت ہے مگر وہ اس صنف سخن میں قدیم طریقہ کی پابندی نہیں کرتے بلکہ آپ کی غزل پرانے محدود دائرے سے بہت آگے بڑھی ہوئی ہے ۔ اُن کی غزلوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسے غزل گو ہیں جنھوں نے علامہ اقبال اور اصغر سے فیضان حاصل کیا ہے ۔ چنانچہ اقبال کی نادر ترکیبیں اور آفاق لب و لہجہ اور اصغر کا لطیف تغزل اور ھلکا تصوف اُن کے یہاں بھی موجود ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت اختر اُن لوگوں میں سے ہیں جو کسی خاص اسکول یا ادارہ سے وابستہ نہیں اور نہ ھی اُن کے یہاں کوئی خاص نمایاں رنگ ہے مگر ساتھ ھی اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُنھیں اپنے خیالات کے اظہار میں بڑا سلیقہ حاصل ہے ۔ اور بقول آل احمد سرور صاحب ''وہ اس تخلص کے دوسرے شاعر اختر شیرانی کے مقابلہ میں زیادہ ھوش مند اور زیادہ سنجیدہ ہیں اور اُن کی شاعری کی عمر بھی زیادہ ہے'' ۔

جہاں تک اختر صاحب کی منظومات کا تعلق ہے یہ تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ اُن کی نظم گوئی بھی تقریباً اُتنی ھی قدیم ہے جتنی اُن کی غزل گوئی ۔ چونکہ آپ کی نظمیں بھی غالباً ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء سے مختلف رسائل میں چھپنا شروع ہو گئی تھیں جن میں سے ایک نظم ''بہار کا آخری پھول'' کے عنوان سے رسالہ ''ذخیرہ'' میں انھیں ایام میں چھپی تھی اور اُسے قبول عام بھی حاصل ہوا تھا ۔ ویسے اختر صاحب کی نظموں پر جوش کا خاصا اثر ہے ۔ اُن کی نظمیں مختلف اقسام میں تقسیم کی جا سکتی ہیں اور اُن میں واقعہ نگاری ' وصف نگاری اور نیچرل شاعری کے بہت عمدہ نمونے دستیاب ہو سکتے ہیں ۔ اختر صاحب کا مصلحانہ انداز اور مناظر فطرت کی عقبی زمینیں اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ یہ نظمیں سنجیدہ فکر اور غنائی اسلوب بیان کی متوازن آمیزش کی وجہ سے خاص دلکشی رکھتی ہیں ۔

بحیثیت مجموعی اختر صاحب ایک خوش فکر و کہنہ مشق شاعر ہیں ۔ اُن کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ کسی حدود کی پابندی نہیں کرتے بلکہ وہ شعر کو غیر محدود فضا کی دلاویزیوں سے لبریز کرتے ہیں ۔ اور اُن کا طرز منفرد و مخصوص نہ ہوتے ہوئے بھی فکر کی گہرائی اور ترنم ریز وضع اظہار کا حامل ہے ۔ آپ کی غزلوں کا مجموعہ ''انوار'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے ۔ نظموں کا مجموعہ ہنوز شائع نہیں ہوا ۔

انتخاب کلام

تغزل

میں ترے عشوؤں سے آشنا ہوں' یہ راز پنہاں سمجھ رہا ہوں
کہ میری اس نا رسی میں بھی ہے کوئی اشارا ضرور تیرا

حریف آگاہ عشق کب تھے، یہ راز تو نے انہیں بتایا
نہ جانے کیوں میری وحشتوں سے اُلجھ پڑا اضطراب تیرا

منت کشِ نظارہ ہے جب تک نگہ شوق
نظارہ نقاب رخ جانانہ نہ رہے گا

دل کی آرزو تھی درد، دردِ بے دوا پایا
کیا سوال تھا میرا اور کیا جواب اُن کا
عشق کی لطافت کو خاکِ طور کیا جانے
مجھ پہ تھی نظر اُن کی مجھ سے تھا خطاب اُن کا
عالم تمنا ہے خواب کا سا اک عالم
شوق نا تمام اپنا، عشوہ کامیاب اُن کا
کم نہ تھی قیامت سے صبح آفرینش بھی
میری مضطرب نظریں اور انتخاب اُن کا

کبھی قابل ذکر تھا حال دل اب آزاد شرح و بیاں ہو گیا
کوئی اور طرز ستم سوچئے دل اب خوگرِ امتحاں ہو گیا

بیگانۂ احساس سہی سینۂ ہستی جیتے ہیں کہ مایوس ہوا بھی نہیں جاتا

بے خودی نے توڑ دیں جب عشق و عرفاں کی حدیں
خود بخود برہم نظام دانش و دل ہو گیا

بیگانۂ شوقِ جلوہ گری وہ حسن خود آرا ہو نہ سکا
آئینہ سے نظریں ہٹ نہ سکیں، آئینہ سے پردا ہو نہ سکا

نہیں کچھ منحصر اس پر کہ غم سہنا نہیں آتا
مجھے اے تلخئ ایام خوش رہنا نہیں آتا

مری مظلوم چپ پر ، شادمانی کا گماں کیوں ہو
که ناآمیدیوں کے زخم کو بہنا نہیں آتا

جہان اعتبار میں اسیر دام ہوش ہوں
گماں ہے اضطراب پر سکون اضطراب کا

محبت نام ہے احساس غم کی اک لطافت کا
که غم ہوتا ہے احساسِ غمِ پنہاں نہیں ہوتا

عشق حریف جاں سہی فکرِ مآل کار کیا
دانش خود فریب کون ؟ ہوش کا اعتبار کیا

پھر دل میں جنوں سلسله جنباں نظر آیا
شیرازۂ کونین پریشاں نظر آیا

درد کو جاوداں کیا حسن کو دی ستم کی خو ،
لذت غم سے کیا ملا ، ذوق نظر نے کیا کیا

پھر بہار آئی ، نشاط روح کا منظر کھلا
ساز جاگے ، جام چھلکے ، میکدے کا در کھلا

مٹا کے سرمایۂ جوانی اسے عطا کی ہے زندگانی
عروس ہستی کے خال وخد میں جھلک رہا ہے شباب میرا

مری بے خودی ہے اُن آنکھوں کا صدقه
چھلکتی ہے جن سے شراب محبت
اُلٹ جائیں سب عقل و عرفاں کی بحثیں
اُٹھا دوں ابھی گر نقاب محبت

حیف وہ رند نامراد جس نے اٹھا کے جام مئے
ہاتھ سے پھر گرا دیا ' رنج خمار دیکھ کر

تجھ سے حیات و موت کا مسئلہ حل اگر نہ ہو
زہر غم حیات پی موت کا انتظار کر

دیکھ بساط الٹ نہ جائے عالم عقل و ہوش کی
چاک نہ اے جنون شوق پردۂ امتیاز کر
عشق ' بقدر آرزو تشنۂ زخم ہے ابھی
تیر نگاہ ناز کو اور بھی دل نواز کر

اب وہ ملال کچھ سہی شمع جلی تو ایک رات
آہ ! کہ بجھ کے رہ گئے پہلے ہی امتحاں میں ہم

جنوں نے فاصلہ رکھا نہ کوئی عشق و عرفاں میں
گریباں کے عوض اب ہاتھ الجھتا ہے رگ جاں میں
کہاں کا ہوش کیسی آگہی ' اس بزم امکاں میں
مگر اک نیم بیداری سی ہے خواب پریشاں میں
یہ بجلی ہے کہ رقص جلوۂ گل خیز ہے ' ہمدم
قفس میں ہوں مگر مرا نشیمن ہے گلستاں میں

دل میں اب تاب ضبط بھی تو نہیں ؟ آپ کیوں یاد آئے جاتے ہیں
دل کے اکثر فسانہ ہائے جمیل آنسوؤں میں سنائے جاتے ہیں

آ ہی جاتا ہے نشیمن کا خیال میں اسیری میں بھی آزاد نہیں
کب ہوئی آپ کو توفیق کرم آہ جب طاقت فریاد نہیں

نہ محدود جلوے نہ محروم نظریں مرے دل کو ناحق پریشانیاں ہیں
بتا اے جنوں ! گمرہان خرد کو یہ دانائیاں ہیں کہ نادانیاں ہیں

وضع کی ہے جنوں نے نسبت خاص — تار دامن میں اور رگ جاں میں
ظرف وحشت کی یہ بھی خامی ہے — ورنہ قیدیں کہاں ہیں زنداں میں

دیکھ نا محرم اسرار حیات — اس فسانے کی حقیقت دل میں

مقام اور بھی ہیں دانش آزما لیکن — طلسم ہستئی فانی ترا جواب نہیں

حسن فریبِ دیدۂ و دل ہے، دیدۂ و دل ہیں حسن فریب
دیوانے یہ عالم رنگیں، صبح نہیں یا شام نہیں
اُن کے جلوے عام ہیں، لیکن آنکھیں ہیں سرگرم تلاش
اب یہ خطا ہے آنکھوں کی یا اُن کے جلوے عام نہیں

عشق کہتا ہے کہ اب اک نئی دنیا اختر
خود ہی تخلیق کروں، خود ہی پھر آباد کروں

توڑ دے دل میں کوئی تیز سا نشتر مطرب
روح خوابیدہ ہے نغموں کا یہ ہنگام نہیں

زحمت التفات کی آپ نے آہ! کیا کیا
اب وہ لطافتیں کہاں حسرت انتظار میں

کہاں کہاں ہے تری جستجو میں آوارہ
مری نظر کہ ابھی آشنائے راز نہیں
مری خطا ہے کہ میں ناشناس لذت درد
سمجھ رہا تھا ترا درد دلنواز نہیں
بکھر رہے ہیں ابھی سے حیات کے اجزا
ابھی تو دوش پہ وہ کاکلِ دراز نہیں

نغمہ درد چھیڑ کر انجمن حیات میں
عشق نے جان ڈالدی پیکر کائنات میں
دعوت رقص جلوہ عام اور یہ نگاہ نا تمام
خود وہ حریف شوق ہیں پردۂ التفات میں

اللہ رے بے خودی خبر دو جہاں نہیں اب زندگی پہ قید زمان و مکاں نہیں
بہلا نہ ہمصفیر مجھے ' کیسے مان لوں بجلی گری ہے جسپہ مرا آشیاں نہیں
جاری ہے دل میں دعوت مژگاں کا اہتمام یعنی ہنوز سعیٔ جنوں رائگاں نہیں

اس کی تلاش ہے مجھے رہگزر مجاز میں
حسن بھی اک حجاب ہے جس کی حریم ناز میں
عقل ہے پھر حریف عشق اب یہ بساط الٹ نہ دو
پردہ اٹھا کے آنہ جاؤ عالم امتیاز میں
مطرب خوشنوا مجھے نشترِ تیز چاہیئے
یہ تو نوائے درد ہے نغمہ کہاں ہے ساز میں

میرے جنون خام کا بے اثری مآل ہے
نالۂ دردمند میں ورنہ اثر کہاں نہیں
میرے ہی آنسوؤں سے کیا فیض جنوں ہے آشکار
دل کے لہو سے زینت دیدۂ تر کہاں نہیں

یہاں تو گلستاں بھی بیمِ گردش سے نہیں خالی
نہ جانے پھول کیا سمجھے ہوئے ہیں مسکرانے کو
وہی کچھ خواب ہوں گے اور کچھ اوہام بیداری
جہاں سے چھیڑئے کمبخت دنیا کے فسانے کو

گفتگوئے صورت و معنی ہے عنوان حیات
کھیلتے ہیں وہ مری فطرت کی حیرانی کے ساتھ
تم نے ہر ذرے میں برپا کر دیا طوفان شوق
اک تبسم اس قدر جلووں کی طغیانی کے ساتھ

دل کی آبادی ہے اختر دل کی بربادی کا نام
اک تعلق ہے مری ہستی کو ویرانی کے ساتھ

لذت غم التفات یار نے برباد کی — ترک بیداد آہ اک تمہید تھی بیداد کی
مسکرائے وہ مجھے یاد آ گیا پیمان ضبط — رہ گئی شرما کے گستاخی لب فریاد کی

میں نے کب چاہا تھا، رسوائی کے ساماں ہوگئے
اُن کے جلوے میری ہستی میں نمایاں ہوگئے
اس تکلف سے ملایا ساز مطرب کے نثار
دل کے سب کانٹے گلستاں در گلستاں ہو گئے
دل سے تھا ہنگامۂ ہستی اب اختر دل کہاں
ساز ادھر ٹھیرا اُدھر نغمے پریشاں ہو گئے

تعلق بخشنے والے آج شرم رہ جائے — سرگزشت دل ہے اور میری بے زبانی ہے
گرم رقص ہیں اختر نا تمام سے اجزا — زندگی حقیقت میں خواب زندگانی ہے

مبارک ہیں اُس دل کی ویرانیاں — جو تیرے تصور سے آباد ہے

ہنستا ہے عشق غفلت ارباب ہوش پر
دنیا ہے چند خواب پریشاں لئے ہوئے
میری نگاہ شوق کو یہ کس نے بخش دیں
حیرانیاں لطافت عرفاں لئے ہوئے

میں یقین کرم پہ ہوں مجبور — وہ سراپا ستمگر ہی سہی

حشر آئے گا نہ جانے کب تک — زندگی اور ابھی رسوا ہوگی

بن سکا درمان محرومی نہ اُن کا التفات
تھم گئے آنسو مگر آنکھوں کو ویراں کر گئے

مسکرائے یوں مری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
وہ مری فطرت کی حیرانی کو عرفان کر گئے

فریبِ صورت عالم نہیں ہے جلوۂ معنی
حقیقت خود آپ افسانہ در افسانہ کرتی ہے

غم فنا سے لیا عیش جاوداں میں نے
متاع عشق کو اتنا کیا گراں میں نے

مری بلا کو ہو جاتی ہوئی بہار کا غم
بہت لٹائی ہیں ایسی جوانیاں میں نے

حریم کعبہ بنا دی وہ سر زمیں میں نے
ترے خیال میں رکھدی جہاں جبیں میں نے
مجھی کو پردۂ ہستی میں دے رہا ہے فریب
وہ حسن جس کو کیا جلوہ آفریں میں نے
چٹک میں غنچے کی وہ صوت جانفزا تو نہیں
سنی ہے پہلے بھی آواز یہ کہیں میں نے
رہین منزل وہم و گماں رہا اختر
اسی میں ڈھونڈھ لیا جادۂ یقیں میں نے

اک بسیط احساس، اک شوق نمایاں چاہیئے
عشق کی نبضوں میں رقصِ موجِ طوفاں چاہیئے
اک نئی ہستی نئی تعمیر دوراں چاہیئے...
میں ترے قرباں پھر اب تجدید پیماں چاہیئے

منزل ہستی کی عبرت دیکھ لی اے مجاز اپنی حقیقت دیکھ لی

جب نہ کوئی ہوا کفیل ، موت کفیل ہو گئی
میری حیات مختصر مرگ طویل ہو گئی
ذکر مآل چھیڑ کر تو نے غضب کیا ندیم
ساعت عیش تھی ہی کیا اور قلیل ہو گئی

اک جہان گفتگو تھا وہ سکوت منفعل
شکوہ کیا کرتے یہ انداز بیاں دیکھا کئے

کچھ اس نگاہ سے دیکھا تھا مجھ کو ساقی نے
چھٹی شراب مگر شان بے خودی نہ گئی

رہین درد عشق ہے حیات ہو کہ موت ہو
یہ جنس کائنات میں حقیر بھی گراں بھی ہے

تجلئی حیات ہے ہنوز بطن خاک میں
پھرا ہوں دل کو کارواں بہ کارواں لئے ہوئے
نہاں ہیں میری خاک میں گداز دل کی رفعتیں
ٹھہر گیا ہوں میں زمیں پہ آسماں لئے ہوئے

فریب جلوہ کہاں تک بروئے کار رہے
نقاب اٹھاؤ کہ کچھ دن ذرا بہار رہے
خراب شوق رہے ، وقف انتظار رہے
اب اور کیا ترے وعدوں کا اعتبار رہے
میں راز عشق کو رسوا کروں معاذ اللہ
یہ بات اور ہے دل پر نہ اختیار رہے
چمن میں رکھ تو رہا ہوں بنا نشیمن کی
خدا کرے کہ زمانہ بھی ساز گار رہے
جنوں کا رخ ہے حریم حیات کی جانب
الہی پردۂ اوہامِ اعتبار رہے

مری نگاہ سے چھپ کر خوشا رعایت ذوق
مری نگاہ پہ بجلی گرائی جاتی ہے
مشاہدات حقیقت کو ہے بہت اختر
وہ اک کلی جو چمن میں کھلائی جاتی ہے

میں تری حیرتِ معصوم کے صدقے یہ نہ پوچھ
موت کیوں درد کا درماں نظر آتی ہے مجھے

مری دانست میں خواب گراں ہے راز بیداری
کہ بیداری مجھے خواب گراں معلوم ہوتی ہے
قفس میں کیوں چلی آتی ہے یاد گلستاں ہمدم
کوئی بجلی قریب آشیاں معلوم ہوتی ہے

اک صبر شکن احساس ملا اک درد بھری تقدیر ملی
جو خواب ازل میں دیکھا تھا اُس خواب کی یہ تعبیر ملی
ہنستی ہوئی کلیوں کے رخ سے اُٹھے جو تبسم کے پردے
حسرت ہی کا اک عالم دیکھا ، عبرت ہی کی اِک تصویر ملی

جب میں نے سنا ہے نام اُن کا دل پر اک چوٹ سی لگی ہے

منظومات

شاعر فلسفی سے

تری نگاہ ہے وابستۂ فریب نمود
بہ ایں رعونت پندار و ناز بینائی
جگا سکی نہ تجھے اے رهین خواب گراں
بہار کی چمن افروز نغمہ پیرائی
مٹا سکی نہ تری روح کی جبیں سے شکن
فروغ ماہ میں لیلائے شب کی رعنائی
گرا سکی نہ کبھی بجلیاں ترے دل پر
سواد شب میں عروس سحر کی انگڑائی
تجھے نہ کیف کے رازوں سے کر سکا آگاہ
تبسم لب شیریں ، جمال برنائی
یہاں کہ ذرۂ خاکی ہے آفتاب فروش
یہاں کہ ریزۂ مینا ہے جام صہبائی
یہاں کہ سینۂ خس میں دواں ہے روح بہار
یہاں کہ رقص شرر میں ہے نور سینائی
تجھے خبر بھی ہے ناواقف سرشت حیات
کہ راز بے خبری ہے کمال دانائی
ہوا نہ صرف یقیں رنگ احتمال ترا
تغیرات کی زد میں رہا کمال ترا

اگرچہ میں بھی ہوں گم کردۂ طلسمِ حیات — مجھے ہے کھیل مگر اس جہاں کی بوالعجبی
یہ جانتا ہوں کہ ہے اک ادائے پرتو رنگ — تلاطم سحری ہو کہ خواب نیم شبی
ملا ہے فیض سے فطرت کے وہ دلِ آگاہ — کہ موج بادۂ عرفاں ہے میری تشنہ لبی

غلط نہیں ہے اگر ہو ز راہ کیف و جمال — خس ذلیل کو بھی دعوئے چمن نسبی
کشش ہے کس کی کہ ازماہ تا بماہئی آب — ہر ایک ذرۂ ہے آسودۂ فنا طلبی
ملے جو ساغر زہر آب مسکراتا ہوں — کہ اس میں پاتا ہوں میں روح آتش عنبی
کسی کا عکس ہے فیض حیات کی جنبش — یہ کائنات ہے ہمرنگ شیشۂ حلبی
مجھے تلاش ہے جس کی وہ مل چکا ہے مجھے — بہ ایں جسارتِ رندی و شانِ بے ادبی

ہجوم دہر میں سر گرم اہتمام ہوں میں
فنا پذیر ہے تو طالب دوام ہوں میں

حیات

اب اے تصوّرِ اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

مجھے یہ دھمکیاں نہ دے حیات کوئی چیز ہے
وہ کوئی چیز ہو نہ ہو مگر مجھے عزیز ہے
سمجھ سکوں یہ راز میں ابھی تو یہ تمیز ہے
ڈرا نہ دام آرزو سے فریب امتحاں نہ دے
اب اے تصور اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

حجاب دہر اٹھا گئی گرفتگی خیال کی
مآل غم سے مٹ گئی خلش غم مآل کی
یقیں نے توڑ دیں حدیں طلسم احتمال کی
حیات پھر حیات ہے مثال رفتگاں نہ دے
اب اے تصور اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

تلاش راز دہر میں کہاں کہاں پھرا ہوں میں
نفس نفس بجھا ہوں میں چمن چمن کھلا ہوں میں
قریب انتہا میں تھا اب اپنی ابتدا ہوں میں
جو منزلیں گزر چکیں انھیں کا پھر نشان نہ دے
اب اے تصور اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

اجل سے بھیک مانگنا یہ کار زندگی نہیں
خزاں کے رحم پر ہوں جو وہ پھول پھول ہی نہیں
تخیلات وہم ہیں جو حسن سرمدی نہیں
حدیث شوق کیا اگر لطافت بیاں نہ دے
اب اے تصور اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

ہوائے سرد سرد ہے نشاط جاں لئے ہوئے
سرور موج موج ہے جوانیاں لئے ہوئے
حجاب گرد گرد ہے کارواں لئے ہوئے
یہاں فغاں کا ذکر کیا یہ دعوت فغاں نہ دے
اب اے تصور اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

ازل سے گرم کار ہے وہ فطرت عظیم تر
دیار نور و نار میں سرِ بساط بحر و بر
اسی کی صبح و شام ہیں اسی کے لالۂ و گہر
متاع سود مند کو یہ تہمت زیاں نہ دے
اب اے تصوّر اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

ہادیؔ مچھلی شہری

سید محمد ہادی نام ہادی تخلص غالباً ۱۸۹۰ء میں قصبہ مچھلی شہر ضلع جونپور میں پیدا ہوئے ۔ آپ نسباً جعفری الزینبی ہیں ۔ آپ کے مورث اعلیٰ قاضی سناء الدین صاحب جونپور میں قاضی القضاۃ ہو کر آئے تھے ۔ ہادی صاحب کے والد مولوی سید عبدالرزاق صاحب المتخلص بہ شاکر سب جج تھے اور شعر و شاعری میں مرزا غالب سے مشورہ لیتے تھے ۔ شاکر صاحب کا ذکر مکتوبات غالب میں بھی موجود ہے ۔ ہادی صاحب کی ابتدائی تعلیم اُن کے وطن مچھلی شہر ہی میں ہوئی اور چونکہ شاکر صاحب عربی اور فارسی کے نہ صرف دلدادہ بلکہ فاضل تھے اس لئے مرحوم نے اپنی اولاد کی تعلیم سے اس عنصر کوعلیحدہ نہ ہونے دیا ۔ چنانچہ حضرت ہادی نے ان زبانوں کی تحصیل باقاعدہ طور پر مکتب میں کی ۔ اس کے بعد انگریزی تعلیم کے لئے علی گڑھ کالج میں داخل کئے گئے جہاں سے اُنہوں نے پہلے بی ۔ اے کی ڈگری حاصل کی پھر قانون کی طرف متوجہ ہوئے اور ایل ۔ ایل ۔ بی پاس کیا ۔ تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد آپ نے وکالت شروع کی اور تقسیم ہند سے قبل تک الہ آباد میں ایڈوکیٹ کی حیثیت سے پریکٹس کرتے رہے ۔ قیام پاکستان کے بعد ہادی صاحب کراچی تشریف لے آئے اور آج کل یہیں مستقلاً قیام پذیر ہیں ۔

شعر و سخن کا ذوق حضرت ہادی کو اپنے والد جناب شاکر سے ورثہ میں ملا اور بچپن ہی سے جبکہ اُن کی عمر چودہ پندرہ سال کی تھی اُن کی طبیعت اس طرف مائل ہوئی ۔ اُنہوں نے حضرت جلیل مانک پوری سے تلمذ اختیار کیا ۔ اسی زمانے میں اُن کی دو چار غزلیں اُس گلدستہ میں بھی شائع ہوئیں جو جلیل مرحوم کی سر پرستی میں شائع ہوتا تھا ۔ لیکن اس کے بعد ہی اُن کی طبیعت پر کچھ ایسا جمود طاری ہوا کہ کئی سال تک اُنہوں نے کچھ نہیں کہا

ہادی صاحب کی شاعری کا اصلی و حقیقی دور ازسرنو ۱۹۱۳ء سے شروع ہوتا ہے جس کا سلسلہ کم و بیش آج تک جاری ہے ۔ اس دوسرے دور شاعری میں حضرت ہادی نے کسی سے اصلاح نہیں لی بلکہ خود اپنے ذوق سلیم کی رہنمائی میں مشق سخن جاری رکھی حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آیا کہ اُنہیں اپنے اوپر پورا پورا بھروسہ ہو گیا ۔ اس دور میں

ہادی صاحب نے اُردو و فارسی دونوں میں طبع آزمائی کی ہے ۔ اُردو میں آن کے دو دیوان عرصہ ہوا مرتب ہو چکے تھے لیکن بعض وجوہ کی بنا پر غالباً اب تک شائع نہیں ہو سکے ۔ ان دواوین میں سے ایک کا تعلق محض غزلیات سے ہے اور دوسرا ملی و مذہبی اور مناظر فطرت سے متعلق منظومات پر مشتمل ہے ۔ فارسی دیوان میں ایک ہزار سے زائد رباعیات کے علاوہ غزلیات ' قصائد اور منظومات شامل ہیں جن میں سے بعض منظومات بہترین ایرانی مجلات میں شائع ہو چکی ہیں اور سر بر آوردہ ایرانی آدباء نے تعریف کرتے ہوئے حضرت ہادی کی زبان و تخیل کو ایرانی قرار دیا ہے ۔ غرض آن کے فارسی کلام کے وقیع ہونے کا اندازہ صرف اسی ایک بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود اہل زبان آن کی تعریف میں رطب اللسان ہیں ۔

حضرت ہادی کے اُردو کلام پر ایک نظر ڈالنے کے بعد یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ وہ ایک کہنہ مشق شاعر ہیں اور آنہیں جملہ اصناف شاعری پر عبور حاصل ہے ۔ آن کی غزلوں میں بڑی شگفتگی و شیرینی اور درد و اثر پایا جاتا ہے ۔ ہمواریٔ کلام اور لطف بیان کا یہ عالم ہے کہ آپ غزلوں پر غزلیں پڑھتے چلے جائیے کہیں ثقالت و گرانی کا نام تک نہ پائیے گا ۔ ظاہر ہے یہ صورت حال اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب شاعر کو اپنے خیالات کے اظہار کا سلیقہ و عبور دونوں حاصل ہوں آپ کی غزلیات کا خاص جوہر جذبات میں صداقت ہے ۔ آپ کی غزلیں در حقیقت گل و بلبل اور محبوب‌ومحب کے پردے میں ساری کائنات کی ایک داستان لئے ہوئے ہیں ۔ جن میں شاعر کے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ آن کی زبان میں اپنے اُستاد جلیل کی سی گھلاوٹ تو نہیں لیکن سادہ اور رواں ضرور ہے ۔ جس میں کہیں کہیں مترنم الفاظ کے استعمال سے اور بھی دلکشی بڑھ جاتی ہے ۔

جہاں تک موصوف کی منظومات کا تعلق ہے وہ نیچرل شاعری کا عمدہ نمونہ ہیں ۔ اور آن میں شاعر نے اپنے صحیح مشاہدات و حقیقی تاثرات کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ باوجودیکہ آن میں کوئی جدت اور آپچ نہیں ملتی تاہم آن کا تسلسل بیان اور سادگی و صفائی وہ خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے آنہیں نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ مناظر فطرت کا بیان آن کے یہاں بڑے حقیقی انداز میں ملتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ مظاہر قدرت سے شاعر کو بڑی شیفتگی ہے اور اسی لئے وہ آن کے بیان میں بعض اوقات جزوئی تفصیلات بھی پیش کر دیتا ہے ۔

بحیثیت مجموعی حضرت ہادی ایک قادرالکلام سخنور ہیں اور آپ کو جملہ اصناف سخن پر کامل قدرت حاصل ہے لیکن آپ کی جد و جہد کا خاص میدان غزل ہے جس میں آن کی قدرت و مشاقی کے جوہر کھلتے ہیں اور سچ بات تو یہ ہے حضرت ہادی جیسے بزرگوں کا دم غنیمت ہے جو ساٹھ سال سے متجاوز ہونے کے باوجود اپنے ذوق سخن کا ثبوت پیش کر رہے ہیں اور اب بھی اپنے دوران قیام کراچی میں کچھ نہ کچھ ضرور کہتے رہتے ہیں ۔ چنانچہ آپ کا تازہ کلام کبھی کبھی ریڈیو کے مشاعروں میں اور اکثر پاکستان کے مقتدر رسائل میں دیکھنے میں آتا رہتا ہے ۔

انتخاب کلام

تغزل

محو کمال آرزو مجھ کو بنا کے بھول جا..
اپنے حریم ناز کا پردہ اٹھا کے بھول جا
جلوہ ہے بے خودی طلب عشق ہے ہمت آزما
دیدۂ مست یار سے آنکھ ملا کے بھول جا
لطف جفا اسی میں ہے یاد جفا نہ آئے پھر
تجھ کو ستم کا واسطہ مجھ کو مٹا کے بھول جا
لوٹ طلب کے ننگ سے عشق کو بے نیاز رکھ
ہو بھی جو کوئی آرزو دل سے مٹا کے بھول جا

اشک غم عقدۂ کشائے خلش جاں نکلا
جس کو دشوار میں سمجھا تھا وہ آساں نکلا
کس قدر دست جنوں بے سر و ساماں نکلا
تجھ میں اک تار نہ اے چاک گریباں نکلا
اُف وہ تقدیر جو تدبیر کی پابند رہی
حیف وہ درد جو منت کش درماں نکلا
خاک ہو کر بھی رہا جلوہ طرازی کا دماغ
میرا ہر ذرۂ دل طُور بداماں نکلا..
الاماں وہ خلش جاں جو مٹائے نہ مٹی
ہائے وہ دم جو بصد کاوش پنہاں نکلا

حاصل وارفتگی تھا ابتدائے عاشقی
ہوش میں آتے ہی میں بے ہوش ہو کر رہ گیا

وہی آنکھیں ہیں، میسر ہے انھیں کو سب کچھ
جن کو حاصل ہو شب و روز تماشا تیرا

اللہ ! اللہ ! محبت کی یہ آئینہ گری
دیکھتا ہوں میں خود اپنے میں سراپا تیرا
ایک شوریدہ سرِ غم کو جگہ اور سہی
اس میں کیا جائے گا اے وسعت صحرا تیرا

درد سا اٹھ کے نہ رہ جائے کہیں دل کے قریب
میری کشتی نہ کہیں غرق ہو ساحل کے قریب
وجد میں روح ہے اور رقص میں ہے پائے طلب
دیکھئے حال مرے شوق کا منزل کے قریب
رہ گیا تھا جو کبھی پائے طلب میں چبھ کر
اب وہی خار تمنا ہے رگ دل کے قریب
اب وہ پیری میں کہاں عہدِ جوانی کی امنگ
رنگ موجوں کا بدل جاتا ہے ساحل کے قریب
جذبۂ شوق بھی کچھ کام نہ آیا "ہادی"
ناتوانی نے بٹھایا مجھے منزل کے قریب

زباں پہ حرفِ شکایت ارے معاذ اللہ — مجھے ترے ستم صبر آزما کی قسم
بس اک نگاہ کرم کا امید وار ہوں میں — جفا شعار تجھے میری التجا کی قسم
تو ہے بہار، تو دامن مرا ہو کیوں خالی — اسے بھی بھر دے گُلوں سے تجھے خدا کی قسم
غضب کی چھیڑ ہے ہادی یہ اور کیا کہئے
وہ کھا رہے ہیں مرے ترکِ مدّعا کی قسم

میں کیا ہوں، کون ہوں، یہ بھی خبر نہیں مجھ کو
وہ اس طرح مری ہستی پہ چھائے جاتے ہیں
خیال ہی ابھی آیا تھا کوئے جاناں کا
یہ حال ہے کہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں
وہ پوچھتے ہیں دل مبتلا کا حال اور ہم
جواب میں فقط آنسو بہائے جاتے ہیں

کہاں ہے شوق بتا غیرت کشش تیری
وہ میری خاک سے دامن بچائے جاتے ہیں
مٹا رہے ہیں وہ کیوں داغہائے دل ہادی
چراغ کیوں یہ جلا کر بجھائے جاتے ہیں

اس بے وفا کی بزم سے چشم خیال میں
اک خواب آرزو کا لئے جا رہا ہوں میں
دل کو نگاہ یار کے نشتر سے چھیڑ کر
بیدار آرزو کو کئے جا رہا ہوں میں
بیدرد مجھ سے شرح غم زندگی نہ پوچھ
کافی ہے اس قدر کہ جئے جا رہا ہوں میں
دو دن کی عمر وہ بھی ملی ہے بقید غم
یہ شکوہ ہر نفس میں کئے جا رہا ہوں میں

نظام طبیعت سے گھبرا گیا دل
طبیعت کی اب برہمی چاہتا ہوں
مری بیقراری سے خوش ہونے والے
نہ خوش ہو کہ میں بھی یہی چاہتا ہوں
جفا کو بھی تیری جو شرمندہ کر دے
وہ مظلوم میں زندگی چاہتا ہوں
غضب ہے یہ احساس وارستگی کا
کہ تجھ سے بھی خود کو بری چاہتا ہوں
سرِ دار منصور کو تھی جو حاصل
میں ''ہادی'' وہی زندگی چاہتا ہوں

اٹھنے کو تو اٹھا ہوں محفل سے تری لیکن
اب دل کو یہ دھڑکا ہے جاؤں تو کدھر جاؤں
مرنا مری قسمت ہے مرنے سے نہیں ڈرتا
پیمانۂ ہستی کو لبریز تو کر جاؤں
تو اور مری ہستی میں اس طرح سما جائے
میں اور تری نظروں سے اس طرح اتر جاؤں
دنیائے محبت میں دشوار جو جینا ہے
مر کر ہی سہی آخر کچھ کام تو کر جاؤں

کھویا ہوا سا رہتا ہوں اکثر میں عشق میں
یا یوں کہو کہ ہوش میں آنے لگا ہوں میں

یہ ابتدائے شوق کی حالت نہ ہو کہیں
محفل میں اُس سے آنکھ چرانے لگا ہوں میں
اب کیوں گلہ رہے گا مجھے ہجر یار کا
بے تابیوں سے لطف اٹھانے لگا ہوں میں

ہزار خاک کے ذرّوں میں مل گیا ہوں میں
مآل شوق ہوں آئینۂ وفا ہوں میں
کہاں یہ وسعت جلوہ کہاں یہ دیدۂ تنگ
کبھی تجھے کبھی اپنے کو دیکھتا ہوں میں
شہید عشق کے جلوے کی انتہا ہی نہیں
ہزار رنگ سے عالم میں رونما ہوں میں
مرا وجود حقیقت مرا عدم دھوکا
فنا کی شکل میں سر چشمۂ بقا ہوں میں
ہے تیری آنکھ میں پنہاں مرا وجود و عدم
نگاہ پھیر کے پھر دیکھ کیا سے کیا ہوں میں
مرا وجود بھی تھا کوئی چیز کیا معلوم
اس اعتبار سے پہلے ہی مٹ چکا ہوں میں
شمار کس میں کروں نسبتِ حقیقت کو
خدا نہیں ہوں مگر مظہر خدا ہوں میں
مرا نشاں نگہ حق نگر پہ ہے موقوف
نہ خودشناس ہوں ''ہادی'' نہ خودنما ہوں میں

وہ نگاہیں جو دل محزوں میں پنہاں ہو گئیں
شوق کی بیتابیاں بڑھ کر نمایاں ہو گئیں
ہر مصیبت تھی مجھے تازہ پیام عافیت
مشکلیں جتنی بڑھیں اتنی ہی آساں ہو گئیں
تیر کھا کھا کر تڑپنا دل کی قسمت ہی میں تھا
یا الٰہی وہ نگاہیں کیوں پشیماں ہو گئیں

اک ذرا سے مسکرا دینے کا حاصل یہ ہوا
ہستیاں غنچوں کی اوراقِ پریشاں ہو گئیں
شوق پھر صرف چمن آرائی خاطر ہے آج
پھر وہی رنگینیاں جانِ گلستاں ہو گئیں
شیشۂ دل عکس بردارِ تمنا پھر ہوا
پھر فروزاں شمع ہائے طاق نسیاں ہو گئیں

تو نہ ہو ہم نفس اگر جینے کا لطف ہی نہیں
جس میں نہ تو شریک ہو موت ہے زندگی نہیں
عشرت دید ہے یہی اپنا بھی کچھ رہے نہ ہوش
جلوہ بقید تاب دید اصل میں جلوہ ہی نہیں
اوّلِ عشق ہی میں کیا دل کا مآل دیکھنا
یہ تو ہے ابتدائے سوز آگ ابھی لگی نہیں
عشق ہے کیف بے خودی اس کو خودی سے کیا غرض
جس کی فضا ہو وصل و ہجر عشق وہ عشق ہی نہیں
یہ بھی نہ ہو خبر کہ سر سجدے میں ہے جھکا ہوا
جس میں ہو بندگی کا ہوش وہ کوئی بندگی نہیں
کس کا سر نیاز تھا پائے ایاز پر جھکا
مانع بندگی شوق سطوتِ خسروی نہیں
کر نہ سکونِ دل کا غم ہادیٔ مبتلا ذرا
عشق کی بارگاہ میں درد کی کچھ کمی نہیں

دیکھ کر شمع کے آغوش میں پروانے کو
دل نے بھی چھیڑ دیا شوق کے افسانے کو
ذرے ذرے سے گلستاں میں برستی ہے بہار
کون ایسے میں سنبھالے ترے دیوانے کو
طُور نے جس سے حیات ابدی پائی ہے
لاؤ دہراؤں میں پھر سے اسی افسانے کو
دل سرشار مرا چشم سیہ مست تری
جذبہ ٹکرا دے نہ پیمانے سے پیمانے کو
صبح کو دیکھ لے اس شمع کا انجام کوئی
جس نے پھونکا شب امید میں پروانے کو

حسن و وفا کا افتراق باعث ننگ شوق ہے
ہو کے مرے شریکِ دل داغِ دوئی مٹا تو دو

دل کے ہر ایک ذرے سے ہو گی نمود زندگی
ہو جو بڑے ستم شعار آ کے مجھے مٹا تو دو

مژدہ وصل اگر نہیں موت کا مشورہ سہی
میرے نصیب کا مجھے حکم ذرا سنا تو دو

خندۂ صبح پر بہت موسم گل کو ہے غرور
تم بھی نگاہ ناز سے دیکھ کے مسکرا تو دو

عرض وفا کی آرزو حسن کا مقتضا سہی
پہلے نگاہ لطف سے ذوق وفا بڑھا تو دو

تم عزیز اور تمہارا غم بھی عزیز　　کس سے کس کا گلہ کرے کوئی
مانع عرض، مجھ کو پاس وفا،　　اُن کو ضد التجا کرے کوئی
تم تغافل شعار، دل مایوس　　آہ! کیا حوصلہ کرے کوئی
غم دل اب کسی کے بس کا نہیں　　کیا دوا کیا دعا کرے کوئی
کون سنتا ہے غم نصیبوں کی　　کس کے در پر صدا کرے کوئی
خیر سن لو مرا فسانۂ غم　　یہ تو کہدو گے کیا کرے کوئی
سخت مشکل ہے شرح درد نہاں　　کس طرح ابتدا کرے کوئی
جس کو دیکھو وہ ہے وفا دشمن　　کس سے عہدِ وفا کرے کوئی
ختم جور و جفا ہے مرگ وفا　　کاش پھر ابتدا کرے کوئی

لطف تعزیر جب ہو جانِ حیات
کیوں نہ ہادی خطا کرے کوئی

تمہیں بھی معلوم ہو حقیقت کچھ اپنی رنگیں ادائیوں کی
کبھی اسے چھیڑ کر تو دیکھو جو لَے مرے دل کے ساز کی ہے

ابھی تو اک قطرہ ہی گرا تھا کہ جس سے ہلچل میں ہے زمانہ
خدا ہی جانے کہ کتنی قوت دل حزیں کے گداز میں ہے

الٰہی خیر اُس کے سنگِ در کی نہ ہو کہیں صرف شوق وہ بھی
کہ ذوق سجدہ کی ایک دنیا مری جبین نیاز میں ہے

نگاہ شوق کی وہ آشفتہ سامانی نہیں جاتی
وہ جلوہ کیا قیامت تھا کہ حیرانی نہیں جاتی
شکایت تنگئی دامان دل کی اس طرف مجھ کو
اُدھر اُن کی نگاہوں کی گل افشانی نہیں جاتی
پڑا ہوں توڑ کر پائے طلب راہِ محبت میں
کڑی منزل پہ بھی فکرِ تن آسانی نہیں جاتی
نگاہ شوق آخر مبتلائے رنگ و بُو کب تک
حقیقت حسن کی اس طرح پہچانی نہیں جاتی

الٰہی کیا یہی انداز ہے درد محبت کا
بھرا آتا ہے دل اور آنکھ پرنم ہوتی جاتی ہے
کہیں ایسا نہ ہو دل بے قراری کے لئے تڑپے
طبیعت کیوں مری آسودۂ غم ہوتی جاتی ہے

تجھ سے ہو کر الگ رہا کیا ہے — اے خدا شانِ ما سوا کیا ہے
وہ مجھے قتل کر کے نادم ہیں — نہیں معلوم یہ ادا کیا ہے
عازمانِ رہِ وفا کے لئے — جادۂ تیغ کے سوا کیا ہے
تم نے ہادی کبھی یہ سوچا بھی
عشق کی زندگی میں کیا کیا ہے

اللہ رے اس دیدۂ حیراں کی مصیبت
جس نے تجھے دیکھا بھی ہے دیکھا بھی نہیں ہے
کچھ منزلیں یہ بھی رہِ عرفاں میں تھیں شاید
اب دل کو خیال حرم و دیر نہیں ہے
اندازِ نظر سے ہے فقط حسن کی ترکیب
جو شکل نگاہوں میں سما جائے حسیں ہے

خدا گواہ کوئی لطفِ زندگی نہ رہے
خودی کے ساتھ اگر کیف بے خودی نہ رہے
ذرا سی دیر میں رازِ جہاں کھل جائے
نگاہ جلوہ طلب میں جو بے خودی نہ رہے
یہ فصل گل کا ہو عالم تو پھر خزاں کیا ہے
کہ گل تو ہوں مگر ان میں شگفتگی نہ رہے
نگاہ سینکڑوں جلوے تراش لیتی ہے
ہٹے جو پردہ تو یہ مشق آذری نہ رہے
دل حزیں کے تقاضے کہ حال دل کہدوں
وفا کی شرط کہ ہونٹوں پہ آہ بھی نہ رہے
فلک کسی کو مٹائے نہ اس طرح ہادی
کہ مٹنے والے کی دنیا میں خاک بھی نہ رہے

ذوق طلب کا میرے تقاضا نہ بن سکی ! — شرم خودی متاع تمنّا نہ بن سکی
تم ، بے خودی، گرفتہ مزاجی، شکستگی — اک آرزوئے دل مری کیا کیا نہ بن سکی
احساس ہو سکا نہ خود اپنے ہی حسن کا — یوسف کی آنکھ چشم زلیخا نہ بن سکی
وہ چشم نامراد یقیناً ہے تنگ شوق — روئی نہ اور رو کے جو دریا نہ بن سکی
وہ دل ہی کیا جو ہو نہ سکا داغ آشنا ! — وہ زندگی نہیں جو تمنا نہ بن سکی
ہادی وہ اعتبار محبت سے گر گئی
وہ آرزو جو داغ سویدا نہ بن سکی

ہے بسکہ تاثیرِ یاس غالب اُمید کا بھی نہیں بھروسہ
تھی جس سے شب ہائے غم کی رونق وہ شمع خود جھلملا رہی ہے
ہے صبر ممکن نہ جبر ممکن ، نہ دل پہ قدرت نہ تم پہ قابو
ہے مختصر یہ کہ جان محزوں عجیب آفت میں آ رہی ہے
یہ رنگ ہے اعتبار دل کا کہ ٹوٹتی ہی نہیں اُمیدیں
غضب تو دیکھو کہ شامِ وعدہ کی صبح تک ابتدا رہی ہے

برسات میں باغ کا نظارہ

کالی کالی یہ گھٹائیں یہ سہانا منظر
یہ گرج اور یہ بجلی کی چمک رہ رہ کر

خوش نما پتے درختوں کے نہائے نکھرے
جنکے نظارے سے ہے تقویت قلب و بصر

لہلہلاتے ہوئے پودوں کی قطاریں ہر سو
جس طرف دیکھئے رعنائی فطرت کا اثر

دیدہ و دل کی ضیافت کا ہے شاید ساماں
صحن گلزار میں پھولوں کی بچھی ہے چادر

اللہ اللہ یہ فیاضئی موسم کا کمال
اک شجر بھی نظر آتا نہیں بے برگ و ثمر

خوش نما قوس و قزح ایک طرف جلوہ فگن
جس میں ہر رنگ عیاں زرد ' گلابی ' احمر

دل ربا شوخ ادا بیر بہوٹی ہر سُو
دوڑتی پھرتی ہے سبزے پہ برنگ خوشتر

دور کے کھیتوں میں چھایا ہے دھواں سا ہرسُو
مستعد اشک فشانی پہ ہے بادیدۂ تر

موسلادھار کبھی اور کبھی ہلکا پانی
کبھی یک لخت برستا ہے کبھی تھم تھم کر

اس طرح پڑتی ہیں تالابوں میں بوندیں گویا
پانی کی تہ سے نکلتے ہیں اُچھل کر گوہر

تار بارش سے ہے آواز ترنم پیدا
بھیرویں گاتا ہو جس طرح کوئی وقت سحر

ایک طوفان ترنم کا ہے برپا ہر سو
جھومتی شاخیں ہیں مستوں کی طرح سن سن کر

ہائے یہ وقت ' یہ موسم ' یہ فضا اور وہ نہیں
کس طرح سینے پہ رکھے کوئی اپنے پتھر

یاس یگانہ چنگیزی

مرزا واجد حسین نام پہلے یاس تخلص کرتے تھے پھر یگانہ اختیار کیا ۔ ۱۸۸۳ء میں عظیم آباد کے معروف محلہ مغل پورہ میں پیدا ہوئے ۔ بزرگ ایران سے ہندوستان آئے اور سلطنت مغلیہ کے دامن سے بسلسلہ سپہ گری وابستہ ہو گئے ۔ پرگنہ حوالی عظیم آباد (پٹنہ) میں جاگیریں ملیں اور وہیں سکونت اختیار کر لی ۔

مرزا یگانہ کی ابتدائی تعلیم وطن ہی میں ہوئی ۔ شعر و شاعری کا ذوق شروع ہی سے تھا ۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد باقاعدہ شعر کہنے لگے اور اپنے استاد مولوی سید علی خاں بیتاب (شاگرد شاد عظیم آبادی) سے مشورہ سخن کیا ، کچھ دنوں کے بعد حضرت بیتاب نے انھیں اپنے استاد شاد صاحب کے سپرد کر دیا جن کے فیضان صحبت نے یگانہ کو یگانہ بننے میں بڑی مدد دی ۔ ۱۹۰۳ء میں وہ مٹیا برج (کلکتہ) گئے اور ایسے بیمار پڑے کہ جان کے لالے پڑ گئے ۔ چنانچہ علاج کے لئے لکھنؤ آئے اور بفضلہ تندرست ہو گئے مگر لکھنؤ کی فضا انھیں کچھ ایسی پسند آئی کہ پھر اسی کو اپنا مستقل مستقر بنا لیا اور لکھنؤ کے ایک معزز گھرانے میں شادی بھی کر لی ۔

اس زمانے میں لکھنؤ میں شعر و شاعری کے چرچے عام تھے ۔ ہر طرف مشاعرے اور ہر جگہ ادبی مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں ۔ یگانہ بھی ان میں شریک ہونے لگے لیکن ایک وقت ایسا آیا جب لکھنؤ کے اکثر اساتذہ اور یگانہ کے درمیان شعر و سخن کے معاملے میں بے لطفی ہو گئی ۔ جس نے بعد میں شدید بد مزگی کی صورت اختیار کر لی ۔ لکھنؤ کی اس ہنگامہ خیزی کا ان کے کلام پر خاصا اثر پڑا ۔

مرزا یگانہ کے ایک قادرالکلام شاعر ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن ان میں ایک فطری کمزوری یہ ہے کہ وہ اچھے اچھے شاعروں کو خاطر میں نہیں لاتے چنانچہ مرزا غالب کے کلام پر انھوں نے جیسے کچھ بھی اعتراضات کئے ان سے ادبی حلقے نا واقف نہیں ۔

یگانہ لکھنؤ سے بد دل ہو کر حیدرآباد دکن گئے اور وہاں کافی عرصہ تک دارالترجمہ میں ملازم رہے ۔ تقسیم کے بعد پھر لکھنؤ آ گئے اور فی الحال وہیں مقیم ہیں ۔

مرزا یگانہ کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت اُن کے انداز بیان کی تیزی اور تیکھا پن ہے ۔ وہ طنز یہ انداز میں بات کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں جس سے زور بیان میں چار چاند لگ جاتے ہیں ۔ وہ ادائے خیال کیلئے الفاظ کا انتخاب ایسے سلیقہ و جدت کے ساتھ کرتے ہیں کہ مفہوم بھی ذہن نشین ہو جاتا ہے اور خیال میں ایک طرفگی بھی پیدا ہو جاتی ہے اس پر اُن کی چست بندشیں کلام کا لطف دو بالا کر دیتی ہیں ۔ غرض زبان پر اُنھیں بڑی قدرت حاصل ہے اور وہ دقیق سے دقیق بات اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ مفہوم الفاظ کے گورکھ دھندے اور تراکیب کی پیچیدگیوں میں اُلجھنے نہیں پاتا ۔

یگانہ میں قوت تخیل کی کمی نہیں وہ حقائق و معارف کے مضامین کو خیالات کے عالم بالا سے چن کر لاتے ہیں اور ان طرفہ خیالات کو ایسی صفائی سے شعری جامہ پہناتے ہیں کہ انداز بیان کی ندرت کے ساتھ معنویت میں بھی بڑا نکھار پیدا ہو جاتا ہے ۔ اُن کے تغزل میں جرأت رندانہ کی کار فرمائی ملتی ۔ حزن و یاس کے وہ قائل نہیں بلکہ ہزار آلام و مصائب میں بھی ہمت و جواں مردی کا پیام دیتے ہیں ۔ وہ حادثات زمانہ کے جھیلنے کے قائل ہیں ۔ اُن پر رونا یا اپنی خستگی پر اظہار تاسف ان کا شیوہ نہیں ۔

یگانہ کا کلام صفائی اور بے باکی کے لحاظ سے بقول ڈاکٹر اعجاز صاحب کے ''آتش کے کلام کا دو آتشہ معلوم ہوتا ہے'' ۔ مگر خواجہ آتش کے یہاں عشقیہ وارداتوں کے بیان سے جو لطف و سرمستی پیدا ہوتی ہے اُس کی یگانہ صاحب کے یہاں کمی ہے ۔ البتہ اُن کے خیالات میں خواجہ صاحب کے مقابلہ میں بلندی ضرور پائی جاتی ہے اور یہی علوئے تخیل اُن کے یہاں جوش و ندرت بیان میں اضافہ کر دیتا ہے ۔ وہ فارسی ترکیبوں کے بڑے دلدادہ ہیں ۔ بحیثیت مجموعی اُن کی زبان صاف و شستہ ہے ہاں کہیں کہیں ہندی کے نا مانوس الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں جو اہل مذاق کی نگاہوں میں ضرور کھٹکتے ہیں ۔

یگانہ نے غزلوں کے علاوہ قطعات و رباعیات بھی کہی ہیں ۔ ان میں بھی اُن کی جدت طرازی کارفرما ہے ۔ ان میں عجیب عجیب نا مانوس الفاظ اور محاورے محض اسلئے استعمال کئے ہیں کہ اپنا نیا رنگ قائم ہو اس سے کہیں کہیں تو انداز بیان میں زور بھی پیدا ہوا ہے اور مزاح بھی ' لیکن اکثر بات بگڑ گئی ہے یعنی ظرافت یا جدت کی بجائے محض صنعت گری یا پتیرے بازی کا ایک نمونہ بن گئی ہے اس میں شک نہیں قوت ایجاد اچھی چیز ہے اور اس کی یگانہ صاحب کے یہاں کمی نہیں وہ کبھی کسی کی تقلید نہیں کرتے ۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اُنھوں نے اسی کو بہت کچھ سمجھ لیا ہے ۔ وہ خود کو اتنا لئے دئے رہنے کے عادی ہو گئے ہیں کہ اُس کا اثر اُن کی شعریت پر بھی برا پڑ رہا ہے ۔

مرزا یگانہ کے دو مجموعے '' آیات وجدانی '' اور '' گنجینہ '' زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں ۔

انتخاب کلام

تغزل

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا
پیام زیر لب ایسا کہ کچھ سنا نہ گیا
اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی رہا نہ گیا
سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے ترانہ درد
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا
بتوں کو دیکھ کے سب نے خدا کو پہچانا
خدا کے گھر تو کوئی بندۂ خدا نہ گیا
پکارتا رہا کس کس کو ڈوبنے والا
خدا تھے اتنے مگر کوئی آڑے آ نہ گیا
ہنسی میں وعدہ فردا کو ٹالنے والو
لو دیکھ لو وہی کل آج بن کے آ نہ گیا

اسی فریب نے مارا کہ کل ہے کتنی دور
اس آج کل میں عبث دن گنوائے ہیں کیا کیا
پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے
اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا
بلند ہو تو کھلے تجھ پہ زور پستی کا
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

دھواں سا جب نظر آیا سواد منزل کا
نگاہ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا
کبھی تو موج میں آئے گا تیرا دیوانہ
اشارہ چاہئے ہے جنبش سلاسل کا
ازل سے اپنا سفینہ رواں ہے دھارے پر
ہوا ہنوز نہ گرداب کا نہ ساحل کا
جواب حسن طلب بے دلوں سے بن نہ پڑا
حیا سے گڑ گئے جب نام آ گیا دل کا

تڑپ کے آبلہ پا اٹھ کھڑے ہوئے آخر
تلاش یار میں جب کوئی کاروان نکلا

دل آگاہ نے جب راہ پہ لانا چاہا　　عقل گمراہ نے دیوانہ بنانا چاہا
ناگہاں چرخ ستم گار نے کروٹ بدلی　　بخت بیدار نے جب مجھ کو جگانا چاہا
جذبۂ شوق نے جب عشق کی صورت بدلی　　پھر مٹائے نہ مٹا لاکھ مٹانا چاہا

مری بہار و خزاں جسکے اختیار میں تھی　　مزاج اس دل بے اختیار کا نہ ملا
امید وار رہائی قفس بدوش چلے　　جہاں اشارہ توفیق غائبانہ ملا
ہوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروان نفس　　عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ ملا
امید و بیم نے مارا مجھے دوراھے پر　　کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا
سمجھ میں آ گیا جب عذر فطرت مجبور　　گناہگار ازل کو نیا بہانہ ملا
بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ بد نصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

یہ دل بے مدعا بیگانہ امید و بیم
غرق ہو کر آپ اپنا ناخدا ہو جائے گا
بڑھتے بڑھتے اپنی حد سے بڑھ چلا دست ہوس
گھٹتے گھٹتے ایک دن دست دعا ہو جائے گا

بوئے وفا کہاں چمن روزگار میں
دل ہٹ گیا ہے جیسے کوئی پھول جھڑ گیا

قفس میں بوئے مستانہ بھی آئی درد سر ہو کر
نوید ناگہاں پہنچی ہے مرگ منتظر ہو کر
نگاہ شوق سے کیا کیا گلوں کا دل دھڑکتا ہے
مبادا رنگ و بو اڑ جائے پامال نظر ہو کر
زمانے کی ہوا بدلی نگاہ آشیاں بدلی
اٹھے محفل سے سب بیگانۂ شمع سحر ہو کر

جواب آیا کہ تو نے کیا آیا صدائے باز گشت آئی
دہن سے آہ نکلی مبتلائے بے خبر ہو کر

چشم پر خوں نے مجسم کر دیا موہوم کو
ورنہ بے تعبیر تھا خواب پریشان بہار
خار و گل دونوں کو اپنے بانکپن پر ناز ہے
دیکھئے رہتا ہے کس کے ہاتھ میدان بہار
اپنے اپنے رنگ میں اور اپنے اپنے حال میں
کوئی حیران خزاں کوئی پشیمان بہار

یکساں کبھی کسی کی نہ گزری زمانے میں
بادشاہ بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں
رہ رہ کے جیسے کان میں کہتا ہے یہ کوئی
ہوں گے قفس میں کل جو ہیں آج آشیانے میں

اسیروں کی یہ خاموشی کسی دن رنگ لائے گی
قفس سے چھوٹ کر سر پر اٹھا لیں گے گلستاں کو
مزاج حسن بدلے ، آسماں بدلے ، زمیں بدلے
سزائے عشق کیا بدلے گی ذوق نا پشیماں کو

آ رہی ہے یہ صدا کان میں ویرانوں سے — کل کی ہے بات کہ آباد تھے دیوانوں سے
آج ہی کل میں ہے چلنے کو نسیم وحشت — تنگ آنے لگے دیوانے گریبانوں سے

بقدر حوصلہ ملتی ہے داد عشق و ہوس — مزاج حسن میں کیا اعتدال ہوتا ہے

خاک کا پتلا ہے رفتار نمو سے مجبور — ہمہ تن سنگ بنے یا ہمہ تن دل ہو جائے
ناخدا کو نہیں اب تک تہ دریا کی خبر — ڈوب کر دیکھے تو بیگانۂ ساحل ہو جائے

نظام دہر نے کیا کیا نہ کروٹیں بدلیں — مگر ہم ایک ہی پہلو سے بیقرار رہے

دل اپنا جلاتا ہوں کعبہ تو نہیں ڈھاتا اور آگ لگاتے ہو کیوں تہمت بے جا سے
حیراں ہیں نظر والے بیتاب ہیں دل والے کچھ رنگ تماشا سے کچھ بوئے تمنا سے

کھیل ہے حسن نظر کا شمع کیا پروانہ کیا
دل ہے جب تک دل بھی تک روشنی محفل میں ہے
باز آ ساحل پہ غوطے کھانے والے باز آ
ڈوب مرنے کا مزا دریائے بے ساحل میں ہے

سلسلہ چھڑ گیا جب یاس کے افسانے کا
شمع گل ہو گئی دل بجھ گیا پروانے کا
خلوت ناز کجا اور کجا اہل ہوس
زور کیا چل سکے فانوس سے پروانے کا
تشنہ لب ساتھ چلے شوق میں سایہ کی طرح
رخ کیا ابر بہاری نے جو میخانے کا
واہ کس ناز سے آتا ہے ترا دور شباب
جس طرح دور چلے بزم میں پیمانے کا
کیا عجب ہے جو حسینوں کی نظر لگ جائے
خون ہلکا ہے بہت آپ کے دیوانے کا
آپ اب شمع سحر بڑھ کے گلے ملتی ہے
بخت جاگا ہے بڑی دیر میں پروانے کا
بزم میں صبح ہوئی چھا گیا اک سناٹا
سلسلہ چھڑ گیا جب آپ کے افسانے کا

قفس کو جانتے ہیں یاس آشیاں اپنا
مکان اپنا زمین اپنی آسماں اپنا
سنا ہے رنگ زمانہ کا اعتبار نہیں
بدل نہ جائے یقیں سے کہیں گماں اپنا
مزے کے ساتھ ہوں اندوہ و غم تو کیا کہنا
یقیں نہ ہو تو کرے کوئی امتحاں اپنا

عجیب بھول بھلیاں ہے منزل ہستی
بھٹکتا پھرتا ہے گم گشتہ کارواں اپنا
کدھر سے آئی ہے یوسف کی بوئے مستانہ
خراب پھرتا ہے جنگل میں کارواں اپنا
جرس نے مژدۂ منزل سنا کے چونکایا
نکل چلا تھا دبے پاؤں کارواں اپنا
خدا کسی کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے
قفس کے سامنے جلتا ہے آشیاں اپنا

وطن کی ہے ہوا سر میں وطن کی خاک دامن پر
گریباں چاک کر لیتا ہوں یاد دوست و دشمن پر
ہوئے کیوں بار خاطر خود بخود گل ہائے پژ مردہ
ڈھیرے پڑتے ہیں آپی آپ کیوں گلچیں کے دامن پر
نہ ترک اختیار آساں نہ ضبط اضطرار آساں
یہی دست دعا جھلّا کے اٹھ جاتا تھا دشمن پر
پسینہ تک نہیں آتا تو ایسی خشک توبہ کیا
ندامت وہ کہ دشمن کو ترس آ جائے دشمن پر
شکست نشہ و کیف ندامت واہ کیا کہنا
بجائے مے ٹپکتا ہے زلال اشک دامن پر
نگاہ بے نیازی نے دکھایا راستہ سیدھا
بھٹکتا کوئی کب تک جادۂ شیخ و برہمن پر
خدا جانے اجل کو کس پہ پہلے رحم آئے گا
گرفتار قفس پر یا گرفتار نشیمن پر
زہے معراج انسانی کہ بندہ ہوں تو اپنا ہوں
چڑھایا خود پرستی نے نگاہ دوست دشمن پر
کجا طرز یگانہ اور کجا انداز بیگانہ
بجا ہے رشک تم جیسوں کو ایسے صاحب فن پر

جان پیاری ہے حیات جاوداں پیاری نہیں
زندگی کیا موت کی جب گرم بازاری نہیں
صبر کہتا ہے کہ رفتہ رفتہ مٹ جائے گا داغ
دل یہ کہتا ہے کہ بجھنے کی یہ چنگاری نہیں
جلوہ گر رہنے لگا چشم تصور میں کوئی
حضرت دل بے سبب راتوں کی بیداری نہیں
جھیل لینگے ہجر کے مارے قیامت کا بھی دن
آج کی شب تو کٹے پھر کوئی دشواری نہیں

تار نظر نے باندھ لیا ہے بہار کو
نیرنگئی تصور بے اعتبار کو
دے کچھ تو داد طبع ندامت شعار کو
کیا دیکھتا ہے لغزش بے اختیار کو
بیچارے بہ نصیب گرفتار آستاں
کیا جانیں گرم و سرد خزان و بہار کو
سہو و خطا ودیعت فطرت سہی مگر
سمجھاؤں کیا ضمیر ملامت شعار کو
میزان عدل آئی اب ایسوں کے هاتھ میں
کانٹوں سے تولتے هیں جو پھولونکے هار کو
کچھ هوش هو تو آنکھوں هی آنکھوں میں تولئے
آغاز پُر فریب سے انجام کار کو

کس دل سے ترک لذت دنیا کرے کوئی
وہ خواب دلفریب کہ دیکھا کرے کوئی
غنچے کے دل میں کچھ نہ تھا اک آہ کے سوا
پھر کیا شگفتگی کی تمنا کرے کوئی
دل مضطرب نگاہ گرفتار شش جہت
فرمائیے کدھر کا ارادہ کرے کوئی
اس کی نگاہ شوق کے قربان جائیے
تجھ ایسے بے نشاں کو جو پیدا کرے کوئی

بندے نہ ہوں گے جتنے خدا ہیں خدائی میں
کس کس خدا کے سامنے سجدہ کرے کوئی
حسن یگانہ آپ ہی اپنا حجاب ہے
حسن حجاب دور سے دیکھا کرے کوئی

بخت بیدار اگر سلسلۂ جنباں ہو جائے
شام سے بڑھ کے سحر دست و گریباں ہو جائے
درد کا قحط ہو دل کا کوئی گاھک نہ رہے
وائے بر عشق کہ بازیچۂ طفلاں ہو جائے
خواب شیریں نہ سہی خواب پریشاں ہی سہی
دل بہلنے کا شب غم کوئی ساماں ہو جائے
موت کی یاد میں نیند اور بھی اڑ جاتی ہے
نیند آ جائے تو کچھ موت کا ساماں ہو جائے
نشۂ حسن کو اس طرح اترتے دیکھا
عیب پر اپنے کوئی جیسے پشیماں ہو جائے
"یاس" بیدارئ موہوم ہے ساری ہستی
آنکھ ہو بند تو سب خواب پریشاں ہو جائے

آہ بیمار کار گر نہ ہوئی
چرخ کانپا مگر سحر نہ ہوئی
صبح محشر ہوئی شب تاریک
صورت یار جلوہ گر نہ ہوئی
شب امید کٹ گئی لیکن
زندگی اپنی مختصر نہ ہوئی
دور سے آج ان کو دیکھ لیا
دل کو تسکیں ہوئی مگر نہ ہوئی
فکر انجام و حسرت آغاز
دو گھڑی چین سے بسر نہ ہوئی
کھلنے والا نہیں در توبہ
فکر انجام وقت پر نہ ہوئی
ایسا رونا بھی کوئی رونا ہے
آستیں آنسوؤں سے تر نہ ہوئی
نیم جاں چھوڑ کر چلا قاتل
نگہ یاس کار گر نہ ہوئی

تا خدائے کم ہمت ھاتھ پاؤں مار آیا   تہ کی کیا خبر لاتا حوصلہ بھی ھار آیا
بار اتارنا کیسا بار سر اتار آیا

کشتئ حیات اپنی جا رہی تھی دھارے پر | سنگدل تماشائی ہنستے تھے کنارے پر
دل وہی شکستہ دل پھر بروئے کار آیا

خانۂ خدا معلوم شیخ و برہمن جھوٹے | اس طلسم حیرت سے کب اسیر غم چھوٹے
پائے مضطرب ٹوٹے جب کہیں قرار آیا

شام سے بھڑک اُٹھی اور بھی لگی دل کی | یاس اُمید فردا نے واہ کیا تسلی دی
مضطرب نگاہوں کو حکم انتظار آیا

لذت زندگی مبارک باد | کل کی کیا فکر ہرچہ بادا باد
دل سلامت ہے درد دل نہ سہی | درد جاتا رہا کہ درد کی یاد
صبر اتنا نہ کر کہ دشمن پر | تلخ ہو جائے لذت بیداد
صلح کر لو یگانہ غالب سے
وہ بھی اُستاد تم بھی اک اُستاد

جب تک خلش درد خدا داد رہے گی | دنیا دل ناشاد کی آباد رہے گی
دل اور دھڑکتا ہے ادب گاہ قفس میں | شاید یہ زباں تشنہ فریاد رہے گی
جو خاک کا پتلا وہی صحرا کا بگولا | مٹنے پہ بھی اک ہستی برباد رہے گی
ہر شام ہوئی صبح کو اک خواب فراموش | دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی
شہرہ ہے یگانہ تری بیگانہ روی کا
واللہ یہ بیگانہ روی یاد رہے گی

نگاہ حسن سے اب تک وفا ٹپکتی ہے | ستم رسیدہ سہی ، پیرہن دریدہ سہی
فریب ابر کرم بھی بڑا سہارا ہے | بلا سے نخل تمنا خزاں رسیدہ سہی
قریب ہوں مگر اتنا کہ جیسے کوسوں دور | مجھے نہ دیکھ سکو گے ، زمانہ دیدہ سہی
یگانہ ٹھن گئی بیڈھب تو سوچتے کیا ہو | شریک کار نہیں تو نہیں جریدہ سہی

حسن پر فرعون کی پھبتی کہی | ہاتھ لانا یار کیوں کیسی کہی
دامن یوسف بھی بھڑکاتا رہا | عشق اور ترک ادب اچھی کہی
کوئی ضد تھی یا سمجھ کا پھیر تھا | من گئے وہ میں نے جب اُلٹی کہی
شک ہے کافر کو مرے ایمان میں | جیسے میں نے کوئی منہ دیکھی کہی
کیا خبر تھی یہ خدائی اور ہے | ہائے میں نے کیوں خدا لگتی کہی

رباعیات

کعبہ کی طرف دور سے سجدہ کر لوں	یا دھر کا آخری نظارہ کر لوں
کچھ دیر کی مہمان ہے جاتی دنیا	اک اور گنہ کر لوں کہ توبہ کر لوں

چارہ نہیں کوئی جلتے رہنے کے سوا	سانچے میں فنا کے ڈھلتے رہنے کے سوا
اے شمع تری حیات فانی کیا ہے	جھونکا کھانے سنبھلتے رہنے کے سوا

دل کے ہاتھوں خراب رہتے ہی بنی	افتاد پڑی جیسی سہتے ہی بنی
ہم تیری تلاش میں کہیں کے نہ رہے	کعبہ کو بھی خیر باد کہتے ہی بنی

کیوں مطلب ہستی و عدم کھل جاتا	کیوں راز طلسم کیف و کم کھل جاتا
کانوں نے جو سن لیا وہی کیا کم ہے	آنکھیں کھلتیں تو سب بھرم کھل جاتا

موجوں سے لپٹ کے پار اترنے والے	طوفان بلا سے نہیں ڈرنے والے
کچھ بس نہ چلا تو جان پر کھیل گئے	کیا چال چلے ہیں ڈوب مرنے والے

جوش ملسیانی

پنڈت لبھو رام نام جوش تخلص - یکم فروری ۱۸۸۴ء کو قصبہ ملسیان ضلع جالندھر (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے - ۱۴ سال کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور چونکہ آنجہانی باپ نے کنبہ کی پرورش اور بیٹے کیلئے کوئی اثاثہ نہ چھوڑا تھا اس لئے شروع سے ہی نہایت غربت اور تنگدستی میں گزر اوقات ہوئی نیز گھریلو ذمہ داریوں کا بار بھی اٹھانا پڑا - پھر ان اقتصادی مشکلات سے قطع نظر جوش صاحب کو ماحول بھی انتہائی غیر شاعرانہ نصیب ہوا - تیس بتیس سال کی عمر تک ملسیان میں رہے - جس کی زمین زرعی پیداوار کی صورت میں یقیناً سونا اگلتی ہے مگر علم و ادب اور شعر و شاعری سے اس علاقہ کو کوئی مناسبت نہیں - ۱۹۱۴ء سے پنڈت جی نے نکودر میں سکونت اختیار کر لی جو ملسیان سے ۸ میل کے فاصلے پر تحصیل کا صدر مقام ہے - لیکن یہاں بھی علم و فن اور وسیع مطالعے کے اسباب عنقا تھے - ظاہر ہے ایسے حوصلہ شکن حالات اور ادب کش ماحول میں رہ کر جوش صاحب کا ایک لائق فائق معلم اور صاحب فن شاعر بن جانا بالکل معجزہ ہے -

جوش صاحب بچپن سے ہی بڑے ہونہار اور ذہین واقع ہوئے تھے- آپ نے منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحانات پاس کرنے کے بعد ڈسٹرکٹ بورڈ کے اسکولوں کی مدرسی کر لی اور زندگی کا بیشتر حصہ اسی معلمی میں گزار کر ملازمت سے سبکدوش ہوئے - خانہ نشینی کے ایام میں آپ کے دو ہی محبوب مشغلے رہے ہیں ایک شعر دوسرے شطرنج -

عادات و خصائل کے اعتبار سے جوش صاحب قدیم وضع کے دیہاتی بزرگ ہیں - مزاج میں بڑی سادگی و بے تکلفی ہے اور سادگی مزاج ان کی ساری زندگی پر چھائی ہوئی ہے - لباس کا یہ عالم ہے کہ معمولی کپڑے کی سفید دھوتی ' سفید پگڑی اور سفید قمیض کو کافی سمجھتے ہیں البتہ سردیوں میں ایک کمبل کا اضافہ ہوتا ہے - لیکن یہ ظاہری ٹیپ ٹاپ کی کمی جوش صاحب کی باطنی خوبیوں کی صورت میں پوری ہو گئی ہے - وہ بڑے مخلص ' بے حد فراخ دل اور صاف گو انسان واقع ہوئے ہیں - ظاہر داری یا ریا کاری سے تو انہیں دور کا بھی لگاؤ نہیں -

شعر گوئی کا آغاز طالب علمی کے زمانے ہی میں ہو گیا تھا ۔ لیکن آنکے انتہائی غیر شاعرانہ ماحول میں بغیر کسی خارجی تحریک کے اتنی شعری رغبت و دلچسپی جتنی جوش صاحب کو رہی ہے ' پیدا ہونا فطری تقاضے کے سوا اور کیا کہلا سکتا ہے ۔ شروع شروع میں آپ نے قدرتی مناظر اور اخلاقی مضامین کو موضوع سخن بنایا مگر درسی کتابوں میں اساتذہ کا کلام دیکھ کر غزلگوئی سے رغبت پیدا ہوئی ۔ چنانچہ فنی کتابوں کے مطالعے اور ذاتی مشق سے بہت جلد فن سخن کے رموز و نکات پر عبور حاصل کر لیا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیائے شعر و سخن میں فصیح الملک داغ دہلوی کا طوطی بول رہا تھا ۔ لہذا پنڈت جی بھی ۱۹۰۲ء میں داغ کے شاگرد ہوئے اور خط و کتابت کے ذریعہ اصلاح لینے لگے ۔ ۱۹۰۵ء تک تقریباً ڈھائی سال یہ سلسلہ جاری رہا لیکن اس سال جناب داغ کا انتقال ہو گیا ۔ اس کے بعد جوش نے کسی سے اصلاح نہ لی ہمیشہ اپنے ذوق صحیح کی رہنمائی پر بھروسہ کیا ۔ ہاں فن و زبان کے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے آن کے متعلق داغ صاحب کے ایک شاگرد نسیم بھرت پوری سے خط و کتابت کر لیا کرتے تھے ۔

جوش صاحب نے یوں تو جملہ اصناف سخن غزل ' قصیدہ ' مرثیہ ' قطعہ ' رباعی ' تاریخ ' خمریات اور نظم سب کو نوازا ہے لیکن غزل پر نسبتاً زیادہ توجہ مبذول رہی ہے ۔ اور حق یہ ہے کہ غزلگوئی کا حق ادا کر دیا ہے ۔ آنکی غزلوں میں مضمون و تخیل کی بلندی کے ساتھ ساتھ بڑی سادگی و صفائی ہے ۔ اور آنکی زبان وہی روزمرہ کی ٹکسالی زبان ہے ۔ محاورہ کی صداقت و صحت کا بڑا خیال رکھتے ہیں ۔ اور حتی الوسع لطف تشبیہ ' خوبی استعارہ اور حسن ترکیب کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ۔ بیان کی شوخی و تازگی آن کے کلام کے مخصوص جوہر ہیں ۔ جوش صاحب کے جذبات میں بلندی و طہارت دونوں کا ایک حسین امتزاج پایا جاتا ہے اور وہ متانت و پاکیزگی کو شعر کیلئے بہت ضروری خیال کرتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ آنکی غزلوں میں ہمیں صنف غزل کے تمام لوازم نہایت پسندیدہ اور پاکیزہ صورت میں ملتے ہیں ۔ آنکی غزل بلند ترین جذبات انسانی کی مظہر اور لغویات و مکروہات سے یکسر پاک ہوتی ہے ۔

مختصر یہ کہ جوش کا کلام فصیح ' شگفتہ اور دلکش ہے ۔ آنکی زبان اہل زبان کی طرح دلکش و شیریں اور بیان میں ایک عجیب ساحرانہ کیفیت ہے ۔ آنکے کلام کی انہیں دو خصوصیات شیرینی و سحر آفرینی کی بدولت بہت سے ہندو نوجوان شعر گوئی کی طرف مائل ہو کر آپ کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو چکے ہیں ۔ خود آپ کے فرزند عزیز پنڈت بالمکند عرش ملسیانی بھی ایک خوش گو شاعر ہیں ۔ جوش صاحب آجکل اپنے صاحبزادے عرش صاحب ہی کے ہمراہ دھلی میں مقیم ہیں ۔ آپ کے کلام کا ایک مجموعہ ''جنون و ہوش'' کے نام سے ۱۹۵۱ء میں دلی سے طبع ہو چکا ہے ۔

انتخاب کلام

مختصر بھی ہے اور جامع بھی   کیا ہُوا کا جواب کیا نہ ہوا

جوَر میں بھی وھی ھے اوچھا پن ۔ اس ادا کا بھی حق ادا نہ ہوا
ھاں کہو کچھ ھمیں بھی ھو معلوم وہ گِلا کیا جو برملا نہ ہوا

تیرے وعدے کو جفا کاری میں مجھ پر بھی ھے فوق
اُس نے جینے کی طرح مرنا بھی مشکل کر دیا
یہ سمجھتے تھے کہ موت آئے تو ھو غم سے نجات
وہ جب آئی ' اُس نے دم لینا بھی مشکل کر دیا

جسکی الفت میں ھم ھوئے برباد وھی بیگانۂ وفا نکلا

چشمک تھی برق کی کہ تجلّی حسن یار ارمان رہ گیا مری آنکھوں کو دید کا

حسن کو جور سے بیگانہ بنایا ھوتا اتنا خونیں نہ یہ افسانہ بنایا ھوتا
تو نے دنیا کو تو بیگانہ بنایا مجھ سے مجھ کو دنیا ھی سے بیگانہ بنایا ھوتا

کچھ خاک تھی جو قالبِ انساں میں صرف کی کچھ برق تھی جسے دل مضطر بنا دیا

حسرت نصیب وہ ھے جو ھو کر شکستہ پا منزل سے دور حسرت منزل میں رہ گیا

بے خودی طاری ھوئی مجھ پر تمہاری یاد میں
تم نے مجھ کو بھی مری نظروں سے پنہاں کر دیا

آسی بے درد کو افسوس میں نے چارہ گر جانا
ھمیشہ میرے درد دل کو جس نے درد سر جانا
کرم میں بھی ستم کے سینکڑوں پہلو نکلتے ھیں
غلط کیا ھے اگر ھم نے تجھے بے داد گر جانا

موت کے دھوکے میں ہم کیوں آ گئے ۔ زندگی کا بھی مزا جاتا رہا
جب سے تو نے دشمنی کی اختیار اعتبار دوستی جاتا رہا

آہ و فریاد و نالہ و شیون یہی انجام ہے محبت کا
خود نمائی تو اسکی فطرت ہے حسن بھوکا نہیں ہے شہرت کا
آدمی ہیں شمار سے باہر قحط ہے پھر بھی آدمیت کا

غم واندوہ کی باتوں سے خفا ہوتے ہیں وہ کیا کروں گا میں اگر حال سنانا ہی پڑا
ضبط کی داد نہ دی کاوش غم نے اے جوش دل سے لب تک مری فریاد کو آنا ہی پڑا

زندگی کیوں نہ ہو لب فریاد ایک دل وہ بھی خانماں برباد
پھر وہی نالہ پھر وہی فریاد حیف ہے تجھ پہ اے دل ناشاد
آنکھ کہتی ہے مشکلات کو دیکھ شوق کہتا ہے ہر چہ بادا باد
جب بھی پیدا ہوئی تڑپ دل میں سی دئے ضبط نے لب فریاد

تائب کبر و ناز ہو محو سر نیاز ہو حسن کا اعتبار کیا عشق کا اعتبار کیا

رنج غم ، درد الم ، یاس ، تمنا ، حسرت
اک تری یاد کے ہونے سے ہے کیا کیا دل میں
جس محبت پہ تمہیں ناز ہے اتنا اے جوش
اس کا انجام بھی تم نے کبھی سوچا دل میں

کیوں کر کہوں کہ بانئی بیداد کون ہے
تقدیر ہی کا نام لئے جا رہا ہوں میں

لاکھ ہو باعث آزار جنون الفت حق تو یہ ہے کہ بغیر اسکے گزارا ہی نہیں

جیتے جی میں کس طرح آزاد ہوں آپ اپنی قید کی میعاد ہوں
اور بھی اس شرم نے مارا مجھے آپ کا بندہ ہوں پھر ناشاد ہوں

کیا کرامت ہے وہ آنکھوں میں سمٹ کر آ گیا
وسعت ارض و سما میں جو سما سکتا نہیں
آہ اس بے درد کی اُلفت میں ہوں آتش بجاں
جو لگا سکتا تو ہے لیکن بجھا سکتا نہیں

بجز اشک غم کے نشاں اور بھی ہیں — مرے درد کے ترجماں اور بھی ہیں
مہ و مہر و انجم کو دیکھا تو جانا — کہ بھٹکے ہوئے کارواں اور بھی ہیں
ابھی اپنی محشر خرامی نہ چھوڑو — سر راہ کچھ نیم جاں اور بھی ہیں
حرم سے کچھ آگے بڑھے ہم تو دیکھا — جبیں کے لئے آستاں اور بھی ہیں

اُسکی بے چارگی کا کیا کہنا — جسکی آہیں بھی کچھ اثر نہ کریں
داستاں ختم ہو ہی جائیگی — آپ قصہ تو مختصر نہ کریں

نگاہ قہر سے وہ دیکھتے ہیں — الٰہی آج میں کیا دیکھتا ہوں
گلستاں میں بہار آئی ہے شاید — خرد کو سر بہ صحرا دیکھتا ہوں
ڈبو دے گا مرا ذوق نظر کیا — ہر اک قطرے میں دریا دیکھتا ہوں

چارۂ حال زار کیا معنی — جبر میں اختیار کیا معنی
چھیڑ ہے یہ قفس نصیبوں سے — مژدۂ نو بہار کیا معنی
جنت اک چیز ہی سہی لیکن — حشر تک انتظار کیا معنی
ہیں وہی بانئی ستم اے جوش — ستم روزگار کیا معنی

خاک جھیلے گا وہ مصیبت عشق — جو لگا کر پھر نہ بجھا جانے

دیر پر بحث کرے بعد میں شیخ — پہلے کعبے کو تو کعبا جانے
اُسکی اُلفت مجھے تڑپاتی ہے — جو تڑپنے کو تماشا جانے
عشق میں گرم رو راہ طلب — شام کیا جانے سحر کیا جانے

جہاں بھی حسن دل آرا دکھا گیا کوئی — وہیں فریب تمنا میں آ گیا کوئی
دکھا کے شوخ نگاری کا جلوۂ بے تاب — مری نظر کو تڑپنا سکھا گیا کوئی
دیا وہ درد کہ تھی جسمیں ایک لذت خاص — ستم میں شان کرم بھی دکھا گیا کوئی

غم کی بھر مار ہوئی جاتی ہے　　زندگی بار ہوئی جاتی ہے
جس محبت پہ بھروسہ تھا مجھے　　اب وہ آزار ہوئی جاتی ہے
بار ہے دل پہ ندامت انکی　　جیت بھی ہار ہوئی جاتی ہے

مہربانی اور بھی تڑپائے گی　　آن کے آنے پر بھی شامت آئے گی
موت ہی انسان کی دشمن نہیں　　زندگی بھی جان لے کر جائے گی

نہ کی بات کوئی مدارات کی　　شکایت رہی ہم کو ہر بات کی
قیامت بھی کم بخت آتی نہیں　　کوئی تو ہو صورت ملاقات کی
وہی بن گئی داستان جنون　　نگاہوں نے آپس میں جو بات کی

کرم اے سوز پنہانی کہ یہ الزام بھی آیا　　تمہاری بے زبانی اب زباں معلوم ہوتی ہے

مجھ پہ دنیا میں قیامت رہی برپا ہر روز　　اور اے داور محشر یہ قیامت کیسی

یہ ادا ہوئی کہ جفا ہوئی یہ کرم ہوا کہ سزا ہوئی
اُسے شوق دید عطا کیا جو نگہ کی تاب نہ لا سکے

بسنت

(ایک نغمۂ شیریں)

بہار صبح دل کشا بسنت بن کے آ گئی
نمود حسن کی گھٹا سرور بن کے چھا گئی
نصیب صحن باغ کا جو سو رہا تھا سو چکا
خزاں کا جور ہو چکا خزاں کا دور ہو چکا
اب اپنے حسن پر فدا شجر بھی ہے حجر بھی ہے
کمال شان دلبری ادھر بھی ہے ادھر بھی ہے
نگاہ شوق آج پھر دلِ پُر آرزو ہوئی
رہین سیر گل ہوئی فدائے رنگ و بو ہوئی

پھر آج رنگ نسترن نظر نواز ہو گیا
پھر آج برگ یاسمن حریم ناز ہو گیا
غبار خستہ خاطری کسی کے رخ پہ اب نہیں
گرہ جو غم کی دل میں تھی وہ آج مہر لب نہیں
چمن کی شاخ شاخ پر طیور نغمہ زن ہوئے
یہ نغمے حسن بن گئے فروغ انجمن ہوئے
ہر ایک شے میں زندگی ادائے ناز ہو گئی
شگفتگی میں تازگی کرشمہ ساز ہو گئی
نہ اب جنوں کی شدتیں نہ اب وہ ہرزہ گردیاں
ہوا میں اعتدال ہے نہ گرمیاں نہ سردیاں
صنم کدے سے برہمن جو ہو کے بے قرار اٹھا
بہار سبزہ دیکھ کر ہری ہری پکار اٹھا
نظر کا ذوق جستجو چمن میں خندہ زن ہوا
یہ خندہ رنگ بن گیا گلوں کا پیرہن ہوا
ہر ایک گل ہے باغ میں عروج شان ارتقا
زمین گلستاں ہے یہ کہ آسمان ارتقا
حیات تازہ مل گئی تمام کائنات کو
طیور کو عوام کو جماد کو نبات کو

ہولی

چمن چمن میں نوید بہار ہے ہولی　　نزول رحمت پروردگار ہے ہولی
بہار رفتہ کی حسرت میں بیٹھنے والے　　نظر اٹھا کہ سراپا بہار ہے ہولی

شہیدان وطن ۱۹۴۹ء

دیکھئے ان جینے والوں کا نشان زندگی　　دیکھئے ان مرنے والوں کا جہان زندگی
دیکھئے ان پستیوں میں آسمان زندگی　　دیکھئے ان خاک کے ذروں کی شان زندگی
بیٹھئے دم بھر شہیدان وطن کی خاک پر

دیکھئے روح وفا کیا کیا ابھرتی ہے یہاں　　دیکھئے حب وطن دل میں آترتی ہے یہاں
دیکھئے دل کی فضا کیسی نکھرتی ہے یہاں　　دیکھئے رحمت خدا کی طوف کرتی ہے یہاں
بیٹھئے دم بھر شہیدان وطن کی خاک پر

اس جگہ بے رنگیاں بھی عالم تصویر ہیں　　اس جگہ تاریکیاں بھی شمع کی تنویر ہیں
اس جگہ خاموشیاں بھی اک لب تقریر ہیں　　اس جگہ روپوشیاں بھی دلکی دامنگیر ہیں
بیٹھئے دم بھر شہیدان وطن کی خاک پر

آٹھ گئے دنیا سے لیکن ایک دنیا ہو گئے　　بلبلے پانی کے تھے ٹوٹے تو دریا ہو گئے
یہ وہ تھے ذرات جو آڑ کر ثریا ہو گئے　　یہ وہ تھے بیمار جو مر کر مسیحا ہو گئے
بیٹھئے دم بھر شہیدان وطن کی خاک پر

سونے والوں کو یہاں بیدار ہوتے دیکھئے　　مست رندوں کو یہاں ھشیار ہوتے دیکھئے
تیرگی کو اسجگہ انوار ہوتے دیکھئے　　تشنگی کو اسجگہ سرشار ہوتے دیکھئے
بیٹھئے دم بھر شہیدان وطن کی خاک پر

دل کے اجڑے باغ کو آباد ہوتے دیکھئے　　روح کی افسردگی کو شاد ہوتے دیکھئے
بندگی کو قید سے آزاد ہوتے دیکھئے　　پر شکستہ صید کو صیاد ہوتے دیکھئے
بیٹھئے دم بھر شہیدان وطن کی خاک پر

آئیے اس خاک سے کسب فضیلت کیجئے　　آئیے قربان اس پر دلکی دولت کیجئے
ھاں ذرا رک جائیے اتنی نہ عجلت کیجئے　　اس زیارت گاہ عالم کی زیارت کیجئے
بیٹھئے دم بھر شہیدان وطن کی خاک پر

آغا شاعر قزلباش دہلوی

آغا مظفر بیگ قزلباش نام شاعر تخلص ۱۸۷۱ء میں دھلی میں پیدا ہوئے۔ علوم متداولہ کی تعلیم وطن ھی میں حاصل کی۔ طبیعت لڑکپن سے چلبلی اور شوخ تھی۔ اس پر نواب احمد سعید خاں طالب کے فیض صحبت اور مرزا شجاع الدین خاں تاباں کی حوصلہ افزائی نے اوربھی چار چاند لگا دئے۔ نتیجہ یہ ھوا کہ آغا صاحب نے اوائل عمر ھی میں شعر و شاعری شروع کر دی اور حضرت طالب سے اصلاح لینے لگے۔ پھر دھلی کے مشاعروں میں اپنی خوش گوئی کی داد لینے کے بعد فصیح الملک داغ کے تلامذہ میں داخل ہوئے اور اصلاح کے لئے غزلیں حیدر آباد بھیجنے لگے۔ کہتے ھیں کہ ابتدا میں جناب شاعر کی روانی و تیزئ طبع کا یہ عالم تھا کہ ایک دن میں چار پانچ سو اشعار کہہ لیتے اور مشاعروں میں اپنے شاگردوں کو تقسیم کر دیتے تھے۔ شعر گوئی کے غاز ھی سے آنہوں نے دھلی میں اپنا علم آستادی بلند کر دیا اور آن کے ماننے والوں کی تعداد کافی ھو گئی تھی۔ یہاں تک کہ اس دور کے اساتذہ مثلاً حالی، ظہیر، مجروح، طالب، ثاقب، راسخ وغیرہ آن کی ذھانت، طباعی اور سلاست بیان کے معترف تھے۔

پچیس تیس سال کی عمر میں شاعر صاحب بتلاش معاش حیدر آباد تشریف لے گئے۔ س زمانے میں داغ مرحوم زندہ تھے اور بقول شخصے حیدر آباد پر چھائے ہوئے تھے چنانچہ آن کی سفارش پر شاعر صاحب مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد کے یہاں بزمرۂ شعرا ملازم ھو گئے اور اس طرح آنھیں کافی عرصہ تک آستاد داغ کی خدمت میں حاضر رھنے کا موقعہ ملا۔ آخر قسمت نے وھاں بھی چین نہ لینے دیا۔ حیدر آباد سے نکل کر جوانی کی آمنگ و ترنگ میں ناٹک کمپنیوں تک پہنچے اور ڈرامہ نگاری کے ذریعہ سے کلکتہ میں بسر اوقات کرتے رہے۔ دو تین سال تک بیگم صاحبہ مرشد آباد کے داماد نواب نصیرالملک سفیر ایران کی مصاحبت میں گزارے۔ وھیں سے ''افسرالشعراء'' کا خطاب پایا۔ اس کے بعد موصوف ریاست جھالا واڑ میں تقریباً دس سال تک مہاراجہ جھالا واڑ کے درباری شاعر کی حیثیت سے مقیم رہے۔ یہیں سے آپ نے کچھ عرصہ ایک رسالہ '' آفتاب '' نامی نکالا اور مہاراجہ صاحب کی تحریک پر رباعیات عمر خیام کا فصیح و ٹکسالی آردو میں منظوم ترجمہ کیا جو ''خمکدۂ خیام'' کے نام سے فیروز سنز لاھور نے طبع کرایا۔ حضرت شاعر چونکہ مرثئے بھی کہتے تھے اور ساتھ ھی پڑھنے کا انداز بھی نہایت دلکش و مؤثر تھا اس لئے آپ دو تین مرتبہ ریاست خیر پور میں ایام عشرہ میں بلائے گئے اور ھر مرتبہ رئیس وقت کی طرف سے بڑی قدردانی ھوئی۔ آخری

عمر میں آپ اپنے وطن دھلی میں گندہ نالہ والے مکان میں اقامت گزیں رہے اور وھیں انتقال فرمایا ۔

حضرت شاعر ایک کامل فن استاد اور مشّاق سخنور تھے ۔ ایک تو دھلوی ھونا ھی زبان کے معاملے میں کافی سے زیادہ سند رکھتا ھے اس پر انھیں داغ سا فصیح البیان استاد ملا ۔ جس نے ان کی بیشتر توجہ روزمرہ اور محاورہ کی طرف منعطف کرائی ۔ یہی وجہ ھے کہ شاعر صاحب کا کلام زبان و بیان کی خصوصیات سے مالا مال ھے ۔ اور سچ پوچھئے تو روزمرہ کا دلفریب اسلوب اور محاورات کا بے تکلف استعمال ' جو داغ کی شاعری کا زبردست عنصر ھے ' آغا صاحب کی شاعری کا بھی طرۂ امتیاز ھے لیکن یہاں یہ کہے بغیر نہیں رھا جا سکتا کہ باوجود اس کے کہ ان کا کلام استاد کی بہت سی خصوصیات کا حامل ھے ۔ بحیثیت مجموعی اس پایہ کا نہیں ۔ ان کے کلام میں شوخی کی انتہا نہیں مگر اس کے ساتھ ھی کہیں کہیں عامیانہ پن بھی پایا جاتا ھے ۔ محاوروں کے نظم کرنے کا انھیں بہت شوق تھا لیکن یہی شوق بعض اوقات عامیانہ محاورات کے استعمال پر بھی مجبور کر دیتا ۔ بایں ھمہ یہ ماننا پڑے گا کہ انھوں نے استاد کے رنگ کو خوب چمکایا اور آخر دم تک صرف تغزل کے شعر کہتے رھے ۔ ان کی غزلیات بندش کی خوبی ' انداز بیان کی ندرت ' مضمون کی شوخی اور صحت زبان کے لحاظ سے خوب ھیں ۔

حضرت شاعر نے چند قصائد بھی لکھے ھیں لیکن خیام کی رباعیات کا ترجمہ خاص طور پر قابل قدر چیز ھے ۔ صاف ' شستہ اور روزمرہ کی زبان میں انھوں نے عمر خیام کے مطالب کو جس برجستگی' روانی اور بے تکلفی کے ساتھ بیان کیا ھے وہ قابل صد ستائش ھے ۔ موصوف کا پہلا دیوان ''تیر و نشتر'' ۱۹۰۶ء میں مخزن پریس لاھور سے طبع ھوا تھا اور دوسرا دیوان بھی تیار تھا مگر اس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی ۔ اس کے علاوہ آپ نثر کی بھی کئی کتابوں کے مصنف ھیں جن میں ''قتل بے نظیر'' نے بہت شہرت پائی ۔

انتخاب کلام

کیا خبر تھی راز دل اپنا عیاں ھو جائے گا
کیا خبر تھی آہ کا شعلہ زباں ھو جائے گا

حشر میں انصاف ھوگا بس یہی سنتے رھو
کچھ یہاں ھوتا رھا ھے ' کچھ وھاں ھو جائے گا

عشق کی آگ کو بجھ بجھ کے سلگتے دیکھا
یہ وہ فتنہ ھے کہ مٹ مٹ کے نمودار رھا

پہلے اسمیں اک ادا تھی ' ناز تھا ' انداز تھا
روٹھنا اب تو تری عادت میں داخل ہو گیا

اس لئے کہتے تھے ' دیکھا منہ لگانے کا مزا
آئینہ اب تو آپ کا مدِّ مقابل ہو گیا

دشمنوں کی جان ہے گویا مری افسردگی
رنگ چہرے سے اُڑا تو رنگ محفل ہو گیا

اک بات کہیں تم سے ' خفا تو نہیں ہوگے
پہلو میں ہمارا دل مضطر نہیں ملتا

نبض دیکھی ' حال پوچھا ' اُٹھ چلے
بیٹھیے صاحب ' بھلا یہ آئے کیا ؟

پاؤں ٹکتا ہی نہیں شاعر کہیں
ایسے وحشی کو کوئی سمجھائے کیا

کس طرح جوانی میں چلوں راہ پہ ناصح
یہ عمر ہی ایسی ہے سجھائی نہیں دیتا

وہ ہنسی بھر گئی آنکھوں میں جو بجلی چمکی
غنچہ چٹکا تو مجھے اُس کا دھن یاد آیا

چوٹ سی دل پہ لگی آنکھ میں آنسو بھر آئے
جب کبھی عالم غربت میں وطن یاد آیا

نزع میں دیکھنے آئے ہیں مرے داغ جگر
پھول کمھلا گئے جب اُن کو چمن یاد آیا

کہاں اُٹھ کر چلے ہم بھی تو اُٹھتے ہیں ذرا ٹھیرو
گھڑی ساعت کے ہیں اب کیا بھروسہ زندگانی کا

حسن یوسف کا جو ذکر آیا تو شاعر سے کہا
رہنے بھی دو اُس کو وہ قصہ کتابی ہو گیا

ہائے اس کہنے کے صدقے کیوں نہ مر جائے کوئی
مر مٹا کوئی تو پھر احسان ہم پر کیا ہوا !

صبح پیری جو ہوئی آہ کے شعلے نکلے
کیا بھڑکتا ہے چراغ سر منزل اپنا.

بڑے سیدھے سادے ' بڑے بھولے بھالے کوئی دیکھے اس وقت چہرا تمہارا
منائیں تو اب جان دیگر منائیں قیامت ہے یہ روٹھ جانا تمہارا
علاج اُس کے بیمار کا تم کرو گے ؟ کہیں دل چلا ہے مسیحا تمہارا

بجلی کی طرح آئے ہوا کی طرح پھر گئے
تم بھی تو کوئی دل ہو کسی بے قرار کا
کس طرح دل بچاؤں تمہاری نگاہ سے
مجبور ہوں کہ کام نہیں اختیار کا

شیخ کو جو پارسا کہتا ہے اُس کو کیا کہوں
میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا وہ میخانے میں تھا

مسافران عدم کس طرف کو جاتے ہیں
کسی کا گور سے آگے پتا نہیں ملتا
عجیب چیز تھی شاعر شباب بھی کیا تھا
ہزار عیش ہیں پر وہ مزا نہیں ملتا

دوئی اپنا نہیں اس دھر فنا میں شاعر
ہم نے اک اک کو باندار نظر دیکھا لیا

کوئی گھڑی تو نیکی کے دم میں بھی تم رہو
ہر بات پر بگڑتے ہو ایسا بھی کیا مزاج

آئے جاتی ہے پیاری پیاری یاد — دل سے جاتی نہیں تمہاری یاد
خود فراموش ہو گیا بالکل — میں نے جس دن سے کی تمہاری یاد
تیرے سب وار دیکھے بھالے ہیں — ہاں مگر ایک سب سے کاری یاد

سبزے کی لہک ، پھول کی خوشبو ، نمِ شبنم
ہر رنگ میں ہوتے ہیں وہ انداز بدل کر

کچھ نہ کچھ عالم ایجاد نے بخشا ہم کو
خالی ہاتھ آئے تھے ، اب جائیں گے حسرت لے کر

کعبہ سے دیر ، دیر سے کعبہ — مار ڈالے نہ راہ کی گردش

مری افتادگی کیا کہئے تیرے — نہ پہنچا اڑ کے گرد کارواں تک

بلا سے راہ میں تو بات ہوگی — چلو چلتا ہوں میں دشمن کے گھر تک
الٰہی آتش الفت بھی کیا ہے — لگی تھی دل سے پہنچی ہے جگر تک
نہ نکلا ایک دم ہی تو شب غم — نہیں مر مر گیا ہوں میں سحر تک

اک ستمگر پہ ہم بھی مرتے ہیں — آپ کا سا شباب ہے بالکل

جب مری بات کا جواب نہیں — کیوں نہ سمجھوں کہ پھر عتاب نہیں
یاس کہتی ہے ساتھ جاؤں گی — زندگی پر مرا حساب نہیں

محفل میں چین بھی ہے تجھے فتنہ گر کہیں
دل ہے کہیں ، خیال کہیں ہے ، نظر کہیں

وهی خاک میں مل گئے سب سے پہلے
جنھیں حسن و خوبی کے دعوے رہے ہیں

الٰہی کیا کریں ، کیونکر جئیں ، آخر کہاں جائیں
کہ ارماں تیر بن بن کر ہمارے دل میں رہتے ہیں

ہم تمہیں یاد بھی آئیں تو کبھی بھُولے سے
تم ہمیں بھول بھی جاؤ تو بہت یاد کریں

جو ترے سامنے ہو آتے ہیں　　دل و دیں جان کے کھو آتے ہیں

کیا کہیں اب وہ رسم و راہ نہیں　　دم نہیں ، دل نہیں ، نگاہ نہیں
تیرے ہاتھوں کہیں پناہ نہیں　　کون سا دل ہے جو تباہ نہیں
آدمی آدمی سے ملتا ہے　　بات کرنی تو کچھ گناہ نہیں

پہرہ بٹھا دیا ہے یہ قید حیات نے
سایہ بھی ساتھ ساتھ ہے جاؤں جہاں کہیں

پی پلا کر اسے رحمت کی قسم دیتے ہیں
کیسے بندے ہیں کہ اللہ کو دم دیتے ہیں

یہی رفتار کے انداز ہیں تو کیا ٹھکانا ہے
خدا جانے کہاں چھپنا پڑے جا کر قیامت کو

چار دن کے بعد غنچہ پھولوں کا ہمشکل تھا
رنگ دیتے ہیں یونہی تصویر سے تصویر کو

غیر کو تم برا کہو نہ کہو　　کبھی چھپتی نہیں ہے پیار کی آنکھ

حسن رفتہ کا اب ملال ہی کیا　عارضی چیز تھی رہی نہ رہی
یاس کچھ کم نہیں ترا احسان　آرزو بھی بری بھلی نہ رہی

کلیجے میں ہزاروں داغ دلمیں حسرتیں لاکھوں
کمائی لے چلا ہوں ساتھ اپنے زندگی بھر کی

مٹتے مٹتے بھی محبت کا نشاں رہتا ہے
تھمتے تھمتے بھی سر شمع دھواں رہتا ہے
ہوش بھی ہو جو کوئی ضبط کی تدبیر کرے
دل جب آتا ہے تو پھر صبر کہاں رہتا ہے
آپ دلی بھی گئے ہیں کبھی اے مشفق من
وہاں اک شاعر اعجاز بیان رہتا ہے

شعلۂ عشق جان لے کے رہا　بجھ گئی شمع غم میں گھل گھل کے
اشک بلبل ٹپک رہے ہیں آج　کل تو شہرے تھے خندۂ گل کے

تم کہاں، وصل کہاں، وصل کے ارمان کہاں
دل کے بہلانے کو اک بات بنا رکھی ہے

ہائے بے شغل ہوں، بے کیف ہوں، بے لذت ہوں
کچھ نہ کچھ لطف تو تھا درد جگر ہونے سے

ہے تیری ہی سی شکل مگر شوخیاں نہیں
چپ چپ جبھی تو ہے تری تصویر کیا کرے

دل پھونک دیا کرتے ہیں الفت کے پتنگے
یہ آگ کسی کو بھی بجھانی نہیں آتی

پوچھتے کیا ہو عدم والو یہاں دنیا کا حال
اک تماشا تھا جسے ہم عمر بھر دیکھا کئے

آئینہ خانہ ہے دنیا ہر جگہ تصویر ہے
سینکڑوں جلوے ترے شام و سحر دیکھا کئے

یا لبالب ساغر بلّور رکھ دے سامنے
دیکھے یا کوئی ان آنکھوں میں نیند آتے ہوئے

ادھر وہ شوق تلوّن کہ بے حجاب پھروں
ادھر یہ ضد ہے کہ نیچی نظر میں کیوں نہ رہے

اپنی کہی تو لاکھ زبانیں ہیں بات میں
میری سنی تو سنتے ہی خاموش ہو گئے

کوئی کل ہی نہیں تڑپنے سے — باز آئے ہم ایسے جینے سے

کسی کا ذکر ہو سننے سے مطلب — الجھتے ہیں ہماری داستاں سے
بہت سن لی بس اب آپے میں رہئے — نکل جائے نہ کچھ میری زباں سے
کبھی تم نے سنا درد محبت ؟ — کبھی ہم نے کہا اپنی زباں سے

محبت بھی کیا چیز ہے دیکھنا — ادھر بات کی چشم تر ہو گئی

کیا خبر کب تک اسے دیکھا کیا — پھر بھی حسرت رہ گئی دیدار کی
اک زمانہ ہو گیا تم پر فدا — کچھ خبر ہے گرمئی بازار کی

بزم دشمن سے اب آئے ہو مزے لوٹے ہوئے
ہوش میں آؤ کہیں جڑتے ہیں دل ٹوٹے ہوئے
وائے ناکامی کہ گلشن میں خزاں آنے لگی
دو ہی دن گزرے تھے ہم کو قید سے چھوٹے ہوئے
دلفریبی لالہ رویوں کی نہیں مٹتی کبھی
یہ ستمگر خاک ہو کر بھی تو گل بوٹے ہوئے

گری ، گر کر آٹھی ، پلٹی تو جو کچھ تھا آٹھا لائی
نظر کیا کیمیا تھی رنگ چہروں سے آڑا لائی

اب بھی جو گزر جاتی ہے چلتی ہوئی مورت
دل کھنچتا ہے ، دم کھنچتا ہے ، کھنچتی ہے نظر بھی

بلبل کو ایک مشت پر آستخواں سمجھ
گل کیا ہے دستۂ ورق چند چند ہے
لو آؤ میں بتاؤں طلسم جہاں کا راز
جو کچھ ہے سب خیال کی مٹھی میں بند ہے

شمع ساں خاموش ہوں لیکن وفور یاد سے
اب بھی اکثر پھول جھڑتے ہیں لبِ فریاد سے

جگر میں درد ہے ، دل مضطرب ہے جان بے کل ہے
مجھے اس بے خودی میں بھی خبر ہے اپنے عالم کی
شکایت کس سے کیجیے ، ہائے ! کیا آلٹا زمانہ ہے
بڑھایا پیار جب ہم نے ، محبت یار نے کم کی
کہاں جانا ہے ، تھم تھم کر چلو ، ایسی بھی کیا جلدی
تم ہی تم ہو ، خدا رکھے ، نظر پڑتی ہے عالم کی
کوئی ایسا ہو آئینہ کہ جس میں تو نظر آئے
زمانے بھر کا جھوٹا ، کیا حقیقت ساغر جم کی

رباعیات

(ترجمہ از عمر خیّام)

قدرت نے مجھے حسن دیا تھا کیسا
رخ پھول سا ، قد سرو سا پیارا پیارا
پر یہ نہ کھُلا کہ خاک کرنے کے لئے
نقاش نے یہ نقش سنوارا کیوں تھا

جس قصر میں بہرام کے تھا رنگ رچا
اب شیر کا بھٹ ہے وہ ہرن کا باسا
بہرام جو کرتا تھا سدا گور شکار
اب دیکھ ! اسے گور نے کھایا کیسا ؟

سرِ دفتر عالم معانی ہے عشق
سر بیت قصیدۂ جوانی ہے عشق
اے عالم عشق سے سراپا غافل !
یہ نکتہ سمجھ ' کہ زندگانی ہے عشق

زاہد کا نہ زہد کام دے گا ساقی !
یہ حسن عمل ہے اک دکھاوا ساقی !
دے جلد مئے ناب کہ میں عیش کروں
جو کچھ تھا ازل میں لکھ لیا تھا ساقی !

یہ موت نہ دیگی پھر اماں اے ساقی ! بھر دے قدح شراب ہاں اے ساقی
غافل ! غم بیہودہ سے کیا کام ہمیں ' دو دن کی ہے زندگی یہاں اے ساقی !

جگر مرادآبادی

علی سکندر نام ۔ جگر تخلص ۔ ۱۸۹۰ء میں مرادآباد میں پیدا ہوئے ۔ والد علی نظر نظر شاگرد خواجہ وزیر لکھنوی ، صاحب دیوان شاعر تھے ۔ مورث اعلیٰ مولوی محمد سمیع دھلی کے باشندے اور شہنشاہ شاھجہاں کے استاد تھے ۔ عتاب شاھی کے باعث ترک وطن کر کے مرادآباد میں آباد ہو گئے ۔ وھیں جگر کی ولادت ہوئی ۔ جگر کی ابتدائی تعلیم غیر مستقل طور پر ہوئی ۔ فارسی کی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھیں پھر میٹرک تک انگریزی پڑھی ۔ البتہ ذوق سخن ترکہ میں پایا ۔ ابتداً اپنے والد سے مشورۂ سخن کیا ۔ اُن کے بعد داغ سے فیض پایا ۔ کچھ غزلیں تسلیم کو بھی دکھائیں ۔ ابتدائی کلام پر داغ کا رنگ غالب ہے ۔

تین مجموعے ''داغ جگر'' ''شعلہ طور'' اور ''آتش گل'' شایع ہو چکے ہیں ۔ شعلۂ طور کا آخری ایڈیشن جگر صاحب کی نظر ثانی کے بعد ۱۹۵۲ء میں دوبارہ شائع ہوا اور نیا مجموعہ ''آتش گل'' ۱۹۵۴ میں چھپا ۔

جگر عصر حاضر کے بڑے کامیاب غزل گو ہیں اور ان کی غزل قدیم رنگ تغزل اور موجودہ رنگین نگاری کا مخلوط نمونہ ہے ۔ جس میں میر کا سوز ، غالب کا تفکر ، مومن کی رنگینی اور داغ کی زبان کی تمام کیفیات بہت ستھرے اور جامع انداز میں یکجا ہو گئی ہیں ۔ یہی وہ خصوصیات کلام ہیں جنکی بدولت جگر حسرت ، فانی اور اصغر جیسے باکمال اساتذہ کی موجودگی میں غزل کے اُفق پر اُبھرے اور نقادان فن کو مجبور کر دیا کہ وہ ان چاروں شعرا کو اُردو غزل کے عصر حاضر کے عناصر اربعہ قرار دیں ۔ آج ان عناصر اربعہ میں سے صرف جگر ہمارے درمیان موجود ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اُن کی مسیحا نفسی کا اعجاز ہے کہ آج اُردو غزل ادب عالیہ کی تمام اصناف پر چھا گئی ہے ۔

جگر کو اصغر سے بے پناہ عقیدت ہے ۔ چنانچہ نفاست خیال اور ایک حد تک رنگینی کے اعتبار سے جگر کے کلام کو اصغر سے مناسبت بھی ہے ۔ مگر اصغر کے فلسفیانہ خیالات نے اُنکی شاعری کو بہت بلند کر دیا ہے ۔ اصغر زندگی کے خوشگوار اور سنگین دونوں پہلو پیش کرتے ہیں لیکن جگر زیادہ تر خوشگوار پہلو سے متاثر ہوئے ہیں ۔

جہاں تک اسالیب بیان کا تعلق ہے جگر کے اسالیب اصغر سے زیادہ صاف اور سیدھے ہیں ۔ آنکی شاعری ایک ایسی تصویر ہے جو بنی تو سادہ رنگوں سے ہی ہے مگر ان رنگوں کی باهمی آمیزش میں مصور کی رنگینی طبع اور چابکدستی جھلکتی ہے ۔

جگر واردات حسن و عشق، کیف و سرور میں ڈوب کر بیان کرتے ہیں ۔ آنکی شاعری ''قال'' نہیں سراپا ''حال'' ہے اور اسی لئے اس میں زندگی کی تازگی و حرارت موجود ہے ۔ جگر کی غزلیات میں تغزل کی صحیح جان موجود ہے ۔ آن میں عشق کا تمام سرور و مستی اور حسن کی تمام رنگینی و رعنائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جگر نے ہماری غزل کو حافظ کی رنگینی و سر مستی عطا کی ۔ جگر کے یہاں ہمیں وہ تندی و تیزی بھی ملتی ہے جو بقول غالب آبگینہ کو تندئی صہبا سے پگھلا دیتی ہے ۔

جگر کے کلام کی سادگی، روانی اور نزاکت دراصل داغ جیسے یگانۂ فن کے فیض صحبت کا نتیجہ ہے ۔ لیکن یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جگر کے کلام میں داغ کا رنگ زیادہ نکھر گیا ہے ۔ داغ بہت ہی پر گو شاعر تھے جنہیں ایک سمندر سے تشبیہ دی جا سکتی ہے اور اسکے مقابلے میں جگر کی شعری کائنات مختصر ہے جسے داغ مقطر کہا جا سکتا ہے ۔ داغ کے بعد آن کے رنگ میں بہت سے شاعروں نے کہا لیکن انفرادی حیثیت جگر ہی کو حاصل ہوئی ۔

جگر کی موجودہ مصروفیات اور احباب کی صحبتیں آنہیں فکر سخن کا بہت کم موقعہ دیتی ہیں ۔ حتیٰ کہ اب مشکل سے سال میں وہ ۳ یا ۴ غزلیں کہہ پاتے ہیں بہر صورت اب وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں انتخاب ہوتا ہے ۔ آن کے رنگ میں متانت و پختگی بڑھتی جا رہی ہے ۔ تخیل میں رفعت اور جذبات میں جوش و صداقت کا اضافہ ہوتا جاتا ہے ۔ حقائق و معارف کی شاعرانہ رنگینی سے کلام میں گہرائی، گیرائی اور عمق بڑھ رہا ہے ۔ آن کی ایک تازہ غزل کے چند شعر دیکھئے :-

کوئی یہ کہہ دے گلشن گلشن لاکھ بلائیں ایک نشیمن
کامل رہبر، قاتل رہزن دل سا دوست نہ دل سا دشمن
عشق ہے پیارے کھیل نہیں ہے عشق ہے کار شیشۂ و آہن
خیر مزاج حسن کی یا رب تیز بہت ہے دل کی دھڑکن
آج نہ جانے راز یہ کیا ہے ہجر کی رات اور اتنی روشن

قطعہ

کام ادھورا اور آزادی نام بڑے اور چھوٹے درشن
شمع ہے لیکن دھندلی دھندلی سایۂ ہے لیکن روشن روشن

صرف ان چند اشعار سے ہی پتہ چل سکتا ہے کہ اب جگر کو صنف غزل پر کس درجہ عبور حاصل ہو چکا ہے ۔ اور وہ اس صنف کے حدود میں حسن و عشق کے

نغموں کے ساتھ ساتھ سیاسی و سماجی تاثرات کو کیسے دل نشیں انداز میں سمونے پر قادر ہو چکے ہیں ۔

انتخاب کلام

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا — دل کچھ اس صورت سے تڑپا ان کو پیار آ ہی گیا
ہائے یہ حسن تصور کا فریب رنگ و بو — میں یہ سمجھا جیسے وہ جان بہار آ ہی گیا
اس طرح خوش ہوں کسی کے وعدۂ فردا پہ میں — فی الحقیقت جیسے مجھ کو اعتبار آ ہی گیا
جان ہی دیدی جگر نے آج پائے یار پر — عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

ہر جنت نگاہ پہ مائل بنا دیا — میرا ہی مجھ کو مد مقابل بنا دیا
دکھلا کے ایک جلوہ سراپائے حسن کا — آنکھوں کو اعتبار کے قابل بنا دیا

اب نظر کو بھی نہیں دم بھر قرار — اس نے بھی انداز دل پیدا کیا

اثر ہے جس میں کہ ہر موج کار فرما کا — وہ ایک قطرہ ہے حاصل تمام دریا کا

عشق کیا چیز ہے ؟ اک حشر درآغوش خیال
حسن کیا ؟ خواب ہے اک چشم تماشائی کا

ایسا کہاں بہار میں رنگینوں کا جوش — شامل کسی کا خون تمنا ضرور تھا

کیا اسی کو کہتے ہیں ربط و ضبطِ حسن و عشق
شوق نارسا اپنا ، ناز کامیاب اُن کا
عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ سکت نہیں رہتی
ورنہ چیز ہی کیا ہے گوشۂ نقاب اُن کا
عرض غم نہ کر اے دل ، دیکھ ہم نہ کہتے تھے
رہ گئے وہ ''اُنھ'' کر کے سن لیا جواب اُن کا
تو جگر جو رسوا ہے ، تو ہی آہ رسوا رہ
نام تو نہ کر رسوا خانماں خراب اُن کا

هجوم تجلی سے معمور ہو کر — نظر رہ گئی شعلۂ طور ہو کر
مجھی میں رہے مجھ سے مستور ہو کر — بہت پاس نکلے بہت دور ہو کر
ترے حسن مغرور سے نسبتیں ہیں — کہیں ہم نہ رہ جائیں مغرور ہو کر

اب اُنکا کیا بھروسہ وہ آئیں یا نہ آئیں
آ ' اے غم محبت تجھ کو گلے لگائیں
اس سے بھی شوخ تر ہیں اُس شوخ کی ادائیں
کر جائیں کام اپنا ' لیکن نظر نہ آئیں
اُس حسن برق وش کے دل سوختہ وہی ہیں
شعلوں سے بھی جو کھیلیں ' دامن کو بھی بچائیں
عاشق خراب مستی ' زاھد خراب تمکیں
وہ بھی ترے کرشمے ' یہ بھی تری ادائیں

نیاز و ناز کے جھگڑے مٹائے جاتے ہیں — ہم اُن میں اور وہ ہم میں سمائے جاتے ہیں
یہ ناز حسن تو دیکھو کہ دل کو تڑپا کر — نظر ملاتے نہیں ' مسکرائے جاتے ہیں
میں اپنی آہ کے صدقے کہ میری آہ میں بھی — تری نگاہ کے انداز پائے جاتے ہیں

آ کہ تجھ بن اسطرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں
میری ہستی شوق پیہم ' میری ہستی اضطراب
کوئی منزل ہو مگر گزرا چلا جاتا ہوں میں
ایک دل ہے اور طوفان حوادث اے جگر
ایک شیشہ ہے کہ ہر پتھر سے ٹکراتا ہوں میں

اوس پڑے بہار پر ' آگ لگے کنار میں — تم جو نہیں کنار میں خاک نہیں بہار میں
اور تو کچھ کمی نہیں آپ کے اقتدار میں — آپ مجھے بھلا سکیں یہ نہیں اختیار میں
غیرت دل بجا سہی ' غیرت عشق کیا ہوئی — ہائے وہ کیف شبنمی دیدۂ اشکبار میں

میکشو ! مژدہ کہ باقی نہ رہی قید مکاں — آج اک موج بہا لے گئی مے خانے کو
غیر از دوست نہ تھا ہستئی عاشق کا وجود — کم نگاہی نے دیا طول اس افسانے کو

کوئی گناہ نہیں شوق دید و ذوق نظر
مگر جو فرصت نظارگی کو طُول نہ ہو

تری چشم مست کو کیا کہوں کہ نظر نظر ہے فسوں فسوں
یہ تمام ہوش ، یہ سب جنوں ، اسی ایک گردش جام سے
یہ کتاب دل کی ہیں آیتیں ، میں بتاؤں کیا جو ہیں نسبتیں
مرے سجدہ ہائے دوام کو ، ترے نقش ہائے خرام سے
وہیں چشم حور پھڑک گئی ، ابھی پی نہ تھی کہ بہک گئی
کبھی یک بہ یک جو چھلک گئی کسی رند مست کے جام سے

حال بھی ، ماورائے حال بھی ہے　　عشق ممکن بھی ہے محال بھی ہے
دل کے ہر اضطراب نازک میں　　شان بے تابئی جمال بھی ہے
حسن کے ہر جمال میں پنہاں　　میری رعنائی خیال بھی ہے

یہ کیا مجال کہ ہم ترک التجا کرتے　　دھن کو سی بھی جو لیتے نظر کو کیا کرتے

یہ کیا کیا کہ عطا کر کے عشق لا محدود　　مجھے حریف مقابل بنا دیا تو نے
جمال حسن کی ہلکی سی لہر دوڑا کر　　نفس نفس کو مرے جگمگا دیا تو نے
خوشا وہ درد محبت ، زہے وہ دل کہ جسے　　ذرا سکون ہوا گدگدا دیا تو نے
ہزار دل کو مٹا کر دیا مجھے اک درد　　اس ایک درد کو پھر دل بنا دیا تو نے

تم مجھ سے چھوٹ کر رہے سب کی نگاہ میں
میں تم سے چھوٹ کر کسی قابل نہیں رہا
دل کو نہ چھیڑ اے غم فرقت کہ اب یہ دل
تیرے بھی التفات کے قابل نہیں رہا
اُٹھے ہیں تیری راہ میں جب سے میرے قدم
احساس قرب و دوریٔ منزل نہیں رہا

ہزاروں قربتوں پر یوں مرا مہجور ہو جانا
جہاں سے چاہنا اُن کا وہیں سے دور ہو جانا

نقاب روئے نادیدہ کا از خود دور ہو جانا
مبارک اپنے ہاتھوں حسن کو مجبور ہو جانا

سراپا دید ہو کر غرق موج نور ہو جانا
ترا ملنا ہے خود ہستی سے اپنی دور ہو جانا

نہ دکھلائے خدا، اے دیدۂ تر دل کی بربادی
جب ایسا وقت آئے پہلے تو بے نور ہو جانا

جو کل تک لغزشِ پائے طلب پر مسکراتے تھے
وہ دیکھیں آج ہر نقش قدم کا طور ہو جانا

محبت کیا ہے؟ تاثیر محبت کس کو کہتے ہیں؟
ترا مجبور کر دینا، مرا مجبور ہو جانا

محبت عین مجبوری سہی لیکن یہ کیا باعث
مجھے باور نہیں آتا مرا مجبور ہو جانا

نگاہ ناز کو تکلیف جنبش تاکجا آخر
مجھی پر منحصر کر دو مرا مجبور ہو جانا

جگر وہ حسن یک سوئی کا منظر یاد ہے اب تک
نگاہوں کا سمٹنا اور ہجوم نور ہو جانا

ہم نہ مرتے ترے تغافل سے — پرسش بے حجاب نے مارا
چھپتے ہیں اور چھپا نہیں جاتا — اس ادائے حجاب نے مارا
ہائے وہ اک اشارۂ نازک — دم نہ پھر اضطراب نے مارا

دل کہ تھا جان زیست آہ جگر
اسی خانہ خراب نے مارا

میرا جو حال ہو سو ہو، برق نظر گرائے جا
میں یوں ہی نالہ کش رہوں تو یونہی مسکرائے جا

دل کے ہر ایک گوشہ میں آگ سی اک لگائے جا
مطرب آتشیں نوا! ہاں اسی دُھن میں گائے جا

لحظہ بہ لحظہ، دم بدم، جلوہ بہ جلوہ آئے جا

تشنۂ حسنِ ذات ہوں ، تشنہ لبی بڑھائے جا
جتنی بھی آج پی سکوں ، عذر نہ کر پلائے جا
مست نظر کا واسطہ مست نظر بنائے جا
لطف سے ہو کہ قہر سے ، ہوگا کبھی تو روبرو
اُس کا جہاں پتا چلے ، شور وہیں مچائے جا
عشق کو مطمئن نہ رکھ حسن کے اعتماد پر
وہ تجھے آزما چکا ، تو اُسے آزمائے جا

شکستِ توبہ

ساقی کی ہر نگاہ پہ بل کھا کے پی گیا
لہروں سے کھیلتا ہوا لہرا کے پی گیا
سرمستیِ ازل جو مجھے یاد آ گئی
دنیائے اعتبار کو ٹھکرا کے پی گیا
آزردگیِ خاطرِ ساقی کو دیکھ کر
مجھ کو یہ شرم آئی کہ شرما کے پی گیا
اے رحمتِ تمام مری ہر خطا معاف
میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا
پیتا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال
در پردہ چشمِ یار کی شہ پا کے پی گیا
اس جانِ میکدہ کی قسم بارہا "جگر"
کل عالمِ بسیط پہ میں چھا کے پی گیا

وہی ہے عشق ، وہی حسن ہے ، وہی سب کچھ
مگر ، کسی سے کسی کا جواب ہو نہ سکا
اُمید ہے تری رحمت اسے بھی دھو ڈالے
وہ اک گناہ جو غرقِ شراب ہو نہ سکا

تصویر و تصوّر

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں
وہی قیامت ہے قد بالا ، وہی ہے صورت وہی سراپا
لبوں کو جنبش ، نگہ کو رزش کھڑے ہیں اور مسکرا رہے ہیں

خرام رنگیں نظام رنگیں پیام رنگیں کلام رنگیں
قدم قدم پر، روش روش پر نئے نئے گل کھلا رہے ہیں
تمام رعنائیوں کے منظر تمام رنگینوں کے مظہر
سنبھل سنبھل کر، سمٹ سمٹ کر سب ایک مرکز پہ آ رہے ہیں
بہار رنگ و شباب ہی کیا ستارۂ ماہتاب ہی کیا
تمام ہستی جھکی ہوئی ہے جدھر وہ نظریں جھکا رہے ہیں
شراب آنکھوں سے ڈھل رہی ہے نظر سے مستی ابل رہی ہے
چھلک رہی ہے ابل رہی ہے پئے ہوئے ہیں پلا رہے ہیں
وہ روئے رنگیں وہ موجۂ یم کہ جیسے دامان گل پہ شبنم
یہ گرمئی حسن کا ہے عالم عرق عرق ہیں نہا رہے ہیں
یہ موج دریا، یہ ریگ صحرا یہ غنچہ و گل یہ ماہ و انجم
ذرا جو وہ مسکرا دئیے ہیں یہ سب کے سب مسکرا رہے ہیں
ذرا جو دم بھر کو آنکھ جھپکی یہ دیکھتا ہوں نئی تجلّی
طلسم صورت مٹا رہے ہیں جمال معنی بنا رہے ہیں
خوشی سے لبریز شش جہت ہے زبان پر سوزِ تہنیت ہے
یہ وقت وہ ہے ''جگر'' کے دل کو وہ اپنے دل سے ملا رہے ہیں

تری خوشی سے اگر غم میں بھی خوشی نہ ہوئی
وہ زندگی تو محبت کی زندگی نہ ہوئی
کوئی بڑھے نہ بڑھے ہم تو جان دیتے ہیں
پھر ایسی چشم توجہ ہوئی ہوئی نہ ہوئی
فسردہ خاطرئ عشق اے معاذ اللہ
خیال یار سے بھی کچھ شگفتگی نہ ہوئی
تری نگاہ کرم کو بھی آزما دیکھا
اذیتوں میں نہ ہوتی تھی کچھ کمی نہ ہوئی
صبا یہ ان سے ہمارا پیام کہہ دینا
گئے ہو جب سے، یہاں صبح و شام ہی نہ ہوئی
ادھر سے بھی ہے سوا کچھ ادھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی ان سے آہ بھی نہ ہوئی
خیال یار سلامت تجھے خدا رکھے

ترے بغیر کبھی گھر میں روشنی نہ ہوئی
گئے تھے ہم بھی جگر جلوہ گاہ جاناں میں
وہ پوچھتے ہی رہے ہم سے بات بھی نہ ہوئی

مجھے ہلاک فریب مجاز رہنے دے — نہ چھیڑ او نگہ امتیاز رہنے دے
میں راز عشق کو بیگانۂ جہاں رکھوں — مگر جو مصلحت حسن راز رہنے دے
یہ بات کیا کہ حقیقت وہی مجاز وہی — مجاز ہے تو پھر اسکو مجاز رہنے دے
یہ خانقاہ نہیں پی بھی جا تو اے زاہد ! — یہ میکدہ ہے یہاں احتراز رہنے دے
گزرتی ہے جو دل عشق پر نہ پوچھ جگر — یہ خاص راز محبت ہے راز رہنے دے

اس نے شانوں پہ زلف برہم کی — خیر یا رب نظام عالم کی
یوں تو پیاسے ہیں سبزۂ و گل بھی — کس نے دیکھی ہے پیاس شبنم کی
آئی تھی آج بھی نسیم سحر — آگ بھڑکا گئی جہنم کی
اللہ اللہ ہستئی شاعر — قلب غنچے کا آنکھ شبنم کی

کسی صورت نمود سوز پنہانی نہیں جاتی
بجھا جاتا ہے دل چہرے کی تابانی نہیں جاتی
صداقت ہو تو دل سینے سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ
حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی
جلے جاتے ہیں بڑھ بڑھ کر مٹے جاتے ہیں گر گر کر
حضور شمع پروانوں کی نادانی نہیں جاتی
وہ یوں دل سے گذرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی
محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی
جگر وہ بھی ز سر تا پا محبت ہی محبت ہیں
مگر ان کی محبت صاف پہچانی نہیں جاتی

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے   گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے
ہائے وہ کیونکر جی بہلائے   غم بھی جس کو راس نہ آئے
جھوٹی ہے ہر ایک مسرت   روح اگر تسکین نہ پائے
حسن وہی ہے حسن جو ظالم   ہاتھ لگائے ہاتھ نہ آئے
ضبط محبت ، شرط محبت   جی ہے کہ ظالم امڈا آئے
نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو   روح سنے اور روح سنائے
راہ طلب آسان ہوئی ہے   زلف و مژہ کے سائے سائے

تیرا تصور شب ہمہ شب   خلوت غم بھی بزم طرب
دعوئ شوق اور شکوہ بلب   شرم دلِ آرام طلب
باتیں ہیں دو مقصود ہے ایک   تیری طلب یا اپنی طلب
آ ہی گیا اک مست شباب   شیشہ بدست و نغمہ بلب
بیت گئی ، جو دل پہ نہ پوچھ   ہجر کی شب اور آخر شب
حسن مکمل جذب و گریز   عشق مسلسل ترک و طلب
ترک طلب اور اطمینان   دیکھ تو میرا حسنِ طلب

یہ دن بہار کے اب کے بھی راس آ نہ سکے
کہ غنچے کھِل تو سکے ، کھل کے مسکرا نہ سکے

یہ آدمی ہے وہ پروانہ شمع دانش کا
جو روشنی میں رہے ، روشنی کو پا نہ سکے

نہ جانے آہ ! کہ ان آنسوؤں پہ کیا گزری
جو دل سے آنکھ تک آئے مژہ تک آ نہ سکے

کریں گے مر کے بقائے دوام کیا حاصل
جو زندہ رہ کے مقامِ حیات پا نہ سکے

مری نظر سے گریزاں بہت رہے لیکن
مرے خلوص محبت سے بچ کے جا نہ سکے

یہ مہر و ماہ مرے ہم سفر رہے برسوں
پھر اس کے بعد میری گرد کو بھی پا نہ سکے

سراپا حقیقت ، مجسم فسانہ
محبت کا عالم ، جنوں کا زمانہ

وہ پہلے پہل دونوں جانب بہ عالم
ادا بے تعلق ، نظر محرمانہ

نظر اٹھتے اٹھتے ، نظر ملتے ملتے
دھڑکتے دلوں کا وہ نازک فسانہ

طبیعت شگفتہ ، مگر کھوئی کھوئی
ہر انداز دلکش ، مگر والہانہ

وہ شعر و ترنم کا پرکیف موسم
وہ اشک و تبسّم کا رنگیں فسانہ

غرور تجمل ، مگر زخم خوردہ
شکستِ محبت ، مگر فاتحانہ

یہ ترا جمال کامل ، یہ شباب کا زمانہ
دل دشمناں سلامت ، دل دوستاں نشانہ

مجھے عشق کی صداقت پہ بھی شک سا ہو چلا ہے
مرے دل سے کہہ گئی ہے ، وہ نگاہ ناقدانہ

مری زندگی تو گذری ترے ہجر کے سہارے
مری موت کو پیارے کوئی چاہئے بہانہ

میں وہ صاف ہی نہ کہدوں جو ہے فرق تجھ میں مجھ میں
ترا درد ، درد تنہا ، مرا غم ، غم زمانہ

مرے دل کے ٹوٹنے پر ہے کسی کو ناز کیا کیا ؟
مجھے اے ''جگر'' مبارک ، یہ شکست فاتحانہ

جوش ملیح آبادی

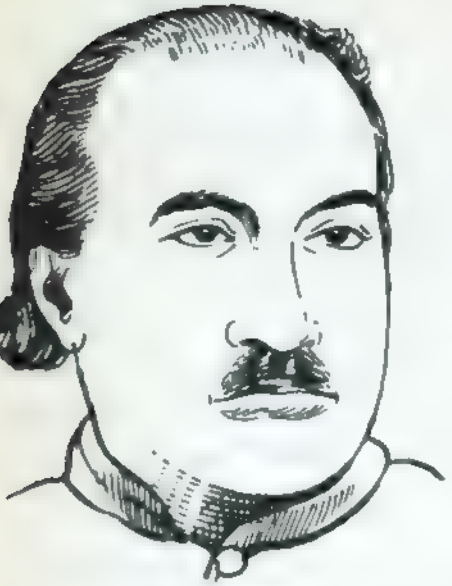

شبیر حسن خاں نام جوش تخلص "شاعر انقلاب" خطاب ، ملیح آباد (اودھ) کے رہنے والے قصبہ "کنو ہار" میں ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ بزرگ کابل سے ہندوستان آئے تھے۔ اُن کے والد بشیر احمد خاں بشیر اور دادا نواب محمد احمد خاں احمد دونوں صاحب دیوان شاعر تھے۔ جوش کے پردادا نواب حسام‌الدولہ تہور جنگ فقیر محمد خاں گویا (شاگرد ناسخ) کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جوش نے شعری فضا میں آنکھ کھولی اور شاعری کی گود میں پلے بڑھے۔ ایسی صورت میں اُن کا نو سال کی عمر میں شعر گوئی اختیار کر لینا کوئی عجیب بات نہ تھی۔ ابتداً چار سال تک جناب عزیز لکھنوی سے تلمذ رہا۔ پھر اُستاد موصوف کی اُستادی کا میدان اپنی جولانیٔ طبع کے لئے تنگ محسوس کرتے ہوئے اپنے ذاتی ذوق و وجدان کی رہبری ہی کو کافی سمجھا۔

تعلیمی اعتبار سے جوش نے شروع میں گھر پر اردو فارسی کی درسی کتابیں پڑھیں پھر انگریزی کے لئے سیتاپور اسکول ، جوبلی اسکول لکھنؤ ، سینٹ پیٹرز کالج آگرہ اور علیگڑھ کالج میں داخل ہوئے اور پڑھتے رہے مگر اپنی لا اُبالی طبیعت اور کچھ گھریلو مصروفیات کے باعث تکمیل تعلیم نہ کر سکے۔ ۱۹۲۴ء میں جوش سرکار نظام میں دارالترجمہ سے متعلق ہو گئے اور ۱۹۳۴ء میں ناظر ادب کے عہدے سے علیحدہ ہوئے۔ کچھ عرصہ دلی سے اپنا ایک ادبی رسالہ "کلیم" نکالتے رہے۔ آجکل ہندوستان کے معروف سرکاری رسالہ "آجکل" کے مدیر اعلیٰ کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

جوش عصر حاضر کے اُن شعرا میں سے ہیں جو نظم و غزل دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ اور بقول آل احمد سرور صاحب "اقبال کے بعد شاید یہی غزل کو نظم کا تسلسل اور کائناتی لباس اور نظم کو غزل کی رنگینی اور شیرینی بخشنے میں کامیاب ہوئے ہیں" اُن کی غزل میں صفائی ، روانی اور سلاست کے ساتھ ایک طرح کی بلند آہنگی و مردانگی پائی جاتی ہے۔ عشق و رندی اُن کی غزل کا خاص موضوع ہے شاید اسی لئے وہ خود کو ہمتائے "حافظ شیراز" کہتے ہیں۔

آ رہی ہے صدائے ہاتف غیب   جوش ، ہمتائے حافظ شیراز

اُن کی ترکیبوں میں بندش کی چستی و دل کشی ہے اور وہ صوفیانہ مضامین اور معرفت کے رموز بھی نہایت سادگی سے نظم کرتے ہیں مگر اُن کے رنگ میں اپنے ہم عصر جگر کی رنگینی و سرمستی نسبتاً کم ہے ـ اور حق تو یہ ہے کہ غزل کی شیرینی' نرمی اور گداختگی اُن کے بس کی نہیں ـ

جوش کی فطرت صحیح معنوں میں نظم کے لئے موزوں ہے چنانچہ نظم میں اُن کا رتبہ غزلگوئی کے مقابلہ میں یقیناً بہت بلند ہے ـ اُنکی نظموں میں جوش' سادگی اور صداقت بدرجۂ احسن موجود ہے ـ اُنکی تشبیہات میں ایک طرح کی ندرت پائی جاتی ہے ـ نظموں میں اُنہوں نے بہت سے انقلابی مضامین سموئے ہیں ـ اس لئے لوگ اُنہیں اکثر '' شاعر انقلاب '' کے نام سے یاد کرتے ہیں ـ اور اس دور میں ہماری شاعری کے سیاسی رجحان میں شدت و وسعت پیدا کرنے کے ذمہ دار بڑی حد تک جوش ہی ہیں ـ اُنہوں نے مزدور و کسان وغیرہ کے متعلق اس شد و مد کے جذبات نظم کئے ہیں کہ شاعری کو حق خدمت گذاری سے سبکدوش کر دیا ـ جوش کی منظومات کی ایک اور خصوصیت اُنکی منظر نگاری ہے اور اس اعتبار سے وہ اُردو کے تمام شعرا میں امتیازی شان رکھتے ہیں ـ

جوش کو رباعیات سے بھی خاصا شغف ہے اس صنف سخن میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے بلکہ اُسکے موضوعات میں بڑی رنگا رنگی ' وسعت اور تنوع پیدا کر دیا ہے ـ حقائق و معارف ' حسن و عشق ' خمریات ' طنزیات غرضکہ کیا نہیں ہے جو اس مختصر صنف شعر میں اُنہوں نے نہیں سمویا ہے ـ چنانچہ جوش کی محض رباعیات کا ایک مجموعہ '' فن و حکمت '' کے نام سے شائع ہو چکا ہے ـ

کلام جوش کے انتخابات جو وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ہیں حسب ذیل ہیں ـ جوش کی شاعری کا سب سے پہلا مجموعہ '' روح ادب '' کے نام سے ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا ـ جو دراصل اُن کے بالکل ابتدائی کلام کا انتخاب تھا جس میں جوش کا انداز بالکل تقلیدی تھا اور اشعار میں تصوف کی جھلک بھی زیادہ تھی ـ اُسکے بعد نقش و نگار ' شعلہ و شبنم فکر و نشاط ' حرف و حکایت' جنون و حکمت' سیف و سبو اور آیات و نغمات مختلف اوقات میں شائع ہوئے اور جوش کی مقبولیت کا اندازہ صرف اسی ایک بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ان میں سے سوائے '' روح ادب '' کے جسکی دوبارہ اشاعت شاید خود جوش کو منظور نہ تھی باقی تمام انتخابات کے اب تک کئی کئی ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں ـ

جوش کی منظومات کے سلسلے میں ایک بات اور کہنا باقی ہے اور وہ ہے اُنکا '' شبابیات '' کا موضوع ـ جوش کیلئے یہ موضوع سچ مچ مخصوص سمجھنا چاہئے کیونکہ اس مبحث پر وہ اپنے حقیقی رنگ و مذاق میں پوری طرح نمایاں ہوتے ہیں ـ لیکن اس خصوصیت کے باعث بعض ناظرین نے اُنہیں '' لذت پرست '' کے نام سے بھی یاد کیا ہے ـ

بحیثیت مجموعی جوش عصر حاضر کے صاحب طرز اور کامیاب شعرا میں ہیں اور اُنہیں جیسی مقبولیت اب حاصل ہو چکی ہے اچھے اچھے شعرا کو اپنی زندگی میں نصیب نہیں ہو سکی ـ

انتخاب کلام

تغزل

محفل عشق میں وہ نازش دوراں آیا
اے خدا خواب سے بیدار کہ سلطاں آیا
اے کلی ناز سے کھل، بادۂ سر جوش اُبل
کہ نگار چمن و شاہد مستاں آیا
خاطر جمع سے ہشیار کہ برہم ہوئی زلف
کشش دل سے خبردار کہ طوفاں آیا
کج کلاہی کا سرو برگ مبارک اے جوش
لے، پیام شکن طرۂ جاناں آیا

سوز غم دے کے مجھے اُس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکش دھر سے آزاد کیا
وہ کریں بھی تو کن الفاظ میں تیرا شکوہ
جن کو تیری نگہ لطف نے برباد کیا
اتنا مانوس ہوں فطرت سے کلی جب چٹکی
جھک کے میں نے یہ کہا، مجھ سے کچھ ارشاد کیا
مجھ کو تو ہوش نہیں، تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا

قدم انساں کا راہ دھر میں تھرّا ہی جاتا ہے
چلے کتنا ہی کوئی بچ کے، ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے
نظر ہو خواہ کتنی ہی حقائق آشنا پھر بھی
ہجوم کشمکش میں آدمی گھبرا ہی جاتا ہے
خلاف مصلحت میں بھی سمجھتا ہوں مگر ناصح!
وہ آتے ہیں تو چہرے پر تغیّر آ ہی جاتا ہے
سمجھتی ہیں مآل گل، مگر کیا زور فطرت ہے
سحر ہوتے ہی کلیوں کو تبسم آ ہی جاتا ہے

جہنم سرد ہے جنّت کے در کھلوائے جاتے ہیں
سرِ محشر پجاری حسن کے بلوائے جاتے ہیں
سحر کی ضو، شفق کی سرخیاں، برسات کے بادل
مجھے ہمراز پا کر یہ مناظر کھائے جاتے ہیں

نہ جانے کتنی رنگیں صحبتیں ہیں میری نظروں میں
بس اے مطرب! میری آنکھوں میں آنسو آئے جاتے ہیں
کوئی حد ہی نہیں اس احترام آدمیّت کی
بدی کرتا ہے دشمن ' اور ہم شرمائے جاتے ہیں

چشم حواس بند ہے ' مست ہوں سوز و ساز سے
ملنے چلا ہوں اسطرح حسن جنوں نواز سے

فنا ہو جا چھلک اٹھے گا سینہ نور عرفاں سے
ابھی تو دل کے آئینے پہ غافل داغ ہستی ہے

میرے حواس لے لئے ' یار کی چشم مست نے
فتح کا تاج رکھدیا سر پہ میرے شکست نے
طعنۂ خود سری دیا عشق جنوں پرست نے
راہ وفا میں کھو دیا فکر بلند و پست نے
سر پہ ترے رہیں سدا پھولوں کے تاج فصل گل!
روح کو مست کر دیا تیری ہوائے مست نے
نظم عبودیت پڑھی میں نے کچھ ایسے لحن سے
ہنس کے رباب اٹھا لیا نغمہ زنِ الست نے
جا کے نسیم جاں ستاں! کہنا یہ بزم حسن میں
بھیجا ہے تحفہ و سلام ' جوش سحر پرست نے

منظومات

البیلی صبح

نظر جھکائے عروس فطرت ' جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے
سحر کا تارا ہے زلزلے میں ' افق کی لو تھر تھرا رہی ہے

روش روش نغمۂ طرب ہے ' چمن چمن جشن رنگ و بو ہے
طیور شاخوں پہ ہیں غزلخواں کلی کلی گنگنا رہی ہے
ستارہ صبح کی رسیلی جھپکتی آنکھوں میں ہیں فسانے
نگار مہتاب کی نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہے
طیور بزم سحر کے مطرب ' لچکتی شاخوں پہ گا رہے ہیں
نسیم فردوس کی سہیلی ' گلوں کو جھولا جھلا رہی ہے
کلی پہ بیلے کی کس ادا سے پڑا ہے شبنم کا ایک موتی
نہیں یہ ہیرے کی کیل پہنے کوئی پری مسکرا رہی ہے
سحر کو مد نظر ہیں کتنی رعنائیں چشم خوں فشاں کی
ہوا بیاباں سے آنے والی ' لہو میں سرخی بڑھا رہی ہے
شلوکا پہنے ہوئے گلابی ' گلاب کی پنکھڑی چمن میں
رنگی ہوئی سرخ آوڑھنی کا ہوا میں پلّو سُکھا رہی ہے
فلک پہ اس طرح چھپ رہے ہیں ہلال کے گرد و پیش تارے
کہ جیسے کوئی نئی نویلی جبیں سے افشاں چھڑا رہی ہے
کھٹک یہ کیوں دل میں ہو چلی پھر؟ چٹکتی کلیو! ذرا ٹھہرنا
ہوائے گلشن کی نرم رو میں ' یہ کس کی آواز آ رہی ہے

گنگا کے گھاٹ پر

بڑھائے سرخیٔ عارض ہوائے صحرا سے
نہایا کون چلا آ رہا ہے گنگا سے
سرا دُلائی کا سر پر نظر جھکائے ہوئے
دبائے دانتوں میں آنچل بدن چرائے ہوئے
لبوں پہ مہر خموشی ' خموشیوں میں خطاب
کمر میں لوچ ' جبیں پر دمک نظر میں شراب
قدم قدم پہ تمنائیں دلستانی کی ..
رخ شگفتہ پہ طغیانیاں جوانی کی
شراب ناب لئے نرگسی کٹوروں میں
لہو چمن کا رواں ' نرگسی کٹوروں میں

دراز زلف میں جادو سیاہ آنکھ میں مدھ
نسیم صبح بنارس ' ھلال شام اودھ
ہوائے صبح سے روشن چراغ سیم تنی
شگفتہ ' غسل سحر سے مزاج گلبدنی
نظر نہ آئے وہ چہرے پہ چادر آبی
بیاض چشم میں گل کاریٔ شکر خوابی
خُنک نسیم سے ابھرے ہوئے نقوش شباب
صباحتیں ھیں کہ برسات کی شب مہتاب
عجیب حسن ٹپکتا ھے چشم و ابرو سے
مہک رھی ھے ہوا کمسنی کی خوشبو سے
مقابلہ جو کرے کوئی چاند ' پھیکا ھے
جبیں شوخ پہ صندل کا سرخ ٹیکا ھے
نمی ھے زلف میں اشنان کر کے نکلی ھے
یہ کس کی سوت کا سامان کر کے نکلی ھے ؟
سیاہ زلف پہ آنچل خفیف آبی ھے
برھنہ پا ھے تو ھر نقش پا گلابی ھے
مری طرف سے کوئی کاش یوں ھو گرم خطاب
کہ وقت صبح ھے اے دختر شب مہتاب
ازل کے دن سے در حسن کا بھکاری ھوں
ادھر بھی ایک نظر ' میں ترا پجاری ھوں ؟

شکست زنداں کا خواب

کیا ھند کا زنداں کانپ رھا ھے ' گونج رھی ھیں تکبیریں
اکتائے شاید کچھ قیدی اور توڑ رھے ھیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ھوئے ھیں زندانی !
سینوں میں تلاطم بجلی کا ' آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ھے ' توپوں کے دھانے ٹھنڈے ھیں
تقدیر کے لب کو جنبش ھے ' دم توڑ رھی ھیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کی سرخی ھے ' بے نور ھے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ھے ' سجدے میں پڑی ھیں تعمیریں

کیا اُن کو خبر تھی زیر و زبر رکھتے تھے جو روحِ ملّت کو
اُبلیں گے زمیں سے مارِسیہ ، برسیں گی فلک سے شمشیریں
کیا اُن کو خبر تھی سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
کیا اُن کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے ہیں
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں
سنبھلو کہ زنداں گونج اٹھا ، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اُٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں ، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

رباعیات

بیلوں میں چھلک رہی ہیں بوندیں ساقی
خوشوں سے ٹپک رہی ہیں بوندیں ساقی
دے جام کہ برگ ہائے سبز و تر پر
رہ رہ کے کھنک رہی ہیں بوندیں ساقی

اے پھول صبا ہمیشہ سہکائے تجھے
اے چاند کبھی گھٹا نہ سنولائے تجھے
اس نیند بھرے لوچ سے لِلّٰہ نہ چل
ڈرتا ہوں کہیں نظر نہ لگ جائے تجھے

غنچے ! تری زندگی پہ دل ہلتا ہے
بس ایک تبسّم کے لئے کھلتا ہے
غنچے نے کہا کہ اس چمن میں بابا
یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

افسوس تجھے پیر دغا دیتے ہیں
کب تیری عقیدت کا صِلا دیتے ہیں

منعم ! یہ تجھے نہیں لگاتے ہیں گلے
سینے سے تری جیب لگا لیتے ہیں

آلام کہن کی یاد آتی ہے مجھے
دیرینہ محن کی یاد آتی ہے مجھے
افسانہ جہنّم کے فرشتوں کا نہ چھیڑ
ارباب وطن کی یاد آتی ہے مجھے

کیا شیخ ملے گا لن ترانی کر کے
تفسیر مآل شادمانی کر کے
تو آتش دوزخ سے ڈراتا ہے انہیں
جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے

بھٹکی ہوئی نیکی

ہر شے کو مسلسل جنبش ہے راحت کا جہاں میں نام نہیں
اس عالم سعی و کاوش میں دم بھر بھی ہمیں آرام نہیں
چھائی ہے جہاں پر تشنہ لبی مفقود یہاں سیرابی ہے
ہر جسم میں اک بے چینی ہے ہر روح میں اک بے تابی ہے
اس بزم خلش کا ہر ذرہ بے چینیوں کے انبوہ میں ہے
اک رعشۂ پیہم کاہ میں ہے اک لرزش پنہاں کوہ میں ہے
لیلائے ساعت مضطر ہے عشرت کے ترانے سُن نے کو
ہر نقص کا دامن پھیلا ہے تکمیل کی کلیاں چننے کو
ہیجان ہے چشم پستی میں رفعت کا نوشتہ پڑھنے کا
اک دھُن ہے ترقی کرنے کی اک جوش ہے آگے بڑھنے کا

ہر موم کو دُھن ہے شمع بنے مضطر ہے پگھل جانے کیلئے
ہر سنگ کا سینہ جلتا ہے آتش میں بدل جانے کے لئے
انگاروں پہ شعلے لوٹتے ہیں بجلی پہ تفّوق پانے کو
چنگاریاں مرغ بسمل ہیں تاروں کی جگہ کِھل جانے کو

بے چین بگولہ رقصاں ہے آندھی پہ شرف پانے کے لئے
جو موج ہے پیچ و تاب میں ہے، دھارے سے الجھ جانے کیلئے
ہر قطرۂ دریا غلطاں ہے موتی پہ تسلّط پانے کو
ہر ذرّۂ خاکی اُڑتا ہے خورشید سے ٹکر کھانے کو
ہر دل میں غرض اک کاہش ہے امید کا ساغر بھرنے کی
ہر شے کی تڑپتی فطرت میں خواہش ہے ترقی کرنے کی
وہ چور جو شب کے پردے میں سرقے کی غرض سے آتا ہے
جو نیند کی ماتی بستی پر ظلمت کی طرح چھا جاتا ہے
اک ایسی ہی خواہش اُس کو بھی چوری کے لئے اُکساتی ہے
جس طرح کی خواہش نورانی دیوتاؤں میں پائی جاتی ہے
سارق بھی فرشتوں ہی کی طرح تسکین و طرب کا جویا ہے
ہر چند کہ اُس نے قسمت سے تسکین کا رشتہ کھویا ہے
رہبر ہو کہ رہزن دونوں میں تسکین کی خواہش یکساں ہے
ہر چند وہ سیدھی راہ پہ ہے یہ راہ بھٹک کر حیراں ہے
عارف نے یہ سمجھا آسائش اشکوں کو گرا کے ملتی ہے
قاتل نے یہ سمجھا انساں کا وہ خون بہا کر ملتی ہے
صوفی نے یہ سمجھا وہ دل کے پیمانے میں مل جائے گی
مے کش کی سمجھ میں یہ آیا میخانے میں مل جائے گی
پس ذوق طرب میں جو انساں رہتا ہے سدا میخانوں میں
ہے اصل میں وہ بھی دنیا کے معصوم ترین انسانوں میں
جال اس پہ نہ ڈال اے صید افگن یہ بام حرم کا طائر ہے
آیا ہے بھٹک کر دیر میں جو گمراہ نہیں ہے زائر ہے
جتنے بھی زمیں پر مجرم ہیں خواہش ہی کے زیر فرماں ہیں
ہر جرم سیہ کے محضر پر خواہش ہی کی مہریں تاباں ہیں
المختصر ان تشریحوں سے ہم پر یہ حقیقت کُھلتی ہے
کہتے ہیں جسے دنیا میں بدی بھٹکی ہوئی وہ اک نیکی ہے

باغی انسان

حکمراں آج بھی ہے پیر مغاں کیا کہنا
وہی دفتر ہے وہی مُہر و نشاں کیا کہنا

عقل کی تند ہوائیں ہیں خروشاں کب سے
پھر بھی ہے شمع جنوں شعلہ فشاں کیا کہنا
کب سے تقویٰ ہے مزامیر و ترنم کے خلاف
آج بھی نغمہ ہے آشوب جہاں کیا کہنا
کب سے خورشید کی حدّت میں ہے فرمان سکوت
پھر بھی جنبش میں ہے ذرّوں کی زباں کیا کہنا
ذرے ذرے پہ جہنم کی لگی ہیں مہریں
پھر بھی دنیا پہ ہے جنت کا گماں کیا کہنا
کب سے ادیان کی خشکی میں ہے تبلیغ سراب
وہی رونق ہے سر آب رواں کیا کہنا
عقل کے دور میں بھی عشق نہیں ہے خاموش
وہی نالے ہیں وہی شور فغاں کیا کہنا
کب سے ہے ذوق نظر حسن شریعت سے حرام
وہی نظریں ہیں وہی حسن جواں کیا کہنا
آج بھی جلوۂ رنگیں کی طلبگاری میں
چشم انساں ہے ہر سو نگراں کیا کہنا
ہاں بہ ایں شدتِ آیات و احادیث حجاب
دست خوباں میں ہے شوخی کی عناں کیا کہنا
شبنم و برف کے اس حلقۂ غم ناک میں بھی
اٹھ رہا ہے دل انساں سے دھواں کیا کہنا
تُرش ہیں منبر و محراب کے لہجے کب سے
پھر بھی سرشار ہیں رندان جہاں کیا کہنا
کب سے قرنوں کا ہے شانوں پہ اٹھائے ہوئے بار
پھر بھی رقصاں ہے جہان گزراں کیا کہنا
سینۂ دہر ہے گو تیر حوادث سے فگار
پھر بھی ابرو کی لچکتی ہے کماں کیا کہنا

کب سے ہے نطق رسالت پہ رواں ھجوِ شراب
وھی ھلچل ہے سر کوئے مغاں کیا کہنا
للہ الحمد کہ خود حکمِ خدا کے با وصف
ہے وھی گرمئی بازار بتاں کیا کہنا
آفریں باد کہ اس جبر مشیّت پہ بھی ہے
دست انساں میں بغاوت کی عناں کیا کہنا

حسن اور مزدوری

ایک دوشیزہ سڑک پر دھوپ میں ہے بے قرار
چوڑیاں بجتی ھیں کنکر کوٹنے میں بار بار
چوڑیوں کے ساز میں یہ شور ہے کیسا بھرا
آنکھ میں آنسو بنی جاتی ہے جس کی ھر صدا
گرد ہے رخسار پر زلفیں اٹی ھیں خاک میں
نازکی بل کھا رھی ہے دیدۂ غم ناک میں
ھو رھا ہے جذب مہر خوں چکاں کے رُو برو
کنکروں کی نبض میں اُٹھتی جوانی کا لہو
دھوپ میں لہرا رھی ہے کاکل عنبر سرشت
ھو رھا ہے کم سنی کا لوچ جزو سنگ و خشت
پی رھی ھیں سرخ کرنیں مہر آتش بار کی
نرگسی آنکھوں کا رس ' سے چنپئی رخسار کی
غم کے بادل خاطر نازک پہ ھیں چھائے ہوئے
عارض رنگیں ھیں یا دو پھول مرجھائے ہوئے
چیتھڑوں میں دیدنی ہے روئے رنگینِ شباب
ابر کے آوارہ ٹکڑوں میں ھو جیسے ماھتاب
اُف یہ ناداری مرے سینے سے اُٹھتا ہے دھواں
آہ اے افلاس کے مارے ہوئے ھندوستاں
حسن ھو مجبور کنکر توڑنے کے واسطے
دست نازک اور پتھر توڑنے کے واسطے
فکر سے جھک جائے وہ گردن تف اے لیل و نہار
جس میں ھونا چاھئے پھولوں کا اک ھلکا سا ھار

آسماں جان طرب کو وقف رنجوری کرے
صنف نازک بھوک سے تنگ آ کے مزدوری کرے

بھیک میں وہ ہاتھ اٹھیں التجا کے واسطے
جن کو قدرت نے بنایا ہو حنا کے واسطے

نازکی سے جو اٹھا سکتی نہ ہو کاجل کا بار
ان سبک پلکوں پہ بیٹھے راہ کا بوجھل غبار

کیوں فلک مجبور ہوں آنسو بہانے کے لئے
انکھڑیاں ہوں جو دلوں میں ڈوب جانے کے لئے

مفلسی چھانٹے اسے قہر و غضب کے واسطے
جس کا مکھڑا ہو شبستان طرب کے واسطے

فرط خشکی سے وہ لب ترسیں تکلّم کے لئے
جن کو قدرت نے تراشا ہو تبسّم کے لئے

دست نازک کو رسن سے اب چھڑانا چاہیئے
اس کلائی میں تو کنگن جگمگانا چاہیئے

حفیظ جالندھری

محمد حفیظ ، نام ، حفیظ تخلص ، ابوالاثر کنیت ۱۹۰۰ء میں پنجاب کے قدیم شہر جالندھر میں پیدا ہوئے ۔ آن کا خاندان چوھان، سورج بنسی راجپوت خاندان کی ایک شاخ ہے جو تقریباً دو سو سال قبل مسلمان ہو گیا تھا ۔ حفیظ کی ابتدائی تعلیم جالندھر میں ہوئی ، حفیظ دور جدید کے آن معدودے چند شعرا میں سے ھیں جنھوں نے اپنی شخصیت ، شاعرانہ مقام اور شہرت ، خاندانی امارت و وجاہت سے نہیں بلکہ محض اپنی کوشش و کاوش اور محنت و جانفشانی کی بدولت حاصل کی ہے ۔ آنھیں شروع ھی سے علمی و ادبی مشاغل سے دلچسپی تھی چنانچہ آنھوں نے لاھور میں ''ھونھار بکڈپو'' قائم کیا اور ادبی کتب کی طباعت و اشاعت میں مصروف رہے ۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں وہ دھلی میں سانگ پبلسیٹی آرگنائزیشن (Song Publicity Organisation) کے ڈائرکٹر جنرل مقرر ہوئے اور کافی عرصہ تک یہ خدمت انجام دیتے رہے ۔ تقسیم ھند کے بعد حکومت پاکستان نے آزاد کشمیر میں آنکی خدمات حاصل کیں اور کئی سال تک حفیظ پبلسیٹی کے کام کی نگرانی کرتے رہے ۔ لیکن ان تمام مصروفیات اور اپنے عہدے کی ذمہ داریوں کے باوجود آنکی ادبی دلچسپیوں میں کوئی فرق نہیں آیا ۔

حفیظ کو شعر و شاعری کا ذوق بچپن ھی سے تھا ۔ وہ مولانا غلام قادر گرامی کے شاگرد ھیں ۔ جنکی رھنمائی اور فیضان صحبت نے حفیظ کو غزل سرائی سکھائی اور شعری صنعت گری پر عبور عطا کیا ۔ لیکن جہاں تک طرز فکر کا تعلق ہے حفیظ اقبال سے بہت متاثر ہوئے ۔ جسکے ثبوت میں آنکی بعض نظمیں ''زندگی'' یا ''آزاد وادی'' اور غزلیں پیش کی جا سکتی ھیں جو بالکل اقبال کے انداز میں کہی گئی ھیں ۔

در حقیقت حفیظ شعرا کے اس دبستان سے تعلق رکھتے ھیں جن کا ارتقا عظمت اللہ خاں کے نقطۂ خیال کی اشاعت کے بعد ھوا اور جسکی بڑی خصوصیت ھندی بحروں کو آردو میں رائج کرنا اور شعر میں الفاظ کی نشست اور ترکیبوں سے ترنم و حسن خیال پیدا کرنا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ حفیظ کے یہاں ھندی کے نرم و شیریں الفاظ ، بول چال کی زبان ، لمبی لمبی بحروں اور موسیقیت کی بہتات ہے ۔ آنکی غزلوں میں نہ نئے مضامین ھیں نہ نئے اسالیب ، مگر سادگی و دلکشی ضرور نئی ہے ۔ حفیظ شروع شروع میں اپنے گیتوں

کی وجہ سے مشہور ہوئے جن میں آرزو اور اختر کا سا سریلا پن پایا جاتا ہے ۔ پھر ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ ''نغمہ زار'' ۱۹۲۵ء میں چھپا جسکی نظموں میں خیال کی رعنائی جذبات کی فراوانی اور ترنم ریزی نے نئی پود کو بہت متاثر کیا ۔ حفیظ کی اس دور کی منظومات میں نئی طرز کی بعض پسندیدہ جدتوں کے ساتھ ساتھ پرتاثیر نغمگی پائی جاتی ہے ۔ مثال کے طور پر انکی ایک نظم کا یہ اقتباس دیکھئیے ۔

اٹھی حسینۂ سحر پہن کے سر پہ تاج زر
لباسِ نور زیب بر
چڑھی فراز کوہ پر
وہ خندۂ نگاہ سے پہاڑ طور بن گئے
وہ عکس جلوہ گاہ سے سحاب نور بن گئے
نوائے جوئے بار اٹھی
صدائے آبشار اٹھی
ہواؤں کے رباب اٹھے خوش آمدید کے لئے
اٹھی حسینہ سحر پہن کے سر پہ تاج زر

''نغمہ زار'' کے بعد حفیظ کے دو اور مجموعے ''سوز و ساز'' اور ''تلخابہ شیریں'' شایع ہوئے ۔ جن میں ایسی ہی چھوٹی چھوٹی بحروں میں حفیظ نے انسانی جذبات اور درد دل کی دھنوں اور گیتوں کو سانچے میں ڈھالا ہے ۔ مگر حفیظ کا شاھکار ان کی طویل نظم ''شاھنامہ اسلام'' ہے ۔ جو تین جلدوں میں مرتب ہوئی ہے ۔ حفیظ نے اپنی اس نظم میں اسلامی تاریخ مدون کر کے اسلامی شائستگی کا احیا بھی کیا ہے اور اردو شاعری کی تاریخ میں ایک نیا تجربہ بھی ۔ اس میں شک نہیں کہ حفیظ اختصار کے پیش نظر بعض تفصیلات اس نظم میں پیش نہیں کر سکے اور انہوں نے واقعات ، روایات اور معتقدات کے انبار سے شاعرانہ زاویے تلاش کر کے نظم مکمل کی ہے مگر بحیثیت مجموعی یہ نظم واقعہ نگاری اور بیانیہ شاعری کا ایک عمدہ نمونہ ہے ۔

''شاھنامۂ اسلام'' میں حفیظ نے جس بحر کا انتخاب کیا ہے وہ بے حد رواں اور مترنم ہے ۔ اقبال نے بھی اپنی بعض نظمیں بالخصوص ''طلوع اسلام'' و ''تصویر درد'' اسی بحر میں لکھی ہیں ۔ اس خصوصیت کے علاوہ نظم میں واقعات کی ترتیب و تناسب اور بیان کی سادگی و سلاست نے شاھنامہ کی مقبولیت میں اور بھی چار چاند لگا دئے ہیں ۔ نمونے کے طور پر خاتم المرسلین کی ولادت کے سلسلے میں ''شاھنامۂ اسلام'' کے چند شعر دیکھئیے ۔

تبسم ہی تبسم تھے نظارے لالہ زاروں کے
ترنم ہی ترنم تھے ، کنارے جوئباروں کے
ندا آئی ، دریچے کھول دو ایوانِ قدرت کے
نظارے خود کریگی آج قدرت شان قدرت کے

ہوا عرش معلیٰ سے نزول رحمت باری
تو استقبال کو اٹھی ' حرم کی چار دیواری
مبارک ہو کہ ختم المرسلیں تشریف لے آئے
جنابِ رحمۃ اللعالمیں تشریف لے آئے
بصد انداز یکتائی ' بغایت شان زیبائی
امیں بن کر امانت ' آمنہ کی گود میں آئی

انتخاب کلام

مجھے ذلیل نہ کر عذر لن ترانی سے
یہ اہل ذوق کی توہین ہے جواب نہیں
جو کامیاب محبت ہے سامنے آئے
میں کامیاب نہیں ' ہاں میں کامیاب نہیں
اسی کی شرم ہے میری نگاہ کا پردہ
وہ بے حجاب سہی میں تو بے حجاب نہیں
سنا ہے میں نے بھی ذکر شراب و حور و قصور
خدا کا شکر ہے نیّت مری خراب نہیں

دل ابھی تک جوان ہے پیارے
کس مصیبت میں جان ہے پیارے
رات کم ہے نہ چھیڑ ہجر کی بات
یہ بڑی داستان ہے پیارے
تلخ کر دی ہے زندگی جس نے
کتنی میٹھی زبان ہے پیارے
جانے کیا کہہ دیا تھا روز ازل
آج تک امتحان ہے پیارے
کب کیا میں نے عشق کا دعویٰ
تیرا اپنا گمان ہے پیارے
میں تجھے بے وفا نہیں کہتا
دشمنوں کا بیان ہے پیارے
تیرے کوچے میں ہے سکوں ورنہ
ہر زمین آسمان ہے پیارے

ترے کرم کے معاملے کو ترے کرم ہی پہ چھوڑتا ہوں
مری خطائیں شمار کرکے ' مری سزا کا حساب کر دے
حفیظ سب سے بڑی خرابی ہے عشق میں لطف کامیابی
کسی کی دنیا تباہ کر دے کسی کی عقبیٰ خراب کر دے

دل شیشہ بنے پیمانہ بنے ہم دل کی حقیقت جانتے ہیں
بے رنگ سا اک قطرہ ہے جسے آنسو بن کر بہہ جانا ہے

اے طائر جاں کچھ روز ابھی اڑنے کی ہوس میں رہنا ہے
اس تنگ قفس میں رہنا ہے، دکھ سہنا ہے، غم کھانا ہے

ہم تری صورت انکار کو پہچانتے ہیں — وہ تبسم تو شریک لب گویائی کر

معصوم امنگیں جھول رہی ہیں دلداری کے جھولوں سے
یہ کچی کلیاں کیا جانیں کب کھلنا، کب مرجھانا ہے

اسی کی شرم ہے میری نگاہ کا پردہ — وہ بے حجاب سہی میں تو بے حجاب نہیں

غزلیات

مجھے شاد رکھنا کہ ناشاد رکھنا — مرے دیدۂ دل کو آباد رکھنا
ملیں گے تمہیں راہ میں بتکدے بھی — ذرا اپنے اللہ کو یاد رکھنا
بھلائی نہیں جا سکیں گی یہ راتیں — تمہیں یاد آئیں گے ہم یاد رکھنا
تمہیں بھی قسم ہے کہ جو سر جھکا دے — اسی کو تہ تیغ بیداد رکھنا
الٰہی وہ برباد کرتا ہے مجھ کو — الٰہی اسے شاد و آباد رکھنا

جرم کو جوش ندامت میں ڈبونا چاہا — داغِ مے کوثر و تسنیم سے دھونا چاہا
عشق نے حسن کے افعال پہ رونا چاہا — تخم احساس مگر سنگ میں بونا چاہا
ہائے کس درد سے کی ضبط کی تلقین مجھے — ہنس پڑے دوست جو میں نے کبھی رونا چاہا
آنے والے کسی طوفان کا رونا رو کر — ناخدا نے مجھے ساحل پہ ڈبونا چاہا
سنگدل کیوں نہ کہیں بتکدے والے مجھ کو — میں نے پتھر کا پرستار نہ ہونا چاہا
دیدۂ تر سے بھی سرزد ہوا اک جرم عظیم — حشر میں نامۂ اعمال کو دھونا چاہا
حضرت شیخ نہ سمجھے مرے دل کی قیمت — ے کے تسبیح کے رشتے میں پرونا چاہا
پھر دم نزع توقع ہوئی دلداری کی — رکھ کے سر زانوئے دلدار پہ سونا چاہا

کوئی مذکور نہ تھا غیر کا لیکن تم نے باتوں باتوں میں یہ نشتر بھی چبھونا چاہا
جنس شہرت بہت ارزاں تھی مگر میں نے حفیظ
دولت وقت کو بے کار نہ کھونا چاہا

بتوں کو کبھی آپ سچا نہ جانیں ۔ نہ انکے دھن ہیں نہ انکی زبانیں
زمانے میں چرچے ہیں دیر و حرم کے بڑی رونقوں پر ہیں دونوں دکانیں
بتوں کی نگاہیں مجھے ڈھونڈتی ہیں فضاؤں میں جب گونجتی ہیں اذانیں
ہمیں پیار ہے اُن سے ہم جانتے ہیں وہ سمجھیں نہ سمجھیں، وہ جانیں نہ جانیں
جوانی گئی پھر بھی ہم اور ناصح جہاں مل گئے چھڑ گئیں داستانیں

سرِ حشر کام آئی نہ مری سخن طرازی
کہ میں نامۂ عمل پر نہ شہید تھا نہ غازی
سر سر بلند میرا ہے نیاز مند تیرا
مرے ناز کو بھی دیکھے تری شان بے نیازی
فقط ایک بات کہکر کوئی بات ہے کہ چپ ہوں
مجھے بے زباں سمجھکر نہ کرو زباں درازی
نہ متاع نور حاصل نہ میں حور ہی سے واصل
نہ میں خود فریب واعظ نہ میں سادہ دل نمازی
مری زندگی ریا ہے مگر اسکا غم ہی کیا ہے
کہ ابھی بچھا ہوا ہے مرا دام پاک بازی

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات، یاد نہ تم کو آ سکے
تم نے ہمیں بھلا دیا، ہم نہ تمہیں بھلا سکے
تم ہی نہ سن سکے اگر، قصۂ غم سنے گا کون
کس کی زباں کُھلیگی پھر ہم نہ اگر سنا سکے
ہوش میں آ چکے تھے ہم، جوش میں آ چکے تھے ہم
بزم کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اُٹھا سکے
رونق بزم بن گئے ۔ لب پہ حکایتیں رہیں
دل میں شکایتیں رہیں، لب نہ مگر ہلا سکے

عجز سے اور بڑھ گئی برھمئی مزاج دوست
اب وہ کرے علاج دوست جسکی سمجھ میں آسکے

جاگ سوز عشق

جاگ سوز عشق جاگ
جاگ سوز عشق جاگ

جاگ کام دیوتا فتنہ ہائے نو جگا
بجھ گیا ہے دل مرا پھر کوئی لگن لگا
سرد ہو گئی ہے آگ
جاگ سوز عشق جاگ

جاگ سوز عشق جاگ
جاگ سوز عشق جاگ

پڑگئی دلوں میں پھوٹ کیا بجوگ پڑ گیا
پرتھوی پہ چار کھونٹ ایک سوگ پڑ گیا
سرنگوں ہے شیش ناگ
جاگ سوز عشق جاگ

جاگ سوز عشق جاگ
جاگ سوز عشق جاگ

تو نے آنکھ بند کی کائنات سو گئی
حسن خود پسند کی دن سے رات ہو گئی
زرد پڑ گیا سہاگ
جاگ سوز عشق جاگ

جاگ سوز عشق جاگ
جاگ سوز عشق جاگ

اب نہ وہ سفر نہ سیر رہبری نہ رہزنی
کچھ نہیں ترے بغیر دوستی نہ دشمنی
اب لگاؤ ہے نہ لاگ
جاگ سوز عشق جاگ

جاگ سوز عشق جاگ
جاگ سوز عشق جاگ

تو جو چشم وا کرے — ہر آہنگ جاگ اٹھے
آہ و نالہ جاگ اٹھے — راگ رنگ جاگ اٹھے
جوگ سے ملے بھاگ
جاگ سوز عشق جاگ

منظومات

شام رنگیں

پچھم کے در پہ سورج بستر جما رہا ہے — رنگین بادلوں میں چہرہ چھپا رہا ہے
کرنوں نے رنگ ڈالا بادل کی دھاریوں کو — پھیلا دیا فلک پر گوٹے کناریوں کو
عکس شفق نے کی ہے اسطرح زر فشانی — گھل مل کے بہ رہے ہیں ندی میں آگ پانی
اوڑھے سیہ دوپٹے سر سبز وادیوں نے — زیور اتار ڈالے گلزار زادیوں نے
چھایا ہے تھوڑا تھوڑا پیڑوں تلے اندھیرا — چڑیوں نے کھیت چھوڑا لینے چلیں بسیرا
کلیوں کے قہقہوں سے معمور ہیں ہوائیں — پریوں کی لوریاں ہیں یہ رس بھری صدائیں
لپٹی ہوئی ہیں نیندیں کیف آوریں ہوا میں — خاموشیوں کی لہریں اٹھنے لگیں فضا میں
گم ہو چلی ہے دنیا بکھرے ہوئے سکوں میں — دل غرق ہو رہا ہے چپ چاپ کے فسوں میں
کھیتوں میں کام کر کے لوٹے ہیں کام والے — چادر سروں پہ ڈالے کندھوں پہ ہل سنبھالے
اب شام آ گئی ہے جاگے ہیں بھاگ ان کے — ہرسمت گونجتے ہیں رستوں پہ راگ ان کے
لے لے کے ڈھور ڈنگر چروا ہے آ رہے ہیں — سیٹی بجا رہے ہیں اور گیت گا رہے ہیں
کمسن سہیلیوں کا پنگھٹ پہ جمگھٹا ہے — جانے اکیلیوں کا دن کسطرح کٹا ہے
یہ بار بار باتیں یہ بار بار ہنسنا — یہ بے شمار باتیں یہ بے شمار ہنسنا
اک گدگدا رہی ہے اک کھلکھلا رہی ہے — اک بھر چکی ہے پانی گاگر اٹھا رہی ہے
شرما کے اک نے اوڑھے منہ پر ہنسی کے مارے — رنگین اوڑھنی کے بھیگے ہوئے کنارے
شرم و حیا کی سرخی چہرے پہ چھا رہی ہے — شام اس کو دیکھتی ہے اور مسکرا رہی ہے

شاهنامه اسلام

(حضرت هاجره کے قافله کا ایک منظر)

خدا کے حکم سے مرسل نے جب رخت سفر باندھا
جناب هاجره نے دوش پر لخت جگر باندھا

پیمبر اپنا بیٹا اور بیوی هم عناں لے کر
چلا سوئے عرب ' پیری میں بخت نوجواں لے کر

خدا کا قافله جو مشتمل تھا تین جانوں پر
معزز جس کو هونا تھا زمینوں آسمانوں پر

چلا جاتا تھا اس تپتے هوئے صحرا کے سینے پر
جهاں دیتا هے انساں موت کو ترجیح جینے پر

وه صحرا جسکا سینه آتشی کرنوں کی بستی هے
وه مٹی جو سدا پانی کی صورت کو ترستی هے

وه صحرا جسکی وسعت دیکھنے سے هول آتا هے
وه نقشه جسکی صورت سے فلک بھی کانپ جاتا هے

جهاں اک اک قدم پر سو طرح جانوں په آفت تھی
یه چھوٹی سی جماعت بس وهیں گرم مسافت تھی

پیمبر بیوی . بچے کو لئے ' قطع سفر کرتے
خدا کے حکم پر لبیک کہتے اور دکھ بھرتے

بالآخر چلتے چلتے آخری منزل په آ ٹھهرے
لئے آرام زیر دامن کوه صفا ٹھهرے

یه وادی جس میں وحشت بھی قدم دھرتی تھی ڈر ڈر کے
جهاں پھرتے تھے آواره تھپیڑے باد صرصر کے

یه وادی جو بظاهر ساری دنیا سے نرالی تھی
یہی اک روز دین حق کا مرکز بننے والی تھی

وه وادی جسمیں سبزه تھا نه پانی تھا نه سایه تھا
اسی کی جستجو میں اسطرف پیغبر آیا تھا

یہیں ننھے سے اسمٰعیل کو لا کر بسانا تھا
یہیں اپنی جبینوں سے خدا کا گھر بسانا تھا

راوی میں کشتی

بن گیا ہے آسماں نتھرے ہوئے پانی کی جھیل
یا کسی ساحر نے ساکن کر دیا دریائے نیل

کوئی لہر اٹھتی نہیں اس بحر حیرت جوش میں
بزم انجم غرق ہے موسیقئی خاموش میں

کس قدر یہ نیلگوں وسعت سکوں انگیز ہے
جس کے اندر چاند کا چہرہ تجلی ریز ہے

رات کے افسوں میں گم ہو گئی ہے کائنات
یہ گماں ہوتا ہے شاید سو گئی ہے کائنات

شہ درے کے نوحہ خواں مینار بھی خاموش ہیں
مقبرہ بھی، باغ بھی، اشجار بھی خاموش ہیں

اس طرف سائے کو لپٹائے ہے پل سویا ہوا
چاندنی پر ریت کا ہے جز و کل سویا ہوا

اُس طرف اُجڑی ہوئی بارہ دری خاموش ہے
اک گئے گذرے پرانے خواب میں مدھوش ہے

اوڑھ کر مغموم بیوہ کی طرح چادر سفید
کروٹیں لیتی ہے راوی نا شکیب و ناامید

سینہ جنباں ہے کہ دل میں ہلکا ہلکا درد
اور ہوا کیا ہے، لب راوی پہ آہ سرد ہے

نغمہ سویا بربط آب رواں کی گود میں
جس طرح اک طفل سو جاتا ہے ماں کی گود میں

چاند بالائے فلک ہے چاند زیر آب ہے
چاند بھی ساکن ہے لیکن چاندنی بیتاب ہے

چاند کو گھیرے میں لیکر بہہ رہی ہے چاندنی
کوئی خواب اور کہانی کہہ رہی ہے چاندنی

اور اس چاندی کے دھارے پر بہا جاتا ہوں میں
خواب کے عالم میں سب کچھ دیکھتا جاتا ہوں میں

یہ مری کشتی بھی گویا خواب کا آغوش ہے
میں کسی عالم میں بیٹھا ہوں بس اتنا ہوش ہے

دو طرف خاموش اور تاریک ساحل ہیں رواں
اس روانی پر روانی کا نہیں ہوتا گماں

چپکے چپکے دوسری جانب چلے جاتے ہیں یہ
میری کشتی کے جلو میں کیوں چلے آتے ہیں یہ

میں کہاں جاتا ہوں شاید یہ نہیں معلوم انھیں
آنکھ سے فطرت نے رکھا ہے مگر محروم انھیں

دور افق پر اک نیا منظر ہے میرے سامنے
زندگانی کا رخ انور ہے میرے سامنے

میں وہاں جاتا ہوں نیندیں ٹوٹ جاتی ہیں جہاں
حسرتیں امید کے جلوے دکھاتی ہیں جہاں

افسر میرٹھی

حامد اللہ نام افسر تخلص ۱۸۹۸ء میں اپنے وطن میرٹھ میں پیدا ہوئے - آپ ایک معزز و ممتاز مفتی خاندان کے چشم و چراغ ہیں - ابتدائی تعلیم مولوی احمد علی صاحب محدث سے حاصل کی - پھر انھیں کی نگرانی میں آپ نے عربی و فارسی کی تعلیم مدرسۂ عالیہ عربیہ میرٹھ میں پائی - اس کے بعد انگریزی کی تکمیل میرٹھ کالج میں ہوئی جہاں سے انھوں نے بی - اے پاس کیا - ویسے اُردو و فارسی زبانوں سے افسر صاحب کو بچپن ہی سے خاص مناسبت ہے چنانچہ ان زبانوں کی کتابیں اکثر آپ کے مطالعہ میں رہتی ہیں - تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ابتداً کچھ مدت تک آپ اخبار نویسی کرتے رہے - آخر گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ میں لکچرر مقرر ہو گئے جہاں آپ اپنے فطری ذوق و مناسبت کے ساتھ درس و تدریس اور ادبی خدمات میں مصروف رہے - سنا ہے کہ حال ہی میں آپ اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں اور پنشن مل گئی ہے -

افسر صاحب کو شعر و شاعری کا شوق ابتدا سے تھا لیکن اس کو کسی پر ظاہر نہ کرتے تھے - سب سے پہلے بعض ہم جماعتوں کے اصرار سے ۱۹۱۶ء میں میرٹھ کے ایک مشاعرے میں شرکت کی اور جو غزل وہاں سنائی وہ بہت مشہور ہوئی تاہم اس مشاعرے کے بعد ایک مدت تک انھوں نے کسی مشاعرے میں شرکت نہیں کی - ویسے شعر گوئی کا شغل برابر جاری رہا - افسر صاحب کو طرح پر شعر کہنے سے ہمیشہ اُلجھن رہی ہے - اُن کی غزل گوئی کا طرز بالعموم یہ رہا ہے کہ کسی واقعہ سے متاثر ہو کر ایک شعر کہا پھر اُسی زمین میں اور شعر کہہ کر غزل پوری کر لی لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدرت نے انھیں نظم کے لئے پیدا کیا تھا اور وہ نظم اور گیت ہی کی دنیا سے غزل کے کوچے میں آ رہے ہیں - اُن کا شمار عصر حاضر کے اُن شعرا میں ہوتا ہے جن کے تجربات نے اُردو شاعری کو بعض نفیس اور مترنم بحروں سے روشناس کیا ہے اور جنھوں نے قدیم رسمی تغزل سے بغاوت کر کے ' نئے نئے موضوعات کو دلکش اسالیب کا جامہ پہنا کر جدید اُردو شاعری میں پیش کیا ہے - افسر کے کلام کا مطالعہ بتاتا ہے کہ شاعر قدیم نظام عروض کی سختی کے ساتھ پابندی کے بجائے نئے نظام کو فروغ دینا چاہتا ہے اور اس لحاظ سے افسر کو عظمت اللہ خاں کا ہمنوا کہا جا سکتا ہے چونکہ عظمت اللہ خاں نے شعر کی ظاہری شکل میں جو انقلاب پیدا کرنے کی کوشش شروع کی تھی افسر نے نہ صرف اُس سعی کو جاری رکھا بلکہ وہ اُن کے کلام میں بار آور بھی ہوئی ہے -

افسر کے تغزل کی ایک خاص خوبی اُس کی سادگی ہے - اس سادگی میں انھوں نے ایک مخصوص نرمی اور دھیما پن سمو کر بڑی دلکشی اور حسن پیدا کر دیا ہے جسے نشتریت

کہنا بے جا نہ ہوگا۔ وہ غزل میں قدیم اساتذہ کی بحروں پر قناعت نہیں کرتے بلکہ نئے رجحان کے ماتحت الفاظ کو تھوڑا بہت کھینچ تان کر اپنے جذبے کے مطابق چھوٹی یا بڑی بحروں میں شعر کہتے ھیں اور اس سے بلا شبہ اُن کی انفرادیت ظاھر ھوتی ھے۔ بحیثیت مجموعی اُن کی غزل حسن و عشق کی اتنی کہانی نہیں جتنی ایک حساس اور درد مند دل کی کہانی ھے۔

جہاں تک افسر کی منظومات کا تعلق ھے وہ باوجویکہ شکل و صورت میں حفیظ کی نظموں سے بہت مشابہ ھیں لیکن اپنی نوعیت و صناعی میں اُن سے بہت مختلف ھیں۔ حفیظ کے فکر و اسلوب میں رنگینی ھے۔ اس کے برعکس افسر کے یہاں سادگی پائی جاتی ھے۔ لیکن اس سادگی میں بڑی رچی ھوئی نغمگی موجود ھے۔ افسر نے اپنی نظموں میں جذبات کی صورت گری اور خارجی مناظر کی عکاسی کچھ ایسی کامیابی کے ساتھ کی ھے کہ اُن کی فنی مہارت کا قائل ھونا پڑتا ھے۔ اُن کی نظموں میں بڑی روانی ترنم اور موسیقیت ھے اس سلسلے میں اُن کی ''تربینی'' ''دولت مند جوگی'' ''شب تاریک'' ''میں جس کو ڈھونڈھتا ھوں'' وغیرہ جیسی نظمیں خاص طور پر قابل مطالعہ ھیں۔

افسر کی نظموں کی ایک اور خوبی حب الوطنی کا احساس ھے۔ یہ احساس افسر نے اقبال ' چکبست اور سرور جیسے شعرا سے ورثہ میں پایا ھے۔ اس میں شک نہیں کہ وطن پرستی کا جذبہ اُس زمانہ میں عام ھو چکا تھا اور تقسیم سے پہلے تقریباً ھر شاعر ھندی نغموں کا راگ الاپتا تھا لیکن افسر کے ایسے نغمات اپنی شاعرانہ موسیقیت کے اعتبار سے بڑے دلدوز واقع ھوئے ھیں۔ اور ان میں افسر نے دوسرے شعرا کی طرح یاس افزا خیالات پیش کرنے کی بجائے شگفتہ جذبات کا اظہار کر کے انہیں رجائی بنا دیا ھے۔ شاید انہیں خصوصیات کے پیش نظر سر سلیمان نے افسر کی نظموں کے مجموعے ''پیام روح'' کا تعارف کراتے ھوئے کہا تھا کہ ''افسر کا دل وطن کی محبت سے لبریز ھے۔ اس مجموعے میں متعدد نظمیں ایسی ھیں جن کو پڑھ کر دل پر ایک عجیب کیفیت طاری ھو جاتی ھے۔ کیا عجب ھے کہ افسر کے یہ محبت بھرے نغمے ھمارے ملک کی فرقہ وارانہ کشمکش کو دور کرنے میں کسی حد تک کامیاب ھو جائیں'' بہر کیف یہ خواب تو شرمندۂ تعبیر نہیں ھوا لیکن بایں‌ھمہ اس سے افسر کے وطنی نغموں کے اثر کو کوئی خاص ٹھیس نہیں پہنچی اور وہ اپنی شعریت و شگفتگی کی وجہ سے آج بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ھیں۔

افسر کا تعلق چونکہ محکمۂ تعلیم سے رھا ھے اور اُنھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ درس و تدریس کے مشغلہ میں گزارا ھے اس لئے اُنھیں بچوں کی نفسیات کا بخوبی علم ھے۔ اس سے فائدہ اُٹھا کر اُنھوں نے بچوں کے لئے بعض بہت ھی سہل ' سادہ اور سلیس نظمیں لکھی ھیں۔ لیکن ان میں بھی افسر کا تجرباتی انداز کام کئے بغیر نہیں رھا اور اُنھوں نے ان نظموں میں اسلوب کے نئے نئے پیکر تراشے ھیں۔ افسر کی ایسی نظموں میں ''مسافر'' ''مالن کا گیت'' اور ''چاند'' وغیرہ نہایت عمدہ نظمیں ھیں۔

الغرض سادگی ' لطیف موسیقیت ' نرم و مترنم طرز ادا ' جذبات نگاری ' مناظر قدرت کی عکاسی اور حب الوطنی افسر کے کلام کی ایسی خصوصیات ھیں جن کی بدولت

انھیں ہم عصر شعرا میں خاص امتیاز حاصل ہے ۔ آن کی غزلوں اور نظموں کے دو مجموعے ''پیام روح'' اور جوئے رواں'' شائع ہو کر اہل ذوق سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں ۔ اس کے علاوہ آن کی ادبی کاوشوں میں ''ڈالی کا جوگ'' اور ''پرچھائیاں'' آن کے مختصر افسانوں کے مجموعے ہیں اور ''نورس'' تنقیدی مقالات کا مجموعہ اور ''نقد الادب'' فن تنقید پر ایک مبسوط کتاب ہے ۔

انتخاب کلام

تغزل

کس نظر سے آشیاں کو آسماں دیکھا کیا
اور تو اے چارہ ساز بے کساں دیکھا کیا
میں نے یوں دل کی کہانی کا اثر قائم رکھا
ہر گھڑی تھم تھم کے رنگ داستاں دیکھا کیا

دل پر اپنا بس چلتا تو وحشت کاھے کو ہوتی
اور کسی سے کیا مطلب ہے تو خود کیا کہتا ہوگا
کون بھلا روتا پھرتا ہے آدھی آدھی راتوں کو
اس بادل کے بھی پردے میں کوئی دل والا ہوگا

پھر وحشیوں کو شوق ہوا کوھسار کا
شاید اس کو کہتے ہیں موسم بہار کا

وہ آرہے ہیں ستاروں کو نیند کے جھونکے
اثر کسی پہ تو ہوتا مرے فسانے کا
جہان بھر میں ہیں تنکے کہاں کہاں سے چنوں
صبا نے کر دیا کیا حال آشیانے کا

چمکتی ہے یہ بجلی ابر میں یا کسی سے کچھ اشارے ہو رہے ہیں

للّٰہ یہ بتا دے اے جذبۂ محبت کیا حسن ہے خدا میں کیا عیب آدمی میں

ہم جسکو موت سمجھتے ہیں پیغام حیات جدید ہے وہ
یہ پھول چمن میں جتنے ہیں پھر کھلنے کو مرجھاتے ہیں
دو شخص جب ایسے ملتے ہیں آپس میں جن کو محبت ہو
خاموشی طاری ہوتی ہے لب کھل کر رہ جاتے ہیں

عمل کی جن میں قوت ہے انھیں ملتی ہیں تاثیریں
نمایاں ہو حیات نو اگر ذروں کے دل چیریں
خدا توفیق دیتا ہے جنھیں وہ یہ سمجھتے ہیں
کہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے بنا کرتی ہیں تقدیریں

اف رے یہ ذوق عبادت کی عجائب کاریاں
دل کہیں ہے میں کہیں ، سجدہ کہیں ہے سر کہیں
موت ہے وہ راز جو آخر کھلے گا ایک دن
زندگی ہے وہ معما جس کا کوئی حل نہیں

مذاہب کیا ہیں ؟ راہیں مختلف ہیں ایک منزل کی
ہے منزل کیا؟ جہاں سب کچھ ہے پر راہیں نہیں ہوتیں

کچھ قطع منازل کی نہیں فکر سفر میں
ہر گام پہ منزل ہے تری راہ گزر میں
للّٰہ یہ تم دیکھنے والوں سے نہ پوچھو
کیا چیز ہو تم دیکھنے والوں کی نظر میں

رکھ کر نظر کے سامنے تصویر خواب ناز
پہروں ترے خیال میں بیٹھا رہا ہوں میں

یہ جی چاہتا ہے مرا آج افسر ابھی اور تم سے کئے جاؤں باتیں

زمانہ ڈھونڈتا ہے مجھ کو افسر خدا جانے کہاں کھویا گیا میں

جن کو ہر حالت میں خوش اور شادماں پاتا ہوں میں
اُن کے گلشن میں بہار بے خزاں پاتا ہوں میں
صبح کی منزل کا تاروں سے پتا کیا پوچھنا
ظلمت شب کارواں در کارواں پاتا ہوں میں
چاند کے اس پار، سورج سے اُدھر، تاروں سے دور
رقص کرتے روز و شب لاکھوں جہاں پاتا ہوں میں

موت کے خواب کی تعبیر ہے تجدید حیات
یعنی اول سے سنائینگے پھر افسانے کو

نیچی غم رخصت سے وہ معصوم نظر ہو
اور مجھ کو کہیں دور کا در پیش سفر ہو

بادلوں کی سر زمیں پر نغمہ ہائے جانفزا
مرغ خوش پرواز آزادی اسی کا نام ہے

جب خوشی کا خیال آتا ہے دل مایوس کانپ جاتا ہے
مجھے فردا کی فکر کیوں کر ہو غم امروز کھائے جاتا ہے
سکھ میں ہوتا ہے حافظہ بیکار دکھ میں اللہ یاد آتا ہے

نظر کے سامنے آ جنگلوں میں بولنے والے
کوئی دھیمی رسیلی ہلکی آوازوں سے کیا سمجھے
رسیلا راگ چھیڑا آم کے باغوں میں کوئل نے
نہ ہو جب کوئی دل والا تو اس کا درد کیا سمجھے

ہائے انجام تجسس کی عجائب کاریاں
تم ملے اور ڈھونڈنے والے تمہارے کھو گئے

فسانہ خواں تری آنکھیں قصور وار نہیں
میں جانتا ہوں خطا ہے مرے فسانے کی
قریب ہے مری منزل قریب ہے شاید
کہ اب نہیں رہی ہمت قدم اٹھانے کی

تجھ کو پا لینے میں یہ بیتاب کیفیت کہاں
زندگی وہ ہے جو تیری جستجو میں کٹ گئی

نہ سمجھا جب حقیقت کو کسی نے خدا پیدا کیا ہر آدمی نے

تو بیچ میں رہ جائے تو یہ تیری خطا ہے
جنت جسے کہتے ہیں آدھر بھی ہے ادھر بھی

مل جائے جو تجھ سے جا کر ایسا کس کا مقدر ہے
دریا میں جو قطرہ ہے وہ دریا ہے یا گوہر ہے

تاروں کا گو شمار میں آنا محال ہے
لیکن کسی کو نیند نہ آئے تو کیا کرے
دنیا میں اک سکوں کا ذریعہ ہو جب یہی
انسان تجھ سے لو نہ لگائے تو کیا کرے

اُن کی پرواز اُنھیں تابہ فلک لے پہنچی
ہم یہی سوچ رہے ہیں کہ خیال اچھا ہے

ہر خزاں کے غبار میں ہم نے کارواںِ بہار دیکھا ہے
کتنے پشمینہ پوش جسموں میں روح کو تار تار دیکھا ہے

اللہ رے جنوں کی یہ ذرہ نوازیاں بیٹھا ہوا ہوں دل میں بیاباں لئے ہوئے

بھٹکتی ھیں نظریں مری ہر طرف خدا جانے کس بھیس میں تو ملے

ایسی خلوت بھی کچھ نہیں افسر کہیں آنے کے ہو نہ جانے کے

ھائے وہ جس کی اُمیدیں ہوں خزاں پر موقوف
شاخ گل سوکھ کے گر جائے تو کاشانہ بنے

نہ شکوہ سنج مرا جوش سعی ہو کیوں کر
محال ہی تو نہیں ہے محال ہونا بھی

بڑھا کے ریش تو مسجد کو کیا چلا افسر
یہ شکل اب کہیں ہوتی نہیں نمازی کی

جو غم حد سے زیادہ ہو خوشی نزدیک ہوتی ہے
چمکتے ھیں ستارے رات جب تاریک ہوتی ہے
وہ دولت جس کا دنیا نے مسرت نام رکھا ہے
ترے جلووں کی داماں نظر میں بھیک ہوتی ہے

کچھ توجہ خاص ہوتی ہے عیاں نام لے لے کر نہ کوسا کیجئے
مصلحت کا ہے تقاضا احتیاط دل یہ کہتا ہے کہ دیکھا کیجئے

دکھاوے کے ھیں سب یہ دنیا کے میلے
بھری بزم میں ہم رہے ھیں اکیلے
انوکھے خیالوں کی محفل جمائے پڑے رہتے ھیں گھر میں افسر اکیلے

بزم میں ان مد بھری آنکھوں کو گردش دے مگر
اس کا اندازہ تو کرلے کسی کو کتنا ہوش ہے
یہ نظر کی جنبشیں یہ چال اٹھلائی ہوئی
کچھ تمہیں بھی آج اپنی بے خودی کا ہوش ہے

ہو قرب اور پھر وہی دلبستگی رہے
ہیں اصل میں یہی تو محبت کے ولولے

واں آن تو یہ گماں کہ دامن بھی تر نہیں
یاں حال یہ کہ آ گیا پانی گلے گلے

محو تلاشِ راحت تو یہ بھی جانتا ہے
کہتے ہیں جس کو راحت وہ غم کی انتہا ہے

پریشانی ہے جی گبھرا رہا ہے کوئی دھیمے سروں میں گا رہا ہے
کہوں کیا حال ناکام محبت تمناؤں سے جی بہلا رہا ہے
کوئی شب کی خموشی میں ہے گریاں تصور میں کوئی سمجھا رہا ہے
تصور کی یہ مقصد آفرینی میں سمجھا کوئی سچ مچ آ رہا ہے
جو رستہ خلد میں نکلا ہے جا کر
وہ دوزخ سے نکل کر جا رہا ہے

آغاز ہوا ہے اُلفت کا اب دیکھئے کیا کیا ہوتا ہے
یا ساری عمر کی راحت ہے یا ساری عمر کا رونا ہے

شاید تھا بیاضِ شب میں کہیں اکسیر کا نسخہ بھی کوئی
اے صبح یہ تیری جھولی ہے یا دنیا بھر کا سونا ہے

تدبیر کے ہاتھوں سے گویا تقدیر کا پردہ اُٹھتا ہے
یا کچھ بھی نہیں یا سب کچھ ہے یا مٹی ہے یا سونا ہے

ٹوٹے جو یہ بند حیات کہیں اس شورو شر سے نجات ملے
مانا کہ وہ دنیا اے افسر صرف ایک لحد کا کونا ہے

یاس ہے، حسرت ہے، غم ہے اور شب دیجور ہے
اتنے ساتھی ہیں مگر تنہا دل رنجور ہے

تیرا جانا تھا کہ غم خانے پہ وحشت چھا گئی
میں یہ سمجھا تھا مرے گھر سے بیاباں دور ہے

شب کی خاموشی میں ہے تیرا تصور تیری یاد
ہائے کیا سامانِ تسکینِ دلِ رنجور ہے

اثر دیکھا دعا جب رات بھر کی — ضیا کچھ کچھ ہے تاروں میں سحر کی
ہوئے رخصت جہاں سے صبح ہوتے — کہانی ہجر کی یوں مختصر کی
تڑپ اٹھے لحد کے سونے والے — زمیں کی سمت کیوں تم نے نظر کی
سحر دیکھیں یہ حسرت لے گئے ہم — بتائیں کیا تمہیں کیونکر سحر کی

یہ بھی اک تماشا ہے کار زار الفت میں
دل کسی کا ہوتا ہے بس کسی کا چلتا ہے

زندگی مری افسر اضطرار پیہم ہے
میں تو کانپ جاتا ہوں دل اگر سنبھلتا ہے

مسافر

ہے تنہا راہ میں گبھرائے گا دل
کہاں ہے اے مسافر تیری منزل ؟

سحر کی سرخ لہروں میں نہا کر — نظر مہر منوّر سے بچا کر
فضائے نیلگوں میں جب بڑھونگا — تو منزل کا پتہ کچھ دے سکونگا

سفر تیرا ہے مشکل اے مسافر
ہے کتنی دور منزل اے مسافر ؟

مسافر ہوں سفر ہے میرا مقصود — مری منزل مرے دل میں ہے موجود
سفر کی حد اگر معلوم ہوتی — سفر کی کیفیت معدوم ہوتی

سفر میں رات کا کٹتا ہے دو بھر
گزارے گا مسافر رات کیوں کر ؟

زمیں سے آسماں تک رہ گزر ہے — سفر کی رات ہی جانِ سفر ہے
خموشی کو صلائے درد دوں گا — کہانی اپنی تاروں سے کہوں گا

فلک پر نور افگن ماہ ہوگا "مسافر رات کا" ہمراہ ہوگا
محبت میں ہیں دونوں داغ بر دل
مسافر ہیں مگر گم کردہ منزل

مالن کا گیت

جی دکھتا ہے کیسے توڑوں،
چھوٹی چھوٹی، ننھی ننھی، پیاری پیاری کلیاں
یہ کانٹے میں سچ سچ کہہ دوں،
تیرے سارے پتے وتے میری ساری کلیاں
یا اللہ میں صبح کو پاؤں،
ننھی ننھی اچھی بھاری بھاری کلیاں
گیت افسر کا ایسا گاؤں،
جیسے میرے پودوں والی نیاری نیاری کلیاں

چاند

تم ندی پر جا کر دیکھو
جب ندی میں نہائے چاند
ڈبکی لگائے غوطے کھائے
ڈر ہے ڈوب نہ جائے چاند
کرنوں کی ایک سیڑھی لے کر
چھم چھم آترا آئے چاند
جھولے میں پانی کی لہروں کے
کیا کیا پینگ بڑھائے چاند
ہنس ہنس کر ندی کے اندر
روتوں کو بھی ہنسائے چاند
جب تم اسکو پکڑنے جاؤ
بادل میں چھپ جائے چاند
پھر چپکے سے نکل کر دیکھے
اور پھر خود کو چھپائے چاند
اب ہالے میں چپ بیٹھا ہے
کیا کیا روپ دکھائے چاند
چاہے جدھر کو جاؤ افسر
ساتھ تمہارے جائے چاند

مالن

بھر کے دامن پھول والی یاسمن لائی ہے تو
بیچنے بازار میں حسن چمن لائی ہے

راہِ پُر امنِ محبت کے لئے رہزن ہے تو
ھائے کتنی بے خبر اے سادہ دل مالن ہے تو

پھول یہ دو چار زینت تھے ترے گلزار کی
اب انھیں مرجھانے دیتی ہے ہوا بازار کی

بلبلیں حسرت بھری نظروں سے تکتی رہ گئیں
بس ھی کیا تھا بے کسی میں سر پٹکتی رہ گئیں

پتے گر گر کر زمیں پر سر رگڑتے رہ گئے
خار تک ظالم ترا دامن پکڑتے رہ گئے

رات بھر شبنم تجھے بیدرد مالن روئے گی
اب سحر کو کس کا منہ آ کر چمن میں دھوئے گی

نور کی جب ماہ تاباں شب کو چادر لائیگا
وہ چھپانے کو چمن کا حسن کیوں کر پائیگا

صبح کو آئیگا سورج گدگدانے کے لئے
باغ میں کوئی نہ ہوگا مسکرانے کے لئے

کاش اتنا ھوش ھوتا اے چمن والی تجھے
کوستی بے تاب ھو ھو کر ہے ھر ڈالی تجھے

دور کانوں سے ابھی تیرے صدائے درد ہے
تیرا ننھا دل ابھی نا آشنائے درد ہے

کمسنی میں چھپ رھا ہے تیرا حسن دلفروز
از صدائے دلفگاراں نیستی واقف ھنوز

خوش‌اداھیں، خوش‌فضاھیں‌خوش اثرخوشر نگ‌ھیں
پھول والی پھول تیرے کس قدر خوشرنگ ھیں

نور کے ٹکڑے پرو کر لائی ہے تو ھار میں
چاند کا دل توڑ کر لے آئی ہے بازار میں

مسکراتے ھیں خوشی سے یوں ترے دامن‌میں‌پھول
ھو دعا جیسے کسی نا چار و بیکس کی قبول

تیرے پھولوں میں ہے پوشیدہ تبسم حور کا
جسم لے کر آئی زاھد کی عبادت نور کا

پھول تارے بن کے جتنے شب کے گلشن میں رہے
صبح کے دامن سے نکلے تیرے دامن میں رہے

پھول تیرے موجب آرائشِ حسن بتاں
پھول تیرے باعث افزائشِ حسن بتاں

رات بھر دیکھیں گے اب یہ ماجرائے حسن و عشق
ان پہ روشن ہونگے کیا کیا راز ہائے حسن‌وعشق

کوسنے کیا کیا سنائے گا ترے گلزار کو
دیکھ کر شرمائے گا جب کوئی باسی ہار کو

دل لئے جاتا ہے کیا جادو ترے پھولوں میں ہے
ہائے اے مالن کسی کی بو ترے پھولوں میں ہے

چھپ رہی ہے تیرے پھولوں میں بہار داغ دل
پھول ہیں ظالم ترے آئینہ دار داغ دل

ہائے ان سے آرزوئے خون شدہ آتی ہے یاد
دل پکڑ کر رہ نہ جائے دیکھ کوئی نامراد

تاب یہ حسرت بھری نظروں کی کیونکر لائیں گے
پھول والی تیرے نازک پھول کمہلا جائینگے

پھول ہیں مالن ترے لطف عبادت کے لئے
ان میں زاہد نے مزے نیرنگ قدرت کے لئے

رنگ جلوت کیف افزا صورت خلوت ہوا
ان کی کثرت میں نمایاں جلوۂ وحدت ہوا

دھرم کی متوالی جوگن کہتی ہے ''دزد چمن !
تیرے پھولوں سے مرے مندر کی دیوی ہے مگن''

دل کی کیفیت ہے کیا دل کی کسی کو کیا خبر
کیف اندوزِ عبادت ہے پجاری کی نظر

چشمِ آخر بیں کو اک نظارۂ عبرت ہیں پھول
آنکھ والے کے لئے آئینۂ حیرت ہیں پھول

غنچہ ہائے مہُر بر لب تھے یہ گل گلزار میں
اب شباب آیا تو بکنے کو چلے بازار میں

رات بس کر سو رہیں گے پھر ہمیشہ کے لئے
زندگی ان کو ملی لُطفِ دو روزہ کے لئے

بے ثباتی کی جہاں میں پھول لائے ہیں خبر
ہستئی نازک کو روتی ہے حیات مختصر

پھول ھیں ظالم ترے تعبیر خواب زندگی
جسم لے کر آئی ھے تصویر خواب زندگی
ھوش جب آیا ھوا سے آشنا دامن ھوئے
پھول جتنے تھے چمن میں چاک پیراھن ھوئے
رنگ مایوسی کا تربت پر دو بالا کر دیا
اک عجب عالم ترے پھولوں نے پیدا کر دیا
پھول کہتے ھیں کوئی نو عمر زیر خاک ھے
کیسا وقت شام یہ نظارہ عبرت ناک ھے
اے کہ در خواب گرانِ مرگ ھستی در مزار
ھائے تجھ پر آج ھے حسن و نزاکت سوگوار
خاک ھو کر بھی زیارت گاہ اھل دل ھے تو
رھروان راہ حسن و عشق کی منزل ھے تو

فراق گورکھپوری

رگھو پتی سہائے نام فراق تخلص ۱۸۹۶ء میں اپنے آبائی وطن گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک معزز سری واستو کائستھ خاندان کے فرد ہیں۔ چونکہ اُن کے بزرگوں کو عہد شیر شاہ سوری میں پانچ گاؤں ضلع گورکھپور میں ملے تھے۔ اس لئے خاندان کے لوگ پنچ گانواں کے کائستھ مشہور ہوئے۔ اُن کے والد منشی گورکھ پرشاد عبرت اُردو و فارسی کے اچھے عالم تھے اور ایک ممتاز و معروف وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے شاعر بھی تھے۔ فراق صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر اُردو سے شروع ہوئی۔ سات سال کی عمر میں انگریزی تعلیم کے لئے اسکول میں داخل کئے گئے۔ جہاں اُنکی خداداد ذہانت کے جوہر کھلے اور اُنہوں نے ہر امتحان میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ میور سنٹرل کالج الہ آباد سے بی۔ اے پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ نے آئی۔ سی۔ ایس کے لئے اُنھیں نامزد کردیا لیکن ان ایام میں وہ اپنی ازدواجی زندگی کی تلخی سے کچھ اس طرح بیدل ہو رہے تھے کہ ڈپٹی کلکٹری قبول کرنے کے بجائے کانگرس میں شریک ہو کر خدمت قوم و وطن میں پناہ لینا چاہی۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اُنہیں اسیر فرنگ رہنا پڑا۔ ۱۹۲۷ء میں جب وہ قید سے رہا ہو کر آئے تو کرسچین کالج لکھنؤ میں ملازم ہو گئے۔ پھر سناتن دھرم کالج کانپور میں اُردو کے لکچرار مقرر ہوئے۔ اس دوران میں فراق صاحب نے انگریزی میں ایم۔ اے کر لیا اور الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے لکچرار ہو گئے۔ جب سے آپکا قیام مستقلاً الہ آباد ہی میں ہے اور آپ اپنے عہدے کے فرائض بحسن و خوبی انجام دینے کے ساتھ ساتھ اُردو شعر و ادب کی بڑی گراں قدر خدمت انجام دے رہے ہیں۔

فراق صاحب کی طبیعت بچپن ہی سے شعر و شاعری کی طرف مائل تھی لیکن شفیق باپ نے بعض مصالح کی بنا پر ان کے اس ذوق کو زیادہ اُبھرنے نہ دیا۔ تاہم حضرت عبرت کی مساعی اس معاملہ میں پوری کامیابی حاصل نہ کر سکیں۔ چنانچہ فراق اپنے پھوپھی زاد بھائی راج کشور لال سحر شاگرد امیر مینائی کی صحبتوں میں شاعرانہ کیفیات سے اس درجہ مانوس ہوئے کہ آخر لطف سخن اُن کا جزو زندگی بن کر رہا۔ ۱۹۱۶ء میں اُنھوں نے پہلی غزل کہی اور حضرت ناصری مرحوم سے اصلاح لی۔ کچھ دنوں بعد وسیم خیرآبادی سے اصلاح کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس زمانہ میں بی۔ اے

کرنے کے بعد وہ قید ہوئے تو وہاں مولانا حسرت ، مولانا ابوالکلام آزاد ، مولانا محمد علی جوہر وغیرہ کی صحبتیں نصیب ہوئیں اور بقول شخصے قید خانہ فراق صاحب کے لئے شعر و سخن کا مدرسہ بن گیا ۔ چنانچہ جب اس مدرسہ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے تو پھر کسی سے اصلاح نہ لی ۔

حضرت فراق کی ابتدائی غزلوں میں امیر مینائی کا رنگ جھلکتا ہے جو آن کے بھائی سحر کے توسط سے آن تک پہنچا ۔ پھر عزیز اور صفی کا اثر آن کے یہاں آبھرتا ہے اور اس کے بعد وہ میر کے رنگ میں کہنے لگتے ہیں ۔ لیکن آہستہ آہستہ ان اساتذہ کے تاثرات ، دیگر شعرائے اردو کے کلام کے گہرے مطالعے اور انگریزی ادب کی وافر معلومات سے اثر پذیر ہو کر فراق صاحب بھی ایک نئے رنگ کی تخلیق کرنے لگے جسے ہم خود فراق صاحب کا طرز سخن کہہ سکتے ہیں ۔ آن کے تغزل کا مرکزی عنصر عشقیہ اور عام زندگی کے متعلق ایک وجدانی ادراک ہے ۔ اسی کی بدولت آنکے یہاں جذبات نگاری کے بجائے ہمیں تنقید حیات کا پہلو زیادہ آجاگر نظر آتا ہے ۔ فراق صاحب نے غزل کو ایک نئی تاثیر ، ایک نئے شعور اور ایک نئے آہنگ سے ہم آہنگ کیا ہے ۔ آن کے تصور میں ہمیں قلب و نظر ، سکون و توازن ، نرمی و محبت اور خیر و برکت سبھی کچھ ملتا ہے ۔ وہ جنسی عشق کو آسکی تمام نزاکتوں ، لطافتوں اور بلندیوں کے ساتھ جس رچیے ہوئے رنگ میں پیش کرتے ہیں وہ آنھیں کا حصہ ہے ۔ لیکن ان تمام محاسن کے باوجود یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ فراق صاحب کے یہاں ابہام بھی پایا جاتا ہے ۔ بظاہر اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ وہ چونکہ مختلف اور بظاہر بے تعلق چیزوں میں ایک رشتہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے خیال کے حسین ہوتے ہوئے بھی وہ آسکی پوری وضاحت نہیں کر پاتے ۔

اس میں شک نہیں کہ فراق صاحب غزل گو شاعر ہیں ۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ غزل کے علاوہ وہ کچھ اور کہتے ہی نہیں یا آن کی دوسری شعری کاوشیں لائق اعتنا نہیں ۔ فراق صاحب کی نظمیں اور رباعیاں بھی ادبی حلقوں میں خاصی مقبول ہو چکی ہیں ۔ آن کی نظموں میں طرز بیان کا تنوع اور اسلوب کی رنگا رنگی خاص طور پر قابل ذکر ہے ۔ اس کے علاوہ وہ چونکہ فطری طور پر مناظر فطرت سے بہت ہی شدید قسم کا تاثر قبول کرنے کے عادی ہیں اس لئے آن کی منظریہ شاعری میں مناظر کے خد و خال کے ساتھ ساتھ آس کی بھر پور فضا بھی ملتی ہے اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو فراق صاحب کی منظومات کو بہت ہی پر تاثیر بنا دیتی ہے ۔ ان نظموں کے ساتھ ساتھ آن کی وہ نظمیں بھی قابل ذکر ہیں جن میں آنھوں نے بڑی بے باکی مگر دلکشی کے ساتھ داستان آدم سنائی ہے ۔ فراق صاحب کی ایسی نظمیں بہت نازک اور بلیغ اشاریت کی حامل ہیں اور آن میں شاعر کا بیدار سیاسی شعور صاف جھلکتا نظر آتا ہے ۔

جہاں تک حضرت فراق کی رباعیوں کا تعلق ہے مولانا نیاز فتحپوری کی مختصر مگر جامع رائے بڑی معنی خیز ہے وہ فرماتے ہیں ''فراق نے اس صنف سخن میں لطیف ترین بت گری سے کام لیا ہے ۔ ان رباعیوں میں مغربی کلچر بھی ہے اور ایرانی کلچر بھی ، یونانیوں کا جمالیاتی نظریہ بھی آن میں موجود ہے اور قدیم ہندو اور بودھ آرٹ کا رقص

و نغمہ بھی'' اور یہی وجہ ہے کہ فراق صاحب کی رباعیات کا مجموعہ ''روپ'' اُردو دان طبقہ میں بڑی قدر و منزلت اور محبت کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے ۔ فراق صاحب کے اس مجموعہ کی تمام رباعیاں جمالیاتی ہیں ۔ لیکن اُنہوں نے ہمارے جنسی جذبہ کو جس تہذیب کے ساتھ ایک آفاقی کلچر کا رنگ دیکر پیش کیا ہے وہ یقیناً لائق صد ستائش ہے ۔

بحیثیت مجموعی فراق صاحب عصر حاضر کے ممتاز شعرا میں سے ہیں ۔ اُن کی شاعری میں سب سے زیادہ تنقید حیات کی ایک مسلسل کوشش ملتی ہے اور شاید اسی لئے اُنہیں عام طور پر اُردو کا نقاد شاعر کہا جاتا ہے ۔ اُن کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ''رمز و کنایات'' اور ''شبنمستان'' صرف غزلوں اور ''روپ'' محض رباعیات کے مجموعے ہیں ۔ ان کے علاوہ ''روح کائنات'' اُن کی نظموں اور غزلوں اور ''مشعل'' غزلوں اور رباعیوں کے مجموعے ہیں ۔

انتخاب کلام

تغزل

تھی یوں تو شام ہجر مگر پچھلی رات کو — وہ درد اُٹھا ''فراق'' کہ میں مسکرا دیا

قفس سے چھٹ کے وطن کا سراغ بھی نہ ملا
وہ رنگ لالہ و گل تھا کہ باغ بھی نہ ملا

نگاہ یار خبر تھی نہ تیرے وعدوں کی — جو تو نے یاد دلایا تو مجھ کو یاد آیا

پردہ داریٔ غم ہے شاکی — تو نے حال تو پوچھا ہوتا
آج تو درد ہجر بھی کم ہے — آج تو کوئی آیا ہوتا
منزل منزل دل بھٹکے گا — آج تمہیں نے روکا ہوتا
میں ہوں دل ہے تنہائی ہے — تم بھی جو ہوتے اچھا ہوتا

آج بھی کام محبت کے بہت نازک ہیں — دل وہی کارگہہ شیشہ گراں ہے کہ جو تھا
منزلیں گرد کی مانند اُڑی جاتی ہیں — وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا
دیکھ سکنے کی الگ بات مگر حسن ترا — دولت دیدۂ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا

جہاں کودے گی محبت کی تیغ آبِ حیات ۔ ابھی کچھ اور اُسے زہر میں بجھائے جا
اس اضطراب میں راز فروغ پنہاں ہے ۔ طلوع صبح کی مانند تھرتھرائے جا
نگاہ یار ترا یوں تو ہے پیام کچھ اور ۔ مگر کرم بھی کئے جا ستم بھی ڈھائے جا

وہ سوز و درد مٹ گئے وہ زندگی بدل گئی ۔ سوال عشق ہے ابھی یہ کیا کیا ، یہ کیا ہوا؟

بس ایک عشق کے خراب ہونے ہی کی دیر تھی ۔ شباب تھا سنور گیا ، زمانہ تھا گذر گیا

کچھ نہ خلوت میں ہے نہ جلوت میں ۔ اُسکی خلوت ہے اور جلوت اور

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں ۔ لیکن اس ترک محبت کا بھروسا بھی نہیں
ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں ۔ اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں
مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست ۔ آہ ! اب مجھ سے تری رنجش بے جا بھی نہیں
آج غفلت بھی ان آنکھوں میں ہے پہلے سے سوا ۔ اور دل ہجر نصیب آج شکیبا بھی نہیں

جو بھولتی بھی نہیں یاد بھی نہیں آتیں ۔ تری نگاہ نے کیوں وہ کہانیاں نہ کہیں

مدتیں قید میں گزریں مگر اب تک صیاد ۔ ہم اسیران قفس تازہ گرفتار سے ہیں
کیا کہیں وہ ترے اقرار کہ اقرار سے تھے ۔ کیا کہیں یہ تیرے انکار کہ انکار سے ہیں

دل میں اُٹھا کے رکھے گلستاں ۔ کرے علاج تنگئ داماں
شبنم و شعلہ حسنِ گلستاں ۔ پرنم پرنم سوزاں سوزاں
آئے گنہگاران محبت ۔ نادم نادم نازاں نازاں
یہ بھی فسانہ وہ بھی کہانی ۔ کیا شب وصل اور کیا شب ہجراں
آنچ قفس والوں تک آئی ۔ اب کے بہت ہے شور بہاراں
کس کے پاؤں کی چاپ ہے دنیا ۔ کون ہے صبح ازل سے خراماں
کس نے موت کی نیند اُڑا دی ۔ جاگ اُٹھی ہے خاک شہیداں

یوں ہی ''فراق'' نے عمر بسر کی
کچھ غم جاناں کچھ غم دوراں

کمی نہ کی ترے وحشی نے خاک اڑانے میں
جنوں کا نام اچھلتا رہا زمانے میں
غرض کہ کاٹ دئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

آج تو حسن و محبت ہو گئے تھے مل کے ایک
تو نے وہ عالم نگاہ ناز کا دیکھا نہیں
بے آڑی تجھ کو نگاہ شوق کیا جانے کہاں
تیری صورت پر بھی اب تیرا گماں ہوتا نہیں

رموز عذر جفا تک خیال جا نہ سکا
میں چپ رہا تو بُرا ماننے کی بات نہیں

کب دیکھنے دلوں کو ملے اذن یاس بھی
بیگانہ وار کہتی ہے وہ آنکھ "ابھی نہیں"
ہم دیکھ کر بھی دیکھ سکیں حسن یار کو
اتنی طویل فرصتِ نظّارگی نہیں

پھر ہیں وہی اداسیاں پھر وہی سونی کائنات
اهل طرب کی محفلیں رنگ جما کے رہ گئیں
مجھ کو خراب کر گئیں نیم نگاهیاں تری
مجھ سے حیات و موت بھی آنکھیں چرا کے رہ گئیں
شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کی کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

خستگی مہر و ماہ کی مت پوچھ کون پیمانہ ہے جو چُور نہیں

اپنی ہی گرمی سے آیا عشق میں اک بانکپن
اپنی ہی گرمی سے گھائل ہو گیا حسن بتاں

یہ نرم نرم ہوا جھلملا رہے ہیں چراغ
ترے خیال کی خوشبو سے بس رہے ہیں دماغ
جو چھپ کے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتا ہے
اسی کے نقش کف پا سے جل اٹھے ہیں چراغ
دلوں میں داغ محبت کا اب یہ عالم ہے
کہ جیسے نیند میں ڈوبے ہوں پچھلی رات چراغ

ابھی تو بلبلیں آسودۂ نشیمن ہیں
گلو کچھ اور ابھی رنگ و بو کے جال بچھاؤ
نہ عشق ہی کو خبر ہو نہ حسن ہی جانے
کسی سے عالم مستی میں اس طرح کھل جاؤ
نہ پوچھ الجھی ہوئی گتھیاں محبت کی
نہ پوچھ حسن کی باتوں میں کتنا ہے سلجھاؤ
تڑپ کو ہم نے بنایا سکون بے پایاں
ہماری دکھ بھری لے میں ہے کس قدر ٹھہراؤ

نکہت زلف پریشاں داستان شام غم صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کرو

ہاں تجھے بھی نہ کہہ سکیں تجھ سا تجھ کو یکتائے روزگار کریں
کوئی آیا نہ آئے گا لیکن کیا کریں گر نہ انتظار کریں
جوش تجدید شوق کیا کہنا دل کو پھر ہم امیدوار کریں

وہ شوخ کسی صورت اپنا بھی نہیں ہوتا اور یہ بھی نہیں ممکن سمجھیں اسے بیگانہ

وہ ماجرائے عشق بھی خواب و خیال ہے تیری نگاہ سے جو ہوا تھا بیاں کبھی
سر بھی انہیں ملا در و دیوار بھی مگر کم ہو سکی نہ وحشت زندانیاں کبھی

بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم
جو تیرے ہجر میں گزری وہ رات رات ہوئی

دیارِ دل میں یہ پرچھائیاں نہیں پڑتیں
حریمِ عشق میں دن ہی ہوا نہ رات ہوئی

هزار بار زمانه ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگذر پھر بھی

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
تو نے تو خیر بے وفائی کی

رُکی رُکی سی شبِ تار ختم پر آئی
وہ پو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئی
کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اٹھتا ہے
کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی
کسی کی بزم طرب میں حیات بٹتی تھی
امید واروں میں کل موت بھی نظر آئی
ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

کہیں دامانِ بادِ صبح بھی آلودہ ہوتا ہے
بچا لیتا ہے حسنِ نرم خود دوشیزگی اپنی

اس پرسشِ کرم پہ تو آنسو نکل پڑے
کیا تو وہی خلوص سراپا ہے آج بھی

زندگی کو وفا کی راہوں میں
موت خود روشنی دکھاتی تھی

تمام شبنم و گل ہے وہ سر سے تا بقدم
رکے رکے سے کچھ آنسو رکی رکی سی ہنسی

جب جب اسے سوچا ہے دل تھام لیا میں نے
انسان کے ہاتھوں سے انسان پہ کیا گزری

کچھ بڑھ گئی وحشت اور مری زنداں سے رہائی پاتے ہی
کچھ حسرتِ صحرا کی بھی ہے، کچھ رنجِ در و دیوار بھی ہے
امید نہ دے پرسش بھی نہ کر، دے اور فریبِ حسن کوئی
مایوسوں کا خوش ہو جانا، آسان بھی ہے دشوار بھی ہے
دن رات شگوفے کھلتے ہیں، دن رات بہاریں لٹتی ہیں
تدبیرِ جنوں، تقدیرِ چمن، ایام کی کچھ رفتار بھی ہے

اک تار نگاہ کی جنبش سے شہ عشق کو دیتی ہے کیا کیا
وہ آنکھ جو مائل صلح بھی ہے، آمادۂ صد پیکار بھی ہے
رہ رہ کے خلش بھی ہوتی ہے، کچھ کشمکش دل بھی کم ہے
سنتے ہیں فراق وہ تیر نظر دل میں بھی ہے دلکے پار بھی ہے

حسن اور عشق میں پیمان وفا ہوتا ہے   ذرے ذرے سے تلاطم سا بپا ہوتا ہے

تجھ کو اے باد صبا شوخئی پیہم کی قسم
اس طرح چھیڑ کہ ہر گل کو گلستاں کر دے
زندگی تیرے تغافل نے بنا دی مشکل
اب اسے اے نگہ یار کچھ آساں کر دے

جنہیں ہے ناز بہت اپنے ظرف پر ساقی   تری نگاہ ہے انداز اُن کے پائے ہوئے
وہ نرم نرم ہوائیں ہیں کس کے دامن کی   چراغ دیر و حرم بھی ہیں جھلملائے ہوئے
خراب اور نہ کر اب خراب حالوں کو   ہماری خاک سے دامن ذرا بچائے ہوئے
خبر یہ ہے کہ سر حشر بھی نہیں چو کے   تیری نگاہ کرم کے فریب کھائے ہوئے

اپنے مقام پر رہیں عشق کی بے نیازیاں
گو در خلد بھی کھلے دل نے کہا کہ کون جائے
عالم حسن و عشق کی کون وہ بات ہے جسے
بھولیں اگر تو یاد آئے یاد کریں تو بھول جائے
گو ہمہ تن وہ جبر ہے کہتی ہیں یہ مشیّتیں
ہم سے بھی کچھ نہ بن پڑے عشق جواپنی ضد پہ آئے
کشتئی دل بچائیے اتنا مگر رہے خیال
ڈوبے اگر تو پار ہو، پار لگے تو ڈوب جائے

کہہ گئی کیا نگہ ناز تری ہم جس کو   بات کی بات فسانے کا فسانہ سمجھے
اپنے دیوانے کا دنیا میں ٹھکانہ ہے کہیں   لوگ اپنا جسے سمجھے نہ تمہارا سمجھے

نہ پوچھ عرصۂ ہستی کی وسعت و تنگی — جو چل پڑے تو بیاباں ، رکے تو زنداں ہے
بہت قریب کہیں مسکرا رہا ہے کوئی — رگِ جنوں ہے، رگِ گل ہے، یا رگِ جاں ہے

ماتھے پہ ترے صبح چمن کھیل رہی ہے — آنکھوں میں محبت کی کرن کھیل رہی ہے
ناگن کوئی بل کھاتی ہے پیہم کہ ہوا سے — وہ زلفِ شکن زیر شکن کھیل رہی ہے
پیراہن خوش وضع سے آتی ہے لپٹ سی — ملبوس میں خوشبوئے بدن کھیل رہی ہے
اس پیکر رنگیں میں زہے شوخیٔ پنہاں — بجلی تہ دامانِ چمن کھیل رہی ہے

باتوں میں فراق اس کی معطر ہے سماعت
ہر لفظ میں خوشبوئے دہن کھیل رہی ہے

جو ہونٹوں تک ترے محدود رہتی ہے ، سحر ہوتے
افق پر دور تک وہ مسکراہٹ پھیل جاتی ہے
کسی کا قامت شاداب ہے وہ مصرعہ رنگیں
کہ جس کے سامنے فکر غزل شرمائی جاتی ہے
محبت آنکھ جھپکاتی ہے پلکیں غم کی بھاری ہیں
بہت جاگا ہوں اے شام فراق اب نیند آتی ہے

بزم برشگال

مطرب سے کہو آج اس انداز سے گائے — ہر دل کو لگے چوٹ سی ہر آنکھ بھر آئے
وہ سوز جو تاریکیوں میں شمع جلائے — وہ ساز جو سوئی ہوئی یادوں کو جگائے
پلکوں کے تلے میکدۂ راز کے جلوے — ظلمت میں گناہوں کے چراغوں کو جلائے
کوندا ہو گداز آف یہ تبسّم کی گھلاوٹ — لہجے کی کھنک ، لَو جو ستاروں سے چرائے
وہ مستی قامت کہ گھٹا جھوم کے اٹھے — وہ چستیٔ ہر عضو کہ بجلی کو غش آئے
وہ نرم کلائی کہ سکوت آنکھ اٹھاوے — آہستہ خرامی کہ فضا وجد میں آئے
وہ شوخیٔ محتاط کے بجتے ہوئے انداز — دنیا بھی نہ رہنے دے قیامت بھی نہ ڈھائے
یہ کم نگہی چشم فسوں ساز کی کیسی ، — دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنائے
نس نس میں کوئی جیسے دبی چٹکیاں بھردے — رگ رگ میں کلی جیسے چٹکتی چلی جائے
زلفِ عرق آلود کی وہ تاروں بھری رات — روئے شفق آمیز سے ہو پھوٹتی جائے
کیوں تیرے غم ہجر میں نمناک ہیں پلکیں — کیوں یاد تیری آتے ہی تارے نکل آئے

برسات کی اس رات میں اے دوست تری یاد اک تیز چھری ہے جو اُترتی چلی جائے
کچھ ایسی بھی گزری ہیں تیرے ہجر میں راتیں
دل درد سے خالی ہو مگر نیند نہ آئے

آج کی دنیا

دنیا کو انقلاب کی یاد آ رہی ہے آج
تاریخ اپنے آپ کو دھرا رہی ہے آج
وہ سر اٹھائے موج فنا آ رہی ہے آج
موج حیات موت سے ٹکرا رہی ہے آج
کانوں میں زلزلونکی دھمک آ رہی ہے آج
ہر چیز کائنات کی تھرا رہی ہے آج
جھپکا رہی ہے دیر سے آنکھیں ہوائے دھر
کون و مکاں کو نیند سی کچھ آ رہی ہے آج
ہر لفظ کے معانی و مطلب بدل چکے
ہر بات اور بات ہوئی جا رہی ہے آج
یکسر جہان حسن بھی بدلا ہوا سا ہے
دنیائے عشق اور نظر آ رہی ہے آج
ہر ہر شکست ساز میں صد لحن سرمدی
یا زندگی کے گیت اجل گا رہی ہے آج
یہ دامن اجل ہے کہ تحریک غیب ہے
کیا شے ہوائے دھر کو سلگا رہی ہے آج
ابنائے دھر لیتے ہیں یوں سانس گرم و تیز
جینے میں جیسے دیر ہوئی جا رہی ہے آج
افلاک کی جبیں بھی شکن در شکن سی ہے
تیوری زمین کی بھی چڑھی جا رہی ہے آج
پھر چھیڑتی ہے موت حیات فسردہ کو
پھر آتش خموش کو اکسا رہی ہے آج
برھم سا کچھ مزاج عناصر ہے ان دنوں
اور کچھ طبیعت اپنی بھی گھبرا رہی ہے آج
اک موج درد سینے میں لرزاں ہے اسطرح
ناگن سی جیسے شیشے میں لہرا رہی ہے آج
بیتے جُگوں کو چھاؤں ہے امروز پر فراق
ہر چیز اک فسانہ ہوئی جا رہی ہے آج

رباعیات

ہر ایک نظر یہ کام کرتی بھی نہیں
ہر ایک نگاہ یوں اُترتی بھی نہیں
صدقے ترے دیکھنے کے ظالم دل پر
پڑتی ہے وہ چوٹ جو اُبھرتی بھی نہیں

دن ڈوب گیا رات کی اندھیاری ہے
ہر سمت خموشی کا سماں طاری ہے
تارے نکلے تو درد سینے میں اٹھا
وہ آنکھ کی " یہ قلب کی بیداری ہے

لہروں میں کِھلا کنول نہائے جیسے   دوشیزۂ صبح گنگنائے جیسے
یہ روپ ، یہ لوچ ، یہ ترنم یہ نکھار   بچہ سوتے میں مسکرائے جیسے

آنسو سے بھرے بھرے یہ نیناں رس کے   ساجن کب اے سکھی تھے اپنے بس کے
یہ چاندنی رات یہ بِرہ کی پِیڑا   جس طرح اُلٹ گئی ہو ناگن ڈس کے

بالوں میں خنک سیاہ راتیں ڈھلتی   گالوں کی شفق کے اوٹ شمعیں جلتی
تاروں کی سرکتی چھاؤں میں بستر سے   اک جان بہار اٹھی ہے آنکھیں ملتی

اک حلقۂ زنجیر تو زنجیر نہیں   اک نقطۂ تصویر تو تصویر نہیں
تقدیر تو قوموں کی ہوا کرتی ہے   اک فرد کی قسمت کوئی تقدیر نہیں

کچھ رندوں کو سن گن سی ملی ہے ساقی   نو جُگ کے جنم کی یہ گھڑی ہے ساقی
تخلیق کے لمحے تھر تھرائے سر جام   یہ شام اک گرد بن رہی ہے ساقی

یہ ولولہ یہ آہنگ دریا دریا   یہ شعلۂ بے درنگ صحرا صحرا
یہ پرتو انقلاب عالم عالم   یہ جلوۂ انقلاب دنیا دنیا

کھلتا ہے اہم ترین باب تاریخ   یہ شعلۂ نغمۂ رباب تاریخ
یہ سینۂ وقت میں دھکتی ہوئی آگ   کروٹ لیتا ہوا شباب تاریخ

شائستۂ انقلاب انساں کا وطن   آگتے سورج کا جگمگاتا درپن
وہ نغمۂ زندگی کا بجتا ہوا ساز   وہ سارے ایشیا کے دل کی دھڑکن

مولانا عبدالمجید سالک

عبدالمجید خان نام سالک تخلص ۱۳ دسمبر ۱۸۹۵ء کو بٹالہ ضلع گورداسپور میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے دادا مولوی میر محمد صاحب علوم شرقیہ کے فاضل اور نہایت عابد و زاھد بزرگ تھے اور آپ کے والد منشی غلام قادر مرحوم پٹھانکوٹ میونسپل کمیٹی کے سیکرٹری تھے ۔

مولانا سالک کی ابتدائی تعلیم پٹھان کوٹ میں ہوئی ۔ انٹرنس کا امتحان اپنے وطن بٹالہ میں پاس کیا ۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک چند عارضی ملازمتیں کرتے رہے ۔ لیکن چونکہ ادبی ذوق میراث میں پایا تھا اس لئے یہ ماحول پسند نہ آیا چنانچہ آپ نے ملازمت سے کنارہ کش ہوکر ۱۹۱۴ء میں پٹھانکوٹ سے ایک ادبی رسالہ ''فانوس خیال'' جاری کیا ۔ اس طرح گویا انیس سال کی عمر میں مولانا کی نثر نگاری کی ابتدا ہوئی اگرچہ نا مساعد حالات نے اس پرچہ کو نو یا دس ماہ سے زیادہ نہ چلنے دیا تاہم اس سے مولانا کے ذوق ادب اور سلیقہ کا ضرور پتہ چل جاتا ھے ۔ اور یہی وہ خصوصیات تھیں جنھوں نے ''فانوس خیال'' کو ایک معیاری جریدہ بنایا اور اُس وقت کے اچھے لکھنے والے اُس کے قلمی معاون بنے ۔

۱۹۱۵ء میں مولانا سالک لاہور تشریف لائے اور سید ممتاز علی صاحب کے رسالہ ''تہذیب نسواں'' اور ''پھول'' کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے ۔ ۱۹۲۰ء میں جب پنجاب کے مشہور اُردو روزنامہ ''زمیندار'' کا اجرا ہوا تو مولانا ظفر علی خان صاحب نے آپ کو اس کے ادارے میں شمولیت کی دعوت دی ۔ آخر آن کے اصرار پر سالک صاحب یکم مئی ۱۹۲۰ء کو ادارۂ ''زمیندار'' سے منسلک ہو گئے ۔ اس حیثیت سے آپ نے اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر ''زمیندار'' کو اپنی قدیم روایات کے ساتھ جاری رکھا ۔

۴ نومبر ۱۹۲۱ء کو مولانا سالک تحریک عدم تعاون کے سلسلہ میں گرفتار کر لئے گئے اور ایک سال کی سزا ہوئی ۔ منٹگمری جیل میں مولانا نے انگریزی کا خاصا مطالعہ کیا چنانچہ جب نومبر ۱۹۲۲ء میں آپ رہا ہوئے تو ''زمیندار'' کی ادارت کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ ایک ہی سال میں ایف ۔ اے اور بی اے کے

امتحانات بھی پاس کر لئے - اسی زمانے میں مولانا غلام رسول مہر بھی ادارۂ ''زمیندار'' سے وابستہ ہوئے -

۲۱ مارچ ۱۹۲۷ء کو جناب مہر اور حضرت سالک نے مل کر روز نامہ ''انقلاب'' نکالنا شروع کیا جو قیام پاکستان کے بعد تک برابر جاری رہا - اس طویل عرصے میں مولانا سرتاپا صحافت و سیاست میں منہمک رہے - اس کے بعد تقریباً ڈیڑھ دو سال مولانا کا قیام کراچی میں رہا جہاں مرکزی حکومت کے لئے آپ کچھ لکھتے رہے - اواخر ۱۹۵۳ء سے لاھور واپس آ گئے ھیں اور مختلف رسائل و اخبارت کو اپنی قلمی اعانتوں سے سرفراز کرتے رھتے ھیں -

مولانا سالک ایک کامیاب صحافی اور اچھے نثر نگار ھیں - اس کا ایک ثبوت تو ''زمیندار'' و ''انقلاب'' کے ''افکار و حوادث'' کے کالم ھیں جن کی مزاحیہ ادبی نگارشات نے قبول عام کی سند حاصل کی ' دوسرے آپ کی وہ تالیفات و تراجم ھیں جو مختلف اوقات میں طبع ہوتے رہے - لیکن ان گراں قدر اوصاف سے قطع نظر آپ ایک بلند پایہ شاعر بھی ھیں - ۱۹۰۹ء یعنی چودہ سال کی عمر سے مولانا نے شعر کہنا شروع کئے اور منشی حیات بخش رسا رامپوری فخر تلامذہ داغ کی شاگردی کا شرف حاصل کیا - یہ سلسلہ چند سال جاری رہا لیکن ۱۹۱۳ء میں جب حضرت رسا کا انتقال ھو گیا تو مولانا سالک نے بھی اصلاح سے گریز کر کے خود اپنی جودت طبع کی رھنمائی میں فکر سخن جاری رکھی اور تھوڑے ھی عرصہ کی مشق و ریاض کے بعد استادی کے درجہ کو پہنچ گئے -

مولانا سالک غزل و نظم دونوں کہتے ھیں مگر چونکہ سیاسی اور صحافی مصروفیتوں نے کبھی خصوصیت کے ساتھ شعر و سخن کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیا اس لئے آپ کا شعری سرمایہ کچھ ایسا زیادہ نہیں - بایں ھمہ آپ نے جو کچھ بھی کہا ھے اس میں وہ مشاطگی اور فنی پختگی پائی جاتی ھے جو ایک ماھر فن اور استاد کے شایان شان ھے - آپ کی نظموں میں علامہ اقبال کا پرتو صاف نظر آتا ھے چنانچہ ان میں سے بیشتر قومی رنگ کی ھیں - اس طرح کی نظموں کا موضوع مسلمان اور اس کی زندگی ھے اور شاعر نے ان موضوعات کو اپنا کر مسلمانوں میں جوش ولولہ اور بیداری پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ھے - اس کے علاوہ بعض نظموں میں مظاھر فطرت اور فنون لطیفہ پر بڑی چابکدستی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ھے کچھ منظوم ترجمے بھی ھیں جو اپنی سادگی و روانی کے اعتبار سے بڑے دلکش ھیں - جہاں تک مولانا کی غزل گوئی کا تعلق ھے یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ھے کہ ان کی غزل زبان و بیان کی جملہ خصوصیات کی حامل ہوتی ھے - پچھلے چند سالوں میں انہوں نے جو غزلیں کہی ھیں وہ تو بس خاصے کی چیز ھیں - ان غزلوں میں غم جاناں و غم روزگار کا ایسا حسین امتزاج پایا جاتا ھے کہ پڑھنے یا سننے والے کی روح وجد کرنے لگتی ھے - مولانا موصوف کی چند ابتدائی اردو فارسی نظموں کا ایک مجموع ''راہ و رسم منزلہا'' کے نام سے ۱۹۲۲ء میں طبع ھوا تھا جس کی ترتیب آپ کے احباب نے اس وقت دی جب آپ جیل میں تھے

انتخاب کلام

تغزل

هم نفسو! اجڑ گئیں مہر و وفا کی بستیاں
پوچھ رہے ہیں اہل دل مہر و وفا کو کیا ہوا
عشق ہے بے گداز کیوں، حسن ہے بے نیاز کیوں
میری وفا کہاں گئی اُن کی جفا کو کیا ہوا
اب نہیں جنت مشام کوچۂ یار کی شمیم
نکہت زلف کیا ہوئی، باد صبا کو کیا ہوا
تھم گیا دورۂ حیات، رک گئی نبض کائنات
عشق و جنوں کی گرمئی ہمہمہ زا کو کیا ہوا
نالۂ شب ہے نارسا، آہ سحر ہے بے اثر
میرا خدا کہاں گیا، میرے خدا کو کیا ہوا

غم کے ہاتھوں مرے دل پر جو سماں گزرا ہے
حادثہ ایسا زمانے میں کہاں گزرا ہے
زندگی کا ہے خلاصہ وہی اک لمحۂ شوق
جو تری یاد میں اے جان جہاں گزرا ہے
حال دل غم سے یہ ہے جیسے کسی صحرا میں
ابھی اک قافلۂ نوحہ گراں گزرا ہے
بزم دوشیں کو کرو یاد کہ اُس کا ہر رند
رونق بارگہ پیر مغاں گزرا ہے
پا بہ گل جو تھے وہ آزاد نظر آتے ہیں
شاید اس راہ سے وہ سرو رواں گزرا ہے
اے اجل جلد کرم کر کہ تری فرقت میں
مجھ پہ جو لمحہ بھی گزرا ہے گراں گزرا ہے
نگرانئی دل و دیدہ ہوئی ہے دشوار
کوئی جب سے مری جانب نگراں گزرا ہے

حال دل سن کے وہ آزردہ ہیں، شاید اُن کو
اس حکایت پہ شکایت کا گماں گزرا ہے
وہ گل افشانئی گفتار کا پیکر ''سالک''
آج کوچے سے ترے اشک فشاں گزرا ہے

نہ محتسب کی نہ حور و جناں کی بات کرو
مئے کہن کی نگار جواں کی بات کرو
کسی کی تابش رخسار کا کہو قصہ
کسی کے گیسوئے عنبر فشاں کی بات کرو
ضیا ہے شاہد و شمع و شراب سے اس کی
فروغ محفل روحانیاں کی بات کرو
جو مدعا ہو کسی قبلۂ مراد کا ذکر
تو آستانۂ پیر مغاں کی بات کرو
نہیں ہوا جو طلوع آفتاب تو فی الحال
قمر کی بات کرو کہکشاں کی بات کرو
رہیگا مشغلۂ یاد رفتگاں کب تک
چمن کی فکر کرو آشیاں کی بات کرو
اب اس چمن میں نہ صیاد ہے نہ گلچیں ہے
کرو تو اب ستم باغباں کی بات کرو
خدا کے ذکر کا موقع نہیں یہاں ''سالک''
دیار ہند میں حسن بتاں کی بات کرو[1]

مرے دل میں ہے کہ پوچھوں کبھی مرشد مغاں سے
کہ ملا جہال ساقی کو یہ طنطنہ کہاں سے
وہ یہ کہہ رہے ہیں ہم کو ترے حال کی خبر کیا
تو اُٹھا سکا نگاہیں نہ بتا سکا زباں سے
جو اُنھیں وفا کی سوجھی تو نہ زیست نے وفا کی
ابھی آ کے وہ نہ بیٹھے کہ ہم اُٹھ گئے جہاں سے

---

[1] مشاعرہ دھلی میں پڑھی گئی

بچے بجلیوں کی زد سے وہی طائران دانا
جو کڑک چمک سے پہلے نکل آئے آشیاں سے
شب غم جو آئی ''سالک'' مٹے باطنی اندھیرے
مرا دل ہوا منور تب و تاب جاوداں سے

نہ تھی امید نہ وعدے پہ اعتبار کیا
غضب ہے پھر بھی ترا ہم نے انتظار کیا
اٹھا دے اب تو نقاب اے عروس آزادی
ہزار سال ترا ہم نے انتظار کیا
شفق نے پھول بکھیرے خزاں کی وادی میں
سحر نے دامن مشرق کو لالہ زار کیا
چھپا رکھا تھا جسے محتسب نے پردوں میں
وہ راز بزم میں رندوں نے آشکار کیا

پلا وہ بادہ کہ سرخوش زمانہ ہو جائے
کشا کشِ غم ہستی فسانہ ہو جائے
قبول پیر مغاں مطمح نظر ہے یہی
جہان خراب شراب مغانہ ہو جائے
بس اب تباہئی زنداں پہ منحصر ہے قرار
قفس کو آگ لگے آشیانہ ہو جائے
خدنگ ناز کی لذت بتاؤں کیا واعظ
خدا کرے کہیں تو بھی نشانہ ہو جائے
اسی لئے کٹے جاتے ہیں پا بگل آزاد
مزاج سرو خرام آشنا نہ ہو جائے
نہ آئیں وہ تو قضا ہی کرم کرے ''سالک''
غم فراق اجل کا بہانہ ہو جائے

ہم نہیں ہوں گے

چراغ زندگی ہوگا فروزاں ہم نہیں ہوں گے
چمن میں آئے گی فصل بہاراں ہم نہیں ہوں گے

جوانو ! اب تمہارے ہاتھ میں تقدیر عالم ہے
تمہیں ہو گے فروغ بزم امکاں ہم نہیں ہوں گے
جئیں گے جو وہ دیکھیں گے بہاریں زلف جاناں کی
سنوارے جائیں گے گیسوئے دوراں ہم نہیں ہوں گے
ہمارے ڈوبنے کے بعد ابھریں گے نئے تارے
جبین دھر پر چھٹکے گی افشاں ہم نہیں ہوں گے
نہ تھا اپنی ہی قسمت میں طلوع مہر کا جلوہ
سحر ہو جائے گی شام غریباں ہم نہیں ہوں گے
ہمارے دور میں ڈالیں خرد نے الجھنیں لاکھوں
جنوں کی مشکلیں جب ہوں گی آساں ہم نہیں ہوں گے
کبھی ہم کو دکھا دو اک کرن ہی ٹمٹماتی سی
کہ جس دن جگمگائے گا شبستاں ہم نہیں ہوں گے
ہمارے بعد ہی خون شہیداں رنگ لائے گا
یہی سرخی بنے گی زیب عنواں ہم نہیں ہوں گے

میسر جس سے آ جاتی تھی ساقی کی قدمبوسی
مقدر میں نہیں وہ لغزش مستانہ برسوں سے
تجھے کچھ عشق و الفت کے سوا بھی یاد ہے اے دل
سنائے جا رہا ہے ایک ہی افسانہ برسوں سے

میرے دل کی ہر تمنا ان نگاہوں پر نثار
جو نگاہیں میرے شکووں پر پشیماں ہو گئیں
غیر کے لب پر تبسم ، او وفا نا آشنا
بزم میں تیری نگاہیں کتنی ارزاں ہو گئیں
شکوۂ صیاد و گلچیں کیا ، حقیقت تو یہ ہے
چند کلیاں وجہ تاراج گلستاں ہو گئیں

منظومات

مجاهد و شهید

تمہیں سے اے مجاهدو جہان کا ثبات ہے
شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے
تمہاری مشعل وفا فروغ شش جہات ہے
تمہاری ضو سے پُر ضیا جبین کائنات ہے
کواکب بقا ہو تم ' جہاں اندھیری رات ہے

یہ نکتہ بے نظیر ہے معارف و نکات میں
کہ فرق ہے تمہاری اور عوام کی ممات میں
تمہارا امتیاز ہے دوام میں ' ثبات میں
جدا ہو کائنات سے تو محو اُس کی ذات میں
بقا ہے جس کی ذات کو وہ اک خدا کی ذات ہے

مجاهدوں کے بازوئے فلک فگن عجیب ہیں
بہادروں کے پنجہ ہائے تیغ زن عجیب ہیں
یہ چشم ہائے خونچکان و بے کفن عجیب ہیں
مجاهدو ! شہید کے یہ بانکپن عجیب ہیں
حیات بھی حیات ہے ' تو موت بھی حیات ہے

زکوٰۃ دے اگر کوئی زیادہ ہو تونگری
بکھیر دے اناج اگر تو فصل ہو ہری بھری
چھٹیں جو چند ڈالیاں نمو ہو نخل تاک کی
کٹیں جو چند گردنیں تو قوم کی ہو زندگی
لہو جو ہے شہید کا وہ قوم کی زکات ہے

بلائیں جن کی قوم نے تمہیں وہ شہسوار ہو
تمہیں وہ سرفروش ہو تمہیں وہ جاں نثار ہو
تمہیں دفاع و احترامِ دیں کے ذمہ دار ہو
جو تم نہ ہو تو امن کی بنا نہ اُستوار ہو
تمہاری تیغ ضامن نظام کائنات ہے

مطرب اور شاعر

اک شاہراہ پر کوئی مطرب تھا نے نواز
تھی جس کے سوز دل سے منور صدائے ساز
تھا اس کی نے میں کیف سرود ازل کا رنگ
تھی جلوہ ریز جام حقیقت مئے مجاز
لیکن فغانِ نے کو نہ سنتے تھے راہ گیر
سب کا مذاق نغمہ تھا محروم امتیاز
غالب ہوا تھا ذوق نواہائے درد پر
شور کشا کش حسد و بغض و حرص و آز
مایوس ہو کے مطرب دل خستہ چل دیا
اندوہ میں چھپائے ہوئے اک جہانِ راز

چھیڑا پہنچ کے دور اسی نے نواز نے
سوز نفس سے پھر وہی آہنگ جاں نواز
آزاد ہو کے شورش انبوہ عام سے
گونجی فضا میں نے کی نوائے جگر گداز
بجلی گری جہاں کے متاع ثبات پر
چنگاریاں سی اڑنے لگیں کائنات پر

شاعر کہ جس کے دم سے ہے ہر دم بہشت گوش
خمخانۂ حیات کی گلبانگ نا و نوش
اس کی نگاہ پر ہے عیاں راز کائنات
اس کے دماغ میں ہے خیالات کا خروش
لیکن پیام اس کا سمجھتا نہیں کوئی
سب ہیں ہوا و حرص کی دنیا میں سخت کوش
اس غم سے شیشۂ دل شاعر شکستہ ہے
میخانۂ خیال کی ہیں شورشیں خموش
صحرائے دل میں یاس کی آہیں سموم خیز
دامان غم پہ خون کے آنسو چمن فروش
لیکن ذرا زمانہ گزرنے کی دیر ہے
ہونے کو ہے کشا کش امروز وقف دوش

ہو جائے گا جو قلزم ماضی میں غرق حال
واپس ملے گی بزم جہاں کو متاع ہوش
اُس وقت کہنہ ہوگی مئے صافئی سخن
ہوگا شراب شعر کا ساقی سبو بدوش
نغمہ ہے دلفریب تو بُعد مکاں سے ہے
وابستہ کیف شعر مرورِ زماں سے ہے

تنہائی

(ترجمہ از انگریزی)

ہنسوں تو اہل عالم سب شریک خندہ ہوتے ہیں
جو روؤں تو کوئی ہمدم نہیں جز رنج تنہائی
خوشی میں حصہ لینے کے لئے تیار ہے دنیا
مگر کوئی نہیں سرمایۂ غم کا تمنائی

جو گاؤں تو جواب نغمہ کہساروں سے سنتا ہوں
بھروں آہیں تو رہ جاتی ہیں معدوم فضا ہو کر
صدائے باز گشت آتی ہے سن کر نغمۂ عشرت
مگر نالوں سے کترا جاتی ہے نا آشنا ہو کر

سناتا ہوں خوشی تو مرجع اہل جہاں ہوں میں
مگر مغموم ہوتا ہوں تو سب آنکھیں چراتے ہیں
زمان عیش ہی میں دوست ہیں دنیا کے باشندے
یہ میری داستان درد کب سننے کو آتے ہیں

اگر خوش ہوں تو لاکھوں ہیں مرے احباب شیدائی
جو غم کھاؤں ، غم بے مہرئی یاراں سے مرتا ہوں

مرے شغل مئے گلگوں میں سب شرکت کے خواہاں ہیں
مگر تلخابۂ حسرت کے میخانے میں تنہا ہوں

بچھاؤں خوان نعمت تو بہت نا خوانده مہماں ہیں
نہیں ہے فاقہ مستی میں شریک حال بد کوئی
سخاوت زندگی میں کامیابی کی معاون ہے
مگر ہنگام مُردن کر نہیں سکتا مدد کوئی

بساط محفل عشق و مسرت میں وہ وسعت ہے
کہ طول و عرض میں اس کے سما سکتی ہے اک دنیا
مگر اس تنگنائے غم میں اے دنیا کے باشندو !
گزرتا ہے ہجوم بے کسی میں ہر بشر تنہا

چراغ حسن حسرت

چراغ حسن نام حسرت تخلص ' ۱۹۰۴ء میں ریاست پونچھ (کشمیر) کے ایک چھوٹے سے گاؤں بمیار میں پیدا ہوئے ۔ بچپن میں حسرت صاحب کے نانا جناب حسن نے آپ کو گود لے لیا چنانچہ آپ نے انہیں کے دامن تربیت میں پرورش پائی ۔ فارسی ' عربی اور اردو کی ابتدائی تعلیم آپ نے جناب حسن نیز اپنے والد شیخ بدرالدین صاحب سے حاصل کی پھر پونچھ میں میٹرک کرنے کے بعد لاہور تشریف لے آئے اور ۱۹۲۴ء میں بی ۔ اے کا امتحان پاس کیا ۔ حصول تعلیم کے بعد کچھ دنوں تک مختلف مدارس میں فارسی کے مدرس کی حیثیت سے کام کرتے رہے ۔ لیکن اس پیشہ سے دلی لگاؤ نہ تھا اس لئے کلکتہ جا کر اخبار نویسی شروع کی اور مختلف مقتدر جرائد ''عصر جدید'' ''نئی دنیا'' ''جمہور'' اور ''استقلال'' کے فرائض ادارت انجام دیتے رہے ۔ آخر میں مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار ''پیغام'' میں کام کر رہے تھے کہ ۱۹۲۸ء میں مولانا ظفر علی خاں کلکتہ گئے اور حسرت صاحب کو اپنے ہمراہ لاہور لے آئے ۔ لاہور آ کر حسرت صاحب کا ''زمیندار'' ''انصاف'' ''احسان'' ''احرار'' ''شہباز'' ''شیرازہ'' اور کئی دیگر اخبارات کے اداروں سے تعلق رہا ۔ بعد ازاں آپ نے آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت اختیار کی ۔ ۱۹۳۹ء میں جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو حسرت صاحب ''فوجی اخبار'' کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے ۔ اس ملازمت کے سلسلے میں آپ برما اور ملایا میں بھی رہے ۔ جہاں آپ کو انگریزی صحافت کے مطالعہ کا خوب موقع ملا ۔ فوجی ملازمت سے سبکدوش ہو کر آپ نے روزنامہ ''امروز'' کی زمام ادارت اپنے ہاتھ میں لی ۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر معلوم ہوتی ہے کہ ''امروز'' کا پہلا شمارہ موصوف ہی کی زیر ادارت شائع ہوا تھا ۔ مولانا تقریباً چار برس تک ''امروز'' کے مدیر اعلیٰ رہے ۔ پھر ۱۰ جولائی ۱۹۵۱ء کو یہاں سے مستعفی ہو کر کراچی چلے گئے اور ریڈیو پاکستان کی ملازمت اختیار کر کے قومی پروگرام مرتب کرنے لگے ۔ مگر اس ملازمت سے ان کی طبیعت بہت جلد اکتا گئی اور وہ اس سے الگ ہو گئے ۔ ازاں بعد کچھ مدت آپ نے سلور برڈٹ کمپنی میں کام کیا اور پھر لاہور آ گئے ۔ اس دوران میں آپ کو دل کی شکایت ہو گئی ۔ اگرچہ آپ صاحب فراش ہی رہے تاہم لکھنے پڑھنے کا مشغلہ برابر جاری رہا آخر ۲۶ جون ۱۹۵۵ء کو آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا ۔

حسرت صاحب ایک قادرالکلام شاعر ہونے کے علاوہ فقیدالمثال مزاح نویس اور طنزنگار بھی تھے اور بلا شبہ اُردو ادب میں موصوف کی شہرت اُن کے فکاہی مضامین ہی کی بدولت ہوئی - ''پنجاب کا جغرافیہ'' آپ کے فکاہی رجحان کا نقش اولین ہے - اس کے علاوہ آپ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے ''مردم دیدہ'' ''دو ڈاکٹر'' ''کیلے کا چھلکا'' ''پربت کی بیٹی'' اور ''زر نیخ'' کے خطوط خاص طور پر قابل ذکر ہیں - لیکن ان نثری کاوشوں سے قطع نظر جہاں تک حسرت صاحب کی شاعری کا تعلق ہے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اُنہیں یہ ذوق ورثہ میں ملا ہے - اور اُن کے نانا جناب حسن جیسے بلند پایہ شاعر کا فیضان صحبت ہے کہ اُن میں اُردو شعر و ادب سے غائت دلچسپی پیدا ہوئی - یوں حسرت صاحب کو کسی سے شرف تلمذ حاصل نہیں مگر ایک زمانہ میں آپ نے شاد عظیم آبادی مرحوم کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہونے کی خواہش کی تھی جو شاد صاحب اس بنا پر قبول نہ کر سکے کہ وہ بیچارے اُس وقت سماعت و بصارت دونوں سے محروم ہو چکے تھے -

حسرت صاحب نے نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں سے کچھ بچوں اور عورتوں کے لئے اور کچھ سیاسی ہیں لیکن در حقیقت غزل کی طرف اُن کا میلان زیادہ ہے - اور اس میں شک نہیں کہ اُن کے تغزل میں ہماری کلاسیکی شاعری کا پورا رچاؤ اور ایک اُستادانہ شان پائی جاتی ہے - یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی صحافتی مصروفیات کی وجہ سے اس طرف پوری توجہ نہ دے سکے تاہم اُنہوں نے جو کچھ بھی تھوڑا بہت کہا ہے اُس میں حسن کی تمام رعنائی اور عشق کی ساری گرمی و شدت موجود ہے - اُن کے یہاں تصوف یا تفلسف یا الفاظ کی بازی گری کے بجائے واردات قلبیہ کا بیان ایسی شگفتگی ، لطافت اور سادگی کے ساتھ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا - اُن کے اسلوب میں جگر کی سی تیزی ، تندی اور سر مستی تو نہیں ہے لیکن ایک ایسی نرمی و مدھم پن اور حسن و سادگی ہے جسے نشتریت کہہ سکتے ہیں - بالخصوص چھوٹی بحروں میں اُنہوں نے بہت ہی بے ساختہ و لطیف شعر کہے ہیں -

حسرت کی شاعری کے بارے میں ایک ضروری بات اور کہنا ہے اور وہ اُن کی زبان ہے - حسرت صاحب کی زبان بڑی صاف و شستہ ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ زبان و محاورہ کی صحت کا خاص خیال رکھتے ہیں - بلکہ اس ضمن میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اُن کے اشعار میں زبان کی چاشنی سے خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے - مگر ان تمام شاعرانہ خصوصیات کے با وصف افسوس ہے کہ اب تک ان کا کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا -

انتخاب کلام

یا رب غم ہجراں میں اتنا تو کیا ہوتا
جو ہاتھ جگر پر ہے وہ دست دعا ہوتا

اک عشق کا غم آفت اور اس پہ یہ دل آفت
یا غم نہ دیا ہوتا یا دل نہ دیا ہوتا
ناکام تمنا دل اس سوچ میں رہتا ہے
یوں ہوتا تو کیا ہوتا یوں ہوتا تو کیا ہوتا
امید تو بندھ جاتی تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے وعدہ تو کیا ہوتا
غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

جب سے تیرا کرم ہے بندہ نواز
سوز ہے سوز اور نہ ساز ہے ساز
میں ہوں اور میری بے پر و بالی
دل ہے اور دل کی جرائت پرواز
حسن کی برہمی معاذاللہ
گیسوؤں کے بکھرنے کا انداز
زلف برہم جھکی ہوئی نظریں
گردن ناز میں کمند نیاز
قد بالا و دامن کوتاہ!
منزل عشق کے نشیب و فراز
اللہ اللہ فسون نغمۂ عشق
سارا عالم ہے گوش بر آواز
قطع ہونے لگا ہے رشتۂ زیست
اے غم یار تیری عمر دراز!

اس طرح کر گیا دل کو مرے ویراں کوئی
نہ تمنا کوئی باقی ہے نہ ارماں کوئی
ہر کلی میں ہے ترے حسن دل آرا کی نمود
اب کے دامن ہی بچے گا نہ گریباں کوئی
مے چکاں لب ، نظر آوارہ ، نگاہیں گستاخ
یوں مرے پہلو سے اٹھا ہے غزل خواں کوئی
زلف برہم ہے ، دل آشفتہ ، صبا آوارہ
خواب ہستی سا نہیں خواب پریشاں کوئی
نغمۂ درد سے ہو جاتا ہے عالم معمور
اس طرح چھیڑتا ہے تار رگ جاں کوئی

محبت کس قدر یاس آفریں معلوم ہوتی ہے
ترے ہونٹوں کی ہر جنبش نہیں معلوم ہوتی ہے
یہ کس کے آستاں پر مجھ کو ذوق سجدہ لے آیا
کہ آج اپنی جبیں اپنی جبیں معلوم ہوتی ہے
محبت تیرے جلوے کتنے رنگا رنگ جلوے ہیں
کہیں محسوس ہوتی ہے، کہیں معلوم ہوتی ہے
جوانی مٹ گئی لیکن خلش درد محبت کی
جہاں معلوم ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے
امید وصل نے دھوکے دئے ہیں اس قدر حسرت
کہ اس کافر کی ہاں بھی اب نہیں معلوم ہوتی ہے

آؤ حسن یار کی باتیں کریں — زلف کی رخسار کی باتیں کریں
زلف عنبر بار کے قصے سنائیں — طرّۂ طرار کی باتیں کریں
پھول برسائیں بساط عیش پر — روز وصل یار کی باتیں کریں
نقد جاں لے کر چلیں اس بزم میں — مصر کے بازار کی باتیں کریں
ان کے کوچے میں جو گزری ہے کبھی — سایۂ دیوار کی باتیں کریں
آخری ساعت شب رخصت کی ہے
آؤ اب تو پیار کی باتیں کریں

دل بلا سے نثار ہو جائے — آپ کو اعتبار ہو جائے
قہر تو بار بار ہوتا ہے — لطف بھی ایک بار ہو جائے
زندگی چارہ ساز غم نہ سہی — موت ہی غمگسار ہو جائے
یا خزاں جائے اور بہار آئے — یا خزاں ہی بہار ہو جائے
دل یہ مانا کہ اختیار نہیں
اور اگر اختیار ہو جائے

رات کی بات کا مذکور ہی کیا — چھوڑئے، رات گئی بات گئی
اب کے برسات میں بھی پی نہ سکے — ہم یہ روتی ہوئی برسات گئی

آپ کا ذکر بیٹھتے ' اٹھتے   آپ کی یاد جاگتے ' سوتے
عشق نے حسن کو بنایا حسن   ہم نہ ہوتے تو آپ کیا ہوتے

میرے درد عشق کو رسوا کیا   آپ نے جو کچھ کیا اچھا کیا

ڈرتا ہوں کہ اس چشم فسوں ساز کی گردش
احساس تمنا کو تمنا نہ بنا دے

حسرت کو ہے تو آئیں تری بزم ناز میں
کمبخت رو نہ دے کہیں محفل کے سامنے

غم آرزو کو نہ تازہ کر دل بے خبر یہ وہ آگ ہے
جو سلگ اٹھی تو سلگ اٹھی جو دبی رہی تو دبی رہی

حسرت یہ بے خودی ہے کہ اتنی خبر نہیں
ان کی نظر ہے یا ستم روزگار ہے

راہ میں ان سے ملاقات ہوئی   جس سے ڈرتے تھے وہی بات ہوئی

ہماری نا مرادی کا فسانہ   یہ کس کس کو سنایا جا رہا ہے

پھر وہی میں وہی نظر ان کی   دیدۂ و دل کی یاریاں نہ گئیں

روز دیتا ہے مجھے داغ جدائی اے چرخ   کیا تجھے اور کوئی طرز ستم یاد نہیں

دم آخر وہ آ گئے حسرت
موت سے اب کوئی بہانہ کریں

عبداللطیف تپش

شیخ عبداللطیف نام تپش تخلص ۹ ۲ اکتوبر ۱۸۹۵ء کو پیدا ہوئے ۔ آپ لاہور کے ہی رہنے والے تھے ۔ یہیں آپ نے تعلیم و تربیت پائی اور یہیں منشی فاضل اور بی-اے کے امتحانات پاس کرکے ابتداً کچھ عرصہ پنجاب یونیورسٹی میں ملازم رہے ۔ پھر گورنمنٹ کالج پسرور میں السنۂ شرقیہ کے استاد ہوکر چلے گئے ۔ پسرور کے دوران قیام میں تپش صاحب نے تدریسی شغل کے علاوہ اپنے ذاتی مطالعہ کو برابر جاری رکھا چنانچہ کچھ دنوں بعد آپ نے ایم - اے (فارسی) کا امتحان دیا اور اس امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی کہ پنجاب یونیورسٹی میں اول آئے ۔ پسرور کالج میں چند سال کام کرنے کے بعد آپ ایمرسن کالج ملتان میں السنۂ شرقیہ کے لکچرر مقرر ہو گئے اور عرصہ دراز تک اپنے عہدے کے فرائض نہایت مستعدی و خلوص کے ساتھ انجام دیتے رہے ۔ افسوس کہ موصوف کی عمر نے وفا نہ کی اور ابھی جوان ہی تھے کہ غالباً ۱۹۴۲ء میں انتقال کر گئے ۔

تپش مرحوم بڑے زیرک اور ملنسار انسان تھے اور چونکہ بڑے شائستہ مذاق اور شستہ ادبی ذوق کے حامل تھے اس لئے کالج نیز حلقۂ احباب میں نہایت ہر دلعزیز تھے ۔ شعروشاعری کے ساتھ بچپن سے ہی لگاؤ تھا ۔ خوش قسمتی سے موصوف کو سر عبدالقادر مرحوم کی دامادی کا شرف حاصل ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے شاعرانہ ذوق کی بہت جلد اصلاح و ترقی ہو گئی لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ باوجودیکہ تپش صاحب نے شیخ عبدلقادر مرحوم کی صحبتوں سے فیض اُٹھایا لیکن نظم گوئی کی طرف اُن کی طبیعت مائل نہ ہوئی اور وہ قدیم رنگ تغزل ہی کے دلدادہ رہے ۔ اُنہوں نے اُس زمانے میں غزل کی شمع روشن رکھی جب باد مخالف کے جھونکے اُسے ہمیشہ کے لئے گل کر دینے پر تلے ہوئے تھے ۔ شروع میں تپش صاحب پر گوئی کے شائق تھے مگر کثرت مشق اور پختہ گوئی کا یہ اثر ہوا کہ گاہے گاہے شعر کہنے لگے چنانچہ جہاں ملک کے بہت سے ادبی رسائل آپ کے اشعار سے متمتع ہوتے تھے آخر عمر میں ''معارف'' یا اسی معیار کے دو ایک اور رسائل میں آپ کا کلام چھپا کرتا تھا ۔

حضرت تپش کا کلام اُردو غزل کی روایتی تہذیب و شائستگی کا اچھا نمونہ ہے ۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اساتذہ کے کلام کا اُنہوں نے بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا ۔ یہی وجہ ہے اُن کے اسلوب میں پختگی و دلنشینی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ۔

ساتھ ھی زبان و بیان پر انھیں ایسی قدرت حاصل ھے کہ وہ اپنے عشقیہ جذبات نیز دیگر مسائل زندگی کو بڑے سادہ اور دلکش پیرائے میں بیان کر دیتے ھیں ۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کے کلام میں کوئی منفرد ، مخصوص اور مختص تجربہ کار فرما نظر نہیں آتا اور نہ ھی وہ انوکھا پن ھے جو تھوڑی دیر کے لئے ھمیں بے خود کر دے یا وہ جادو ھے جو ھمیں کسی دوسری دنیا میں لا کھڑا کرے مگر اس کے باوجود اُن کے یہاں ایک ایسی سادگی و دلکشی ھے کہ پڑھنے والا اُن کے اشعار سے متاثر ضرور ھوتا ھے ۔ اس تاثر کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ھے کہ موصوف کے تغزل میں یاس کا پہلو ھے جس نے اُن کے اشعار میں درد و کرب کی ھلکی سی کسک پیدا کر دی ھے ۔

حضرت تپش کے تغزل کی ایک خصوصیت یہ بھی ھے کہ اُن کی غزلیات حسن و عشق کی اتنی کہانی نہیں جتنی ایک حساس اور درد مند دل کی کہانی ھیں ۔ چونکہ انھیں بات کہنے کا سلیقہ آتا ھے اس لئے اُن کی کہانی میں ایک تاثیر اور دل کو لبھانے والی کیفیت بھی پیدا ھو گئی ھے اور وہ گرمی بھی ، جس کے بغیر فنکار کے نقوش پھیکے و بے کیف معلوم ھوتے ھیں ۔ اُن کی غزلوں میں کہیں کہیں تیکھی اور جاندار تراکیب کا استعمال بھی ھے جو کلام غالب کے مطالعہ کا نتیجہ معلوم ھوتا ھے ۔

غرض تپش مرحوم پنجاب کے خوش فکر متغزلین میں سے تھے اور اُن کے کلام میں ایسی پختگی و اُستادانہ شان پائی جاتی ھے کہ غزل کے باب میں انھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا ۔ افسوس کہ مرحوم کا مجموعہ کلام اب تک شایع نہیں ھو سکا ۔ کاش اس معاملے میں مرحوم کے صاحبزادے ابو ظفر حنیف صاحب لکچرار چیفس کالج لاھور تھوڑی سی سعی فرماتے تاکہ یہ منتشر کلام کتابی صورت میں یکجا ھو جاتا ۔

انتخاب کلام

موت آتی نہیں قرینے کی
یہ سزا مل رھی ھے جینے کی

مے سے پرھیز شیخ توبہ کرو
اک یہی چیز تو ھے پینے کی

تمہیں کہتا ھے آئینہ خودبیں
باتیں سنتے ھو اس کمینے کی

ھو گیا جب سے بے نقاب کوئی
شمع روشن نہ پھر کسی نے کی

چشم تر آبرو تو پیدا کر
یوں نہیں بجھتی آگ سینے کی

اھل دنیا سے کیا بدی کا گلہ
اے تپش تو نے کس سے نیکی کی

جان آنکھوں میں رھی جی سے گزرنے نہ دیا
اچھی دیدار کی حسرت تھی کہ مرنے نہ دیا

کیا قیامت ہے ستم گار! بھری محفل میں
دل چرا کر ، تری دزدیدہ نظر نے نہ دیا
مدتوں کش مکش یاس و تمنا میں رہے
غم نے جینے نہ دیا ، شوق نے مرنے نہ دیا
ناخدا نے مجھے دلدل میں پھنسائے رکھا
ڈوب مرنے نہ دیا ، پار اترنے نہ دیا
کوئی تو بات ہے جو غیر کے آگے اس نے
شکوہ کیسا کہ مجھے شکر بھی کرنے نہ دیا
خاک آرام کی خواہش ہو وطن سے باہر
جب ہمیں چین ''تپش'' اپنے ہی گھر نے نہ دیا

سر پھوڑتا ہے قطع رہ عشق کے لئے
یہ کس بلا کا شوق دل کوہکن میں ہے
اندیشۂ شکستِ دل و سر بجیب شوق
اب کون سی کسر مرے دیوانہ پن میں ہے
پھر مدعی ہدف ہوا ناوک نظر
پھر اک خلش نئی مرے زخم کہن میں ہے
دلسوزیاں کلام میں ہیں میرے اے ''تپش''
گویا زبان سوختہ میرے دہن میں ہے

اپنا بھی امتحان کر قاتل — تیغ کیوں آزمائے جاتا ہے
جس قدر وہ بگڑتے ہیں ، یہ دل — مجھ سے باتیں بنائے جاتا ہے
آن کی محفل میں دیکھتے ہو ''تپش'' — رنگ اپنا جمائے جاتا ہے

میری بے قدری نہ کر اے کج نظر — دور کی بھیجی ہوئی سوغات ہوں
انتشار طبع کیا کہئے ''تپش'' — مدتوں سے مورد آفات ہوں

بہار گل ، ہوائے آشیاں ، نغمات آزادی
یہ افسانے ہیں سب بلبل کے زیر دام آنے تک

نہ دی اشکوں نے مشت خاک کو پرواز کی رخصت
تمہارے نقش پا کا میرے سر الزام آنے تک
تمہاری خود نمائی اللہ اللہ اک تماشا ہے
تصور دل میں رہتا ہے زباں پر نام آنے تک
لب خاموش کا اپنے تحیّر ہم بھی دیکھیں گے
ترے دل میں خیال لذت دشنام آنے تک

شوق ستم ظریفئی احباب دیکھنا
رو داد عشق کو مری افسانہ کر دیا
اللہ رے نمائش انداز دلفریب
بیگانہ ہو گئے کبھی بیگانہ کر دیا
دیکھی جو بے نیازئی سنگ حرم ''تپش''
سر کو رھین سجدۂ بت خانہ کر دیا

کر گئے کام ولولے دل کے
قیس ہے ساتھ ساتھ محمل کے
کس قدر تند تھی شراب عشق
ہو گئے ٹکڑے شیشۂ دل کے
کیوں نہ بھٹکیں مسافران عدم
پھیر میں آ گئے ہیں منزل کے
گل کھلاتی رھی چمن میں بہار
زخم جب تک ھرے رہے دل کے
اللہ اللہ رے خمار ستم !
لڑکھڑاتے ہیں پاؤں قاتل کے
چھُٹ گیا دامن امید ''تپش''
رہ گئے خالی ہاتھ سائل کے

جان دینا مرا ھنسی ھی سہی
دل لگی ہے تو دل لگی ھی سہی
کل تو رونا پڑیگا ھنس لو آج
عشق کی ابتد ھنسی ھی سہی
لطف ابر بہار تم دیکھو
دیدۂ تر ' نمائشی ھی سہی
آزمائش ہے ظرف واعظ کی
میرے حصے میں کچھ کمی ھی سہی
نہ بجھاؤ مرا چراغ وفا
رونق بزم مدعی ھی سہی

سو بندشیں تھیں رنگ پریدہ کے واسطے
یہ جانتا اگر کہ حنا کو تلاش ہے
پھرتی ہے پیچھے پیچھے اجل ' اف ری زندگی !
ملتا نہیں ہے درد ' دوا کو تلاش ہے

جو بے نیاز صدمہ مضراب ہو چکا
اس ساز بے صدا کی نوا کو تلاش ہے
کیوں زلف ناز صبح سے بل کھا رہی ہے آج
کیا جانے کس کی شام بلا کو تلاش ہے
اے خار مژدہ باد کہ ابھرے پھر آبلے
شاد اے خلش کہ پھر کف پا کو تلاش ہے
نا آشنائے عالم ذرات ہے "تپش"
وہ مشت خاک جس کی صبا کو تلاش ہے

نہ جاگی آج تک تقدیر دیکھا چاہئے کیا ہو
مرے اس خواب کی تعبیر دیکھا چاہئے کیا ہو
ہوا جاتا ہے خالی یہ نشیمن بھی تصور کا
پریدہ رنگ ہے تصویر ' دیکھا چاہئے کیا ہو
ابھی آغاز ہے ' بگڑا ہے نقشہ بزم ہستی کا
ابھی نالوں میں ہے تاثیر ' دیکھا چاہئے کیا ہو
ہزاروں نقش پا سجدہ طلب اور بے نشاں منزل
ترا انجام اے رہگیر ! دیکھا چاہئے کیا ہو
ابھی کن مشکلوں سے بل نکالے تھے مقدر کے
کیا پھر زلف کو زنجیر ' دیکھا چاہئے کیا ہو
"تپش" تقدیر کا لکھا نہیں مٹتا نہیں مٹتا
نہیں بنتی کوئی تدبیر ' دیکھا چاہئے کیا ہو

دنیا میں پھر آغاز ہے کافر منشی کا — اچھا ہے کہ پھر کعبہ کو بتخانہ بنا دے
اک حرف تمنا ہے سنا دوں تجھے قاصد — ایسا تو نہیں بات کو افسانہ بنا دے
پھر توبہ کے ٹکڑوں پہ گزر ہے مری ساقی — پھر مجھ کو گدائے در میخانہ بنا دے

خجل ہے طائر رنگ پریدۂ ہستی — رہا قفس ہی سلامت ' نہ آشیانہ ملا
ہوائے جنبش دامن کا ذکر کیوں چھیڑا — چراغ عمر کو گُل ہونے کا بہانہ ملا
غضب تھا پردۂ خود داری حرم اٹھنا — ہوئی یہ خیر کہ بتخانے میں خدا نہ ملا

کہیں واعظ بھک آیا نہ ہو مسجد کے دھوکے میں
کوئی کھڑکا رہا ہے دیکھنا زنجیرِ میخانہ

نعرۂ مستانہ

مقام بے خودی میں دورِ دوراں کا کسے غم ہے
وہ دنیا اور دنیا ہے وہ عالم اور عالم ہے

نہ پوچھو منزلت ہم بادہ مستانِ محبت کی
کہ اک پٹکا ہوا ساغر ہمارا ساغر جم ہے

نرالا ہے سرور اپنا، انوکھا ہے خمار اپنا
سوا ہے اس قدر ہی کیف مستی جس قدر کم ہے

ازل کہتے ہیں جس کو سر بسر ایوان خمیازہ
ابد ہے نام جس کا ایک کیفیت کا عالم ہے

حیات و موت دو موجیں ہیں اپنے ساغر مے کی
عدم ہے بیخودی، ہستی خودی کا اپنی اک رَم ہے

فنا کیسی، بقا کس کی، کہاں کا عالم برزخ
وہ ھاو ھوئے مستانہ، یہ بد مستی کا عالم ہے

وہ اک پھوٹا ہوا ساخُم ہے جس کو گور کہتے ہیں
تماشا گاہ محشر ایک شور خیر مقدم ہے

بہار ہشت جنت چار دھبے اپنے دامن کے
شراب آتشیں کا اک دھواں نارِ جہنم ہے

کہاں کا دیر، کعبہ کیا، وہاں بھی ہم، یہاں بھی ہم
جسے خمخانہ سب سمجھے ہوئے ہیں چاہ زمزم ہے

نہ ساقی سے جدا ہم ہیں نہ ہم سے ہے جدا ساقی
ہوئے فانی تو پھر باقی کہاں تفریق باہم ہے

سرور جام ساقی نے بنایا ایسا متوالا
خوشی کی ہے خوشی باقی نہ غم کا اب کوئی غم ہے

ہمیں سے دونوں عالم ہیں ہمیں ہیں دونوں عالم میں
سوا و ما سوا جو کچھ تپش ہے ہم میں منضم ہے

مرقع شوق

عالم دل ہے نور دیدۂ شوق
میری ہستی ہے آفریدۂ شوق

مدعائے نظر ہے حسن نظر
ہمہ تن بن گیا ہوں دیدۂ شوق

ہو گئی کل امید جذب فنا
مٹ گیا دل کا سب عقیدۂ شوق

آہوئے دشت قیس کی ہے تلاش
دیدۂ شوق ہیں رمیدۂ شوق

غنچہ دل سے باز پرس نہ کر
اے نسیم وفا وزیدۂ شوق

تار دامن ہوئے گریباں گیر
مدد اے دست نا رسیدۂ شوق

چشم پوشی کی ہے طلب یعنی
پیرہن ہوں مگر وریدۂ شوق

ہے تمنائی نیازِ جبیں
سرِ راہ وفا خمیدۂ شوق

ننگ صحرائے بے خودی ہوں میں
میرا ہر ذرہ ہے کبیدۂ شوق

چشم اشک آفریں کو کیا کہئے
جام لبریز ہے دمیدۂ شوق

نہ کھلی چشم منتظر نہ کھلی
مرحبا جاں بلب رسیدۂ شوق

خوف کیا اب شکستہ رنگی کا
صورت حال ہے کشیدۂ شوق

ہائے کیوں کر ہو اعتبار خیال
مدعا اور برگزیدۂ شوق

ہے غزل میں ''تپش'' شباب کا رنگ
لکھ رہا ہوں ابھی عقیدۂ شوق

اختر شیرانی

محمد داؤد خاں نام ۔ اختر تخلص ۴ مئی ۱۹۰۵ء میں ریاست ٹونک (راجپوتانہ) میں پیدا ہوئے ۔ بزرگ صوبہ سرحد سے آئے تھے ۔ دادا مولوی محمد اسماعیل خاں ٹونک کے نواب محمد علی خاں کے مختار تھے ۔ اختر شیرانی کے والد پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی علمی و ادبی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ۔

اختر شیرانی کی ابتدائی تعلیم ٹونک میں ہوئی ۔ جہاں پندرہ برس کے سن تک انہوں نے اُردو فارسی کی کچھ کتابیں پڑھیں اور خطاطی میں مشق و مہارت حاصل کی ۔ اختر کے والد پروفیسر محمود شیرانی ان دنوں اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسر تھے ۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنی نگرانی میں اختر کی تعلیم و تربیت کی جائے ۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں انہوں نے اختر کو لاہور بلا لیا اور اورینٹل کالج میں داخل کرا دیا ۔ اختر نے ۱۹۲۱ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا ۔ اب ان کے والد مرحوم نے ان کو میٹرک کے امتحان کی تیاری شروع کرا دی ۔ لیکن ان کے میلان طبع اور ماحول نے شفیق باپ کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دی اور امتحان سے چند ماہ قبل ہی اختر لاہور سے فرار ہو گئے ۔

لاہور کے مختصر دوران قیام میں ہی اختر کی شعر و شاعری کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور وہ اپنی چند غزلیں علامہ تاجور نجیب آبادی کو جو اُس وقت مخزن کے ایڈیٹر تھے، دکھا چکے تھے ۔ چنانچہ امتحان سے روگردانی کر کے ، کچھ دن کے بعد اختر لاہور واپس آگئے اور شعر و شاعری اُن کا مستقل مشغلہ بن گیا ۔ ساتھ ہی وہ مختلف رسائل کے لئے مضامین بھی لکھنے لگے ۔ اس کے بعد اُنہوں نے رسائل کی ادارت کا کام سنبھالنا شروع کیا ۔ سب سے پہلے وہ چند ماہ کے لئے ''ھمایوں'' کے مدیر رہے پھر چند ماہ ''انتخاب'' کی ادارت کی ۔ ۱۹۲۸ء میں اختر شیرانی نے اپنا ایک پرچہ ''خیالستان'' نکالا مگر وہ کارکنان کی بد دیانتی کی نذر ہو گیا ۔ ۱۹۳۱ء میں اُنہوں نے دوسرا پرچہ ''رومان'' جاری کیا لیکن اُس کا حشر بھی ''خیالستان'' کا سا ہوا ۔ ۱۹۳۱ء میں ''شاھکار'' کی ادارت سنبھالی مگر بعض وجوہ کی بنا پر اُنھیں خود اُس سے علیحدہ ہونا پڑا ۔ غرض اس مشغلہ میں اختر شیرانی گو اپنی شرافت ، نیک نیتی اور سادہ لوحی کے باعث کامیاب نہ ہو سکے مگر ادبی حلقوں میں نہ صرف روشناس ہو گئے بلکہ لوگوں کے دلوں پر اُن کے زور قلم کا سکہ بھی بیٹھ گیا ۔

اختر شیرانی کی نثری کاوشوں سے قطع نظر نظم کے حسب ذیل مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۔

(۱) پھولوں کے گیت --- بچوں کے لئے نظمیں
(۲) نغمۂ حرم — خواتین کے لئے نظمیں
(۳) صبح بہار — نظموں کا پہلا مجموعہ
(۴) اختر ستان — نظموں کا دوسرا مجموعہ
(۵) لالۂ طور — نظموں کا تیسرا مجموعہ
(۶) طیور آوارہ — غزلوں اور گیتوں کا مجموعہ
(۷) شہناز — غزلوں اور نظموں کا مجموعہ
(۸) شہرود — باقیات اختر کا مجموعہ جو اُن کے انتقال کے بعد بیگم اختر شیرانی نے شائع کرایا ۔

اختر شیرانی فطری طور پر بڑے خوش اخلاق ' ملنسار اور مستغنی‌الطبع واقع ہوئے تھے اور شروع ہی سے بڑے دوستدار اور دوست نواز ' مگر افسوس کہ کثرت احباب کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُنہیں ہر برے بھلے سے نباھنا پڑی اور بہت سے شرابی کبابی اور عامی و جاھل دوست ان کے گرد جمع رھنے لگے ایسی ہی صحبتوں میں اختر شیرانی نے اپنی علمی و فنی صلاحیتوں میں گھن بھی لگایا اور شراب نوشی کا مہلک چسکا بھی پڑا ۔ اختر کی شراب نوشی نے آھستہ آھستہ خطرناک صورت اختیار کرنا شروع کی ' پروفیسر شیرانی نے صرف ایک اس کمی کے باعث اُن سے قطع تعلق کر لیا مگر اس کے باوجود اختر شیرانی شراب ترک نہ کر سکے حتیٰ کہ ۱۹۴۸ء میں اُردو کا یہ ہونہار شاعر ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا ۔

اختر شیرانی کے کلام پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ھے کہ اُن کی شاعری فلسفہ و تصوف کی بجائے حسن مجازی کے لطیف جذبات اور وجد انگیز غنائت سے معمور ھے ۔ وہ ایک رومانی شاعر ہیں اور اُن کی تمام شعری کائنات پر جوانی چھائی ہوئی ھے ۔ اُن کی شاعری کی روح تغزل ھے ۔ اور وہ اس روح تغزل اور موسیقیت کو اپنی غزلوں ' نظموں اور گیتوں پر پھیلا کر اپنا ایک انفرادی رنگ قائم کرتے ہیں ۔ جن میں ولولہ انگیز ترنم رنگینی ' نزاکت ادا اور جدت تراکیب نے اور بھی جان ڈال دی ھے ۔ اختر کے یہاں ایک عجیب سر مستی ' ایک شدید احساس اور ایک ایسی تیزی و تندی پائی جاتی ھے کہ اُن کی غزلیں اور نظمیں بھی جوان معلوم ہوتی ہیں ۔ قطع نظر اس کے کہ ہمیں اُن کے کلام میں کوئی حیرت انگیز بات نہیں ملتی' تاہم ہمیں اُس کی سیلابی کیفیت کا معترف ہونا پڑتا ھے جو پڑھنے والے کو اپنی رو میں دور تک بہا لے جاتی ھے ۔

اختر شیرانی ایک نوجوان شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نفیس مذاق اور حسن پسند نظر کے مالک تھے ۔ شاید یہی وجہ ھے کہ اُنھوں نے اپنے کلام میں بڑے حسین و دلکش موضوعات کا انتخاب کیا ھے ۔ بنا بریں ''خدائے رقص'' ''اعتراف'' ''ترانہ'' وغیرہ منظومات اپنے انتخاب موضوع کے اعتبار سے بالکل انوکھی نظمیں ہیں ۔ پھر شاعر نے محض موضوع ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بحروں کا انتخاب بھی نئے انداز میں کر کے

ان کی روانی و دلکشی میں اضافہ کر دیا ہے اور خوبی یہ ہے کہ ان نظموں میں معنویت و مفہوم خوش آہنگی پر کہیں قربان نہیں ہونے پاتا ۔ جہاں تک اسلوب بیان کا تعلق ہے اختر کو نہ صرف زبان پر قدرت حاصل ہے بلکہ اُنکے انتخاب الفاظ ، تراکیب، تشبیہات و استعارات میں اکثر جدت و خوش آہنگی بھی پائی جاتی ہے اور واضح معنویت بھی ۔ یوں اُن کی بہت سی غزلیں آپ کو بالکل سپاٹ بھی ملینگی جن میں کوئی نیا تخیل نہیں ، نہ کوئی نئی بات پیش کی گئی ہے مگر اُن میں بھی آپ کو بلا وجہ کی پیچیدگی اور اُلجھاؤ یا الفاظ کا خواہ مخواہ الٹ پھیر نہیں ملے گا ۔

اختر شیرانی نے اپنی انھیں خصوصیات کلام کی بدولت کم عمری میں پختہ کاروں کا رنگ اختیار کر لیا تھا اور اُن سے بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں لیکن افسوس کہ حالات نے اُنھیں فنی یا ارتقائی حیثیت سے زیادہ آگے نہ بڑھنے دیا اور نہ ھی عمر نے وفا کی ۔

انتخاب کلام

تغزل

وعدہ ، اُس ماہرو کے آنے کا — یہ نصیبہ ! سیاہ خانے کا
ذرے ذرے میں بے حجاب ہیں وہ — جن کو دعویٰ ہے منہ چھپانے کا
حاصل عمر ہے شباب ، مگر — اک یہی وقت ہے گنوانے کا
اُس کی بدلی ہوئی نظر ، توبہ ! — یوں بدلتا ہے رخ زمانے کا

کر دیا خوگر ستم ''اختر''
ہم پہ احسان ہے زمانے کا

ہے جام خالی تو پھیکی ہے چاندنی کیسی — یہ سیل نور ستم ہے شراب ہو نہ سکا

اللہ اللہ تری آنکھوں کا چھلکتا ہوا کیف — جیسے مستی میں اُلٹ دے کوئی پیمانے چند
آج یاد آ گئے بھولے ہوئے افسانے چند — چٹکیاں لینے لگا دل میں نشاط طفلی

گلزار جہاں میں گل کی طرح ، گو شاد ہیں ہم شاداب ہیں ہم
کہتی ہے یہ ہنس کر صبح خزاں ، سب ناز عبث اک خواب ہیں ہم

دو دن کے لئے ہم آئے ہیں ، اک شب کی جوانی لائے ہیں
فردوس سرائے ہستی میں ، ہم رنگ گل مہتاب ہیں ہم

ادائے پردہ کتنی دل نشیں معلوم ہوتی ہے
پس پردہ کوئی ناز آفریں معلوم ہوتی ہے
یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزم ہستی کو
کہ جو شے ہے نگاہوں کو حسیں معلوم ہوتی ہے
کسی کا عشق آ پہنچا ہے رسوائی کی منزل تک
نگاہ شوخ ! اب کچھ شرمگیں معلوم ہوتی ہے

مجھے میخانہ تھراتا ہوا محسوس ہوتا ہے
وہ میرے سامنے اٹھلا کے جب پیمانہ رکھتے ہیں
جوانی بھی تو اک موج شراب تند و رنگیں ہے
برا کیا ہے اگر ہم مشرب رندانہ رکھتے ہیں

چمن کی ہر کلی سے نور کی مستی جھلکتی ہے
در و دیوار سے مہتاب کی شوخی جھلکتی ہے

ہیں بحر سے سے بہم ، میکدے میں شام و سحر
کہ ماهتاب قدح ، آفتاب ہے ساقی

خدائی کہکشاں کہتی ہے جس کو
وہ سلمیٰ کا خرام رائیگاں ہے

ہے نشاط لالہ و گل میں کیا ، ہے بہار سرو سمن میں کیا
مجھے کب دماغ ہے سیر کا ، میں کروں گا جا کے چمن میں کیا ؟
مرا واسطہ ہے خطا سے کیا ، مرا کام باغ ختن میں کیا ؟
وہ شمیم روح فزا نہیں ترے گیسوؤں کی شکن میں کیا ؟

همہ فتنہ و همہ فتنہ گر ، همہ تیرہ دل ، همہ خیرہ سر
ہے یہ حال اهل وطن اگر ، تو کرینگے جا کے وطن میں کیا ؟
وہ سواد رنگ و نظر نہیں ، وہ فضائے شام و سحر نہیں
وہ بہار باغ و شجر نہیں تو ہے لطف سیر چمن میں کیا

اے دل وہ عاشقی کے فسانے کدھر گئے ؟
وہ عمر کیا ہوئی ، وہ زمانے کدھر گئے ؟
ویراں ہیں صحن و باغ ، بہاروں کو کیا ہوا
وہ بلبلیں کہاں وہ ترانے کدھر گئے ؟
تھے وہ بھی کیا زمانے کہ رہتے تھے ساتھ ہم
وہ دن کہاں ہیں اب وہ زمانے کدھر گئے ؟
ہے نجد میں سکوت ہواؤں کو کیا ہوا
لیلائیں ہیں خموش دوانے کدھر گئے ؟
صحرا و کوہ سے نہیں اٹھتی صدائے درد
وہ قیس و کوہ کن کے ٹھکانے کدھر گئے ؟
اجڑے پڑے ہیں دشت غزالوں پہ کیا بنی
سونے ہیں کوہسار دوانے کدھر گئے ؟
وہ ہجر میں وصال کی امید کیا ہوئی
وہ رنج میں خوشی کے بہانے کدھر گئے ؟
غیروں سے تو امید وفا پہلے ہی نہ تھی
رونا یہ ہے کہ اپنے یگانے کدھر گئے ؟
دن رات میکدے میں گزرتی تھی زندگی
"اختر" وہ بے خودی کے زمانے کدھر گئے

یہ کون آیا بزم گل و یاسمن میں | کہ شادیاں جاگ اٹھیں چمن میں
ہر اک ذرہ اک آنکھ بن کر ہے مضطر | وہ کب آئیں گے میرے دارالمحن میں
یہ کس نے نگاہ بہاریں سے دیکھا | کہ پھولوں نے انگڑائی سی لی چمن میں
یہ مطلب کا بندہ وہ مطلب کا بندہ | نہیں فرق کچھ شیخ اور برہمن میں
تری یاد باقی ترا غم سلامت | بہلتا نہیں دل کسی انجمن میں
یہ سیمیں بدن اور شفق رنگ عارض | کہ گل ہائے احمر ہیں شاخ سمن میں

چمن کیا جواب اُس چمن وش کو دیگا
بہت فرق ہے گل میں اور گلبدن میں

اٹھو بادہ نوشو ، کریں رقص مستی
وہ آئی بہار ، ابر گونجا چمن میں

وہ جان بہار آج آئے گی ''اختر''
چلو چل کے کلیاں بچھا دیں چمن میں

وہ کہتے ہیں رنجش کی باتیں بھلا دیں
محبت کریں ، خوش رہیں ، مسکرا دیں

غرور اور ہمارا غرور محبت
مہ و مہر کو ان کے در پر جھکا دیں

جوانی ہو گر جاودانی تو یا رب
تری سادہ دنیا کو جنت بنا دیں

شب وصل کی بے خودی چھا رہی ہے
کہو تو ستاروں کی شمعیں بجھا دیں

بہاریں سمٹ آئیں کِھل جائیں کلیاں
جو ہم تم چمن میں کبھی مسکرا دیں

وہ آئیں گے آج اے بہار محبت
ستاروں کے بستر پہ کلیاں بچھا دیں

بناتا ہے منہ تلخئی مے سے زاہد
تجھے باغ رضواں سے کوثر منگا دیں

تم افسانۂ قیس کیا پوچھتے ہو
ادھر آؤ ہم تم کو لیلیٰ بنا دیں

انھیں اپنی صورت پہ یوں ناز کب تھا
مرے عشق رسوا کو ''اختر'' دعا دیں

کون آیا ہے مرے پہلو میں خواب آلودہ
زلف برہم زدہ و چشم حجاب آلودہ

آہ یہ زلف ہے یا ابر سر مے خانہ
آہ یہ آنکھ ہے یا جام شراب آلودہ

کس کے ملبوس سے آتی ہے حنا کی خوشبو
کس کے ہر سانس کی جنبش ہے گلاب آلودہ

کس کو شکوہ ہے مرے عشق سے رسوائی کا
کس کا لہجہ ہے بایں لطف عتاب آلودہ

پھر ہم آغوشی کے موسم نے بکھیرے گیسو
پھر فضائیں نظر آتی ہیں سحاب آلودہ

نہ ساز و مطرب نہ جام و ساقی نہ وہ بہار چمن ہے باقی
نگاہ شمع سحر کے پردے پہ نقشۂ انجمن ہے باقی

بھلا چکی دل سے شام غربت ہر ایک نقشہ ہر ایک صورت
ہماری آنکھوں میں لیکن اب تک فروغ صبح وطن ہے باقی

زمانہ بدلا مٹی جوانی نہ وہ محبت نہ زندگانی
بس ایک بھولی سی یاد ہے جو برنگ داغ کہن ہے باقی

حباب آسا محیط ہستی میں جو ہے مٹنے کو بن رہا ہے
ہے انقلاب اک نمود ایسی جو زیر چرخ کہن ہے باقی
غم زمانہ کی سختیوں سے ہوئی ہے پامال طبع "اختر"
نہ وہ نشاط کہن ہے باقی نہ وہ مذاق سخن ہے باقی

منظومات

تاثرات نغمہ

نظر کے سامنے رقصاں ہیں رنگیں وادیاں گویا !
شراب و شعر میں ڈوبی ہوئی ساری فضائیں ہیں
افق پر موج زن آوارہ خوابوں کی گھٹائیں ہیں
فضا میں بس رہی ہیں نور کی آبادیاں گویا !
خلا میں پرفشاں ہیں خواب کی شہزادیاں گویا !
بہار و کیف سے لبریز مستانہ ہوائیں ہیں ..
اور ان میں منتظر غمگین روحوں کی صدائیں ہیں
مہیا ہیں سکون و ہوش کی بربادیاں گویا !

وہ دنیا ہے جہاں جنت کے نظارے برستے ہیں
شفق کی سطح پر آباد خوابوں کے جزیرے ہیں
ستاروں کے سمندر ماہتابوں کے جزیرے ہیں
بہاریں منظروں میں پھول اور تارے برستے ہیں
فضا ہے مست موج نکہت باد بہاری سے
اور اس پر تیرتا پھرتا ہوں میں بے اختیاری سے

وادیٔ گنگا میں ایک رات

کرتے ہیں مسافر کو محبت سے اشارے
اے وادیٔ گنگا ترے شاداب نظارے
یہ بکھرے ہوئے پھول یہ بکھرے ہوئے تارے
خوشبو سے مہکتے ہوئے دریا کے کنارے

یہ چاندنی رات اور یہ پُر خواب فضائیں
اک موج طرب کی طرح بے تاب فضائیں
سبزے کا ھجوم اور یہ شاداب فضائیں
مہکے ہوئے نظارے ھیں بہکے ہوئے تارے

یہ تارے ھیں یا نور کے مے خانے ھیں آباد
معصوم و حسیں حوروں کے کاشانے ھیں آباد
مستانہ ہواؤں پر پری خانے ھیں آباد
یا دامن افلاک میں بے تاب شرارے

مہتاب ھے یا نور کی خوابیدہ پری ھے
الماس کی صورت ھے کہ مندر میں دھری ھے
مرمر کی صراحی مئے سیمیں سے بھری ھے
اور تیرتی ھے نیل کی موجوں کے سہارے

نیندوں میں ھیں کھوئی ہوئی بے دار ہوائیں
گل زار میں گل ریز گہر بار ہوائیں
یا نور میں ڈوبی ہوئی سرشار ہوائیں
یا بال فشاں مستئ نکہت کے نظارے

صحرا ھیں کہ خوابیدہ نظاروں کے شبستاں
دامن میں لئے چاند ستاروں کے شبستاں
فردوس کی پُر کیف بہاروں کے شبستاں
شاعر کو تمنا ھے یہیں رات گزارے

انتظار (گیت)

اب بھی نہ آئے من کے چین
بیت چلی ھے آدھی رین
نا کوئی ساتھی نا کوئی ساجن نا کوئی میرے پاس سہیلی
برھہ کی لمبی رات گزاروں ڈر کی ماری کیسے اکیلی
نیر بہائیں کب تک نین
اب بھی نہ آئے من کے چین

نظریں جمی ہیں چوکھٹ پر اور کان لگے ہیں آہٹ پر
آنکھوں سے ننھے ننھے سے آنسو بہتے ہیں اک اک کروٹ پر
کرتی ہوں چپکے چپکے بین
اب بھی نہ آئے مورے چین !
بیت چلی ہے آدھی رین !

سلمیٰ

بہارِ حسن کا تو غنچۂ شاداب ہے سلمیٰ
تجھے فطرت نے اپنے دست رنگین سے سنوارا ہے
بہشت رنگ و بو کا تو سراپا اک نظارہ ہے
تری صورت سراسر پیکر مہتاب ہے سلمیٰ
ترا جسم اک ہجوم ریشم و کمخواب ہے سلمیٰ
شبستان جوانی کا تو اک زندہ ستارہ ہے
تو اس دنیا میں بحر حسن فطرت کا کنارہ ہے
تو اس سنسار میں اک آسمانی خواب ہے سلمیٰ

اے عشق کہیں لے چل

اے عشق کہیں لے چل اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہِ عالم سے لعنت گہِ ہستی سے
ان نفس پرستوں سے ' اس نفس پرستی سے
دور اور کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

ہم پریم پجاری ہیں تو پریم کنہیا ہے
تو پریم کنہیا ہے ' یہ پریم کی نیّا ہے
یہ پریم کی نیّا ہے ' تو اس کا کھوّیا ہے
کچھ فکر نہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

بے رحم زمانے کو اب چھوڑ رہے ہیں ہم
بے درد عزیزوں سے منہ موڑ رہے ہیں ہم
جس آس پہ جیتے تھے، اب توڑ رہے ہیں ہم
اب تاب نہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

یہ جبر کدہ آزاد افکار کا دشمن ہے
احرار کا مدفن ہے ابرار کا دشمن ہے
اشرار کا مسکن ہے اخیار کا دشمن ہے
چل یاں سے کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

آنکھوں تلے پھرتی ہے اک خواب نما دنیا
تاروں کی طرح روشن مہتاب نما دنیا
جنت کی سی سر سبز اور شاداب نما دنیا
للّٰہ وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

سنسار کے اُس پار اک اس طرح کی بستی ہو
جو قرنوں سے انساں کی صورت کو ترستی ہو
اور جسکے مناظر پر تنہائی برستی ہو
یوں ہو تو وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

ان چاند ستاروں کے بکھرے ہوئے شہروں میں
ان نور کی کرنوں کی ٹھہری ہوئی لہروں میں
ٹھہری ہوئی لہروں میں، سوئی ہوئی لہروں میں
اے خضر حسیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

ایسی بہشت آئیں وادی میں پہنچ جائیں
جس میں کبھی دنیا کے غم دل کو نہ تڑپائیں
اور جس کی بہاروں میں جینے کے مزے پائیں
لے چل تو وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

رخصت دائمی

قرار چھین لیا بے قرار چھوڑ گئے
بہار لے گئے یاد بہار چھوڑ گئے
ہماری چشم حزیں کا خیال کچھ نہ کیا
وہ عمر بھر کے لئے اشکبار چھوڑ گئے
جسے سمجھتے تھے اپنا وہ اتنی مدت سے
اسی کو آج وہ بیگانہ وار چھوڑ گئے
رگوں میں اک طپش درد کار جاگ اٹھی
دلوں میں اک خلش انتظار چھوڑ گئے
ہوائے شام سے آنے لگی صدائے فغاں
فضائے شوق کو ماتم گسار چھوڑ گئے
نشاط محفل لیل و نہار لوٹ لیا
نصیب میں غم لیل و نہار چھوڑ گئے
گھٹائیں چھائی ہیں ، ساون ہے مینہ برستا ہے
وہ کس سمے میں ہمیں اشکبار چھوڑ گئے
دل حزیں ہے اب اور عہد رفتہ کا ماتم
چمن کے سینے پہ داغ بہار چھوڑ گئے
چھڑا کے دامن امید دل کے ہاتھوں سے
سواد یاس میں ماتم گسار چھوڑ گئے
نہ آیا رحم مرے آنسوؤں کی منت پر
کیا قبول نہ پھولوں کا ہار چھوڑ گئے
امید و شوق سے آباد تھا ہمارا دل
امید و شوق کہاں اک مزار چھوڑ گئے

تمام عمر ہے اب اور فراق کی راتیں
یہ نقش گیسوئے مشکیں بہار چھوڑ گئے
ترس رہے ہیں مسرت کو عشق کے ارماں
ہمیں ستم زدہ و سوگوار چھوڑ گئے
امید خستہ ، سکوں مضطرب ، خوشی بسمل
جہان شوق کو آشفتہ کار چھوڑ گئے
نگاہ درد کی عرض حزیں قبول نہ کی
ہمیں وہ غمزدہ و دلفگار چھوڑ گئے
کسے خبر ہے کہ اب پھر کبھی ملیں نہ ملیں
نظر میں اک ابدی انتظار چھوڑ گئے
ہماری یاد بھلا کر وہ چل دئے ''اختر''
اور اپنی یاد ، فقط یادگار چھوڑ گئے

ایس۔ اے۔ رحمان

شیخ عبدالرحمان صاحب ۴ جون ۱۹۰۳ء کو وزیرآباد ضلع گوجرانوالا میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے مختلف مراحل شاندار کامیابی اور امتیاز کے ساتھ طے کئے۔ ۱۹۲۶ء میں آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں قابل فخر کامیابی حاصل کی۔ اس سلسلے میں آپ انگلستان تشریف لے گئے۔ آئی۔ سی۔ ایس کی تعلیم سے فارغ ہوئے تو مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ پہلے سیشن جج ہوئے پھر ۱۹۴۶ء میں ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ جسٹس محمد منیر صاحب چیف جج عدالت العالیہ لاہور کے فیڈرل کورٹ کے چیف جج بنائے جانے پر آپ پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جج بنائے گئے۔ اور اکتوبر ۱۹۵۵ء میں جب مغربی پاکستان کے تمام صوبوں اور ریاستوں کو آپس میں مدغم کردیا گیا اور وحدت مغربی پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو آپ مغربی پاکستان کے ہائی کورٹ کے چیف جج بنادیئے گئے۔ آج کل آپ اسی عہدہ جلیلہ پر فائز ہیں۔

اردو ادب کی یہ خوش قسمتی ہے کہ ہر دور میں پنجاب ہائی کورٹ کے ایک نہ ایک جج اردو کے سر پرستوں میں رہے ہیں۔ جسٹس شاہ‌دین ہمایوں مرحوم اور سر عبدالقادر مرحوم نے اپنی زندگی میں ادب کی بہترین خدمات انجام دی ہیں۔ خصوصاً سر شیخ عبدالقادر مرحوم تو اردو کے بہت بڑے محسنوں میں شمار ہوتے ہیں۔ شیخ صاحب ان کے صیحح جانشین اور شعر و ادب کا نہایت گہرا اور شستہ مذاق رکھتے ہیں۔

شائد بہت کم لوگ جسٹس رحمان صاحب کی شاعری سے آگاہ ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ جن بلند مناصب پر فائز رہے اور ہیں ان کی مصروفیتوں نے اس طرف زیادہ توجہ دینے کی مہلت نہیں دی۔ اور پھر جو کچھ لکھا وہ شہرت و ناموری کی غرض سے نہیں بلکہ تسکین ذوق کے لئے لکھا۔

جسٹس رحمان کی شاعری کا تعلق بلحاظ عمر اور شاعری حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، حفیظ ہوشیارپوری، فراق اور روش صدیقی کے گروہ سے ہے۔ اور یہ وہ دور ہے جن کی شاعری پر اقبال کا بڑا گہرا اثر ہے۔ اگرچہ ابھی تک اقبال کے بعد کوئی عظیم فن‌کار پیدا نہیں ہوا۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ان شعرا نے اردو شاعری میں کچھ نئے رنگ ضرور بھرے ہیں۔

جسٹس رحمان صاحب کی پہلی کتاب ۱۹۵۲ء میں جو منظر عام پر آئی ''ترجمان اسرار'' ہے جو علامہ اقبال کی شہرہ آفاق مثنوی کا منظوم ترجمہ ہے۔

رحمان صاحب کا طبعزاد کلام کچھ بہت زیادہ نہیں۔ جو ہے ان میں مختصر نظمیں اور چند ایک غزلیں ہیں۔ لیکن اس مختصر کلام کے مطالعہ سے ان کے کلام کی

خصوصیات نمایاں نظر آنے لگتی ہیں - آپ کی شاعری میں شاعری کم اور افکار زیادہ ہیں ابتذال اور تصنع کا نام نہیں بلکہ ان کے رومان میں پاکیزگی، بلند پردازی اور قومی اور ملی اشعار میں ایک خلوص اور والہانہ جوش نظر آتا ہے -

انتخاب کلام

"ترجمان اسرار" کے چند اشعار -

قدم خود شوق سے اٹھے، نئی ہو جستجو میری
نیا مقصود ہو میرا، نئی ہو آرزو میری

نہیں پوشیدہ مجھ سے جنبش اعصاب گردوں کی
روانی میں نے دیکھی ہے رگ مہتاب میں خوں کی

مسلماں دوڑ کر دنیا سے حق کی سمت جاتا ہے
دعا سے اپنی ہر تدبیر کو محکم بناتا ہے

مرے سوز نوا کے فیض سے ذرہ ہوا زندہ
تڑپ کر، جگمگا کر بن گیا وہ مہر تابندہ

غزلیات

صید سادہ کی خو نہیں بدلی گرچہ صیاد و دام بدلے ہیں

اتر کے آنکھ سے آنسو کم اعتبار ہوا
ستارہ بن کے گرا، آفتاب ہو نہ سکا

تقریریں بھی ہوتی ہیں، ہم تحریریں بھی دیکھ چکے
باتوں سے تقدیریں بدلیں، ایسا جادو کوئی نہیں

امتحان کر نہ میری الفت کا خود ترا امتحاں نہ ہو جائے

آتش آرزو جلا، لمحوں کو جاوداں بنا
موت تو اک مقام ہے اس کو گزشتنی سمجھ

مرد خدا کی اک نگاہ، کبر کے حق میں بے پناہ
شعلوں میں پھول ھنس پڑیں گر ھو اشارۂ خلیل

کچھ اس طرح سے حیات گزری کہ آنکھ جھپکی تو رات گزری
شباب تھا ایک خواب رنگیں، نہ جس کی تعبیر کر سکے ھم
کھنکتے ساغر، تھرکتے ساقی بہکتے نغمے تھے محفل آرا
یہ سادگی تھی کہ بزدلی تھی، رھے بتوں سے کھچے کھچے ھم
دیا کئی بار ھم کو دھوکا ھمارے زود اعتبار دل نے
نہ دوستی دوستوں کی پرکھی، یونہی نبھائے چلے گئے ھم

منظومات

دلکش ھیں خیالوں کے غزالوں کی کلیلیں
کہتے ھیں کہ آ کھیل پرانے کوئی کھیلیں
پھر سوئی ھوئی یاد کے لب چوم رھا ھوں
جاگ اٹھی ھے ماضی کی پری جھوم رھا ھوں
کھینچی ھیں تصور نے طنابیں جو زماں کی
ندی پلٹ آئی ھے مری عمر رواں کی
پہچانی ھوئی راھوں یہ پھر بھول رھا ھوں
جھولے ھیں تمناؤں کے، میں جھول رھا ھوں
گزرے ھوئے ھنگاموں کے نقشے ھیں نظر میں
پھر خود ھی بہار آتی ھے چل کر میرے گھر میں

جو لا مکاں سے مجھے زیر آسماں لائے — سجا کے میرے لئے محفل مکاں لائے
چراغ لالہ و گل سے کئے چمن روشن — شمیم و رنگ و تبسم کے کارواں لائے
دیارخواب کے قاصد، نسیم کے جھونکے — سکوت کوہ گراں، جوئے نغمہ خواں لائے
شب خیال کی ظلمت میں سیم و زر فشاں — مہ ستارہ و خورشید و کہکشاں لائے
حصار حسن میں قلب و نظر کئے محصور — جمال زھرا وشاں، غمزۂ جواں لائے
کتاب و حکمت و فکر و خیال کے طوفاں — سرود شعر کی بستی سے لوریاں لائے

فضا میں بام فلک تک اُڑائے طیارے سفینۂ سبک و بحر بیکراں لائے
نہ ہوسکا دل زندہ حدود کا پابند
اگرچہ اس کے لئے دام دو جہاں لائے

کھلونے

بچپن کے

کچھ کاغذ کے، کچھ مٹی کے کچھ لکڑی کے کچھ چینی کے
کچھ توڑے تھے کچھ جوڑے تھے کچھ ایسے ہی رکھ چھوڑے تھے
جھولا اور رنگیں کنکوا گلی ڈنڈا، گیند اور بلاّ
رونے ہنسنے کے وہ ساتھی کشتی، انجن، گھوڑا ہاتھی
کڑیل دیو اور پیٹو بونے یہ تھے اپنے کھیل کھلونے

جوانی کے

بے بے مست جوانی آئی دریا میں طغیانی آئی
دل میں شوخ ترنگیں اٹھیں نا معلوم اُمنگیں اٹھیں
ہستی مستی، مستی ہستی دل تھا ارمانوں کی بستی
دل کے سودے غم کے سودے پل میں دو عالم کے سودے
حسن اور اس کی تصویریں تھیں عشق اور اس کی تفسیریں تھیں
زریں دن اور سمیں راتیں
پیارے کھیل اور پیاری باتیں

جوانی کے بعد

ہوتے ہوتے طوفاں گزرا دریا چڑھ چڑھ کر خود اترا
موجوں نے ساحل کو ڈھونڈا رہرو نے منزل کو ڈھونڈا
پانی ہے گو ٹھہرا ٹھہرا باطن میں ہے گہرا گہرا
شیشوں میں سے تارے دیکھے گردوں کے نظارے دیکھے
زیر آب چلائی کشتی تا افلاک اڑائی کشتی
کچھ سادہ، کچھ رنگیں خاکے نام فن سے ہم نے کھینچے
دل کی ہر پوشیدہ چوری یوں کاغذ پر ہم نے کھولی
یوں کھیلوں میں ہم رہتے ہیں
علم و فن ان کو کہتے ہیں

اثر صہبائی

عبدالسمیع پال نام ' اثر تخلص ۲۸ دسمبر ۱۹۰۱ء کو سیالکوٹ (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ مورث اعلیٰ وادئی کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں آباد ہوئے۔ اثر صاحب کے والد مولوی احمد دین صاحب پال مرحوم (پال کشمیری راجپوتوں میں ایک ذات ہے) جماعت اہل حدیث میں ایک فاضل و ممتاز بزرگ تھے۔ انہیں کی مذہبی آغوش میں اثر صاحب نے آنکھیں کھولیں مگر تعجب ہے کہ گھر کے شدید مذہبی ماحول کے باوجود وہ دولت شاعری سے محروم نہ رہے۔

اثر صاحب کی ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں ہوئی جہاں سے ۱۹۱۸ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں بی۔ اے کرنے کے بعد لا کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ آخر ۱۹۲۳ء میں ایل۔ ایل۔ بی کرنے کے بعد وکالت کا کام شروع کیا۔ پھر چند سال اس طرح گزار کر ۱۹۲۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفہ میں ایم۔ اے کیا۔

صہبائی صاحب نے اگرچہ گیارہ بارہ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دئیے تھے لیکن اسلامیہ کالج کے طالب علمی کے زمانے میں لاہور کی رنگیں و شعر انگیز فضا نے موصوف کے ذوق شعری کو اور جلا دی اور یہاں آ کر آنکی طبیعت اور شاعری نے آزادی کی سانس لی۔ ۱۹۲۷ء میں آپکی شادی ہوئی اور زندگی کا ایک خوشگوار دور شروع ہوا مگر افسوس کہ یہ سہانا خواب زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا اور ۱۹۳۱ء میں موصوف کی اہلیہ جنہیں آپ ''راحت'' کہتے تھے انتقال کر گئیں۔ اس سانحہ عظیم کا اثر صہبائی صاحب کے خیالات اور شاعری دونوں پر بہت پڑا اور حسن و شباب کی تمام رعنائیاں اور عشق و محبت کی ساری سرمستیاں اب حزن و ملال اور درد و کرب میں ڈوب گئیں۔

صہبائی صاحب پہلے کچھ عرصہ اپنے وطن سیالکوٹ میں پریکٹس کرتے رہے پھر جموں چلے گئے جہاں ۱۹۴۶ء میں سرکاری وکیل مقرر ہوئے۔ چند ماہ بعد جموں و کشمیر ہائی کورٹ میں اسٹنٹ ایڈوکیٹ ہو گئے۔ تقسیم ہند کے بعد آپ کشمیر سے سیالکوٹ واپس آ گئے اور نومبر ۱۹۴۷ء میں دوبارہ پریکٹس شروع کی۔ ۱۹۴۸ء میں چند ماہ اسٹنٹ

کسٹوڈین کے فرائض انجام دینے کے بعد یہاں بھی آپ سرکاری وکیل بنا دئے گئے اور آج تک آپ بفضلہ اس عہدے کے فرائض بحسن‌وخوبی انجام دے رہے ہیں ۔ آج کل آپ کا قیام لاہور میں ہے ۔

صہبائی صاحب بڑے خوش اخلاق ، با مروت اور وضع دار انسان اور علم و ادب کے بڑے قدر دان ہیں ۔ وہ حق و صداقت کے پرستار ہیں مذہب آنکی زندگی و شاعری کا اہم ترین جزو ہے ۔ اور یہ ہونا بھی چاہئے کیونکہ آنکی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت جس ماحول میں ہوئی ہے وہ زر پرستی ، عیش کوشی ، ریا کاری اور جاہ طلبی جیسے ذمائم اخلاق کے خلاف ہمیشہ آنہیں صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور کریگی ۔

اثر صاحب نے ابتداً اپنا کلام اپنے بڑے بھائی ''امین حزیں'' کو دکھایا اور کچھ غزلیں مرحوم مولانا تاجور نجیب آبادی کو دکھائیں ، اسکے علاوہ علامہ کیفی دہلوی اور حضرت اثر لکھنوی نے بھی آنکے کلام کا بیشتر حصہ دیکھ کر آنہیں اپنے مشوروں سے مستفید کیا اور خود اثر صاحب کے الفاظ میں ''مولانا سید سلیمان ندوی نے میری حوصلہ افزائی فرمائی اور مولانا ابو الکلام آزاد نے بھی اپنی پسندیدگی کا اظہار فرما کر مجھ میں یقین و اعتماد کا جذبہ پیدا کر دیا'' ہر موقعہ پر آن کی یہ خواہش اور کوشش رہی ۔ کہ ان کا کلام ممتاز نقادان فن کی نگاہ سے گذرتا رہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اثر صاحب کا زر شاعری ان متعدد مستند کسوٹیوں پر چڑھنے کے بعد پہلے ''خالص'' ہوا پھر آس نے ایک ''سکہ بند'' شکل اختیار کر لی اور آجکل بجا طور پر آن کا شمار پاکستان و ہند کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے ۔

جناب اثر کے فطری شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں ۔ آن کے کلام میں عشق و محبت کی رنگینیاں کم اور حکیمانہ اسرار و رموز کی عقدہ کشائی زیادہ ہے ۔ آن پر اقبال ، میر اور غالب کا خاصا اثر ہے ۔ وہ اپنے دھیمے سروں میں بڑی پر معنی باتیں کہنے کے عادی ہیں ۔ آنکے خیالات بڑے رفیع اور ساتھ ہی بہت سلجھے ہوئے ہوتے ہیں لیکن ان حکیمانہ خیالات کی جان وہ نرم‌وشیریں زبان ہے جسکے برتنے پر اثر صاحب کو بڑی قدرت حاصل ہے ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ کسی صنف کلام میں بند نہیں ۔ آنہوں نے غزلیات ، قطعات ، رباعیات اور نظمیں سب کچھ کہی ہیں ۔ لیکن بقول مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم ''ان کے تخیل کے پردہ میں فلسفہ کی حقیقت ہمیشہ مستور رہتی ہے یہی سبب ہے کہ آنکی غزلوں کے مقابلے میں آنکی رباعیات اور قطعات زیادہ پر معنی اور زیادہ موثر ہیں'' ۔ لیکن اسکے یہ معنی نہیں کہ آنکی غزلیں اور نظمیں پھیکی یا بے کیف ہوتی ہیں ۔ بلکہ غزل کے معاملہ میں تو ہمارا خیال ہے کہ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے بڑی تیزی سے قدم آگے بڑھایا ہے اور اب آنکی غزلیں بڑے رچے ہوئے رنگ میں دیکھنے میں آتی ہیں ۔ بحیثیت مجموعی وہ ایک کامیاب شاعر ہیں آن کا کلام کیف و سرور کا خزینہ اور زبان شگفتہ و دل نشیں ہے ۔

اب تک اثر صہبائی صاحب کے کئی مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہو کر ارباب ذوق سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں چنانچہ ۱۹۲۸ء میں آنکی رباعیات کا مختصر سا مجموعہ ''جام صہبائی'' کے نام سے شائع ہوا ۔ ۱۹۳۳ء میں آن کا شاہکار ''خمستان'' طبع ہوا ۔ ۱۹۳۷ء میں رباعیات کا دوسرا مجموعہ ''جام طہور'' کے نام سے منظر عام پر آیا ۱۹۴۵ء میں

"روح صہبائی" ایک اور مجموعہ شائع ہوا۔ حال میں ان کا چوتھا مجموعہ کلام "بام رفعت" کے نام سے شائع ہوا ہے ۔ ابھی بہت سا کلام قابل اشاعت ہے ۔

انتخاب کلام

ملی ہے جاں مگر آرام جاں نہیں ملتا کہیں جہاں میں دل شادماں نہیں ملتا
خدا کی دین ہے جسکو نصیب ہو جائے ہر ایک دل کو غم جاوداں نہیں ملتا

تمہارا ذکر مرے کیف و حال کی دنیا تمہاری یاد ہے میرے خیال کی دنیا
جو تیرے عشق کے زخموں سے رہ گئی محروم وہی حیات ہے رنج و ملال کی دنیا
نظر ہٹا کے بتوں سے جمائی ہے دل پر کہ دل ہے درد و غم لازوال کی دنیا

گو تو نہیں ملا ہے مگر تیرے شوق میں یہ وقفۂ حیات تو اچھا گزر گیا

صبح ازل سے ہے رواں، یہ نہ مگر ہوا عیاں
کون ہے میر کارواں، منزل کارواں ہے کیا ؟

اُن سے آغاز رسم و راہ ہوا آخر کار دل تباہ ہوا !

کعبہ میں ہو یا ہو بتکدے میں ہر سنگ ہے آستاں کسی کا
گو تاروں پہ ٹکٹکی بندھی ہے دل کو ہے مگر گماں کسی کا

اب کیا کریں جو دل نہ لگائیں خزاں سے ہم
رنگینیاں بہار کی لائیں کہاں سے ہم
سرشاریاں عجیب تھیں صہبائے عشق کی
کیا خوب بے نیاز تھے دونوں جہاں سے ہم

لطف گناہ میں ملا اور نہ مزا ثواب میں
عمر تمام کٹ گئی کاوش احتساب میں
تیرے شباب نے کیا مجھ کو جنوں سے آشنا
میرے جنوں نے بھر دئے رنگ ترے شباب میں

آہ یہ دن کہ جانگداز جوشش اضطراب ہے
ہائے وہ دَور جب کبھی لطف تھا اضطراب میں

وہی ساعتیں حاصل زندگی ہیں گزر جائیں جو مستی و بے خودی میں

آستانے نگاہ سے گزرے مائل بندگی جبیں نہ ہوئی
لاکھ جلوے رہے نگاہوں میں کوئی تصویر دل نشیں نہ ہوئی
کعبہ و دیر و میکدہ میں رہے دل کی تسکیں مگر کہیں نہ ہوئی

ایک جاں پر ہزارہا آفت پھر بھی شکر خدا کرے کوئی
نظر شوق تجھ کو ڈھونڈتی ہے دیر و کعبہ کو کیا کرے کوئی

تیرے جانے سے عجب رنگ ہے اے جان بہار
اب گلستاں بھی بیاباں نظر آتا ہے مجھے

دنیا میں ہزاروں خوشیاں ہیں ' یہ دنیا عشرت خانہ ہے
اس بزم میں لیکن میرا ہی اک درد بھرا افسانہ ہے
برگشتہ قسمت والوں کا نےَ کعبہ نےَ بتخانہ ہے
ہاں دو ہی سہارے ہیں آنکے ' یا موت ہے یا پیمانہ ہے
ہر شاخ جب اک مستانہ ہے ' ہر پھول جب اک پیمانہ ہے
توبہ ! ایسے میں توبہ !! جب فطرت خود میخانہ ہے
برسات کی چاندنی راتوں میں ' دیکھے تو کوئی صہبائی کو
لب پر ہیں مناجاتیں لاکھوں اور ہاتھوں میں پیمانہ ہے

فراغت ہے اب فکر سود و زیاں سے محبت کی دیوانگی مل گئی ہے
ترے اک تبسم سے اے جان خوبی مجھے دو جہاں کی خوشی مل گئی ہے
اثر اسکو پاتا ہوں میں بے خودی میں
مری بے خودی ہی مری آگہی ہے !

تم یاسمن و لالہ و گل سے بھی ہو رنگیں
تم خندۂ معصوم سحر سے بھی حسیں ہو!
تم عرش بریں پر ہو کہ اس سے بھی کہیں دور
محسوس یہ ہوتا ہے، رگ جاں سے قریں ہو!
سو رنگ کے پردوں میں بھی چھپ جاؤ اگر تم
میری نگہ شوق سے مستور نہیں ہو
آغوش محبت ہو تو آغوش میں ہے حسن
ہر گام پہ منزل ہے، جو منزل کا یقیں ہو

یاد تری شراب ہے ذکر ترا سرور ہے
کیف طرب میں موجزن میرا یم وجود ہے
اپنی ہی دھن میں عرش سے آگے نکل گیا ہوں میں
اتنی بلندیوں پہ بھی مجھ کو غم صعود ہے
اس میں کہاں سرور و نور آگ ہی آگ ہے ہوس
مثل سموم ہر نفس آہ برنگ دود ہے
آنکھ ہو حق شناس اگر آتا ہے تو ہی تو نظر
ورنہ تمام کائنات بتکدۂ نمود ہے
پچھلے پہر کی چاندنی نور میں ہے دُھلی ہوئی
عرش بریں سے پے بہ پے قدسیوں کا ورود ہے
فکر دل و جگر نہ کر عشق میں جان سے گزر
اس میں کہیں زیاں نہیں اس میں زیاں بھی سود ہے
غرق سرور نور ہوں جام و سبُو سے دور ہوں
میرے لئے کھُلا ہوا میکدۂ شہود ہے

رباعیات

شیرازۂ ہستی کو بکھرنا ہوگا
ظاہر ہے کہ ایک روز مرنا ہوگا

لیکن یہ سوال ہے ابھی لاینحل
کیا ڈوب کے مجھ کو پھر ابھرنا ہوگا

مدت ہوئی زخم دل پہ کھاتے کھاتے
اے کاش! وہ پوچھ لیتے آتے جاتے
جب غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے اثر
آتا ہے قرار دل کو آتے آتے

رو رو کے عبث شکوۂ بیداد نہ کر
اے ننگ جہاں روح کو برباد نہ کر
ہمت سے ہے رزمگاہ ہستی میں وقار
کھا زخم پہ زخم اور فریاد نہ کر

گزری ہے جگر کے زخم سیتے سیتے
زہرآبِ الم کے جام پیتے پیتے
سو بار اگرچہ کوہ غم بھی ٹوٹے
گردن نہ کبھی جھکے گی جیتے جیتے

سرمایۂ افتخار آدم ہے یہی!
جبریل یہی ہے اسم اعظم ہے یہی
ہے تیرے مقدر میں غم عشق اگر
خوش باش کہ حاصل دو عالم ہے یہی

انسان کا قلب جب سنبھل جاتا ہے
جادو ہر شے پہ اس کا چل جاتا ہے
ڈھل جاتے ہیں دو جہاں نئے سانچے میں
انداز نگاہ جب بدل جاتا ہے

منظومات

پلائے جا

بہار ہے نگار ہے کنار جوئبار ہے
فضائے کوہسار ہے رباب آبشار ہے
نسیم خوشگوار ہے جہان زرنگار ہے
پلائے جا ، پلائے جا
غم جہاں مٹائے جا

ستارے ہیں یہ سو بہ سو چھلک رہے ہیں یا سبو
رواں ہے کہکشاں کی جو ہر ایک شے ہے مشکبو
یہ بزم حسن ہو بہو! ہے اک طلسم رنگ و بو
پلائے جا ، پلائے جا
غم جہاں مٹائے جا

کبھی بہار کا سماں! کبھی ہے منظر خزاں
یہ زندگی کی داستاں عجیب سی ہے چیستاں
رواں ہے ایک کارواں خبر نہیں مگر کہاں
پلائے جا ، پلائے جا
غم جہاں مٹائے جا

کرم ہو ساقیا کرم! نگاہ مست کی قسم
چلے وہ دور جام جم کہ بھول جائیں کیف و کم
یہ محفلیں ہیں مغتنم کہ زندگی ہے کوئی دم
پلائے جا ، پلائے جا
غم جہاں مٹائے جا

سرگزشت

مرغزاروں میں چمن زاروں میں کہساروں میں
چرخ کے نور میں ڈوبے ہوئے نظاروں میں
شب تاریک کی بہکی ہوئی تنہائی میں
شب مہتاب کی مہکی ہوئی رعنائی میں

شفق شام کی رنگینی و سرشاری میں
صبح پرکیف کے انوار کی بیداری میں
حسن معصوم کو ہر رنگ میں دیکھا میں نے

دیدۂ شوق سے اشکوں کی روانی نہ گئی
نہ گئی دل کی تپش شعلہ فشانی نہ گئی
تیر پر تیر برستے رہے مجھ پر برسوں
سنگدل دُور سے ہنستے رہے مجھ پر برسوں
یورش غم بھی سہی ' رنج و محن بھی دیکھے
رہ اُلفت میں کئی دار و رسن بھی دیکھے
اپنے محبوب کو ہر حال میں چاہا میں نے

بزم امکاں میں رہا ظلمت باطل کا ہجوم
چھپ گئے خوف کے مارے مہ و خورشید و نجوم
ہیبت اہرمنی چاروں طرف طاری تھی
مرد حق کوش پہ یہ رات بہت بھاری تھی
حق پرستوں کے لئے خنجر خونخوار کہیں
زہر کا جام کہیں ' نار کہیں ' دار کہیں
پرچم حق و صداقت کو اُٹھایا میں نے

پھول اور ستارہ

میں لالۂ صحرا ہوں ! تو عرش کا تارا ہے
چاہوں کہ پہونچ جاؤں '
اُڑ کر تری محفل میں '
پر میری تگ و دو کیا !
کچھ دور ذرا اُڑ کر !
پھر خاک پہ گر جاؤں '
گرتے ہی فنا ہو جاؤں '
میں لالۂ صحرا ہوں ! تو عرش کا تارا ہے

میں لالۂ صحرا ہوں ! تو عرش کا تارا ہے

تیرے لئے ممکن ہے
تو چاہے تو بن جائے
قطرہ مئے شبنم کا !
اور صبح بہاراں میں
میرے دل سوزاں پر !
اک بار برس جائے
تو عرش کا تارا ہے میں لالۂ صحرا ہوں !

ساغر نظامی

محمد صمد یار خان نام ساغر تخلص ۲۱ دسمبر ۱۹۰۷ء کو محلہ بالائے قلعہ، علی گڑھ میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے والد کا نام ڈاکٹر احمد یار خاں اور مورث اعلیٰ کا نام سردار شہباز خاں تھا ۔ سردار شہباز خاں نواب جھجھر کی فوج کے سپہ سالار تھے اور موصوف کو غدر میں نواب کے ساتھ پھانسی دی گئی ۔ ساغر نظامی کی مذہبی ' اردو اور فارسی کی تعلیم گھر پر ہوئی اور انگریزی کی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول علی گڑھ اور محدود طور پر ایم ۔ اے ۔ او کالج علی گڑھ میں ہوئی ۔ شاعری سے دلچسپی بچپن سے تھی ۔ چنانچہ ۱۹۱۸ء سے جبکہ انکی عمر تیرہ سال کی تھی وہ مشاعروں میں شریک ہونے لگے اور مولانا سیماب اکبر آبادی مرحوم سے شرف تلمذ حاصل کیا ۔ ۱۹۲۳ء میں مولانا مرحوم کی شرکت میں آگرہ سے رسالہ ''پیمانہ'' جاری کیا اور اس کی ادارت کا کام بھی سنبھالا لیکن ۱۹۲۶ء میں مزاجی و ادبی اختلافات کی بنا پر استاد و شاگرد کا یہ تجارتی و ادبی اشتراک اس طرح ختم ہوا کہ نہ صرف یہ بعد میں استوار نہ ہو سکا بلکہ ۱۹۳۰ء کے بعد سے ایک حریفانہ کشمکش کی صورت اختیار کر گیا ۔

ستمبر ۱۹۲۶ء سے ساغر صاحب نے اپنے وطن علی گڑھ سے ماہنامہ ''مستقبل'' جاری کیا ۔ لیکن یہ پرچہ بعض وجوہ کی بنا پر زیادہ دن نہ چل سکا ۔ ۱۹۲۸ء میں انہوں نے ایک نیم مزاحی و ادبی اخبار ''علی گڑھ پنچ'' نکالا ۔ اس کے بعد ۱۹۲۹ء میں ہفتہ وار ''استقلال'' کی اشاعت شروع کی جس میں ساغر صاحب کے سیاسی جذبات و تفکرات کی ترجمانی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ہوئی ۔ اگست ۳۰ء سے جولائی ۳۱ء تک وہ اپنے والد کے ہمراہ مظفر نگر میں رہے اور اس عرصہ میں انہوں نے متعدد نثر کی کتابیں لکھیں ۔ رسالہ ''پیمانہ'' کی ادارت کی اور اپنے کلیات ''بادۂ مشرق'' کی ترتیب و تصحیح کی ۔ لیکن ان مصروفیتوں کے باوجود ۱۹۲۹ء سے انہوں نے عملی سیاست میں جو حصہ لینا شروع کیا تھا وہ برابر جاری رہا ۔

۱۹۳۲ء میں ساغرصاحب کے والد کا تبادلہ میرٹھ ہو جانے پر یہ بھی والدین کے ہمراہ میرٹھ پہنچ گئے ۔ یہاں انہوں نے ادارہ ادبی مرکز کی بنیاد ڈالی ۔ ایک مکتبہ قائم کیا اور ایک اردو لیتھو پریس ''ساغر پریس'' کے نام سے جاری کیا ۔ یہیں سے انہوں نے

اپنی نگرانی و اہتمام میں ''بادۂ مشرق'' شائع کی ۔ اس کے علاوہ اور دوسری کتابیں بھی اس ادبی مرکز نے شائع کیں لیکن ان کتابوں سے بھی زیادہ گراں قدر خدمت اس ادارے کے ماہنامہ ''ایشیا'' نے انجام دی جو ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۳ء تک برابر نکلتا رہا اس طرح میرٹھ میں مستقل گیارہ سال تک علمی و ادبی خدمات انجام دینے کے بعد فروری ۱۹۴۳ء میں انہوں نے اس محبوب شہر کو خیر باد کہا اور دکن کے عظیم الشان تاریخی شہر پونا کو سدھارے جہاں انہیں ''شالیمار پکچرز'' میں بحیثیت اسٹوری رائٹر ' مکالمہ نگار اور شاعر بلا لیا گیا ۔ پونا کے دوران قیام میں ساغر صاحب نے قلمی مصروفیات کے باوجود اپنے محبوب ماہنامہ ''ایشیا'' کو جاری رکھا ۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد بعض وجوہ کی بنا پر یہ رسالہ بند ہوگیا ۔ قیام پاکستان کے بعد ساغر صاحب کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ بمبئی میں ہیں اور کسی فلم کمپنی سے متعلق ہیں ۔

غرض ساغر صاحب کی تمام زندگی سخت جدو جہد ' شدید مقابلے اور ادبی و شاعرانہ ذوق میں گزری اور انہوں نے جب سے ہوش سنبھالا اس وقت سے اب تک ان کا بیشتر وقت لکھنے پڑھنے ہی میں گزرا ۔ جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے وہ اردو کے جدید شعراء میں سے ہیں اور ان کے کلام میں اردو شاعری کے جدید تغیر کا نمایاں اثر ہے ۔ ساغر صاحب نے یوں تو تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی نظمیں خاص طور پر نزاکت خیال اور موسیقی کی روانی کے اچھوتے محاسن کی آئینہ دار ہیں ۔ مزیدبراں ان کی نظموں کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں ہندوستانی زندگی ' ہندوستانی تجربات اور ہندوستانی جذبات کا اظہار ایسے سلیس و دلکش انداز میں ہوا ہے جو بیشتر عوام کی روز مرہ کی بول چال سے مشابہت رکھتے ہیں ۔ آزادئ وطن کا جذبہ حضرت ساغر کی منظومات میں قدم قدم پر نظر آتا ہے اور وہ اپنی پرجوش نظموں اور پر لطف نغموں سے اہل وطن کو ہر قسم کی قربانی کرنے اور آزادی حاصل کرنے کی ترغیب دیتے ہیں ۔

لیکن جناب ساغر کی شاعری یہیں تک محدود نہیں بلکہ انہوں نے مناظر قدرت کے جلوے ' جذبات کی کیفیتیں اور نغمہ و سرود کی سحر آفرینیاں بھی اپنی نظموں میں خاص کیفیت سے بیان کی ہیں ۔ اس سلسلے میں ساغر صاحب کے محاسن شعری کا تذکرہ کرتے ہوئے ''بادۂ مشرق'' کے دیباچہ میں بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب فرماتے ہیں ''ان کے کلام کی بہت بڑی خصوصیت اس کا ترنم اور موسیقیت ہے ۔ یہ بات شاید اس وقت کے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ۔ دوسری بات بحروں کا تنوع ہے جس سے شاعر کا حسن انتخاب اور اس کے ذوق موسیقیت کا پتہ ملتا ہے ۔ یہ فارسی کی جدید شاعری کا اثر معلوم ہوتا ہے ترنم اور بحروں کی جدت یہ دو چیزیں ایسی ہیں جو ساغر نے جدید فارسی شاعری سے حاصل کی ہیں اور انہیں خوب نبھایا ہے ۔ ساغر کی بعض نظمیں ایسی ہیں کہ انہیں پڑھکر اور خاص کر ان سے سن کر (جس میں خوش گلوئی ' جوش اور باطنی کیفیت سب کچھ ہوتا ہے) آدمی محو ہو جاتا ہے'' ۔

مختصر یہ کہ ساغر صاحب نے جدید اردو شاعری میں زبان کی نرم اور دلفریب شیرینی پیدا کی ۔ جس میں ہندی الفاظ بے ساختگی کے ساتھ بغیر کسی تصنع کے ' فارسی

منظومات کی مشکل تر مقررہ بند شوں میں ، گھل مل جاتے ہیں ۔ آنھوں نے شباب سے سرشار ہو کر قدم بڑھایا اور زندگی کے متعلق آن کا تمام طرز عمل شباب کی رنگینیوں میں ڈوبا ہوا ہے ۔ اور آن کا دل شباب ، رومانیت ، تاریخ اور آزادی وطن کے جذبات سے مملو ہے ۔ وہ یاس و مایوسی کو اپنے پاس نہیں آنے دیتے چنانچہ آن کے کلام میں رجائیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ۔ موصوف کے کئی مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں جن میں '' صبوحی '' '' بادۂ مشرق '' اور '' رنگ محل '' خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔

انتخاب کلام

عشق ہنگامہ فروش و حسن ہنگامہ نواز
رنگ محفل مانع نظارۂ محفل ہوا
سامنے آتے ہی آن کے آنکھ پرنم ہو گئی
جانے کیا دیکھا کہ ضبط آرزو مشکل ہوا

نہ میں ہوں نہ وہ ہیں نہ دین اور دنیا   جنوں محبت کہاں کھینچ لایا

جہاں پڑی وہیں اک چوٹ کھا کے بیٹھ گئی
مری نگاہ کو اندازۂ شباب نہ تھا

کیوں روک دیا تم نے آنکھوں کے اشاروں سے
دلچسپ تھا افسانہ کہنے تو دیا ہوتا
مارا مجھے اے ''ساغر'' فطرت کی عنایت نے
یا وہ نہ ملے ہوتے یا دل نہ ملا ہوتا

کیوں گرفتار مجھے اے مرے صیاد کیا   اور بھی فطرت آزاد کو آزاد کیا
یہ تری بزم کا انداز یہ نظروں کا فریب   ہر غم اندوز یہ سمجھا کہ مجھے شاد کیا
غنچے نے نکہت و شبنم نے شمیم و گل نے   سارے گلشن نے تجھے وقت سحر یاد کیا
قید ہستی بھی ہے فطرت کی غلادی ''ساغر''   کاش یہ حکم سنوں ''جا تجھے آزاد کیا''

لوٹ کر لے گیا نظر میری نرگس نیم خواب کا عالم
کھلے پھولوں میں صبح کا منظر بند کلیوں پہ خواب کا عالم

شوق بیکار جذب دل ناکام میں ہوں خود اپنے عشق کا انجام
ہے یہ دنیائے عاشقی کا نظام مرگ آغاز، زندگی انجام

حسن آمادۂ پرسش ہے باندازۂ غم
کاش ہم آج بھی اظہار تمنا نہ کریں
ہجر مہلک ہی سہی وصل کی راحت معلوم
کاش ہم یہ بھی محبت میں گوارا نہ کریں

میرے آنسو اُن کے دامن پر ستارے بن گئے
کون کہتا ہے کہ یوں رونے سے کچھ حاصل نہیں
نا خدا پہنچے گی ساحل پر نہ کشتی، کیا کہا؟
ناخدا ہے تُو خدائے کشتی و ساحل نہیں

بدل گئی ہیں فغاں میں جرس کی آوازیں
کوئی خراب محبت تو کارواں میں نہیں
مذاق دھر ہے اب تشنۂ سکوں ''ساغر''
مگر شراب سکوں ساغرِ جہاں میں نہیں

کس طرح دوں پیام غم جاوداں کو میں
قابو میں ہو تو روک لوں عمر رواں کو میں
سجدے مری جبیں کے نہیں اس قدر حقیر
کچھ تو سمجھ رہا ہوں ترے آستاں کو میں
باقی اب امتحان وفا میں ہے اور کیا
بے ضبط کر گیا ترے درد نہاں کو میں

محفل خموش صبح کے آثار جلوہ گر
اب حکم ہو تو ختم کروں داستاں کو میں

ایک زنجیر طریقت میں بندھے ہیں دونوں
عشق پابند سہی حسن بھی آزاد نہیں

میں ناواقف سہی منزل سے منزل مجھ سے واقف ہے
مجھے بھی قافلے والے شریک کارواں کر لیں
چمن میں جانے کل کس برق وش کی حکمرانی ہو
ابھی سے عندلیب و گل کو اپنا رازداں کر لیں
گل اپنے ' غنچے اپنے' گلستاں اپنا ' بہار اپنی
گوارا کیوں چمن میں رہ کے ظلم باغباں کر لیں
یہ اک بجلی کہ رقصاں ہے یہ اک شعلہ کہ عریاں ہے
جو مل جائے تو پھر روشن چراغ آشیاں کر لیں
نہ دے پھر کوئی غربت میں ثبوت آبلہ پائی
وہ ''ساغر'' کاش کانٹوں کو بھی اپنا ہمزباں کر لیں

کافر گیسو والوں کی رات بسر یوں ہوتی ہے
حسن حفاظت کرتا ہے اور جوانی سوتی ہے
صبر و سکوں دو دریا ہیں بھرتے بھرتے بھرتے ہیں
تسکیں دل کی بارش ہے ہوتے ہوتے ہوتی ہے
جیتے میں کیا راحت تھی ' مرنے میں تکلیف ہے کیا
جب دنیا کیوں ہنستی تھی؟ اب دنیا کیوں روتی ہے ؟
ساون آئے پھول کھلے ' اک افسردہ بول اٹھا
جس میں دل کھل جاتے ہیں وہ برکھا کب ہوتی ہے؟
رات کے آنسو اے ''ساغر'' پھولوں میں بھر جاتے ہیں
صبح چمن اس پانی سے کلیوں کا منہ دھوتی ہے

شاید تری سمجھ میں روداد غم نہ آئے
ڈرتا ہوں آرزو کی تشریح مختصر ہے
خانہ خراب قسمت آخر مٹا کے مانی
آس کو بھی تھا گزرنا تیری ہی رہگزر سے

ہے شب رنگیں' سحر رنگیں' ہوئے ہیں بام و در رنگیں
زمانہ رنگ پر ہے اک مری رنگینیٔ دل سے

جب چمن ریز نظر اُن کی گل افشاں ہو جائے
کیوں نہ اندیشۂ کوتاہئی داماں ہو جائے
محفل سوز میں اس دل کی نموداری کیا
جو بھڑکتے ہی چراغ تہ داماں ہو جائے
بار بار آے تصوّر ترا تغئیر کے ساتھ
کم سے کم ایک ہی تصویر کا ساماں ہو جائے
نہ سہی شمع مری خلوت غم میں نہ سہی
کوئی ڈوبا ہوا تارا ہی فروزاں ہو جائے

جانب دل کوئی آتا ہے بانداز لطیف
کہہ نہیں سکتا یہ تو ہے یا تری آواز ہے
ختم ہوتی ہے جہاں سرحد خودی و ہوش کی
اُس سے کچھ آگے نکل کر جلوہ گاہ ناز ہے
نالہ کہتے ہیں جسے سب اصطلاح عشق میں
ساری دنیائے وفا کی متحد آواز ہے

ہستی کی بد مستی کیا، ہستی خود اک مستی ہے
موت اُسی دن آئے گی ہوش میں جسدن آئیں گے
میری آنکھیں کچھ بھی نہیں تیرے جلوے جلوے ہیں
تو جب سامنے آئیگا، پردے سے پڑ جائیں گے

گل اُس کے، غنچے اُس کے، گلستاں اُس کا بہار اُسکی
جو قانون گلستاں توڑ کر آزاد ہوتا ہے

کچھ حقیقت نہ ہو محبت کی نشہ سا اک ضرور ہوتا ہے

زمانہ بھر نے ٹھکرایا ہے ہم کو آٹھا دو تم بھی اپنے آستاں سے

آہ ملتا ہے یہ سرمایہ کسے   غم بڑی دولت بڑا انعام ہے
ہے ترا سحرِ تبسم فتنہ ساز   اور مری دیوانگی بدنام ہے
مدعی اور پختہ کاری کا فریب   مدعا ''ساغر'' خیال خام ہے

سہہ گئے سوز عشق کو ہم تو   حسن سے کب مگر یہ آگ دبی
ایک دن لے دیا تھا نام ترا   بات یہ پھر دبائے سے نہ دبی
آرزو نا تمام و عمر تمام   زندگی مستقل ہے تشنہ لبی
بارگاہ جنوں میں اے ''ساغر''   ہے ادب بھی کمال بے ادبی

یہ ناکامی محبت کی الٰہی !   محبت سے بھی دل گھبرا رہا ہے

آفتاب

بربط نوریں پہ بھیروں راگنی گاتا ہوا
ساز سے کرنوں کے روشن راگ برساتا ہوا
اپنی موسیقی سے دنیا بھر کو گرماتا ہوا
زندگی کی موج ہر اک شے میں دوڑاتا ہوا
پردۂ مشرق سے ساقیٔ سحر پیدا ہوا
بادۂ مشرق بدست و نغمہ گر پیدا ہوا
دیر میں ناقوس، مندر میں گجر بجنے لگا
میکدے میں حلقۂ زنجیر در بجنے لگا
جنبش مضراب سے ساز سحر بجنے لگا
خود بخود ساز خموش بحر و بر بجنے لگا
روح ہستی جاگ کر محو ترنم ہو گئی
زندگی بیدار ہو کر رقص میں گم ہو گئی
لالہ و گل جاگ اٹھے بام و در روشن ہوئے
سبزۂ خوابیدہ پر لعل و گہر روشن ہوئے
ڈالیوں پر روشنی دوڑی، شجر روشن ہوئے
کوہ و صحرا، دشت و دریا، بحر وبر روشن ہوئے
آسماں روشن ہوا اور خاکداں روشن ہوا
پر تو انوار سے سارا جہاں روشن ہوا

اے نقیب صبح اے سر چشمۂ امواج نور
اے کلید خمستاں ، اے مشعل طاق سرور
ہر شعاعِ گرم تیری لمعۂ صد برق طور
تیری کرنوں سے رگ عالم میں ہے موج شعور
ذرہ ذرہ زندگی کے نور سے تابندہ ہے
زندگی تابندہ ہے ، رقصندہ ہے رخشندہ ہے

گوھریں شبنم کے قطرے موتیوں کا یہ نکھار
یہ عروس صبح کے سینے پہ ھیروں کی بہار
یہ سمندر ، یہ بیاباں ، یہ چمن ، یہ کوھسار
ناچتی یہ ندیاں ، گاتے ہوئے یہ آبشار
سب کو تو نے روشنی دی مسکرانے کے لئے
قاسم انوار ہے تو اک زمانے کے لئے

آسماں کے اے طلائی دائرے ! زرّین باب
اے زمیں کی نوجوانی ، آسمانوں کے شباب
اے سبوئے آتشیں ، اے حاصل شعر و شباب
خاک ھیں تیرے قدم کی کہکشاں و ماھتاب
دست قدرت کا جہنم زار انگارہ ہے تو
کس کی دُھن میں اے نگاہ چرخ آوارہ ہے تو

ناظر عالم ہے تو اک آتشیں منظر ہے تو
جوھر آئینہ ہے ، آئینہ جوھر ہے تو
فطرتاً نظارۂ خاموش کا خوگر ہے تو
دھر کی تاریخ پارینہ کا اک دفتر ہے تو
تیری کرنیں راز دار عظمت دیرینہ ھیں
تیرے جلوے یادگار عشرت دوشینہ ھیں

ھر کرن تیری ہے دنیا کو سلام زر نگار
خمستان انجم رخشاں کا جامِ زر نگار
خود کلیم زر فروش و خود کلام زر نگار
اے خطیب زر نگار و اے امام زر نگار
اپنا خطبہ کیف میں جس وقت دھراتا ہے تو
دھر کو سیلاب زرّیں میں ڈبو جاتا ہے تو

سانولے ہلکے دھندلکے میں پری پیکر ہے تو
یا جبین صبح پر سونے کا اک جھومر ہے تو
یا برہمن کی جبیں کا قشقۂ احمر ہے تو
یا فلک کے ہاتھ میں کندن کا اک ساغر ہے تو
یا کسی شاعر کے دل کا داغ ہے دھکا ہوا
یا بہشت حسن کا اک پھول ہے مہکا ہوا
روشنی تیری متاع خانۂ آشفتہ حال
تیری کرنوں میں کسانوں کیلئے تاروں کی شال
اور مزدوروں کو پہلی رات سے تیرا خیال
ثبت ہے منعم کے دل پر بھی تری مُہرِ جلال
تو قریب و دور کے احساس سے آزاد ہے
خواجہ و مزدور کے احساس سے آزاد ہے
یاسمن کی غنچگی، گل کا تبسم رقص میں
تیری خاطر ہے جہانِ رنگ و بو گُم رقص میں
ہے سمندر اور سمندر کا تلاطم رقص میں
خاکداں کا ذکر کیا ہے بزم انجم رقص میں
اک جہاں تیرے لئے شام و سحر آوارہ ہے
کس کے دل کی قاش تو کس کے جگر کا پارہ ہے
سوئے مغرب جا رہا ہے رنگ برساتا ہوا
جیسے اک مزدور دن بھر کا تھکا ہارا ہوا
سرخ آغوش فلک میں شعلہ سا دھکا ہوا
جس طرح کوئی سپاہی خون میں ڈوبا ہوا
نونہالان چمن کے خون سے رنگیں ہے تو
کیا شہیدان وطن کے خون سے رنگیں ہے تو
غنچہ و گل ہوں رہا اور آشیاں آزاد ہو
بلبلیں آزاد ہوں اور گلستاں آزاد ہو
ایشیا آزاد ہو، ہندوستاں آزاد ہو
حلقۂ زنجیر سے کون و مکاں آزاد ہے
مجھ سے ٹکرا کے اٹھے ہستی سے اٹھلاتا ہوا
ذرہ ذرہ گیت آزادی کا ہو گاتا ہوا

سماج

کِھل کھلاتے ہوئے چہروں پہ نہ جا جان بہار   اے مری جان بہار
خندہ جز شورشِ آغوشِ بلا کچھ بھی نہیں
نغمہ جُز ماتمِ تابوتِ صدا کچھ بھی نہیں
ہر روشِ صحن گلستاں کی مزار بُو ہے
گود میں موجِ تبسم کی فقط آنسو ہے
جگنوؤں کا یہ چراغاں ہے شراروں کا فریب
لالہ و گل کا تبسم ہے بہاروں کا فریب
کھل کھلاتے ہوئے چہروں پہ نہ جا جان بہار   اے مری جان بہار
چہچہاتے ہوئے چہروں پہ نہ جا جان سخن   اے مری جان سخن
جھوٹ نے مستئ گفتار کا بدلا ہے لباس
غیبت و کذب کا رنگین و تراشیدہ لباس
بحرِ تکذیب کے ٹھیرے ہوئے دھارے ہیں یہ ہونٹ
یا جہنم کے دریچوں کے کنارے ہیں یہ ہونٹ
جھوٹ سے فاش نہ ہونے کی قسم لیتے ہیں
سچ کو اک آن میں الہام بنا دیتے ہیں
چہچہاتے ہوئے ہونٹوں پہ نہ جا جان سخن   اے مری جان سخن
شہد آمیز نگاہوں پہ نہ گِر کیف نظر   اے مرے کیف نظر

یوں تو شیریں ہیں بہر طور مئے زیست کے جام
لیکن احساس میں یہ جام ہیں زہر آب تمام
تلخیاں جھانک رہی ہیں کوئی جیتا تو نہیں
بادۂ عیش جہاں میں کوئی پیتا تو نہیں
میٹھی میٹھی یہ نگاہیں یہ تبسم یہ نیاز
سب کے پردے میں ہے اک تلخ حقیقت کا راز

شہد آمیز نگاہوں پہ نہ گر کیف نظر — اے مرے کیف نظر
گنگناتی ہوئی بانہوں پہ نہ جا ساز خیال — اے مرے کیف خیال

استعارہ ہیں یہ ہیروں سے لدی ٹہنی کا
اک ستوں چاہئے اس بیل کو زر دوزی کا
حلقہ کرتی ہیں یہ زریں کمر و گردن کا
عکس پڑتا ہے بہاروں پہ ہی اس گلشن کا
فن ہو یا حسن جوانی ہو کہ پیغامبری
ہار پڑتا نہیں مفلس کے گلے میں تو کبھی
گنگناتی ہوئی بانہوں پہ نہ جا ساز خیال — اے مرے ساز خیال
عطر آلود نگاہوں پہ نہ جا روح گلاب — اے مری روح گلاب

اس طرف دیکھ کہ تو دیکھ کے رہ جائیگا دنگ
عہد تہذیب میں بھی آدمی ہے ننگ دھڑنگ
ہے یہی مرکز بو اور یہی مخزن رنگ
جسم عریاں پہ مگر جامۂ انفاس ہے تنگ
توشہ خانے سے غریبوں کے آڑے ہیں یہ لباس
عطر آلود لباسوں پہ نہ جا روح گلاب — اے مری روح گلاب
ان خطرناک کھلونوں پہ نہ مٹ حسن نظر — اے مرے حسن نظر

چلتے پھرتے جو نظر آتے ہیں تہذیب کے بت
ترشے ترشائے ہوئے آذر تادیب کے بت
ان کے دل سنگ ہیں جاں سرد ہے سینے تاریک
ان کے دریا ہیں سراب ان کے سفینے تاریک
کوئی در ان پہ سیہ کاریوں کا بند نہیں
جان ابلیس ہیں تہذیب کے فرزند نہیں
ان خطرناک کھلونوں پہ نہ مٹ حسن نظر — اے مرے حسن نظر
ریگ زاروں کی گھٹاؤں پہ نہ جا کشت حیات — اے مری کشت حیات

کبھی مجبور یہ ہو بارش الطاف امیر
ایک ہو جائے کبھی قسمت صیاد و اسیر
زہر خود شہد بنے آب ہو خود موجۂ شیر
اپنی ہر کاٹ سے پیدا کرے امرت شمشیر
جذبۂ جبر کے ہونٹوں پہ تبسم ہو محال
ظلم کی روح کو احساس ترحّم ہو محال
ریگ زاروں کی گھٹاؤں پہ نہ جا کشت حیات
مسکراتی ہوئی آنکھوں پہ نہ مٹ حسن نظر
اے مری کشت حیات
اے مرے حسن نظر

انتخاب نظم (پجارن)

اے مندر کا راز پجارن
اے فطرت کا ساز پجارن
پریم نگر کی رہنے والی
ہر کی بتیاں کہنے والی
سیدھی سادی بھولی بھالی
بات نرالی گات نرالی
گردن میں تلسی کی مالا
دل میں اک خاموش شوالہ
ہونٹوں پر پیمانے رقصاں
آنکھوں میں میخانے رقصاں

اے دیوی کا روپ پجارن
تیرا روپ انوپ پجارن

بھینی بھینی بو ساری میں
ساری مدھ میں تو ساری میں
آنکھوں میں جمنا کی موجیں
بالوں میں گنگا کی لہریں
نور ترے رخسار حسیں پر
رنگیں ٹیکا پاک جبیں پر
جیسے فلک پر صبح کا تارا
روشن روشن پیارا پیارا
شرمیلی معصوم نگاہیں
گوری گوری نازک باہیں

اے دیوی کا روپ پجارن
تیرا روپ انوپ پجارن

نور کے تڑکے گھاٹ پر آ کر
گنگا کا سمنان بڑھا کر
بھر کے کر خوشبوئیں ساری
چندن جل اور دوب سپاری
صبح کے جلووں کو تڑپا کر
نظارے سے آنکھ بچا کر
اے مندر میں آنے والی
پریم کے پھول چڑھانے والی
ہستی بھی ہے گلشن تجھ سے
سورج بھی ہے روشن تجھ سے

اے دیوی کا روپ پجارن
تیرا روپ انوپ پجارن

آ ! تیری صورت کو پوجوں میں زندہ مورت کو پوجوں
تو دیوی میں تیرا پجاری نام تیرا ہر سانس سے جاری
لاگ کی آگ نے تن کو بھونا پھر مندر ہے دل کا سونا
من میں تیرا روپ بسا لوں تجھ کو من کا چین بنا لوں
چھپ جا میرے دل کے اندر ہو جائے آباد یہ مندر
اے دیوی کا روپ پجارن
تیرا روپ انوپ پجارن

رباعی

ہوتی نہیں ختم داستانِ ہستی مٹتا نہیں حشر تک نشان ہستی
ہے موت بھی ایک وقفۂ کیف و سرور دم لے کے چلے گا کاروانِ ہستی

ڈاکٹر تاثیر

محمد دین نام تاثیر تخلص ۱۹۰۲ء میں قصبہ اجنالہ ضلع امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ابھی تاثیر کم سن ہی تھے کہ ۱۹۰۴ء کی وبائے طاعون میں پہلے باپ کے سایے سے پھر ماں کی شفقت سے محروم ہو گئے اور اس کم سن یتیم کو اُن کے خالو میاں نظام الدین نے ' جن کا شمار لاہور کے روساء میں ہوتا ہے اپنے گھر میں پناہ دی ۔ اس طرح تاثیر تین سال کی عمر سے میاں نظام الدین کے گھرانے میں پرورش پانے لگے ۔ میٹرک اسلامیہ اسکول شیرانوالہ گیٹ لاہور سے کیا ۔ پھر ایف ۔ سی کالج میں داخل ہوئے اور وہیں سے ۱۹۲۶ء میں انگریزی میں ایم ۔ اے کا امتحان پاس کیا ۔

ڈاکٹر تاثیر کی ادبی زندگی کا آغاز تو اسکول ہی میں ہو گیا تھا مگر کالج میں اُن کی ادبی صلاحیتوں نے جلا پائی ۔ ۱۹۲۴ء میں وہ ادبی دنیا سے روشناس ہوئے ۔ اُن دنوں ''نیرنگ خیال'' کی بڑی دھوم تھی چنانچہ اُس رسالے کی ادارت ان کے سپرد ہوئی ۔ کچھ عرصہ بعد حفیظ جالندھری نے ''مخزن'' نکالا اور تاثیر کی نظمیں اور مقالے اُس میں چھپنے لگے ۔ ۱۹۲۶ء میں وہ اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی کے لکچرر مقرر ہوئے ۔ کچھ عرصہ بعد مستعفی ہو کر چند روز محکمہ اطلاعات سے وابستہ رہے مگر یہ ملازمت بھی طبیعت کو راس نہ آئی اور اس سے علیحدہ ہو کر ۱۹۲۸ء میں دوبارہ اسلامیہ کالج میں آ گئے اور ۱۹۳۴ء تک وہیں رہے ۔ ۱۹۳۴ء میں وہ ولایت چلے گئے اور کیمبرج میں پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ۔ ۱۹۳۶ء میں واپس آئے اور ایم ۔ اے او کالج امرتسر میں پرنسپل مقرر ہوگئے ۔ کوئی تین سال تک اس درسگاہ سے تعلق قائم رہا ۔ ۱۹۴۰ء میں سری پرتاپ کالج سری نگر کے پرنسپل ہوگئے جنگ کے زمانے میں تعلیمی زندگی سے الگ ہو کر حکومت ہند کی ملازمت اختیار کی اور ۱۹۴۷ء تک مختلف عہدوں پر فائز رہے ۔ ۱۹۴۷ء کے آغاز میں وہ اس ملازمت سے علیحدہ ہو کر سری نگر گئے اور کچھ عرصہ بعد پاکستان چلے آئے اور آزاد کشمیر کے محکمہ نشر و اشاعت کے انچارج ہو گئے ۔ ۱۹۴۸ء میں وہ اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے اور زندگی کے آخری دن تک اسی ادارہ سے متعلق رہے ۔ ۳۰ نومبر ۱۹۵۰ء میں انتقال کیا ۔

ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے اپنی کوئی مستقل یادگار نہیں چھوڑی اور نہ اُن کی کوئی تصنیف شائع ہوئی لیکن اگر اُن کے مضامین کو جمع کیا جائے تو کئی جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں اور یہی حال اُن کے کلام کا ہے ۔ حال ہی میں ایک خبر سننے میں آئی ہے کہ عنقریب اُن کا مجموعہ کلام شائع ہونے والا ہے جس کی ترتیب اُن کے ایک عزیز دوست سید عابد علی صاحب عابد کے سپرد ہوئی ہے ۔ خدا کرے مرحوم کا یہ مجموعہ جلد مدون ہو کر شائع ہو جائے اور مرحوم کا بکھرا ہوا کلام یکجا صورت میں ادبی حلقوں میں پہنچ جائے

ڈاکٹر تاثیر ایک جلیل‌القدر ادیب ' خوش فکر شاعر ' عظیم‌الشان نقاد اور ماہر تعلیم تھے اُن کی ذات مشرق و مغرب کے علوم و فنون کا ایک نہایت موزوں سر چشمہ تھی ۔ گزشتہ بیس پچیس برس میں پنجاب میں جتنے ادیب و شاعر ہوئے ہیں اُن میں تاثیر کا نام ممتاز ہے ۔ اور اُن کی بدولت بہت سے ادیب و شاعر فنی بلاغت حاصل کر سکے ۔ وہ فطرتاً بڑے خوش اخلاق ' بذلہ سنج اور باغ و بہار قسم کے انسان واقع ہوئے تھے ۔ اور قدرتی طور پر اُن میں ایسی صلاحیتیں تھیں کہ وہ ہر محفل پر چھا جاتے تھے ۔ شعر و شاعری کا ذوق اُنھیں بچپن ہی سے تھا ۔ عام شعراء کی طرح اُنھوں نے بھی غزلگوئی سے ابتدائے سخن کی لیکن بہت جلد اُن کی حساس طبیعت ملک کی سیاسی کشمکش اور زبوں حالی سے متاثر ہوئی ۔ ۱۹۳۸ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہوئی جس کے بانیوں میں تاثیر بھی تھے ۔ اسی ایک واقعہ سے اُن کے شاعرانہ رجحانات کا کافی اندازہ ہوتا ہے ۔ پھر علامہ اقبال مرحوم کے فیض صحبت نے اُن کے شاعرانہ مذاق کو خاصی جلا دی اور زبان و بیان میں بھی پختگی پیدا کی ۔ وہ اہل زبان تو نہ تھے مگر اپنی ذاتی دلچسپی و مطالعہ کی بدولت اُنھیں زبان پر بڑا عبور حاصل ہو گیا تھا ۔

اُن کی نظموں میں فنی پختگی کے ساتھ ساتھ زندگی کا گہرا مطالعہ بھی ملتا ہے ۔ اُن کی ابتدائی نظمیں رومانی ہیں مگر اُن میں بھی بڑی شگفتگی‌وتازگی پائی جاتی ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شروع میں غم جاناں کا تذکرہ ہی کافی سمجھتے تھے مگر حالات سے بیداری نے اُنھیں حقائق کے بیان کرنے پر مجبور کر دیا ۔ اُنھیں چونکہ سیاست میں بھی خاصا شغف تھا اسلئے اُن کی نظموں میں انقلابی رنگ کی جھلک بھی پیدا ہو گئی ہے ۔ جس کا اظہار بعض جگہ تو دبے دبے اور ایمائی انداز میں ہوا ہے اور بعض جگہ وہی بے دھڑک و بے جھجک پیرایہ ہے جو اُن کا اسلوب زندگی تھا ۔

انداز بیان میں باوجودیکہ اُنھوں نے روایت سے بغاوت کی ہے اور مروجہ اسلوب سے ہٹ کر نظم آزاد کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا ہے مگر خوبی یہ ہے کہ مفہوم میں کہیں پیچیدگی پیدا نہیں‌ہوتی بلکہ وہ اپنے خیالات کو بڑی روانی کے ساتھ بیان کرتے چلے جاتے ہیں اور قاری اُن کے سمجھنے میں کوئی دقت یا اُلجھن محسوس نہیں کرتا ۔

اُن کے کلام میں یقیناً مزید گہرائی ' رچاؤ اور پختگی پیدا ہوتی مگر افسوس کہ موت کے ظالم ہاتھوں نے اس ہونہار شاعر کو ہم سے چھین کر ہماری ادبی محفلوں کو سونا کر دیا ۔

انتخاب کلام

تغزل

حضور یار میں آنسو نکل ہی آتے ہیں
کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں
مزاج ایک ، نظر ایک ، دل بھی ایک سہی
معاملات من و تو نکل ہی آتے ہیں
ہزار ہم سخنی ہو ، ہزار ہم نظری
مقام جنبش ابرو نکل ہی آتے ہیں
حنائے ناخن پا ہو کہ حلقۂ سر زلف
چھپاؤ بھی تو یہ جادو نکل ہی آتے ہیں
جناب شیخ وضو کے لئے سہی ، لیکن
کسی بہانے اب جُو نکل ہی آتے ہیں
متاع عشق وہ آنسو جو دل میں ڈوب گئے
زمیں کا رزق جو آنسو نکل ہی آتے ہیں

اس طرح آیا کہ اب تک اس طرح آیا نہ تھا
لو پریشاں ، چاک داماں ، دست افشاں آ گیا
جیسے صحرا میں گھٹائیں جیسے اندھیاری میں چاند
رخ پہ بکھرائے ہوئے زلف پریشاں آ گیا
اس طرح آیا کہ جیسے کاروانِ فصل گل
یک گلستاں بر کف و صد گل بداماں آ گیا
خانقاہوں کی ترق ، مسجدوں کی رونقیں
میرے گھر میں وہ عدوئے دین و ایماں آ گیا
ہوش میں آ ، سر اٹھا تاثیر ، آنکھیں کھول ، دیکھ
تیری آنکھوں کی قسم وہ شاہِ خوباں آ گیا

لبا لب جام پھر ساقی نے واپس لے لیا مجھ سے
نہ جانے کیا کہا میں نے نہ جانے کیا ہوا مجھ سے
مری توبہ ، مجھے باور ، وہ کافر ہے ، وہ کافر ہے
خفا تو بھی ہوا جاتا ہے اے میرے خدا مجھ سے

چھپا پھرتا ہوں اب تک تیری آنکھوں سے مگر کب تک
یہ کہہ ڈالیں گی اک دن میرے دلکا مدعا مجھ سے
مجھے معلوم ہے ''تاثیر'' سب کچھ جانتا ہوں میں
ارے اب پی بھی جا کیوں بن رہا ہے پارسا مجھ سے

حسن کے راز نہاں شرح بیاں تک پہنچے
آنکھ سے دل میں گئے ' دل سے زباں تک پہنچے
دل نے آنکھوں سے کہی آنکھوں نے دل سے کہدی
بات چل نکلی ہے ' اب دیکھیں کہاں تک پہنچے
کعبہ و دیر میں تو لوگ ہیں آتے جاتے
وہ نہ لوٹے جو در پیر مغاں تک پہنچے

تری نیم کش نگاہیں ترا زیر لب تبسم
یونہی اک ادائے مستی یونہی اک فریب سادہ
وہ کچھ اس طرح سے آئے مجھے اس طرح سے دیکھا
مری آرزو سے کم تر مری تاب سے زیادہ

سجدوں سے نامراد ہے جلوؤں سے نا امید
وہ رہگزر کہ اب جو تری رہگزر نہیں
بے باک چال ' چال سے بے باک تر نظر
اب حسن تو بہت ہے مگر فتنہ گر نہیں
دنیائے چشم و گوش تو برباد ہو گئی
اب کچھ بغیر معرکۂ خیر و شر نہیں

زلف آوارہ ' گریباں چاک ' اے مست شباب
تیری صورت سے تجھے درد آشنا سمجھا تھا میں

بہت ہجوم تھا مسجد میں میکدے کی طرح
میں لوٹ آیا شریک نماز ہو نہ سکا

یوں ہی بیٹھے ہیں ترے در پہ تو بیٹھے ہیں مگر
پھر نہ ہم لوٹ کے آئینگے جو اک بار گئے

منظومات

رس بھرے ہونٹ

رس بھرے ہونٹ ،
پھول سے ہلکے ،
جیسے بلور کی صراحی میں
بادۂ آتشیں نفس جھلکے ،
جیسے نرگس کی گول آنکھوں سے
ایک شبنم کا ارغواں قطرہ
شفق سرخ سے در خشندہ
دھیرے دھیرے سنبھل سنبھل ڈھلکے ،
رس بھرے ہونٹ یوں لرزتے ہیں !—
یوں لرزتے ہیں جس طرح کوئی
رات دن کا تھکا ہوا راہی
پاؤں چھلنی ، نگہ متزلزل !—
وقت صحرائے بیکراں کہ جہاں
سنگ منزل نما ، نہ آج ، نہ کل—
دفعتاً دور — دور !— آنکھ سے دور
شفق شام کی سیاہی میں
قلب کی آرزو نگاہی میں
فرش سے عرش تک جھلک اٹھے
ایک دھوکا — سراب — منبع نور !
رس بھرے ہونٹ دیکھ کر تاثیر
رات دن کے تھکے ہوئے راہی
یوں ترستے ہیں ، یوں لرزتے ہیں !—

لندن کی ایک شام (مرحوم کی سب سے آخری نظم)
۱۹۵۰ء

یہ رھگزر
یہ زن و مرد کا ھجوم یہ شام
فراز کوہ سے جس طرح ندیاں ، سر پر
لئے ہوئے شفق آلود برف کے پیکر
سفید جھیل کی آغوش میں سمٹ جائیں !—
یہ تند گام سبک سیر کاروانِ حیات
''نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم''
کدھر سے آئے کدھر جا رہے ھیں کیا معلوم !—
سنہری شام میں
اسی* روس جھلملاتا ہوا
بندھا ہوا ہے نشانہ ،کِھنچی ہوئی ہے کماں
کسے یہ تیر لگے گا
کہاں ؟ یہاں کہ وھاں !—
نظر نظر سے ملی دل کا کام ختم ہوا۔

سنہری شام میں
اسی روس جگمگاتا ہے
کوئی ھنسے کوئی روئے یہ مسکراتا ہے
اسی مقام پہ پھر لوٹ کر میں آیا ھوں
یہ رھگزر ، یہ زن و مرد کا ھجوم یہ شام
یہ تند سیر سبک گام کاروان حیات
یہ جوش رنگ ، یہ طغیانِ حسن کے جلوے:
یہیں کے نور سے روشن مری نگاھیں ھیں
مرے شباب کی روندی ہوئی یہ راھیں ھیں !—
وھی مقام ہے لیکن وھی مقام نہیں
یہ شام تو ہے مگر وہ سنہری شام نہیں
وہ رعب داب نہیں ہے وہ دھوم دھام نہیں

---

* عشق کے دیوتا کا مجسمہ جو لندن کے مشہور چوک (پکاڈلی سرکس) میں استادہ ہے۔

وہ میں نہیں ہوں کہ آن کا میں اب غلام نہیں !
صنم کدوں میں آجائے نہیں رہے کہ جو تھے
کہ اب وہ دیکھنے والے نہیں رہے کہ جو تھے

میخانہ افرنگ

تیرے ہر جام کا یکساں ہے مزا اے ساقی
اب پلائی ہے تو کچھ اور پلا اے ساقی
تجھ پہ کیوں مست ہوئے بیٹھے ہیں رندان کہن
وہ ترے پاس نیا نشہ ہے کیا اے ساقی
وہی پیمانہ فروشی وہی قطروں کا شمار
وہی انداز پرانا ہے ترا اے ساقی
وہی آقائی و محکومی کی زنجیریں ہیں
وہی بندے ہیں وہی آن کے خدا اے ساقی
جاں بلب پیاس سے کوئی، کوئی بدمستی سے
کیا یہی مے ہے تری ''آب بقا'' اے ساقی
اب نئے رنگ کے مے خوار یہاں آئیں گے
ب یہاں سے تو دکاں اپنی بڑھا اے ساقی

اب یہاں سود و زیاں کا نہ تقاضا ہوگا
غم امروز نہ اندیشہ فردا ہوگا
عہد سلطانئی جمہور کی ساعت ہے قریب
تو معزز جسے سمجھا ہے وہ رسوا ہوگا
تیری تلچھٹ کی گدائی پہ جو اب ہے مجبور
وہی مجبور بچارا ترا آقا ہوگا
یوں ہی رکھے ہوئے رہ جائیں گے آداب و رسوم
جانے اے پیر مغاں حشر ترا کیا ہوگا
پھر بہار آئی، گئی جیب و گریباں کی تمیز
قیس پھر دست کش دامن صحرا ہوگا
کھیلی جائیگی نئے رنگ کی ہولی ''تاثیر''
میکشو ! مژدہ کہ جاری یہ تماشا ہوگا

تاثرات

میری وفائیں یاد کرو گے　　روؤ گے فریاد کرو گے
مجھ کو تو برباد کیا ہے　　اور کسے برباد کرو گے
ہم بھی ہنسینگے تم پر اک دن　　تم بھی کبھی فریاد کرو گے
محفل کی محفل ہے غمگیں　　کس کس کا دل شاد کرو گے
دشمن تک کو بھول گئے ہو　　مجھ کو تم کیوں یاد کرو گے
ختم ہوئی دشنام طرازی ؟　　یا کچھ اور ارشاد کرو گے
جا کر بھی ناشاد کیا تھا　　آ کر بھی ناشاد کرو گے

چھوڑو بھی تاثیر کی باتیں
کب تک اس کو یاد کرو گے

ید بیضا [1]

مجھے تلاش رہی ہے
نہیں تلاش نہیں !
تلاش میں تو طلب
جستجو سی ہوتی ہے
دبی دبی ہی سہی
آرزو سی ہوتی ہے
نہ آرزو نہ طلب ہے نہ جستجو نہ تلاش
ذرا سی ایک جراحت ذرا سی ایک خراش
میان قلب و نظر اک مقام ہے اس کا
مقام ؟ مرحلہ ؟ جو کچھ بھی نام ہے اس کا
جہاں خیال کے پیکر بنائے جاتے ہیں
نگاہ گوش کو نغمے دکھائے جاتے ہیں
وہ طور جلوۂ معنی
وہ کار گاہ کمال

[1] ''ید بیضا'' جسے تاثیر کی شاعری کا شاہکار کہنا چاہئیے۔ اردو ادب میں ایک نئی چیز ہے ۔ معنوی اعتبار سے یہ نظم اُن جذبات و کیفیات کی ترجمانی کرتی ہے جو فنون لطیفہ کی تخلیق میں کار فرما ہوتی ہیں اور باعتبار اسلوب اس نظم میں منطقی تعریف کی کاوش و احتیاط اور رچی ہوئی شعریت اپنی مثال آپ ہے ۔

تصورات کی آلائشوں سے پاک خیال
تعینات سے بے باک واردات جمال
ہوس ، نہ عشق ، نہ منزل نہ سرحدیں نہ حدود !

"جمال : تابش رو ، گرمئی خرام نہیں
ہزار ایسی ادائیں ہیں جن کا نام نہیں !"

یہ جھلکیاں
یہ ادائیں
یہ پرفشاں سائے
یہ جھلملاتے
ابھرتے
دبے ہوئے سے نقوش
سواد قوس خم و گردش و نشور و سرور !

یہ کائنات مری کائنات ہو ، یہ نہیں
ہر ایک بات مگر میری بات ہو یہ نہیں
میں دن کو رات بتاؤں تو رات ہو یہ نہیں

نہیں ! مجھے یہ خلش یہ ہوس نہیں ہوتی
بقدر جام یہاں اذن عام ہے سب کو
یہ میکدہ ہے یہاں پیش و پس نہیں ہوتی !

مگر کبھی کوئی گم گشتہ رہ نورد غزال
مری کمندِ نظر کا شکار ہو جائے !
حریم ناز کا پردہ صبا الٹ ڈالے
کسی کا راز دروں آشکار ہو جائے !

یہ مدعا طلبی یہ نظر کی آلائش
یہ حسن رھگزری یہ سرودِ نشر گہی

یہ شمع طاق حرم ، یہ شرار بو لہبی
یہ منتہائے نظر ، یہ مآل کار نہیں !

"نہیں نہیں" کی یہ تکرار ، ہر جگہ یہ "نہیں"
کہ جیسے علم و عمل میں تضاد ہو جائے
کہ جیسے قلب و نظر میں فساد ہو جائے
کہ جیسے .... کیا میں کہوں
"یہ نہیں" یہ تشبیہیں

یہ اعتقاد کے اثبات کی نہی سے نہیں
وفور شوق کی جذبات کی کمی سے نہیں!

بساط کیف ہے اک کار زار جوش نمود
روش روش ہمہ رامش، چمن چمن ہمہ رنگ
خطوط نسخ و مناشیر و سنبل و ریحاں
نوائے بربط و طنبورہ و دف و نے و چنگ

نمود سر بسر اظہار و کوہکن یک تن
ہزار پیکر شیریں فسرد در رگ سنگ

کسی نے مسند سنگ سیہ پہ لی کروٹ
برنگ موج ابھرنے لگے نشیب و فراز
کھلا ہے ضربت تیشہ سے اک دریچۂ سرخ
قطار بستہ ہوئے کھڑے ہیں محو نیاز
عمود ہمت و قوس نیاز و محور درد
بدن ڈھلے ہوئے انگڑائیوں میں بے سرو دست
تنے کسے ہوئے سینے بلند سر بد مست

شکار ماہ کہ تسخیر آفتاب کروں
میں کس کو ترک کروں کس کا انتخاب کروں

وہ ایک اجنبی ساحل وہ شام تنہائی
حریف کثرت نظارہ دل کی یکتائی
جواب جوشش دریا صدف کی پنہائی!

وہ رنگ و صوت کا عالم حواس کی دنیا
وہ غور و فکر کی خوف و ہراس کی دنیا
وہ ماورا کا جہاں، آس پاس کی دنیا

افق پہ وہ شفق آلودہ بادلوں کے ہجوم
مصوروں نے لگائے ہیں نقش رنگ برنگ
مچی ہوئی ہے چٹانوں میں جل ترنگ کی دھوم
مغنیوں نے اڑائے ہیں موج کے آہنگ

مرے حروف مرے لفظ میرا طرز کلام
نہ ان میں لمس نہ رنگت نہ ذائقہ نہ مشام

چمن کا رنگ نہیں ہے گہر کی آب نہیں
مگر وہ کیا ہے کہ جس کا یہاں جواب نہیں

حکایت غم دل روئداد کون و مکاں
حدیث مطرب و مے حادثات دور زماں
جمال زہرہ جبیناں جلال کجکلہاں

یہ چند حرف یہ لفظوں کے جوڑ یہ پیوند
ردیف و قافیہ و مثنوی و قطعہ و بند
"مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند آفتاب می سازند"

مرا کلام ہے میرا کلام ہی لیکن
یہ میری بات جو ہے میری اپنی بات نہیں
معاملات غزل ہیں معاملات غزل
یہ آپ بیتی یہ میرے معاملات نہیں

وہ صبحدم سر مژگاں لہو سے تر آنسو
وہ نوک خار پہ شبنم کے ارغواں قطرے
لرز لرز کے جو سنبھلیں ، سنبھل سنبھل ڈھلکیں
تصورات کی آمیزشیں یہ تشبیہیں

یہ واقعات نہیں ہیں یہ واردات نہیں
یہ اور بات ہے قلب و نظر کی بات نہیں

کلیم غش میں گرا ، طور جل کے خاک ہوا
نظر کی بات رہی اور نہ دل کی بات رہی
شہود و شاہد و مشہود کے حدود کہاں
نہ اس کی ذات رہی اور نہ اُس کی ذات رہی

مگر وہ ایک دھکتا ہوا نشاں کہ جو ہے
متاع عرض تماشا بس اور کچھ بھی نہیں
وہی کہ جس سے درخشاں ہے خاکدانۂ حیات
وہی کہ جس سے ہے لمحات زندگی کو ثبات
وہی حیات کا مقصد وہی بنائے حیات
وہی کہ ہے ید بیضا بس اور کچھ بھی نہیں

یہی ہے ، کچھ بھی نہیں اور کائنات مری
مری حیات ادب ہے ادب حیات مری

میان قلب و نظر اک مقام ہے اُس کا
مقام ؟ مرحلہ ؟ جو کچھ بھی نام ہے اُس کا
جہاں خیال کے پیکر بنائے جاتے ہیں
نگاہ گوش کو نغمے دکھائے جاتے ہیں

(اپریل تا جون ۱۹۵۰ء)

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم

صوفی غلام مصطفیٰ متخلص بہ تبسم امرتسر کے رہنے والے ہیں ۔ جہاں اُن کے بزرگ کشمیر سے آ کر آباد ہو گئے تھے ۔ صوفی صاحب کی ولادت ۴ اگست ۱۸۹۹ء کو امرتسر ہی میں ہوئی لیکن آپ کی عمر کا بیشتر حصہ لاہور میں گزرا ہے ۔ ابتداً آپ بی ۔ اے ۔ بی ۔ ٹی کر کے گورنمنٹ اسکول میں مدرس ہوئے پھر فارسی میں ایم ۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں السنہ شرقیہ کے پروفیسر ہو گئے ۔ کچھ عرصہ بعد جب ٹریننگ کالج میں اورینٹیل ٹریننگ کی جماعتیں ختم ہو گئیں تو آپ تبدیل ہو کر گورنمنٹ کالج لاہور میں چلے آئے اور اپنی تمام مدت ملازمت اس معروف درسگاہ میں گذار کر یہیں سے ریٹائر ہوئے ۔ اس دوران میں آپ عرصہ تک فارسی کے صدر شعبہ رہے اور کچھ مدت تک فارسی کے علاوہ شعبہ اُردو کے بھی صدر رہے ۔

تبسم صاحب کو شعر و ادب سے فطری لگاؤ ہے نیز اُن کی تمام عمر چونکہ علمی اور ادبی ماحول میں گزری ہے اس لئے اُن کا ادبی مذاق بھی نہایت سلجھا اور نکھرا ہوا ہے ۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن سے ہے لیکن زیادہ تر فارسی میں کہتے رہے ہیں ۔ آپ کا کلام نگار اور ملک کے دیگر مقتدر ادبی رسائل میں طبع ہو کر بہت مقبول ہو چکا ہے ۔ تاہم اس عرصہ میں وہ اُردو میں بھی برابر طبع آزمائی کرتے رہے ہیں بالخصوص چند سالوں سے تو اُنھوں نے فارسی کے مقابلے میں اُردو میں بہت زیادہ کہا ہے ۔ اور غزل نظم ، قطعہ ، رباعی غرضکہ ہر صنف میں اُن کی شاعری کے نہایت دلکش نمونے موجود ہیں ۔

صوفی صاحب بڑے مشاق مگر محتاط سخنور ہیں ۔ اُنھوں نے بحیثیت مجموعی کم کہا ہے لیکن جو کچھ کہا ہے اُس میں اُستادانہ فکر و فن کے جوہر بڑی مشاطگی سے سموئے ہیں ۔ خاص طور پر اُن کی غزلیں جتنی حسن و عشق کی رنگین داستان ہیں تقریباً اتنی ہی حساس اور درد مند دل کی کہانی بھی ہیں ۔ یہ بات بلاشبہ اس دور کے اکثر متغزلین کے یہاں عام ہے چونکہ آج کے بدلے ہوئے حالات میں غم عشق کے ساتھ غم روزگار کا بیان ناگزیر سا ہو گیا ہے مگر تبسم صاحب نے ان جذبات و خیال کو جس سادگی و صفائی ، نغمگی و ترنم اور لطافت و شیرینی کے ساتھ شعر کے قالب میں

ڈھالا ہے اُس سے اُن کے اسلوب بیان میں ایک امتیازی شان پیدا ہو گئی ہے۔ اور اسی بیان کی بدولت اُن کی چھوٹی بحر والی غزلیں سہل ممتنع کی خصوصیات سے مالا مال ہیں۔ مثال کے طور پر اُن کی ایک غزل کے چند شعر دیکھئے۔

ہر اک نے اک بات کہی — کوئی نہ سمجھا دل کی بات
شام و سحر کا نام نہ تھا — ایسے بھی دیکھے دن رات
دل کے ہاتھوں ہم مجبور — دل کی لاج پرائے ہات
حسن کے تیور کیا کہیئے — ہر لحظہ اک تازہ بات
تم بھی ضبط کرو ہم بھی — عشق ہے کس کے بس کی بات

جن سے کلام کی اس خوبی کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مزید برآں اُن کے تغزل میں ایک ایسی گھلاوٹ اور سریلا پن پایا جاتا ہے جس میں کہیں کہیں گیتوں کا سا رس اور لوچ ہے۔

انتخاب کلام

غزلیات

ہزار گردش شام و سحر سے گزرے ہیں — وہ قافلے جو تیری رہگذر سے گزرے ہیں
ابھی ہوس کو میسر نہیں دلوں کا گداز — ابھی یہ لوگ مقام نظر سے گزرے ہیں
ہر ایک نقش پہ تھا تیرے نقش پا کا گماں — قدم قدم پہ تیری رہگذر سے گزرے ہیں
نہ جانے کون سی منزل پہ جا کے رک جائیں — نظر کے قافلے دیوار و در سے گزرے ہیں
رحیل شوق سے لرزاں تھا زندگی کا شعور — نہ جانے کس لئے ہم بے خبر سے گزرے ہیں
کچھ اور پھیل گئیں درد کی کٹھن راہیں — غم فراق کے مارے جدھر سے گزرے ہیں
جہاں سرور میسر تھا جام و مے کے بغیر — وہ میکدے بھی ہماری نظر سے گزرے ہیں

شجر شجر نگراں ہے کلی کلی بیدار
نہ جانے کس کی نگاہوں کو ڈھونڈتی ہے بہار
نہ جانے کس کے نشاط قدم سے ہیں محروم
کہ ایک عمر سے سونے پڑے ہیں راہگذار
یہ برق حسن اور اس پر یہ تیری خوئے حجاب
یہ سیل عشق اور اس پر نظر نظر کا شمار

ابھی چمن کو میسر نہیں ہے رنگ چمن
بہار ڈھونڈ رہی ہے ابھی سراغ بہار

ایسے بھی تھے کچھ حالات
دل سے چھپائی دل کی بات
ہر اک نے اک بات کہی
کوئی نہ سمجھا دل کی بات
شام و سحر کا نام نہ تھا
ایسے بھی دیکھے دن رات
عشق کی بازی کیا کہئے
سوچ سمجھ کر کھائی مات
دل کے ہاتھوں ہم مجبور
دل کی لاج پرائے ہات
حسن کے تیور کیا کہئے
ہر لحظہ اک تازہ بات
اشکوں کا طوفان اٹھا
غم میں ڈوب گئی برسات
تم بھی ضبط کرو ہم بھی
عشق ہے کس کے بس کی بات

جب بھی دو آنسو نکل کر رہ گئے
درد کے عنواں بدل کر رہ گئے
کتنی فریادیں لبوں پر رک گئیں
کتنے اشک آہوں میں ڈھل کر رہ گئے
رخ بدل جاتا مری تقدیر کا
آپ ہی تیور بدل کر رہ گئے
تیرے انداز تبسم کا فسوں
حادثے پہلو بدل کر رہ گئے

دل کا افسانہ ہی کیا ہے
بھولنے والا بھول نہ جائے
ایک افسانہ کہتے کہتے
کتنے افسانے یاد آئے
جو کچھ بھی میں کہنا چاہوں
تیرا نام زباں پر آئے

نظر میں ڈھل کے ابھرتے ہیں دل کے افسانے
یہ اور بات ہے دنیا نظر نہ پہچانے
وہ بزم دیکھی ہے میری نگاہ نے کہ جہاں
بغیر شمع بھی جلتے رہے ہیں پروانے
یہ کیا بہار کا جوبن، یہ کیا نشاط کا رنگ
فسردہ میکدے والے، اداس میخانے
نگاہ ناز میں دل سوزئی نیاز کہاں
یہ آشنائے نظر ہیں دلوں کے بیگانے

وہ دیکھتے ہیں تبسم مرے لبوں کی ہنسی
جو مرے دل پہ گزرتی ہے کوئی کیا جانے

رسم مہر و وفا کی بات کریں ۔ پھر کسی دلربا کی بات کریں
سخت بیگانۂ حیات ہے دل ۔ آؤ اس آشنا کی بات کریں
گیسوؤں کے فسانے دھرائیں ۔ اپنے بخت رسا کی بات کریں

سحر فسردہ فسردہ ہے شام اُداس اُداس ۔ عجیب گردش لیل و نہار ہے ساقی
ٹھہر گئے ہیں کہاں قافلے محبت کے ۔ ہر ایک راہگذر سوگوار ہے ساقی
دبی دبی سی ہے کچھ اسطرح سے جان حزیں ۔ تری نگاہ بھی اب دل پہ بار ہے ساقی
ہمارے جذبۂ ذوق نظر کا کیا ہوگا ۔ تری نگاہ تغافل شعار ہے ساقی
یہ سحر بار تبسم ' یہ خندہ بار نگاہ
نظر کا نشہ ہے دل کا خمار ہے ساقی

دیکھ کیا کر رہے ہیں اہل زمیں ۔ آسماں کے ستم کی بات نہ کر
سخت اُلجھی ہیں زیست کی راہیں ۔ زلف کے پیچ و خم کی بات نہ کر
آج سود و زیاں کا سودا ہے ۔ آج دیر و حرم کی بات نہ کر

ہر اپنی داستاں کو کہا داستان غیر ۔ یوں بھی کسی کا راز چھپانے چلے گئے
میں جتنا اُن کی یاد بھلاتا چلا گیا ۔ وہ اور بھی قریب تر آتے چلے گئے

یہ تیرا ہی فیضان غم ہے کہ میں نے ۔ غم زندگی کر لیا ہے گوارا
فسون تمنا کی سو داستانیں ۔ نگاہ کم آمیز کا اک اشارا

آہوں کے نغمے ' اشکوں کے تارے ۔ کتنے حسیں ہیں غم کے سہارے
چھوٹا سا اک دل اُلفت کی دولت ۔ کیا کوئی جیتے کیا کوئی ہارے

اس موسم گل ہی سے بہکے نہیں دیوانے ۔ ساتھ ابر بہاراں کے وہ زلف بھی لہرائی
ہر درد محبت سے اُلجھا ہے غم ہستی ۔ کیا کیا نہیں یاد آیا جب یاد تری آئی
چرکے وہ دئے دل کو محرومئی قسمت نے ۔ اب ہجر بھی تنہائی اور وصل بھی تنہائی

دیکھے ہیں بہت ہم نے ہنگامے محبت کے آغاز بھی رسوائی انجام بھی رسوائی
وہ مست نگاہیں ہیں یا وجد میں رقصاں ہے تسنیم کی لہروں میں فردوس کی رعنائی

وہ طوفان ہوس تھا آرزو کا کہ ناموس محبت ڈگمگائی
محبت کی خموشی بھی فسانہ محبت کی فغاں بھی خوشنوائی
محبت کا وہ سنگ آستاں ہے لرزتی ہے جبین پارسائی
ہنسی کیا آئی ان نازک لبوں پر
''تبسم'' ایک دنیا مسکرائی

ہم بھی سر راہ منتظر ہیں دیکھیں کب ادھر نظر کریں گے
افسانۂ غم طویل ہے دوست اس بات کو مختصر کریں گے
ہے شام فراق سخت تاریک اس شام کی اب سحر کریں گے
آئے گا تبسم ان لبوں پر آنسو بھی کبھی اثر کریں گے

دل کو جب بے کلی نہیں ہوتی زندگی ' زندگی نہیں ہوتی
جان پر کھیلتے ہیں اہل وفا عاشقی دل لگی نہیں ہوتی
کیا کرو گے کسی کی دلداری تم سے تو دلبری نہیں ہوتی
موت کی دھمکیاں نہ دو مجھکو موت کیا زندگی نہیں ہوتی ؟
عشق میں ہوشیاریاں بھی ہیں محض وارفتگی نہیں ہوتی
عشق کی اشک ریزیوں کے بغیر آبرو حسن کی نہیں ہوتی
دل ''تبسم'' کسی کو دو پہلے
مفت میں شاعری نہیں ہوتی

ہوتا تھا اثر کبھی فغاں کا منہ دیکھ رہا ہوں آسماں کا

تو نے کھائی تو قسم ضبط محبت کی مگر وہ کہیں بزم میں آ جائیں تو پھر کیا ہوگا
دیکھ اے جذبۂ بے تاب سنبھل کر رہنا آج سنتے ہیں وہ پھر انجمن آرا ہوگا

بارگاہ حسن میں

جہاں میں خلد مسرت کی یادگار ہے تو
مرا فسانۂ غم سن کے سوگوار نہ ہو
تو نو عروس شبستان زندگانی ہے
تو نو بہار گلستان شادمانی ہے
شباب کھیل رہا ہے ترا بہاروں میں
نشاط حسن کے شاداب خندہ زاروں میں
سرور و خواب کی دنیائے کیف بار ہے تو
مرا فسانۂ غم سن کے سوگوار نہ ہو
تری نگاہ میں فردوس رقص کرتے ہیں
لبوں پہ جنتیں عشرت کی مسکراتی ہیں
تری اداؤں پہ لرزاں ہیں کوثر و تسنیم
ضیائیں حور و ملائک کی جگمگاتی ہیں
ترا شباب طرب زار حسن فطرت ہے
جہاں میں تو ابدی راحتوں کی جنت ہے
مرا فسانۂ غم سن کے اشکبار نہ ہو
سکون قلب کو تکلیف اضطراب نہ دے
خدا کے واسطے تیغ نگہ کو آب نہ دے

مرد مومن

ترے ضمیر میں پوشیدہ کائنات کا راز
تری نظر میں دو عالم کی وسعتیں پنہاں
سکوں کی جنتیں آسودہ تیرے سینے میں
تری جبیں پہ تری بے نیازیاں رقصاں
ترے خیال سے لرزاں ہے شوکت الوند
ترے سجود سے ہے سرنگوں سپہر بلند
ترے نیاز سے خائف غرور قیصر و جم
تری نماز کے آگے سرِ ملائک خم
ترے جمال سے رخشندہ کائنات کا حسن
ترے جلال سے پائندہ عظمت انسان

ہر اک نفس میں نہفتہ حیات نو کی لگن
ہر اک نگاہ تری تازہ سرخوشی کی لگن

قطعات

آرزو کا گداز افسردہ
شمع غم کی بجھی بجھی تنویر
آ ! کہ یہ زندگی ہے تیرے بغیر
اک پریشان خواب بے تعبیر

آج کچھ مضمحل سی یادوں کے
یوں سلگنے لگے ہیں افسانے
جیسے اک نیم سوز شمع کے گرد
سسکیاں لے رہے ہوں پروانے

کتنی ہنگامہ خو تمنائیں
مضمحل ہو کے رہ گئیں دل میں
جیسے طوفاں کی مضطرب موجیں
سو گئی ہوں کنارے ساحل کے

دل کی ہر آرزو ہے خوابیدہ
اب نہ وہ کیفیت نہ سوز نہ رنگ
ہر نظر ایک شعلۂ بے نور
ہر نفس ایک ساز بے آہنگ

آنسوؤں میں الم کا رنگ نہ تھا
قہقہوں میں خوشی کی بات نہ تھی
تھے عجب ڈھنگ زندگانی کے
کوئی بھی زندگی کی بات نہ تھی

ہر خزاں غارت چمن ہی سہی
پھر بھی اک سرخوشی بہار میں ہے
موت پر اختیار ہو کہ نہ ہو
زندگی اپنے اختیار میں ہے

اے درخشندہ ماہتاب بتا
ان ستاروں کی بزم میں رہ کر
کتنی ہنگامہ آفریں راتیں
ہم نے تنہائیوں میں کاٹی ہیں

رباعیات

ارباب وفا کی جاں گدازی دیکھی
اور اس پہ ستم کی سرفرازی دیکھی
مفلس کا نیاز ہو کہ منعم کا غرور
ہر چیز میں تیری بے نیازی دیکھی

آغوش میں آ کہ زندگانی کر لوں
کچھ روز خوشی سے زندگانی کر لوں
اک جام مئے طرب پلا دے ساقی
فانی ہے حیات جاودانی کر لوں

عابد علی عابد

سید عابد علی نام عابد تخلص ' ۱۷ ستمبر ۱۹۰۶ء کو لاھور میں پیدا ھوئے ۔ ابتدائی تعلیم ڈیرہ اسمعیل خاں میں پائی جہاں آپ کے والد سید محمد عباس صاحب فوج میں ملازم تھے اس کے بعد لاھور کے رنگ محل مشن ھائی اسکول میں تعلیم پاتے رھے۔ سید صاحب نے ۱۹۲۳ء میں بی ۔ اے اور ۱۹۲۵ء میں ایل ۔ ایل ۔ بی کی ڈگریاں حاصل کیں ۔ لیکن اس درمیانی وقفے میں انہیں چونکہ شعر و ادب سے فطری لگاؤ تھا اس لئے وہ ''دلکشی'' اور ''ھزار داستاں'' رسائل کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رھے ۔ یہی وہ زمانہ ھے جب عابد صاحب نے ایک شاعر و افسانہ نگار کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں خاصی شہرت و مقبولیت حاصل کی ۔

۱۹۲۵ء سے حضرت عابد نے گجرات میں وکالت شروع کی لیکن یہ مشغلہ زیادہ عرصہ قائم نہ رھا تھا کہ علمی و ادبی ذوق آپ کو پھر لاھور کھینچ لایا ۔ لاھور آ کر آپ کے مطالعہ کا دور پھر سے شروع ھوا ۔ اور آپ نے انگریزی اور عربی کے تنقیدی ادب کا مطالعہ کیا ۔ اسی اثناء میں ایم ۔ اے کرنے کا خیال پیدا ھوا تو آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم ۔ اے کیا اور اس کے بعد دیال سنگھ کالج لاھور میں فارسی کے پروفیسر مقرر ھو گئے ۔ اس اسامی پر چار سال تک کام کر کے آپ ایف ۔ سی کالج لاھور چلے گئے جہاں آپ کو السنۂ شرقیہ کا صدر مقرر کردیا گیا ۔

۱۹۴۳ء میں پروفیسر عابد دوبارہ دیال سنگھ کالج سے منسلک ھوئے اور تقسیم ھند سے قبل تک وہ کالج میں فارسی کے پروفیسر رھے مگر قیام پاکستان کے بعد آپ کالج کے پرنسپل ھو گئے لیکن کچھ مدت کے بعد کالج میں کچھ ایسے تنازعات پیدا ھو گئے ۔ کہ آپ کو کالج سے علیحدہ ھونا پڑا ۔ لیکن ان مصروفیتوں اور پریشانیوں کے باوجود وہ مجسم شاعر ھیں اور یہ کہنا مبالغہ نہ ھوگا کہ پچھلے چند سالوں سے آن کی شاعری اپنے پورے شباب پر ھے ۔

حضرت عابد ایک خوش فکر اور مشاق سخنور ھیں انہوں نے غزل ' نظم ' گیت ' رباعی غرضکہ ھر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ھے لیکن آن کی شاعری در اصل تغزل کی شاعری ھے اور غالباً یہی وجہ ھے کہ اب عرصہ سے وہ صرف غزل کہتے ھیں ۔ آن کے

ابتدائی کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں وہ جدید اُردو شاعری کے اُس اسکول سے زیادہ متاثر تھے جسے غنائی اسکول کہا جا سکتا ہے اور جس میں خود آن کے ہم عصر شعراء حفیظ و اختر شیرانی وغیرہ شامل تھے۔ بنابریں عابد صاحب کے اس دور کے سارے کلام میں شباب کی نغمہ سرائی کا عنصر غالب ہے۔ اُنہوں نے عشق و محبت کی رنگین داستان بڑے موسیقانہ و مترنم الفاظ اور رنگین و دلکش انداز میں بیان کی ہے۔ نظموں میں البتہ کہیں کہیں اقبال کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ مثال کے طور پر آن کی ایک نظم ''شاعر'' کے یہ دو بند ملاحظہ کیجئے۔

نہ تھے جلوہ گر آسماں پر ستارے ‌ نہ تھے مہر گردوں کے روشن شرارے
نہ تھے یوں رواں موج تابش کے دھارے ‌ نہاں تھے یہ سب حسن کے ماہ پارے
ابھی کہکشاں جلوہ گستر نہیں تھی
ازل میں تو ہوگی فلک پر نہیں تھی

کہ فطرت نے اجزائے عالم پہ چھڑکا ‌ وہ پانی کہ اکسیر ہے نام جسکا
تپش ہو گئی روح قدرت میں پیدا ‌ ہر اک شے سے ذوق نظر پھوٹ نکلا
محبت در آغوش آیا ہے شاعر
مئے غم سے مدہوش آیا ہے شاعر

اقبال کی نظم ''محبت'' ذہن میں رکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عابد صاحب کے انداز فکر پر اقبال چھائے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد حضرت عابد کی شاعری کا وہ دور آتا ہے جس میں صرف غزل آن کے جذبات و مشاهدات کا ذریعہ اظہار بنی اور اس میں غم جاناں کے ساتھ ساتھ غم دوراں کا حسین و متوازن امتزاج بھی پیدا ہوا۔ اپنے اس مسلک کی وضاحت خود عابد صاحب نے ایک شعر میں فرمائی ہے۔

قرض جتنے غم دوراں کے ہیں مجھ پر عابد ‌ غم جاناں کی وساطت سے ادا ہوتے ہیں

اس دور کی غزلیات سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ وہ آن تمام تحریکات سے متاثر ہوئے جو آن کے گرد و پیش اُٹھ رہی تھیں اور اسی لئے باوجود قدما کی طرز میں غزل لکھنے کے آن کی شاعری میں ایک انفرادیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس انفرادیت میں موجودہ رجحانات، اثرات اور آن کی طبیعت کی اُفتاد کو بہت بڑا دخل ہے۔ جناب عابد کا نقطۂ نظر زندگی کے متعلق رجائی ہے اور وہ بڑے زندہ دل انسان ہیں۔ چنانچہ یہی زندہ دلی انکے تغزل میں کش مکش حیات اور حسن کاری کے درمیان ایک لطیف توازن پیدا کرتی ہے ان کی شاعری میں سیاسی خیالات بھی تلقین و پروپیگنڈے کے بجائے حسن کے ایسے نفیس سانچوں میں ڈھل کر نکلتے ہیں کہ پڑھنے والا محظوظ و متاثر تو اکثر ہوتا ہے لیکن منغض کبھی نہیں ہوتا۔

جہاں تک اسلوب بیان کا تعلق ہے عابد صاحب اساتذہ کے طرز اظہار کا پورا پورا احترام کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اُنہوں نے ہماری کلاسیکی شاعری کا گہرا

مطالعه کیا ہے اور میر ، غالب ، آتش وغیرہ کے رنگ کی جھلکیاں اُن کے کلام میں موجود ہیں۔ ساتھ ہی اس غائر مطالعہ کی بدولت انہیں زبان پر ایسی قدرت حاصل ہو گئی ہے کہ اُن کی اور اہل زبان شعرا کی زبان میں قطعی طور پر کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکتا ، صاف ، شستہ اور منجھی ہوئی زبان عابد صاحب کے تغزل کی ایسی نمایاں خصوصیت ہے جو انہیں کم از کم پنجاب کے دیگر متغزلین میں ممیز و ممتاز ضرور کر دیتی ہے۔ بعض اوقات عابد صاحب اشعار میں ہم آواز الفاظ کے پیہم استعمال سے ایک ایسی صوتی خوش آہنگی پیدا کر دیتے ہیں کہ شعر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

حضرت عابد کی شاعری کے سلسلے میں ایک بات اور کہنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ اُردو شاعری میں گو ''ساقی نامہ'' کو باقاعدہ طور پر حضرت نفیس لکھنوی نے رائج کر دیا تھا لیکن اُس کے بعد معدودے چند شعرا ایسے ہیں جنہوں نے اس روایت کو کامیابی کے ساتھ برتا ہے بالخصوص پنجاب میں علامہ اقبال کے بعد عابد صاحب ہی ایسے قادرالکلام سخنور ہیں جنہوں نے فارسی ساقی ناموں کے اُصول کی پیروی بھی کی ہے اور ساتھ ہی ہندی فضا کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

غرض حضرت عابد ہر لحاظ سے ایک کامیاب سخنور ہیں بالخصوص غزلگو کی حیثیت سے وہ بلاشبہ ایک امتیازی شان کے مالک ہیں۔ ساتھ ہی ستم ظریفی کا یہ عالم ہے کہ شاگردوں کے مجموعے چھپواتے ہیں مگر اپنے مجموعہ کلام کی تدوین کا کبھی خیال بھی نہیں کرتے۔ جسکا نتیجہ یہ ہے کہ باوجودیکہ اُنہوں نے بہت کچھ کہا ہے لیکن اب تک اُن کا ایک مجموعہ بھی شایع نہیں ہوا۔

انتخاب کلام

غزلیات

شب کے جلوے نظر سے گزرے ہیں وہ نہ جانے کدھر سے گزرے ہیں
موج آواز پائے یار کے ساتھ نغمے دیوار و در سے گزرے ہیں
آج آیا ہے اپنا دھیان ہمیں آج دل کے نگر سے گزرے ہیں
گھر کے گوشے میں تھے کہیں پنہاں جتنے سیلاب گھر سے گزرے ہیں
زلف کے خم ہوں یا جہان کے غم مر مٹے ہم جدھر سے گزرے ہیں
صدف تہ نشیں بھی کانپ گیا کیسے طوفان سر سے گزرے ہیں
باغ شادابِ موجِ گل ہی نہیں سیل خوں بھی ادھر سے گزرے ہیں

جب چڑھی ہے کہاں کہیں ''عابد''
تیر میرے جگر سے گزرے ہیں

کسی کی عشوہ گری سے بہ غیر فصل بہار
سبھی کا چاک گریباں ہے دیکھئے کیا ہو
تمہیں خبر ھی نہیں اے طیور نغمہ سرا
یہی چمن یہی زنداں ہے دیکھئے کیا ہو
جہاں کشودِ نوا پر خزاں کے پہرے ہیں
وھیں بہار غزل خواں ہے دیکھئے کیا ہو
سبو اُٹھا کہ یہ نازک مقام ہے ساقی
نہ اھرمن ہے نہ یزداں ہے دیکھئے کیا ہو
رواں ہے موج گل و لالہ موج خوں کی طرح
چمن شہید بہاراں ہے دیکھئے کیا ہو
درازئی شب ھجراں سے مجھ کو خوف نہ تھا
کسی کی زلف پریشاں ہے دیکھئے کیا ہو
ہوا کا رنگ یہ ہے آشیاں تو ایک طرف
قفس بھی شاخ پہ لرزاں ہے دیکھئے کیا ہو
یہی ہے دل سے شکایت کہ میرا محرم راز
مجھی سے دست و گریباں ہے دیکھئے کیا ہو
ھمیں ھیں پیر مغاں کافروں کے اے "عابد"!
ھمیں کو دعوئ ایماں ہے دیکھئے کیا ہو

چاند ستاروں سے کیا پوچھوں کب دن میرے پھرتے ھیں
وہ تو بچارے خود ھیں بھکاری ڈیرے ڈیرے پھرتے ھیں
جن گلیوں میں ھم نے سُکھ کی سیج پہ راتیں کاٹی تھیں
اُن گلیوں میں بیاکل ھو کر سانجھ سویرے پھرتے ھیں
روپ سروپ کی جوت جگانا اس نگری میں جوکھم ہے
چاروں کھونٹ بگولے بن کر گھُور اندھیرے پھرتے ھیں
جن کے شام برن سائے میں میرا من سستایا تھا
اب تک آنکھوں کے آگے وہ بال گھنیرے پھرتے ھیں
کوئی ھمیں بھی یہ سمجھا دو، اُن پر دل کیوں ریجھ گیا
تیکھی چتون، بانکی چھب والے بہتیرے پھرتے ھیں

اک دن اُس نے نین ملا کے، شرما کے مکھ موڑا تھا
تب سے سندر سندر سپنے من کو گھیرے پھرتے ہیں
اس نگری کے باغ اور من کی یارو لیلا نیاری ہے
پنچھی اپنے سر پہ اُٹھا کر اپنے بسیرے پھرتے ہیں
لوگ تو دامن سی لیتے ہیں، جیسے ہو جی لیتے ہیں
عابد ہم دیوانے ہیں، جو بال بکھیرے پھرتے ہیں

دوراں غم جاناں کا نشاں ہے کہ جو تھا
وصف خوباں بہ حدیث دگراں ہے کہ جو تھا
شرع و آئین کی تعزیر کے باوصف شباب
لب و رخسار کی جانب نگراں ہے کہ جو تھا
عشق کی طرز تکلم وہی چپ ہے کہ جو تھی
لب خوش گوئے ہوس محو بیاں ہے کہ جو تھا
مغ بچے خوش ہیں کہ بزم اُن کی ہے ساقی اُن کا
بر سرِ کار وہی پیر مغاں ہے کہ جو تھا
سنگ طفلاں سے ذرا بچ کے رہے قصر بلند
یہ وہی کارگہہ شیشہ گراں ہے کہ جو تھا

کہو بتوں سے کہ ہم طبع سادہ رکھتے ہیں
پھر اُن سے عرض وفا کا ارادہ رکھتے ہیں
یہی خطا ہے کہ اس گیرو دار میں ہم لوگ
دل شگفتہ، جبین کشادہ رکھتے ہیں
خدا گواہ۔ کہ اصنام سے ہے کم رغبت
صنم گری کی تمنا زیادہ رکھتے ہیں
دکان بادہ فروشاں کے صحن میں "عابد"
فرشتے خلد کا اک در کشادہ رکھتے ہیں

گردش جام نہیں رک سکتی جو بھی اے گردش دوراں گزرے
صبح محشر ہے بلائے ظاہر کسی صورت شب ہجراں گزرے
کوئی برسا نہ سرِ کشت وفا ق کتنے بادل گہر افشاں گزرے

ابنِ آدم کو نہ آیا کوئی راس — کئی آذر کئی یزداں گزرے
اے غم یار تری راہوں سے — عمر بھر سوختہ ساماں گزرے
وہ جو پروانے جلے رات کی رات — منزل عشق سے آساں گزرے
غم ہستی کے بیابانوں سے — کچھ ہمیں تھے جو غزلخواں گزرے
غم کے تاریک اُفق پر ''عابد''
کچھ ستارے سر مژگاں گزرے

آیا ہمارے جینے کا انداز سب کو یاد — جب ذکر جاں نثارئ پروانہ ہو چکا
اُس بد نصیب کو نہیں ملتی کہیں پناہ — جو تیری بار گاہ سے بے گانہ ہو چکا

یہ کیا طلسم ہے دنیا پہ بار گذری ہے — وہ زندگی جو سر راھگذار گذری ہے
گلوں کی خوں شدگی سے سراغ ملتا ہے — کہیں چمن سے نسیم بہار گذری ہے
کہیں سحر کا اجالا ہوا ہے ہم نفسو — کہ موج برق سر شاخسار گزری ہے
رہا ہے یہ سر شوریدہ مثل شعلہ بلند — اگرچہ مجھ پہ قیامت ہزار گزری ہے
یہ حادثہ بھی ہوا ہے کہ عشق یار کی یاد — دیار قلب سے بیگانہ وار گزری ہے
اُنہیں کو عرض وفا کا تھا اشتیاق بہت — اُنہیں کو عرض وفا ناگوار گزری ہے
حریم شوق مہکتا ہے آج تک ''عابد'' — یہاں سے نکہت گیسوئے یار گزری ہے

عام ہو فیض بہاراں تو مزا آ جائے
چاک ہوں سب کے گریباں تو مزا آ جائے
واعظو ! میں بھی تمہاری ہی طرح مسجد میں
بیچ دوں دولت ایماں تو مزا آ جائے
کیسی کیسی ہے شب تار یہاں چیں بہ جبیں
صبح اک روز ہو خنداں تو مزا آ جائے
ساقیا ! ہے تری محفل میں خداؤں کا ھجوم
محفل افروز ہو انساں تو مزا آ جائے

ہنس رہی ہے کلی کلی کہ ہوا — سارے گھونگھٹ اُلٹ گئی کل رات
اُن کے گیسوئے عنبریں کے طفیل — کس تکلف سے کٹ گئی کل رات

ایک دنیائے رنگ و رامش و نور   میرے دل میں سمٹ گئی کل رات
اب سنا ہے کہ گردش دوراں   الٹے پاؤں پلٹ گئی کل رات
بڑھ گیا ذوق زندگی عابد
عمر کچھ اور گھٹ گئی کل رات

دنیا میں اپنی صبحیں نہ شامیں   دل کے اندھیرے دل کے آجالے
اے ہم صفیرو گلشن قفس ہے   آنکھوں پہ سہریں ہونٹوں پہ تالے
میخوار ساقی قطرے کو ترسیں !   برسیں چھا چھم ساون کے جھالے !
فصل بہاراں گویا دلہن ہے   پھولوں کا آنچل چہرے پہ ڈالے

آئی سحر قریب تو میں نے پڑھی غزل   جلنے لگے ستاروں کے بجھتے ہوئے کنول
بے تاب ہے جنوں کہ غزلخوانیاں کروں   خاموش ہے خرد کہ نہیں بات کا محل
کیسے دئے جلائے غم روزگار نے   کچھ اور جگمگائے غم یار کے محل
اب ترک دوستی ہی تقاضا ہے وقت کا   اے یار چارہ ساز مری آگ میں نہ جل
اے التفات یار مجھے سوچنے تو دے   مرنے کا ہے مقام یا جینے کا ہے محل
ہم رند خاک و خوں میں اَٹے ہاتھبھی کٹے   نکلے نہ اے بہار ترے گیسوؤں کے بل

خوں فشاں دست صبا دیکھا ہے   میں نے کل باغ میں کیا دیکھا ہے
دور ہے گھر ابھی ویرانی کا   ابھی آمید نے کیا دیکھا ہے
اے سر خار کہاں ہے "عابد"   کہیں وہ آبلہ پا دیکھا ہے

اہرمن یار ، نہ یزداں محرم   یہی تقدیر بشر ہے ساقی
گیسوئے یار ہیں گو شامل کار   ہر شب غم کی سحر ہے ساقی
زندگی آنچ ہے انگاروں کی   عاشقی رقص شرر ہے ساقی
مے نہیں چارۂ حرماں کہ مجھے   غم بہ اسلوب دگر ہے ساقی
کچھ تکلف مجھے تلچھٹ میں نہیں   میکدہ تو مرا گھر ہے ساقی

دیکھنا یہ ہے کہ انداز سحر کیا ہوں گے
یوں تو ارباب جنوں رات گزر جائیگی

میں ترا محرمِ اسرار ہوں اے صبحِ بہار
جا کے پھولوں سے کہوں، رات گزر جائیگی

مژدۂ صبح مبارک تمہیں اے دیدۂ ورو
میں جیوں یا نہ جیوں، رات گزر جائیگی

رات بھر میں نے سجائے سرِ مژگاں تارے
مجھ کو تھا وہم کہ یوں رات گذر جائیگی

شکووں پہ مجھے بھی تھی ندامت
کچھ اُس کی نگاہ بھی خجل تھی

دنیا کے لئے بنی وہ ٹھنڈک
سینے میں جو آگ مشتعل تھی

اب عکسِ نشاط بن گئی ہے
وہ غم کی خلش کہ جاں گسل تھی

یوں بڑھی اُن سے راہ و رسمِ وفا
کہ مجھے بھی کوئی خبر نہ ہوئی

شبِ غم کا طلسم کیا کہیئے!
دھوپ چڑھنے پہ بھی سحر نہ ہوئی

میرا مرنا تو اُن پہ کیا کھلتا
میرے جینے کی بھی خبر نہ ہوئی

یہ رنگ و نور کے جلوے یہ دلکشا نغمے
صنم کدے ہیں کہ ذوق نظر بہشت میں ہے

یہ ساکنانِ حرم سے پتہ چلا عابد
کہ ڈھونڈنے جسے نکلے ہو وہ کنشت میں ہے

دشتِ ایمن سے چلے، کوئے بتاں تک پہنچے
تیرے دیوانے رموز دو جہاں تک پہنچے

بت کے راندے ہوئے، اللہ کے ٹھکرائے ہوئے
آخر کار درِ پیرِ مغاں تک پہنچے

رہ گئے یار قتیلِ غمِ دوراں ہو کر
ہم سے کچھ سوختہ جاں کوئے بتاں تک پہنچے

دامنِ یار کی راہوں سے گزر کر آخر
دستِ گستاخ سرِ تاجوراں تک پہنچے

چاند اُترا مرے کاشانے میں عابد کل رات
دیکھئے رات کی یہ بات کہاں تک پہنچے

اے دوست موج رنگ سے بنتے نہیں چمن اے دوست موج خوں کی طلبگار ہے بہار
نوک زبان خار کی دیکھی نہیں ادا غافل کو وہم ہے گل و گلزار ہے بہار

کمال صبر و ضبط ہے یہ میری بود و ہست ہے
دیار عاشقی میں حوصلوں کی راہ پست ہے
نظر ہے کامگار حسن ' یار پھر بھی خوش نہیں
یہ بندوبست عشق ہے کہ فتح کو شکست ہے

کیسے کیسے نقش ہائے علم و فن سینے میں ہیں
بن گئے ہیں اپنے حسن فکر کا بت خانہ ہم
منزلیں ایمان و عرفان کی بہت پر پیچ تھیں
رہ گئے ہو کر شہید مسلک رندانہ ہم

بے حسی بری شے ہے دل کو مضطرب کر لوں
یا وفور عشرت سے یا غم تمنا سے

مدت کے بعد آئے ہیں اے راہبر ' جہاں
میرا قیاس ہے کہ چلے تھے وہیں سے ہم

یوں تو میٹھی زباں ہے ظالم کی آنکھ میں رنگ التفات نہیں

تدبیر ترک عشق ' ورائے جنون غم
دل پر ہو اختیار تو کیا کیا نہ کیجئے

شوق سے خود جو مرے راہنما ہوتے ہیں
مری قسمت کہ وہی آبلہ پا ہوتے ہیں
بادہ نوشی پہ مصر ' بادہ نوشی پہ خفا
محو حیرت ہوں کہ یہ لوگ بھی کیا ہوتے ہیں

لب سے ہوتی ہوئی آنکھوں میں ہنسی جاتی ہے
اے بتو! پیار کے اسلوب جدا ہوتے ہیں

یہی بت شب کے اندھیرے میں جو ہیں بندۂ شوق
یہی بت دن کے اجالے میں خدا ہوتے ہیں

کوئی پروانو کو سمجھاؤ کہ مرنے کے سوا
اور بھی چند مقامات وفا ہوتے ہیں

قرض جتنے غم دوراں کے ہیں مجھ پر ''عابد''
غم جاناں کی وساطت سے ادا ہوتے ہیں

ساقی نامہ

فسون خرد سے ہے دل تلخ کام
پلا ساقیا بادۂ لعل فام
نہ دل شادماں ہے نہ طبع جواں
مجھے کھا گئی فکر سود و زیاں
نہیں کم یہ شرمندگی ساقیا
گئی رائگاں زندگی ساقیا
مغنی کوئی نغمۂ درد ناک
جسے سن کے ہوجائے دل چاک چاک
دُرت میں کدارا بجا چنگ پر
کہ آئے طبیعت مری رنگ پر
سنا کوئی پنجاب کی داستاں
کہ دل پر ہے بار محبت گراں
وطن ہے میرا حسن کی سر زمیں
کمی اس جگہ دلبروں کی نہیں
یہاں رنگ احباب محفل نہیں
یہاں جمع اسباب محفل نہیں
یہاں دہلوی خوش کلامی نہیں
اصول زباں کی غلامی نہیں
یہاں خنجر ناز ہے خوں فشاں
یہاں خاک کا رنگ ہے ارغواں
یہاں ساز میں سوز، پانی میں آگ
یہاں جوگ میں سل گیا ہے بھاگ
یہاں موت سے کھیلتا ہے جنوں
یہاں روز بہتا ہے دریائے خوں
یہاں نوجوانی سے ڈرتی ہے موت
یہاں مرنے والوں پہ مرتی ہے موت

مغنی سن اے رازدان بہار
بہت تیز ہے کاروان بہار
کلی کو چٹکنے کی فرصت نہیں
ہوا کو مہکنے کی مہلت نہیں
اٹھ اے زینت انجمن رقص کر
اٹھ اے رشک سرو سمن رقص کر
ذرا ساز سے ناز کے سُر ملا
بڑی دیر کے بعد یہ گر ملا
کہ مستی میں کھلتا ہے راز حیات
اسی سُر پہ بجتا ہے ساز حیات

بہار آئی ساقی بط مے اٹھا — ہتھیلی پہ تخت جم و کے اٹھا
دکھا کوئی محفل کو جادو گری — اتار اپنے شیشے میں ساقی پری
مئے لعل کو آب حیواں بنا — خط جام سے کو رگ جاں بنا
نہیں قید کچھ بھیرویں ٹھاٹھ کی — کوئی شے کسی دل نشیں ٹھاٹھ کی
کوئی شے شہانہ ہو یا شاھناز — کوئی دھن بطرز عراق و حجاز
کوئی سُر ہو کومل، رکھب یا گندھار — کوئی تال ہو دادرا یا دھمار
سن اے نغمہ گر اے بہار آفریں — تری ساحری پر ہزار آفریں
خرد کا ھے شیرازہ بکھرا ہوا — سنا دے کوئی راگ نکھرا ہوا

کہانی ہم اپنی سنانے لگے — وہ منہ پھیر کر مسکرانے لگے
وہ پہلو میں ہیں اور شام بہار — بھی خواب رہ رہ کے آنے لگے
حیا سے جو کرتے نہ تھے ہم سے بات — وہ اب چٹکیوں میں اڑانے لگے
دئے حسن نے ایسے ایسے فریب — کہ ہم عشق سے جی چرانے لگے

وہ سن لیں جو ''عابد'' یہ رنگیں غزل
تو محنت ہماری ٹھکانے لگے

غم کے محور پہ ہیں ٹھہرے ہوئے افلاک و نجوم
میری محفل میں نہیں وقت کو بار آج کی رات
نہ مکاں آج ھے ثابت نہ زماں ھے سیّار
نہ خزاں شعبدہ آرا نہ بہار آج کی رات

تصدّق حسین خالد

تصدق حسین نام خالد تخلص ۶ نومبر ۱۹۰۰ء کو پشاور میں پیدا ہوئے جہاں آپ کے والد میاں محمد بخش صاحب بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے ۔ لیکن چونکہ میاں صاحب ۱۹۰۱ء سے ۱۹۳۷ء تک پشاور سے تبدیل ہو کر راولپنڈی میں سکونت پذیر رہے اس لئے خالد صاحب کا بچپن اور زمانہ طالب علمی راولپنڈی ہی میں بسر ہوا ۔ تصدق حسین صاحب کا آبائی وطن بٹالہ ضلع گورداسپور ہے اور خاندانی اعتبار سے آپ کا تعلق پنجاب کے اس معروف گھرانے سے ہے جس میں سر فضل حسین مرحوم اور میاں افضل حسین ایسے شہرہ آفاق لوگ ہوئے ہیں ۔

خالد صاحب نے ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول راولپنڈی میں حاصل کی ۔ ایف ۔ اے گارڈن کالج راولپنڈی اور بی ۔ اے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا ۔ آپ کی طالب علمی کا زمانہ بڑی شاندار روایات کا حامل ہے آپ نے ایک طرف تو نہایت ذہین و محنتی طالب علم ہونے کی حیثیت سے پرائمری سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کے تمام امتحانات بڑے امتیاز کے ساتھ پاس کئے اور ہمیشہ وظائف حاصل کئے اور دوسری طرف اپنے علمی و ادبی ذوق کی وجہ سے آپ ادبی مجالس میں سرگرم حصہ لیتے رہے ۔ ۱۹۲۴ء میں آپ نے انگریزی ادبیات میں ایم ۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور اسی سال پنجاب سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں شریک ہوئے اور ہر مضمون میں اول رہے ۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۲ء تک پنجاب کے مختلف اضلاع میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے طور پر متعین رہے پھر ۱۹۳۲ء میں پنشن حاصل کر کے مزید تعلیم کے لئے انگلستان تشریف لے گئے ۔ وہاں لندن یونیورسٹی سے بی ۔ اے آنرز اور پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں ۔ ۱۹۳۴ء میں رائل اکنامکس سوسائٹی لندن کے فیلو منتخب ہوئے اور ۱۹۳۵ء میں بیرسٹر ہو کر وطن واپس آئے ۔ جب سے لاہور ہائی کورٹ میں پریکٹس کر رہے ہیں ۔

خالد صاحب کو شعر و شاعری سے بچپن سے ہی دلبستگی ہے ۔ آپ نے ۱۹۱۹ء سے شعر کہنا شروع کئے ۔ ابتداً غالب اور اقبال کا مطالعہ بیشتر رہا اس لئے اُن کا رنگ غالب تھا ۔ زاں بعد ۱۹۲۵ء سے نظم آزاد لکھنا شروع کی ۔ انگلستان کے دوران قیام میں وہاں کے نامور شعرا سے ملاقاتوں اور مروجہ انگریزی شاعری کے عمیق مطالعے کا یہ

اثر ہوا کہ آپ ماضی کی پابند شاعری کے حلقے سے ہمیشہ کے لئے نکل کر نہ صرف آزاد شاعری کے رسیا بن گئے بلکہ اُس کے فروغ دینے میں بڑی مستعدی سے حصہ لینے لگے ۔ اور اس میں شک نہیں کہ آج اُن کا شمار اُردو کے اُن چند باغی شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے اُردو نظم میں ایک نئے تجرباتی دور کا آغاز کیا اور مروجہ اصناف سخن اور اسالیب بیان سے ہٹ کر نئی نئی راہیں نکالیں ۔

تصدق حسین خالد نے قدیم اُردو شاعری سے صرف موضوع ھی میں نہیں بلکہ ہیئت میں بھی انحراف کر کے نظم آزاد اور نظم معریٰ میں دلی کیفیات اور جذباتی تجربات بیان کئے اور نئے اسالیب سخن کو مقبول و پسندیدہ بنانے کی جد و جہد کی ۔ اُن کی نظموں میں تاثر ' ایمائیت اور اشاریت کے ساتھ ساتھ نئی نئی تشبیہات اور جدید استعارات بکثرت ملتے ہیں ۔

مختلف انسانی جذبات نظم میں ڈھلنے کے لئے مختلف ہیئتوں کے متقاضی ہوتے ہیں ۔ تصدق صاحب اس رمز سے پوری طرح آگاہ ہیں اور اس سے کام بھی لیتے ہیں ۔ وہ اپنے دلی جذبات اور نفسیاتی کیفیات و تجربات اپنی تخئیل سے ہم آہنگ کر کے مختصر سے مختصر الفاظ میں بیان کرنے کے عادی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں ایجاز بھی ہے اور تاثیر بھی ۔ تاہم یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی بعض نظموں میں وہ ابہام بھی موجود ہے جو رفتہ رفتہ ہماری آزاد شاعری کا ایک جزو لاینفک بن گیا ہے ۔

مختصر یہ کہ تصدق حسین خالد صاحب کا شمار اُردو کے اُن جدید شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے نہ صرف قدیم موضوعات سخن اور اسالیب بیان سے منہ موڑا بلکہ اُردو شاعری کے روایتی محبوب اور اُس نظریۂ محبت کے خلاف بھی بغاوت کی جس کی رو سے محبوب یا تو حسن جفا پیشہ ہوتا ہے یا شاہد بازاری ۔ آپ کے کلام میں مروجہ بحور اور اوزان کے نئے نئے تجربات بھی ملتے ہیں اور ایک ھی نظم میں ایک سے زیادہ بحر کے استعمال سے بحور و اوزان کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے ۔ موصوف کا مجموعہ کلام ''سرود نو'' عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے ۔ اس کے علاوہ آپ کے مضامین و تراجم بھی مختلف رسائل میں اکثر چھپتے رہے ہیں ۔

انتخاب کلام

پیام

فضاؤں میں کوئی نا دیدہ نا معلوم رستہ ہے
جہاں جذبات مضطر ' روح کے سیماب پا قاصد '
صعوبات سفر سے بے خبر ' اک دور منزل کو '

پروں میں اُلفتوں کے راز کو ے کر '
ہواؤں کی طرح آزاد بے پروا اُڑے جائیں '
پیام شوق دے آئیں ؟
اگر اس رات ' اس بے راہ رستے پر '
کوئی جذبہ دل بے تاب سے اُٹھ کر '
عناں برداشتہ نکلے '
اشارے گرم جوش آرزو آئیں گے ایثر پر
اُنھیں پڑھنا '
اگر منظور خاطر ہو '
جواباً ایک جذبے کو سوار برق کر دینا ۔

پشیمانی

موت کا راگ نفیری پہ بجاتی اُٹھی
لُو ' جھلستی ہوئی لُو '
اُٹھی
بڑھی
ریت پہ جیسے دھواں اُٹھتا ہو
سرسراہٹ سی درختوں میں ہوئی
پتے مرجھا گئے
گرنے لگے
وہ اُن کے کھڑکنے کی صدا ـــــ میرے خدا

لُو کے ہمراہ بڑھے
موت کے ناچ کا نکلا تھا جلوس
چونک کر جاگ اُٹھے صحن چمن میں طائر
آشیانوں سے جدائی انھیں منظور نہ تھی
سہم کر اُٹھے ' اُڑے ' اڑ کے وہیں آن گرے
اُن کی اس آخری فریاد کی غمناک صدا ـــــ میرے خدا

اک گھنا ٹوپ اندھیرے میں جھکائے ہوئے سر
ہاتھ آنکھوں پہ رکھے
بیٹھی ہے غمگیں اداس مجبور
پہلو میں افسردہ خوشی کو لئے
سانس رکنے لگا
خون جمنے لگا
بیکلی ڈھونڈتی پھرتی ہے پناہ
رینگتا رینگتا خوف آیا سسکتا ہوا سانپ
بیکلی کانپ اٹھی
خوف جھپٹ کر اٹھا ' بیکلی نزع میں تھی
مجھ کو بچا —— میرے خدا

تیرگی کانپی
فضا لرزی
کھلی کرنوں کی راہ
روحیں جو وسعت آفاق میں آوارہ سی تھیں
ڈھونڈتی پھرتی تھیں منزل اپنی
پھڑ پھڑائے ہوئے پر اپنے اٹھیں
اور ہواؤں میں بڑھیں
سامنے جنت گم گشتہ نظر آتی تھی

اعجاز تصور

راہ دیکھی نہیں اور دور ہے منزل میری
کوئی ساقی نہیں ' میں ہوں ' مری تنہائی ہے
دیکھتی ہے مجھے حیرانی سے تاروں کی نگاہ
دور ان سے بھی کہیں دور مجھے جانا ہے
اس بلندی پہ اڑے جاتا ہے توسن میرا
کہکشاں گرد سی دیتی ہے دکھائی مجھ کو

رفعت عرش سے مٹتا ہوا مبہم سا شرار
میری منزل ہے کہاں یہ کبھی سوچا ہی نہیں
اس کی فرصت ہی کسے ؟ دل میں مگر رہتا ہے
درد وہ درد کہ ہے جس سے تمنا بے تاب
چاند کچھ راہ مرے ساتھ ہوا تھا لیکن
رہ گیا دور کہیں ہار کے ہمت اپنی
زہرہ کہنے لگی ''اے بزم فلک کے قاصد
زرد رو پہلی ہی منزل میں ہوا تو کیوں کر
جب کہ وہ خاکئی بے مایہ بڑھے جاتا ہے
پست ہر ایک بلندی کو کئے جاتا ہے''
بھر کے اک آہ کہا چاند نے یوں زہرہ سے
''اے نگار رخ زیبائے بہار افلاک
میں بھی حیران ہوں اس ہمت عالی پہ کہیں
حسن سلمیٰ کے تصور کا یہ اعجاز نہ ہو
یہ جواں حوصلگی پردہ در راز نہ ہو'' ۔

حسن قبول

گرج رہا ہے سیہ مست، پیل پیکر ابر
اداس کوہ کی چوٹی پہ ایک تنہا پیڑ
اٹھا رہا ہے سوئے آسماں وہ تنہا شاخ
سرک رہی ہے ابھی جس میں زندگی کی نمی
بڑھا ہو جیسے کسی بے نوا کا بیکس ہاتھ
ہجوم یاس میں اک آخری دعا کے لئے
''برس محیط کرم ایک بار اور برس
بس ایک بار مجھے اور پھول لانے دے
تڑپ رہا ہے ابھی مجھ میں ساز و برگ نمو
یہ میری کایاں یہ پتے، ابھی تو زندہ ہوں
اتر اتر مرے دامن پہ پھول برسا دے''
مچل کے ابر کے پردوں سے بے حجاب آیا

دعائے نیم شبی کا مگر جواب آیا
شرار برق کا ہیجان
پیڑ ——— طور بدست ۔
" زفرق تا بقدم ایک پھول
حسن قبول !

شیر دل خاں

شیر دل خاں !
میں نے دیکھے تیس سال
پے بہ پے فاقے مسلسل ذلتیں
جنگ
روٹی
سامراجی بیڑیوں کو وسعتیں دینے کا فرض
سو رہا ہوں اس گڑھے کی گود میں
آفتاب مصر کے سائے تلے
میں کنوارا ہی رہا
کاش میرا باپ بھی ———
آف کنوارا ،
کیا کہوں ———

احسان دانش

احسان‌الحق نام احسان تخلص ۔ دنیائے شاعری میں احسان دانش کے نام سے مشہور ہوئے ۔ احسان کا خاندانی وطن باغپت ضلع میرٹھ ہے لیکن اُن کے والد قاضی دانش علی نے کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں سکونت اختیار کر لی تھی ۔ یہیں ۱۹۱۴ء میں احسان کی پیدائش ہوئی ۔ قاضی دانش علی زیادہ پڑھے لکھے آدمی نہ تھے اور محنت مزدوری کر کے گزر اوقات کرتے تھے تاہم خوش مذاق اور علم دوست تھے اسی لئے اُن کی خواہش تھی کہ کسی طرح اپنے چشم و چراغ کو زیور علم سے ضرور آراستہ کریں لیکن برا ہو اس مفلسی کا جس نے نادار باپ کی خواہش پوری نہ ہونے دی اور احسان کی تعلیم نامکمل رہی ۔ چند عربی فارسی کتابیں حافظ محمد مصطفیٰ سے پڑھیں اور مدرسہ کی چوتھی جماعت سے اُٹھ کر تلاش معاش میں سرگرداں ہونا پڑا ۔ اس سلسلے میں کچھ عرصہ کاندھلہ اور دھلی میں قیام رہا پھر لاہور کیا آئے کہ یہیں کے ہو کے رہ گئے ۔

لاھور میں '' مکتبۂ دانش '' کے قیام سے پہلے احسان کو غم روزگار نے جن جن دشوار منزلوں سے گذارا ہے اُن کی تفصیل میں جاتے ہوئے سچ مچ قلم تھراتا اور کلیجہ منہ کو آتا ہے ۔ احسان نے اپنی ادبی زندگی سے قبل اسی لاھور میں مزدوری ' معماری ' باغبانی ' چوکیداری اور نہ جانے کیا کچھ کیا ہے مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ قسمت کی ان گوناگوں گردشوں اور پریشانیوں کے باوجود احسان نے اپنا مطالعہ جاری رکھا اور کسی نہ کسی طرح تھوڑا بہت وقت نکال کر کتب بینی ضرور کی ۔ اس طرح خود علم حاصل کرکے اس مزدور شاعر نے اپنی ابتدائی تعلیمی کمی کو بڑی حد تک پورا کر لیا ۔ غرض احسان اس لحاظ سے یقیناً لائق صد ستائش ہیں کہ اُن کی زندگی خود تعمیر کردہ ہے ۔ اُنہوں نے افلاس کی آغوش میں آنکھ کھولی ' اُسی کے زیر سایہ پل کر جوان ہوئے مگر اس افلاس کے پیدا کردہ مصائب و مشکلات کا مقابلہ بڑی ہمت و جوانمردی سے کیا اور عزم و استقلال کا دامن اُس وقت تک نہ چھوڑا جب تک اُنہیں دنیائے شاعری میں ایک ممتاز حیثیت نہ حاصل ہو گئی ۔

ابتداً شعر و شاعری کا ذوق قاضی محمد زکی کی صحبت میں ہوا جسے احسان کے میلان طبع نے اور ہوا دی حتیٰ کہ فطری ذہانت اور جودت کی رہنمائی میں بہت جلد

نظم نگاری میں ایک خاص ملکہ حاصل کر لیا یہ وہ زمانہ تھا جب پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان میں ایک مخصوص سیاسی بیداری پھیل رہی تھی اور انقلابی رجحانات اور ترقی پسند نظریات مقبول ہو رہے تھے اس زمانہ میں شعر و شاعری میں بھی یہ رجحانات بڑی تیزی سے راہ پا رہے تھے اور سماجی دکھوں کا بھرپور اظہار اس دور کی شاعری کا طرۂ امتیاز بن رہا تھا۔ غرض کچھ اس مقبول رنگ سے متاثر ہو کر اور بیشتر اپنے تلخ تجربات و مشاہدات سے مجبور ہو کر احسان نے اپنی منظومات کا موضوع سخن مزدور کی زندگی قرار دیا اور اس دکھی طبقہ کی زندگی کی ترجمانی میں چونکہ فن کاری کے ساتھ ساتھ خلوص بھی شامل تھا اس لئے احسان کے کلام کو جو مقبولیت و امتیاز حاصل ہوا اس کا پوچھنا ہی کیا - ۱۹۳۶ء کے بعد تقریباً سارے ہندوستان میں جہاں جہاں بھی اچھے مشاعرے ہوئے ان میں نہ احسان کے بغیر رنگ جمتا اور نہ ہی نوجوان طبقہ مطمئن ہوتا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب احسان افق شاعری پر ابھرتے ہی آفتاب بن کر چمکنے لگے۔

احسان نے ذاتی تجربات کی بنا پر مزدور طبقہ کی ترجمانی میں اس کی زندگی کی بہت سی عبرتناک تصویریں پیش کی ہیں جنھیں دیکھ کر بسا اوقات بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں۔ واقعات و مناظر کی تصویر کشی میں احسان کو بڑی قدرت حاصل ہے انہیں ماہر فن انیس کی طرح واقعات و مناظر کے بیان میں جزئیات سے کام لے کر نقوش کو ہلکا و گہرا کرنا خوب آتا ہے اور جذبات کے لطیف فرق کو نمایاں کرنے میں انہیں ید طولیٰ حاصل ہے۔ احسان کی واقعہ نگاری و منظر کشی کا ایک کمال یہ ہے کہ وہ ان کی تصویروں کے نمایاں کرنے میں انکے درد و تاثر کو حسب ضرورت کم و بیش کر کے بڑے واضع خد و خال پیش کرتے ہیں۔ تاثر میں شدت پیدا کرنے کے لئے وہ اکثر مفلسی و ناداری کی غمناک تصویریں پس منظر کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ اس بھیانک تمہید کے بعد جب اصل تصویر سامنے آتی ہے تو اس کا اثر یقینی طور پر کئی گنا زیادہ ہو جاتا ہے۔

احسان کی زندگی جیسے ماحول اور مصائب و آلام میں گزری ہے اس کا لازمی طور پر نتیجہ یہی ہونا چاہئے تھا کہ انکے جذبات میں بے پناہ شدت پیدا ہو جائے۔ اس شدت جذبات نے ایک طرف تو احسان سے ''باغی کا خواب'' یا ''سادھو کی چتا'' جیسی بھیانک نظمیں کہلوائیں جو اتنی ادبی لطافتوں کے ساتھ شاید ہی کوئی دوسرا شاعر کہہ سکے اور دوسری طرف کلام میں بعض اوقات سخت ترین تلخی پیدا کر دی ہے جو اگرچہ شاعر کے دل کی آواز ہے اور اس کی تہ میں خود اس کے تلخ تجربات کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ شاعرانہ رواداری اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

احسان کی شاعری بھی انقلابی شاعری ہے۔ وہ نادار مزدور کی پامال زندگی کی اصلاح بھی چاہتے ہیں۔ لیکن یہاں آ کر احسان کبھی جوش کی طرف جھکتے ہیں کبھی علامہ اقبال کے ہم خیال ہوتے ہیں اور کبھی یہ مسئلہ مصلحین کے سپرد کر کے خاموش ہو جاتے ہیں۔ احسان کے اس ذہنی خلفشار کا سبب بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ خود انکے خیالات میں تصورات واضح نہیں ہیں اور وہ زندگی و سماج کے بنیادی مسائل پر رسمی و مذہبی قیود سے نکل کر علمی و تحقیقی نگاہ نہیں ڈالتے۔ وہ سرمایہ داری اور اس کی

جملہ اقسام کی سخت ترین مذمت تو کرتے ہیں مگر اپنے طبقاتی تعلق کی اہمیت کو زیادہ نہیں سمجھتے۔ بایں ہمہ جوش و اقبال کا اثر اُن پر اتنا گہرا نہیں ہے کہ خود اُنکی شاعرانہ انفرادیت ختم ہو جائے۔ احسان کا اپنا مشاہدہ اتنا وسیع اور تیز ہے کہ وہ محض اسی کے بل بوتے پر واقعات کو بڑے شاعرانہ اور دلکش انداز میں پوری قدرت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

احسان کی رومانی نظمیں بھی بڑی والہانہ ہیں اور اُن میں حسن و عشق کے کیف و اثر میں ڈوبے ہوئے کافی شعر ملتے ہیں۔ اس منزل میں احسان کی شدت جذبات بڑی لطیف اور نرم صورت اختیار کر لیتی ہے۔ زبان میں مٹھاس اور حلاوت کے ساتھ بیان میں بڑی جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے اور احسان واردات کے بیان کو خوب ٹھہر ٹھہر کر بڑی تفصیل کے ساتھ اسطرح بیان کرتے ہیں کہ سارا منظر پڑھنے یا سننے والے کی آنکھوں سامنے کے آ جاتا ہے۔ احسان نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ لیکن اُن کی غزلوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظم کے پختہ رنگ کے بعد تغزل میں وہ خاصے پھیکے پھیکے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ نظم گوئی کے میدان میں احسان نے اپنے آپ کو پا لیا ہے۔ اور یہی پانا غزل کی بیگانگی کا باعث ہوا ہے۔ احسان اس تفصیل و وضاحت کے عادی ہو چکے ہیں۔ وہ غزل کو بے کیف و بے رنگ بنا دیتی ہے۔ تاہم اُن کی غزلوں میں جذبات کی آئینہ داری ضرور ملتی ہے بالخصوص تقسیم کے بعد اُن کی غزلوں میں ایک طرح کا نکھار پیدا ہونا شروع ہوا ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر اسی توجہ کے ساتھ وہ غزلیں کہتے رہے تو عنقریب اس خیال کی تردید ہو جائیگی کہ احسان کی غزلیں ردیف و قافیہ کی قید میں عاشقانہ نظمیں ہوتی ہیں۔ احسان کی تازہ غزلوں میں تصوف تو نہیں مگر معرفت و آگاہی کی جھلک ضرور بڑھ رہی ہے۔ جو انکے تغزل کو ایک جدا گانہ رنگ دے رہی ہے۔

جہاں تک اُسلوب بیان کا تعلق ہے جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا احسان ایک ماہر فنکار کی طرح اپنی تصویروں کے خد و خال نمایاں کرتے ہیں اور انکے تاثر کو بڑی چابکدستی کے ساتھ گھٹاتے بڑھاتے ہیں۔ ترنم اُنکے کلام کی جان ہے۔ احسان کو لطیف و نادر تشبیہات و استعارات کے استعمال پر بھی بڑی قدرت حاصل ہے اور بعض اچھوتی تشبیہات تو اُنھوں نے ایسی تلاش کی ہیں کہ دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ احسان کی زبان بڑی شگفتہ و پاکیزہ ہے۔ وہ سیدھے سادھے مگر دلکش اور مانوس الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جس سے زبان میں سلاست و صفائی پیدا ہو گئی ہے۔ اُن کے یہاں فارسیت کا غلبہ نہیں بلکہ اُنھوں نے فارسی تراکیب کا بڑا معتدل اور بر محل استعمال کر کے زبان کو بوجھل ہونے سے بچا لیا ہے۔

احسان کے کلام کا سب سے پہلا مجموعہ ''حدیث ادب'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اور اسی سے ''مکتبۂ دانش'' کی بنیاد پڑی تھی۔ اس کے بعد اُن کے حسب ذیل مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔

درد زندگی، نفیر فطرت، چراغاں، نوائے کارگر، آتش خاموش، جادۂ نو، زخم و مرہم، شیرازہ، مقامات اور گورستان

تقسیمِ ہند کے بعد بھی احسان لاھور ھی میں سکونت پذیر ھیں اور اپنے "مکتبہ دانش" کو چلا رہے ھیں۔

انتخاب کلام

تغزل

جتنی جس انسان کو توفیق خودی ہوتی گئی
زندگی آگاہِ رازِ زندگی ہوتی گئی
عقل نے جب تک دکھائے راہ اُلفت میں چراغ
ہر نظر یکسر حجابِ آگہی ہوتی گئی
اُن کا سایہ اک تجلی اُن کے نقشِ پا چراغ
وہ جدھر گزرے اُدھر ہی روشنی ہوتی گئی
علم بے وجدان کا پرچم ہوا جتنا بلند
آدمی سے آدمیت کی نفی ہوتی گئی
عشرتِ غم اعتمادِ زندگی کی بات ہے
جو تصور کر لیا دنیا وھی ہوتی گئی
جتنا سناٹا ہوا گہرا خزاں کی شام کا
آشنا رازِ چمن سے ہر کلی ہوتی گئی
کر دیا احسان دل کو دل غم و آلام نے
زندگی ناکام ہو کر کام کی ہوتی گئی

خموشی سے مذاقِ عشق پنہاں ہو نہیں سکتا
یہ شعلہ ہے چراغِ زیرِ داماں ہو نہیں سکتا
در و دیوار دیوانوں کا رستہ چھوڑ دیتے ہیں
ہمیشہ کو جنوں مجبورِ زنداں ہو نہیں سکتا
حدودِ بندگی میں دل کو جو آسودگی دیدے
وہ سجدہ باعثِ تکمیلِ انساں ہو نہیں سکتا
میں دیوانہ بھلا ' مجھ کو مرے صحرا میں پہونچادو!
کہ میں پابندِ آدابِ گلستاں ہو نہیں سکتا

اسی کا سلسلہ ہے میرا چاک جامۂ ہستی
گریباں تک فقط چاک گریباں ہو نہیں سکتا
یہ گستاخی تو ہے لیکن میں اُس جلوے کا طالب ہوں
بقید رنگ و صورت جو نمایاں ہو نہیں سکتا

خودی کا جب کسی دل میں سرور ہوتا ہے
بہر نگاہ چراغان طور ہوتا ہے
بچا بچا کے نہ رکھ برق حسن سے دل کو
کہ اُسکی زد پہ جو آ جائے طور ہوتا ہے
جنوں جنوں ہے تو ترک ادب کے کیا معنی
مذاق عشق ' مذاق شعور ہوتا ہے
ابھی نہیں ہے ' ابھی اُن کی بارگاہ کہاں
جو چل رہا ہے وہ منزل سے دور ہوتا ہے
یہ خد و خال کے پردے اُٹھے تو کیا حاصل
حجاب خاص تو در اصل نور ہوتا ہے

علم و عرفاں کی جہاں تک روشنی دیکھا کئے
زندگی میں بندگی کو لازمی دیکھا کئے
کون سی بجلی کو رحم آیا کہ پابند قفس
آشیاں تک روشنی ہی روشنی دیکھا کئے
ہر قدم پر لغزش نو کا مقام آتا رہا
زندگی کو اک مسلسل بے خودی دیکھا کئے
مطمئن ہوگا کوئی احسان ہم تو عمر بھر
آگہی کو اک فریب آگہی دیکھا کئے

خدا کی دین ہے وہ عجز عشق بھی جس میں
غرور حسن کے انداز پائے جاتے ہیں
مری وفا پہ نہ جا حسن کی شکست کو دیکھ!
تری جفا کے قدم ڈگمگائے جاتے ہیں
اگرچہ اب مجھے غم راس آ گیا لیکن
کسی کے لطف و کرم یاد آئے جاتے ہیں
وصال و ہجر کے پردے میں رات دن احسان
حیات و موت کے خاکے بنائے جاتے ہیں

وصل کا خواب کجا لذت دیدار کجا
ہے غنیمت جو ترا درد بھی حاصل ہو جائے
ضبط بھی صبر بھی امکان میں سب کچھ ہے مگر
پہلے کم بخت مرا دل تو مرا دل ہو جائے
آہ اُس عاشق ناشاد کا جینا اے دوست
جسکو مرنا بھی ترے عشق میں مشکل ہو جائے

اب تو ہر دھڑکن کسی کے پاؤں کی آواز ہے
دل میں یا رب کون مصروف خرام ناز ہے
حاصل صد گفتگو ہے عشق میں مہر سکوت
ہر نگاہ آرزو فریاد بے آواز ہے
چاند کیا شے ہے ترا دھندلا سا اک نقش قدم
چاندنی کیا ہے تری گرد خرام ناز ہے

جوانی نے آسے اس خوش مذاق سے سنوارا ہے
نہ عرض شوق کی جرائت نہ ضبط غم کا یارا ہے
سحر ہوتے ہی وہ اس طرح شرما کے سدھارا ہے
کہ مجھ کو عمر بھر اب رنج محرومی گوارا ہے
معطر سانس، چہرہ رشک گل، مستی بھری آنکھیں
جوانی ہے کہ اک سیلاب رنگ و بو کا دھارا ہے
ستم کو کیا ستم سمجھوں جفا کو کیا جفا جانوں ؟
وہی جور آشنا جب زندگانی کا سہارا ہے
ہوا مغموم، منظر مضمحل، ماحول افسردہ
مجھے اے نا خدا کس گھاٹ تو نے لا آتارا ہے

وہ عشق خاک عشق ہے وہ حسن خاک حسن ؟
جو قید ہو فسانۂ ہجر و وصال میں
ہو سوئے آسماں جو دعا کے لئے بلند
یہ پستیاں کہاں مرے دست سوال میں

بڑا کرم ہے کہ بخشا ہے اک دل بے تاب
مگر گھٹا کے جنوں کو نہ شرمسار کیا
کہیں فریب نظر ہے کہیں فریب خیال
نہیں طلسم دو عالم پہ اعتبار مجھے

مجھے چپ سمجھنے والے تجھے کیا خبر کہ گم ہے
ترے نغمۂ سحر میں مرا نالۂ شبانہ
تجھے کس طرح بتاؤں کہ ہے محترم کہاں تک
مرے عشق کی نظر میں ترے حسن کا زمانہ
یہ اُڑی اُڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو
تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ

آرزو اک جرم ہے جسکی سزا ہے زندگی
زندگی بھر آرزوؤں کو پشیماں کیجئے
ذرے ذرے میں ہیں احساں اسکے جلوے آشکار
دیکھئے اور دیکھ کر تکمیل ایماں کیجئے

عشق کو تقلید سے آزاد کر دل سے گریہ آنکھ سے فریاد کر
اے خیالوں کے مکیں نظروں سے دور میری ویران خلوتیں آباد کر
حسن کو دنیا کی آنکھوں سے نہ دیکھ اپنی اک طرز نظر ایجاد کر

مرے سجدوں کی یا رب تشنہ کامی کیوں نہیں جاتی
یہ کیا بے اعتنائی اپنے بندے سے خدا ہو کر
یہ پچھلی رات یہ خاموشیاں، یہ ڈوبتے تارے
نگاہ شوق بہکی پھر رہی ہے التجا ہو کر

عکس جاناں ہم، شہید جلوۂ جانانہ ہم
آشنا کے آشنا بیگانہ کے بیگانہ ہم
تجھ کو کیا معلوم گزری کس طرح فرقت کی رات،
کہہ پھرے اک اک ستارے سے ترا افسانہ ہم

تیرے ہر ذرے پہ تا روز قیامت سجدہ ریز
ہم رہینگے ، اے زمین کوچۂ جانانہ ہم

منزل اُلفت میں ہیں احسان دونوں سدّ راہ
کھائیں کیوں آخر فریب کعبہ و بتخانہ ہم

منظومات

بیگانہ انجام

(ایک دوشیزہ کو دیکھ کر)

یہ دوشیزہ جو ہے محفوظ ہاتھوں سے زمانے کے
نہ کیوں کر مسکرائے ، ہیں یہی دن مسکرانے کے

جبیں پر تمتماہٹ سرخ ڈورے چشم میگوں میں
نگاہیں سربسر ڈوبی ہوئی نازوں کے افسوں میں

لب لعلیں میں بیکل آرزوئیں گلفشانی کی
حریم ناز میں ضوریز قندیلیں جوانی کی

بھرے شانوں پہ زلف مشکبو کا دور دورہ ہے
سر بزم طرب جام و سبو کا دور دورہ ہے

فضا شاداب ہے اس حوروش کی بے نقابی سے
ادائیں اٹھ رہی ہیں سو کے خواب ماہتابی سے

رخ رنگین پہ ہے دہکی ہوئی سرخی بہاروں کی
تبسم ہے کہ چکر میں ہے تابانی ستاروں کی

تکلم بربط داؤد کے جوہر دکھاتا ہے
سکوت دلنشیں تسکین کے دریا بہاتا ہے

اکیلی شرم ہے سو شوخیونکی پاسبانی میں
مسرت کھیلتی ہے اس کے دامان جوانی میں

گھنی زلفوں سے وا ہے باب میخانہ فضاؤں پر
مسیحائی فدا ہے اُسکی افسوں گر اداؤں پر

یہ کیا جانے ابھی دلدوز باتیں کیسی ہوتی ہیں
یہ کیا جانے ابھی مجروح راتیں کیسی ہوتی ہیں

ابھی یہ التماس دل کی مجبوری کو کیا جانے ؟
نشاط قرب کیا سمجھے ، غم دوری کو کیا جانے ؟
یہ کیا جانے ابھی سوز نہانی کس کو کہتے ہیں
یہ کیا جانے کہ اندوہ جوانی کس کو کہتے ھیں
ابھی واقف نہیں یہ عشق کی پرھول راھوں سے
ابھی ھے پاک اس کا دامن عصمت گناھوں سے
یہ کیا جانے کہ پردے میں خوشی کے غم بھی ھوتا ھے
رسیلی راگنی کی اوٹ میں ماتم بھی ھوتا ھے
یہ کیا جانے کہ آتی ھے خزاں چھپ کر بہاروں میں
بسر کرتے ھیں کانٹوں پر شگوفے لالہ زاروں میں
یہ کیا جانے کہ فریادوں کے مسکن ھیں ترنم میں
یہ کیا جانے کہ غم پلتا ھے آغوش تبسم میں
نشیلے زمزموں کے ساتھ ھی آتی ھیں آھیں بھی
یہ مقصد ھے کہ جو دن کو ھنسیں شب کو کراھیں بھی
جو انساں ھو گیا آگاہ انجام مسرت سے
قسم ھے تھرتھرا جاتا ھے وہ نام مسرت سے

جشن بے چارگی

ھے داغ دل اک شام سیہ پوش کا منظر
تھا ظلمت خاموش میں شہزادۂ خاور
عالم میں مچلنے ھی کو تھے رات کے گیسو
انوار کے شانوں پہ تھے ظلمات کے گیسو
یہ وقت اور اک دختر مزدور کی رخصت
واللہ قیامت تھی قیامت تھی قیامت
نوشاہ کہ جو سر پہ تھا باندھے ھوئے سہرا
بھرپور جوانی میں تھا اترا ھوا چہرہ
اندوہ ٹپکتا تھا بشاشت کی نظر سے
مرجھائے سے رخسار تھے فاقوں کے اثر سے
کرتا بھی پرانا سا تھا پگڑی بھی پرانی
مجبور تھی قسمت کے شکنجوں میں جوانی
نوشاہ کے جو ساتھ آئے تھے دو چار براتی
ھر اک کی جبیں سے تھی عیاں نیک صفاتی
توقیر کے ، الفت کے ، شرافت کے مرقعے
ایثار کے ، ایمان کے ، غیرت کے مرقعے
ھمراہ نفیری تھی نہ باجا تھا نہ تاشا
آنکھوں میں تھا بے مہرئ عالم کا تماشا
مجمع تھا یہ جس خستہ و افسردہ مکاں پر
تھا بھیس میں شادی کے وھاں عالم محشر

دالان تھا گونجا ہوا رونے کی صدا سے   اک درد ٹپکتا تھا عرقناک ہوا سے
اماں کی تھی بیٹی کی جدائی سے یہ حالت   چیخوں میں ڈھلے جاتے تھے جذبات محبت
تھا باپ کا یہ حال کہ اندوہ کا مارا   اٹھتا تھا تو دیوار کا لیتا تھا سہارا
وہ آپ کہیں اور تھا اور جان کہیں تھی   سینے میں کوئی شے تھی جو قابو میں نہیں تھی
افلاس کے آرے جو جگر کاٹ رہے تھے   ارمان سب اپنا ہی لہو چاٹ رہے تھے

لڑکی کا یہ عالم تھا کہ آپے کو سمیٹے
گڑیا سی بنی بیٹھی تھی چادر کو لپیٹے

تھی پاؤں میں پازیب نہ پیشانی پہ ٹیکا   اس خاکۂ افلاس کا ہر رنگ تھا پھیکا
انصاف زمانہ تھا یا تقدیر کا چکر   ماں باپ کو آیا نہ تھا جوڑا بھی میسر
یوں کہنے کو دلہن تھی یہ مزدور کی دختر   اماں کا دوپٹہ تھا تو ابا کی تھی چادر

آخر نہ رہا باپ کو جذبات پہ قابو
تھرانے لگے ہونٹ ٹپکنے لگے آنسو

کہنے لگا نوشہ سے کہ اے جان پدر سُن   اے وجہ سکوں ، لخت جگر ، نور نظر سُن
گرچہ مری نظروں میں ہے تاریک خدائی   حاضر ہے مری عمر کی معصوم کمائی
کی لاکھ مگر ایک بھی کام آئی نہ تدبیر   مجبور ہوں مجبور یہ تقدیر ہے تقدیر
اس سانولے چہرے میں تقدس کی ضیا ہے   یہ پیکر عفت ہے یہ فانوس حیا ہے
اس کے لئے چکی بھی نئی چیز نہیں ہے   بیٹی ہے مری دختر پرویز نہیں ہے
غربت میں یہ پیدا ہوئی غربت میں پلی ہے   خود داری و تہذیب کے سانچے میں ڈھلی ہے
زنہار یہ زیور کی تمنا نہ کرے گی   ایسا نہ کرے گی کبھی ایسا نہ کرے گی
شکوہ اسے تقدیر کا کرنا نہیں آتا   ادراک کی سرحد سے گزرنا نہیں آتا
ہے صبر کی خوگر اسے فاقوں کی ہے عادت   ماں باپ سے پائی ہے وراثت میں قناعت

اسکی بھی خوشی ہوگی تمہاری جو رضا ہو
تم اسکے لئے دوسرے درجے پہ خدا ہو

پھر آ کے یہ بیٹی سے کہا نرم زباں سے   بچی مری رخصت ہے تو اب باپ سے ماں سے
اُمید ہے ہر بات کا احساس رہیگا   ماں باپ کی عزت کا تجھے پاس رہیگا
اے جان پدر ! دیکھ وفادار ہی رہنا   آئے جو قیامت بھی تو ہنس کھیل کے سہنا

دل توڑ نہ دینا کہ خدا ساتھ ہے بیٹی
لاج اس مری ڈاڑھی کی ترے ہاتھ ہے بیٹی

آیا جو نظر مجھ کو یہ جانکاہ نظارہ   احسان نہ آنکھوں کو رہا ضبط کا یارا
تپنے لگی ہر سانس مری سوز نہاں سے   اتنا ہے مجھے یاد کہ نکلا یہ زباں سے

اے خالق کونین ! یہ تو نے بھی سنا ہے   دنیا کا گماں ہے کہ غریبوں کا خدا ہے
تو جن کا خدا آن کا ہو گردش میں ستارا   کیا تیرے کرم کو یہ ستم بھی ہے گوارا
کس طرح نہ ہو دل کو بھلا رنج و محن دیکھ   مزدور کے اس زندہ جنازے کا کفن دیکھ
احساس کبھی دل سے جدا ہو نہیں سکتا
انسان ہے انسان ' خدا ہو نہیں سکتا

طوفانی نغمہ

زمانہ ہو گیا گنگا میں اک آئی تھی طغیانی
جلو میں جسکے دامن تھام کر چلتی تھی ویرانی
تھا جل تھل ایک کوسوں تک مسافر تھے نہ راہیں تھیں
یہ عالم تھا ہوائے شام کے لب پر بھی آہیں تھی
جو ریلا ھڑ بڑا کر ناگہاں کروٹ بدلتا تھا
بیابانوں کی پیاسی ریت کا دم سا نکلتا تھا
تھی وحشت آفریں پھنکارتی موجوں کی بیباکی
سر ساحل سراسیمہ تھی پیراکوں کی پیراکی
درختوں کے قدم جمتے نہ تھے سیلاب کے آگے
فلک کی گردشیں بے کار تھیں گرداب کے آگے
عجب بپھری ہوئی موجوں کا نقشہ تھا روانی میں
کہ جیسے بُتّی ہوں جل دیویاں قالین پانی میں
ہوائیں تیز کر دیتی تھیں جب تیور دریڑوں کے
کنارا دھم سے گر کر پاؤں چھوتا تھا تھپیڑوں کے
ہر اک ریلے میں خونی موت کے قدمونکی آہٹ تھی
فضائے بحر میں سیل بلا کی سنسناہٹ تھی
جدھر پانی کا رخ ہوتا تھا ساحل گرتا جاتا تھا
کسانونکی عرق ریزی پہ پانی پھرتا جاتا تھا
بہا کر بستیاں دھارے نے کی تھی رہ گزر پیدا
جو ٹکراتی تھیں دو موجیں تو ہوتے تھے شرر پیدا
یقیں ہوتا تھا اکثر جوش طوفاں کے قرینے سے
کہ اب مل جائیگا جھک کر فلک گنگا کے سینے سے

نہ بیڑوں کا پتہ تھا اور نہ کوسوں گھاٹ ملتا تھا
جہاں تک کام کرتی تھیں نگاہیں پاٹ ملتا تھا

مویشی نیم جاں تھے ہوش پراں تھے درندوں کے
بہے جاتے تھے بچے آشیانوں سے پرندوں کے

کہیں بہتا نظر آتا تھا ساماں خانہ داری کا
کہیں غرقاب ہوتا تھا سفینہ کشت کاری کا

گھُلا تھا ہر طرف رنگ شفق دریا کے پانی میں
کہ موجیں سرد انگارے اگلتی تھیں روانی میں

نہ کشتی کا، نہ ساحل پر پتا تھا نا خداؤں کا
تسلط تھا فقط طوفان کے خونی دیوتاؤں کا

بچارے بے گھرے ہالی موالی روتے جاتے تھے
غریبوں کے مکاں موجوں کے لقمے ہوتے جاتے تھے

ہرن دلدل میں پھنس کر رہ گئے تھے خستہ جانی سے
نکل آئی تھیں اندھی مچھلیاں گھبرا کے پانی سے

فلک سے ہانپ کر بیمار سورج گرنے والا تھا
زمیں کی نعش پر کالا کفن فطرت نے ڈالا تھا

اسی نازک سمے میں جب تھے دونوں وقت ملنے کو
زمیں پر غش تھا طاری چرخ پر تھے پھول کھلنے کو

بہا آتا تھا اک چھپر پہ اک اندھا پجاری بھی
جسے قسمت سے حاصل تھا کمال نغمہ باری بھی

بھجن گاتا ہوا آتا تھا اکتارے کی تانوں پر
ہوائیں لے کے تانیں جا رہی تھیں آسمانوں پر

بدن پر جو گیا بانا، لٹیں شانوں پہ آوارہ
ہر اک موج نفس معراج روحانی کا ہرکارہ

نوا میں سوز بھی، بشرے پہ نور حق پرستی بھی
تشکک بھی، خوشی بھی، جذب خود داری بھی مستی بھی

نہ بے صبری، نہ بے ہوشی، نہ بے چینی، نہ بے تابی
وہی مضراب کی ضربت وہی چہرے کی شادابی

ترانے تیرتے تھے جب بھری گنگا کے دھارے پر
تو اک گاتی ہوئی خنکی پہونچتی تھی کنارے پر

بھجن حل کر کے گردابوں میں گنگا پیتی جاتی تھی
جو لے چھڑتی تھی موجوں کے گریباں سیتی جاتی تھی
ہوائیں راگ کی پاکیزہ لہروں میں نہاتی تھیں
اندھیری رات کے بچپن کی گھڑیاں گنگناتی تھیں
اندھیرا جب ذرا گہرا ہوا اک دم فضا بدلی
ہُوا کم ہانپتا طوفان ، دیوانی ہوا بدلی
فسون کم روی فطرت نے پھونکا تیز دھارے پر
وہ چھپر رفتہ رفتہ آلگا آخر کنارے پر
نکالا کھینچ کر دیہاتیوں نے اس پجاری کو
کہ وہ پہلا فریضہ جانتے ہیں غمگساری کو
حریم دل میں غیرت ، شرم ہے آنکھوں کے پردوں میں
ابھی تک بھی یہاں مردانگی باقی ہے مردوں میں
گئے گزرے بھی اچھے ہیں یہ شہری کجکلاہوں سے
برس پڑتی ہیں اب بھی بجلیاں انکی نگاہوں سے
کہا میں نے پجاری کو یہ آخر ماجرا کیا تھا
کہ یہ کف دردھاں طوفاں اور تو نغمہ پیرا تھا
جواب اس نے دیا مجھ کو کہ سُن اے شاعر دانا
فنا کو تو نے کیا سمجھا بقا کو تو نے کیا جانا ؟
قضا آتی ہے جب دیتی نہیں اک پل بھی جینے کو
ڈبو دیتی ہے ظالم رہگزاروں میں سفینے کو
تو پھر ہم موت کو اک لمحہ کیوں دیں زندگانی کا
کریں کیوں فکر کر کے رنگ پھیکا شادمانی کا
جو موت آتی ہے آنے مرد کو مرنے کا غم کیسا ؟
عبارت میں خوشی کی دفتر رنج و الم کیسا ؟

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ

سردار موھن سنگھ نام ' دیوانہ تخلص مارچ ۱۸۹۹ء میں سید کسراں ضلع راولپنڈی میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے والد کا نام سردار شیر سنگھ تھا ۔ دیوانہ صاحب نے اپنی تعلیم کے ابتدائی و ثانوی مراحل کامیابی کے ساتھ طے کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم ۔ اے کیا پھر ''جدید اردو شاعری کے رجحانات'' اور ''تاریخ ادب پنجابی'' پر یکے بعد دیگرے دو مبسوط مقالے سپرد قلم کر کے کلکتہ یونیورسٹی سے پی ۔ ایچ ۔ ڈی اور پنجاب یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی مؤقر ڈگریاں حاصل کیں ۔ یکم اکتوبر ۱۹۲۸ء سے آپ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں بحیثیت لکچرار مقرر ہوئے اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے ریڈر کے معزز عہدے تک پہونچے ۔ اورینٹل کالج میں تقریباً بیس سال تک پنجابی و انگریزی کی تدریس کے فرائض بحسن و خوبی انجام دینے کے بعد جب ۱۹۴۷ء میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو آپ ہندوستان چلے گئے ۔ وھاں ابتدا میں کچھ عرصہ ڈیرہ دون کے کسی کالج میں ملازمت کی پھر امرتسر چلے آئے ۔ چنانچہ جب سے آپ امرتسر ھی میں مستقل طور پر اقامت گزیں اور پنجابی زبان کی درس و تدریس میں مشغول ھیں ۔

ڈاکٹر موھن سنگھ دیوانہ مختلف زبانوں کے علم و ادب سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فطری شاعر بھی ھیں ۔ اردو میں انھوں نے نظم و غزل دونوں پر طبع آزمائی کی ھے اور ان کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ھے کہ وہ ایک خاص طرز فکر اور مخصوص انداز بیان کے مالک ھیں ۔ آپ کی منظومات پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب فرماتے ھیں ''ڈاکٹر موھن سنگھ دیوانہ اس عصر کے دوسرے شاعر ھیں جن کی نظمیں حفیظ کی طرح شباب کے مستانہ جذبات سے پر ھیں ۔ لیکن شعر میں حسن اور موسیقی پیدا کرنے کے لئے وہ جدید اسکول کی صنعت گری سے بہت کم کام لیتے ھیں ۔ ھندی بحروں سے بھی دیوانہ نے بہت کم کام لیا ھے ۔ اسی لئے ان کی شاعری قدیم عروضی پابندیوں اور جدید احساسات کا مرکب بن گئی ھے ۔ دیوانہ کی شاعری کا رنگ اختر شیرانی کی طرح عاشقانہ ھے ۔ وہ گویا نظم میں تغزل کا رنگ بھرتے ھیں''

دیوانہ صاحب کے ابتدائی مجموعہ کلام ''دوشیزہ'' کی اکثر منظومات صنفی جذبات پر مشتمل ھیں لیکن ان جذبات کو جس بے تکلفی ' حسن اور شائستگی کے ساتھ انھوں

نے سپرد قلم کیا ہے وہ لائق تحسین ہے ۔ اس کے ماسوا وہ قوم ' وطن اور آزادی کی محبت سے بھی سرشار ہیں ۔ چنانچہ مرحومہ مسز سروجنی نائیڈو اور غازی مصطفیٰ کمال پاشا پر انہوں نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ اس خیال کی پوری پوری تائید کرتی ہیں ۔ ان خصوصیات سے قطع نظر ان کی منظومات کی ایک منفرد خوبی یہ ہے کہ ان میں ہندو روایات ' عقائد اور مشاہیر کی نہایت کامیاب مرقع کشی کی گئی ہے ۔ ''مخمور بندرابن'' اور ''بھگوات گیتا'' بلاشبہ دیوانہ صاحب کی بہترین نظمیں ہیں ۔

آپ کے تغزل میں روایات کے احترام کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کی مختلف تحریکات کی جھلک بھی پائی جاتی ہے ۔ جناب دیوانہ نے غنائی شاعری کے اسالیب کے ساتھ اپنے فلسفیانہ انداز فکر کا پیوند خوب لگایا ہے ۔ اور وہ الفاظ اور بحروں کے انتخاب میں ترنم کا بھی حتی الوسع خیال رکھتے ہیں ۔ اردو شعرا نے ' ہر واقعہ کے لئے گل و بلبل ' بادہ و ساغر ' ناز و غمزہ ' غرض عاشقانہ اور رندانہ انداز کے بے شمار استعاروں سے کام لیا ہے اور بہت سی ایسی باتیں کہہ گئے ہیں جن کو وہ صاف الفاظ میں نہیں کہہ سکتے تھے ۔ جناب دیوانہ شاعری کے اس گر پر اتنا قابو رکھتے ہیں کہ اپنے زمانے کے بہت سے ایسے امور ' جن پر صاف اظہار خیال ممکن نہ تھا ' انہیں استعاروں میں ادا کر دیا ہے اور نہایت خوبی سے کیا ہے ۔ جہاں کہیں انہوں نے قدیم موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے وہاں بھی وہ عموماً اپنے ذاتی مشاہدے کا ایک نیا زاویۂ نظر پیش کرتے ہیں مگر ان کے تغزل کا بیشتر حصہ دراصل عصری حالات ' معتقدات اور مسائل پر تنقید ہے اور اس سلسلہ میں ان کی فکر نے بعض نہایت نفیس پیرائے نکالے ہیں ۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا مجموعہ کلام ' نئی دنیا'' جس میں کچھ پابند نظمیں ' کچھ آزاد منظومات اور کچھ مفرد اشعار جمع کر دئے گئے ہیں ' ان کی شاعری کا ایک ایسا نمونہ ہے جسے سچ مچ ان کے نام سے منسوب دیکھ کر حیرت ہوتی ہے ۔ اس مجموعہ کا سارا کلام ماہ اکتوبر ۱۹۴۴ء کے چند دن کی فکر کا نتیجہ ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اس میں فکر و فن کی بہت سی اغلاط پائی جاتی ہیں ۔ بایں ہمہ ان کے ''دوشیزہ'' اور ''کیفیات'' جیسے مجموعوں کے کلام میں ایسی جان پائی جاتی ہے کہ ان کی شاعری کو ہم بھلا نہیں سکتے ۔

اس وقت تک نظم میں ان کی کتابیں ترانہ قدرت ' دوشیزہ' کیفیات ' نئی دنیا اور نغمہ دیدار الٰہی اور نثر میں حالی اور چٹکیاں چھپ چکی ہیں ۔ ان کے علاوہ آپ نے ''اردو ادب'' پر ایک مختصر مگر جامع کتاب انگریزی زبان میں بھی لکھی ہے ۔

انتخاب کلام

دوشیزہ

غنچہ ہے ناشگفتہ ' تو لب ہے نا کشودہ
ناگفتہ راز تو ہے ' تو وصف نا ستودہ

خوابیدہ نغمے ہیں کیا خاموشیوں میں تیری
مستور جلوے ہیں کیا گل پوشیوں میں تیری

شرم و حیا میں تیری ناز و اِدا ہے کیا کیا
کیا کیا بلائے جاں ہے ' جان بلا ہے کیا کیا

نیچی نگاہیں تیری ڈھاتی ہیں آفتیں کیا
چاند اور کنول نے بخشیں تجھ کو لطافتیں کیا

فطرت کے ساز سے یہ دمسازیاں غضب ہیں
ہمچشمیاں غضب ہیں ہمرازیاں غضب ہیں

آئینہ دار حسن فطرت ہے حسن تیرا
گنجینۂ مراد الفت ہے حسن تیرا

ہر عضو تیرا روشن شمع کمال خوبی
رشک قد صنوبر تیرا نہال خوبی

سانچے میں نور کے وہ تیرے بدن کا ڈھلنا
آغوش نغمہ ہائے فردوس میں وہ پلنا

یکسر نیاز ہے تو ' ہے ناز سر بسر تو
اپنی کراستوں سے کیسی ہے بے خبر تو

شرما رہی ہے گل کو ساڑی تری گلابی
سینے سے تیرے نادم مہتاب ہے سابی

چاندی کی چوڑیاں یہ غیرت دہ قمر ہیں
یا حلقہ ہائے گوش دوشیزۂ سحر ہیں

برگ و گل و ثمر ہیں کیا کیا نثار تجھ پر
قربان ہو رہی ہے کیا کیا بہار تجھ پر

غمگینیاں یہ تیری یہ اضطراب تیرا
سر تا سر آرزو و حسرت شباب تیرا

اے غنچہ کس صبا کا ہے انتظار تجھ کو
کس لب کی تشنگی ہے لیل و نہار تجھ کو

کس رازداں سے تجھ کو ملنے کی آرزو ہے
کس ترجماں کی تجھ کو ہرلحظہ جستجو ہے

دل میں ترے طلب ہے کس زخمۂ وفا کی
ہر دم ہے منتظر تو کس طُور آشنا کی

تیرے لئے ہے کس کا ہر ہر نفس بہاراں
ہر ہر نگاہ کس کی ہے رشک برق خنداں
نخل شباب کو جو تیرے ثمر دلادے
ہر عضو کو جو تیرے مینائے مے بنا دے
تجھ نا تمام کو جو آ کر تمام کر دے
تجھ تشنہ کام کو جو مدھوش جام کر دے
راز نہان خلقت تجھ کو ترا بنا دے
ہستی کو اپنی تیری ہستی میں جو مٹا دے
اے کان حسن و خوبی دوشیزۂ حیا کوش
نیل مرام کی ہے میری دعائے پر جوش

بھگوت گیتا

سن اے دیدہ و دل خستۂ پیکار حیات — بانسری والے کا تو نغمۂ اسرار حیات
چاہئے فتح اگر رزم مکانی میں تجھے — چاہئے عیش اگر بزم جہانی میں تجھے
حسن ایماں کی جو تو جلوۂ نمائی چاہے — عشق جاناں کی جو تو عقدہ کشائی چاہے
صدق دل سے جو طلبگار ہے راحت کا تو — راز جویا ہے اگر حسرت و حیرت کا تو
روح تیری ہے اگر حسن ازل کی شیدا — قلب تیرا ہے اگر علم و عمل کا جویا
صفت و ذات کے اظہار، خفا کے اسرار — نور کے نار کے ہستی کے قضا کے اسرار
آئینہ خانۂ امکاں کی وہ خوش نیرنگی — نغمۂ فطرت و انسان کی وہ ہم آہنگی
کیا ترے دل میں ہے بیتابئی دیدار جمال — کیا تری عقل کو ہے جستجوئے کنہ کمال
کیا تو ہے صبح و مسا تشنۂ آب ظلمات — کاٹتا ہے تجھے کیا سلسلۂ مرگ و حیات
پردۂ حائل جاناں جو اٹھانا چاہے — شرر جلوہ سے پھر طور جلانا چاہے

بانسری والے کا تو نغمۂ عرفاں سن لے
مژدۂ وصل تو اے کشتۂ ہجراں سن لے

دردِ مسلسل

جو حکمت مولیٰ نے کیا بندے کو تفویض
اُس درد میں پوشیدہ ہیں درمان ہزاروں

اس درد کے کاشانۂ تاریک میں یعنی
اس دل میں ہیں پر نور گلستان ہزاروں

اس درد کی توفیق سے پہنچا ہوں میں اکثر
اس سطح پہ آرام و مصیبت ہیں جہاں ایک
ہم رشتہ نظر آتی ہیں عالم کی کل آشیا
ہیں نغمۂ و نور ایک وہاں وقت و مکاں ایک

ہر طالبِ حرّیت و شیدائے محبت
ہے درد کی افراط کا شدت کا طلبگار
ہاتھ اپنے کلیجے پہ ذرا رکھ کے تو کہئے
ہے درد کی اہمیتوں سے واقعی انکار

دنیا کے لئے درد کی یہ قدر یہ قیمت
اللہ کے لئے درد سے کیا کچھ نہ ملے گا
شاہد ہے میرا تجربہ اس کہنہ خدا پر
دل کا کنول اس درد مسلسل سے کھِلے گا

اس درد کی ہیں دو ہی شرائط ، میں رہوں گا
اس دل میں جو ہے ضبط کا اور صبر کا ڈیرا
کر سکتا ہے جو دست کشی دیکھ کے جلوے
تسلیم کی آغوش میں ہے جس کا بسیرا

ایشیا اور یورپ

ایشیا میں یورپی ہنگامے برپا ہو چلے
آئی تفریق جماعت ، آئی تمئیز وطن
ہر طرف جاری ہوئے آئین نو احکام نو
محو ہو جانے کو ہیں اپنی روایات کہن

حسن کی عریانیوں سے اب ہوئی دلبستگی
نغمہ راحت سوز ہے اور بادہ ہے توبہ شکن
بے توازن بے سکوں علم و ہنر قول و عمل
اپنے آقا کا نہیں بندے میں اب کوئی چلن
رنگ و بو سے مدعا حیوانیت کا اشتعال
واقعیت ہو حقیقت پر نہ کیوں کر طعنہ زن
خون انسانی کی ارزانی ہے بے حد ہر طرف
ضبط اور سنجیدگی کو چھوڑ بیٹھے مرد و زن
عشرت فانی کا مضموں شاعروں کو ہے پسند
ہیں ملمع ساز و قصہ باف اب ارباب فن
رہ گیا اک میں طلبگار دوام معرفت
بک چکے آسائشوں کے ہاتھ ابنائے وطن

دو شعر

مرے اللہ کو ہے اک سجدہ کافی ، دور سے وہ بھی
در انساں پہ سو سو بار دستک دینا پڑتی ہے
مری تدبیر تیغ و تیر و بم کب کام آتی ہے
رضائے حق برنگ خوبئ تقدیر لڑتی ہے

تغزل

بدل لی نظر دوستوں نے تو جانا ہوا ہے کسی کا نہ ہوگا زمانہ
میں سب جانتا ہو جو تقدیر میں ہے فضول آزمودہ کا ہے آزمانا !

مزہ یہ تو دیکھو کہ خود بے وفا ہے مگر ہم سے دنیا وفا چاہتی ہے

بہت سے دوست دشمن سے زیادہ رنج دیتے ہیں
بگڑتے زخم کو دیکھا ہے اکثر ہم نے مرہم سے

دیکھ لو مہربانیاں اپنی مجھ ستمکش کے حال ابتر میں

آشیاں کے خار و خس کا غم نہیں لیکن اپنا تھا بس اتنی بات ہے
کامیابی ایسی کچھ مشکل نہ تھی کیوں اسے چاہا نہ یہ اک بات ہے

جس نے دیکھا ہے تری چشم خمار آلود کو جمع خاطر سے مئے رنگین پئے وہ کس طرح

تمنائے حیات جاوداں کو لئے پھرتا ہوں دنیائے فنا میں

عقل اور آگے جتنا بڑھتی ہے دور تر دیکھتی ہے منزل کو
جب لگائی تھی اب بجھائیں آپ کوئی سمجھائے حضرت دل کو

ملتے بھی ہیں کبھی تو وہ ملتے ہیں اسطرح
گویا کبھی میں اُن سے کہیں بھی ملا نہیں

یہ کام فصل گل میں تو کرنا نہ تھا ہمیں کیا وقتِ بد میں ہائے غضب ترک مے ہوا

ترک ہم نے نہ بت پرستی کی ٹوٹتا اس سے حوصلہ دل کا
جھیلنا اس میں جو پڑا ' جھیلا کر تو ڈالا مگر کہا دل کا
تیرے کوچے میں ہم ذلیل ہوئے بارے ارماں نکل گیا دل کا

اللہ سے خیر مانگتے ہیں آشیانے کی گو ہم قفس سے جائینگے کیا آشیانے میں

اب خدا پر ہے فیصلہ اپنا تم کو شک ہے مری محبت پر

میں پہنچ جاتا کسی دن کعبے تک لیکن آدھی راہ پر بت خانہ تھا
سن کے اس کا ہوشمندانہ کلام
پوچھتے ہیں سب کہ یہ دیوانہ تھا

تھا کبھی دیوانہ سے کچھ ارتباط　　تم کو شاید وہ زمانہ یاد ہو

اپنی نظر کی وسعت دیکھی　　اور کسی نے یاں کیا دیکھا

فرصت ملی ہے معرفت عشق کے لئے　　ہے حاصل حیات تماشا کہیں جسے

سنتے ہیں اک غلام پہ محمود مر مٹا　　کچھ بت شکن نے سیکھ لیا بت پرست سے

پھر بھی دیتے ہیں اک نظر پہ تمہیں　　سو مصیبت سے دل کو پالا ہے
نکلو دل سے ہمارے جب جانیں　　بزم سے تو ہمیں نکالا ہے

نہیں دیکھتے خلق میں جو خدا کو　　خدا جانے وہ لوگ کیا دیکھتے ہیں

دل پر نہ اختیار نہ دلبر پر اختیار　　ہم ناصحوں کی پند و نصیحت کو کیا کریں
دو دن کی بات ہو تو خوشی سے گزار دیں　　لیکن ہم آئے دن کی مصیبت کو کیا کریں

اک تمہیں خوش نہ کر سکے ورنہ　　کیا ہمیں بات کر نہیں آتی

تجھے دیکھتے ہیں جو اہل نظر ہیں　　وہ کب تیرا لطف و ستم دیکھتے ہیں

جو لایا ہے آغوش میں لا مکاں کو　　تصور کو اپنے ہزار آفریں ہے

محبت چاہتی ہے اور بھی کچھ　　یہ مانا تو ہمارے روبرو ہے

نہ وہ سمجھے مرے دل کو نہ میں سمجھا مزاج اُن کا
محبت میں نیاز و ناز دونوں ہی پریشاں ہیں

اللہ رے جوانی کی وہ دو چار بہاریں
جب شہرۂ آفاق تھا دیوانہ پن اپنا

کفر و دیں کے معاملے دیکھے   اب طبیعت ادھر نہیں آتی
درمیاں سے اب اٹھ گیا پردہ   کوئی ہستی نظر نہیں آتی

شاہد پرست ہی نہیں دیوانۂ شباب   رہن سرور و شعر وہ مے خوار بھی تو ہے
دنیا پرست ہی نہیں مصروف کشت و خوں   جنگ و جدل میں شرکت دیندار بھی تو ہے

دنیا کہے کہ پیتا ہے بے صرفہ یہ عزیز   کسب کمال اتنا تو اے بادہ نوش کر

آتا ہے تو آتا ہے نظر اپنے کرم سے   دیدار کو ہے کوشش ارباب نظر ہیچ

ہر چند یہاں خار و خس و زاغ و زغن ہیں   اے ہمنفسو پھر بھی ہے اپنا چمن اپنا

جب کہتا ہوں میں آپ رقیبوں سے نہ ملئے
فرماتے ہیں ہنس کر، ارے یہ تنگ دلی چھوڑ

کچھ لطف اٹھا سکا نہ حریف اپنی فتح سے
دیکھا جو ہم حزیں نہیں اپنی شکست سے

تجھ کو خدا نے دی تھی بہار آفریں نظر
تو نے نظر کو بیچ دیا برگ و گل کے ہاتھ

عشق میں ہے شگفتگئی حیات   عشق سے گرچہ کچھ نہ حاصل ہو

کہتا ہے ہم سے وقت ملاقات کوئی شوخ   بے باک ہو نہ اتنی تمنا سے تم کہو

بگڑے کسی کا کام نہ بننے سے اپنا کام   اس ڈر سے اپنا خون تمنا کرینگے ہم

عروج فرد منحصر ہے قوم کے عروج پر ہیں اپنی کامیابیاں وطن کی کامرانیاں

اے کعبہ و کلیسا بالفعل مل کے بیٹھو جھگڑے کو اپنے چھوڑو کل کیلئے خدا پر

ہو قوم میں کس طرح صلاحیتِ نیکی افراد میں جب خوبئی کردار نہیں ہے

پہلے تو دنیا تھی درویش و تو نگر میں بٹی اب سنا یکرنگئی انساں کے ساماں ہو گئے

بس حسرت کی شاگردی ہے ہے کیا اپنی استادی

آنند نرائن مُلاّ

پنڈت آنند نرائن نام مُلاّ تخلص اکتوبر ۱۹۰۱ء میں اپنے آبائی مکان محلہ رانی کٹڑہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے ۔ خاندانی لحاظ سے ملا صاحب کا تعلق کشمیری پنڈتوں کی اُس شاخ سے ہے جس کی داغ بیل اُن کے دادا پنڈت کالی سہائے ملا آنجہانی کے لکھنؤ میں مستقلاً بود و باش اختیار کرنے سے پڑی ۔ ملا صاحب کے والد پنڈت جگت نرائن ملا لکھنؤ کے مقتدر و معروف لوگوں میں سے تھے ۔ ملا صاحب کی تعلیم و تربیت لکھنؤ ہی میں ہوئی ۔ آپ نے انٹرنس جوبلی گورنمنٹ اسکول سے پاس کیا ۔ پھر کیننگ کالج لکھنؤ سے ۱۹۲۳ء میں انگریزی میں ایم ۔ اے اور ۱۹۲۵ء میں ایل ۔ ایل ۔ بی کے امتحانات پاس کئے ۔ ۱۹۲۴ء میں وہ آئی ۔ سی ۔ ایس کے امتحان میں بھی شریک ہوئے لیکن اس میں ناکامیاب ہونے کے بعد اُنہوں نے وکالت شروع کردی' جسے اُن کا آبائی پیشہ کہنا چاہئے ۔ ۱۹۲۶ء سے وہ برابر لکھنؤ میں پریکٹس کر رہے ہیں ۔

اسکول و کالج کی طالب علمی کے زمانے میں انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ ملا صاحب نے اُردو و فارسی کی تعلیم گھر پر مولانا محمد برکت‌اللہ صاحب رضا مرحوم فرنگی محلی سے حاصل کی اور یہی وہ زمانہ ہے جب اُنہوں نے اپنے فطری ذوق کے ماتحت انگریزی میں نظم گوئی شروع کی اور انیس' غالب اور اقبال کے اشعار کے ترجمے بھی کئے ۔ لیکن ۱۹۲۷ میں پنڈت منوہر لال زتشی کے اشارے سے اُن کی اس ذہنی آوارگی کو ایک فطری راستہ مل گیا اور اُنہوں نے اُردو میں شعر کہنے شروع کر دئے ۔ تاہم اس فن لطیف میں اُنہیں کسی سے تلمذ حاصل نہیں اور نہ اُنہوں نے اپنے کلام پر باقاعدہ اصلاح لی ہے بلکہ اپنی انفرادیت و ذوق سلیم ہی کو سہارا بنایا ہے ۔ بظاہر اُن کی یہی انفرادیت پسندی اور انگریزی میں ایم ۔ اے کرنے کی وجہ سے اُنہیں جو عالمی ادب کے میلانات و رجحانات سے واقفیت حاصل ہوئی ہے اسی کی بدولت اُن کی شاعری تمام صالح ادبی رجحانات کی حامل ہے ۔ اور وہ لکھنؤ میں رہتے ہوئے بھی لکھنؤ کے مخصوص رنگ سخن یا کسی شاعر سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے ۔ لے دے کے چکبست کا کچھ رنگ ہے ورنہ وہ غالب و اقبال سے زیادہ متاثر ہیں ۔

آنند نرائن ملا عصر حاضر کے اُن شعرا میں سے ہیں جو زندگی کا مطالعہ گہری نظر سے کرتے ہیں اور مکانکی طور پر بنے بنائے راستہ پر چل کھڑے ہونے کے بجائے ذاتی

جذبات ' احساسات اور تجربات کو فن کے لوازم کے ساتھ شعر میں پیش کرتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی ہر بات سوچی سمجھی ہوئی ہوتی ہے ' ہر خیال فکر کی کسوٹی پر کسا ہوا ہوتا ہے ' ہر تصور میں خلوص کی گرمی اور احساس کی سچائی شامل ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ فن کے مطالبات پر بھی اُن کی نگاہ ہوتی ہے ۔ مختصراً یہی وہ باتیں ہیں جنھوں نے مل کر ملا کی شاعری کو رنگین اور ٹھوس بنا دیا ہے ۔ اُنھیں فن و اسلوب دونوں پر قابو حاصل ہے اور وہ خیالات کو حسن کارانہ طور پر تربیت دینے کی صلاحیت رکھنے کے باعث نظم و غزل دونوں میں اپنے جذبات ظاہر کرتے ہیں ۔ اس سلسلے میں یہ بات کہنا بے محل نہ ہوگی کہ ۱۹۳۵ء تک ملا کی غزلوں اور نظموں میں تازگی ' شگفتگی اور لطافت کے علاوہ کوئی انفرادیت نہیں پیدا ہوئی تھی لیکن اس کے بعد اُن کے فکر و فن میں بقول آل احمد سرور صاحب ''انسان دوستی کا جذبہ ایسی گہرائی اور گیرائی اور ایک ایسی قوت شفا پیدا کر دیتا ہے کہ اُس کی طرف نگاہیں فوراً اُٹھ جاتی ہیں'' اور اس میں شک نہیں کہ پچھلے اٹھارہ اُنیس سال میں اُنھوں نے جو کچھ کہا ہے اُس میں رفعت تخیل ' بلند نصیب‌العین اور دل نشینی کا بڑا اچھا امتزاج ملتا ہے ۔

ملا کی غزلیات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ قدیم لکھنویت اب لکھنؤ میں بھی ختم ہو چکی ہے ۔ چنانچہ اُن کی غزلوں میں روائتی غزل کی آن بان کے ساتھ ذاتی تجربات و جدید نفسیات کی آمیزش پائی جاتی ہے ۔ اُنھوں نے خیالات کی پختگی اور ندرت بیان سے اپنے کلام کو فرسودگی کی زد سے بچا لیا ہے ۔ اس میں کلام نہیں کہ اُن کی غزلوں میں بہت سے روکھے پھیکے شعر بھی ملیں گے چونکہ اُن کے عشق میں وہ چمک دمک اور سپردگی نہیں ہے جو مثال کے طور پر آپ کو جگر کے یہاں نظر آتی ہے لیکن اُن کا عشق ذرا مہذب اور سنبھلا ہوا ضرور ہے بنا بریں اُن کے تغزل کی صداقت و دل گدازی پر حرف رکھنے کی گنجائش نہیں ۔

ملا کی پہلی نظم ''پرستار حسن'' ہے جو ۱۹۲۷ء میں لکھی گئی لیکن اس پہلی نظم کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعری کی رو میں حقیقت کے تصور کو مجروح نہیں ہونے دیتے ۔ اور یہ خوبی اُن کی تمام نظموں کا جزو لاینفک بن چکی ہے ۔ اس کے علاوہ وطن پرستی ' سیاسی جد و جہد ' قومی تحریک ' آزادی کی خلش ' انسان دوستی وغیرہ کا جذبہ بھی اُن کی نظموں سے آشکار ہوتا ہے اور اس ضمن میں اُن کا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی منظومات میں تغزل کا رنگ بڑی کامیابی کے ساتھ پیدا کیا ہے ۔ ملا کی منظومات کی یہ ایک خصوصیت ایسی ہے جو اس انداز میں دوسرے نظم گو شعرا کے یہاں بہت کم پائی جاتی ہے ۔ اُن کی طویل نظموں میں ''تم مجھے بھول جاؤ گے'' ''سماج کا شکار'' ''دو شیزہ کا راز'' ''ٹھنڈی کافی'' '' آخری سلام'' وغیرہ میں شعریت و حقیقت کا ایسا حسین امتزاج ہے کہ پڑھنے والا سچ مچ جھوم اُٹھتا ہے ۔ ان کے علاوہ اُن کی ایسی نظمیں جن میں سیاسی عنصر کے ساتھ فکر کی جولانیاں بھی کارفرما ہیں اُن میں شعریت کے ساتھ بڑا وزن اور گہرائی بھی ہے مثال کے طور پر ''میری دنیا'' ''لال قلعہ'' ''جہاں میں ہوں'' ''صبح آزادی'' ''سروجنی نائیڈو'' وغیرہ اُن کی ایسی منظومات ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں ۔

الغرض حضرت ملا کی شخصیت ہماری تہذیب کی وسیع المشربی و ہمہ گیری کی ایک زندہ و تابندہ تصویر ہے اور اُن کا کلام ہمارے قدیم و جدید ادب کے تمام صالح میلانات کا آئینہ دار ہونے کی حیثیت سے دل سوزی ' جگر کاوی اور پاکیزگی خیال کا بڑا اچھا مرقع ہے ۔ اُن کے کلام کا مجموعہ ''جوئے شیر'' کے نام سے ۱۹۴۹ء میں طبع ہو کر نہ صرف ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکا ہے بلکہ ملک کے مقتدر نقادوں نے اس کی دل کھول کر تعریف بھی کی ہے ۔

انتخاب کلام

تغزل

تاب جلوہ بھی تو ہو وہ سوئے بام آیا تو کیا
چشم موسیٰ نے کے عشق تشنہ کام آیا تو کیا
خون دل ضائع نہ ہو مجھ کو بس اتنی فکر ہے
اپنے کام آیا تو کیا غیروں کے کام آیا تو کیا

آئینۂ رنگین جگر کچھ بھی نہیں کیا
کیا حسن ہی سب کچھ ہے نظر کچھ بھی نہیں کیا
نا گفتہ اشارے بھی ہیں جن کے مجھے احکام
اُن پر مرے نالوں کا اثر کچھ بھی نہیں کیا
مانا مرے جلنے سے نہ آنچ آئے گی تم پر
لیکن مرے جلنے میں ضرر کچھ بھی نہیں کیا

مہر وہ ہے خاک کے ذرے جو کر دے زرنگار
اونچی اونچی چوٹیوں پر نور برسانے سے کیا

اظہار درد دل کا تھا اک نام شاعری
یاران بے خبر نے اسے فن بنا دیا

پھر ہوس نظارہ کر بزم جمال یار میں
پہلے نظر کو تاب دے آتش انتظار میں
ایک جگر کا سوز و ساز کشمکش امید و یاس
ایک فسانۂ حیات دفن ہے ہر مزار میں
سختیٔ زیست عشق سے دور نہ ہو سکی مگر
پھول تو کچھ کھلا دئے دامن کوہسار میں

فسردہ ہوتے ہوئے ڈالیوں پہ پھولوں کی
خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے اور خزاں میں نہیں

میرے ہر آنسو میں خوشبو میرے ہر نالہ میں راگ
اب تو ہر ہر سانس میں شامل تمہیں پاتا ہوں میں
اب تمنا بے صدا ہے اب نگاہیں بے پیام
زندگی اک فرض ہے جیتا چلا جاتا ہوں میں

خروش بزم میں بھی ساز دل چھیڑے ہی جاتا ہوں
اکیلا ہوں ابھی لیکن مجھی کو کارواں سمجھو
کبھی تیغ و قلم سے بھی مٹے ہیں تفرقے دل کے
مٹانا ہیں تو پہلے رکھ کے ساغر درمیاں سمجھو

میرے جگر کی تاب دیکھ ' رخ کی شکستگی نہ دیکھ
فطرت عاشقی سمجھ ' قسمت عاشقی نہ دیکھ
تجھ پہ عیاں ہے راز دل جان کے بے خبر نہ بن
معنئی خامشی سمجھ ' صورت خامشی نہ دیکھ

وہ دیکھتے تو ہیں مجھ کو مگر چرا کے نظر
حجاب ٹوٹ رہے ہیں مگر حجاب کے ساتھ

تڑپ شیشے کے ٹکڑے بھی اُڑا لیتے ہیں ہیرے کی
محبت کی نظر جلدی سے پہچانی نہیں جاتی
کسی کے لطف بے پایاں نے کچھ یوں سُونے دل دیکھا
کہ اب ناکردہ جرموں کی پشیمانی نہیں جاتی
یہ بزم دیر و کعبہ ہے نہیں کچھ صحن میخانہ
ذرا آواز گونجی اور پہچانی نہیں جاتی
نظر جھوٹی، شباب اندھا، وہ حسن اک نقش فانی ہے
حقیقت ہے تو ہو لیکن ابھی مانی نہیں جاتی
نظر جس کی طرف کر کے نگاہیں پھیر لیتے ہو
قیامت تک پھر اس دل کی پریشانی نہیں جاتی

اسی کو جس نے نہ کی بھول کر بھی بات کبھی
بغیر یاد کئے کٹ سکی نہ رات کبھی
بس ایک پھول نمایاں ہے دل کے داغوں میں
یہاں رکی تھی تری چشم التفات کبھی

بشر کو مشعل ایماں سے آگہی نہ ملی
دھواں وہ تھا کہ نگاہوں کو روشنی نہ ملی
خوشی کی معرفت اور غم کی آگہی نہ ملی
جسے جہاں میں محبت کی زندگی نہ ملی
یہ کہہ کے آخر شب شمع ہو گئی خاموش
کسی کی زندگی لینے سے زندگی نہ ملی
لبوں پہ پھیل گئی آ کے موج غم اکثر
بچھڑ کے تجھ سے ہنسی کی طرح ہنسی نہ ملی
ثبات پا نہ سکے گا کوئی نظام چمن
فسردہ غنچوں کو جس میں شگفتگی نہ ملی
فلک کے تاروں سے کیا دور ہو گی ظلمت شب
جب اپنے گھر کے چراغوں سے روشنی نہ ملی

وہ قافلے کہ فلک جن کے پاؤں کا تھا غبار
رہ حیات سے بھٹکے تو گرد بھی نہ ملی
وہ تیرہ بخت حقیقت میں ہے جسے "ملاؔ"
کسی نگاہ کے سائے کی چاندنی نہ ملی

مجھے دھوکا نہ دیتی ہوں کہیں ترسی ہوئی نظریں
تمہیں ہو سامنے یا پھر وہی تصویر خواب آئی ؟
جسے میں چاہتا ہوں وہ اگر قسمت سے بالا ہے
مرے حصہ میں کیوں میری نگاہ انتخاب آئی !
کرن مہتاب کی پھولوں میں جب تھی جان تسکیں تھی
یہی ذروں میں کیا آئی کہ موج اضطراب آئی

شیخ ! میں اور ترک عصیاں وہ بھی جنت کے لئے
جب خطا کی تھی مرے قبضہ میں کیا جنت نہ تھی

جفا صیاد کی اهل وفا نے رائیگاں کر دی
قفس کی زندگی وقف خیال آشیاں کر دی
یہ دل کیا ہے کسی کو امتحان ظرف لینا تھا
تن خاکی میں اک چھوٹی سی چنگاری نہاں کر دی
بھرم حسن حقیقت کا کوئی کھلنے نہیں دیتا
نظر جب سامنے آئی تجلی درمیاں کر دی
تری بے مہریاں آخر وہ نازک وقت لے آئیں
کہ اپنوں کی محبت بھی طبیعت پر گراں کر دی
اسیر آنکھیں کہاں سے سیر گلشن کے لئے لائیں
نظر جتنی بھی تھی صرف تلاش آشیاں کر دی

دل بجھا شمع کائنات گئی   زندگی کی اجالی رات گئی

گزری حیات وہ نہ ہوئے مہرباں کبھی
سنتے تھے ہم کہ عشق نہیں رائیگاں کبھی
آنکھوں میں کچھ نمی سی ہے ماضی کی یادگار
گزرا تھا اس مقام سے اک کارواں کبھی
ہاں یاد ہے کسی کی وہ پہلی نگاہ لطف
پھر خون کو یوں رگوں میں نہ دیکھا رواں کبھی

مجھ کو غم انساں کی حقیقت نظر آئی
دنیا ابھی محتاج محبت نظر آئی
تم جس کو سمجھتے ہو کہ ہے حسن تمہارا
مجھ کو تو وہ اپنی ہی محبت نظر آئی

مائل بہ ستم چرخ، زمیں بر سر کیں ہے
آخر مری دنیائے تمنا بھی کہیں ہے
دل مرکز احساس ہے ایذائے جہاں کا
لگ جائے کہیں چوٹ مگر درد نہیں ہے
صبر آنے کو آ جائے مجھے حسرت دل پر
لیکن یہ تقاضائے جوانی تو نہیں ہے

میکشوں نے پی کے توڑے جام مے ہائے وہ ساغر جو رکھے رہ گئے

سر محشر یہی پوچھوں گا خدا سے پہلے
تو نے روکا بھی تھا مجرم کو خطا سے پہلے
اشک آنکھوں میں ہیں ہونٹوں پہ بُکا سے پہلے
قافلہ غم کا چلا بانگ درا سے پہلے
اُڑ گیا جیسے یکایک مرے شانوں پر سے
وہ جو اک بوجھ تھا تسلیم خطا سے پہلے
راز مے نوشی ''ملا'' ہوا افشا ورنہ
کیا وہ بد مست نہ تھا لغزش پا سے پہلے

ذرہ ذرہ پہ لکھا ہے مرا افسانۂ دل
پہلے تقصیر نے پھر ذوق جبیں سائی نے

پیہم رہ طلب میں مشکل کا سامنا ہے
ہر گام پر فریب منزل کا سامنا ہے
ہشیار حسن ! حیرت ارمان بن چلی ہے
پہلے فقط نظر تھی اب دل کا سامنا ہے

ظالم مری حیات کا دور شباب ہے
ہاں ہاں تری جفا پہ بھی جینے کی تاب ہے

قفس والے نہ گل دیکھیں نہ سبزہ نظر جتنی ہے صرف آشیاں ہے
گل خنداں ابھی غافل ہے شاید وہی گلچیں بھی ہے جو باغباں ہے

ابھی شباب ہے کرلوں خطائیں جی بھر کے
پھر اس مقام پہ عمر رواں ملے نہ ملے

مری باتوں پہ دنیا کی ہنسی کم ہوتی جاتی ہے
مری دیوانگی شاید مسلّم ہوتی جاتی ہے
ابھی سن لو تو شاید سن سکو تم دل کے نغموں کو
کہ اب اس کی صدا کچھ خود بخود کم ہوتی جاتی ہے
تجھے مذہب مٹانا ہی پڑے گا روئے ہستی سے
ترے ہاتھوں بہت توہین آدم ہوتی جاتی ہے

خالی ہے مرا ساغر تو رہے ساقی کو اشارہ کون کرے
خود داریٔ سائل بھی تو ہے کچھ ہر بار تقاضا کون کرے
دنیائے محبت بھی ہے عجب دو دل ملنے کو راضی ہیں
لیکن یہ تکلف ہے حائل پہلا وہ اشارا کون کرے
جب دل تھا شگفتہ گل کی طرح ٹہنی کانٹا سی چبھتی تھی
اب ایک فسردہ دل لے کر گلشن کی تمنا کون کرے

بسنے دو نشیمن کو اپنے پھر ہم بھی کریں گے سیر چمن
جب تک کہ نشیمن آجڑا ھے پھولوں کا نظارا کون کرے

جس کے خیال میں ھوں گم آس کو بھی کچھ خیال ھے
میرے لئے یہی سوال سب سے بڑا سوال ھے

ہم نے بھی کی تھیں کوششیں ، ہم نہ تمہیں بھلا سکے
کوئی کمی ھمیں میں تھی یاد تمہیں نہ آ سکے
زیست کی راحتوں میں بھی غم نہ ترا بھلا سکے
لب سے ھنسے ھزار بار دل سے نہ مسکرا سکے
قفل سا کچھ زباں پہ تھا آنکھ میں کچھ نمی سی تھی
ھوش نہیں کہ دل کا بھید کہہ گئے یا چھپا سکے
اپنے ھی شوق کی خطا اپنی ھی آنکھ کا قصور
وہ تو آٹھا چکا نقاب ھم نہ نظر آٹھا سکے

مری بات کا جو یقیں نہیں مجھے آزما کے بھی دیکھ لے
تجھے دل تو کب کا میں دے چکا اسے غم بنا کے بھی دیکھ لے
یہ تو ٹھیک ھے کہ تری جفا بھی ھے اک عطا مرے واسطے
مری حسرتوں کی قسم تجھے کبھی مسکرا کے بھی دیکھ لے

میں آج ھی اسے کیوں صرف دل نہ کر ڈالوں
یہ خوں کی بوند مجھے کل یہاں ملے نہ ملے
متاع شوق کو اشکوں کے ساتھ بھیج بھی دوں
پھر اس کے بعد کوئی کارواں ملے نہ ملے

اپنے جی میں یہ کہ دنیا چھوڑ دیں اور دنیا کو ھمیں سے کام ھے
جل چکے چشم اعزّہ میں چراغ سو بھی جا ملّا کہ وقت شام ھے

وہ کون ہیں جنہیں توبہ کی مل گئی فرصت
ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے

تری ہستی سے منکر ہوتے جاتے ہیں جہاں والے
سنبھال اپنی خدائی کو ارے او آسماں والے

سوکھنے پائے نہ دل میں دیکھ خوئے آرزو
سیکڑوں دریا تنک آبی سے صحرا بن گئے

کھنچی آتی ہیں اس ساحل پہ خود دو اجنبی موجیں
محبت ایک جذب بے اماں معلوم ہوتی ہے

چشم خوں بار میں باقی نہ رہا کیا کوئی اشک
آج بیمار محبت کو ہنسی آئی ہے

شمع اک موم کے پیکر کے سوا کچھ بھی نہ تھی
آگ جب تن میں لگائی ہے تو جاں آئی ہے

ساقیا جب مے ہر اک میکش کی قسمت میں نہیں
سب کو اس محفل میں پیمانے عطا کیوں ہو گئے

شب غم میں بھی اے تصور دوست زندگی کا مزا دیا تو نے

جمال حسن میں تھا اک جلال عفت بھی
گناہگار خیال گناہ کر نہ سکے

کسی کی زندگی کا رنج ہی حاصل نہ بن جائے
غم اچھا ہے مگر جب تک مزاج دل نہ بن جائے

منظومات

تم مجھے بھول جاؤ گے

رہ نہ سکے گا عمر بھر آج کا جوش اضطراب
آرزؤوں میں آئیگا کوئی ضرور انقلاب
پھر کوئی دوست ڈھونڈھ ہی لے گی نگاہ انتخاب
زیست ہے زیست ' دل ہے دل ' اور شباب پھر شباب
عہد وفا ہے ایک خواب
تم مجھے بھول جاؤ گے

تم مجھے بھول جاؤ گے
جس کی تجلیوں سے تھی بزم آسید حشر خیز
جس کے تبسموں سے تھا ساز حیات نغمہ ریز
جسکے نفس نفس سے تھی محفل دوش مشک بیز
رکھ کے کبھو جگر پہ ھاتھ آج بھی ہے وھی عزیز
وقت ہے کچھ عجیب چیز
تم مجھے بھول جاؤ گے

تم مجھے بھول جاؤ گے
رسم جہاں ہے انقلاب ' دور کا نام کائنات
دم کوئی لے سکے کہیں اتنا سکوں بھی دے حیات
آرزؤں کی دل میں ہے ایک سجی ہوئی برات
ایک نگاہ اک امنگ ' ایک امنگ ایک رات
ہستئی عشق بے ثبات
تم مجھے بھول جاؤ گے

تم مجھے بھول جاؤ گے
کوئی کسی کی یاد میں حشر تلک جیا نہیں
تیر نظر کی چوٹ سے کوئی کبھی مرا نہیں
بن کے کھرنڈ کون سا داغ جگر آڑا نہیں
سنگ لحد کو توڑ کر سبزہ کہاں آگا نہیں
تم کوئی لا دوا نہیں
تم مجھے بھول جاؤ گے

تم مجھے بھول جاؤ گے

پھر سے نگارخانۂ شوق کو تم سجاؤ گے

پھر کسی بت کے واسطے فرش نظر بچھاؤ گے

آج کی بات کو کبھی خواب میں بھی نہ لاؤ گے

نام مرا اگر کوئی لے گا تو مسکراؤ گے

تم مجھے بھول جاؤ گے

تم مجھے بھول جاؤ گے

جہاں میں ہوں

وہی حرص و ہوس کا تنگ میداں ہے جہاں میں ہوں

وہی انساں وہی دنیائے انساں ہے جہاں میں ہوں

تمنا قید ، ہمت پا بجولاں ہے جہاں میں ہوں

مجھے جکڑے ہوئے زنجیر امکاں ہے جہاں میں ہوں

کبھی شاید یہ محفل بھی ستاروں سے چمک اٹھے

ابھی تو اشک بے کس سے چراغاں ہے جہاں میں ہوں

کسی دن تپتے تپتے یہ بھی شاید سرخ ہو جائے

ابھی پانی کا ایسا خون دھقاں ہے جہاں میں ہوں

کبھی شاید فرشتہ آدم خاکی بھی بن جائے

ابھی تو بھیس میں انساں کے شیطاں ہے جہاں میں ہوں

کسی قیمت پہ بھی انسانیت ڈھونڈے نہیں ملتی

مگر جنس خدائی اب بھی ارزاں ہے جہاں میں ہوں

ہوائے علم شمعیں روح کی گل کرتی جاتی ہیں

خرد کے ہاتھ میں دل کا گریباں ہے جہاں میں ہوں

افق پر ہوں تو ہوں دھندلے سے کچھ جلوے مسرت کے

ابھی راحت فقط اک خواب ارماں ہے جہاں میں ہوں

غرض مندی کی پوجا عام ہے یوں ہر شوالے میں

محبت اپنی فطرت پر پشیماں ہے جہاں میں ہوں

ابھی روئے حقیقت پر پڑا ہے پردۂ ایماں

ابھی انساں فقط ہندو مسلماں ہے جہاں میں ہوں

کسی دن کوئی چنگاری نہ دنیا کو جلا ڈالے

جہاں خود اپنے شعلوں سے ہراساں ہے جہاں میں ہوں

غلاموں کی ہنسی ہی کیا بس اک آواز بے نغمہ
بہار باغ ہمرنگ بیاباں ہے جہاں میں ہوں
نظر میں ہیں تصور کے وہی موہوم نظارے
ابھی انساں حقیقت سے گریزاں ہے جہاں میں ہوں
فقط ہلکی سی سطح آب پر ہے ایک جنبش سی
زبانوں پر فقط اک ذکر طوفاں ہے جہاں میں ہوں
خدا وہ دن بھی لائے سوز بھی اک ساز بن جائے
ابھی ہر ساز میں اک سوز پنہاں ہے جہاں میں ہوں
مجھے بھی شوق آزادی ہے لیکن کیا کروں اس کو
مرے چاروں طرف زنداں ہی زنداں ہے جہاں میں ہوں
بدلنے کو بدل جائے جہاں لیکن ابھی ملاؔ
وہی دنیائے برق و باد و باراں ہے جہاں میں ہوں

میری دنیا

(۱)

بزم جہاں میں تیرے قابل نہ بن سکوں گا
افسردہ دل ہوں زیب محفل نہ بن سکوں گا
اک عارضی نمائش روح نظام تیری
رنگینئی تصنع جان کلام تیری
طاقت کی ہے پرستش اب تیرے معبدوں میں
سونے کے دیوتا ہیں تیرے صنم کدوں میں
دل کانپتا ہے میرا انساں کی طاقتوں سے
لگتا ہے خوف مجھ کو اونچی عمارتوں سے
لاشوں پہ ہے بنائے ایوان کامیابی
چونے کی جا لہو ہے اینٹیں ہیں ہڈیوں کی
سینچی ہوئی لہو سے سب تیری کیاریاں ہیں
مسروقہ دولتوں پر سرمایہ داریاں ہیں
انساں اتر رہا ہے رسم درندگی پر
تہذیب آ گئی ہے حد برہنگی پر

کیا جہد زندگی میں طبع بشر یہی ہے
سو بار موت بہتر جینا اگر یہی ہے

(۲)

اک بار دور گردوں ایسا نظام بھی ہو
جس میں ہر ایک میکش صہبا بہ جام بھی ہو
مظلوم کا کلیجہ تیر ستم نہ ڈھونڈے
ایوان شادمانی بنیاد غم نہ ڈھونڈے
اک آرزوئے باطل فکر سکوں نہ ٹھہرے
اُلفت فقط مذاق اہل جنوں نہ ٹھہرے
تصویر نا مرادی نقش جبیں نہ نکلے
راحت دل حزیں کا خواب حسیں نہ نکلے
کھوئے تکلفوں میں اُلجھی نہ گفتگو ہو
دل کی کھری زباں میں اظہار آرزو ہو
انسان غاصبانہ راہوں سے ہٹ چکا ہو
پیشانئی بشر کا تیور پلٹ چکا ہو
برف خرد میں جل کر دل سُن نہ ہو گئے ہوں
آنکھوں میں آنسوؤں کے سوتے نہ جم چکے ہوں
غیروں کے درد پر بھی دل میں ذرا کسک ہو
خون سفید میں کچھ سرخی کی بھی جھلک ہو
انسانیت کا پودا ٹھٹھرے نہ جس ہوا میں
دل کا بھی سانس لینا ممکن ہو جس فضا میں
ایسی زمیں بھی کوئی کیا زیر آسماں ہے
میرے خیال بتلا دینا مری کہاں ہے

میراجی

میرا جی کا اصل نام محمد ثناء اللہ ڈار تھا مگر وہ اپنے ادبی نام و تخلص میراجی سے ہی ادبی حلقوں میں متعارف و مشہور ہوئے۔ اُن کا سال ولادت ۱۹۱۲ء ہے میراجی کے والد منشی مہتاب الدین صاحب ریلوے انجینیر تھے اور اس ملازمت کی بدولت اُنھیں اکثر مختلف ریلوے اسٹیشنوں پر رہنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ منشی صاحب کے کسی ایک جگہ مستقل قیام نہ ہونے کی وجہ سے میرا جی کی تعلیم و تربیت بھی مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر ہوئی۔ غالباً سات سال کی عمر میں قصبہ سالول (گجرات کاٹھیاواڑ) کے اسکول میں داخل کئے گئے۔ ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ اُنھیں بوستان (بلوچستان) اور پھر وہاں سے سکھر (سندھ) جانا پڑا۔ یہاں میرا جی چھٹی جماعت کے طالب علم تھے لیکن اُن کے بھائی کامی صاحب کا کہنا ہے کہ اُنھوں نے اس زمانہ میں اپنے بڑھتے ہوئے ذوق کتب بینی کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی کہنا شروع کر دی تھیں اور اپنے اس ابتدائی دور شاعری میں ساسری تخلص کرتے تھے۔ سکھر کے بعد میرا جی کا قیام کچھ عرصہ جیکب آباد اور ڈابھے جی میں رہا اور بالآخر وہ لاہور چلے آئے۔ لاہور کے دوران قیام میں اُردو کے اس باغی شاعر کی زندگی میں میرا سین (ایک بنگالی لڑکی) والے واقعہ نے ایسا انقلاب پیدا کیا کہ وہ ثناء اللہ ساسری سے میرا جی بن گیا اور اُس کی زندگی کی ہر بات کچھ اس طرح بدل گئی گویا اُس نے ایک نیا جنم لیا ہو۔

اس واقعہ کے بعد جیسا کہ ہونا چاہئے تھا میرا جی انٹرنس کا امتحان پاس نہ کر سکے مگر کتب بینی کا شوق برابر جاری رہا۔ کچھ دنوں کے بعد میرا جی نے ''حلقہ ارباب ذوق'' میں بہت زیادہ دلچسپی لینا شروع کی۔ یہی دلچسپی اُنھیں ایک دن رسالہ ادبی دنیا کے دفتر لے گئی جہاں مولانا صلاح الدین نے اُن کی ادبی صلاحیتوں سے متاثر ہوکر انھیں نائب مدیر بنا لیا۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۱ء تک میرا جی ادبی دنیا سے منسلک رہے اور اس میں شک نہیں کہ میرا جی کے یہ چار سال ادبی دنیا میں فنی فروغ کے چار بہترین سال تھے۔ ادبی دنیا سے قطع تعلق کر کے میرا جی آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم ہوئے۔ ریڈیو کے مسودات لکھنے میں اُنھوں نے کافی مہارت حاصل کر لی تھی اور حسب ضرورت بے تکلف لکھ لیتے تھے۔ گیت بھی میرا جی نے ریڈیو ہی میں جا کر لکھے اور پھر اتنے کہ اُن کا مجموعہ ''گیت ہی گیت'' کے نام سے شائع ہوا۔ مگر دلی پہنچ کر میرا جی کا ذوق مطالعہ غرق مئے ناب ہو گیا۔ بہر حال چند سال دلی میں گزارنے کے بعد وہ بمبئی چلے گئے جہاں کچھ دنوں ایک ادبی رسالہ ''خیال'' نکال کر آخر ۳ نومبر ۱۹۴۹ء کو بمبئی کے ایک اسپتال میں انتقال کیا۔

میرا جی قطع نظر اس کے کہ ایک صاحب طرز انشا پرداز اور اچھے ادیب تھے، ایک ایسے شاعر بھی تھے جنھیں اُردو کے باغی شاعر کے نام سے یاد کیا جاتا ھے ۔ باغی اس لئے کہ اُنھوں نے ن ۔ م راشد کی طرح اُردو نظم کی روایت سے مکمل بغاوت کی اور اپنی منظومات کو موضوع اور تکینک ھر دو لحاظ سے بالکل نئے رنگ میں پیش کیا ۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کی اکثر نظمیں بڑی پیچیدہ اور مبہم ھیں لیکن اس کی وجہ غالباً یہی ھے کہ خود میرا جی کی زندگی خاصی پر اسرار اور پیچیدہ تھی ۔ ساتھ ھی وہ اُس تصادم اور کشمکش کی پیدا وار تھے جو ھماری انفرادی آزادی اور سماجی اور اخلاقی پابندیوں میں پائی جاتی ھے ۔ تاھم ایک عجیب بات یہ ھے کہ میرا جی نے یہ ابہام اور نئے نئے اشارے اور کنائے صرف آزاد نظم تک ھی روا رکھے ھیں اس کے علاوہ جب وہ دوسری شعری اصناف پر قلم اُٹھاتے ھیں تو اُن میں نہ تو کوئی ابہام ہوتا ھے اور نہ کوئی خلا نظر آتا ھے بلکہ وہ روایات کی پابندی کو ملحوظ رکھتے ھیں ۔

میرا جی کے کلام کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ھے کہ وہ علم عروض سے بخوبی واقف اور جملہ اصناف شعر پر حاوی ھیں ۔ بالخصوص اُن کی غزلیں ستھری اور گیت نہایت مترنم اور میٹھے ھیں وہ حسن کا شعور بھی رکھتے تھے مگر ۔

کوئی چھینے لئے جاتا ھے ستاروں کی چمک | کوئی مسموم کئے دیتا ھے شعلوں کی لپک

گرد و پیش کے حالات کا ادراک و اثر بھی لازمی تھا چنانچہ اُنھوں نے ایک حساس انسان کی حیثیت سے زندگی کی بہت سی تلخ حقیقتوں کا مشاھدہ کر کے اپنے جذبات و احساسات کو بڑے بے لاگ انداز میں پیش کیا ھے ۔ اس سلسلے میں جہاں اُن کا موضوع سخن جنسی جذبات ھیں وہ بڑی حد تک اُلجھے ہوئے اور بے راھرو معلوم ہوتے ھیں لیکن اس کے علاوہ جب وہ زندگی کے دوسرے مسائل کو اپنی نظموں میں پیش کرتے ھیں تو اُن کے یہاں وضاحت کے ساتھ ساتھ بڑی دلکشی، روانی اور سوز و گداز ملتا ھے ۔

میرا جی کے اُسلوب بیان کا ذکر کرتے ہوئے ایک بات ھمیں شروع میں ذھن نشین کر لینی چاھئیے کہ آزاد نظم اُردو میں ایک غیر روایتی چیز ھے یا یوں کہہ لیجئے کہ وہ ھماری شاعری میں ایک نئے تجربے کی حیثیت رکھتی ھے لہذا ایسی غیر روایتی صنف کے لئے اگر میرا جی نے بھی روایت سے ھٹ کر ایک نیا انداز بیان اختیار کیا ھے تو وہ کم از کم اس وقت مورد الزام نہیں ۔ اس آزاد نظم کے علاوہ دوسری اصناف میں میرا جی کا اُسلوب بڑی حد تک روایتی اور دلکش ھے ۔ اُنھوں نے صحیح زبان استعمال کی ھے ساتھ ھی چونکہ وہ ھندی زبان کی سرشت سے بخوبی واقف تھے اس لئے اُنھیں ھندی کے نہایت موزوں بلکہ رسیلے الفاظ کے استعمال پر بڑی قدرت حاصل تھی جو اُن کی غزلوں بالخصوص گیتوں میں ترنم و نغمگی اور سوز و گداز جیسی خوش آیندہ خوبیوں کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ھے ۔

بحیثیت مجموعی میرا جی کا کلام بیک وقت روایت کی اھمیت و بغاوت دونوں کا حامل ھے اور یہ تضاد اس لیے ھے کہ میرا جی خود متضاد عناصر کا مجموعہ تھے ۔ وہ جنسی جذبات کا شکار تھے شاید اسی لئے وہ جب اس موضوع پر قلم اُٹھاتے ھیں تو نئے نئے

استعارے ' اشارے اور کنائے استعمال کر کے کچھ مبہم سی باتیں کہہ جاتے ہیں لیکن اس موضوع کے علاوہ وہ زندگی کے دوسرے مسائل پر اظہار خیال کرتے ہیں تو کلام میں کوئی سقم راہ نہیں پاتا ۔ اس پر شاعر کے جذبات کا خلوص اور آن کا دیانت‌دارانہ اظہار اس کے فن پاروں کو اور بھی قابل قدر بنا دیتا ہے ۔ مرحوم کے کئی مجموعہ کلام چھپ چکے ہیں لیکن ابھی کئی ایسے مجموعے باقی ہیں جو کتابی صورت میں شائع نہیں ہو سکے ہیں ۔

انتخاب کلام

تغزل

ہنسو تو ساتھ ہنسے گی دنیا' بیٹھ اکیلے رونا ہو گا
چپکے چپکے بہا کر آنسو دل کے دکھ کو دھونا ہو گا
بیاروں سے مل جائیں پیارے' انہونی کب ہونی ہو گی
کانٹے پھول بنیں گے کیسے' کب سکھ سیج بچھونا ہو گا
بہتے بہتے کام نہ آئے لاکھوں بھنور طوفانی ساگر
اب منجدھار میں اپنے ہاتھوں جیون ناؤ ڈبونا ہو گا
میرا جی کیوں سوچ ستائے ' پلک پلک ڈوری لہرائے
قسمت جو بھی رنگ دکھائے ' اپنے دل میں سمونا ہو گا

غم کے بھروسے کیا کچھ چھوڑا ' کیا اب تم سے بیان کریں
غم بھی راس نہ آیا دل کو ' اور ہی کچھ سامان کریں
کرنے اور کہنے کی باتیں ' کس نے کہیں اور کس نے کیں
کرتے کہتے دیکھیں کسی کو ' ہم بھی کوئی پیمان کریں
بھلی بری جیسی بھی گزری ' آن کے سہارے گزری ہے
حضرت دل جب ہاتھ بڑھائیں ' ہر مشکل آسان کریں
ایک ٹھکانا آگے آگے ' پیچھے پیچھے مسافر ہے
چلتے چلتے سانس جو ٹوٹے ' منزل کا اعلان کریں

میر ملے تھے میرا جی سے ' باتوں سے ہم پہچان گئے
فیض کا چشمہ جاری ہے ' حفظ اُن کا بھی دیوان کریں

گیت

انجانے نگر من مانے تھے

انجانے نگر من مانے تھے ' من مانے نگر انجانے رہے
اپنی باتوں کی بستی میں
سنتے رہے دلکی بستی میں
وہی گیت جو کچھ من مانے رہے ' وہی راگ جو سکھ کے بہانے رہے
راتیں بیتیں ' دن بیت گئے
رات بھی نئی پھر دن بھی نئے
مورکھ من ایسا ہٹیلا ہے ' اسے یاد وہ رنگ پرانے رہے
ان ہونی کا جسے دھیان رہا
ہونی نے اُسے چپکے سے کہا
نہ وہ باتیں رہیں نہ زمانے رہے ' جو رہے بھی تو باق فسانے رہے
اب گیت میں رس ٹپکاتے ہیں
یوں دل کی آگ بجھاتے ہیں
اب دل کیلئے وہی باؤرے ہیں ' جو بیتے سمے میں سیانے رہے

اب سکھ کی تان سنائی دی

اب سکھ کی تان سنائی دی
اک دنیا نئی دکھائی دی
اب سکھ نے بدلا بھیس نیا اب دیکھیں گے ہم دیس نیا
جب دل نے رام دھائی دی
اک دنیا نئی دکھائی دی
اس دیس میں سب انجانے ہیں اپنے بھی یہاں بیگانے ہیں
پیتم نے سب سے رہائی دی
اک دنیا نئی دکھائی دی

هر رنگ نیا ہر بات نئی اب دن بھی نیا اور رات نئی
اب چین کی راہ سجھائی دی
اک دنیا نئی دکھائی دی
اب اپنا محل بنائیں گے اب اور کے در پہ نہ جائیں گے
اک گھر کی راہ سجھائی دی
اک دنیا نئی دکھائی دی

منظومات

لبِ جوئیبارے

ایک ہی پل کے لئے بیٹھ کے پھر اٹھ بیٹھی
آنکھ نے صرف یہ دیکھا کہ نشستہ بت ہے
یہ بصارت کو نہ تھی تاب کہ وہ دیکھ سکے
کیسے تلوار چلی' کیسے زمیں کا سینہ
ایک لمحے کے لئے چشمے کی مانند بنا

پیچ کھاتے ہوئے یہ لہر اٹھی دل میں مرے
کاش یہ جھاڑیاں اک سلسلۂ کوہ بنیں
دامن کوہ میں میں جا کے ستادہ ہو جاؤں
ایسی انہونی جو ہو جائے تو کیوں یہ بھی نہ ہو
خشک پتوں کا زمیں پر جو بچھائے بستر
وہ بھی اک ساز بنے ۔ ساز تو ہے ! ساز تو ہے !
نغمہ بیدار ہوا تھا جو ابھی' کان ترے
کیوں اسے سن نہ سکے ! سننے سے مجبور رہے
پردۂ چشم نے صرف ایک نشستہ بت کو
ذہن کے دائرۂ خاص میں مرکوز کیا

یاد آتا ہے مجھے ۔ کان ہوئے تھے بیدار
خشک پتوں سے جب آئی تھی تڑپنے کی صدا
اور دامن کی ہر اک لہر چمک اٹھی تھی

پڑ رہا تھا اُسی تلوار کا سایۂ شائد
جو نکل آئی تھی اک پل میں نہاں خانے سے
جیسے بے ساختہ انداز میں بجلی چمکے

لیکن اُس دامن آلودہ کی ہر لہر مٹی
جل پری دیکھتے ہی دیکھتے رو پوش ہوئی
میں ستادہ ہی رہا میں نے نہ دیکھا (افسوس !)
کیسے تلوار چلی ' کیسے زمیں کا سینہ
ایک لمحے کے لئے چشمے کی مانند بنا

دامن کوہ میں استادہ نہیں ہوں اس وقت
جھاڑیاں سلسلۂ کوہ نہیں ' پردہ ہیں
جس کے اُس پار جھلکتا نظر آتا ہے مجھے
منظر انجان ' اچھوتی سی دلہن کی صورت

ہاں تصور کو میں اب اپنے بنا کر دولھا
اسی پردے کے نہاں خانے میں جاؤں گا کبھی
کیسے تلوار چلی ' کیسے زمیں کا سینہ
دل بے تاب کی مانند تڑپ اٹھا تھا !
زندگی گرم تھی ہر بوند میں آبی پاؤں
خشک پتوں پہ پھسلتے ہوئے جا پہنچے تھے !

میں بھی موجود تھا ۔ اک کرمک بے نام و نشاں
میں نے دیکھا کہ گھٹا شق ہوئی ' دھارا نکلی '
برق رفتاری سے اک تیر کماں نے چھوڑا
اور وہ خم کھا کے لچکتا ہوا تھرا کے گرا
قلۂ کوہ سے گرتے ہوئے پتھر کی طرح
کوئی بھی روک نہ تھی اُس کے لئے ' اُس کے لئے
خشک پتوں کا زمیں پر ہی بچھا تھا بستر !
اُسی بستر پہ وہ انجان پری لیٹ گئی !

اور میں کرمک بے نام ' گھٹا کی صورت
اسی اُمید میں تکتا رہا ' تکتا ہی رہا

اب اسی وقت کوئی جل کی پری آ جائے
بنسری ہاتھ میں لے کر میں گوالا بن جاؤں
جل پری آئے کہاں سے ! وہ اسی بستر پر
میں نے دیکھا ' ابھی آسودہ ہوئی ' لیٹ گئی
لیکن افسوس کہ میں اب بھی کھڑا ہوں تنہا !
ہاتھ آلودہ ہے ' نمدار ہے ' دھندلی ہے نظر '
ہاتھ سے آنکھوں کے آنسوں تو نہیں پونچھے تھے !

ابوالہول

بچھا ہے صحرا اور اس میں ایک ایستادہ صورت بتا رہی ہے
پرانی عظمت کی یادگار آج بھی ہے باقی '

نہ اب وہ محفل ' نہ اب وہ ساقی
مگر انھیں محفلوں کا اک پاسباں کھڑا '
فضائے ماضی میں کھو چکی داستان فردا
مگر یہ افسانہ خواں کھڑا ہے '
زمانہ ایوان ہے ' یہ اس میں سنا رہا ہے پرانے نغمے '
میں ایک نا چیز و ہیچ ہستی
فضائے صحرا کے گرم و ساکن ' خموش نغمے
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے
ابھی وہ آ جائیں گے سپاہی
وہ تند فوجیں
دلوں میں احکام بادشاہوں کے لے کے آ جائیں گی افق سے
ہوائے صحرا نے چند ذرے کئے پریشاں
ہے یا وہ فوجوں کی آمد آمد!
خیال ہے ' یہ فقط خیال اک خیال سے دل میں ڈر گیا ہوں '
مگر یہ ماضی کا پاسباں پر سکون دل سے
زمیں پہ اک بے نیاز انداز سے ہے قائم ۔

نارسائی

رات اندھیری ' بن ہے سونا ' کوئی نہیں ہے ساتھ
پون جھکولے پیڑ ھلائیں ' تھر تھر کانپیں پات
دل میں ڈر کا تیر چبھا ہے ' سینے پر ہے ھاتھ
رہ رہ کر سوچوں یوں کیسے پوری ہو گی رات ؟

برکھا رت ہے اور جوانی ' لہروں کا طوفان '
پیتم ہے نادان' مرا دل رسموں سے انجان '
کوئی نہیں جو بات سجھائے ' کیسے ھوں سامان
بھگوان! مجھ کو راہ دکھادے' مجھکو دے دے گیان'

چپو ٹوٹے ' ناؤ پرانی ' دور ہے کھیون ھارا '
بیری ھیں ندی کی موجیں اور پیتم اس پار
سن لے سن لے دکھ میں پکارے اک پریمی بیچارا
کیسے جاؤں' کیسے پہنچوں' کیسے جتاؤں پیار ؟

کیسے اپنے دل سے مٹاؤں برہ اگن کی آگ
کیسے بجھاؤں پریم پہیلی' کیسے کروں سنجوگ ؟
بات کی گھڑیاں بیت نہ جائیں دور ہے اسکا دیس '
دور دیس ہے پیتم کااور میں بدلے ہوں بھیس '

حفیظ ہوشیارپوری

شیخ عبدالحفیظ سلیم متخلص بہ حفیظ ہوشیار پور کے رہنے والے ہیں۔ آپ ۵ جنوری ۱۹۱۲ء مطابق ۱۵ محرم ۱۳۳۰ھ کو لائل پور سے بارہ میل کے فاصلے پر ضلع جھنگ کے ایک گاؤں دیوان پور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مرحوم کا اسم گرامی شیخ فضل محمد خاں تھا۔ حفیظ صاحب کی ابتدائی تعلیم کا بیشتر زمانہ اسلامیہ ہائی اسکول ہوشیار پور میں گزرا۔ وہیں سے آپ نے ۱۹۲۸ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ پھر ۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ کالج ہوشیار پور سے ایف۔ اے۔ میں کامیابی حاصل کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۳ء میں بی۔ اے۔ اور ۱۹۳۶ء میں ایم۔ اے (فلسفہ) کی ڈگریاں حاصل کیں۔ تعلیم سے فراغت کے بعد حفیظ صاحب نے کچھ عرصہ محض علمی و ادبی مشاغل میں گزارا اور میاں بشیر احمد سکریٹری ''انجمن اردو پنجاب'' کی معیت میں انجمن مذکور کے اسسٹنٹ سکریٹری رہے۔ پھر تلاش معاش کی فکر دامنگیر ہوئی تو آل انڈیا ریڈیو لاہور سے وابستہ ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ پہلے کراچی میں پروگرام ڈائرکٹر رہے۔ کچھ عرصہ بعد لاہور تبدیل ہو کر آئے اور اسٹیشن ڈائرکٹر کے فرائض انجام دیتے رہے۔ جون ۱۹۵۳ء میں دوبارہ کراچی واپس چلے گئے اور آجکل آپ کا قیام وہیں ہے۔

حفیظ صاحب کو خاندانی روایات کی وجہ سے بچپن ہی میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ گھر میں ہر وقت شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ آپ کے نانا شیخ غلام محمد صاحب مرحوم جو پرانے مکتبوں کے فارغ التحصیل تھے فارسی میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ انھیں اردو فارسی کی نظم و نثر کی بہت سی کتابیں حفظ تھیں۔ چنانچہ وہ فرصت کے وقت کسی کتاب کا کوئی حصہ زبانی سناتے اور پھر اس کی تشریح کرتے۔ ۱۹۳۰ء میں ان کے انتقال کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد حفیظ صاحب کا ذوق سخن زیادہ تر اپنے بڑے بھائی شیخ عبدالرشید خاں راحل کے فیضان صحبت کا مرہون منت رہا۔ انھیں کے ہمراہ حضرت حفیظ مولانا گرامی مرحوم تک پہنچے اور ان کی دلچسپ صحبتوں میں شریک ہو کر اپنے مذاق سخن کو اور بھی نکھارا۔

حضرت حفیظ گورنمنٹ کالج لاہور میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور سید احمد شاہ بخاری پطرس کی صحبتوں سے بہت اثر پذیر ہوئے۔ ابتدا سے ہی انگریزی شاعری کی طرف بہت رغبت تھی چنانچہ آپ نے چند انگریزی نظمیں بھی لکھیں۔ اردو میں آپ نظم و غزل

دونوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن طبیعت کو غزل سے زیادہ مناسبت ہے اور بلا شبہ غزل ہی میں اُن کے فکر و فن کے جوہر کھلتے ہیں۔ آپ کی غزلیں اُردو غزل کی کامل شائستگی و تہذیب کے ساتھ ساتھ جدید رجحانات کی آئینہ دار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن میں غم جاناں و غم دوراں کا نہایت لطیف امتزاج پایا جاتا ہے۔ مزید برآں اُن کے تغزل کی سب سے امتیازی خصوصیت تخیل کی گہرائی ہے۔ یہ تفکر اور فلسفیانہ انداز بیان غالباً اُن کے یہاں اس لئے پیدا ہوا ہے کہ اُنھیں فلسفہ کے مضمون سے طالب علمی کے زمانے سے ہی دلچسپی رہی ہے۔ وہ غزل کے پامال مضامین کو بھی ایک ایسے انداز سے پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو نئی باتوں کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ پھر چونکہ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں دستگاہ رکھتے اور اساتذہ کے کلام کا وسیع مطالعہ کر چکے ہیں اس لئے زبان و بیان کی خوبیاں بھی اُن کے کلام میں بدرجۂ اتم مو جود ہیں۔

حفیظ صاحب نے غزلوں کی بہ نسبت نظمیں کم کہی ہیں مگر اُن میں بھی وہی شگفتگی و کشش ہے جو اُن کی غزلوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ آپ نے رومانی نظمیں زیادہ کہی ہیں۔ جن میں جذبات کی فراوانی اور خیال کی رعنائی سب کچھ موجود ہے۔ یہ نظمیں در حقیقت اُن کی پریت کے گیت ہیں لیکن ان گیتوں میں سموئی ہوئی ذہنی و جذباتی کیفیات صحت مند ضرور ہیں۔ جہاں تک ان کی زبان کا تعلق ہے وہ بھی گیتوں کی سی ہے یعنی اُس میں اُردو کے نرم اور مترنم الفاظ کے ساتھ ساتھ ہندی کے رس بھرے الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں جس کی وجہ سے منظومات کے درد و موسیقیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

حفیظ صاحب کے بارے میں ایک بات اور کہنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ آپ کو تاریخ گوئی میں بھی بڑی مہارت حاصل ہے۔ غرض حضرت حفیظ پاکستان کے خوش فکر شعرا میں سے ہیں اور اُن کا کلام پختگی و روانی، سلاست و شگفتگی اور درد و اثر کی خصوصیات کا حامل ہے۔ موصوف نے کم کہا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ جو کچھ ہے اُسے انتخاب کا شرف حاصل ہے۔

انتخاب کلام

تغزل

راز سر بستہ محبت کے زباں تک پہنچے
بات بڑھ کر یہ خدا جانے کہاں تک پہنچے

کیا تصرف ہے ترے حسن کا اللہ! اللہ!
جلوے آنکھوں سے اُتر کر دل و جاں تک پہنچے

تری منزل پہ پہنچنا کوئی آسان نہ تھا
سرحد عقل سے گزرے تو یہاں تک پہنچے

ابتدا میں جنھیں ہمرنگ وفا سمجھے تھے
ہوتے ہوتے وہ گلے حسن بیاں تک پہنچے
نہ پتہ سنگ نشاں کا نہ خبر رہبر کی
جستجو میں ترے دیوانے یہاں تک پہنچے
نہ غبار رہ منزل ہے نہ آواز جرس
کون مجھ رہرو گم کردہ نشاں تک پہنچے
صاف توہین ہے یہ درد محبت کی ''حفیظ''
حسن کا راز ہو اور میری زباں تک پہنچے

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے — تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے
میں اکثر سوچتا ہوں پھول کب تک — شریک گریۂ شبنم نہ ہوں گے
زمانے بھر کے غم یا اک ترا غم — یہ غم ہو گا تو کتنے غم نہ ہوں گے
اگر تو اتفاقاً مل بھی جائے — تری فرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے
''حفیظ'' اُن سے میں جتنا بدگماں ہوں
وہ مجھ سے اس قدر برہم نہ ہوں گے

تو نے اسے تعبیر کیا عشق سے ورنہ
کس کے لئے اے دوست پریشاں نہ ہوئے ہم
محدود ہے غم ایک نہ اک آفت جاں تک
افسوس حریف غم انساں نہ ہوئے ہم
دل کا ہے وہی حال خزاں ہو کہ بہاراں
صد شکر کہ رسوائے بہاراں نہ ہوئے ہم
جلتے ہیں مگر دیکھ کے دلسوزئ احباب
یعنی سر ہر بزم فروزاں نہ ہوئے ہم
توہین غم عشق نہ تھی ہم کو گوارا
توفیق خداداد پہ نازاں نہ ہوئے ہم
شرمندہ رہے سہل پسندان جہاں سے
وہ عقدۂ مشکل تھے کہ آساں نہ ہوئے ہم

ضرور عشق سے بڑھ کر بھی کوئی غم ہو گا
کہ آج دل پہ گراں یاد یار گزری ہے
غم جہاں نہ کہیں اس میں کار فرما ہو
کہ دل سے تیری نظر شرمسار گزری ہے
بہار ہو کہ خزاں دل کا ہے وہی عالم
کہ زندگی بہ اُمید بہار گزری ہے
خزاں نصیب یہ سمجھے کہ آ گئی ہے بہار
''حفیظ'' جب بھی چمن سے بہار گزری ہے

کہاں کہاں نہ تصور نے دام پھیلائے
حدود شام و سحر سے نکل کے دیکھ آئے
غرور جادہ شناسی بجا سہی' لیکن
سراغ منزل مقصود بھی کوئی پائے
خدا وہ دن نہ دکھائے کہ راہبر یہ کہے
چلے تھے جانے کہاں سے کہاں نکل آئے
نہ جانے اُن کے مقدر میں کیوں ہے تیرہ شبی
وہ ہم نوا جو سحر کو قریب تر لائے
کوئی فریب نظر ہے کہ تابناک فضا
کسے خبر کہ یہاں کتنے چاند گہنائے
غم زمانہ تری ظلمتیں ہی کیا کم تھیں
کہ بڑھ چلے ہیں اب اُن گیسوؤں کے بھی سائے
''حفیظ'' اپنا مقدر' ''حفیظ'' اپنا نصیب
گرے تھے پھول مگر ہم نے زخم ہی کھائے

غم زندگانی کے سب سلسلے
بالاخر غم عشق سے جا ملے
روایات وصل و فراق اب کہاں
نئی قربتیں ہیں نئے فاصلے
تری یاد یوں دل میں آئی کبھی
کوئی جس طرح اتفاقاً ملے
بہاریں کئی آ کے رخصت ہوئیں
پر اہل جنوں کے نہ دامن سلے
نہ یہ معتبر ہیں نہ وہ معتبر
جفا کے تقاضے وفا کے صلے

ایسی بھی کیا جلدی پیارے' جانے ملیں پھر یا نہ ملیں ہم
کون کہے گا پھر یہ فسانہ' بیٹھ بھی جاؤ' سن لو کوئی دم
وصل کی شیرینی میں پنہاں' ہجر کی تلخی بھی ہے کم کم
تم سے ملنے کی بھی خوشی ہے' تم سے جدا ہونے کا بھی غم
حسن و عشق جدا ہوتے ہیں' جانے کیا طوفان اٹھے گا
حسن کی آنکھیں بھی ہیں پرنم' عشق کی آنکھیں بھی ہیں پرنم

پروانے کی خاک پریشاں ' شمع کی لو بھی لرزاں لرزاں
محفل کی محفل ہے ویراں ' کون کرے اب کس کا ماتم
کچھ بھی ہو پر ان آنکھوں نے' اکثر یہ عالم بھی دیکھا
عشق کی دنیا ناز سراپا ' حسن کی دنیا عجز مجسم

ہجوم اندوہ و غم سراسر ترے غم عشق تک رسائی
ہزار غم بھر آزمائش ترے غم کارگر سے پہلے
وہی ہیں دیکھے ہوئے سے منظر' وہی ہیں مانوس سی فضائیں
کہیں وہیں پھر نہ آگئے ہوں چلے تھے جس رہگزر سے پہلے

کہیں دیکھی ہے شاید تیری صورت اس سے پہلے بھی
کہ گزری ہے مرے دل پر یہ حالت اس سے پہلے بھی
ترا نور جبیں تھا اور شام غم کی تاریکی
تجھے دیکھا ہے اے صبح مسرت اس سے پہلے بھی
نہ جانے کتنے جلوے پیش رو تھے تیرے جلووں کے
تجھی سے بارہا کی ہے محبت اس سے پہلے بھی
سناتی ہیں کوئی افسانہ تیری سہمگیں نظریں
ہوئی ہے مجھ سے گستاخانہ جرأت اس سے پہلے بھی
مری قسمت کہ میں اس دور میں بدنام ہوں ورنہ
وفاداری تھی شرط آدمیت اس سے پہلے بھی

نہ آسماں پہ نہ مژگاں پہ ہے ستارہ کوئی
شب سیاہ میں اندازۂ سحر کے لئے
ہنوز گوش بر آواز ہیں در و دیوار
نجانے کس کی ملاقات کی خبر کے لئے
نہ اب وہ ذوق طلب ہے نہ اب وہ عزم سفر
رواں ہے قافلہ تسکین راہبر کے لئے
نظر سے حد نظر تک تمام تاریکی
یہ اہتمام ہے اک وعدۂ سحر کے لئے

خدا دراز کرے عمر اہل شوق ''حفیظ''
کہ جی رہے ہیں کسی دور منتظر کے لئے

چند آنسو بے ارادہ بے سبب — محفل غم بن گئی بزم طرب
دل کی دنیا اُس قدر آباد ہے — جس قدر ویران ہیں چشم و گوش و لب
عشق اور خمیازۂ اظہار غم — حسن اور اندازۂ حسن طلب

کیا دل گرفتہ ہم تری محفل سے آئے ہیں
آنکھوں میں اشک بھی بڑی مشکل سے آئے ہیں
مجبور ہو کے پھر تری محفل میں جائیں گے
مایوس ہو کے جو تری محفل سے آئے ہیں
اپنی نظر میں اب کوئی جچتا نہیں ''حفیظ''
اُٹھ کر نہ جانے کس کے مقابل سے آئے ہیں

تجھے یاد آئیں گے حسن پشیماں ہم نہ کہتے تھے
ستائے گا تجھے بھی درد ھجراں ہم نہ کہتے تھے
چھپانے سے بھی اب چھپتا نہیں احساس محرومی
عذاب جاں بنے گا ربط پنہاں ہم نہ کہتے تھے
علاج رنجش بے جا نہیں ترک تعلق بھی
یہ مشکل اس طرح ہوگی نہ آساں ہم نہ کہتے تھے
ہمیں ویرانئ پیہم سے لذت آشنا کر کے
تری دنیا بھی ہو جائے گی ویراں ہم نہ کہتے تھے

آ گئی اُن کی جدائی دل کو راس — پھر بھی ہے ملنے کی اک موہوم آس
ہوتے ہوتے خشک آنسو ہو گئے — بجھتے بجھتے بجھ گئی آنکھوں کی پیاس
اب ملے گی عمر بھر اس کی سزا — عشق میں باقی رہے ہوش و حواس
یہ در و دیوار سے باتیں ''حفیظ'' — جس طرح بیٹھا ہو کوئی میرے پاس

کون جانے ہو گئی کس کے بغیر — زندگی وہم و گماں ، خواب و خیال
تیرے غم میں تیرے صورت آشنا — بن گئے آئینہ حسن و جمال

فرصت غم کو ہے اب جنکی تلاش — کاش بن سکتے وہ لمحے ماہ و سال
زندگی میں اور بھی غم تھے کئی — کیوں ہمیں آیا ترے غم کا خیال
کھل گیا ترک محبت کا فریب — اب انہیں دل سے بھلانا ہے محال
گر مقدر میں یہی کچھ تھا ''حفیظ''
عشق ہوتا بر تر از ہجر و وصال

ہر ایک درد کو درماں بنا دیا کس نے — غم حیات کو آساں بنا دیا کس نے
لب بہار پہ یہ مسکراہٹیں کب تھیں — کلی کلی کو گلستاں بنا دیا کس نے
سکون گوشۂ زنداں کو جی ترسنے لگا — اسیر دشت و بیاباں بنا دیا کس نے
ادائے پرسش غم سے غم جہاں کو حفیظ
کبھی کبھی غم جاناں بنا دیا کس نے

جبیں پہ گرد سفر ہے، نظر میں عزم جواں
یہ کس دیار میں پہنچے ہیں کس دیار سے ہم
فضا پہ چھائینگے طوفان رنگ و بو بن کر
بہار بن کے جو نکلے ہیں شعلہ زار سے ہم
تمام عمر رہا ہم کو انتظار بہار
بہار آئی تو شرمندہ ہیں بہار سے ہم
افق پہ حد نظر تک غبار چھایا ہے
''حفیظ'' ابھریں گے آخر اسی غبار سے ہم

اتنا بھی مرا حال پریشاں تو نہیں ہے — آخر ترا غم ہے غم دوراں تو نہیں ہے
کیوں دیکھ رہے ہو مری افسردہ نگاہی — اندازۂ غم اس قدر آساں تو نہیں ہے

دولت غم بھی ہے بہت نایاب — دولت غم کو پائمال نہ کر

آپ کی یاد تک رہا شام و سحر کا سلسلہ
اب کوئی صبح بھی نہیں اب کوئی شام بھی نہیں

بات کہنے لگیں تو ختم نہ ہو   بات کہنے کو مختصر سی ہے

تیرے لطف و کرم ہیں، تو بھی ہے، تیری وفا بھی ہے
مگر کوئی مداوا اس دل بے تاب کا بھی ہے

کچھ مجھے جرأت ہوئی ، کچھ اُن کی آنکھیں جھک گئیں
ہوتے ہوتے یوں ہی اظہار تمنا ہو گیا

لطف آنے لگا جفاؤں میں   وہ کہیں مہرباں نہ ہو جائے

تم سے رخصت ہوئے تھے جو ہنس کر   سر منزل پہنچ کے روئے ہیں
کیا ہوا میرے غمگساروں کو   آج کچھ وہ بھی کھوئے کھوئے ہیں
ہجر کی رات جاگنے والے   وصل کی رات خوب سوئے ہیں

ظلمت شب کا دھڑکتا ہے دل   اس میں نا دیدہ سحر ہے کوئی
منتظر ہے مری آغوش وفا   کاش آ جائے اگر ہے کوئی

منظومات

آج کی رات

چاندنی رات ہے جوانی پر
دست گردوں میں ساغر مہتاب   نور بن بن کے چھن رہی ہے شراب
ساقئی آسماں پیالہ بدست   میں شراب سرور سے سرمست
فکر دوزخ نہ ذکر جنت ہے   میں ہوں اور تیری پیاری صورت ہے
رس بھرے ہونٹ مد بھری آنکھیں !
کون فردا پہ اعتبار کرے   کون جنت کا انتظار کرے
جانے کب موت کا پیام آئے   یہ مسرت بھی ہم سے چھن جائے
دامن عقل چاک ہونے دے   آج یہ قصہ پاک ہونے دے

غم کو نا پائدار کر دیں ہم　　موت کو شرمسار کر دیں ہم
لب سے لب یوں ملیں کہ کھو جائیں　　جذب اک دوسرے میں ہو جائیں
میں رہوں اور نہ تو رہے باقی !

کس قدر دل نشیں ہیں لب تیرے　　بادۂ احمریں ہیں لب تیرے
تیرے ہونٹوں کا رس نہیں ہے یہ　　آج کوثر ہے ' انگبیں ہے یہ
شہد کے گھونٹ پی رہا ہوں میں　　آج کی رات جی رہا ہوں میں
آج کی رات پھر نہ آئے گی !

آگ لگے اس من میں آگ

لو پھر رات برہ کی آئی　　جان مری تن میں گھبرائی
چاروں اور اداسی چھائی　　اپنی قسمت اپنے بھاگ
آگ لگے اس من میں آگ

کالی اور برستی رین !　　آس بن نیند کو ترسیں نین
جسکے ساتھ گیا سکھ چین　　اس کی یاد کہے اب جاگ
آگ لگے اس من میں آگ

جس دن سے وہ پاس نہیں ہے　　کوئی خوشی بھی راس نہیں ہے
جینے تک کی آس نہیں ہے　　جان کو ہے اب تن سے لاگ
آگ لگے اس من میں آگ

کون جئے اور کس کے سہارے　　میٹھے میٹھے بول سدھارے
گیت کہاں وہ پیارے پیارے　　اب وہ تان نہ اب وہ راگ
آگ لگے اس من میں آگ

درس دکھا کر جو چھپ جائے　　کون ایسے سے پیت لگائے
کیوں اپنی کوئی دسا سنائے　　چھوڑ محبت کا کھڑاگ
آگ لگے اس من میں آگ

تاریخیں

(۱)

ماتم تاثیر

(۱)

غم تاثیر میں احباب گریاں
بہ زیر خاک محو خواب ''تاثیر''
کہاں سے لائیں اس کو ڈھونڈ کر ہم
'' محب صادق احباب تاثیر ''

۱۳۷۰ھ

(۲)

اجل سے آج پیمان وفا ہے
بہت کوتاہ تھا پیمان ''تاثیر''
نصیب اس کو بہشت جاودانی
نصیب دوستاں '' ہجران تاثیر ''

۱۳۷۰ھ

(۲) کراچی میں ٹرانسمیٹر لگنے کی تاریخ :-
ع تری آواز مکے اور مدینے

(۳) لیاقت علی خاں مرحوم کی تاریخ وفات:-
ع صلۂ شہید کیا ہے تب و تاب جاودانہ

اختر انصاری

اختر انصاری یکم اکتوبر ۱۹۰۹ء کو اپنے آبائی وطن بدایوں میں پیدا ہوئے مگر بدایوں میں اپنی زندگی کے صرف چند ماہ ہی بسر کئے شاید اسی بنا پر وہ بدایوں سے زیادہ دهلی کو اپنا وطن مانتے هیں - آپ کے والد پنجاب میڈیکل سروس کے رکن تھے چنانچہ زندگی کے ابتدائی تین چار سال اختر صاحب نے پنجاب کے مختلف شہروں میں گزارے - پھر والد صاحب دهلی منتقل هو گئے اور کئی سال اسٹنٹ سول سرجن رہ کر جب ریٹائر ہوئے تو وهیں سکونت اختیار کر لی - بنا بریں اختر انصاری صاحب بھی تین چار سال کی عمر سے مستقل طور پر دهلی میں رہے - وهیں ہوش سنبھالا اور وهیں تعلیم و تربیت کی مختلف منازل طے کیں - ۱۹۳۰ء میں دهلی یونیورسٹی سے بی - اے (آنرز) کی ڈگری حاصل کر کے ۱۹۳۱ء میں انگلستان گئے لیکن حالات کی نا مساعدت کی بنا پر وهاں سے کچھ حاصل کئے بغیر جلد واپس آ گئے - هندوستان پہنچ کر قانون پڑھنا شروع کیا مگر ایک ہی سال گزرا تھا کہ طبیعت اچاٹ هو گئی اور بی - ٹی میں داخلہ لے لیا - ۱۹۳۴ء میں ٹریننگ کالج علیگڑھ سے امتیاز کے ساتھ بی - ٹی پاس کر کے مسلم یونیورسٹی هائی اسکول میں انگریزی کے اُستاد مقرر هو گئے اور کافی عرصے تک یہ خدمت انجام دیتے رہے - اس دوران میں اُردو ادب کا مطالعہ برابر جاری رہا - تقسیم هند سے کچھ عرصہ پہلے آپ نے علیگڑھ یونیورسٹی سے اُردو میں ایم - اے کی ڈگری حاصل کی - اس کے بعد عارضی طور پر وهیں شعبۂ اُردو میں لکچرر هو گئے - آجکل مسلم یونیورسٹی ٹریننگ کالج میں لکچرر کی حیثیت سے کام کر رہے هیں -

اختر انصاری صاحب نے ۱۹۲۸ء سے شعر کہنا شروع کئے - ابتدا میں علامہ اقبال کے اثرات کے ماتحت قومی، ملی اور منظریہ نظمیں لکھنے کا شوق زیادہ تھا اور غزلگوئی سے دلچسپی نہیں تھی - لیکن بہت جلد طبیعت کا اصلی رنگ غالب آ گیا اور قومیات کو پس پشت ڈال کر غنائی و جذباتی شاعری پر اپنی پوری توجہ صرف کرنا شروع کی - ۱۹۳۲ء میں نظموں، غزلوں اور قطعات کا ایک مختصر سا مجموعہ "نغمہ روح" کے نام سے شائع کرایا جو بعد میں کچھ اضافے کے ساتھ ۱۹۳۴ء میں دوبارہ شائع ہوا اس مجموعے میں نظمیں اور غزلیں تو زیادہ بہتر نہیں تھیں مگر قطعات ضرور انفرادیت کے حامل تھے چنانچہ ملک کے مقتدر جرائد میں جب "نغمہ روح" پر تبصرے ہوئے تو بلا مبالغہ هر تبصرہ نگار نے اُنکے قطعات کی تعریف کی - غالباً انہیں همت افزا تبصروں کا یہ نتیجہ ہوا کہ اختر صاحب نے اُس کے بعد دوسری اصناف سخن کے مقابلے میں قطعات پر زیادہ توجہ دی - حتیٰ کہ ۱۹۴۰ء کے اواخر میں اُن کے محض قطعات کا ایک مجموعہ "آبگینے" شائع ہوا -

اختر صاحب کا حقیقی جوہر اُن کے قطعات میں ظاہر ہوتا ہے ۔ یہ رباعی نما شعر جنہیں وہ قطعوں کا عنوان دیتے ہیں آنکی جدت طبع کا نتیجہ ہیں ۔ یہ قطعے رباعی سے اس خاص باب میں مختلف ہیں کہ رباعی میں بیشتر پہلے تین مصرعے چوتھے مصرعے کی خاطر برداشت کر لئے جاتے ہیں مگر ان قطعات میں پہلے تین مصرعے بھی اُس فضا کے پیدا کرنے کے کام آتے ہیں جو چوتھے مصرعے کے ساتھ مکمل ہو جاتی ہے ۔ ان قطعوں میں آپ نے مختلف موضوعات پر انتہائی برجستگی ' چستی اور صفائی کے ساتھ قلم اُٹھایا ہے اور بعض اوقات تو سچ مچ شاعر کی چابکدستی و زور بیان پر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے ۔

اختر صاحب کی نظموں میں ' ابتدائی منظومات کو چھوڑ کر جن میں جذباتیت اور اظہار و ابلاغ کی بھی کہیں کہیں خامیاں موجود ہیں ' بڑی نغمگی ' ترنم ' ندرت بیان اور سب سے زیادہ خلوص کی کارفرمائی نظر آتی ہے نیز اُن کی تشبیہات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ بالعموم مادی و محسوس چیزوں کا موازنہ غیر مادی و غیر محسوس چیزوں سے کر کے اُن میں ایک خاص کیفیت و اثر پیدا کر دیتے ہیں ۔ آپ کی صرف نظموں کا ایک مجموعہ ''خندۂ سحر'' کے نام سے شائع ہوکر ادبی حلقوں میں خاصا مقبول ہو چکا ہے ۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظم نگاری میں بھی اُنہوں نے گونہ ترقی کی ہے اور زندگی کے مختلف مسائل پر طبع آزمائی کر کے اپنی منظومات کو حقیقت افروز بنا دیا ہے ۔ تاہم اختر صاحب چونکہ فطرتاً ایک متشائم انسان ہیں اسلئے اُن کی اکثر نظموں میں اندوہ و ملال کا پہلو زیادہ نمایاں ہے ۔ اور اُن کی فطرت کی اس خصوصیت نے ہمارے تغزل کے روایتی قنوطی لب و لہجہ میں گم ہو کر غزل میں بڑی تاثیر پیدا کر دی ہے ۔ چنانچہ اختر صاحب کی غزلیات کے مجموعے ''خوناب'' کی غزلوں میں قوت تخیل اور زبان و بیان کی دوسری خوبیوں سے قطع نظر جو درد اور کسک پائی جاتی ہے وہ در اصل اسی ذاتی وصف کی بدولت پیدا ہوئی ہے ۔

بحیثیت مجموعی اختر صاحب ایک کامیاب افسانہ نگار ہونے کے علاوہ اچھے شاعر بھی ہیں اور نوجوان شعرا کی صف میں ایک امتیازی شان کے مالک ہیں لیکن کاش وہ اپنی دوسری ادبی مصروفیتوں کو کم کر کے اس طرف زیادہ توجہ دے سکتے تاکہ اُن کے کلام میں زیادہ مشاطگی اور ہمہ گیری پیدا ہو سکتی ۔

انتخاب کلام

قطعات

مسکراہٹ اور ہنسی

مسکرائی وہ جب تو میں سمجھا
کسی بربط سے نغمہ پھوٹ پڑا

هنس پڑی وہ تو یہ ہوا معلوم
دست ساقی سے جام چھوٹ پڑا

مغنّیہ کی آواز

یہ ترنم، یہ لطافت اور یہ رنگینیاں
کیوں نہ صدقے جائیے اس سحر کار آواز کے
جانفزائی، قلب سوزی، دلفریبی، رہزنی
واہ! کیا انداز ہیں اس خانہ بر انداز کے

مبتلائے محبت

تو جو راتوں کو اٹھ کے روتا ہے
آہ کیوں اپنی جان کھوتا ہے
ہم تمہیں چاہتے ہیں تم ہم کو
بس فسانوں میں یہی ہوتا ہے

برسات

مہین پھوار کے قطرے میں برف کے ریزے
بھری ہوئی ہیں ہواؤں میں خنکیاں یکسر
فضا ہے بھیگی ہوئی اور جل رہا ہوں میں
خدا کی مار سلگتی ہوئی جوانی پر

رازِ دروں

تکلیف یہ ہر وقت کی ہوتی نہیں برداشت
یہ بارِ الم آہ اٹھایا نہیں جاتا
وہ راز کہ اغیار سے کہہ بھی نہیں سکتے
سینے میں بھی للّٰہ چھپایا نہیں جاتا

آرزو

دل کو برباد کئے جاتی ہے
غم بدستور دئے جاتی ہے
مر چکیں ساری امیدیں "اختر"
آرزو ہے کہ جئے جاتی ہے

ضبطِ اشک

ان آنسوؤں کو ٹپکنے دیا نہ تھا میں نے
کہ خاک میں نہ ملیں میری آنکھ کے تارے
میں ان کو ضبط نہ کرتا اگر خبر ہوتی
پہنچ کے قلب میں بن جائینگے یہ انگارے

شعلہ نوائی

کسی کی انگلیوں کی جنبش پر
ارغنوں سے نکل رہے ہیں راگ
میرے سینے کی کیفیت ' توبہ
جیسے جنگل میں لگ رہی ہو آگ

حسین رات

نسیم ' پھولوں کی رونق' کِھلے ہوئے تارے
فضا میں چھوٹ رہے ہیں ضیا کے فوّارے
رخ حسینۂ فطرت سے اٹھ گئی ہے نقاب
نظر کو ڈھونڈ رہے ہیں حسین نظارے

منظومات

مغنّیہ

نغموں کی نذر ہو گیا پہلے ہی جوش دل
کیا داد دوں مغنیہ ! نغمہ سرائی کی
افسوں کیا وہ دل پہ کہ دل دل نہیں رہا
گویا کوئی ادا تھی یہ رنگیں نوائی کی
آواز لہلہاتی ہوئی اور فرح بار،
جس میں بھری تھیں نزھتیں ساری خدائی کی
اللہ ! یاد ھے مجھے اب تک وہ کیفیت
جب دل سے آ رھی تھیں صدائیں دھائی کی
وہ بات تو نہیں مگر اب بھی مغنیہ
کھاتا ھے دل قسم تری شیریں نوائی کی

امنگ

بہار خلد کا سینے میں بول بالا ھے
تری ضیا سے مری روح میں آجالا ھے
شعاع نور سے آنکھوں میں ھے چمک پیدا
تیرے جمال کے پرتو سے ھے دمک پیدا
فروغ رنگ سے رعنائیوں کا عالم ھے
مرے دماغ میں انگڑائیوں کا عالم ھے
آبل رہا ھے نشاط و سرور کا دریا
رواں جگر سے نظر تک ھے نور کا دریا
تو ایک شمع ھے جو دل میں دے رھی ھے لو
بنا رھی ھے چراغاں جہاں کو تیری ضو
مری نگاہ میں ھے رشک طور ھر ذرہ
ترے جمال کا در اصل عکس ھے دنیا
فضا میں موج صبا بن کے کھیلتی ھے تو
شراب حسن کے ساغر آنڈیلتی ھے تو

شباب حسن بہاراں میں رنگ تیرا ہے
گلوں کی مست اداؤں میں رنگ تیرا ہے
بہار زیست کو تجھ سے ثبات حاصل ہے
ترے وجود سے دل کو حیات حاصل ہے
مئے نشاط کا تو ایک جام ہے گویا
مجھے حیات ابد کا پیام ہے گویا

جبرِ حیات

یہ چاہتا ہوں کہ کچھ دیر کے لئے ہمدم !
تجھے بھی دل سے بھلاؤں میں، خود کو بھی بھولوں
اڑوں لگا کے تخیّل کے پر زمینوں سے
کمند پھینکوں فلک پر، ستاروں کو چھولوں
نہاؤں دھو میں کبھی کہکشاں میں، اور کبھی
دھنک کو گود میں لے کر گھٹاؤں میں جھولوں
بلند ہو کے بہار و خزاں کے عالم سے
ریاض انجم و مہتاب میں پھلوں پھولوں
مگر اڑان کی قیمت کہاں سے دوں گا میں ؟
بلندیوں سے گروں گا تو کیا کروں گا میں ؟

طیارہ

یہ انسان کی فتح کا ہے منارہ
یہ آدم کی تقدیر کا ہے ستارا
یہ اس کی نفاست، یہ اس کی لطافت
یہ پرواز اس کی کہ ہے ایک آفت
یہ قوت، یہ جودت، یہ چستی، یہ تیزی
یہ تندی، یہ شدت، یہ طوفاں خیزی
پھر اس ساری ہنگامہ زائی کے با وصف

یہ نرمی کا انداز ' یہ لوچ کا وصف
یہ مستی بھرے گیت کی سی روانی
یہ سازوں کے سنگیت کی سی روانی
رسیلی ہواؤں کے مانند بہنا
نشیلی ضیاؤں کے مانند بہنا
ہماری فراست کا شہ کار ہے یہ
جنوں اور حکمت کا شہ کار ہے یہ
عروج ذہانت کا شہ کار ہے یہ

عبارت ہے جس سے ہمارا تمدن
مڑا ہے بلندی کی جانب وہ دھارا
ترقی نے اپنی بھرا ہے طرارہ

فضا میں یہ اڑتا ہوا برق پارہ
یہ نوریں چھلاوہ ' یہ رنگیں شرارہ
یہ فردا کی انسانیت کا سہارا
یہ آئندہ تہذیب کا گاہوارہ

ہمیں خاک کی پستیوں سے اٹھا کر
شقاوت بھری بستیوں سے اٹھا کر
تمدن کی بد مستیوں سے اٹھا کر

ستاروں کی دنیا میں لے جا رہا ہے
بہاروں کی دنیا میں لے جا رہا ہے
جہاں یہ گھٹا ٹوپ اندھیرا نہ ہوگا
تعصب کی ظلمت کا ڈیرا نہ ہوگا
روایات کا کوئی گھیرا نہ ہوگا
یہ ہر بات میں تیرا میرا نہ ہوگا
نہ ہوں گی سیاسی غرض مندیاں یہ
نہ ہوں گی زمیں کی سی حد بندیاں یہ
یہ ہند اور ایران ' چین اور جاپان
یہ اسپین ' بلغاریہ اور سوئستان
فرانس اور ہالینڈ ' روس اور یونان
یہ ڈبے نہ ہوں گے ' یہ خانے نہ ہوں گے

یہ خوں ریزیوں کے بہانے نہ ہوں گے
تغلّب کے خونیں فسانے نہ ہوں گے
یہ منحوس جنگی ترانے نہ ہوں گے
یہ اہل سیاست کی گھاتیں نہ ہوں گی
یہ مکر و دنائت کی باتیں نہ ہوں گی
غلامی کے دن اور راتیں نہ ہوں گی

فضا میں یہ اڑتا ہوا برق پارہ
یہ نوریں چھلاوہ، یہ رنگیں شرارہ
ہے فردا کی انسانیت کا سہارا
ہے آئندہ تہذیب کا گاہوارہ
یہ انسان کی فتح کا ہے منارہ
یہ آدم کی تقدیر کا ہے ستارا

غزلیات

محبت ہے، اذیت ہے، ہجوم یاس و حسرت ہے
جوانی اور اتنی دکھ بھری! کیسی قیامت ہے
کہاں کی آرزوئیں، ولولے کیسے، اُمنگیں کیا
مری کل کائنات اب ایک افسردہ طبیعت ہے
وہ ماضی جو ہے اک مجموعہ اشکوں اور آہوں کا
نہ جانے مجھ کو اُس ماضی سے کیوں اتنی محبت ہے
ترا افسانہ اے افسانہ خواں! رنگیں سہی لیکن
مجھے روداد عشرت سن کے رو دینے کی عادت ہے
ستم دیکھو، ہمیں لطف نظارہ بھی نہیں حاصل
کہ جو آنکھوں کی راحت ہے وہی دل کی اذیت ہے

یادش بخیر عہد محبت کی شاعری
اک آہ تھی کہ گیت کے سانچے میں ڈھل گئی

محبت کرنے والوں کے بہار افروز سینوں میں
رہا کرتی ہے شادابی خزاں کے بھی مہینوں میں
میں آن میں ہوں جو ہو کر آستان دوست سے محروم
لئے پھرتے ہیں سجدوں کی تڑپ اپنی جبینوں میں

زندگی بھر کی اذیت ہے یہ جینا یا رب !
ایک دو دن کی مصیبت ہو تو کوئی سہ لے
اتنے خاموش ہو کیوں اے شب غم کے تارو
کوئی قصہ ہی سناؤ کہ ذرا جی بہلے

مرے حواس پہ اک بیخودی سی طاری ہے
پیام لائے ہیں کس کا نسیم کے جھونکے ؟
حسین یادوں کی شمعیں مجھے جلانے دو
مزار ہیں مرے سینے میں آرزوؤں کے

ابھی تو دل کی وحشت ہی جھلکتی ہے نگاہوں سے
کسی دن خون روئیں گی یہ دل کی رازداں آنکھیں

شباب نام ہے اس جاں نواز لمحے کا جب آدمی کو یہ محسوس ہو جواں ہوں میں

دل کو میں حسن سے تو بہلاؤں اور اگر جان سے چلا جاؤں ؟
تو جہاں اے خیال رہتا ہے کاش میں بھی وہاں پہنچ جاؤں !

خوار ہیں یوں مرے شباب کے دن جیسے جاڑوں کی چاندنی راتیں
دل یہ کہتا ہے گنج راحت ہوں دیکھتا غم نصیب کی باتیں !

شاعری ہو کہ شغل نغمہ و مے مدعا خود کو بھول جانا ہے

رگوں میں دوڑتی ہیں بجلیاں لہو کے عوض
شباب کہتے ہیں جس چیز کو قیامت ہے

کبھی ہم بھی مسلماں تھے مگر نام خدا اب تو
کسی کے عشق میں بے دین و کافر بن کے بیٹھے ہیں

کیسے بدلوں میں اپنی فطرت کو لاگ ہے مجھ سے خود محبت کو

اب کے فصل بہار کیسی رہی پوچھئے پیرہن کے تاروں سے

غم کے صدمے اٹھائے ہیں برسوں جب مسرت کی قدر جانی ہے

کیوں نہ آنکھوں میں اشک بھر آئیں دل کی چوٹ اور اس قدر بھر پور !

شب تار ! تیری خموشی کے قرباں ' بتا آمد آمد ہے کس رشک مہ کی
یہ بزم فلک کیوں سجائی گئی ہے' یہ تاروں کا چھڑکاؤ کیوں ہو رہا ہے ؟

آہ ! مطرب یہ ترا دھیمے سروں میں گانا جیسے دریا شب مہتاب میں آہستہ بہے
''اختر'' اخفائے تمنا کی ہے کوشش بے سود یہ محبت کبھی پردے میں رہی ہے نہ رہے

وہ حقائق میں کیا سکوں پائے عمر بھر جس نے خواب دیکھے ہوں

دشمن زیست اک خدائی ہے حیف ! اپنا کوئی خدا نہ ہوا

کامیابی کے دیکھتا ہوں خواب ! میرے مالک ! مجھے ہوا کیا ہے ؟

یہ بھی ممکن نہیں کہ مر جائیں زندگی آہ ! کتنی ظالم ہے

زندگی کی ہوس ہے پھر مجھ کو   دل میں بھڑکی ہے انتقام کی آگ

مٹ گئے ایک غم عشق میں سارے جھگڑے
درد سمجھے تھے جسے ہم وہ مداوا نکلا

یہی ہے مصلحت اخفائے راز میں ''اختر''   جہاں میں رسم محبت نہ عام ہو جائے

محبت بھرا دل بھی کیا شے ہے یا رب !
کبھی سنگ خارا ، کبھی آبگینہ

میں بہت ہی برا ہوں اہل بزم !   تم کہو تو یہاں سے اٹھ جاؤں
جوش مستی اگر سہارا دے   بزم بادہ کشاں سے اٹھ جاؤں

ہو کے محروم تمنا جو جئے گا یا رب !   اس کا جینا بھی کوئی جینے میں جینا ہوگا

اب یہ عالم ہے کہ اس دکھ بھری حالت پہ مری
کوئی روتا ہے تو ''اختر'' میں ہنسا کرتا ہوں

آلِ رضا رضاؔ

سید آل رضا نام رضا تخلص ۱۸۹۷ء میں قصبہ نیوتنی ضلع آناؤ (اودھ) میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے والد خان بہادر جسٹس سید محمد رضاصاحب ابتداً منصف تھے پھر اودھ کے اضلاع میں انصاف و قانون کے مختلف عہدہ ھائے جلیلہ پر فائض رہے اور آخر میں لکھنؤ چیف کورٹ کے جج ہو گئے تھے ۔

رضا صاحب کا بچپن اپنے والد مرحوم کے ہمراہ مختلف اضلاع میں گزرا ۔ لیکن گھر پر ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۲ء تک سیتا پور اسکول میں پڑھتے رہے ۔ وھاں سے انٹرنس کر کے لکھنؤ چلے آئے اور ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء تک چار سال کیننگ کالج لکھنؤ میں تعلیم پائی اور بی ۔ اے کی ڈگری حاصل کی ۔ اُس کے بعد خانگی اُمور نیز دیگر مصروفیتوں کے سبب سے دو سال بیکار گزرے ۔ ۱۹۱۸ء سے قانون پڑھنا شروع کیا اور ۱۹۲۰ء میں الہ آباد لا اسکول سے ایل ۔ ایل ۔ بی پاس کر کے لکھنؤ میں وکالت شروع کر دی ۔ لیکن ۱۹۲۱ء میں آپ پرتاب گڈھ چلے گئے جہاں ۱۹۲۷ء تک برابر پریکٹس کرتے رہے ۔ ۱۹۲۷ء سے دوبارہ لکھنؤ میں اقامت اختیار کی اور یہاں بھی مشغلہ وکالت جاری رہا ۔ تقسیم ہند کے بعد آپ اپنے ہر دو برادران حقیقی جناب ھاشم رضا و جناب کاظم رضا صاحبان کے ایماء پر لکھنؤ سے کراچی تشریف لے آئے اور اب وھیں مستقل طور پر سکونت پذیر ھیں ۔

جناب رضا کی شاعری کا آغاز پرتاب گڈھ کے دوران قیام میں ھوا ۔ شروع میں کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے لیکن ۱۹۲۲ء سے احباب کے اصرار پر باقاعدہ غزل کہنا شروع کی اور سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی سے بذریعہ خط و کتابت تلمذ حاصل کیا ۔ شاعرانہ حیثیت سے رضا صاحب پرتاب گڈھ ھی میں کافی شہرت کے مالک بن چکے تھے ۔ اس کے بعد جب لکھنؤ واپس آئے تو یہاں بھی شعر و شاعری کی مجلس گرم تھی چنانچہ آپ نے ان محفلوں میں حصہ لینا شروع کیا اور تھوڑے ھی عرصہ میں اپنے ادبی رتبہ کو منوا لیا ۔ اس کے اعتراف میں ''انجمن معین الادب'' نے ' جس کے ممبر جناب صفی اور حضرت ظریف بھی تھے ' رضا صاحب کو نائب صدر کی حیثیت سے انتخاب کیا اور بعد ازاں صدارت کے فرائض بھی تفویض کر دئے ۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ ادبی انجمن ''بہار ادب'' کے نام سے موسوم ھوئی تو اس میں بھی آپ نے سکریٹری کی حیثیت سے کام کیا ۔

جناب رضا بڑے وضع دار انسان ھیں چنانچہ اُن کے کردار کی یہ خصوصیت اُن کی

شاعری میں بھی نمایاں ہے ۔ وہ خالصتاً غزل گو شاعر ہیں ۔ آنکی شاعری کا آغاز اسی صنف لطیف سے ہوا اور آج بھی وہ غزل ہی کہتے ہیں ۔ اس سلسلے میں اُن کے اپنے خیالات پیش کرنا بے محل نہ ہوگا ۔ فرماتے ہیں ''میں زیادہ تر جذباتی شاعری کرتا ہوں جس میں روحانیت کا خاصا حصہ ہوتا ہے لیکن شاعر کی دنیا کو یہیں تک محدود نہیں سمجھتا...... غزل کے اشعار کے متعلق میرا نظریہ یہ ہے کہ محبت کی کوئی کیفیت ایسے الفاظ میں بیان کی جائے جو اُس کیفیت کے ہم آہنگ ہونے کے علاوہ آپس میں بھی ہم آہنگ ہو ۔ کوئی کیفیت سے مطلب نا مناسب کیفیت نہیں ہے ۔ ہر بات کہنے والی نہیں ہوتی اور ہر کہنے والی بات ہر طریقہ سے نہیں کہی جاتی ۔ ایک مرتبہ کی کہی ہوئی بات کو پھر اُسی طرح کہنا اپنا اور دوسروں کا وقت ضایع کرنا ہے ۔ ہر شعر میں کوئی بات تو ہو ۔ موضوع میں تنوع نہ ہو تو اُسلوب بیان ہی میں کوئی خاص رنگ ہو'' اور بلاشبہ اُن کا یہ نظریۂ شاعری اُن کے کلام پر پورا پورا صادق آتا ہے ۔ وہ غزل میں کسی خاص طرز کے موجد یا مبلغ تو نہیں ہیں لیکن اپنے مخصوص اُسلوب بیان کی بدولت پہچانے ضرور جا سکتے ہیں ۔ وہ غزل کو غزل کے نہایت نازک و لطیف حدود میں رکھ کر دلی جذبات کی مصوری کرنے کے عادی ہیں اور اکثر و بیشتر محض تغزل کے شعر کہتے ہیں ۔ اُن کا رنگ سخن خشک فلسفیانہ بلندی سے معرا اور سوقیانہ پستی سے بالکل پاک اور منزہ ہے ۔

رضا صاحب کو ایک تو خود اہل زبان ہونے کا شرف حاصل ہے اس پر جناب آرزو جیسے شیریں بیان اُستاد کی صحیح رہنمائی نے اُن کی زبان و بیان میں اور بھی دلکشی و گھلاوٹ پیدا کر دی ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت رضا اپنی وکالت کی گوناگوں مصروفیات کے باعث شعر و سخن کی طرف پوری توجہ نہیں دے سکے اور ان کا سرمایۂ شاعری ایسا کچھ زیادہ بھی نہیں ۔ بایں ہمہ اُنہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ اپنی ہمواری روانی اور سلاست کے لحاظ سے خوب ہے ۔ ۱۹۲۹ء میں آپ کا ایک مختصر سا مجموعہ کلام ''نوائے رضا'' کے نام سے شایع ہو چکا ہے ۔ جس میں آپ کی غزلیں زمانۂ تصنیف کے لحاظ سے مرتب کی گئی ہیں اور ان کے مطالعہ سے آنکے کلام کی تدریجی ترقی صاف ظاہر ہوتی ہے ۔

جناب رضا لکھنؤ کے دور جدید کے اُن شعرا میں سے ہیں جنہوں نے جلال ، آرزو اور صفی جیسے اساتذۂ فن کی جلائی ہوئی شمع کو روشن رکھا اور جناب سراج لکھنوی اور حضرت قدیر لکھنوی کے ساتھ مل کر لکھنؤ کی بساط شاعری کو رونق بخشی ۔ یہاں جناب اثر لکھنوی کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو اپنے کلام کی پختگی اور اُستادانہ شان کی بدولت آج بھی دلدادگان ادب و شعر سے خراج تحسین وصول کر رہے ہیں ۔ لیکن آپ میں اور رضا صاحب کے کلام میں جو چیز مابہ الامتیاز ہے وہ یہ کہ اثر صاحب کی شاعری صرف غزلگوئی تک ہی محدود نہیں بلکہ آپ نظم و تراجم سے بھی اُردو کے دامن کو مالا مال کر رہے ہیں ۔ بر عکس اس کے جناب رضا کی شاعری کی ابتدا غزل

سے ہوئی اور آج تک وہ اسی صنف کے ساتھ نباہ کر رہے ہیں ۔ عاشقانہ جذبات کو سادہ مگر نکھری ہوئی زبان میں بے تکلفی سے ادا کرنا اُن کا طرۂ امتیاز ہے ۔

انتخاب کلام

انتظار آپ کا پتھرائی ہوئی آنکھوں میں
مہرباں ! یاد یہ مٹتی ہوئی تصویر رہے

یہی اچھا ہے جو اس طرح مٹائے کوئی
آپ بھی پھر مجھے ڈھونڈھے تو نہ پائے کوئی
کوندتی برق نہ دیتی ہو جہاں فرصتِ دید
تاب کیا ہے ؟ جو وہاں آنکھ اٹھائے کوئی
بندشیں عشق میں دنیا سے نرالی دیکھیں
دل تڑپ جائے مگر لب نہ ہلائے کوئی

مرحبا ! خوب کیا رنج سے آزاد مجھے
یوں مٹایا ہے کہ مٹنا بھی نہیں یاد مجھے
تم ، وہ تم ھی نہ رہو ، بھول سکوں گر تم کو
میں ، وہ میں ھی نہ رہوں ، تم جو کرو یاد مجھے

عشق کی شان ، جنوں ، حسن کی خو ناز و غرور
آپ مجبور ھیں ، بندہ بھی خطا وار نہیں

وہ کرے کیا ؟ کچھ نہ آئے جسکو منت کے سوا
پھر یونہی منت کرینگے ہم ، خفا ہو جائیے
اپنی ھی آنکھوں میں جب کھٹکے رضا ! اپنا وجود
آپ ھی ، اپنی گناھوں کی سزا ہو جائیے

مایوس خود بخود دل آمید وار ہے اس گل میں بو خزاں کی ہے رنگ بہار ہے
طے ہو چکیں شکست تمنا کی منزلیں اب اسکے بعد گریۂ بے اختیار ہے
اُس بے وفا سے کر کے وفا مر مٹا "رضا" اک قصۂ طویل کا یہ اختصار ہے

نیرنگ بزم دھر' طلسم فریب ہے لیکن میں کیا کروں نگہ اعتبار کو
وہ بھی کوئی سکوں ہے جو بیچارگی سے ہو دیکھا کیا میں گردش لیل و نہار کو

چشم حسرت کو خدا رکھے' نہ پوچھے ساقی
ہم بھی دو جام بھرے بیٹھے ھیں میخانے میں
زندگی دیکھ کے ھر دور سے تھراتی ہے
اپنی تصویر جھلکتے ہوئے پیمانے میں

فریاد کر رھی ہے یہ ترسی ہوئی نگاہ دیکھے ہوئے کسی کو بہت دن گزر گئے

حیرت آئینہ ہے پر تو نیرنگ جہاں ھر ادا اک نئی تصویر دکھا جاتی ہے

تھپیڑوں کا موجوں ھی کے آسرا ہے چل اے میری کشتی! خدا' نا خدا ہے

کسی کو فارغ اندوہ پاؤں تو پوچھوں کہ اور بھی کوئی صورت ہے زندگانی کی

اُن کے ستم بھی کہہ نہیں سکتے کسی سے ہم
گھٹ گھٹ کے مر رہے ھیں عجب بے بسی سے ہم
یادش بخیر' دل کا خیال آ کے رہ گیا
اس بے دلی میں جیتے ھیں کس بے حسی سے ہم
جو دل میں تھا وہ ملتا ہے ساتھ اپنے خاک میں
تم دور' اور کہہ نہ سکے کچھ کسی سے ہم

رت اور فضا بدلی' زنداں کی ہوا بدلی بیڑی کی صدا بدلی' دیوانہ پریشاں ہے

آگاہئی رموز ہے خود پردہ دار حسن میں کچھ سمجھ چلا تھا کہ دیوانہ ہوگیا
کیوں ہنسکے کہدیا ''مرے در کا فقیر ہے'' میرا مزاج اور بھی شاہانہ ہو گیا

جو مجھ پہ ہنستے ہیں ہنس لیں جو روتے ہیں رو لیں
کسی کی بات محبت میں ناگوار نہیں

ہائے کیا وقت تھا ، کیا کیف تھا ، کیا عالم تھا
جب تیرے لب پہ میرا پہلے پہل نام آیا
ہم گئے جان سے اور ضد نہ جوانی کی گئی
کھا لیا تیر کلیجہ پہ ، تو آرام آیا

قسمت میں خوشی جتنی تھی ہوئی اور غم بھی ہے جتنا ، ہونا ہے
گھر پھونک تماشا دیکھ چکے اب جنگل جنگل رونا ہے
ہستی کے بھیانک نظارے ، ساتھ اپنے چلے ہیں دنیا سے
یہ خواب پریشاں اور ہم کو ، تا صبح قیامت سونا ہے
دم ہے کہ ہے اکھڑا اکھڑا سا اور وہ بھی نہیں آ چکتے ہیں
قسمت میں ہو مرنا یا جینا ، اب ہو بھی چکے جو ہونا ہے
دل ہی تو ہے آخر بھر آیا ، تم چیں بہ جبیں کیوں ہوتے ہو
ہم تم کو بھلا کچھ کہتے ہیں ، تقدیر کا اپنی رونا ہے
غم کاہے کا یارو ماتم کیا ، بدلو گے نظام عالم کیا
مرنا تھا رضا کو مرتا ہے ، یہ کاہے کا رونا دھونا ہے

زندگی ختم جہاں کی ، وہ جگہ پھر نہ ملی
تیرے کوچے سے اٹھائے لئے جاتے ہیں مجھے

نگاہ لطف کا تیری بہت ممنون ہوں لیکن
مروت کے علاوہ اور بھی اک شے محبت ہے

وہ زمانہ جب اسی دل پر تھی چشم التفات
خواب سا ہے ایک لیکن بارہا دیکھا ہوا

بھلا کے سویرا کرتے ھیں اس دلکو انہیں کی باتوں میں
دل جلتا ھے اپنا جنکی طرح برسات کی بھیگی راتوں میں

دم لے ، مرے ٹوٹے دل ، دم لے ، گھبرا کے بھلا کیا پائیگا ؟
خیر ! اُس کو بھلائیں گے دل سے ، جتنا کہ بھلایا جائیگا
در سے تو اُٹھا ھی تم نے دیا ، تڑپوں بھی نہ میں یہ ظلم ھے کیا ؟
ٹوٹا ھے سہارا مدت کا ، صبر آتے آتے آئے گا
کہتے تھے رضا ! کمبخت رضا !! نا اھل وفا سے دل نہ لگا
اب کاھے کا رونا پچھتانا ؟ جو جیسا کرے گا پائے گا

نہ تھا آسان کچھ دم توڑنا کانٹوں کی نوکوں پر
بڑی مشکل سے نکلے حوصلے حسرت بھرے دل کے
زباں صرف دعا ، سجدے میں سر ، اور خاک پر سجدہ
ھوئے ھونگے کم اتنے خیر مقدم تیغ قاتل کے

کرم نما ھے ستم اور ستم نما ھے کرم وفا کی داد ملی ھے کس اھتمام کے ساتھ

پھر اُس کی یاد پیام اُمید لائی ھے سلام ھجر نصیباں بکوئے جانانہ
سمجھنے ؟ دیتی نہیں ابتدا محبت کی زمانہ ختم کرے گا کہاں یہ افسانہ

چلے تھے ایک نظر تیری بزم دیکھ آئیں یہاں جو آئے ، تو بے اختیار بیٹھ گئے

گئے تم ایک ، مگر یوں کہہ کر گئے تنہا تمہارے ساتھ گئیں خوبیاں مقدّر کی

آئے دن کا رونا جائے ، اے دل آن کو بھول ھی جا
زھر دوا ھے تیرے حق میں جینا جب مشکل ھو جائے
حسن کی گرمی ، نئی جوانی ، پہلی محبت ، نازک دل
جلتی تپتی ریت پہ گر کر ، جیسے تازہ کلی کُمھلائے

ہاں ، اور جس طرح بھی ہو تڑپائیے مجھے ۔ کچھ ایسا کیجئے کہ نہ یاد آئیے مجھے

دفعتہً جا کے پھر نہ پلٹی نگاہ ۔ کشش حسن ! اے معاذ اللہ !
پہلا آنسو گرا جو اُلفت میں ۔ درد اُٹھ کر پکارا ، ''بسم اللہ''

مٹایا ہے ہمیں نے اسکو ورنہ کیا سے کیا ہوتی
ہماری داستاں جتنا گلہ ہم سے کرے کم ہے

داد وفا کا وقت بھی اک ہے ، اب نہ سہی کچھ بعد سہی
دل سے بھلانے والے تجھے ہم سب سے سوا یاد آئیں گے

اللہ نظر کوئی ٹھکانہ نہیں آتا ۔ آنے کو چلے آتے ہیں جانا نہیں آتا
کہدوں تو مزے پر یہ فسانہ نہیں آتا ۔ ٹھہروں تو پلٹ کر یہ زمانہ نہیں آتا
یوں روز ہوا کرتے تھے بے ساختہ چکر ۔ اب آج بلایا ہے تو جانا نہیں آتا
تدبیر سی تدبیر دعاؤں سی دعائیں ۔ سب آتا ہے تقدیر بنانا نہیں آتا

خیال حسن میں یوں زندگی تمام ہوئی
حسین صبح ہوئی اور حسین شام ہوئی
وقار عشق بس اب سر جھکادے قدموں پر
اُدھر سے تیرے لئے سبقت سلام ہوئی
ہر ایک اپنی جگہ خوش ، ہر اک یہی سمجھا
نگاہ خاص بہ طرز نگاہ عام ہوئی

اپنا لیا اسے چمن روزگار نے ۔ میرے لئے جو پھول کھلایا بہار نے
ہر دم نئی ادا سے وہ آتے نظر پڑے ۔ آنکھوں سے کتنے کام لئے انتظار نے
رچ رچ کے کیسے کیسے کھلاتی تھی روزپھول ۔ جانے لگی تو مڑ کے نہ دیکھا بہار نے

واسطہ کوئی نہ رکھ کر بھی ستم ڈھاتے ہو تم
دل تڑپ اُٹھتا ہے ، اب کاہے کو یاد آتے ہو تم

لاتے ہو کیف طرب ' دیتے ہو پیغام حیات
کیا بتاؤں ساتھ لیکر کیا چلے جاتے ہو تم
بھیج کر خوشبو ہواؤں میں بہ انداز پیام
کیا یہ سچ ہے آج یوں میری طرف آتے ہو تم
تم سے ہے آراستہ جذبات کا تازہ چمن
جیسی رت ہوتی ہے ویسا پھول بن جاتے ہو تم

دل کا ٹکڑا کوئی ہر لفظ میں شامل ہو جائے
ذکر جسکا ہے ذرا آسکے بھی قابل ہو جائے
انتظار اور جدائی کا مسلسل یہ پیام
جان بھی جاتی ہوئی رات میں شامل ہو جائے
آپکے ہار میں یہ پھول جو ہے دل کے قریب
اس سے کہئے کہ جب اترے تو مرا دل ہو جائے

حسن کی فطرت میں دل آزاریاں — اس پہ ظالم نت نئی تیاریاں
متصل طفلی سے آغاز شباب — خواب کے آغوش میں بیداریاں
سوچ کر ان کی گلی میں جائے کون — بے ارادہ ہوتی ہیں تیاریاں
درد دل اور جان لیوا پرسشیں — ایک بیماری کی سو بیماریاں
اور دیوانے کو دیوانہ بناؤ ! — اللہ اللہ اتنی خاطر داریاں
بندھ رہا ہے اے "رضا" رخت سفر
ہو رہی ہیں کوچ کی تیاریاں

اللہ رے آغاز محبت کی فضائیں
باتوں میں ' نگاہوں میں ' خیالوں میں ادائیں
کیا وعدۂ پیہم پہ رضا آس لگائیں
آج آئیں کہ کل آئیں ' وہ آئیں کہ نہ آئیں

تمہارے ہی رحم و کرم کے سہارے — نہ معلوم مرمر کے کیوں کر جئے ہیں
کہاں پائے نازک کہاں راہ الفت — مرے ساتھ دو اک قدم ہو لئے ہیں

ھنساتا ہے سب کو ہمارا فسانہ ہمیں کہتے کہتے کبھی رو لئے ہیں
بھلے ہیں برے ہیں کسی سے غرض کیا ''رضا'' وہ بہر حال میرے لئے ہیں

ہمیں نے اُن کی طرف سے منا لیا دل کو
وہ کرتے عذر ' تو یہ اور بھی گراں ہوتا
سمجھ تو یہ کہ نہ سمجھے خود اپنا رنگ جنوں
مزاج یہ کہ زمانہ مزاج داں ہوتا
بھری بہار کے دن ہیں خیال آ ہی گیا
اُجڑ نہ جاتا ' تو پھولوں میں آشیاں ہوتا
دماغ عرش پہ ہے تیرے در کی ٹھوکر سے
نصیب ہوتا جو سجدہ ' تو میں کہاں ہوتا

جنوں بن کے محبت کا اعتبار اُٹھا جو ہنس رہے تھے وہی لوگ معتبر ٹھہرے
بغیر اُن کے ادھر کیا ہے زندگی کیلئے زمانہ بھر کے سہارے تو سب اُدھر ٹھہرے
چراغ کتنے نڈر تھے شب جوانی کے ہوا کے رخ پہ جلے اور رات بھر ٹھہرے

فیض احمد فیض

فیض احمد نام فیض تخلص ۱۹۱۲ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے - ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی اور اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی اور عربی میں ایم - اے کیا - گورنمنٹ کالج لاہور کے دوران قیام میں ہی فیض کو ادبی ذوق پورا کرنے کا موقع ملا - یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ''زندہ دلان لاہور'' کا حلقہ بقول شخصے زندہ تھا اور تمام ادب دوست حلقوں کی نگاہیں اسی ایک حلقے کی طرف اٹھتی تھیں - چونکہ اس حلقے کے اکثر اراکین کالجوں سے متعلق تھے اس لئے نئی پود ان سے اور بھی مانوس و متاثر تھی - چنانچہ فیض جب گورنمنٹ کالج میں آئے تو ان دنوں بخاری ' تاثیر ' مجید ملک ' سالک وغیرہ لاہور کی ادبی محفلوں کو گرما رہے تھے - فیض تو ویسے بھی کالج میں پطرس کے شاگرد تھے - اس لئے جب زندہ دلان لاہور نے مشہور ادبی سالنامہ ''کارواں'' شائع کیا تو نوجوانوں میں فیض کی نگارشات کو خاص اہمیت حاصل تھی -

۱۹۳۶ء میں فیض ایم - اے - او کالج امرتسر میں انگریزی کے لکچرر مقرر ہوگئے اس زمانے میں ایم - اے - او کالج میں اساتذہ کا ایسا گروہ جمع ہو گیا تھا جو نہ صرف ادب سے گہری دلچسپی رکھتا تھا بلکہ سیاست میں بھی انقلابی رجحانات کے حامل تھا - کالج کے پرنسپل صاحب زادہ محمود الظفر انگلستان کے ان فارغ التحصیل نوجوانوں میں سے تھے جنہوں نے وہاں ''ترقی پسند مصنفین'' کی بنیاد رکھی - ان بنیاد رکھنے والوں میں سجاد ظہیر ' ملک راج نند' محمود الظفر' ڈاکٹر اشرف ' زیڈ - اے احمد اور تاثیر مرحوم تھے - چنانچہ محمود الظفر اور ان کی بیوی رشیدہ جہاں نے بھی فیض کو خاصا متاثر کیا - چنانچہ فیض کی شاعری میں ترقی پسند رجحانات اور سماجی دکھوں کا بھرپور اظہار ' بڑی حد تک انہیں لوگوں کی صحبت ہی کا نتیجہ ہے - جب ۱۹۳۶ء میں ہندوستان میں ترقی پسند تحریک نے ایک منظم صورت اختیار کی تو فیض اس میں پیش پیش تھے -

۱۹۳۶ء کے بعد تو ہندوستان کے درمیانی طبقے میں انقلابی رجحانات اور ترقی پسند نظریات اس تیزی سے پھیلے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین ایک زندہ حقیقت بن گئی چنانچہ فیض شاعری کے افق پر پوری آب و تاب سے چمکا اور اس نے غم جاناں اور

غم دوراں کی آمیزش سے ایسی شاعری کی جس سے ساری نئی پود متاثر ہوئی - ۱۹۳۹ء کے شروع میں جب فیض کا پہلا مجموعہ کلام ''نقش فریادی'' شائع ہوا تو واقعی ہندوستان کی ادبی فضا میں ایک تہلکہ مچ گیا - اسی دوران میں فیض نے کچھ عرصہ کے لئے ''ادب لطیف'' کی ترتیب کی ذمہ داری سنبھال لی اور انھیں دنوں اُنھوں نے بعض اہم تنقیدی مضامین بھی لکھے -

۱۹۴۰ء میں فیض ہیلی کالج آف کامرس لاھور میں لکچرر ہو گئے اور تقریباً دو سال تک رہے - یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری جنگ عظیم زوروں پر تھی اور فاشزم کے خلاف دنیا بھر کی قومیں متحد ہو رہی تھیں چنانچہ فیض بھی فوج میں ملازم ہو گئے - ۱۹۴۶ء کے آخر تک وہ فوج میں رہے اور ۱۹۴۷ء کے شروع میں جب روزنامہ ''پاکستان ٹائمز'' نکلا تو فیض اس میں آ گئے - اس کے بعد جب ''امروز'' نکلنا شروع ہوا تو اس کے مدیر مسئول بھی فیض احمد فیض ھی مقرر ہوئے اور اس طرح ایک نامور شاعر نے چند ھی دنوں میں دنیائے صحافت سے اپنا لوھا منوا لیا -

پاکستان بننے کے بعد فیض نے مزدور تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کیا وہ ٹریڈ یونین فیڈریشن کے نائب صدر مقرر ہوئے اور مزدوروں کے نمایندے کی حیثیت سے آئی - ایل - او کے جنیوا اجلاس میں بھی شریک ہوئے - ۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو آپ پاکستان سیفٹی آرڈیننس کے تحت گرفتار کر لئے گئے اور اُن پر راولپنڈی سازش کے سلسلے میں مقدمہ چلا جس میں انھیں سزا ہو گئی - اُن کا دوسرا مجموعہ کلام ''دست صبا'' حیدرآباد جیل ھی میں مرتب ہوا - اور جیل میں ھی انھوں نے اپنے تنقیدی مضامین مرتب کئے جو عنقریب ''میزان'' کے نام سے شائع ہونگے -

جہاں تک فیض کی شاعری کا تعلق ھے اُن کا شعری سرمایہ بہت تھوڑا ھے لیکن ساتھ ھی ھمیں یہ کہنے میں بھی کوئی تامل نہیں کہ یہ مختصر سا کلام اُن کے بہت سے ھمعصروں کے ضخیم شعری سرمایہ کے مقابلے میں اپنی گراں مائگی کے اعتبار سے بہت وزنی ھے -

فیض نے اپنی ابتدا غزل گو کی حیثیت سے کی لیکن آھستہ آھستہ منظومات کی طرف بھی رجحان پیدا ہوا اور آج وہ ان دونوں اصناف سخن پر پوری قدرت رکھتے ھیں - بحیثیت مجموعی اُن کے کلام کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ھے - پہلے دور کو ھم ''رومانی'' کہہ سکتے ھیں - اس دور کی غزلوں اور نظموں میں فیض نے ایک تخئیلی دنیا بسائی ھے جس میں وہ غم دوراں کی تلخ کامیوں سے فرار حاصل کرکے پناہ لینا چاھتا ھے - اور ایک خیالی محبوبہ کا سہارا لیتا ھے - لیکن اس روائتی شاعری میں بھی فیض کی انفرادیت برقرار رھتی ھے - اُس کے یہاں ایک مخصوص تازگی و شگفتگی بھی ھے اور حسن کا صحیح و واضح احساس بھی - حسن کا یہ احساس فیض کے یہاں اس لئے پیدا ہوتا ھے کہ وہ کسی جنسی اُلجھن کا شکار نہیں - اُس کی اس دور کی نظموں و غزلوں میں فکر کی گہرائی یا شعور کی بیداری زیادہ نہیں لیکن حسن کے لطیف و نازک احساسات تک رسائی ضرور ھے -

فیض کی شاعری کا دوسرا دور وہ ھے جس میں وہ زندگی کا کافی مشاہدہ و تجربہ کئے ہوئے معلوم ہوتا ھے - اس دور میں ھم ''نقش فریادی'' کی آخری نظموں سے لے کر ''دست صبا'' تک کے کلام کو شامل کر سکتے ھیں اس دور کے کلام میں وہ پچھلی

فراریت ختم ہو جاتی ہے اور عشق کی ایک منزل کا سراغ ملنا شروع ہوتا ہے۔ موضوعات میں اب بھی نمایاں وسعت و ہمہ گیری تو پیدا نہیں ہوتی لیکن احساس کی شدت، جذبات کا خلوص اور سب سے زیادہ عمل کی شدید خواہش نے ان موضوعات میں جان ضرور ڈال دی ہے۔ اب کلام میں وہ سادگی ہلکا پھلکا پن اور جذباتیت، فکری گہرائی اور شعور کی پختگی میں تبدیل ہو کر ایک نئے عزم و جولانی کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے۔ اس میں ایک نئی زندگی کا احساس اور اس نئی زندگی کو سنوارنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس دور کی غزلوں اور نظموں میں قنوطیت کے بجائے رجائیت کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ فیض انتہائی شدید جذبات کی ترجمانی میں بھی اپنے لہجے میں کوئی تیزی یا جھنجھلاہٹ نہیں پیدا ہونے دیتا بلکہ اپنے مخصوص معتدل اور متوازن انداز کی بدولت بیان میں ایک نرمی اور لہجے میں دباؤ پن پیدا کر دیتا ہے۔ فیض کی یہ خصوصیت کم از کم عصر حاضر کے کسی نوجوان شاعر میں نہیں پائی جاتی اور اس معاملہ میں وہ بالکل منفرد ہے۔

فیض نے مروجہ اصناف سخن اور اسلوب بیان میں محض جزوی رد و بدل کر کے اسے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اور فیض کی اُفتاد طبع ہیئت کے میدان میں قافیئے اور بحر کی پابندی کے ساتھ ہی مکمل اظہار پر قادر ہے۔ انتخاب الفاظ میں اس نے مروجہ الفاظ و تراکیب کو نئی جھلک عطا کی۔ چنانچہ قفس، صیاد، نور، ساقی، گلشن، ناصح، محاسب وغیرہ جیسے الفاظ میں ہی اس نے سیاست و رومانیت اور عشق و انقلاب کا امتزاج پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فیض کا کلام اکثر جدید شعرا کے کلام کی طرح بعید از فہم و نا مانوس نہیں ہے بلکہ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ فیض کے اس احترام روایت نے اس کی شاعری میں اور چار چاند لگا دئے ہیں۔

غرض صوری و معنوی دونوں لحاظ سے فیض کی شاعری اُن کی ابتدائی شاعری کے مقابلے میں زیادہ بہتر و اہم ہے۔ اب اُن کی شاعری میں حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ ایک قوت عمل کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ جو زندگی سے قربت پر دال ہے۔ فیض کے کلام کی یہی خصوصیات ہیں جن کی بدولت آج اُن کا شمار ہند و پاکستان کے معروف شعرا میں ہونے لگا ہے۔

انتخاب کلام

تغزل

راز اُلفت چھپا کے دیکھ لیا — دل بہت کچھ جلا کے دیکھ لیا
اور کیا دیکھنے کو باقی ہے — آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا

وہ مرے ہو کے بھی مرے نہ ہوئے　　　اُن کو اپنا بنا کے دیکھ لیا
"فیض" تکمیل غم بھی ہو نہ سکی
عشق کو آزما کے دیکھ لیا

تیری رنجش کی انتہا معلوم　　　حسرتوں کا مری شمار نہیں

تیری چشم الم نواز کی خیر　　　دل میں کوئی گلا نہیں باقی

ساری دنیا سے دور ہو جائے　　　جو ذرا تیرے پاس ہو بیٹھے
نہ گئی تیری بے رخی نہ گئی　　　ہم تری آرزو بھی کھو بیٹھے

فریب آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آواز پا سمجھے

گراں ہے دل پہ غم روزگار کا موسم
ہے آزمائش حسن نگار کا موسم
حدیث بادہ و ساقی نہیں تو کس مصرف
خرام ابرِ سرِ کوہسار کا موسم
یہ دل کے داغ تو دکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجران یار کا موسم

جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے
ہوئی ہے حضرت ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سر کوئے یار گزری ہے
وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے
چمن پہ غارت گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں
وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق ولب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں
در قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو ''فیض'' دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

صبا نے پھر در زنداں پہ آ کے دی دستک
سحر قریب ہے، دل سے کہو نہ گھبرائے

دوستو اس چشم و لب کی کچھ کہو جسکے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے نہ میخانے کا نام
پھرنظرمیں‌پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصوّر نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

ہر رگ خوں میں پھر چراغاں ہو
سامنے پھر وہ بے نقاب آئے

تیری صورت جو دلنشیں کی ہے
آشنا شکل ہر حسیں کی ہے
حسن سے دل لگا کے ہستی کی
ہر گھڑی ہم نے آتشیں کی ہے
صبح گل ہو کہ شام بے خانہ
مدح اس روئے نازنیں کی ہے
ذکر دوزخ بیان حور و قصور
بات گویا یہیں کہیں کی ہے

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے
ویراں ہے میکدہ، خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے
اک فرصت گناہ ملی، وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے
دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

عجزِ اہل ستم کی بات کرو
عشق کے دم قدم کی بات کرو

بزم اہل طرب کو شرماؤ
بزم اصحابِ غم کی بات کرو

بام ثروت کے خوش نشینوں سے
عظمت چشم نم کی بات کرو

ہے وہی بات یوں بھی اور یوں بھی
تم ستم یا کرم کی بات کرو

خیر ہیں اہل دہر جیسے ہیں
آپ اہلِ حرم کی بات کرو

ہجر کی شب تو کٹ ہی جائیگی
روز وصل صنم کی بات کرو

جان جائینگے جاننے والے
فیض، فرہاد و جم کی بات کرو

دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں

ایک اک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

رقص مے تیز کرو، ساز کی لے تیز کرو
سوئے میخانہ سفیرانِ حرم آتے ہیں

کچھ ہمیں کو نہیں احسان اٹھانے کا دماغ
وہ تو جب آتے ہیں، مائل بہ کرم آتے ہیں

اور کچھ دیر نہ گزرے شب فرقت سے کہو
دل بھی کم دکھتا ہے، وہ یاد بھی کم آتے ہیں

اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے
جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں ٹھہری ہے

آج تک شیخ کے اکرام میں جو شے تھی حرام
اب وہی دشمن دیں، راحت جاں ٹھہری ہے

ہے خبر گرم کہ پھرتا ہے گریزاں ناصح
گفتگو آج سر کوئے بتاں ٹھہری ہے

ہے وہی عارض لیلیٰ، وہی شیریں کا دہن
نگہ شوق گھڑی بھر کو جہاں ٹھہری ہے

وصل کی شب تھی تو کس درجہ سبک گزری تھی
ہجر کی شب ہے تو کیا سخت گراں ٹھہری ہے

اک دفعہ بکھری تو ہاتھ آئی ہے کب موج شمیم
دل سے نکلی ہے تو کب لب پہ فغاں ٹھہری ہے

دست صیاد بھی عاجز، ہے کف گلچیں بھی
بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

آتے آتے یوں ہی دم بھر کو رکی ہوگی بہار
جاتے جاتے یونہی پل بھر کو خزاں ٹھہری ہے

ہم نے جو طرز فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
''فیض'' گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری ہے

منظومات

تنہائی

پھر کوئی یاد آیا دل زار! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئیگا!

''مجھ سے اگلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ''

مجھ سے اگلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
ترا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے؟
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟

تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہیں ہر کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوّروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

دو عشق

(۱)

تازہ ہیں ابھی یاد میں اے ساقیٔ گلفام
وہ عکس رخ یار سے مہکے ہوئے ایّام
وہ پھول سی کھلتی ہوئی دیدار کی ساعت
وہ دل سا دھڑکتا ہوا اُمید کا ہنگام
اُمید کہ لو جاگا غم دل کا نصیبہ
لو شوق کی ترسی ہوئی شب ہو گئی آخر
لو ڈوب گئے درد کے بے خواب ستارے
اب چمکے گا بے صبر نگاہوں کا مقدّر
اس بام سے نکلے گا ترے حسن کا خورشید
اُس کنج سے پھوٹے گی کرن رنگ حنا کی
اس در سے بہے گا تری رفتار کا سیماب
اُس راہ پہ پھوٹے گی شفق تیری قبا کی

پھر دیکھے ہیں وہ ہجر کے تپتے ہوئے دن بھی
جب فکر دل و جاں میں فغاں بھول گئی ہے
ہر شب وہ سیہ بوجھ کہ دل بیٹھ گیا ہے
ہر صبح کی لَو تیر سی سینے میں لگی ہے

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دل زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دست صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردن مہتاب میں باہیں

(۲)

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں
ڈھونڈی ہے یونہی شوق سے آسائش منزل
رخسار کے غم میں کبھی کاکل کی شکن میں

اس جان جہاں کو بھی یونہی قلب و نظر نے
ہنس ہنس کے صدا دی کبھی رو رو کے پکارا
پورے کئے سب حرف تمنا کے تقاضے
ہر درد کو اُجیالا ، ہر اک غم کو سنوارا

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں کوئی کبھی آواز جرس کی
خیریت جاں ، راحت تن ، صحت داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہل ہوس کی

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری
تنہا پس زنداں کبھی رسوا سر بازار
گرجے ہیں بہت شیخ سر گوشۂ منبر
کڑکے ہیں بہت اہل حکم بر سر دربار

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوک دشنام
چھوڑی نہیں اپنوں نے کوئی طرز ملامت
اس عشق ، نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغ ندامت

موضوع سخن

گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام
ڈھل کے نکلیگی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور ـــ مشتاق نگاہوں کی سنی جائے گی
اور ـــ اُن ہاتھوں سےمس ہونگے یہ ترسے ہوئے ہاتھ
اُن کا آنچل ہے ، کہ رخسار کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
جانے اُس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں ؟

آج پھر حسن دل آرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

اپنے افکار کی ، اشعار کی دنیا ہے یہی
جان مضموں ہے یہی ، شاھد معنی ہے یہی

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے ؟
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی، اجداد پہ کیا گزری ہے ؟

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے ؟
یہ حسیں کھیت ، پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لئے ان میں فقط بھوک اگا کرتی ہے ؟

یہ ہر اک سمت پراسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
یہ ہر اک گام پہ اُن خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ
یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اُس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اُس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط !
آپ ہی کہئے کہیں ایسے بھی افسوں ہونگے
اپنا موضوع سخن ان کے سوا اور نہیں !
طبع شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں !

عبدالحمید عدم

سید عبدالحمید نام عدم تخلص جون ۱۹۰۹ء میں قصبہ ''تلونڈی موسیٰ خاں'' ضلع گجرانوالہ میں پیدا ہوئے ۔ یہ قصبہ گجرانوالہ سے چار کوس کے فاصلہ پر آباد اور عدم صاحب کے آبا و اجداد کا وطن مالوف ہے ۔ عدم صاحب کے اکثر مورث اعلیٰ محکمۂ فوج سے منسلک رہے چنانچہ آن کے دادا سید مہتاب شاہ بھی فوج میں صوبیدار تھے ۔ لیکن آن کے والد نے فوج کی ملازمت نا پسند کرتے ہوئے لاہور آ کر مستقل سکونت اختیار کر لی ۔ بنا بریں حضرت عدم کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت لاہور ہی میں ہوئی ۔ ۱۹۲۶ء میں آن کے والد ماجد کا انتقال ہوا ۔ یہ زمانہ عدم کے لئے بڑی پریشانیوں کا تھا ایک طرف تو سولہ سترہ برس کے کم عمر طالب علم پر گھر کی تمام ذمہ داریوں کا بار آ پڑا دوسری طرف اقتصادی مشکلات نے آن گھیرا ۔ اس کشمکش کے عالم میں عدم نے اپنے گاؤں کی جائیداد کو فروخت کر کے تعلیمی نیز دیگر ضروری اخراجات کی کفالت کی ۔

شعر و شاعری سے دلچسپی اگرچہ زمانہ طالب علمی میں بھی تھی لیکن عدم کی شعر گوئی کی ابتدا انٹرنس پاس کرنے کے بعد یعنی ۱۹۲۷ء سے ہوتی ہے ۔ اور اس معاملے میں آنھوں نے اپنے فطری وجدان و ذوق سلیم کی رہنمائی کو غنیمت جانا ہے ۔ آستادی شاگردی کے جھگڑے میں وہ نہ پڑے ہیں اور نہ ہی اس کے قائل ۔ ۱۹۲۷ء میں ہی عدم کی شادی ہو گئی اور متاہل زندگی کی روز افزوں ضرورت و مصروفیات نے آنھیں تعلیم کو خیر باد کہہ کر ملازمت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء میں آپ آڈیٹر کی حیثیت سے ملٹری اکاؤنٹس کے دفتر میں ملازم ہو گئے اور راولپنڈی میں سکونت اختیار کر لی ۔ آپ آج بھی اس شعبہ سے منسلک ہیں ۔

عدم پاکستان کے چند چوٹی کے غزل گو شعرا میں سے ہیں ۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک ایسا شخص جو دن رات حسابات کی جانچ پڑتال کرتا رہتا ہے وہ تغزل کا ایسا ستھرا اور نکھرا ہوا مذاق کیسے رکھتا ہے ۔ بات در اصل یہ ہے کہ عدم ایک فطری شاعر ہیں اور شعریت سچ مچ آن کی رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے ۔ اور اب تو جس منزل سے عدم گزر رہے ہیں اس میں آن کا احساس جمال آنھیں حسن رہگزر سے بھی کیف اندوز ہونے میں مانع نہیں آتا ۔

آنکھوں میں اشارے ہیں
ہونٹوں میں شرارے ہیں
زلفوں میں ستارے ہیں
لاہور کی گلیوں میں

عدم نے یوں تو نظم ، غزل ، گیت و قطعہ وغیرہ بہت سی اصناف پر طبع آزمائی کی ہے بالخصوص شروع میں اُنھوں نے نظمیں زیادہ کہیں اور اُن کی نظمیں بڑی جان دار ہیں ۔ لیکن عدم کا خاص سرمایۂ کمال اُن کا تغزل ہے ۔ اور یہ ہونا بھی چاہئے کیونکہ جہاں حسن کی بے پناہ پرستاری اور عشق کی شوریدہ سری جمع ہو جائیں وہاں تغزل کا جنم لینا لازمی ہے ۔ عدم نے غنائیت و تغزل کی لے وہاں سے پکڑی ہے جہاں اقبال کے بعد چند جدت پسند شاعروں نے اُسے چھوڑا تھا ۔ اور اُس میں کچھ نئی باتیں پیدا کی ہیں ۔ عدم خود بھی ایک رند مشرب انسان ہیں چنانچہ اُن کی رندی و سر مستی نے اُن سے خمریات خوب خوب کہلوائی ہیں ۔ اُن کے تغزل کے اس رنگ کو دیکھ کر یادش بخیر ریاض خیر آبادی مرحوم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ۔ اور یہی رندی و سرمستی وہ خصوصیت ہے جو عدم کے جملہ کلام پر حاوی ہے ۔ عدم نے اردو شاعری کی روایت سے حاصل شدہ ماضی کے سرمایہ کو اور بھی جلا دے کر پیش کیا ہے اور اُس میں اپنے سوز و گداز ، شعریت ، شوخی ، بذلہ سنجی ، طنز اور کیف و سرور سے اور بھی چار چاند لگا دئے ہیں ۔

سر زمین پنجاب میں اختر شیرانی کے بعد صحیح معنوں میں اگر کسی کو رومانی شاعر کہا جا سکتا تو وہ عدم ہی ہیں ۔ اُن کی طبیعت میں ایک صحت مند رومانیت کا احساس ملتا ہے ۔ اسی لئے وہ حسن کی ہر ادا میں ایک عجیب رنگینی اور بانکپن تلاش کر لیتے ہیں ۔ اور یہی صحت مند رومانیت عدم و اختر شیرانی میں مابہ‌الامتیاز چیز ہے ۔ اختر مرحوم نے یاد سلمیٰ میں جوانی تو گنوائی تھی لیکن ساتھ ہی شاعری کو بھی اک روگ لگا لیا تھا اور اُن کی شاعری میں کوئی چونکا دینے والی بات باقی نہیں رہ گئی تھی ۔ اس کے برعکس عدم کے یہاں رومانیت و پناہ گزینی تو ہے مگر اُن کے رومان میں ایک بشاشت و شادابی ہے ۔ جو اُنہیں ہر دم جوان و پیہم دواں رکھتی ہے ۔ جو یقیناً ایک اچھی علامت ہے ۔

عدم ایک ہشاش بشاش اور بڑے شگفتہ مزاج انسان ہیں ۔ اور اُن کی زندگی یاران بذلہ سنج کی محفل میں لطیفوں ، چٹکلوں اور قہقہوں کی زندگی ہے ۔ بنا بریں اُن کی شاعری میں ہمیں کسی مرحلہ پر بھی کوئی گھٹن محسوس نہیں ہوتی ۔ بلکہ اُن کی تمام شاعری پر خوشی ، نرمی اور شگفتگی کی ایک لہر چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ عدم کوئی اونچے ٹھاٹھ کے شاعر نہیں اور نہ ہی اُن کے یہاں کوئی رومانی یا حکیمانہ گہرائی پائی جاتی ہے مگر یہ بھی تو کوئی ضروری نہیں کہ ان چیزوں کا مطالبہ بھی عدم سے ضرور کیا جائے ۔ عدم کا اپنا ایک منفرد

رنگ ہے جس میں گداختگی و بے ساختگی دونوں کا ایک حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ وہ اُردو شاعری میں سلیس ، رواں اور بے تکلف انداز بیان کے علم بردار ہیں اور عدم کا فن زیادہ تر دل سے متعلق ہے کیونکہ اُن کے نزدیک دلوں پر حکم چلانا ہی شہر یاری ہے۔

عدم کو زبان و بیان دونوں پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ اُنھیں ترنم ریز و خوبصورت بحروں کے انتخاب میں بھی بڑا ملکہ ہے۔ اُن کی تشبیہات ، استعارات اور تراکیب میں حسن و دلکشی کے ساتھ اکثر ندرت اور ایک اچھوتا پن پایا جاتا ہے۔ مختصراً اُن کے کلام کے متعلق یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ غالب کے تخیل ، داغ کی شوخی و سادگی اور ریاض کی رندی و سرمستی نے عدم کی شاعری کو جلا دی ہے اور موجودہ دور میں وہ بلا شبہ ایک نمائندہ غزل گو کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عدم کا سب سے پہلا مجموعہ کلام ''نقش دوام'' تھا۔ اُس کے بعد سے اب تک اُن کے حسب ذیل مجموعے شائع ہو چکے ہیں

خرابات ، شہر خوباں ، پیچ و خم ، قول و قرار اور گردش جام

انتخاب کلام

غزلیات

تسکین کی صورت کیا ہوگی ، آرام کا امکاں کیا ہوگا
جو درد کہ جزو ہستی ہے ، اُس درد کا درماں کیا ہوگا
کلیوں کی نگاہیں حیراں ہیں ، غنچوں کے تصور ویراں ہیں
آغاز بہاراں کے صدقے انجام بہاراں کیا ہوگا

اک رات تیری شمع شبستاں رہا ہوں میں
احساس زندگی سے فروزاں رہا ہوں میں
اک عمر معصیت کو سمجھتا رہا ہوں عیب
اک عمر زندگی سے گریزاں رہا ہوں میں

غم جاناں بھی گو اک حادثہ ہے غم دوراں سے فرصت ہو گئی ہے

وقت جوں جوں رائیگاں ہوتا گیا   زندگی کو کام یاد آنے لگے

کتنے حسین عزم تھے جو دل سے مٹ گئے   کتنے صنم کدے تھے جو برباد ہو گئے
میری نظر سے بجھ گئے جلتے ہوئے چراغ   تیری نظر سے میکدے آباد ہو گئے
دو مستقل ضدوں کی کشا کش تھی زندگی   آباد ہو گئے کبھی برباد ہو گئے

میں اور تری نگاہ عنایت کی آرزو   صدمہ نہ ہو مزاج غم روزگار کو
کس نے غرور صبح قیامت بنا دیا   تھوڑا سا طول دے کے شب انتظار کو
دنیا ہے اعتماد پہ قائم تو اے ''عدم''
دینا پڑے گا کوئی فریب اعتبار کو

کیا کریں مہ وشوں سے پیار ''عدم''   بت پرستی ہے ، لوگ کہتے ہیں

چاندنی رات میں وہ اس طرح خوابیدہ ہے
جیسے ٹھہرا ہوا اک نغمۂ رقصیدہ ہے
دل ہو بیدار تو تجھ پر بھی یہ ظاہر ہو جائے
غم جسے کہتے ہیں اک عشرت بالیدہ ہے

کچھ اس ادا سے نسیم بہار گزری ہے
کہ جیسے رحمت پروردگار گزری ہے
وہاں وہاں ابھی رقصاں ہے بوئے عنبر و عود
جہاں جہاں سے چمن میں بہار گزری ہے
حیات نام ہے جس بیقرار بجلی کا
مرے غبار سے بھی شعلہ بار گزری ہے

ترا درد آرام جاں ہو رہا ہے   نشاط غم جاوداں ہو رہا ہے
مری داستاں کچھ تو رنگین ہوگی   کوئی شامل داستاں ہو رہا ہے

اُن کے وعدے کی بات کیا کہیئے   ہاں بہت اُستوار ہوتا ہے

جو نفس تیری یاد میں گزرے — بندگی میں شمار ہوتا ہے
اُن پہ گو ہم یقیں نہیں کرتے — پھر بھی کچھ اعتبار ہوتا ہے
زندگی ہے "عدم" گناہ نہیں
کس لئے شرمسار ہوتا ہے

ساقی کے التفات سے کچھ بات بن گئی — ورنہ حیات و موت میں کس کو تمیز تھی

منت چارہ ساز کیا کیجئے — زخم خود بھی تو بھر ہی جائیں گے.

صدمۂ بیداریٔ احساس تھا یا موت تھی
باغ میں کلیاں چٹکتے ہی پریشاں ہو گئیں
ذہن فطرت میں تھیں جتنی ناکشودہ اُلجھنیں
ایک مرکز پر سمٹ آئیں تو انساں ہو گئیں

ٹھہر ٹھہر گردش زمانہ ، سنبھل سنبھل شورش حوادث
ذرا جوانی کی داد دے لوں ، ذرا حسینوں سے پیار کر لوں
کروں گا جی بھر کے تجربے زندگی کی ہر لذت نہاں کے
میں اپنے ذوق گناہ کو اے "عدم" ! ذرا اُستوار کر لوں

جنوں اب منزلیں طے کر رہا ہے — خرد رستہ دکھا کر رہ گئی ہے

آ گیا تھا اُن کے ہونٹوں پر تبسم خواب میں
ورنہ اتنی دلکشی کب تھی شب مہتاب میں
اک طلسم شوق ٹوٹا ، اک مرتب ہو گیا
خواب سے چونکے تھے لیکن سو گئے پھر خواب میں
اُس حسیں کی نیند کا عالم کچھ ایسا ہے "عدم"
بتکدے کی چاندنی جیسے لباس خواب میں

غم حیات کو کچھ خوشگوار کر لوں گا   تری جفاؤں سے تھوڑا سا پیار کر لوں گا
کبھی تو دیر و حرم سے تو آئیگا واپس   میں میکدے میں ترا انتظار کر لوں گا
تری نگاہ کی گردش نے دی اگر فرصت   علاج گردش لیل و نہار کر لوں گا
''عدم'' بہت ہی اگر روٹھنے لگی اُمید   کسی کے وعدے پہ پھر اعتبار کر لوں گا

تو لطف تماشا لیتا جا ' مت ڈھونڈ سراغ اصلیت
تخلیق کے صورت خانے میں ' کچھ وہم ہے کچھ سچائی ہے

کلی بہار کے انجام سے نہیں واقف
وگر نہ اتنی خوشی سے چٹک کے پھول نہ ہو

کچھ منفعل وفائیں ہیں کچھ مضطرب خیال
جن کی نوازشوں سے جئے جا رہا ہوں میں
جاتا ہوں بزم حشر میں اس بے دلی کے ساتھ
جیسے کسی رقیب کے گھر جا رہا ہوں میں
کہہ دو جہان غم سے توقف کرے ''عدم''
دم بے کے میکدے میں ابھی آ رہا ہوں میں

امروز کی ظلمت میں ساقی فردا کے اشارے ڈوب گئے
یا چاند ستارے نکلے تھے ' یا چاند ستارے ڈوب گئے
کشتی کا پہنچنا ساحل تک ' دریا پہ وہ دلکش تہمت تھی
طوفاں نے کچھ ایسی کروٹ لی سب گھاٹ کنارے ڈوب گئے
کچھ لوگ خود اپنی کوشش سے طوفان کی زد سے بچ نکلے
کچھ لوگ مگر ملاحوں کی ہمت کے سہارے ڈوب گئے
احساس کا پہلا شعلہ ہی جاگا تھا ابھی سینے میں ''عدم''
بے رحم صراحی ٹوٹ گئی ' بے فیض ستارے ٹوٹ گئے

تخلیق کائنات کے دلچسپ جرم پر
ہنستا تو ہوگا آپ بھی یزداں کبھی کبھی

صرف اک قدم اٹھا تھا غلط راہ شوق میں
منزل تمام عمر ہمیں ڈھونڈتی رہی

ثابت رہے گا کس کا گریباں بہار میں
گلشن میں اڑ چلی ہے کسی گلبدن کی بات

سوال کر کے میں خود ہی بہت پشیماں ہوں
جواب دے کے مجھے اور شرمسار نہ کر
''عدم'' کی تشنہ لبی کو کچھ اور ہے مطلوب
شراب دے مگر اندازۂ خمار نہ کر

زمانے کو پرکھ کر بات کرنا ہر اک انسان دیوانہ نہیں ہے
''عدم'' آباد ہیں دل میں بیاباں خدا کا شکر ویرانہ نہیں ہے

ہمیں جب بھی اسیر بے دلی ہوتے ہوئے دیکھا
ترا وعدہ فریب جنت فردا اٹھا لایا
پریشاں رنگ ' ویران نگہتیں ' ڈوبے ہوئے نغمے
گلستاں سے ہجوم بے خودی کیا کیا اٹھا لایا

بھٹک گئے کہ ہمیں راہ کا شعور نہ تھا حریم ناز ترا ورنہ اتنی دور نہ تھا
ازل کے دن بھی بصارت کی کیفیت تھی یہی شراب پینے سے پہلے نظر میں نور نہ تھا
''عدم'' یہ راز بڑی دیر سے کھلا ہم پر
وہ جام جام نہیں تھا جو چور چور نہ تھا

دل کے معاملات میں سود و زیاں کی بات
ایسی ہے جیسے موسم گل میں خزاں کی بات
نیرنگئی زمانہ کا چہرہ اتر گیا
چھیڑی تھی ہم نے شوخئی عمر رواں کی بات
اٹھ کر تری گلی سے کہاں جائیں اب فقیر!
تیری گلی کے ساتھ ہے اب جسم و جاں کی بات

اب شدت غم میں مصنوعی آرام سہارا دیتا ہے
یا دوست تسلی دیتے ہیں یا جام سہارا دیتا ہے
اے دوست محبت کے صدمے تنہا ہی اٹھانے پڑتے ہیں
رہبر تو فقط اس رستے میں دو گام سہارا دیتا ہے
بیتابئی دل کی کیفیت اس حال تک اب آ پہنچی ہے
جس حال میں ہر مایوسی کو انجام سہارا دیتا ہے

طور پر چھیڑا تھا جس نے آپ کو   وہ مری دیوانگی تھی میں نہ تھا
میں اور اس غنچہ دہن کی آرزو   آرزو کی سادگی تھی میں نہ تھا

ان مست انکھڑیوں کو کنول کہہ گیا ہوں میں
محسوس ہو رہا ہے غزل کہہ گیا ہوں میں
ساقی ! تری نگاہ کو کتنے غرور سے
ہر حادثے کا رد عمل کہہ گیا ہوں میں
قسمت کی الجھنوں کو ''عدم'' کس گریز سے
اس گیسوئے دراز کا بل کہہ گیا ہوں میں

مری جوانی کے گرم لمحوں پہ ڈال دے گیسوؤں کا سایہ
یہ دوپہر کچھ تو معتدل ہو تمام ماحول جل رہا ہے
نہ دیکھ او مہ جبیں مری سمت اتنی مستی بھری نظر سے
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے شراب کا دور چل رہا ہے

حوادث روزگار میری خوشی سے کیا انتقام لیں گے
کہ زندگی وہ حسین ضد ہے کہ بے سبب مسکرا رہی ہے
ترا تبسم فروغ ہستی تری نظر اعتبار مستی
بہار اقرار کر رہی ہے ' شراب ایمان لا رہی ہے
خرد کے ٹوٹے ہوئے ستارے ''عدم'' کہاں تک چراغ بنتے
جنوں کی روشن روش ہے آخر دلوں کو رستہ دکھا رہی ہے

جملہ اسباب جہاں پر ہے تغیّر حاوی
اک محبت ہے کہ ہر وقت جواں رہتی ہے

اے دل کبھی کبھی تو خود آتی ہے اُن کی یاد
کمبخت بار بار نہ آئے تو کیا کروں

یہاں کچھ راہرو ایسے بھی ہیں جو جادہ پیما ہیں
نہ رہبر کے اشارے پر ' نہ منزل کے سہارے پر
محبت اک مقدس شکل ہے آتش پرستی کی
پتنگے جی رہے ہیں شمع محفل کے سہارے پر

تاروں میں روشنی ہے نہ پھولوں میں باس ہے
جو کچھ بھی ہے تکلف وہم و قیاس ہے
خوشبو اُڑی ہے رنگ کے پردے کو چیر کر
کہتے ہیں جس کو گل وہ جنوں کا لباس ہے

تبسم کی سزا کتنی کڑی ہے گلوں کو کھِل کے مرجھانا پڑا ہے

یہ ناز ہے کہ تری آرزو میں جیتے ہیں یہ فخر ہے کہ ری ذات سے تعلق ہے
تعلقات کی غارت گری کا حال نہ پوچھ کہ دن کے نور کا بھی رات سے تعلق ہے
''عدم'' خیال کی ہر قیمتی مسرت کا
خیال سے نہیں جذبات سے تعلق ہے

مرا جنوں تری آنکھوں سے کچھ ہوا رسوا تری خبر مری مستی سے گاہ گاہ ملی

کہاں سے چل کے اے ساقی کہاں تک بات پہنچی ہے
تری آنکھوں سے عمر جاوداں تک بات پہونچی ہے
ابھی تو اُس کی آنکھوں نے لیا ہے جائزہ دل کا
ابھی تو ابتدائے داستاں تک بات پہنچی ہے

خرد فسانہ و تمثیل و خواب ہے ساقی جنوں ہوائے شب ماہتاب ہے ساقی
ہے میکدہ وہ خلاصہ رموز دانش کا جہاں حقیقت دریا حباب ہے ساقی
سمجھ گیا ہوں میں تیری نگاہ کا مطلب نظر ہی رنگ ، نظر ہی شراب ہے ساقی

دونوں کو نگاہ جاناں نے تو قیربرابر کی بخشی
تا عمر خرد برباد رہی ، تا عمر جنوں معتوب رہا

ہم آشنا ہیں قیامت کی دلفریبی سے ہزار بار تمہاری گلی سے گزری ہے
گذر تو خیر گئی ہے عدم حیات مگر
ستم ظریف بڑی بے رخی سے گزری ہے

غم جاں بخش کو آرام جاں کہنا ہی پڑتا ہے
کسی نا مہرباں کو مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے
بہار زندگی سے غم کا بھی گہرا تعلق ہے
کہ کانٹوں کو بھی جزو گلستاں کہنا ہی پڑتا ہے

ترے غم کا جو حاصل ہو گیا ہے وہ دل جینے کے قابل ہو گیا ہے
بڑھا ہے درد جب اپنی حدوں سے تو اکثر راحت دل ہو گیا ہے

میرا وعدہ تری نگاہ نہیں اپنے وعدے پہ برقرار ہوں میں

طلوع حشر کا بھی کیا یقین ہے پیارے دراز ہو تو شب انتظار ہے پیارے

دلچسپ ہو گئی ہے پریشانی حیات اے زلف عنبریں تری الجھن دراز ہو

قطعات

شام ہے اور پار ندی کے ایک ننھا سا بے قرار دیا
یوں اندھیرے میں ٹمٹماتا ہے جیسے کشتی کے ڈوبنے کی صدا

کتنی صدیوں سے عظمت آدم — عجز فطرت پہ مسکراتی ہے
جب مشیت کی کوئی پیش نہ جائے — موت کا فیصلہ سناتی ہے

اک حرف اک طویل حکایت سے کم نہیں
اک بوند ایک بحر کی وسعت سے کم نہیں
نکلے خلوص دل سے اگر وقت نیم شب
اک آہ اک صدی کی عبادت سے کم نہیں

موت کا سرد ہاتھ بھی ساقی — مجھ کو خاموش کر نہیں سکتا
ساز کا تار ٹوٹ سکتا ہے — تار کا سوز مر نہیں سکتا

ایک ماں کے کشادہ سینے پر — ایک ننھا سا ماہ پارہ ہے
زندگی کے ضعیف شانوں پر — فرض کا بوجھ کتنا پیارا ہے

دفن ہیں ساغروں میں ہنگامے — کتنی اجڑی ہوئی بہاروں کے
نام کندہ ہیں آبگینوں پر — کتنے ڈوبے ہوئے ستاروں کے

بجھ گیا ہے بھڑک کے ایک چراغ — گر گئی ہے چٹک کے ایک کلی
ایسی دلدوز مسکراہٹ سے — موت کی پر سکون نیند بھلی!

منظومات

فطرت

کوہساروں کا یہ گاتا ہوا شاداب سکوت
یہ ہواؤں میں لرزتا ہوا رنگیں خمار
یہ صنوبر کے درختوں کی بلندی کا وقار
بج رہا ہے مرے محبوب مرے دل کا ستار

تیری آنکھوں میں آنسوؤں کی شفق ہے لرزاں
جھانکتی ہے تری زلفوں کے دریچے سے بہار
جیسے مخمور گھٹاؤں سے ستاروں کی پھوار
تیرے ہونٹوں کی لکیریں ہیں کہ یا قوت کے تار
تیرے اعضا میں جوانی کے کنول ہیں روشن
میرے اعصاب میں سیماب کی لہریں ہیں رواں
دیوتاؤں کا تخیل ہے ترا جسم جواں
یا کسی شعر کے سانچے میں جوانی کی فغاں
دو اہم جزو ہیں فطرت کی ضرورت کے ہم
آ کہ فطرت کی مناجات سماعت کر لیں
مل کے لہروں کی طرح رقص محبت کر لیں
لب سے لب جوڑ کے تھوڑی سی عبادت کر لیں

گجر

اے ہمنشیں طلوع سحر کو سلام کر
لبریز مسکرا کے عقیدت کا جام کر
انساں ہے تیرا مسلک ہستی ہے ارتقا
یزداں و اہرمن کی قبا پر خرام کر
گوشہ اٹھا ہر ایک صنم کے نقاب کا
دے روئے کائنات کو چھینٹا شراب کا
کہتے ہیں زندگی جسے سوز دوام ہے
آہنگ آفتاب کی لہروں کا نام ہے
رکتا نہیں کسی کے لئے کاروان وقت
منزل ہے جستجو کی نہ کوئی مقام ہے
اے مطرب شباب کہاں ترا ساز ہے
گیسو تری ضدوں کا ابد تک دراز ہے
محدود برگ گل کی مہک تک نہیں بہار
کانٹوں کی انکھڑیوں میں بھی ہے رنگ کا خمار
رکتا بھی ہے کبھی جسے کہتے ہیں حادثہ
تھمتی بھی ہے کہیں جسے کہتے ہیں جوئبار

ساحل بھی ایک نے ہے اگر کوئی سن سکے
اُمڈے ہوئے سکوت سے طوفان بن سکے
سہواً اگر حیات کی نبضوں کو کل پڑے
ہنس کر ضمیر سنگ سے چشمہ اُبل پڑے
نشتر اگر چبھے کسی رہرو کی سانس کا
صحرا کی چوب خشک مسرت سے جل پڑے

احساس درد خون رگ کائنات ہے
یہ مستقل شرار دلیل ثبات ہے
تاریخ کائنات کی نبضیں ٹٹول کر
خونیں تغیّرات کے اوراق کھول کر
سن تو سہی کہ غیب سے آتی ہے کیا صدا
الفاظ خود دکھائیں گے گرمی سے بول کر

کون و مکاں بھی وقت کے سیّال تیر ہیں
کولھو کے بیل کی طرح گردش پذیر ہیں
تعمیر و ریخت کام ہے اس کارگہ کا
منزل سے بے خبر ہے سفر مہر و ماہ کا
چکی کے دور میں ہے عناصر کا ہست و بود
انسان معرکہ ہے ثواب و گناہ کا

سورج کی موت زندگئی ماہتاب ہے
گرمی ڈھلے تو نکہت برگ گلاب ہے
ہے خبط انہدام میں تعمیر نو کا ہاتھ
تنظیم گامزن ہے تباہی کے ساتھ ساتھ
اک سمت خندہ زن ہے خدا وند آشتی
اک سمت غیض بار ہے بربادیوں کا ناتھ

اک دوش پر جنازہ ہے اک دوش پر سبو
طاؤس ناچتے ہیں مزاروں کے روبرو
شاہوں کی تمکنت بھی ہے اک جشن رہگزار
شہزادیوں کا بند قبا بھی ہے تار تار
سرمایہ حیات ہے اک حسن زہر خند
مرنے پہ اختیار نہ جینے پہ اختیار

ساق اٹھا بھی جھوم کے ساغر شراب کا
بجتا رہے گا یوں ہی گجر انقلاب کا

دھواں

یہ با وقار مفکّر یہ فلسفی شاعر — بہت بلند فضاؤں میں پھڑپھڑاتے ہیں
میں ان کے حلقہ صحبت میں بیٹھتا ہوں جب — عجیب قسم کے مجھ کو خیال آتے ہیں
زمیں پہ جانے قدم ان کا کیوں نہیں لگتا — کہ عرش پار کے اکثر سراغ لاتے ہیں
سمجھ میں بات کوئی ان کی آ نہیں سکتی — ہر ایک بات میں ابہام تھر تھراتے ہیں
کبھی فرشتے ہیں ان کی تلاش میں بے حال — کبھی یہ اپنے تجسس میں آپ جاتے ہیں
چمن کے پھول ' ہوا کا خرام' گل کی چٹک — ہر ایک زندہ مسرت سے خوف کھاتے ہیں
کبھی خدا نہ کرے مسکرائیں بھی یہ بزرگ — تو کس قبیح متانت سے مسکراتے ہیں
رباب زیست کے آتش مزاج تاروں پر — غلاف برف زدہ فکر کے چڑھاتے ہیں
ہے مرگ فکر وہ مردہ بلند پروازی
کہ جس سے زیست کے اعصاب اینٹھ جاتے ہیں

یہ فلسفے کی تحیّر فروز تاویلیں — یہ نفع بخش ادب کی علیل قندیلیں
یہ زاویوں کے تلاطم یہ تجزیوں کے غبار — یہ مردہ مُردہ کنائے یہ سرد تفصیلیں
ذرا سی دیر اگر ہمنشیں یہاں ٹھہریں
یہ اونگھتے ہوئے ماحول خون ہی پی لیں

غبار علم و تصوف کا ذہن میں لے کر — میں جب بھی محفل اہل خرد سے آتا ہوں
تو ایک آہ تسلی کی بھر کے ' ریحانہ !
ترے دریچۂ رحمت میں بیٹھ جاتا ہوں

کہ یہ مقام وہ زندہ مقام ہے جن میں — کوئی مری ہوئی تخئیل آ نہیں سکتی
ترے تبسم رنگیں کے حرف حکمت پر — کوئی بجھی ہوئی تاویل چھا نہیں سکتی
بغیر صحبت اہل جمال کچھ بھی نہیں
وجود مذہب و فکر و خیال کچھ بھی نہیں

گائے جا (ایک گیت)

اے حسین مطربہ !
سادگی سے گائے جا
زمزمے بہائے جا
بجلیاں گرائے جا

پھول کی مہک ہے تو
جام کی کھنک ہے تو

اے حسین مطربہ !
چاندنی ہے رنگ میں
موج ہے آمنگ میں
تیرے انگ انگ میں

گیت ہیں رچے ہوئے
شور ہیں مچے ہوئے

اے حسین مطربہ !
روپ ایک پیاس ہے
کانچ کا گلاس ہے
دو دلوں کی آس ہے

کھیتیاں ہری رہیں
جھولیاں بھری رہیں

ماہرالقادری

منظور حسین نام ماہر تخلص ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۶ء میں قصبہ کسیر کلاں ضلع بلند شہر (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ منظور حسین آپ کا تاریخی نام ہے اور سلسلۂ قادری سے روحانی نسبت رکھتے ہیں۔ آپ کے والد محمد معشوق علی صاحب بھی شاعر تھے اور ظریف تخلص کرتے تھے مگر کلام ظریفانہ نہیں تھا بلکہ حمد و نعت لکھا کرتے تھے۔

ماہر صاحب نسباً قریشی اور حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کی اولاد سے ہیں۔ آپ کی ابتدائی تعلیم اپنے والد مرحوم کی زیر نگرانی ہوئی۔ اُس کے بعد اسکول میں داخل ہوئے۔ ۱۹۲۴ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے انٹرنس کے امتحان میں شریک ہوئے مگر نا کامیاب ہونے پر ۱۹۲۶ء میں علیگڈھ مسلم یونیورسٹی سے انٹرنس پاس کیا۔ پھر تلاش معاش میں بظاہر تعلیم ترک کر دی لیکن معناً مطالعے کا سلسلہ بدستور جاری رہا اور بقول خود ''مطالعہ میری زندگی کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ رہا ہے۔ سینکڑوں راتیں چراغ کے سہارے بسر کی ہیں اور جو کچھ میرے ذہن و فکر کی تربیت ہوئی ہے اُس کو کثرت مطالعہ کا نتیجہ سمجھنا چاہئے''۔ ماہر صاحب کو علوم و آداب سے فطرت مناسبت ہے۔ بنا بریں اُنہوں نے مذہب و تاریخ کا خاصا مطالعہ کیا ہے۔

ماہر صاحب ابتدا میں کچھ دن روز نامہ مدینہ (بجنور) کی ادارت میں شامل رہے اور ہفتہ وار ''غنچہ'' کی زمام ادارت بھی آپ سے متعلق رہی۔ ۱۹۳۳ء میں آپ نے عراق کا سفر کیا جہاں دوسرے عمائد کے علاوہ ہزمجسٹی شاہ عراق (غازی الاول) مرحوم سے بھی ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ وہاں سے واپسی پر کافی عرصہ تک آپ کا قیام ریاست حیدر آباد میں رہا۔ یمین السلطنت سر مہاراج کشن پرشاد صاحب صدر اعظم حیدر آباد آپ کے حال پر خاص عنایت کی نظر رکھتے تھے۔ اس کے بعد ضرورت و حالات سے مجبور ہو کر آپ نے چندے بمبئی میں قیام کر کے فلمی گانے وغیرہ لکھے۔ لیکن جب آپ کی غیور و خود دار طبیعت نے یہ مشغلہ زندگی پسند نہ کیا تو آپ اسے چھوڑ کر دہلی چلے گئے۔ تقسیم ہند کے وقت آپ اپنے وطن قصبہ کسیر کلاں میں تھے کہ قرب و جوار کے اضلاع میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ بارے بہزار دقت و دشواری آپ ہجرت کر کے پاکستان تشریف لے آئے۔ جب سے کراچی میں مقیم ہیں اور ماہنامہ ''فاران'' نکالتے ہیں۔

جناب ماہر کو شاعری میں کسی سے تلمذ نہیں اور نہ ہی آپ اصلاح سخن کے قائل ہیں چنانچہ کثرت مطالعہ اور طبع رسا کی بدولت آپ نے اپنے کلام پر خود ہی اصلاح کی ۔ آپ کے نزدیک شاعری کا وہ پہلو اہم ہے جس کے ذریعے قلب میں تسکین اور روح میں انقلاب پیدا ہو سکے ۔ آپ اقتصادیات و معاشیات وغیرہ کی رهنمائی سے شاعری کو بالا تر سمجھتے ہیں ۔ یہاں یہ بات بے محل نہ ہوگی کہ ابھی حال ہی میں ''اسلامی ادب'' کی جو تحریک پاکستان کے مختلف جرائد میں شروع ہوئی تھی اُس کے بانی مبانی ماہرالقادری صاحب ہی تھے ۔

حضرت ماہر بڑے ذہین و طباع انسان ہیں مذہب ، تاریخ ، سیاست ، ادب وغیرہ سے آپ کو خاصا لگاؤ ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ آپ کا کلام بہت ہی متنوع ہے ۔ لیکن چونکہ روحانیت ورثہ میں پائی ہے اور بزرگوں سے عقیدتمندی اور مذہب کی پابندی آپ کے کردار کی خصوصیت رہی ہے اسلئے آپ کے کلام میں روحانی عنصر نسبتاً زیادہ ہے ۔ اس کے ثبوت میں آپ کی ایک مستقل تصنیف ''ذکر جمیل'' پیش کی جا سکتی ہے جس میں آپ کا نعتیہ کلام شائع ہوا ہے ۔

ماہر صاحب یوں تو ہر صنف سخن پر عبور رکھتے ہیں مگر خصوصیت کے ساتھ نظم و غزل کہتے ہیں ۔ آپ کے رنگ تغزل میں بے اعتدالی نام کو نہیں اور اکثر اشعار بڑے صاف ستھرے اور پاکیزہ ہیں لیکن وہ سرمستی و گداختگی جو غزل کی جان سمجھی جاتی ہے آپ کی غزلوں میں خال خال ہی ملے گی ۔ البتہ نظم گوئی میں آپ کو ید طولیٰ حاصل ہے ۔ آپ کی منظومات میں فکر و نظر ، علم و حکمت ، جذبات نگاری اور منظر نگاری وغیرہ کے بڑے اچھے نمونے ملتے ہیں اس پر روانی الفاظ ، ترکیب کی چستی اور زبان کی سلاست کلام کو اور بھی دلپذیر بنا دیتی ہے ۔ آپ کے کلام پر ایک نظر ڈالنے کے بعد ایک چیز جو سب سے زیادہ نمایاں معلوم ہوتی ہے وہ مضامین نو کی بہتات اور تنوع ہے لیکن اس سے بھی زیادہ قابل قدر چیز یہ ہے کہ ماہر صاحب نے ہر موضوع پر بڑی چابکدستی کے ساتھ قلم اٹھایا ہے اور کہیں ثقالت یا گرانی پیدا نہیں ہونے پاتی بلکہ ہر جگہ کلام میں روانی و ہمواری پائی جاتی ہے ۔

آپ کی منظومات میں بعض بڑی اچھی رومانی نظمیں بھی ہیں لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا مذہب و تاریخ سے چونکہ ماہر صاحب کو خاص شغف ہے اسلئے آپ کی اکثر نظمیں مجاہدین اسلام کی زندگی اور اُن کے کارناموں سے متعلق ہیں اور آپ کی ایسی نظموں میں صداقت و جوش کا پہلو ایک امتیازی شان رکھتا ہے ۔ حضرت ماہر کو ، جیسا کہ ہونا بھی چاہئے تھا ، علامہ اقبال مرحوم سے بڑی عقیدت معلوم ہوتی ہے اور اُن کا اثر بھی آپ نے بڑی حد تک قبول کیا ہے ۔

ماہر صاحب نے نظم و نثر کی کم و بیش بائیس کتابیں تصنیف کی ہیں ۔ لیکن نثری کاوشوں کے علاوہ ''محسوسات ماہر'' ''جذبات ماہر'' ''نغمات ماہر'' اور ''ذکر جمیل'' آپ کے کلام کے وہ مجموعے ہیں جو ادبی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں اور جن کی مقبولیت کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ ان میں سے ہر مجموعے کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں ۔

انتخاب کلام

تغزل

لے لیا ہے فضائے محشر نے ایک ٹکڑا مری ہی کہانی سے
آرزو کو سمجھ رہا ہے رقیب تنگ ہوں دل کی بدگمانی سے

میں نے مانا کہ ہے جنت دلکش کوچۂ یار اگر یاد آیا
پھر شب ہجر نے کروٹ بدلی پھر ترا خواب سحر یاد آیا

اک بار تجھے عقل نے چاہا تھا بھلانا سو بار جنوں نے تری تصویر دکھا دی

میں قائل ہوں دیر و حرم کا بھی لیکن درا آستاں پھر ترا آستاں ہے

آرزو اک فریب باطل ہے عشق خود عشق ہی کا حاصل ہے
مختلف ہیں حیات کے پہلو موت اک زندگی کی منزل ہے
نبض امید چھٹ گئی شاید آج دل کیوں سکوں پہ مائل ہے

کس قیامت کی گھٹا چھائی ہے دل کی ہر چوٹ ابھر آئی ہے
درد بدنام ، تمنا رسوا عشق ، رسوائی ہی رسوائی ہے
اس نے پھر یاد کیا ہے شاید دل دھڑکنے کی صدا آئی ہے
ہم سے چھپ چھپ کے سنورنے والے چشم آئینہ تماشائی ہے

چمن میں سوگ ہے اس بد نصیب غنچے کا
جو ایک رات بھی جی بھر کے مسکرا نہ سکا

اے رہر و منزل محبت ! ہر ذرہ نگاہ چاہتا ہے

نبض دل ڈوبتی جاتی ہے طبیعت ہے نڈھال
مجھ سے پھر درد محبت نے کوئی کام لیا

دل دیا ، دل کو لذت غم دی ساری آفت مجھی پہ ڈال گئے
مجھ کو بیدل بنا کے وہ ''ماہر'' حسرت زندگی نکال گئے

تمنا پاک ، دل معصوم ، فطرت کس قدر سادہ
محبت سادگی ہی سادگی معلوم ہوتی ہے

آن کے آنے کا ہے یقیں لیکن حسرت بام و در کو کیا کہئے
ہر طرف درد کی خدائی تھی شام غم کی سحر کو کیا کہئے
عشق کی موت کس کو ملتی ہے فطرت نوحہ گر کو کیا کہئے

آنکھیں اداس ، روح پریشان ، دل نڈھال
برپا ہوئی ہے ایک قیامت کہاں کہاں

میرے حال دل کی کس صورت سے رسوائی ہوئی
روک لی ظالم نے ہونٹوں پر ہنسی آئی ہوئی

وہ بھی دل کے ذکر پر ہنسنے لگے دور جا پہنچیں مری رسوائیاں

ڈھونڈا تو وہ کچھ دور نہ تھے حد طلب سے
دیکھا تو سر رہگذر یار ہمیں تھے

چمن میں میرے ہی تنکوں پہ ہر بجلی کی نظریں ہیں
مری قسمت کہ پھر میں نے بنائے آشیاں رکھدی

شب وعدہ وہ اب تک آ رہے ہیں — ستارے ہیں کہ ڈوبے جا رہے ہیں

تیرے ہوتے ہوئے غم جاناں — اور کس چیز کی ضرورت ہے
اس نے غم دے کے مجھ سے فرمایا — یہ مری آخری عنایت ہے
کاش! ناصح کو بھی خبر ہوتی — عشق تو آدمی کی فطرت ہے

کتنا مصروف ضبط آہ میں ہے — دل ابھی قید رسم و راہ میں ہے

زندگی جب عذاب ہوتی ہے — عاشقی کامیاب ہوتی ہے

وہ عربدہ جُو معصوم ادا قاتل بھی ہے اور قاتل بھی نہیں
دل اس کی ادائے سادہ کا بسمل بھی ہے اور بسمل بھی نہیں
وعدے پہ نہیں آنا سچ ہے، پر یاد تو اس کی آتی ہے
اس جان محبت کا وعدہ باطل بھی ہے اور باطل بھی نہیں
ہر دل ہے نشیمن، کاشانہ، اس پر بھی تباہ و ویرانہ
اس جان جہاں کے جلووں کی منزل بھی ہے اور منزل بھی نہیں
جو ڈوب گیا وہ پار اترا، جو سطح پہ تھا وہ تر نہ سکا
دریائے محبت کا ''ماہر'' ساحل بھی ہے اور ساحل بھی نہیں

دیر و کعبہ پہ کیا نظر ڈالیں — ہم ترے آستاں سے آئے ہیں
تو اسیروں پہ رحم کر صیّاد! — یہ ابھی آشیاں سے آئے ہیں
کچھ زمیں پر بپا ہوئے فتنے — اور کچھ آسماں سے آئے ہیں
چند جھونکے قفس کی جانب آج — جانے کیوں گلستاں سے آئے ہیں

عشق کی زندگی کو کیا کہئے — اپنی قسمت! کسی کو کیا کہئے
اک ذرا سی امید پر یہ حال — آدمی کی خوشی کو کیا کہئے
حسن پر اعتماد چارہ گری — عشق کی سادگی کو کیا کہئے

دیکھتا ہوں وہ مہرباں ہیں آج　　خواب کہئے اسے کہ بیداری

جب کوئی پھول مسکراتا ہے　　مجھ کو دل کا خیال آتا ہے
پھر تصور نے دے دیا دھوکا　　پھر کوئی سامنے سے آتا ہے

وہ نظر اٹھی ، جھجک کر رہ گئی　　پھانس سی دل میں کھٹک کر رہ گئی
مسکرا کر اس نے پوچھا حال دل　　بوند آنسو کی ڈھلک کر رہ گئی
کون دیتا ساتھ غم کی رات کا　　شمع بھی آخر بھڑک کر رہ گئی
کتنی کیف آور تھی ساغر کی کھنک　　آنکھ ساقی کی جھپک کر رہ گئی
کیا کہوں ماہر فسانہ دید کا
ایک بجلی سی چمک کر رہ گئی

منظومات

حرّیت کاملہ کا مبلغ اعظم

ذلیل جذبات کی فضا میں ضمیر خوابیدہ ہو چکا تھا
دماغ انساں کا ہر تخیل ہوس کی ظلمت میں گھر چکا تھا
بیاض اخلاق منتشر تھی ، نظام بزم حیات برہم
غریب تھے ذلّتِ سراپا ، امیر تھے نخوت مجسم
جفا کے بادل گھرے ہوئے تھے ، گھٹا غلامی کی چھا رہی تھی
ستم کی بجلی تڑپ تڑپ کر وفا کا خرمن جلا رہی تھی
تباہیوں کا تھا اک مرقع ، غلام قوموں کا حال بد تر
رگوں میں نشتر ، چھری گلے پر ، ضمیر بیتاب ، روح مضطر
غریب پامال ہو رہے تھے جفا کے ہاتھوں کچھ اس طرح سے
کہ جیسے چٹکی میں کوئی لے کر گلاب کے پھول کو مسل دے
یہ ہم نے مانا ستم رسیدوں کی تھیں بہت دردناک چیخیں
مگر غرض تھی کسے جو سنتا حریم عشرت کے قہقہوں میں

پلٹ چکا تھا نظام عالم ' بدل چکی تھی فضائے دنیا
جہان ہستی کا ذرہ ذرہ ' طلسم اک نسل و رنگ کا تھا
غلام و آقا کے درمیاں تھی خلیج عجز و غرور حائل
ادھر جبیں عاجزی سراپا ' اُدھر نظر میں غرور باطل
یہ دیکھ کر گرمئی معاصی خدا کی غیرت کو جوش آیا
اُمنڈ اُٹھے رحمتوں کے چشمے ' اُبل پڑے حریت کے دریا
فضا غلامی کی کانپ اُٹھی ' اک انقلاب آ گیا جہاں میں
امارتوں کی بلندیوں نے جھکا ہی دیں خاک پر جبینیں
جھکی اُخوّت کے آستاں پر مداین و نینوا کی سطوت
اُتر گیا چشم خود سری سے خمار صہبائے قیصریت
گزر گیا حریت کا طوفاں ' غرور و نخوت کی چوٹیوں سے
اُبھر کے پہنچیں بلندیوں پر غلام اقوام پستیوں سے
حبیب حق کے نثار جاؤں بدل دیا یوں نظام دنیا
کھڑے کئے ایک صف میں لا کر امیر و مفلس غلام و آقا
ادھر علی کے قریں آسامہ رض ' ابو ہریرہ رض کے پاس عثمان رض
ادھر عمر رض اور بلال رض حبشی ' جناب بو بکر رض اور سلمان رض
طلسم جبر و ستم کے توڑے ' مٹا دئے نقش ذلتوں کے
بتا دیا راز زندگی کا ' سکھا دئے گُر ترقیوں کے
ہوئی مساوات کی وہ بارش کہ بھر دئے جس نے دشت و صحرا
پہاڑ کے ہو گیا مقابل جہاں کا اک اک حقیر تنکا
بدل گئی نغمۂ طرب سے ستم رسیدوں کی آہ و شیون
کئے گئے عرصۂ جہاں میں اُصول جمہوریت مدوّن

سلام اے حرّیت کے داعی سلام اے رحمت مجسم
سلام اے مرکز اخوت ' سلام اے رحمت دو عالم

صبح بہاراں

کانٹوں کی نوکیں رشک گل تر
پھولوں کا جوبن اللہ اکبر

ہر برگ رنگیں ہر گل معطر
دلکش تماشا دلچسپ منظر

صبح بہاراں

کلیوں کی چاندی شبنم کے گوہر
کرنوں کا سونا پھولوں کے زیور
کونپل کے جگنو پتوں کے جھومر
ہر چیز روشن ہر شے منور

صبح بہاراں

غنچوں کے تکمے سبزے کی مخمل
پھولوں کی جھالر شاخوں کا آنچل
آب رواں کی باریک مخمل
چمپا کا لچکا بیلے کی جدول

صبح بہاراں

قمری بھی چنچل تتلی بھی چنچل
پرواز پیہم رقص مسلسل
مستانہ بلبل بد مست کویل
الفت مجسم نغمہ مکمل ،

صبح بہاراں

جنت کی نزہت خاشاک و خس میں
کوثر کی موجیں پھولوں کے رس میں
کلیوں کی سیجیں کنج قفس میں
سارا زمانہ مستی کے بس میں

صبح بہاراں

ہر سمت شادی ہر سو مسرت
ہر قطرہ کوثر ، ہر ذرہ جنت
سامان فرحت ، اسباب عشرت
مستی ، ترنم ، خنکی ، طراوت

صبح بہاراں

هر شے پہ طاری، اک کیف مستی
زاهد کا ایماں صہبا پرستی
ساری خدائی رندوں کی بستی
نغمہ بھی ارزاں، مستی بھی سستی

صبح بہاراں

باد سحر کیا اٹھلا رہی ہے
پھولوں کے تلوے سہلا رہی ہے
خنکی دلوں کو گرما رہی ہے
ایسے میں ان کی یاد آ رہی ہے

صبح بہاراں

نیند کے مارے اک دو شیزہ!

چاند کی رنگت پھیکی سی ہے، رات بھی ڈھلتی جاتی ہے
شمع بھی سوز دل کے ہاتھوں رنگ بدلتی جاتی ہے
سانس کی تیزی کیا کہئے تلوار سی چلتی جاتی ہے
باد صبا ٹھوکر کھا کر ہر بار سنبھلتی جاتی ہے
نیند کے مارے اک دو شیزہ آنکھیں ملتی جاتی ہے

نظم بھی ہے غزلیں بھی ہیں اور گیت بھی ہے تقریر بھی ہے
پھول بھی ہیں انگارے بھی ہیں پارہ ہے اکسیر بھی ہے
موسیقی کے زیر و بم ہیں اور ان میں تاثیر بھی ہے
نغمے کے طوفانوں میں ہر سانس جھکولے کھاتی ہے
نیند کے مارے اک دو شیزہ آنکھیں ملتی جاتی ہے

ماتھے کی نمناک لکیریں نور کا مینہ برساتی ہیں
ہونٹ ہیں گویا کچی کلیاں آنکھیں کچھ کچھ گاتی ہیں
خود ہی خود غزلوں پر غزلیں موزوں ہوتی جاتی ہیں
زلف کی بے ترتیبی رخ پر اور قیامت ڈھاتی ہے
نیند کے مارے اک دو شیزہ آنکھیں ملتی جاتی ہے

ہونٹ کی لالی کو گر دیکھے پھول کی پتی شرما جائے
آنکھ کی مستی جب چاہے پیمانۂ دل کے چھلکا جائے

حسن سراپا مستی ہے اور مستی کو کیا سمجھا جائے
پریم کی دھن میں مست جوانی گیت خوشی کے گاتی ہے
نیند کے مارے اک دوشیزہ آنکھیں ملتی جاتی ہے

پیام

وہ تیغ ہے دراصل مسلماں کی وراثت
جو تیغ کہ اقوام کی تقدیر بدل دے
تو رزم کا خوگر ہے تجھے بزم سے کیا کام
تہذیب کے ہر پھول کو چٹکی سے مسل دے
پھر نان جویں مائل خیبر شکنی ہو
اے کاش! خدا پھر تجھے توفیق عمل دے
کب تک خس و خاشاک کی الجھن میں رہے گا
طوفاں ہے تو الوند کی چوٹی سے گذر جا
دنیا تجھے مرنے کی بھی مہلت نہیں دے گی
ناموسِ محمدؐ پہ جو مرنا ہے تو مر جا

روشؔ صدیقی

شاہد عزیز صدیقی نام روشؔ تخلص ۱۰ جولائی ۱۹۱۱ء کو جوالا پور ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے ۔ یہ مقام بقول روش صاحب مناظر فطرت کے لحاظ سے عجیب جگہ ہے اور قدیم ہندوستانی تہذیب کا گہوارہ ' گرو کل کالج بھی یہیں ہے ۔ آپ کے والد ماجد کا نام مولوی خلیل احمد شاہد ہے ۔ روش صاحب کی تعلیم گھر ہی پر ہوئی اور آپ نے ابتداً اُردو و فارسی کی تحصیل کی ' پھر ہندی ' سنسکرت اور انگریزی سے بھی بقدر ضرورت واقفیت پیدا کی ۔ شعر و سخن سے اُنھیں فطری مناسبت ہے چنانچہ خود اُن کے بیان کے مطابق سات سال کی عمر میں آغاز شاعری ہوا اور زندگی کے سب سے پہلے دو شعر یہ ہیں ۔

یہ میرے ضبط محبت نے کی عجب تاثیر
که اُن کو ضبط محبت کا حوصلہ نہ رہا

ہے روز میرے گریباں سے گفتگوئے رفو
بہار کے لئے کیا کوئی مشغلہ نہ رہا

روش صاحب کو تلمذ اگر کسی سے ہے تو وہ اپنے والد ماجد حضرت شاہد صاحب سے ' ابتدائی دور شاعری میں اُنھوں نے صرف غزلیں کہیں لیکن ۴۲ء کے بعد سے اُن کی نظم نگاری کا آغاز ہوا اور اب تو دونوں اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے اور خوب کہتے ہیں ۔

حضرت روش جدید شعریت کے پیرو ہیں اور عصر حاضر کے رومانی شعرا میں اُنھیں خاص اہمیت حاصل ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی نظموں کی وجہ سے مشہور ہوئے لیکن اُن کی غزلیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس صنف میں بھی اچھے شعر نکال لیتے ہیں ۔ تا ہم چونکہ پوری توجہ نظم نگاری کی طرف ہے اس لئے غزل میں اُن کا کوئی خاص رنگ پیدا نہیں ہو سکا اور نہ ہی اس میں وہ پورے طور پر اپنے آپ کو واضح کر سکے ہیں ۔

روش صاحب کے کلام کو دیکھ کر اُن کے متعلق یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ وہ سر تا پا احساس ہیں ۔ بعض اوقات یہ احساس الفاظ کی صورت میں آ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے ۔ مگر ان ٹکڑوں میں اصل کی کچھ جھلک اور ایک

حسن ضرور ملتا ہے ۔ آن کی منظومات رعنائی خیال ' شیرینی اور ترنم کے لئے خاص طور پر معروف ہیں ۔ شکل و ھئیت کے اعتبار سے روش صاحب کی نظمیں آن کی شاعرانہ ذھنیت کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں اور ان میں آن کے جذبات ' احساسات اور خیالات کے پیچ و خم کا اظہار بھی بخوبی ہو جاتا ہے ۔ بالخصوص ترجیع بند کے انداز کی نظموں میں جہاں وہ ایک مصرعہ کو بار بار لاتے ہیں آن کے طرز بیان میں ایک خاص حسن و دلکشی پیدا ہو جاتی ہے ۔

جناب روش کی نظم نگاری کے متعلق ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب رقم طراز ہیں ۔ ''روش اپنی رومانیت میں اتنے گم ہیں کہ آن کے اقلیم سخن سے منظر نگاری یا واقعہ نگاری عموماً دور رہتی ہے ۔ روش کی شاعری بنیادی طریقہ سے دور جدید کی پیداوار ہے ۔ اور طبقۂ متوسط کو اپنی رومانی زندگی میں جو مشکلات پڑتی ہیں وہ بڑے عمدہ شاعرانہ انداز سے روش کے یہاں بیان ہو جاتی ہیں'' ۔ اس کے علاوہ آن کی نظموں میں سیاسی و سماجی جکڑ بندیوں پر بھی اظہار خیال ہوا ہے لیکن آن کے سیاسی تصورات میں وہ بیداری و زور اور ایسی گرج اور چمک نہیں پائی جاتی جو جوش ' مجاز یا فیض وغیرہ کے یہاں ہے ۔ اس کی وجہ غالباً یہی معلوم ہوتی ہے کہ وہ ان مسائل کو رومانیت کے نظریہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور رومانی عنصر کے غالب ہونے کے باعث سیاسی حقیقت ایک آواز باز گشت کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آنھوں نے دور حاضر کے سیاسی و سماجی مسائل کو اپنی منظومات میں جگہ دی ہے ۔

حضرت روش کی نظموں کی نمایاں خصوصیت آن کا تغزل اور روانی ہے اور ان خصوصیات کے تحت آن کی اکثر نظمیں بہت ھی قابل قدر ہیں ۔ اس سلسلے میں آن کی ایک رومانی نظم کا یہ بند ملاحظہ فرمائیے ۔

کس نے جھانکا ہے شفق رنگ جھروکے سے مجھے
صبح کے چاک گریباں کو خبر ہو شاید

زندگی فرش قدم بن کے بچھی جاتی ہے
آ گہی حسرت دیدار ہوئی جاتی ہے
کیوں یہ پیشانئی احساس جھکی جاتی ہے
حیرت عالم امکاں کو خبر ہو شاید

اس ایک بند سے ھی بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آن کے رنگ سخن میں تغزل کس قدر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے ۔ وہ محبت کی دنیا میں سرشار ہونے کی کیفیت کو اس خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ آن کے مقابلہ میں کم لوگ پیش کئے جا سکتے ہیں ۔ آن کے اسلوب میں بلا کی دل نشینی ہے اور اس دل نشینی میں نرم ' لطیف اور مترنم الفاظ و تشبیہات کی بہتات اور بھی اضافہ کر دیتی ہے ۔ لیکن بڑی حیرت کی بات ہے ۔ کہ ان گونا گوں اوصاف کا حامل ہونے کے باوجود حضرت روش نے اپنا مجموعہ کلام اب تک نہیں چھپوایا حالانکہ آن کا جتنا کلام مختلف رسائل میں منتشر پڑا ہے کم از کم وہی اتنا ہے کہ ایک سے زائد مجموعے ضرور چھپ سکتے ہیں ۔

انتخاب کلام

تغزل

ترے مذاق نے کیا کیا دکھائے ہیں عالم
ترا مذاق ہی اے کاش جاوداں ہوتا
جو میں کرم نہ سمجھتا ، ترے تغافل کو
تو بار بار یہ دل مجھ سے بد گماں ہوتا
ہزار طُور نگاہوں نے کر لئے پیدا
حجاب آن سے بالاخر کہاں کہاں ہوتا

عشق کو داغِ دلِ زیست سمجھنے والے
دونوں عالم سے بھی یہ داغ مٹایا نہ گیا
کس کس عنواں سے بھلانا انہیں چاہا تھا ''روش''
کسی عنواں سے مگر آن کو بھلایا نہ گیا

ذوق یقیں نے کفر کو ایماں بنا دیا
جس در پہ سر جھکا در جاناں بنا دیا
کیا کیا خیال زینت آغوش شوق تھے
تم نے تو سب کو خواب پریشاں بنا دیا
یہ بھی سب آن کا حسن نوازش ہے اے ''روش''
غم ہی کو چارۂ غم پنہاں بنا دیا

وسعتیں پاتا گیا ذوق لطافت جس قدر
میں بعید جلوہ ہائے رنگ و بو ہوتا رہا

منتظر ہیں ابھی تیرے لئے لاکھوں جلوے
تو ذرا وسعت دامان نظر پیدا کر

بہت بلند ہے دل کا مقام خود داری — مگر شکست کا امکاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
گزر چکی تری کشتی ہزار طوفاں سے — ہنوز حسرت طوفاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

وہ کوئی نالۂ غم ہو کہ نغمۂ عشرت — شکست دل کی صدا کے سوا کچھ اور نہیں

محبت ایک بڑا مدعا ہے فطرت کا — خبر بھی ہے کہ محبت کا مدعا ہے تو

شرف عطا جو کیا تو نے ہمکلامی کا — زمانہ منتظر داستاں ملا مجھ کو

غم وفا تو کہانی نہ تھا مگر اے دل — بتا دیا تری خاموشیوں نے افسانہ
وہ لب کھلیں تو بکھر جائیں نغمہ ہائے ارم — وہ آنکھ اٹھے تو برس جائے کیف میخانہ
ہوا نہ تکملۂ حسرتِ دلِ رنگیں — تمام عمر چھلکتا رہا یہ پیمانہ

مسافرِ رہِ اُلفت یہ شرط منزل ہے
کہ ہر قدم ہو ترا اور جہاں بے خبری
اب اشک دیدۂ بیتاب میں نہیں رکتے
ادھر نگاہ نہ کر اے ستارۂ سحری

غم پنہاں کی نہ ہو جائے کہیں پردہ دری
آہ ! رہنے دو یہ انداز پریشاں نظری
مجھ تک آتی تھی کہاں نکہت گیسوے نگار
وحشتِ عشق مبارک غم شوریدہ سری

بظاہر تو کوئی وجہ مسرت بھی نہیں ہوتی
یہ کیوں اکثر بہت شاداں دل نا شاد ہوتا ہے

دل گوارا نہیں کرتا ہے شکستِ اُمید
ہر تغافل پہ نوازش کا گماں ہوتا ہے

کچھ مرا حال سناتی ہے مری خاموشی
کچھ تری نیم نگاہی سے عیاں ہوتا ہے

وہ اک تسکیں جو اب تک چارہ ساز درد اُلفت تھی
وہ تسکیں بھی شریک درد اُلفت ہوتی جاتی ہے
خموشی سے بھی بار ترجمانی اُٹھ نہیں سکتا
بہت غمناک روداد محبت ہوتی جاتی ہے
''روشؔ'' اب ہم ہیں اور راز و نیاز سوز محرومی
بہت محبوب شمع شام فرقت ہوتی جاتی ہے

نگاہ ناز میں ہلکا سا رنگ ناتوانی ہے — محبت کی کہانی ہے محبت کی زبانی ہے
بسائی ہے وہ دنیا ایک ناکام محبت نے — جہاں ہر نامرادی میں جمال کامرانی ہے
کسی کا لطف پنہاں آنسوؤں میں مسکراتا ہے — مری ناشادمانی انتہائے شادمانی ہے

جس میں ہو یاد بھی تری شامل — ہائے اُس بے خودی کو کیا کہیئے
ہے وہی رنگ حسن بے پروا — عشق کی سادگی کو کیا کہیئے
کھینچ لے جائے جو ترے در تک — ایسی دیوانگی کو کیا کہیئے
آن پہ قربان ہستئ کونین — ایک مری نظر کو کیا کہیئے

اب عالم تغافل پنہاں کچھ اور ہے — ہر لمحہ رنگ شوق فراواں کچھ اور ہے
الطاف بر ملا کی تو کیا بات ہے مگر — رعنائی نوازش پنہاں کچھ اور ہے

جیسے کلیوں کا عالم محجوب — ہے کچھ ایسا ہی دوستی کا خلوص
موج خوشبوئے التفات آمیز — اس تغافل کی سادگی کا خلوص
پھر غنیمت ہے میکدے میں روشؔ
کم سے کم رند مشربی کا خلوص

لب مینا پہ تھی کس شوخ کی بات — بہک نکلے ہیں رندانِ خوش اوقات
وہاں ہیں اب اسیران خرابات — جہاں ہے ہر قدم کشف الحجابات

زمانہ تھا، نہ ارباب زمانہ — یہ کس عالم میں گزرے چند لمحات
زباں چپ ہے مگر خاموش آنکھیں — کہے دیتی ہیں صدیوں کی حکایات
مری پلکوں پہ آب آنسو کہاں ہیں — یہ کیوں افسردہ ہے تاروں بھری رات

''روش''جادو تو کیا ہوتا غزل میں
مگر خوباں سے تقریب ملاقات

توڑ کر اٹھے ہیں جام و شیشہ و پیمانہ ہم
کس سے کہہ دیں آج راز نرگس مستانہ ہم
بجلیاں روپوش، طوفاں دم بخود، صحرا خموش
جا رہے ہیں کس طرف اے لغزش مستانہ ہم
اور جو کچھ ہے وہ سب آرائش افسانہ ہے
تو ہے افسانہ ہمارا اور ترا افسانہ ہم
زندگی اک مستقل شرح تمنا تھی مگر
عمر بھر تیری تمنا سے رہے بیگانہ ہم
تجھ میں بھی کچھ ہوشمندانہ ادائیں آ گئیں
تجھ سے بھی اب بد گماں ہیں اے دل دیوانہ ہم
خشک آنکھیں، دل شکستہ، روح تنہا، لب خموش
بستیوں میں دیکھتے ہیں صورت ویرانہ ہم

ہم تک اب آئے نہ آئے دور پیمانہ ''روش''
مطمئن بیٹھے ہیں زیر سایۂ میخانہ ہم

کیوں تشنۂ شوق تک رہے ہیں — ساقی کے قدم بہک رہے ہیں
خوشبوئے حبیب ہے خراماں — سب ارض و سما سہک رہے ہیں
خونابہ فشاں ہیں دیدہ و دل — کیا جام و سبو چھلک رہے ہیں
بس ایک ہی سمت ہیں نگاہیں — ہر چند قدم بھٹک رہے ہیں

ہجوم تمنا سے کیا ہو گیا — وہ کچھ اور نا آشنا ہو گیا
چلے تھے زمانے سے منہ پھیر کر — یکایک ترا سامنا ہو گیا
تغافل میں بھی اس قدر احتیاط — تری بے نیازی کو کیا ہو گیا

وھیں لٹ گیا کاروان حیات　　　جہاں سے ترا غم جدا ہو گیا
یہاں ایک سے ایک اجنبی ہے　　　الہی زمانے کو کیا ہو گیا

منظومات

شاھد معصوم

بھول جا ! اے شاھد معصوم مجھ کو بھول جا !

محفل آرائے وفا تو اور میں ننگ وفا
دل مرا تاریک ہے تو بحر انوار و ضیا
رہرو منزل ہوں میں اور تو ہے گردوں آشنا

نور تیری ابتدا ہے خاک میری انتہا
بھول جا ! اے شاھد معصوم مجھ کو بھول جا !

میرے آنسو تیرے زریں ہار کے قابل نہیں
میرے داغ دل ترے گلزار کے قابل نہیں
تیری الفت آہ ! میرے پیار کے قابل نہیں

یعنی میں تیری محبت کے لئے ہوں ناسزا
بھول جا ! اے شاھد معصوم مجھ کو بھول جا !

جلوہ گاہ زندگی تیرے لئے حیراں رہے
عظمت کونین تیرے نام پر قرباں رہے
اور تو اک بے نوا کی یاد میں نالاں رہے

کچھ نہیں کھلتا محبت نے تجھے کیا کر دیا
بھول جا ! اے شاھد معصوم مجھ کو بھول جا !

تو نگار عفت و عصمت ہے آوارہ ہوں میں
تو مقیم جلوہ گاہ راز اور رسوا ہوں میں
آہ ! کب تیری محبت کے لئے زیبا ہوں میں

کچھ تو اپنے عشق کی معصومیوں پر رحم کھا
بھول جا ! اے شاھد معصوم مجھ کو بھول جا !

ایک ساعت کے لئے حاصل مجھے راحت نہیں
میرے ساز زندگی میں نغمۂ عشرت نہیں
آہ ! میں نا شاد ہرگز قابلِ اُلفت نہیں
ایک ننگ زندگی کا غم کرے تیری بلا
بھول جا ! اے شاہد معصوم مجھ کو بھول جا !

میری اُلفت میں نہ اپنی راحتیں نا شاد کر
میرے غم میں یوں نہ اپنی ہر خوشی برباد کر
میں تو اک خواب پریشاں ہوں نہ مجھ کو یاد کر
چھوڑ دے میرے لئے یہ رات بھر کا جاگنا
بھول جا ! اے شاہد معصوم مجھ کو بھول جا !

فطرت رنگیں کو تو اے دلربا محبوب ہو
قدسیوں کو تیرا انداز حیا محبوب ہو
آہ ! ہر محبوب کو تیری ادا محبوب ہو
اور تیرے دل کا ہو محبوب اک غم آشنا
بھول جا ! اے شاہد معصوم مجھ کو بھول جا !

ڈر رہا ہوں تیرا راز عشق افشا ہو نہ جائے
محرم اسرار خاموشی یہ دنیا ہو نہ جائے
ضبط غم ہمرنگ محزونِ تمنا ہو نہ جائے
آہ ! کیا ہو گا اگر یہ راز پنہاں کھل گیا
بھول جا ! اے شاہد معصوم مجھ کو بھول جا !

گر کسی سے تیرا ذکر عشق سن پاؤں گا میں
منہ چھپا کر بزم ہستی سے نکل جاؤں گا میں
آہ ! پھر تجھ کو نہ دنیا میں نظر آؤں گا میں
گر تجھے مجھ سے محبت ہے تو دے مجھ کو بھلا
بھول جا ! اے شاہد معصوم مجھ کو بھو جا !

روشنی

دیکھ کر دیدۂ گیتی میں فروغ اُمید
مطمئن ہوں کہ بہت جلد وہ دور آئے گا

جسے گردوں نے ستاروں میں چھپا رکھا ہے
کہکشاں نے جسے اک راز بنا رکھا ہے
قدسیوں نے جسے انساں سے چھپا رکھا ہے

ختم ہونے کو ہے افسانۂ محرومئ دید
اب یہ پردہ رخ امکاں سے سرک جائے گا

ہاں وہی دور وہی عہد مسرت بنیاد
جس کو روح غم پنہاں نے کیا ہے تعمیر

وہی عالم وہی مسجود جبینِ ایام
وہی آغاز کہ جس کا نہیں کوئی انجام
وہی جنت وہی کیف ابدی کا پیغام

چشم آدم میں جو تھا صبح ازل سے آباد
مسکراتا ہے وہی خواب بہ شکل تعبیر

یہ سکوں اور یہ شب ہائے غلامی کا فسوں
زور طوفانِ تغیّر سے بکھر جائے گا

وقت توڑے گا روایات کے بت خانوں کو
غرق کر دے گا کمالات کے ایوانوں کو
پھونک دے گا در ظلمت کے نگہبانوں کو

ہے یہ مژدہ کہ پس معرکہ آتش و خوں
چہرۂ عالم ایجاد نکھر جائے گا

جس تصوّر پہ غلامان خرد تھے مغرور
وہ جہاں سوز تصور ہے چراغ سحری

اب گریبانِ تمرّد میں رفو ناممکن
تن بے روح میں تجدید نمو ناممکن
رنگ لائے نہ صداقت کا لہو ناممکن

جلوہ گر لوح تغیّر پہ ہے یہ آیت نور
کہ گرا چاہتا ہے خیمۂ بیداد گری

خوش ہو اے دوست کہ وہ دور بہار آتا ہے
جس کو نزدیک خزاں کر نہ سکے گا انسان

شکل نفرت نہ جہاں میں نظر آئے گی کبھی
موج بیگانہ وشی سر نہ اٹھائے گی کبھی
غیرت آ آ کے ہمیں منہ نہ دکھائے گی کبھی

اب زمیں پر در یزداں سے وہ پیار آتا ہے
کہ جسے نذر زیاں کر نہ سکے گا انسان

ساقی

دیکھ وہ عرش سے نازل ہوئی شام اے ساقی
ہے اب اک لمحہ بھی تا خیر حرام اے ساقی
زندگی ہے شب تاریک نہ ہو جائے کہیں
لا ! مہ و مہر سے ترشا ہوا جام اے ساقی
تیری صہبا خم و مینا و سبو توڑ گئی
کہ یہ شمشیر تھی بیزارِ نیام اے ساقی
اب تری نرگسِ مخمور کا ایما کیا ہے
آج تو بزم میں ہے لغزش عام اے ساقی

اب وہ مے دے کہ جو ہو تمکنت افروز خودی
سخت برہم ہے زمانے کا نظام اے ساقی
میں نے صدیوں سے نہ دیکھا تھا کبھی روز غریب
اب وہ خورشید خرد ہے لب بام اے ساقی
علم موجود کے ایوان کا اب حال یہ ہے
جیسے طوفاں میں کوئی کشتئ خام اے ساقی
ٹھوکروں میں سرِ پندارِ خرد ہے پامال
رخش تخریب ہے آزادِ زمام اے ساقی

جس نے کاشانۂ انساں کو کیا تھا ویراں
اب وہ تہذیب ہے ویرانِ دوام اے ساقی
جس نے صہبائے محبت کو کیا زہر آلود
آج اس زہر سے ہے مرگ بجام اے ساقی

جو غم عشق کی عظمت کو سمجھتا تھا حرام
اُس پہ ہر لمحۂ راحت ہے حرام اے ساقی
ماجرا ذلّت تزویرِ تمدن کا نہ پوچھ
جیسے رسوا کوئی ناظورۂ بام اے ساقی

آگ اور خون کے طوفاں ہیں بر افگندہ نقاب
آج بے پردہ ہے دوزخ کا مقام اے ساقی
خود کہے دیتی ہے خاکستر تہذیب فرنگ
کون تھا سوختۂ آتشِ خام اے ساقی
گر یہ ہے ہوش پرستی کی سزا کا آغاز
کیا ہو اب دیکھئے پاداش تمام اے ساقی
علم کہتا ہے جسے قاصد اقلیم فنا
زلف بردوش ہے وہ ظلمت عام اے ساقی

اب ترے در پہ زمانہ ہے طلبگار سکوں
کہ یہی در تو ہے محبوب انام اے ساقی
یہیں ملتی ہے محبت کی ہواؤں کو حیات
لمحہ لمحہ ہے یہاں خلد مشام اے ساقی
داغ غم تیرے سوا کون مٹا سکتا ہے
مہر تاباں نہ کوئی ماہ تمام اے ساقی
تیرے میخانے سے اٹھتی ہوئی ایک ایک کرن
ہے سکونِ دلِ انساں کا پیام اے ساقی

عام ہے اسود و احمر پہ ترا جُود و کرم
سب کی دولت ہے تری رحمت عام اے ساقی

کچھ یہاں مشرق و مغرب کی نہیں ہے تخصیص
سب کو ملتا ہے ترے ہاتھ سے جام اے ساقی

تو نے علم و عمل و عشق کو بخشا وہ سرور
کہ جو ہے عرش پہ مصروف خرام اے ساقی

جس سے ہستی بھی ہے سرشار ، فنا بھی مدھوش
تری صہبا میں ہے وہ کیفِ تمام اے ساقی

ن م ۔ راشد

نذر محمد نام راشد تخلص یکم اگست ۱۹۱۰ء میں پنجاب میں پیدا ہوئے ۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے اقتصادیات میں ایم ۔ اے پاس کیا ۔ تقسیم ہند سے پہلے آل انڈیا ریڈیو میں ملازم رہے ۔ قیام پاکستان کے بعد سے ریڈیو پاکستان پشاور میں تھے ۔ اواخر ۱۹۵۳ء میں ریڈیو امریکہ نے آردو پروگراموں کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں انکی خدمات حاصل کر لی ہیں چنانچہ آج کل راشد صاحب نیویارک میں قیام پذیر ہیں ۔

راشد عصر حاضر کے آن نوجوان شعرا میں سے ہیں جنہوں نے آردو شاعری کی روایات سے بغاوت کر کے مادہ و ہیئت ہر دو اعتبار سے ایک نئے تجربے کا ثبوت دیا ہے ۔ ہمیں آنکی شاعری میں اپنی مروجہ شاعری کے مقابلہ میں داخلی و خارجی اور فنی و فکری ہر لحاظ سے ایک مکمل انحراف ملتا ہے ۔ یوں تو بے قافیہ نظمیں عبدالحلیم شرر اور اسماعیل میرٹھی نے بھی کہی ہیں مگر راشد کی ''نظم آزاد'' اپنے اسلوب فکر و بیان اور اپنے مخصوص آہنگ و تاثیر کے لحاظ سے بالکل مختلف چیز ہے ۔ آنکی نظم میں ردیف و قافیہ کا التزام نہیں ہوتا اور اگر کہیں ہوتا بھی ہے تو کسی مسلمہ قاعدے کے ماتحت نہیں ۔ ساتھ ہی آن میں کوئی مسلمہ وزن بھی نہیں پایا جاتا ۔ علاوہ ازیں وہ زبان میں بھی جدت سے کام لیتے ہیں آنھوں نے نئے الفاظ ' تراکیب ' تشبیہات و استعارات استعمال کئے ہیں اور پرانے الفاظ کو نئے معنی بھی پہنانے کی کوشش کی ہے جسکا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آنکی نظمیں اکثر پڑھنے والوں کے لئے مبہم ہو جاتی ہیں ۔ چنانچہ آنکی تصنیف ''ماورا'' میں کرشن چندر نے راشد اور آنکی شاعری کا تعارف کراتے ہوئے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ ''فنی نقطۂ نگاہ سے راشد ایک صحیح باغی شاعر ہے ۔ آس کا تخیل ہمیشہ ہماری موروثی زبان کے الفاظ آنکے معانی ' اسالیب بیان ' بندشوں اور تراکیب کو توڑتا ' پگھلاتا ' آنہیں نئے سانچوں میں ڈھالتا ' نئی صورتیں دیتا اور آن میں سے نئے مطالب کشید کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے ۔ آسکی شاعری میں نفسیاتی تحلیل اور جذباتی تسلسل ساتھ ساتھ چلتے ہیں ۔ اور ان دونوں کے ہم آہنگ ہونے سے ایک آزاد تسلسل کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ ''آزاد تسلسل راشد کا خاص انداز ہے ۔ اسکی مثالیں آنکی اکثر نظموں میں ملتی ہیں ۔ اس سے آنکی نظموں میں ایک خاص ایجاز و جامعیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ جو عہد حاضر کے بہت کم شاعروں کو نصیب ہے ۔ اکثر اوقات آسکے ذہن لاشعور کی

کھینچی ہوئی تصویریں صرف عامیوں ہی کی نہیں بلکہ عہد حاضر کے اکثر شعرا کی ذہنی تصویروں سے مختلف ہوتی ہیں اور اس لئے وہ اُن کے سمجھنے میں دقت محسوس کرتے ہیں۔ یہ تصویریں اتنی برق رفتاری سے ذہن لاشعور سے کھنچتی چلی آتی ہیں کہ ان میں فوری طور پر کسی تسلسل کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے راشد کی اکثر نظمیں مبہم سمجھی جاتی ہیں'' اور اس ابہام کا سبب اُنہوں نے ہمارے تیزی سے بدلتے ہوئے معاشرتی ماحول کو بتایا ہے۔ لیکن دیانتداری کی بات یہ ہے کہ کرشن چندر صاحب کی یہ توجیہہ کچھ سمجھ میں نہیں آتی بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ اسی بے حد تیز رفتاری سے بدلتے ہوئے تہذیبی و معاشرتی ماحول سے اقبال کو چھوڑ کر خود موجودہ شعرا میں جوش، فیض، قاسمی اور نہ جانے کتنے معروف و مقبول شعرا موجود ہیں اور اُنہوں نے روایت سے بغاوت کا بھی ثبوت دیا ہے۔ اُنکے اُسلوب بیان میں ایسا شدید ابہام نہیں پایا جاتا جتنا راشد کی نظموں میں ہے۔ بہرنوع اس بحث کا یہاں موقع نہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اُنکی بیشتر نظموں میں پڑھنے والا بڑی اُلجھن محسوس کرتا ہے اور شاعر کا مافی الضمیر اُسکی سمجھ میں نہیں آتا۔

راشد کی ''ماورا'' اور اسکے بعد کی نظموں میں تین طرح کی نظمیں ہیں۔ (۱) نیم آزاد (۲) آزاد (۳) سانٹ

آخرالذکر اس انگریزی صنف نظم کا نام ہے جس میں قوافی کا ایک خاص التزام ہوتا ہے اور مصرعوں کی تعداد ہمیشہ چودہ ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ راشد صاحب نے اُردو فارسی قوافی کے التزام سے تو گریز کیا ہے لیکن انگریزی التزام کا جوا اپنے کاندھوں پر لاد کر کسی مستحسن اجتہاد کا ثبوت نہیں دیا۔

جہاں تک اُن کے کلام کے مجموعی تاثر کا تعلق ہے اُنکی اکثر نظمیں قاری کے ذہن پر کوئی صحت مند اثر مترتب نہیں کرتیں چونکہ اُنکے یہاں موت، خود کشی، افسردگی اور فرار کی خاص تکرار پائی جاتی ہے۔ زندگی اُن کے لئے زہر بھرا جام ہے اور ارض مشرق کی روح بالکل مردہ و بے جان، جسے شاعر کے نزدیک قطعی طور پر مر جانا چاہئے۔ ان تصورات کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اُنکے یہاں ایک اعصابی تکان، ذہنی جمود شکستہ ایمانی اور حد سے زیادہ احساس کمتری نے غلبہ پا لیا ہے۔ ظاہر ہے ایسی ذہنی پراگندگی اور شدید انتشار کی صورت میں اُن سے کسی منظم مربوط اور توانا و صالح تصور کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔ یہ الگ بات ہے کہ راشد صاحب بڑے ذہین و ذکی الحس انسان واقع ہوئے ہیں اور اُنہیں شاعری میں خیال کے ساتھ ساتھ مروجہ اسالیب بیان کی اہمیت کا بھی اندازہ ہے لیکن کیا کیا جائے کہ ایک طرف تو سارے جہان کا درد اُنکے جگر میں ہے دوسری طرف وہ مروجہ اسالیب کے برتنے میں قطعی طور پر ناکام رہے ہیں (اُنکی غزلیں اس کی شاہد ہیں)۔ بہر حال قطع نظر ان تمام باتوں کے وہ اس دور کے سب سے زیادہ منفرد شاعر ہیں اُنکے انداز میں ایک اعتماد، لہجے میں تیقن، اظہار میں زور اور پھیلاؤ پایا جاتا ہے۔ اُنکی ہر نظم کے موضوع، اُسکے اجزائے ترکیبی، اظہار خیال اور ایک ایک لفظ کی نشست سے انفرادیت ٹپکتی ہے۔ ''ماورا'' کے بعد کی نظموں میں شدت جذبات میں بہت ہی زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اُنکی یہ نظمیں موضوع کے لحاظ سے

بھی بڑی متنوع ہیں ۔ ان میں مختلف ملکوں خاص طور پر مشرق وسطیٰ کے سیاسی و سماجی مسائل کا ذکر ہے ۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ راشد نے ان میں اپنے تمام تجربات ' سیر و سیاحت ' میل ملاقاتیں ' عشق اور محبت ' اُمیدیں و خدشات پورے خلوص کے ساتھ منعکس کرنے کی کوشش کی ہے ۔

راشد نے ''ماورا'' کے بعد چند غزلیں اور بیشتر نظمیں کہی ہیں ۔ آن کی جو نظمیں وقتاً فوقتاً رسائل میں چھپتی رہی ہیں حسب ذیل ہیں ۔

زنجیر — پہلی کرن — خرابے — داشتہ — سرگوشیاں

(یہ نظمیں ماورا کے دوسرے ایڈیشن میں شامل کر لی گئی ہیں)

اسکے علاوہ سومنات — ایران میں اجنبی (طویل نظم) — رقص کی رات ۔ طلسم ازل — ظلم رنگ — کشاکش — ویران کشید گاہیں — ایک شہر — سوغات — سبا — ویراں وغیرہ ہیں ۔

انتخاب کلام

رقص

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں
ڈر سے لرزاں ہوں کہیں ایسا نہ ہو
رقص گہ کے چور دروازے سے آ کر زندگی
ڈھونڈ لے مجھ کو نشاں پالے مرا
اور جرم عیش کرتے دیکھ لے !

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
رقص کی یہ گردشیں
ایک مبہم آسیا کے دور ہیں
کیسی سر گرمی سے غم کو روندتا جاتا ہوں میں
جی میں کہتا ہوں کہ ہاں '
رقص گہ میں زندگی کے جھانکنے سے پیشتر
کلفتوں کا سنگریزہ ایک بھی رہنے نہ پائے !

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی میرے لئے
ایک خونیں بھیڑیے سے کم نہیں
اے حسین و اجنبی عورت اسی کے ڈر سے میں
ہو رہا ہوں لمحہ لمحہ اور بھی تیرے قریب
جانتا ہوں تو مری جاں بھی نہیں
تجھ سے ملنے کا پھر امکاں بھی نہیں
تو مری ان آرزوؤں کی مگر تمثیل ہے
جو رہیں مجھ سے گریزاں آج تک!
اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
عہد پارینہ کا میں انساں نہیں
بندگی سے اس در و دیوار کی
ہو چکی ہیں خواہشیں بے سوز و رنگ و ناتواں
جسم سے تیرے لپٹ سکتا تو ہوں
زندگی پر میں جھپٹ سکتا نہیں
اس لئے اب تھام لے
اے حسین و اجنبی عورت مجھے اب تھام لے!

زنجیر

گوشۂ زنجیر میں
اک نئی جنبش ہویدا ہو چلی
سنگ خارا ہی سہی، سنگ مغیلاں ہی سہی
دشمن جاں، دشمن جاں ہی سہی
دوست سے دست و گریباں ہی سہی
یہ بھی تو شبنم نہیں
یہ بھی تو مخمل نہیں، دیبا نہیں، ریشم نہیں

ہر جگہ پھر سینۂ نخچیر میں
اک نیا ارماں، نئی امید پیدا ہو چلی

حجلۂ سیمیں سے تو بھی پیلۂ ریشم نکل
وہ حسیں اور دور اُفتادہ فرنگی عورتیں
تو نے جن کے حسن روز افزوں کی زینت کے لئے
سالہا بے دست و پا ہو کر بُنے ہیں تارہائے سیم و زر
اُس کے پردوں کے لئے بھی آج اک سنگین جال
ہو سکے تو اپنے پیکر سے نکال

شکر ہے دنبالۂ زنجیر میں
اک نئی جنبش نئی لرزش ہویدا ہو چلی
کوھساروں ریگ زاروں سے ندا آنے لگی
ظلم پرورده غلامو ! بھاگ جاؤ
پردۂ شب گیر میں اپنے سلاسل توڑ دو
چار سو چھائے ہوئے ظلمات کو اب چیر جاؤ
اور اس ھنگام بار آورد کو
حیلۂ شب خوں بناؤ

خودکشی

کر چکا ہوں آج عزم آخری ———
شام سے پہلے ھی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوک زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
رات کو جب گھر کا رخ کرتا تھا میں
تیرگی کو دیکھتا تھا سرنگوں
منہ بسورے ، رھگذاروں سے لپٹتے ، سوگوار !
گھر پہنچتا تھا میں انسانوں سے اکتایا ہوا
میرا عزم آخری یہ ھے کہ میں
کود جاؤں ساتویں منزل سے آج !
آج میں نے پالیا ھے زندگی کو بے نقاب
آتا جاتا ہوں بڑی مدت سے میں

ایک عشوہ ساز و ہرزہ کار ۱محبوبہ کے پاس
اس کے تخت خواب کے نیچے مگر
آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو
تازہ ، درخشاں لہو ،
بوئے مے میں بوئے خوں اُلجھی ہوئی !
وہ ابھی تک خواب گہ میں لوٹ کر آئی نہیں
اور میں کر بھی چکا ہوں آج اپنا عزم آخری !
جی میں آئے ہے لگا دوں ایک بے باکانہ جست
اس دریچے میں سے جو
جھانکتا ہے ساتویں منزل سے کوئے و بام کو
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوک زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک یہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
آج تو آخر ہم آغوش زمیں ہو جائے گی ۔

ظلم رنگ

''یہ میں ہوں''
''اور یہ میں ہوں !''
یہ دو میں ایک سیم نیلگوں کے ساتھ آویزاں
ہیں شرق و غرب کے مانند
لیکن مل نہیں سکتے !
صدائیں رنگ سے نا آشنا
اک تار ان کے درمیاں حائل !

مگر وہ ہاتھ جن کا بخت
مشرق کے جواں سورج کی تابانی
کبھی ان نرم و نازک ، برف پروردہ حسیں باہوں
کو چھو جائیں ،

۱مراد زندگی

محبت کی کمیں گاہوں کو چھو جائیں
یہ نا ممکن ! یہ نا ممکن !
کہ ''ظلم رنگ'' کی دیوار ان کے درمیاں حائل !

''یہ میں ہوں''
''اور یہ میں ہوں''
انا کے زخم آلودہ ، ہر پردے میں ،
ہر پوشاک میں عریاں
یہ زخم ایسے ہیں جو اشک ریا سے سل نہیں سکتے
کسی سوچے ہوئے حرف وفا سے سل نہیں سکتے !
(نیویارک)

پہلی کرن

کوئی مجھ کو دور زمان و مکاں سے نکلنے کی صورت بتا دو !
کوئی یہ سجھا دو کہ حاصل ہے کیا ہستئی رائیگاں سے ؟
کہ غیروں کی تہذیب کی استواری کی خاطر
عبث بن رہا ہے ہمارا لہو مومیائی !
میں اس قوم کا فرد ہوں جس کے حصے میں محنت ہی محنت ہے
نان شبینہ نہیں ہے
اور اس پر بھی یہ قوم دل شاد ہے شوکت پاستاں سے
اور اب بھی ہے امید فردا کسی ساحر بے نشاں سے
مری جاں ، شب و روز کی اس مشقت سے تنگ آ گیا ہوں
میں اس خشت کوبی سے اکتا گیا ہوں
کہاں وہ دنیا کی تزئین کی آرزوئیں
جنھوں نے تجھے مجھ سے وابستہ تر کر دیا تھا
تری چھاتیوں کا جوئے شیر کیوں زہر کا اک سمندر نہ بن جائے
جسے پی کے سو جائے ننھی سی یہ جاں
جو اک چھپکلی بن کے چمٹی ہوئی ہے ترے سینۂ مہرباں سے
جو واقف نہیں تیرے درد نہاں سے
اسے بھی تو ذلت کی پائندگی کے لئے آلۂ کار بننا پڑے گا

بہت ہے کہ ہم اپنے آبا کی آسودہ کوشی کی پاداش میں آج
بے دست و پا ہیں
اس آئندہ نسلوں کی زنجیر پا کو تو ہم توڑ ڈالیں !
مگر اے مری تیرہ راتوں کی ساتھی !
یہ شہنائیاں سن رہی ہو ؟
نہیں اس دریچہ کے باہر تو جھانکو
خدا کا جنازہ لئے جا رہے ہیں فرشتے
اسی ساحر بے نشاں کا
جو مغرب کا آقا ہے مشرق کا آقا نہیں ہے !
یہ انسان کی برتری کے لئے اک نئے دور کے شادیانے ہیں سن لو
یہی ہے نئے دور کا پرتو اولیں بھی
اٹھو اور ہم بھی زمانہ کی ولادت کے اس جشن میں مل کے
دھومیں مچائیں
شعاعوں کے طوفان میں بے محابا نہائیں !

مجاز

اسرار الحق نام مجاز تخلص ۱۹۱۱ء میں اپنے وطن قصبہ رُدولی ضلع بارہ بنکی (اودھ) میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے والد شیخ سراج الحق صاحب کا شمار قصبہ کے سر بر آوردہ اور معزز لوگوں میں ہوتا ہے اور چونکہ آپ ججی کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے اس لئے آپ کا قیام زیادہ تر لکھنؤ میں رہا ۔ یہیں مجاز کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی پھر ۱۹۳۶ء میں علیگڈھ یونیورسٹی سے بی ۔ اے پاس کرنے کے بعد وہ کچھ دنوں آل انڈیا ریڈیو دھلی میں اور کچھ دنوں حکومت بمبئی کے محکمہ اطلاعات میں ملازم رہے ۔ اس کے بعد ''حلقہ ادب'' لکھنؤ کے سرگرم کارکنوں اور ''نیا ادب'' کے ادارہ میں رہ کر ہارڈنگ لائبریری دھلی میں ملازم ہوئے ۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہاں سے بھی نکل کھڑے ہوئے اور جب سے اب تک سوائے شعر و شاعری کے کوئی دوسرا مشغلہ نہیں ہے ۔

مجاز کی شاعری بیسویں صدی کے ربع اول کے بعد کی پیداوار ہے ۔ اور اس میں اپنے ماحول کے بڑے گہرے اثرات پائے جاتے ہیں ۔ یوں فطرتاً مجاز ایک رومانی شاعر ہیں لیکن ایک حساس شاعر ہونے کی حیثیت سے اُنہوں نے ملکی حالات کا جو اثر قبول کیا اُس کی بدولت اُن کی شاعری میں ایک انقلابی رنگ پیدا ہو گیا ہے ۔ اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں مجاز کے ہاں ساز و جام زیادہ اور شمشیر کم ہے لیکن آہستہ آہستہ یہ تناسب بدل رہا ہے اور بہت ممکن ہے کہ اگر مجاز نے تھوڑے ریاض اور ذہنی و جذباتی یکسوئی سے کام لیا تو کچھ عرصہ کے بعد اُن کی شاعری نہ صرف اچھی انقلابی شاعری کا عمدہ نمونہ بن جائے گی بلکہ اُس میں وہ عظمت و رفعت بھی پیدا ہو جائے گی جو اعلیٰ شاعری کی ضمانت سمجھی جاتی ہے ۔

مجاز کے کلام کی سب سے بڑی خوبی اُس کی حد درجہ غنائیت ہے ۔ جو اس دور کے عام غنائی شعرا کے محض جوانی کے دو چار ذاتی تجربات کی ترجمانی تک محدود نہیں بلکہ اس میں زیادہ وسعت ، زیادہ گہرائی اور زیادہ مستقل مسائل سے اتصال پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ مجاز کے رنگ میں ترقی کے امکانات ہیں اور اُس میں تھکن کے بجائے مستی اور اُداسی کے بجائے سرخوشی قائم اور برقرار ہے ۔ اس کے علاوہ اُن کی رومانی شاعری میں جہاں جہاں رمزیت ، اشاریت ، داخلیت اور وجدانی عمق پوری تابناکی سے سمویا ہوا ہے وہاں اُن کے ہر شعر میں جذبات کی گہرائی اور لہجہ میں بڑا ضبط و توازن ملتا ہے اور یہی وہ شاعری ہے جس کے سہارے مجاز آج تک زندہ ہیں اور عرصہ تک زندہ رہیں گے ۔

مجاز کی انقلابی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ صرف انقلاب کا ڈھنڈورہ نہیں اور نہ ہی اُس میں انقلاب کا محض ہولناک نقشہ ہی کھینچا گیا ہے بلکہ وہ انقلاب کا ایک ایسا نغمہ ہے جس میں رنگینئی بہار کی عبارت آرائی اور تاثر آفرینی بھی موجود ہے ۔ بالفاظ دیگر مجاز انقلاب کا مطرب ہے اور اُس نے حسن کے پردوں سے انقلاب کو دیکھ کر جو راگ الاپا ہے اُس میں نئی اُردو شاعری کی وہی جاذب توجہ لے پائی جاتی ہے جسے ہم فیض و جذبی کے یہاں پاتے ہیں ۔ البتہ اس راہ سے ہٹ کر جہاں مجاز نے خطابت سے کام لیا ہے یا عدل و حق کی کشتی کو ڈوبنے سے بچانے کا دعویٰ کیا ہے وہاں وہ انقلاب کے سطحی تصور میں گم ہو کر رہ گیا ہے اور اُس کے اشعار میں وہی روائتی مار دھاڑ ، توپوں کی گرج ، گولیوں کی سنسناہٹ ، بگل کی آواز وغیرہ جیسی چیزوں کا تذکرہ ہونے لگتا ہے ۔ جسے سوائے سستی جذبات پرستی کے اور کیا کہا جا سکتا ہے ۔

البتہ مجاز کی شاعری میں جہاں کشمکش اور ذاتی و خارجی تقاضوں میں تصادم پیدا ہوا ہے وہاں اُس کی شاعری میں کافی نکھار پیدا ہوگیا ہے ۔ ''آوارہ'' اس کی بہترین مثال ہے ۔ یہ ایک بڑی نفسیاتی نظم ہے جس میں ایک طرف حسن کی پکار ، دوسری طرف غلامی کی زنجیریں ، ایک طرف ماحول ناسازگار دوسری طرف انسانیت پر ظلم و تعدی کی ناقابل برداشت بارش دکھائی دیتی ہے مگر انقلاب لانے کی نہ تو قوت ہے اور نہ اسباب اس لئے ''کیا کروں'' کا فطری سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور پوری نظم ایک کشمکش ، اضطرار اور اُلجھن کی عکاسی کرتی ہے ۔ اس طرح گویا اس نظم میں آج کے انسان کی ذہنی کشمکش کی بڑی اچھی ترجمانی پائی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس میں ایک عام اپیل بھی ہے ۔

مجاز کی شاعری کے سلسلے میں سچ مچ اگر جوش جو اُن کے معنوی اُستاد ہیں ، کا تذکرہ نہ کیا جائے تو بات نہیں بنتی ۔ حقیقت یہ ہے کہ مجاز کا فن جوش کا فن ہے جس میں موزوں ترین سلیقہ سے ڈھلے ہوئے الفاظ ، شعری تصاویر ، مناسب ترین تشبیہات و استعارات اور جھنکار موجود ہے ۔ ظاہر ہے یہ خوبیاں بڑی حد تک جوش ہی کے فیضان صحبت کا نتیجہ ہیں اور انہیں خصوصیات کے بل بوتے پر خود جوش کا فن برقرار ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ مجاز کے شاعرانہ اسلوب میں وہ پختگی پیدا نہیں ہوئی جو جوش کا طرۂ امتیاز ہے لیکن اس کی جھلک ضرور پائی جاتی ہے اور آئندہ اس کے بڑھنے کے امکانات ہیں ۔

مجاز کے کلام میں حد درجہ روانی ، گھلاوٹ اور شیرینی پائی جاتی ہے ۔ علاوہ ازیں جوانی کی اُمنگ اور سرمستی نے اُن کی شاعری کو ایک خاص دلکشی بخشی ہے ۔ اُن کا پہلا مجموعہ کلام ''آہنگ'' کے نام سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا ۔ اس میں کچھ نظموں کا اضافہ کر کے مجاز نے ۱۹۴۵ء ''شب تاب'' کے نام سے اور پھر مزید اضافے کے بعد ۱۹۴۹ء میں ''ساز نو'' کے نام سے طبع کروایا ہے ۔

انتخاب کلام

تغزل

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا ' اے شورش دوراں بھول گئے
وہ زلف پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے
اے شوق نظارہ کیا کہئے ' نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوق تصور کیا کیجے ' ہم صورت جاناں بھول گئے
اب گُل سے نظر ملتی ہی نہیں ' اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصل بہاراں رخصت ہو ' ہم لطف بہاراں بھول گئے
سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے ' اپنا ہی گریباں بھول گئے
یہ اپنی وفا کا عالم ہے ' اب اُن کی جفا کو کیا کہئے
اک نشتر زہر آگیں رکھ کر نزدیک رگ جاں بھول گئے

تسکین دل محزوں نہ ہوئی وہ سعئی کرم فرما بھی گئے
اس سعئی کرم کو کیا کہئے بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے
ہم عرض وفا بھی کر نہ سکے کچھ کہہ نہ سکے کچھ سن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے
رُوداد غم اُلفت اُن سے ہم کیا کہتے کیوں کر کہتے
اک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے
ارباب جنوں پر فرقت میں اب کیا کہئے کیا کیا گزری
آئے تھے سواد اُلفت میں کچھ کھو بھی گئے کچھ پا بھی گئے

اُن انکھڑیوں کا عالم نہ پوچھو صہبا ہی صہبا ' مستی ہی مستی
وہ آ بھی جاتے وہ ہو بھی جاتے چشم تمنا پھر بھی ترستی

برباد تمنا پہ عتاب اور زیادہ ہاں میری محبت کا جواب اور زیادہ

یہ میرے عشق کی مجبوریاں معاذاللہ　　تمہارا راز تمہیں سے چھپا رہا ہوں میں
بتانے والے وہیں پر بتاتے ہیں منزل　　ہزار بار جہاں سے گزر چکا ہوں میں

سارا عالم گوش بر آواز ہے　　آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے
ہاں ذرا جرأت دکھا اے جذب دل　　حسن کو پردے پہ اپنے ناز ہے
ہنس دئے وہ میرے رونے پر مگر　　اُن کے ہنس دینے میں بھی اک راز ہے
چھپ گئے وہ ساز ہستی چھیڑ کر　　اب تو بس آواز ہی آواز ہے

ساری محفل جس پہ جھوم اٹھی ''مجاز''
وہ تو آواز شکست ساز ہے

محبت کے سو رنگ سو سو اثر　　کوئی نغمہ پیرا ، کوئی نوحہ گر
جہاں ٹھوکریں ہوں ہر اک گام پر　　وہاں لغزش پا بنے راہبر
یہ سب ہاتھ ہیں خون سے جن کے تر　　یہی تھے مسیحا یہی چارہ گر
جگر کی خبر ہے نہ دل کی خبر　　مگر لڑ رہی ہے نظر سے نظر

بے سبب التفات کیا معنی　　کچھ تو اے چشم ناز ہیں ہم لوگ
ہم کو رسوا نہ کر زمانے میں　　بسکہ تیرا ہی راز ہیں ہم لوگ

آنکھ سے آنکھ جب نہیں ملتی　　دل سے دل ہمکلام ہوتا ہے

جھوم جھوم اٹھے شجر ، کلیوں نے آنکھیں کھولدیں
جانب گلشن کوئی مست خرام آ ہی گیا
پھر کسی کے سامنے چشم تمنا جھک گئی
شوق کی شوخی میں رنگ احترام آ ہی گیا
بار ہا ایسا ہوا ہے یاد تک دل میں نہ تھی
بارہا مستی میں لب تک اس کا نام آ ہی گیا

کُھل گئی تھی صاف گردوں کی حقیقت اے ''مجاز''
خیریت گزری کہ شاہیں زیر دام آ ہی گیا

میری نظروں میں حشر بھی کیا ہے　　میں نے اُس کا جلال دیکھا ہے
ہائے انجام اُس سفینے کا . . . .　　نا خدا نے جسے ڈبویا ہے
پھر مری آنکھ ہو گئی نمناک　　پھر کسی نے مزاج پوچھا ہے

شوق کے ہاتھوں اے دل مضطر کیا ہونا ہے کیا ہوگا
عشق تو رسوا ہو ہی چکا ہے حسن بھی کیا رسوا ہوگا
حسن کی بزم خاص میں جا کر اس سے زیادہ کیا ہوگا
کوئی نیا پیماں باندھیں گے کوئی نیا وعدا ہوگا
چارہ گری سر آنکھوں پر اس چارہ گری سے کیا حاصل
درد کہ اپنی آپ دوا ہے تم سے اچھا کیا ہوگا

سازگار ہے ہمدم ان دنوں جہاں اپنا　　عشق شادماں اپنا شوق کامراں اپنا
آہ بے اثر کس کی نالہ نارسا کس کا　　کام بارہا آیا جذبۂ نہاں اپنا
اُلجھنوں سے گھبرائے میکدے میں در آئے　　کس قدر تن آساں ہے ذوق رائیگاں اپنا

کیوں کر ہوا ہے فاش زمانے پہ کیا کہیں
وہ راز دل جو کہہ نہ سکے رازداں سے ہم
دیکھیں گے ہم بھی کون ہے سجدہ طراز شوق
بے سر اُٹھا رہے ہیں ترے آستاں سے ہم

عقل کی سطح سے کچھ اور اُبھر جانا تھا
عشق کو منزل پستی سے گزر جانا تھا
حسن اور عشق کو دے طعنۂ بیداد ''مجاز''
تم کو تو صرف اسی بات پہ مر جانا تھا

جنون شوق اب بھی کم نہیں ہے　　مگر وہ آج بھی برہم نہیں ہے
بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا　　تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

نہیں یہ فکر کوئی رہبر کامل نہیں ملتا
کوئی دنیا میں مانوس مزاج دل نہیں ملتا

یہ آنا کوئی آنا ہے کہ بس رسماً چلے آئے
یہ ملنا خاک ملنا ہے کہ دل سے دل نہیں ملتا
کبھی ساحل پہ رہ کر شوق طوفانوں سے ٹکرائیں
کبھی طوفاں میں گِھر کر فکر ہے ساحل نہیں ملتا
یہ قتل عام اور بے اذن قتل عام کیا معنی
یہ بسمل کیسے بسمل ہیں جنھیں قاتل نہیں ملتا

آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارا پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارا پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بدر مارا پھروں
اے غم دل کیا کروں ' اے وحشت دل کیا کروں

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور ' جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے دل کا حال
اے غم دل کیا کروں ' اے وحشت دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا آفتاب
جیسے مُلّا کا عمامہ ' جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی ' جیسے بیوہ کا شباب
اے غم دل کیا کروں ' اے وحشت دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھُوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی چوٹ سی دل پر لگی
اے غم دل کیا کروں ' اے وحشت دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر چلتی ہوئی شمشیر سی
اے غم دل کیا کروں ' اے وحشت دل کیا کروں

راستے میں رک کے دم لوں یہ مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی همنوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں

رات هنس هنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہناز لالہ رخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں

منتظر ہے ایک طوفان بلا میرے لئے
اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لئے
پر مصیبت ہے مرا عہد وفا میرے لئے
اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں

جی میں ٹھانی ہے کہ اب عہد وفا بھی توڑ دوں
ان کو پا سکتا هوں میں یہ آسرا بھی توڑ دوں
هاں مناسب ہے یہ زنجیر ہوا بھی توڑ دوں
اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں

هر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں رعنائیاں
هر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں

دل میں اک شعلہ بھڑک اٹھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اٹھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں

مفلسی اور یہ مظاهر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے

سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و سامان پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تخت سلطاں کیا میں سارا قصر سلطاں پھونک دوں
اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں

آہنگِ نو

اے جوانانِ وطن روح جواں ہے تو اٹھو
آنکھ اس محشرِ نو کی نگراں ہے تو اٹھو
خوف بے حرمتی و فکرِ زیاں ہے تو اٹھو
پاس ناموس نگاران جہاں ہے تو اٹھو
اٹھو نقارۂ افلاک بجا دو اٹھ کر
ایک سوئے ہوئے عالم کو جگا دو اٹھ کر

ایک اک سمت سے شبخون کی تیاری ہے
لطف کا وعدہ ہے اور مشق جفا کاری ہے
محفل زیست پہ فرمان قضا جاری ہے
شہر تو شہر ہے گاؤں پہ بھی بم باری ہے
یہ فضا میں جو گرجتے ہوئے طیارے ہیں
بر سرِ دوشِ ہوا موت کے ہرکارے ہیں

اس طرف ہاتھوں میں شمشیریں ہی شمشیریں ہیں
اس طرف ذہن میں تدبیریں ہی تدبیریں ہیں
ظلم پر ظلم ہیں تعزیروں پہ تعزیریں ہیں
سر پہ تلوار ہے اور پاؤں میں زنجیریں ہیں

ایک ہو ایک کہ ہنگامۂ محشر ہے یہی!
عرصۂ زیست کا ہنگامۂ اکبر ہے یہی!

اپنی سرحد پہ جو اغیار چلے آتے ہیں
شعلہ افشان و شرر بار چلے آتے ہیں
خون پیتے ہوئے سرشار چلے آتے ہیں
تم جو اٹھ جاؤ تو بیکار چلے آتے ہیں

خون جو بہہ نکلا ہے اُس خون میں بہا دو ان کو
اُن کی کھودی ہوئی خندق میں گرا دو ان کو

رنگ گلہائے گلستانِ وطن تم سے ہے
شورش نعرۂ رندانِ وطن تم سے ہے
نشۂ نرگسِ خوبانِ وطن تم سے ہے
عفّتِ ماہ جبینانِ وطن تم سے ہے

تم ہو غیرت کے امیں تم ہو شرافت کے امیں
اور یہ خطرے میں ہیں ' احساس تمہیں ہے کہ نہیں

یہ درندے یہ شرافت کے پرانے دشمن
تم کہ ہو حامل آداب و روایات کہن
جادہ پیما کے لئے خضر ہو تم یہ رہزن
تم ہو خرمن کے نگہبان یہ برق خرمن

خطّۂ پاک میں زنہار نہ آنے پائیں!
آ ہی جائیں جو یہ زندہ تو نہ جانے پائیں!

مرد و زن پیر و جواں اُن کے مظالم کا شکار
خونِ معصوم میں ڈوبی ہوئی اُن کی تلوار
یہ قیامت کے ہوسناک ' غضب کے خونخوار
اُن کے عصیاں کی نہ حد ہے نہ جرائم کا شمار

یہ ترحم سے نہ دیکھیں گے کسی کی جانب
ان کی توپوں کے دھن کر دو انھیں کی جانب

یہ تو ہیں فتنۂ بیداد دبا دو ان کو
یہ مٹا دیں گے تمدن کو مٹا دو ان کو

پھونک دو ان کو جھلس دو کہ جلا دو ان کو
شان شایان وطن ہو یہ بتا دو ان کو
یاد ہے تم کو کن اسلاف کی تم یادیں ہو
تم تو خالد کے پسر بھیم کی اولادیں ہو
تم تو تنہا بھی نہیں ہو کئی دمساز بھی ہیں
روس کے مرد بھی ہیں چین کے جانباز بھی ہیں
کچھ نہ کچھ ساتھ فرنگی فسوں ساز بھی ہیں
اور ہم جیسے بہت زمزمہ پرداز بھی ہیں
دور انسان کے سر سے یہ مصیبت کر دو
آگ دوزخ کی بجھا دو اسے جنّت کر دو

اعتراف

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو!
میں نے مانا کہ تم اک پیکرِ رعنائی ہو
چمنِ دھر میں روحِ چمن آرائی ہو
طلعتِ مہر ہو، فردوس کی برنائی ہو
بنتِ مہتاب ہو گردوں سے اتر آئی ہو
مجھ سے ملنے میں اب اندیشۂ رسوائی ہے
میں نے خود اپنے کئے کی یہ سزا پائی ہے
خاک میں آہ ملائی ہے جوانی میں نے
شعلہ زاروں میں جلائی ہے جوانی میں نے
شہرِ خوباں میں گنوائی ہے جوانی میں نے
خواب گاہوں میں لٹائی ہے جوانی میں نے
حسن نے جب بھی عنایت کی نظر ڈالی ہے
میرے پیمانِ محبت نے سپر ڈالی ہے
ان دنوں مجھ پہ قیامت کا جنوں طاری تھا
سر پہ سرشاری و عشرت کا جنوں طاری تھا
ماہ پاروں سے محبت کا جنوں طاری تھا
شہر یاروں سے رقابت کا جنوں طاری تھا

بستر مخمل و سنجاب تھی دنیا میری
ایک رنگین و حسین خواب تھی دنیا میری
جنت شوق تھی بیگانۂ آفات سموم
درد جب درد نہ ہو کاوش درماں معلوم
خاک تھے دیدۂ بیباک میں گردوں کے نجوم
بزم پرویں تھی نگاہوں میں کنیزوں کا ھجوم
لیلئ ناز بر افگندہ نقاب آتی تھی
اپنی آنکھوں میں لئے دعوت خواب آتی تھی
سنگ کو جوھر نایاب و گراں جانا تھا
دشتِ پرخار کو فردوس جواں جانا تھا
ریگ کر سلسلۂ آب رواں جانا تھا
آہ یہ راز ابھی میں نے کہاں جانا تھا
میری ھر فتح میں ھے ایک ھزیمت پنہاں
ھر مسرت میں ھے رازِ غم و حسرت پنہاں
کیا سنوگی مری مجروح جوانی کی پکار
میری فریاد جگر دوز مرا نالۂ زار
شدت کرب میں ڈوبی ھوئی میری گفتار
میں کہ خود اپنے مذاق طرب آگیں کا شکار
وہ گداز دلِ مرحوم کہاں سے لاؤں
اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں
میرے سائے سے ڈرو تم مری قربت سے ڈرو
اپنی جرائت کی قسم تم مری قربت سے ڈرو
تم لطافت ھو اگر میری لطافت سے ڈرو
میرے وعدوں سے ڈرو میری محبت سے ڈرو
اب میں الطاف و عنایت کا سزا وار نہیں
میں وفادار نہیں ھاں میں وفادار نہیں
اب مرے پاس تم آئی ھو تو کیا آئی ھو

عرش ملسیانی

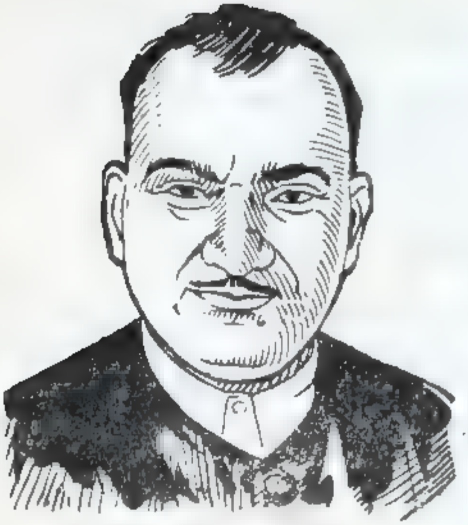

بالمکند نام ، عرش تخلص ، ۲۰ دسمبر ۱۹۰۸ء کو اپنے آبائی وطن قصبہ ملسیاں ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے والد جناب جوش ملسیانی ایک فاضل استاد اور اردو کے معروف متغزلین میں سے ہیں اور سچ پوچھئے تو یہ بامذاق اور مہذب باپ ہی کی تربیت کا فیضان ہے کہ عرش صاحب ایک شستہ ادبی ذوق کے مالک ہیں ۔ عرش صاحب نے ابتدائی تعلیم والد کے زیرنگرانی حاصل کر کے انٹرنس پاس کیا ۔ پھر انجینئرنگ کالج رسول سے اورسیری کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ۱۹۲۸ء میں محکمہ نہر میں ملازمت اختیار کی ۔ لیکن چونکہ شعر و شاعری سے فطری مناسبت تھی اس لئے یہ ملازمت ترک کر کے ۱۹۳۰ء میں گورنمنٹ انڈسٹریل اسکول لدھیانہ میں بہ حیثیت معلم ملازم ہوئے اور تقریباً چودہ پندرہ برس اس ادارے میں کام کرتے رہے ۔ اس دوران میں آپ کا مطالعہ بھی برابر جاری رہا چنانچہ یہیں سے آپ نے پرائیویٹ طور پر ایف ۔ اے اور بی ۔ اے کے امتحانات پاس کئے ۔ یہاں سے نکل کر آپ گورنمنٹ آف انڈیا کی ملازمت کے سلسلے میں دہلی پہونچے اور تقسیم ہند تک وہاں کام کیا پھر غالباً ۱۹۴۷ء سے آپ کا تقرر ماہنامہ ''آجکل'' کے عملۂ ادارت میں ہو گیا ۔ جب سےعرش صاحب نائب مدیر کی حیثیت سے اسی ادارے میں کام کر رہے ہیں ۔

عرش صاحب کو بچپن سے ہی شعر و سخن سے دلچسپی تھی اس پر حضرت جوش ملسیانی جیسا دقت نظر رکھنے والا استاد اور شعر کی قدر کو پرکھنے والا سخن سنج باپ ملا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں انہیں نہ صرف شعر کہنے پر قدرت حاصل ہو گئی بلکہ اردو شاعری کی روایات میں وہ پوری طرح سنجھ بھی گئے ۔ عرش صاحب نے جس فضا میں آنکھ کھولی اسے صحیح معنوں میں شعر و شاعری کے چرچوں سے سیر حاصل کہا جا سکتا ہے ۔ ایک طرف اقبال کے ترانے فضا میں گونج رہے تھے تو دوسری طرف جوش ملسیانی ، حفیظ جالندھری اور حضرت محروم نئی غنائیت اور نئی شعری اقدار کی بنیاد رکھ رہے تھے ۔ قدرتی طور پر اس فضا سے عرش متاثر ہوئے اور اس تاثر کے بعد خود انہوں نے جو نغمہ چھیڑا وہ تغزل سے بھرپور تھا ۔

عرش صاحب کو صنف غزل پر عبور حاصل ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر اپنے ماحول کی تحریکات کے اظہار کے لئے اسی صنف سخن کو منتخب کرتے ہیں ۔ لیکن ساتھ ہی وہ

نظم بھی کہتے ھیں اور اس میں بھی غزل کی طرح عصری جذبات و رجحانات کو پوری طرح سمونے پر قادر ھیں ۔ اس طرح عرش صاحب کی شاعری کے متعلق یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ بیک وقت مسائل کی شاعری بھی ھے اور غنائی و فکری شاعری بھی ۔ غزل کو وہ اساتذۂ سلف کے معیار پر پرکھنے کے عادی ھیں مگر روایت کے اس احترام کے باوصف انکی غزلیں نئے سماجی رجحانات اور جدید شعری تصورات سے پوری طرح ہم آھنگ ھیں ۔ ان کے دو مجموعہ کلام چھپ چکے ھیں پہلا ''ھفت رنگ'' اور دوسرا ''چنگ و آھنگ'' ۱۹۵۳ء میں شایع ھوا ھے ۔ ان دونوں مجموعوں ' بالخصوص ''چنگ و آھنگ'' جس میں کلام کی زمانی ترتیب اختیار کی گئی ھے ' کے مطالعے سے شاعر کے ذھنی ارتقاء کا خاکہ زیادہ مکمل طور پر سامنے آ جاتا ھے اور بلاشبہ اب وہ ان بلندیوں تک پہنچنے لگے ھیں جہاں فطری شاعری کا علم لہراتا اور حقیقی شعریت کی بجلیاں چمکتی رھتی ھیں ۔

ان کے کلام پر تبصرہ کرتے ھوئے پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب ''چنگ و آھنگ'' کے دیباچے میں رقمطراز ھیں ''ابتدائی دور میں عرش اگر پابند روایت شاعر تھے اور عمومی تجربات کو عمومی اصطلاحوں اور اسالیب میں پیش کرنے پر اکتفا کرتے تھے ' تو بعد کے ادوار میں جب ان کی خود اعتمادی اپنے آپ کو محسوس کرانے کی صلاحیت کو نشو و نما دینے لگتی ھے تو وہ ''سر دلبراں'' کے ذاتی تجربوں کو بھی ' کبھی تو ''حدیث دیگراں'' کے پردے میں پیش کرتے ھیں اور کبھی اس مہین پردے کو چاک کر کے اپنے ذاتی تجربوں کو بے نقاب کر دیتے ھیں اس مرحلے پر پہنچ کر ' عرش کی فکر کے ڈانڈے ہمارے عصر کی ان شعری تحریکوں سے مل جاتے ھیں جنھیں پرانی تحریکوں سے ممیز کرنے کے لئے کبھی ترقی پسند شاعری اور کبھی نئی شاعری کے نام سے موسوم کیا جاتا ھے'' ۔ اور اس میں شک نہیں کہ جناب عرش ان معنوں میں ضرور ترقی پسند ھیں کہ وہ اپنے کلام میں بالعموم اپنے ماحول کی ترجمانی اور زندگی کے موجودہ مسائل کو پیش کرتے ھیں ۔

عرش صاحب نے موضوعاتی نظمیں بھی کافی کہی ھیں ۔ ان میں کچھ تو غنائی و تخیلی ھیں اور بیشتر ایسی ھیں جن میں یا تو زندگی کے موجودہ مسائل کا خاکہ پیش کیا گیا ھے یا حالات حاضرہ پر کڑی مگر سچی تنقید کی گئی ھے ۔ اول الذکر خصوصیات کی ترجمان ان کی بہت سی نظمیں ھیں جن میں ''ھولی'' ''دیہاتی دوشیزہ'' ''بسنت'' ''ریڈیو پر گانے والی'' ''وادیٔ کشمیر'' ''ساز خاموشی'' بڑی دلکش اور قابل مطالعہ نظمیں ھیں جہاں تک دوسری خصوصیت کا تعلق ھے ان کی وہ نظمیں جو فرقہ دارانہ فسادات پر کہی گئی ھیں درحقیقت ایک خاص دور کی سیاسی تاریخ ھیں ۔ لیکن اس سے بڑھکر ان کی چند وہ نظمیں ھیں جن میں انہوں نے بعض اھم عالمی مسائل پر قلم اٹھایا ھے ۔ اس سلسلے میں ان کی ''۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک'' ''ایشیا کو چھوڑ دو'' اور ''جنگ کوریا'' نہایت پر درد اور جوشیلی منظومات ھیں ۔

کلام عرش کی زبان اور اسالیب بیان پر کچھ کہنا اس لحاظ سے تحصیل حاصل ھے کہ یہ چیزیں تو انہیں قطعی طور پر اپنے والد جناب جوش سے ورثے میں ملی ھیں ۔ اور جوش صاحب زبان و بیان کے معاملے میں فصیح الملک داغ کے شاگرد رشید ھوئے

کی حیثیت سے مستند مانے جاتے ھیں۔ غرض عرش کی شاعری اپنے عصر کی محتاط اور نفیس فکر کی آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کے محاسن سے بھی آراستہ ہے۔ اور یہی وہ علامات ھیں جو اسکے دیرپا ہونے کی ضامن ھیں۔

انتخاب کلام

تغزل

یہ دنیا ہے اسے دارلفتن کہنا ھی پڑتا ہے
یہاں ہر راہبر کو راہزن کہنا ھی پڑتا ہے
وفور عقل انساں سے بڑھی انساں کشی اتنی
وفور عشق کو دیوانہ پن کہنا ھی پڑتا ہے
وہ صحرا جس میں کٹ جاتے ھیں دن یاد بہاراں سے
بالفاظ دگر اُس کو چمن کہنا ھی پڑتا ہے
بتان سنگدل میں ہے نزاکت کا بھی اک پہلو
انہیں سیمیں بدن گل پیرہن کہنا ھی پڑتا ہے
اسی صورت سے کم ہوتا ہے کچھ آزار غربت کا
دیار غیر کو اپنا وطن کہنا ھی پڑتا ہے
اگر انجام کو پیش نظر رکھیں تو مجبوراً
جہان عیش کو دارالمحن کہنا ھی پڑتا ہے
زباں سمجھے نہ سمجھے کوئی اپنی ''عرش'' اس پر بھی
وطن اپنا ہے یہ اسکو وطن کہنا ھی پڑتا ہے

اے اسیری سے چھوٹنے والے — اب تو دام و قفس کی بات نہ کر
قصدِ شیخ شہر رہنے دے — مجھ سے اُس بوالہوس کی بات نہ کر
وہ رہائی نہیں سکوں جس میں — اک قفس ہے قفس کی بات نہ کر
یہ بتا ''عرش'' سوز ہے کتنا
ساز پر دسترس کی بات نہ کر

کسی طرح بھی زمانے کو بس میں کر نہ سکے
نہ دوستی نہ ہمیں راس دشمنی آئی
عجب نہ تھا کہ غم دل شکست کھا جاتا
ہزار شکر ترے لطف میں کمی آئی

خواہش معدوم اچھی خواہش ناکام سے حیف اُس پر پھول بنکر جو کلی مرجھا گئی
کون ہوگا اب ہدف ناکامئی تدبیر کا زندگی کی راہ میں تقدیر تو کام آ گئی

دوستی کا نشاں نہیں ملتا کوئی اپنا یہاں نہیں ملتا
درد معراج کو پہنچتا ہے جب کوئی ترجماں نہیں ملتا
رہبروں کی ہوئی وہ ارزانی رہرووں کا نشاں نہیں ملتا

ہم اس چمن کا پھول ہوئے بھی تو فائدہ شبنم کا آفتاب جہاں پاسباں رہے
اُن رہبروں کے رحم پہ منزل رسی ہے عرش جو محو نالۂ جرس کارواں رہے

آہ ! ان طائروں کی خوش فہمی ہو کے آزاد جو اسیر ہوئے
چھیڑ بھی اُن سے بے مثال ہوئی اُن سے شکوے بھی بے نظیر ہوئے

اک فقط مظلوم کا نالہ رسا ہوتا نہیں
اے خدا دنیا میں تیری ورنہ کیا ہوتا نہیں
ہم کو راہ زندگی میں اس قدر رہزن ملے
رہنما پر بھی گماں رہنما ہوتا نہیں
سجدے کرتے بھی ہیں انساں خود در انساں پہ روز
اور پھر کہتے بھی ہیں بندہ خدا ہوتا نہیں
''عرش'' پہلے یہ شکایت تھی خفا ہوتا ہے وہ
اب یہ شکوہ ہے کہ وہ ظالم خفا ہوتا نہیں

دل ہی بے نور ہو تو ہو شاید عشق کی راہ تو نہیں تاریک

چوٹ جب تک کوئی نہیں لگتی — دل میں ہوتی نہیں کوئی تحریک
عشق کا ہر بیان بیانِ غلط — حسن جو بھی کہے سراسر ٹھیک

طوفان بلا کا خوف نہیں یہ شان تغافل کیا کہنا
اے اہل وطن تم ہنستے ہو اور ایک زمانہ روتا ہے
انجام عمل کی فکر نہ کر ' ہے ذکر بھی اسکا ننگ عمل
جو کرنا ہے تجھ کو کرے وہ ہونے دے جو ہوتا ہے
طوفان مصیبت تیز سہی ' لیکن یہ پریشانی کیسی
کشتی کو بیچ سمندر میں کیوں اپنے آپ ڈبوتا ہے
اے ''عرش'' تلاش منزل میں انجام دل کی فکر نہ کر
گم ہونا شان دل ٹھہری ہونے دے اگر گم ہوتا ہے

طوفان سے الجھ گئے لے کر خدا کا نام
آخر نجات پا ہی گئے ناخدا سے ہم
پہلا سا وہ جنون محبت نہیں رہا
کچھ کچھ سنبھل گئے ہیں تمہاری دعا سے ہم
آنے دو التفات میں کچھ اور بھی کمی
مانوس ہو رہے ہیں تمہاری جفا سے ہم

شاعری اس کے لئے ہے گھر کی بات عرش فرزند جناب جوش ہے

جو نہ دیکھا تھا آج تک ہم نے — دل کی باتوں میں آ کے دیکھ لیا
زندگی ہر طرح وبال رہی — صبر بھی آزما کے دیکھ لیا
کوئی اپنا نہیں یہاں اے عرش — سب کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

میں تو ناکام انتظار نہیں — دل کو ہی تجھ پہ اعتبار نہیں
وہ تسلی بھی دے گئے اے عرش — اب بھی دل کو مرے قرار نہیں

ناز اگر ہے تو تیری رحمت پر — اپنے عصیاں پہ مجھکو ناز نہیں

یاد جس وقت مجھے وہ ستم ایجاد آیا ۔ لب پہ رہ رہ کے مرے شکوۂ بیداد آیا
حضرت شیخ کے لب پر ہے وہی حور کی بات ۔ یاد اس کو نہ کبھی کوئی پریزاد آیا

کوئی دیکھے قفس والوں کی حالت ۔ اٹھا گلشن کی جانب سے دھواں ہے
ذرا ہمت سے او گم کردہ منزل ۔ ابھی کچھ دور گرد کارواں ہے

اے جوش طلب تو ہو ، تو پروا نہیں مجھ کو
صحرا مرے آگے ہو کہ دریا مرے آگے
مر کر بھی گرفتارِ سفر ہے مری ہستی
دنیا مرے پیچھے ہے تو عقبیٰ مرے آگے
خود حسن کا خاکہ ہے یہ خود عشق کا نقشہ
ہے خواب بھی تعبیر بھی دنیا مرے آگے

دل کو سوجھی بھی تو کب چاک جنوں سینے کی
دامن ہوش میں جس وقت کوئی تار نہ تھا

امیدوں پر پھرا جاتا ہے پانی ۔ ٹھہر اے دیدۂ تر کی روانی
دیا کیوں اس کو عشق جاودانی ۔ جسے بخشی ہے تو نے عمر فانی

تمہارے تیر کو جو دل میں رکھ لیتے ہیں خوش ہو کر
جفائے آسماں کو وہ بلاکش کیا سمجھتے ہیں

جنہیں گم گشتگی کے فیض سے ہے ہر قدم منزل
جنون شوق میں رہبر کی وہ پرواہ نہیں کرتے

موت نے آسرا دیا بھی تو کب ۔ جب مصیبت کے دن گزار آئے
یاس کہتی ہے کچھ ، تمنا کچھ ۔ کس کی باتوں پہ اعتبار آئے
عرش وہ بے قراریاں نہ رہیں ۔ دل کو اب کس طرح قرار آئے

کچھ قصورساق کا ' کچھ ہے ابرو باراں کا　　قابل سزا ناحق جرم مے پرستی ہے

نقاب رخ اُلٹنے کو تو اُس نے بارہا اُلٹی
برا ہو اپنی حیرت کا کہ ہم خود گم نظر نکلے

دل ہے لیکن دل میں کوئی غم نہیں　یہ مصیبت بھی تو آخر کم نہیں
کس کو دنیا میں ہوئی راحت نصیب　کون دنیا میں اسیر غم نہیں

کسکا قرب کہاں کی دوری اپنے آپ سے غافل ہو
راز اگر پانے کا پوچھے ' کھو جانا ہی پانا ہے

ہاں دیدۂ تحقیق سے اے ذوق سفر دیکھ　رہبر جسے سمجھا ہے وہ رہزن تو نہیں ہے
بے سعئی عمل خاک ہے انسان کا جینا　یہ رزم گہہ زیست ہے مدفن تو نہیں ہے
تکلیف اسیری کی شکایت نہ کر اے دل　یہ کنج قفس کنج نشیمن تو نہیں ہے

اجارہ دارانِ عیش و مستی زمانہ اب رخ بدل رہا ہے
کبھی تو مجھ بد نصیب کو بھی فراغت زندگی ملے گی
خرد کو بے مایہ کر نہ اتنا ' یہ زہد کیسا یہ بندگی کیا
خرد کا افلاس دور ہوگا تو دولت زندگی ملے گی

بارگاہ خزاں میں ایک ہیں سب　کوئی کانٹا ہوا کہ پھول ہوا

زندگی کش مکش عشق کے آغاز کا نام　موت انجام اسی درد کے افسانے کا

فریب آرزو پر لطف ہے ترک تمنا سے　سکوں افزائے دل ہے عشق کی ہنگامہ آرائی

ہم صفیرو یہ مسرت کا ترانہ کیسا　ہو تو لینے دو ابھی قید سے آزاد مجھے
نہ نشیمن ہے نہ ہے شاخ نشیمن باقی　لطف جب ہے کہ کرے اب کوئی برباد مجھے

ہے دیکھنے والوں کو سنبھلنے کا اشارہ   تھوڑی سی نقاب آج وہ سرکائے ہوئے ہیں

جھک گئی نقش قدم پر جوش اُلفت سے جبیں
بے خودی میں اب تلاش جادہ و منزل کہاں
کہہ رہی تھی صُبح دم یہ شمع کی افسردگی
سوز پروانہ نہ ہو تو گرمئی محفل کہاں

سنا ہے تیری رحمت جرم عصیاں سے فزوں تر ہے
اسی اُمید پر یا رب گنہگاروں میں شامل ہوں

تاثیر آہ کی یہ کرامت تو دیکھنا   رحمت کے باب مجھ پہ فرشتوں نے وا کئے

اب تو یہ درد عشق مری زندگی ہے ''عرش''   اب اُس نے درد عشق کا چارہ کیا تو کیا

منظومات

جنگ کوریا

بجھ گیا امن و آشتی کا دیا
جنگ کی کوریا سے آئی صدا
صلح کے راستے ہوئے مسدود
پھر چلے ٹینک پھر اُڑی بارود
شہر کے شہر کر دئے برباد
بڑھ گیا اھر من سے آدم زاد
پھر اُڑے آسماں پہ انگارے
چھا گئے پھر فضا پہ طیارے
خلق توپوں سے پائمال ہوئی
خون سے پھر زمین لال ہوئی
چہرۂ زندگی اُتر سا گیا
موت کا روپ کچھ نکھر سا گیا
سیل بن کر تباھیاں آئیں
زندگی کو جمائیاں آئیں
الاماں الاماں کا شور ھوا
ہر طرف وحشتوں کا زور ھوا
چہرۂ زیست ہو گیا ہے فق
چاک ہر سینہ ہر کلیجہ شق
بُرد باری سے دل ہوئے خالی
بج گئی دونوں ھاتھ سے تالی
صلح کے نام پر لڑائی ہے
امن عالم تیری دھائی ہے

صلح جوئی سے بڑھ گئی پیکار آدمی آدمی سے ہے بیزار
آدمیت کا سینہ چاک ہوا قصہ انسانیت کا پاک ہوا
آدمی زاد سے خدا کی پناہ اسکے ہاتھوں ہے اسکی نسل تباہ
مہ جبیں در بدر پریشاں ہیں نیک بندے نزار و نالاں ہیں
کون پرساں ہے غم کے ماروں کا کم سنوں اور بے سہاروں کا
نوجواں ہی بچے نہ پیر بچے مرد میداں نہ گوشہ گیر بچے
آندھیاں ظلم کی چلیں ہرسو دور حاضر پہ صد ہزار تفو
ہاں یہی دور عقل و علم کا دور ''آشتی'' ''صلح'' اور''حلم'' کادور
یہ تعدّی یہ جور کیا کہنا وحشتوں کا یہ دور کیا کہنا
کوئی وعدہ بھی پائیدار نہیں ایک کو اک پہ اعتبار نہیں
جو ہے کمزور وہ غلام انکا یہ ہے دستورِ انتقام انکا
اپنے گھر میں بجائیں عود و چنگ غیر کے گھر میں شور فتنہ و جنگ
شعبدے ہیں یہ ملک گیروں کے ہوس و حرص کے اسیروں کے
ساقیا یہ ہے وقت رستا خیز آج تو لا شراب تند و تیز
تیرا بادہ ہے بادۂ صاف ہر مرض کے لئے ہوا لشّافی
ذہن انساں ہے آجکل بیمار اب تو اسکا علاج ہے دشوار
دے اسے ایک جام ایک ہی جام اے کہ تو ہے امین خیر انام
کھول دے میکدہ محبت کا نام اونچا ہو آدمیت کا
ایک فرمان پر چلے عالم ہو بنائے نظام نو محکم
تخت باقی رہے نہ کوئی تاج سارے عالم پہ ہو عوامی راج
ہو اخوت کی اسطرح تخلیق کالے گورے کی دور ہو تفریق
آدمی آدمی سے مل کے رہے غنچۂ صلح عام کھل کے رہے
شرق پر جور غرب مٹ جائے دل آدم کا کرب مٹ جائے

هو تہ آب بحر کاہل غرق
ایشیا اور یورپ کا فرق

میکدہ

دکھا وہ میکدہ مجھ کو بھی آج پیر مغاں ہزار صومعے جس میکدے پہ ہیں قرباں
وہ میکدہ وہ شعور و خرد کی مے کا امیں کہ دھوئی جاتی ہے جس میں حماقت انساں

بجائے شمع جہاں دل جلائے جاتے ہیں   بجائے عود سہکتا ہے جس میں سوز نہاں
وہ میکدہ کہ جہاں روح آدمیت ہے   وہ میکدہ کہ جہاں تازہ ہوتے ہیں ایماں
وہ میکدہ کہ ہے ظلمات جہل سے محفوظ   وہ میکدہ کہ جہاں مہر عقل ہے تاباں

جہاں بگوشۂ یک جام وسعت عالم
جہاں بگوشۂ یک دل فضائے کون و مکاں

ہولی

سحر موسیقی ہُوا پھر گونج اٹھے گوکل کے بن
رقص فرمانے لگی پھر وادیٔ گنگ و جمن
پھر شباب مست نکلا مل کے چہرے پر گلال
پھر نکھر آیا بہار لالہ سے حسن چمن
پھر ہوائے تند لے کر آئی ہولی کی بہار
ہاتھ میں پچکاریاں لے کر چلے پھر مرد و زن
پھر جنون زندگی کو مل گیا نام سرور
پھر نظر آنے لگا ہر سادگی میں بانکپن
ڈھولکیں باجے مجیرے اور گھڑتالیں بجیں
پھر فضائیں ہو گئیں ہنسی کی لے سے نغمہ زن
رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں گوپیاں سرتا قدم
اودے اودے ، پیلے ، پیلے ، نیلے نیلے پیرہن

جذبی

معین احسن نام جذبی تخلص ، ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم جھانسی میں ہوئی ۔ اس کے بعد ایک عرصے تک تعلیم کے سلسلے میں آگرہ ، لکھنؤ اور دہلی میں قیام رہا ۔ ۱۹۳۶ء میں عربک کالج دہلی سے بی ۔ اے پاس کیا ۔ پھر تلاش معاش میں بمبئی چلے گئے اور تقریباً ایک سال وہاں رہ کر لکھنؤ آ گئے ۔ اس طرح چار سال تک مختلف شعبوں میں ملازمت کرنے کے بعد علیگڑھ جا کر ۱۹۴۰ء میں دوبارہ سلسلۂ تعلیم جاری کیا اور ۱۹۴۲ء میں ایم ۔ اے (اردو) کی ڈگری حاصل کر کے پہلے کچھ عرصہ رسالہ ''آجکل'' کے ادارتی فرائض انجام دیتے رہے پھر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے شعبۂ اردو میں لکچرار ہو گئے ۔ اور آج تک اسی ادارے سے وابستہ ہیں ۔

جذبی صاحب نے باقاعدہ شاعری ۱۹۲۹ء سے شروع کی ۔ ابتدائی زمانہ میں انھوں نے حامد شاہجہان پوری اور صادق جھانسوی سے اپنے کلام پر اصلاح بھی لی ہے ۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ان اساتذہ کی رہنمائی میں وہ صرف فن کی ابتدائی منزلیں آسانی سے طے کر گئے اور بس ۔ جہاں تک جذبات و تاثرات کا تعلق ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذبی صاحب فانی سے بہت جلد اور بہت زیادہ متاثر ہوئے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بعض غزلیات اپنے مجموعی تاثر اور لب و لہجہ کے اعتبار سے فانی کی تو نہیں فانی کی سی معلوم ہوتی ہیں ۔

جذبی صاحب نظم و غزل دونوں کہتے ہیں اور دونوں میں اپنے لطیف اور نازک احساسات ، اپنے شاعرانہ خلوص ، اپنے شیریں تغزل ، اپنے ہلکے ترنم اور اپنی مدھم مگر دلنشیں آواز کی ترجمانی بڑی خوش اسلوبی سے کرتے ہیں ۔ ان کے کلام میں ابتدا ہی سے سنجیدہ تفکر جھلکتا ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ گیتوں کا سا لوچ اور رس ، اس میں ایک ایسا نکھار پیدا کر دیتا ہے جس سے آہیں نغموں میں ڈھلتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں ۔ غم عشق اور غم روزگار کا ایسا لطیف امتزاج اس دور کے جن معدودے چند شعرا کے یہاں ملتا ہے ان میں جذبی بھی ہیں ۔ ان کے یہاں یاس کے باوجود موت کی سردی کے بجائے زندگی کی گرمی اور تڑپ ملتی ہے جس کی وجہ سے زندگی کے قنوطی ماحول میں بھی ایک رجائی پہلو اجاگر ہو جاتا ہے ۔ مزید برآں انفرادیت و اجتماعیت کے صحیح توازن ، سیاسی اور سماجی شعور اور موجودہ کشمکش اور پیچیدگیوں کی عکاسی کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں ہمیں آنے والی دنیا کی ایک جھلک نظر آتی ہے ۔

حضرت جذبی کا کل سرمایۂ شاعری چند غزلیں اور نظمیں ہیں ۔ بالخصوص اپنے مختصر مجموعہ کلام ''فروزاں'' کی اشاعت کے بعد تو انھوں نے بہت ہی کم کہا ہے مگر جتنا

بھی کہا ہے اُس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سوچ بچار کے بعد کہتے ہیں ۔ اُن کے کلام کی نمایاں خصوصیت وہ آتشیں احساس ہے جو الفاظ کو پگھلا ہوا لاوا بنا دیتا ہے ۔ ساتھ ہی اُنھیں اُس پر سحر انداز بیان پر بھی پورا پورا عبور حاصل ہے جس میں کبھی محاورے سے ' کبھی چند الفاظ کی تکرار سے ' مگر زیادہ تر جذبات کی صداقت اور اصلیت سے روح کو تڑپا دینے والی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں ۔

جذبی صاحب ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر ہوئے مگر اُن کی ترقی پسندی قاضی نذر الاسلام یا جوشؔ کی باغیانہ شاعری سے مختلف ہے بلکہ اُن کے غم میں ایک وسعت اور اُن کے ماتم میں سینکڑوں دکھے ہوئے دلوں کی فریاد ہوتی ہے ۔ اس کی سب سے اچھی مثال اُن کی نظم ''فطرت ایک مفلس کی نظر میں'' ہے ۔ اس کے علاوہ اُن کی دوسری نظمیں مثلاً ''موت'' ''تو ہم'' ''طوائف'' وغیرہ بھی قابل مطالعہ ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک میں ہمیں شاعری کا کوئی نہ کوئی انوکھا تجربہ ضرور مل جاتا ہے ۔ خاص طور پر ''موت'' تو اُن کی سب سے اچھی نظم ہے جس میں سوئی ہوئی دنیا کو جگانے کا جو ولولہ ہے ' آنکھیں ملنے اور ہوش میں آنے کا جو عزم ہے ' کچھ رنگین اور پر اسرار محل بنانے کا جو حوصلہ ہے ' محبت اور شرافت کے وھموں سے نکل آنے کا جو ارادہ ہے ' وہ اُن کی ترقی پسندی اور شعریت دونوں کے اعتبار سے لائق ستائش ہے ۔ اسی طرح اُن کی غزلیں بھی اچھے اُسلوب اور سچے خیال کی آئینہ دار ہیں ۔ اور اُن میں سے بعض میں تو زندگی اپنی پوری پہنائیوں اور عظمتوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے ۔

غرض جذبی صاحب جدید شعراء میں صف اول کے شاعر ہیں ۔ اور اُن کا کلام زندگی کا ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ فنی و جمالیاتی اقدار کا بھی حامل ہے ۔ آپ کا مجموعہ کلام ''فروزاں'' کے نام سے طبع ہو چکا ہے ۔

انتخاب کلام

تغزل

مشعل تھے جو بحر ظلمت میں وہ ماہ و اختر ٹوٹ گئے
اور لطف یہ ہے اے طوفانو ! کشتی کے بھی لنگر ٹوٹ گئے

اک یاس بھرے دل پر نہ ہوئی تاثیر تمہاری نظروں کی
اک موم کے بے حس ٹکڑے پر یہ نازک خنجر ٹوٹ گئے

کیا ماتم اُن اُمیدوں کا جو آتے ہی دل میں خاک ہوئیں
کیا روئے فلک اُن تاروں پر دم بھر جو چمک کر ٹوٹ گئے

یا اشکوں کا رونا تھا مجھے یا اکثر روتا رہتا ہوں
یا ایک بھی گوہر پاس نہ تھا یا لاکھوں گوہر ٹوٹ گئے

میری ہی نظر کی مستی سے سب شیشہ و ساغر رقصاں تھے
میری ہی نظر کی گرمی سے سب شیشہ و ساغر ٹوٹ گئے
یہ عرش محبت ہے میرا ' اے طائر سدرہ ہوش میں آ
اس لاحاصل سی کوشش میں تخئیل کے شہپر ٹوٹ گئے
تو اور غم الفت ''جذبی'' مجھ کو تو یقیں آئے نہ کبھی
جس قلب پہ ٹوٹے ہوں پتھر اس قلب میں نشتر ٹوٹ گئے

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں ' جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا اب خواہش دنیا کون کرے
جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے
جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

ہم دہر کے اس ویرانے میں جو کچھ بھی نظارا کرتے ہیں
اشکوں کی زباں میں کہتے ہیں' آہوں میں اشارا کرتے ہیں
کیا تجھ کو پتہ' کیا تجھ کو خبر' دن رات خیالوں میں اپنے
اے کاکل گیتی ہم تجھکو جس طرح سنوارا کرتے ہیں
اے موج بلا ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارا کرتے ہیں
کیا جانئے کب یہ پاپ کٹے' کیا جانئے وہ دن کب آئے
جس دن کے لئے ہم اے ''جذبی'' کیا کچھ نہ گوارا کرتے ہیں

ملے غم سے مجھ کو فرصت تو سناؤں وہ فسانہ
کہ ٹپک پڑے نظر سے مئے عشرت شبانہ
یہی زندگی مصیبت ' یہی زندگی مسرت
یہی زندگی حقیقت ' یہی زندگی فسانہ
کبھی درد کی تمنا ' کبھی کوشش مداوا
کبھی بجلیوں کی خواہش ' کبھی فکر آشیانہ

دل میں کچھ سوز تمنا کے نشاں ملتے ہیں
اس اندھیرے میں اجالے کے سماں ملتے ہیں
وہی ویرانگئ شوق ' وہی تیشۂ غم
راہ چلئے تو وہی کوہ گراں ملتے ہیں
آج بھی کلیوں کے رخسار سے اڑ جاتا ہے رنگ
آج بھی پھول ملول و نگراں ملتے ہیں
آج بھی ریگ بیاباں کے تپش زاروں میں
لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے نشاں ملتے ہیں
آج بھی جسم اسی طرح فگار و مجروح
آج بھی قلب اسی طرح تپاں ملتے ہیں
آج بھی دل ہیں کہ ہو حشر کا دھوکا جن پر
آج بھی لب ہیں کہ سر گرم فغاں ملتے ہیں
آج بھی سر سے گزر جاتی ہیں امواج بلا
آج بھی اپنے ابھرنے کے نشاں ملتے ہیں
ہاں اسی منزل صد کیف و طرب کی جانب
قافلے آج بھی اشکوں کے رواں ملتے ہیں
اے مرے ہم سفرو اس کو تو منزل نہ کہو
آندھیاں اٹھتی ہیں طوفان یہاں ملتے ہیں
ان کے ہر وعدۂ الطاف کی رنگینی میں
کتنے نادیدہ ستم ہائے گراں ملتے ہیں
یوں گوارا ہے یہ خونبار افق کا منظر
اس کے پر تو میں ہمیں تازہ جہاں ملتے ہیں

جاگ اے نسیم ! خندۂ گلشن قریب ہے
اٹھ اے شکستہ بال ! نشیمن قریب ہے
تاریک رات اور بھی تاریک ہو گئی
اب آمد آمد مہ روشن قریب ہے
لو دے اٹھا ہے ساز جفا کا ہر ایک تار
ہنگام رقص آتش و آہن قریب ہے
ایوان و پاسباں کے حجابات بے محل
اس دست شوق سے ترا دامن قریب ہے

اُن بجلیوں کی چشمک باہم تو دیکھ لیں
جن بجلیوں سے اپنا نشیمن قریب ہے

کیا یہی انقلاب ہے ، قلب ادھر جگر اُدھر
نالۂ بیقرار ادھر ، شورش چشم تر اُدھر
اُف ری سیاست چمن ، رنگ کو بو سے سوء ظن
کور ہے نرگس وطن نور ادھر نظر اُدھر
ایک تبسم فرنگ ، ہر دو اُفق لہو ترنگ
نعش بدوش و نالہ رنگ ، شام ادھر سحر اُدھر
اے وہ عقاب جس سے تھی کوہ و دمن کی آبرو
آج اُسی عقاب کے بال ادھر ہیں پر اُدھر
کام و دہن کی تلخیاں ، کوئی مٹا دے اب کہاں
وائے بہ حال تشنگاں ، شیر ادھر شکر اُدھر
قلت صلح کل یہاں ، قلت صلح کل وہاں
کثرت فتنہ گر ادھر ، کثرت فتنہ گر اُدھر
اہل ہنر کے واسطے خاک بسر کے واسطے
جور و جفا کا گھر ادھر ، قہرو بلا کا گھر اُدھر
برگ سے بر سے پوچھئے ، نخل و شجر سے پوچھئے
کون ہے بارور ادھر ، کون ہے باثمر اُدھر
ایک مریض نیم جاں ، ایک مریض خستہ جاں
کون ہے چارہ جُو ادھر ، کون ہے چارہ گر اُدھر
اہل فراق کچھ بتاؤ ، اہل مذاق کچھ بتاؤ
کون سی شے ہے خوب ادھر ، کونسی خوب تر اُدھر

ہجر کی رات ہے طویل ، وصل کی صبح دور ہے
جذب ابھی ہے ناتمام ، خام ابھی شعور ہے

تمہارے جلووں کی رنگینیوں کا کیا کہنا
ہمارے اُجڑے ہوئے دل میں اک بہار تو ہے

سوال شوق پہ کچھ اُن کو اجتناب سا ہے
جواب یہ تو نہیں ہے مگر جواب سا ہے

جہاں تک آخری نظریں تری مشکل سے پہنچی ہیں
وہی منزل کی حد ہے خواب منزل دیکھنے والے

اس طرف اک آشیانے کی حقیقت کُھل گئی
اُس طرف اک شوخ کو بجلی گرانا آ گیا

گلشن میں گیا میں اور واں سے غنچوں کی خموشی لے آیا
اور تو جُو وہاں جا نکلا تو پھولوں کو ہنسی تک دے آیا

ہزار بار کیا عزم ترک نظارہ ہزار بار مگر دیکھنا پڑا ہم کو

اک ایسا راز دیا ہے مجھے چھپانے کو
جسے وہ چاہیں تو خود بھی چھپا نہیں سکتے

جب محبت کا نام سنتا ہوں ہائے کتنا ملال ہوتا ہے

آہ بھی اک کوشش ناکام ہے میرے لئے
ایسی صہبائے کہن اور خام ہے میرے لئے
میری عرض شوق بے معنی ہے اُن کے واسطے
اُن کی خاموشی بھی اک پیغام ہے میرے لئے

اس حرص و ہوا کی دنیا میں ہم کیا چاہیں ہم کیا مانگیں
جو چاہا ہم کو مل نہ سکا ، جو مانگا وہ بھی پا نہ سکے

منظومات

موت

اپنی سوئی ہوئی دنیا کو جگا لوں تو چلوں
اپنے غم خانے میں اک دھوم مچا لوں تو چلوں
اور اک جام مئے تلخ چڑھا لوں تو چلوں
ابھی چلتا ہوں ذرا خود کو سنبھالوں تو چلوں

جانے کب پی تھی ابھی تک ہے مئے غم کا خمار
دھندلا دھندلا نظر آتا ہے جہان بیدار
آندھیاں چلتی ہیں دنیا ہوئی جاتی ہے غبار
آنکھ تو مل لوں ذرا ہوش میں آ لوں تو چلوں

وہ مرا سِحر ' وہ اعجاز کہاں ہے لانا
میری کھوئی ہوئی آواز کہاں ہے لانا
میرا ٹوٹا ہوا وہ ساز کہاں ہے لانا
اک ذرا گیت بھی اس ساز پہ گا لوں تو چلوں

میں تھکا ہارا تھا اتنے میں جو آئے بادل
کسی متوالے نے چپکے سے بڑھا دی بوتل
اُف وہ رنگین ' پر اسرار خیالوں کے محل
ایسے دو چار محل اور بنا لوں تو چلوں

مجھ سے کچھ کہنے کو آئی ہے مرے دل کی جلن
کیا کیا میں نے زمانے میں نہیں جس کا چلن !!
آنسوؤ ! تم نے تو بیکار بھگویا دامن
اپنے بھیگے ہوئے دامن کو سکھا لوں تو چلوں

میری آنکھوں میں ابھی تک ہے محبت کا غرور
میرے ہونٹوں کو ابھی تک ہے صداقت کا غرور
میرے ماتھے پہ ابھی تک ہے شرافت کا غرور
ایسے وہموں سے بھی اب خود کو نکالوں تو چلوں

طوائف

اپنی فطرت کی بلندی پہ مجھے ناز ہے کب
ہاں تری پست نگاہی سے گلہ ہے مجھ کو
تو گرا دے گی مجھے اپنی نظر سے ورنہ
تیرے قدموں پہ تو سجدہ بھی روا ہے مجھ کو

تو نے ہر آن بدلتی ہوئی اس دنیا میں
میری پائندگیٔ غم کو تو دیکھا ہوتا

کلیاں بیزار ہیں شبنم کے تلوّن سے مگر
تو نے اس دیدۂ پرنم کو تو دیکھا ہوتا

ہائے جلتی ہوئی حسرت یہ تری آنکھوں میں
کہیں مل جائے محبت کا سہارا تجھ کو
اپنی پستی کا بھی احساس، پھر اتنا احساس
کہ نہیں میری محبت بھی گوارا تجھ کو

اور یہ زرد سے رخسار، یہ اشکوں کی قطار
مجھ سے بیزار، مری عرض وفا سے بیزار

فطرت ایک مفلس کی نظر میں

فطرت کے پجاری کچھ تو بتا کیا حسن ہے ان گلزاروں میں
ہے کون سی رعنائی آخر ان پھولوں میں ان خاروں میں

وہ خواہ سلگتے ہوں شب بھر، وہ خواہ چمکتے ہوں شب بھر
میں نے بھی تو دیکھا ہے اکثر کیا بات نئی ہے تاروں میں

اس چاند کی ٹھٹھری کرنوں سے مجھ کو تو سکوں ہوتا ہی نہیں
مجھ کو تو جنوں ہوتا ہی نہیں جب پھرتا ہوں گلزاروں میں

یہ چپ چپ نرگس کی کلیاں، کیا جانے کیسی کلیاں ہیں
جو کھیلتی ہیں، جو ہنستی ہیں اور پھر بھی ہیں بیماروں میں

یہ لال شفق، یہ لالہ و گل، اک چنگاری بھی جن میں نہیں
شعلے بھی نہیں، گرمی بھی نہیں، ہیں تیرے آتش زاروں میں

کیا تجھ کو نظر آتی ہی نہیں، یہ لرزش سی، یہ سوزش سی
یہ موت کی ہلکی زردی سی، ان صبح کے مدھم تاروں میں

آس وقت کہاں تو ہوتا ہے ' جب موسم گرما کا سورج
دوزخ کی تپش بھر دیتا ہے دریاؤں میں ' کہساروں میں
جاڑے کی بھیانک راتوں میں وہ سرد ہواؤں کی تیزی
ہاں وہ تیزی ' وہ بے مہری جو ہوتی ہے تلواروں میں
دریا کے تلاطم کا منظر ہاں تجھ کو مبارک ہو لیکن
اک ٹوٹی پھوٹی کشتی بھی چکراتی ہے منجدھاروں میں
کوئل کے رسیلے گیت سنے لیکن یہ کبھی سوچا تو نے
ہیں اُلجھے ہوئے نغمے کتنے اک ساز کے ٹوٹے تاروں میں
بادل کی گرج ' بجلی کی چمک ' بارش میں وہ تیزی تیروں کی
میں ٹھٹھرا سمٹا سڑکوں پر ' تو جام بلب میخواروں میں
سب ہوش وخرد کے دشمن ہیں' سب قلب وجگر کے رہزن ہیں
رکھا ہے بھلا کیا اس کے سوا ان راحت جاں مہ پاروں میں
وہ لاکھ ہلالوں سے بھی حسیں ' کیسی زہرہ' کیسی پرویں
اک روٹی کا ٹکڑا جو کہیں مل جائے مجھے بازاروں میں
جب جیب میں پیسے بجتے ہیں ' جب پیٹ میں روٹی ہوتی ہے
اُس وقت یہ ذرّہ ہیرا ہے ' اُس وقت یہ شبنم موتی ہے

سردار جعفری

علی سردار نام - جعفری نسبت خاندانی سے مشہور ہیں آپ کی پیدائش ریاست بلرام پور (اودھ) میں ۱۹۱۲ء میں ہوئی - والدین کا ارادہ مولوی بنانے کا تھا چنانچہ لکھنؤ کے ایک دینی دارالعلوم ''سلطان المدارس'' میں داخل کر دئے گئے لیکن ۱۹۲۵ء میں مدرسہ چھوڑ کر آپ بلرام پور ہائی اسکول میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے لگے - ۱۹۳۰ء میں جہازرانی (بمبئی) میں لے لئے گئے مگر والدین نے واپس بلا لیا - ۱۹۳۲ء میں جب آپ بی - اے کے طالب علم تھے اسٹرائک میں حصہ لینے کے جرم میں وہاں سے نکال دئے گئے - ۱۹۳۸ء میں عربک کالج دہلی سے بی - اے کیا - علی گڑھ تک گاندھی جی کی آپ بیتی کا اثر دماغ پر بہت تھا لیکن مارکس اور اینگلز کی تعلیمات نے یہ اثر زائل کر دیا - ۱۹۳۵ء میں جب لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد پڑی تو اس کا ایک جلسہ علی گڑھ میں ہوا - اس جلسہ میں علی سردار صاحب نے ایک مقالہ ''جدید ادب اور نوجوانوں کے رجحانات'' کے عنوان سے پڑھا جو انجمن کے اعلان نامے سے متاثر تھا - اسی وقت سے ان کی جدید ادبی کاوشوں کی ابتدا ہوتی ہے -

۱۹۳۶ء میں ''آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن'' کی بنیاد پڑی جعفری صاحب ابتدا ہی سے اس میں شریک ہوگئے - ۱۹۳۹ء میں سبط حسن صاحب اور مجاز صاحب کی معیت میں لکھنؤ سے رسالہ ''نیا ادب'' نکالنا شروع کیا - اسی سال لکھنؤ یونیوسٹی میں ایم - اے میں داخلہ لیا لیکن ایک ہی سال گزرنے پایا تھا کہ دسمبر ۱۹۴۰ء میں سیاست میں حصہ لینے کے باعث گرفتار کر لئے گئے اور لکھنؤ اور بنارس جیل میں رہے - رہا ہونے کے بعد کچھ عرصہ لکھنؤ میں رہے پھر بمبئی چلے گئے چنانچہ تا حال وہیں مقیم ہیں اور پارٹی کے کاموں میں شب و روز مصروف و منہمک رہتے ہیں -

علی سردار جعفری دور حاضر کے ان نوجوان شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے حیات انسان کی تاریخی رفتار' بالخصوص حالات حاضرہ کا گہرا مطالعہ کر کے جدید رجحانات کو بڑی فکر و بصیرت سے اپنے کلام میں سمویا ہے - اس میں شک نہیں کہ ان کی شاعری کا معتدبہ حصہ جماعی ہے چونکہ وہ اپنی پارٹی کے مخلص کارکن ہیں اور انہوں نے اپنی ساری ہستی اور سارے فن کو صدق دل سے اپنی جماعت کی خدمت کے لئے وقف کر دیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی شاعری ایسی وقیع و متین اور شائستہ و پختہ ہے کہ اسے کسی حالت میں فراموش نہیں کیا جا سکتا -

علی سردار صاحب کے کلام کی سب بڑی خصوصیت یہ ہے کہ گو بقول خود ع ''چھیڑتا ہوں بربط دل کو نئے انداز سے'' انہوں نے اپنے نغمے ایک نئے رنگ و آہنگ

کے ساتھ پیش کئے ہیں مگر اُن کا یہ نیا انداز بہت رچا ہوا اور اُس میں ہماری موروثی روایات شاعری کی تمام شائستگی و تہذیب بڑی لطافت و خوبی کے ساتھ سموئی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا کلام عام ترقی پسند شعرا کی طرح ہیجانی نہیں بلکہ اُس میں ایک عمق پایا جاتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں ماضی ، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کا بلیغ و واضح تصور موجود ہے۔ چنانچہ وہ جو بات بھی کہتا ہے اُس میں سنجیدگی و اعتماد کی جھلک ضرور پائی جاتی ہے۔

جہاں تک اُن کی نظموں کے موضوعات کا تعلق ہے وہ اکثر و بیشتر ہماری موجودہ زندگی کے مسائل پر لکھی گئی ہیں۔ چنانچہ ''تاریخ'' ''آثار سحر'' ''ارتقاء و انقلاب'' ''خواب و خیال'' وغیرہ اور آزاد نظموں میں ''آنسوؤں کے چراغ'' ''خواب'' ''رومان سے انقلاب تک'' جیسی منظومات سب اسی عنوان کی چیزیں ہیں۔ ان کے علاوہ اُنہوں نے رومانی نظمیں بھی کہی ہیں۔ لیکن اُن کی رومانی نظموں میں مظلومیت کی بجائے ایک حوصلہ انگیز انبساط ہوتا ہے اور ساتھ ہی سعی و عمل اور انقلاب و ترقی کی طرف ذوق انگیز اشارے بھی ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں اُن کی ''لکھنؤ کی ایک شام'' ''انتظار نہ کر'' ''حسن نا تمام'' ''فراموش کردند عشق'' ''جشن سوگوار'' وغیرہ نظمیں خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔ چونکہ ان میں ایک طرف تو وہ تمام اسلوبی لطافتیں اور لب و لہجہ کی وہ ساری نرمیاں موجود ہیں جن کو ہم رومانیت اور تغزل سے منسوب کرتے ہیں دوسری طرف ان میں بدلتی ہوئی زندگی کی اُن نئی توانائیوں کا بھرپور احساس ملتا ہے جو دور جدید کی لازمی علامتیں ہیں۔

علی سردار صاحب کے اسلوب بیان کے بارے میں حضرت مجنوں گورکھپوری فرماتے ہیں '' اُن کا سارا فن غیر شخصی ہے اور اس فن کو اُنہوں نے فن لطیف بنانے میں حیرت ناک حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔ یعنی اُن کے اسلوب میں بھرپور جمالیاتی کیفیتیں بھی ہوتی ہیں اور یہ نمایاں طور پر اقبال کے مطالعے کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ علی سردار اپنے اسلوب میں کس حد تک صرف جوش سے متاثر ہیں۔ ورنہ ان کی ننانوے فیصدی شاعری اقبال کے اثر کی علامتیں لئے ہوئے ہے۔ اُن کے مصرعوں اور مصرعوں کے ٹکڑوں میں جو مدھم ، ہموار اور پرسکون ترنم ہوتا ہے وہ بے اختیار اقبال کی یاد دلاتا ہے۔ بے شک اُن کے یہاں اکثر الفاظ نئے ملتے ہیں اور ایسے کہ اس سے پہلے شاعری میں استعمال نہیں کئے گئے لیکن مجموعی طور پر اُن کے اسلوب اور انداز بیان میں وہی رچی ہوئی پختگی ہوتی ہے جو اقبال کے سوا کسی دوسرے نظم نگار کو میسر نہیں ہوئی۔'' اس میں شک نہیں کہ حضرت مجنوں کی یہ رائے نہایت صحیح و متوازن ہے لیکن چونکہ اُن کی یہ رائے ''پرواز'' کی منظومات کے بارے میں تھی جس مجموعے میں کوئی آزاد نظم شامل نہیں ہے اس لئے جعفری صاحب کی چند بعد میں کہی ہوئی منظومات (جن میں اُن کی آزاد نظمیں بھی شامل سمجھنا چاہئے) کے انداز بیان کو دیکھ کر یہ ضرور کہنا پڑتا ہے کہ بعض اوقات اُن کے لب و لہجہ میں زیادہ تندی و تیزی بلکہ تلخی بھی پیدا ہو گئی ہے۔ جس کو اُن کے جماعتی مسلک کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے تاہم شاعرانہ نقطۂ نظر سے اگر وہ اسلوب میں نرمی و گداختگی ہی سے کام لیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

غرض علی سردار صاحب اپنی شاعری کی گونا گوں خصوصیات کی بدولت نوجوان شعرا میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں اور وہ چونکہ مستقبل کا صحیح اور قطعی درک رکھتے ہیں اس لئے اُن کا کلام مستقبل کی بشارت لئے ہوئے ہے ۔ آپ کے کئی مجموعہ کلام چھپ چکے ہیں ۔ جیسے ''پرواز'' ''خون کی لکیر'' ''کشمیر جاگ اٹھا''

انتخاب کلام

انتظار نہ کر

میں تجھ کو بھول گیا اس کا اعتبار نہ کر
مگر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر
عجب گھڑی ہے میں اس وقت آ نہیں سکتا
سرور عشق کی دنیا بسا نہیں سکتا
میں تیرے ساز محبت پہ گا نہیں سکتا
میں تیرے پیار کے قابل نہیں ہوں پیار نہ کر
نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر
خراج اپنی جوانی سے دے رہا ہوں میں
سفینہ خون کے دریا میں کھے رہا ہوں میں
صدا اجل کے فرشتے کو دے رہا ہوں میں
بس اب نوازش پیہم سے شرمسار نہ کر
نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر
عذار نرم پہ رنگ بہار رہنے دے
نگاہ شوق میں برق و شرار رہنے دے
لبوں پہ خندۂ بے اختیار رہنے دے
متاع حسن و جوانی کو سوگوار نہ کر
نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر
شکست ساز کی، ٹوٹے ہوئے سبو کی قسم
دھڑکتے دل کی، ٹپکتے ہوئے لہو کی قسم
تجھے وطن کے شہیدوں کی آبرو کی قسم
اب اپنے دیدۂ نرگس کو اشکبار نہ کر
نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر

حسن سوگوار

کیا کہوں کیا ہے وہ حسن سوگوار — جس کو نظریں دور سے کرتی ہیں پیار
خال و خط میں آن نگاہوں میں شراب — ہلکی ہلکی سانس میں روح شباب
انکھڑیوں میں خواب و بیداری لئے — زلف کے ہر خم میں دنداری لئے
بات کرتی ہے تو یوں جھڑتے ہیں پھول — جیسے گلشن میں بہاروں کا نزول
ہو کے چپ جب بیٹھ جاتی ہے کبھی — خامشی سے پھوٹتی ہے راگنی
آنکھ اٹھا کر دیکھ لیتی ہے اگر — جم کے رہ جاتی ہے سورج کی نظر
پھر بھی رخ پر ہے اداسی کا غبار — جس طرح پھولوں پہ شبنم کی پھوار
آسماں پر شام کی پرچھائیاں — آئینے پر ہلکی ہلکی جھائیاں
صبح کے منظر پہ کہرے کا اثر — ابر کی چادر عروس ماہ پر
ادھ کھلے، مخمور آنکھوں کے کنول — ابروؤں کی نوک پر ہلکا سا بل
قہقہوں میں گریۂ غم کی خراش — انگلیوں میں ایک مبہم ارتعاش
شوق کی برنائیوں سے بے قرار — عشق کی ناکامیوں سے سوگوار
رسم کی زنجیر میں جکڑی ہوئی — حلقۂ تدبیر میں جکڑی ہوئی
لاکھ چاہے پھر بھی خوش رہتی نہیں — دل میں کڑھتی ہے مگر کہتی نہیں
ہنستے ہنستے جیسے کھو جاتی ہے وہ — بات کرتے کرتے سو جاتی ہے وہ
سوچ کر کچھ ڈبڈبا آتی ہے آنکھ — چپکے چپکے اشک برساتی ہے آنکھ
روتے روتے مسکرا دیتی ہے وہ — دل میں شمعیں سی جلا دیتی ہے وہ

اس کی خوشیاں جتنی غم انگیز ہیں
اس کے غم اتنے ہی دل آویز ہیں

تاریخ

تری نگاہ نے دیکھا ہے ملتوں کا عروج
تری نظر میں فسوں کار امتوں کا زوال
ترا شباب ترے بچپنے سے ہم آہنگ
تمام عمر تری داستان جنگ و جدال
خزینہ دار ہے تو ارتقائے عالم کی
ترے غلام ہیں ماضی و حال و استقبال

تجھے قسم ہے انھی تجربات بیہم کی
ادھر بھی دیکھ یہ نکلا ہے کون لیکے کدال
زمیں سے خون کا چشمہ ابلنے والا ہے
زمانہ سوز تحمل سے جلنے والا ہے

ارتقاء و انقلاب

ایک ہی قوت عطا کرتی ہے تاروں کو چمک
چاند کو تنویر سورج کو نگاہ شوخ و شنگ
کشت زاروں کو تبسم کوہساروں کو سکوت
پھول کو بو، تاک کی نبضوں کو خون لالہ رنگ
سرکشی طوفان کو ملاح کے بازو کو زور
کشتئ امید کے پتوار کو کھینے کے ڈھنگ
وقت کے شہپر کو سرعت وہم کے پرواز کی
عہد پارینہ کی فطرت کو جمود خشت و سنگ
زندگی کے نظم افسردہ کو خوئے انقلاب
مفلسی کو منعمی کی ساحری سے شوق جنگ
رقص نشتر ہو چکا اب ضربت کاری بھی دیکھ
ارتقائے زندگی کی تیز رفتاری بھی دیکھ

ٹوٹا ہوا ستارہ

(انفرادیت کی شاندار ناکامی)

آ رہا ہے اک ستارہ آسماں سے ٹوٹ کر
دوڑتا اپنے جنوں کی راہ پر دیوانہ وار
اپنے دل کے شعلہ سوزاں میں خود جلتا ہوا
منتشر کرتا ہوا دامان ظلمت میں شرار
اپنی تنہائی پہ خود ہی ناز فرماتا ہوا
شوق پر کرتا ہوا آئین فطرت کو نثار

کس قدر بے باک کتنا تیز ، کتنا گرم رو
جس سے سیاروں کی آسودہ خراسی شرمسار
موجۂ دریا اشاروں سے بلاتی ہے قریب
اپنی سنگیں گود پھیلائے ہوئے ہے کوہسار
ہے ہوا بے چین آنچل میں چھپانے کے لئے
بڑھ رہا ہے کرۂ گیتی کا شوق انتظار
لیکن ایسے انجم روشن جبین و تابناک
خود ہی ہو جاتے ہیں اپنی تابناکی کا شکار

اُردو

ہماری پیاری زبان اُردو
ہمارے نغموں کی جان اُردو
حسین و دلکش جوان اردو

زبان وہ دُھل کے جس کو گنگا کے جل سے پاکیزگی ملی ہے
اودھ کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے جس کے دل کی کلی کھلی ہے
جو شعر و نغمہ کے خلد زاروں میں آج کوئل سی کوکتی ہے
اسی زبان سے ہمارے بچپن نے ماؤں سے لوریاں سنی ہیں
جوان ہو کر اسی زبان میں کہانیاں عشق نے کہی ہیں
اسی زبان کے چمکتے ہیروں سے جھولیاں علم کی بھری ہیں
اسی زبان سے وطن کے ہونٹوں نے نعرۂ انقلاب[1] پایا
اسی سے انگریز حکمرانوں نے خود سری کا جواب پایا
اسی سے میری جواں تمنا نے شاعری کا رباب پایا
یہ اپنے نغمات پر اثر سے دلوں کو بیدار کر چکی ہے
یہ اپنے نعروں کی فوج سے دشمنوں پہ یلغار کر چکی ہے
ستمگروں کی ستمگری پر ہزار ہا وار کر چکی ہے
کوئی بتاؤ وہ کون سا موڑ ہے جہاں ہم جھجک گئے ہوں
وہ کون سی رزمگاہ ہے جس میں اہل اردو دبک گئے ہوں
وہ ہم نہیں ہیں جو بڑھ کے میدان میں آئے ہوں اور ٹھٹک گئے ہوں

[1] ''انقلاب زندہ باد'' تحریک آزادی کا سب سے مشہور نعرہ اردو زبان ہی کی دین ہے۔

یہ وہ زبان ہے کہ جس نے زنداں[1] کی تیرگی میں دیئے جلائے
یہ وہ زبان ہے کہ جس کے شعلوں سے جل گئے پھانسیوں کے سائے
فراز دار و رسن سے بھی ہم نے سرفروشی[2] کے گیت گائے
کہا ہے کس نے ہم اپنے پیارے وطن میں بھی بے وطن رہیں گے
زباں چھن جائے گی ہماری دہن سے، ہم بے سخن رہیں گے
ہم آج بھی کل کی طرح دل کے ستار پر نغمہ زن رہیں گے
یہ کیسی باد بہار ہے جس میں شاخ اردو نہ پھل سکے گی
وہ کیسا روئے نگار ہوگا نہ زلف جس پر مچل سکے گی
ہمیں وہ آزادی چاہئے جس میں دل کی مینا ابل سکے گی
ہمیں یہ حق ہے، ہم اپنی خاک وطن میں اپنا چمن سجائیں
ہماری ہے شاخ گل تو پھر کیوں نہ اس پہ ہم آشیاں بنائیں
ہم اپنے انداز اور اپنی زباں میں اپنے نہ گیت گائیں
کہاں ہو متوالو! آؤ، بزم وطن میں ہے امتحاں ہمارا
زباں کی ہے زندگی سے وابستہ آج سود و زیاں ہمارا
ہماری اردو رہے گی باقی اگر ہے ہندوستاں ہمارا
چلے ہیں گنگ و جمن کی وادی میں ہم تو باد بہار بن کر
ہمالیہ سے اتر رہے ہیں ترانۂ آبشار بن کر
رواں ہیں ہندوستاں کی رگ رگ میں خون کی سرخ دھار بن کر

متفرقات

دامن جھٹک کے منزل غم سے گزر گیا
اٹھ اٹھ کے دیکھتی رہی گرد سفر مجھے

گزشتہ دور خواب آلودہ پیری کا سہارا ہے
شکست عصر حاضر میں ہیں مستقبل کی تعمیریں

---

[1] اردو کے در جنوں ادیب اور شاعر قید فرنگ میں رہ چکے ہیں۔
[2] سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

تڑپ قطروں کی جب بڑھتی ہے موجوں میں نہاں ہو کر
پہاڑوں سے گزر جاتی ہے جوئے نغمہ خواں ہو کر

ڈر نہ حیات و موت کے سیل سبک خرام سے
غلطاں ہر ایک موج میں تابش صد گہر بھی ہے

کشش مکش، عظمت کردار عطا کرتی ہے
زندگی عافیت انجام نہیں ہے اے دوست

لب پہ ہلکے سے تبسم کی مٹھاس آتی گئی
زندگی کی تلخیاں شیر و شکر ہوتی گئیں

کس قدر شاداب و دلکش ہے وہ حسن نا تمام
جس کی فطرت غنچگی، دوشیزگی ہے جس کا نام

لبوں پہ مہریں لگی ہوئی ہیں، زباں پہ تالے پڑے ہوئے ہیں
وہی ہیں آداب محفل اب بھی طریقۂ انجمن وہی ہے

وقار انبالوی

ناظم علی متخلص بہ وقار قصبہ ملانہ ضلع انبالہ کے رہنے والے ہیں جہاں ۲۲ فروری ۱۹۰۳ء کو آپ کی پیدائش ہوئی ۔ موصوف کے آباؤ اجداد نصیر الدین ہمایوں کے ساتھ ہندوستان آئے تھے ۔ آپ کا شجرۂ نسب حضرت عیص بن اسحاق علیہ السلام سے ملتا ہے ۔ ملانہ کو ان کے مورث اعلیٰ ملا محمد طاہر نے مغل بادشاہوں سے جاگیر میں پایا اور اس کا نام عہد شاہجہان میں چنار تھل سے بدل کر مغلانہ رکھا گیا جو بعد میں ملانہ رہ گیا ۔ وقار صاحب کے بیشتر اعزہ و رفقاء کا پیشہ زراعت رہا ہے یہی وجہ ہے کہ دیہات اور وہاں کی سادہ زندگی سے نہ صرف حضرت وقار کو عشق ہے بلکہ اس کی جھلک اُن کے کلام میں بھی نمایاں طور پر پائی جاتی ہے ۔

وقار صاحب نے اپنی زندگی کے ابتدائی دس سال پشاور میں گزارے ہیں جہاں آپ کے دادا قدرت علی صاحب جیلر کے عہدہ پر فائز تھے ۔ قدرت علی صاحب کو شعر و ادب سے بہت لگاؤ تھا چنانچہ پشاور کے دوران قیام میں وقار صاحب کے کان شعر وشاعری سے آشنا ہوئے پھر اتفاق سے دادا کے انتقال کے بعد جب وہ ملانہ گئے تو وہاں وقار صاحب کے والد صفدر علی صاحب نے نواب احمد مرزا دھلوی کی ایک عزیزہ سے عقد ثانی کر کے اپنے ارد گرد ایک شیعی ماحول پیدا کر لیا تھا ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جناب وقار میر انیس اور مرزا دبیر کے کلام سے بخوبی روشناس ہوئے ۔ ساتھ ہی چونکہ اُن کی نئی والدہ اہل زبان ہونے کے علاوہ اچھی شاعرہ بھی تھیں اس لئے اُن کی صحبت میں اُنہوں نے زبان میں بھی خاصی دستگاہ حاصل کی اور شعر و شاعری کا جو ذوق اُن کے وجدان میں پہلے سے جگہ بنا چکا تھا وہ بھی نکھرنا شروع ہوا غرض زبان دانی اور فن شعر سے آگاہی کے معاملے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ اپنی والدہ کے رہین منت ہیں ۔ اور غالباً یہ اُنہیں محترمہ کا فیضان صحبت ہے کہ موصوف کو پھر کسی سے مشورۂ سخن لینے کی ضرورت نہیں پڑی ۔

وقار صاحب پاکستان کے قیام سے پہلے غیر منقسم ہند کے ممتاز صحیفہ نگاروں اور شاعروں میں ایک امتیازی درجہ رکھتے تھے اور قیام پاکستان کے بعد جہاں وہ پاکستان کے ایک قابل احترام صحافی اور شاعر ہیں وہیں اُن کی افکار سے برعظیم ہند و پاکستان کے وہ تمام حلقے جنھیں صحافت و سیاست سے کچھ بھی دلچسپی ہے مستفید اور لطف اندوز ہو رہے ہیں ۔ موصوف کی صحافت کی ابتدا پرتاپ ، ملاپ اور ویر بھارت وغیرہ کانگریسی اخبارات کے فکاہی کالم لکھنے سے ہوئی ۔ اس کے بعد آپ بعض نظریاتی اختلافات کی بنا پر ان اخبارات سے علیحدہ ہو کر ۱۹۳۹ء میں روز نامہ احسان میں آئے اور اُس وقت سے لے کر تقسیم ہند تک اُس کے مدیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے ۔ اس دوران میں آپ نے

۱۹۵۰ء میں مشرق وسطیٰ اور ۱۹۵۱ء میں ملایا وغیرہ کا سفر بھی کیا ۔ تقسیم کے بعد آپ نے اپنا اخبار ''سفینہ'' نکالا۔ لیکن ۱۹۵۱ء میں جب وہ بند ہو گیا تو آپ دوبارہ ''احسان'' کے مدیر ہوگئے ۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۳ء تک جاری رہا پھر آپ روزنامہ ''آفاق'' کے عملۂ ادارت میں شامل ہوئے اس کے بند ہو جانے کے بعد پھر احسان میں چلے گئے اور تا حال اسی سے متعلق ہیں ۔

وقار صاحب جیسا کہ اُن کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے ' روایتی شاعری کے قائل نہیں ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے شروع سے غزل کی بجائے نظم کو اپنے جذبات و احساسات کا ذریعہ اظہار بنایا ہے اور اب تک جو کچھ کہا ہے اُس میں غزل سرے سے ناپید ہے ۔ یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ظفر علی خاں کی طرح چونکہ وقار صاحب کا تعلق بھی بیشتر صحافت سے رہا ہے اس لئے اُن کے یہاں بھی ہنگامی شاعری کے نمونے بڑی کثرت سے ملتے ہیں ۔ بالخصوص اُن کے دو آخری مجموعے '' بیان حال'' اور ''زبان حال'' ایسی منظومات پر مشتمل ہیں جن میں موصوف کی طنز نگاری ' ہنگامی سیاست و صحافت پر اُن کی گہری نگاہ ' اور فکر و نظر کے انمٹ نقوش نظر آئیں گے ۔ یہ مجموعے در اصل قیام پاکستان کے بعد ملک کی سیاسی زندگی اور سیاست پنجاب کی افسوسناک تصویر کے ایسے نقوش ہیں جن کے مطالعہ سے بیک نظر ہم اس کے اسباب و علل کو لطیف طنز کے آئینہ میں دیکھ سکتے ہیں ۔ ان مجموعوں کی بعض نظمیں ایسی ہمہ گیر قدروں کی حامل ہیں جو کسی وقت ' کسی زمانے اور کسی ملک کے ایسے جمہوری نظام کی ترجمان بن سکتی ہیں جہاں جمہوریت اپنے ابتدائی مراحل سے گزر رہی ہو پھر لطف کی بات یہ ہے کہ یہ تمام سیاسی نظمیں ایسے دلچسپ اسلوب بے ساختہ انداز اور روز مرہ کی زبان میں لکھی گئی ہیں کہ پڑھنے والا ان سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ البتہ ان مجموعوں میں غلطی سے بعض ایسی نظمیں بھی منتخب کر لی گئی ہیں جو طنز و ظرافت کے درجہ سے گر کر ابتذال کی حد تک پہنچ گئی ہے ۔ مثال کے طور پر ''کاٹھ کے اُلو'' ہی ایک ایسی نظم ہے جسکی تفصیلات میں گئے بغیر قاری محض عنوان سے اس کی ثقاہت کا اندازہ بخوبی لگا سکتا ہے ۔

ان منظومات سے قطع نظر وقار صاحب نے کچھ رزمیہ اور کچھ دیہات سے متعلق نظمیں بھی کہی ہیں ۔ اُن کی رزمیہ نظموں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خالص ہندوستانی ہیں یعنی اُردو مراثی کے برعکس اُن کے کردار ' واقعات طرز تخیئل اور انداز بیان سب میں ہندوستانی فضا اور ماحول کا پر تو صاف نظر آتا ہے ۔ پھر اُن کی تخیئل کے تواتر اور التزام سے افراد متعلقہ کی ذہنیت متاثر ہوتی ہے جو آگے چل کر سماج میں جرأت و جوانمردی کا جذبہ پیدا کرتی اور فطرت انسانی کو ایک نیا جامہ بھی عطا کرتی ہے ۔ جہاں تک اُن کی دیہاتی نظموں کا تعلق ہے ۔ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ وقار صاحب بذات خود دیہات' وہاں کی دلکشی و پرسکون فضا اور دیہاتیوں کی سادہ و معصوم زندگی کے شیدائی ہیں اس لئے اُن کی اس طرح کی نظموں

میں دیہات کی ان خصوصیات کا تذکرہ انتہائی چابکدستی ' بے ساختگی اور لطافت کے ساتھ ہوتا ہے ۔

مختصر یہ کہ گو وقار صاحب ایک پر گو شاعر ہیں لیکن ان کی پر گوئی میں بھی ایک بے تکلفی اور شگفتہ پن ضرور پایا جاتا ہے ۔ ساتھ ہی ہنگامی واقعات کے نظم کرنے میں تو انھیں ایسی مہارت حاصل ہے کہ مولانا ظفر علی خاں کے علاوہ کم لوگوں کے حصے میں آئی ہوگی ۔ موصوف کی نثری کاوشوں سے قطع نظر منظومات کے تین مجموعے ''آہنگ رزم'' ''بیان حال'' اور ''زبان حال'' منظر عام پر آ کر خاصے مقبول ہو چکے ہیں ۔

انتخاب کلام

سپاہی کا معبد

یہ سرحد جس پہ ملتے ہیں حیات و موت کے ڈانڈے
یہ معبد جس کی زینت ہیں کمانیں ' برچھیاں ' کھانڈے
یہ مندر ' سنکھ اور گھنٹے بجاتا ہے زحل جس میں
یہ مسجد ۔ دعوت تسبیح دیتی ہے اجل جس میں
وضو خوں سے نہ ہو جب تک نہیں اس میں روا سجدہ
یہاں سر کٹ کے گرتا ہے تو ہوتا ہے ادا سجدہ
یہاں تسبیح کے دانے ہیں دل طاعت گزاروں کے
عوض پھولوں کے چڑھتے ہیں یہاں سر جاں سپاروں کے
یہاں ماتھے پہ ٹیکا خون سے چنڈی لگاتی ہے
یہاں غیرت سروں کی بھینٹ ہر لحظہ چڑھاتی ہے
عقیدت اس کے دیوانوں کے دل میں ''ھُو'' کی ہے
یہاں زمزم لہو کا ہے تو گنگا بھی لہو کی ہے
کلس پر اس کے ہمت اپنا پرچم لہلہاتی ہے
صدا ''ھل من مبارز'' کی ہر اک پہلو سے آتی ہے
یہاں دیتی ہے غیرت موت کی دیوار کو بوسہ
عقیدت کے لئے لازم یہاں تلوار کو بوسہ

یہاں مقبول ہوتی ہے عبادت نوجوانی کی
یہیں سے راہ ملتی ہے حیات جاودانی کی
یہاں احساس اور ادراک رہ رہ کر اُلجھتے ہیں
یہاں زنار اور تسبیح کے عقدے سلجھتے ہیں
خلاصہ رونق کونین کا ہے کشمکش اس کی
بقا اک خادمہ اس کی ، فنا جاروب کش اس کی
کفن بندی ہے اس کے باغ نصرت کی چمن بندی
یہاں کی بندگی ہے درحقیقت اک خداوندی
وظیفہ ہے یہاں ہر دم وطن کی خیر خواہی کا
ادب اے شوق نظارہ ! یہ معبد ہے سپاہی کا

گاؤں

گاؤں ! اے تہذیب انسانی کے نقش اولیں !
زندگی کے دور عمرانی کے نقش اولیں !
منزل صحرائیت کی آخری حد کے نشاں
تیرے ٹوٹے پھوٹے بیڈھنگے سے گارے کے مکاں
کہنہ دیواریں تری تاریخ ماضی کے ورق
تیرے مکتب سے ملا پہلا حضارت کو سبق
آدمی جنت سے نکلا تیرے دامن میں بسا
اس مسرت اور آزادی کے مامن میں بسا
بحر وحشت کا شناور تیرے ساحل پر رکا
دشت و صحرا کا مسافر تیری منزل پر رکا
رہروان زندگی کی منزل اول ہے تو
بار تہذیب بشر کا حامل اول ہے تو
رہنمایان بشر تیری ہی بستی سے اٹھے
مہر و ماہ ونجم کیا کیا تیری پستی سے اٹھے
یہ ترے کچے گھروندے مسکن اشراف ہیں
تیری چوپالیں ستونِ کعبۂ انصاف ہیں

بے ریا بھولے ترے معصوم اور سادہ مکیں
محنت و اخلاص و دلداری کے دلدادہ مکیں
روح کا سامان عشرت تیرے دلکش گیت ہیں
اور تری بستی کے باسی ہر کسی کے میت ہیں
نیند سے مخمور دلکش چاندنی راتیں تری
' پی کہاں ' کے نور سے پر نور برساتیں تری
دھوپ سے آباد تیری سردیوں کی ہر سحر
چھاؤں سے دلشاد تیری گرمیوں کی دو پہر
تیری صبح و شام کا سادہ مگر دلچسپ رنگ
آدمی کے دل میں بس رہ رہ کے اٹھتی ہے اُمنگ
ڈھاک کے پھول' آم کے پھل' چھاؤں ٹھنڈی نیم کی
رشک کھائے بادشاہت اُس پہ ہفت اقلیم کی
لیکے چوپایوں کے گلے خانۂ دھقان سے
پھرتے ہیں چرواہے اک پیغمبرانہ شان سے
کھیت میں خود دار مزدور اور جفاکش محنتی
جن کا مسلک ہے عمل اور جن کا مشرب سادگی
تیرے میدانوں کی زرخیزی سے دولت شرمسار
تیرے ویرانوں کی خاموشی پہ ہنگامے نثار
حسن سادہ کی فسوں خیزی ! الٰہی الاماں !
عشق صادق کی جنوں خیزی ! الٰہی الاماں
پاسدار عصمت مریم ' کنواری لڑکیاں
ناشناس فکر بیش و کم ' کنواری لڑکیاں
ناچتے ہیں گیت اُن کی محنتوں کے ساز پر
چکیوں کی منضبط اور دل ربا آواز پر
اک طرف ساون کی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار
اک طرف ان کے سریلے مست گیتوں کی بہار
سردیوں کی لمبی راتوں میں فسانہ گوئیاں
گرمیوں کی دوپہر میں باھمی دلجوئیاں
شہر کے پر شور ہنگاموں سے گھبراتا ہوں جب
رات دن کی کاھش پیہم سے اکتاتا ہوں جب

تیری جانب دوڑ کے بے ساختہ آتا ہوں میں
دل کا اطمینان اس ماحول میں پاتا ہوں میں
تجھ سے وابستہ مرا سرمایۂ تاب و قرار
کچھ عزیزوں کے مکاں ہیں کچھ بزرگوں کے مزار
وقت کی رفتار مجھ کو یاں نظر آتی ہے سست
جسم کی بگڑی کلیں ہوتی ہیں یاں آ کر درست
زندگی کی حرکتوں میں اک سکون دل نواز
شادمانی خرمی کا اک فسون دل نواز
تیرے میدانوں کی وسعت میں مرا پیک خیال
چار جانب دوڑتا ہے بے کے ادراک جمال
لطف اٹھاتا ہوں تری روشن فضا میں بیٹھ کر
گیت گاتا ہوں تری تازہ ہوا میں بیٹھ کر
میری خواہش، میری آسائش مری مرضی ہے تو
کہوں کیا؟ میری نظر میں جنتِ ارضی ہے تو

ایک لیگی رہنما سے

خدا نے تجھ کو دیا ہے دل حمیت کوش
سریر و تاج پہ ہنستے ہیں تیرے خرقہ پوش
پہنچ سکے نہ ترے شہپر عزیمت کو
اگرچہ پھرتے رہے صید مند دام بدوش
تری نگاہ سے ٹوٹا فرنگیوں کا طلسم
ترے کلام نے غیروں کو کر دیا خاموش
خدا نصیب کرے تجھ کو ضربت کاری
بتان عصر ترے خوف سے رہیں روپوش
قوی پہ طنز رہے ترا جسم زار و نحیف
ترے عتاب سے عاجز ہو صاحب تن و توش
تری زباں پہ رہے لا الہ الا اللہ
ترے لہو میں رہے زندگی کا جوش و خروش
سمجھ یہ نکتہ کہ تقدیر روبہ فردا ہے
لپٹ چکا تہ ماضی میں کارنامۂ دوش

کٹھن ہے راہ تمنا قدم بڑھائے جا
قضا و قدر کے رہگیر ہیں ترے ہم دوش
ترے عمل پہ تقاضا ہے سخت کوشی کا
امیر قافلۂ سخت کوش و پیہم کوش
کہ در قبیلۂ ما حیدری زکرّاری ست

ممبری

جب اہل زر کے سر میں سماتی ہے ممبری
گل باغ آرزو میں کھلاتی ہے ممبری
ممبر کی آرزو پہ زمانے کو رشک ہے
ممبر کے خلق و خو پہ زمانے کو رشک ہے
شہرت پہ ہاؤ ہو پہ زمانے کو رشک ہے
جو کچھ بھی چاہے کر کے دکھاتی ہے ممبری
سو سو طرح کے ناچ نچاتی ہے ممبری
سر بے شمار جھکتے ہیں ممبر کے سامنے
اور بار بار جھکتے ہیں ممبر کے سامنے
اغیار و یار جھکتے ہیں ممبر کے سامنے
دشمن سے بھی خراج دلاتی ہے ممبری
جب جلوۂ جلال دکھاتی ہے ممبری
کرسی بلند، اس کے لئے ہال بھی بڑا
باتوں میں زور، ہاتھ میں زر، مال بھی بڑا
اس کے شکار بھی ہیں بڑے جال بھی بڑا
چاہو جسے اسی کو پھنساتی ہے ممبری
لاسہ بری طرح سے لگاتی ہے ممبری
حاکم پہ اس کا رعب ہے محکوم اس کے ساتھ
چھوٹی بڑی ہزار سفارش ہے اس کے ہاتھ
منہ زور ہو جو کوئی تو رشوت سے دے یہ ناتھ
خورد و کلاں پہ رعب جماتی ہے ممبری
اچھے برے پہ دھونس جماتی ہے ممبری

یہ ممبری ہے ایک الہ دین کا چراغ
دل کو ہے اس سے چین طبیعت کو ہے فراغ
رہتا ہے ممبروں کا سدا عرش پر دماغ
چرخ بریں کی سیر کراتی ہے ممبری
ممبر کو اس طرح سے آٹھاتی ہے ممبری

منتر ہے اک یہ مال جہاں کے حصول کا
وا اس کی ہر دعا کے لئے در قبول کا
کھٹکا رسوم کا ہے نہ جھگڑا آصول کا
پابندیوں پہ چوٹ لگاتی ہے ممبری
بنک اور مِل الاٹ کراتی ہے ممبری

منزل یہ عیش کی ہے، مگر راستہ کٹھن
لاکھوں ھی کرنے پڑتے ھیں اس کے لئے جتن
ہے دور انتخاب کا اک دور پر فتن
جب ووٹروں کے ناز آٹھاتی ہے ممبری
نیچا بڑے بڑوں کو دکھاتی ہے ممبری

شورؔ علیگ

منظور حسین نام شور تخلص ، جولائی ۱۹۱۰ء میں امراؤتی (سی - پی) میں پیدا ہوئے - ابتدائی تعلیم اپنے وطن امراؤتی میں حاصل کرنے کے بعد آپ علی گڑھ چلے گئے جہاں میٹرک سے لیکر ایم - اے اور ایل - ایل - بی تک کے امتحانات پاس کئے - اس لحاظ سے گویا علی گڑھ کو آپ کے ادبی وطن کی حیثیت حاصل ہے - ۱۹۳۷ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے قانون کا آخری امتحان پاس کر کے آپ وطن واپس گئے اور ۱۹۳۸ء میں ناگپور یونیورسٹی کے شعبۂ ادبیات فارسی اور اردو میں بطور ریڈر و صدر شعبہ آپ کا تقرر ہو گیا - انقلاب ۱۹۴۷ء تک ناگپور ہی میں قیام رہا - تقسیم ہند کے بعد آپ پاکستان تشریف لے آئے یہاں ابتدا میں کچھ عرصہ تلاش معاش میں پریشان رہے بارے کامیابی ہوئی اور درس و تدریس کا محبوب مشغلہ دوبارہ جاری ہوا - اس سلسلے میں اب تک آپ کئی اداروں سے منسلک رہ چکے ہیں - شروع میں ''زمیندار کالج'' گجرات میں اُستاد رہے - اُس کے بعد ''اسلامیہ کالج'' لائلپور چلے گئے اور آجکل گورنمنٹ کالج لائل پور میں ہیں -

شور صاحب کی شاعری کا آغاز علی گڑھ کے زمانہ طالب علمی سے ہوا - ابتدائی کلام ''علی گڑھ میگزین'' میں چھپا - پھر کچھ عرصہ تک ''نگار'' میں آپ کی نظمیں شائع ہوتی رہیں اور اب پاکستان کے مؤقر جرائد میں بالالتزام آپ کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے - شور صاحب کبھی کبھی غزل بھی کہہ لیتے ہیں لیکن بیشتر نظمیں کہتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اُنہوں نے اپنی نظموں میں مشاہدہ ، احساس تفکر اور ہمہ گیر خصوصیات نہایت کامیابی کے ساتھ سموئی ہیں اور انہیں خصوصیات کی بدولت وہ دور جدید کے خوش فکر شعراء میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں -

حضرت شور کی منظومات کے مطالعہ کے بعد جو چیز پڑھنے والے کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ احساس کی شدت ہے - اُن کی بیشتر منظومات میں جذبات کا ایک طوفان اُمنڈتا ہوا نظر آتا ہے اور چونکہ شاعر کے ان جذبات و احساسات کو صدق و خلوص کی پشت پناہی حاصل ہے اس لئے اُس کا ہر شعر ایک زندہ حقیقت اور درد و اثر کا خزانہ بن گیا ہے - شور صاحب پر انقلابات زمانہ اور ماحول کا بھی نمایاں اثر ہوا ہے چنانچہ

اُنکے کلام میں غم جاناں پر سماج اور انسانیت کا غم رفتہ رفتہ حاوی ہوتا چلا گیا ہے۔ لیکن اس اہم تغیر کی تہ میں جو چیز کام کر رہی ہے وہ شور صاحب کا گہرا و عمیق مشاہدہ ہے۔ اسی مشاہدہ نے آہستہ آہستہ اُنہیں ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیا ہے جہاں ہر ہر قدم پر افسردہ لڑکپن، پژمردہ شباب، بے سر و ساماں بڑھاپے، بھوک، افلاس، درد و کرب اور چیخ پکار سے دو چار ہونا پڑتا ہے اور چونکہ یہ اپنی دیکھی بھالی اور ذاتی مشاہدے کی دنیا ہے اس لئے اس کی ترجمانی میں ابہام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

موضوع سے قطع نظر جہاں تک ہیئت کا تعلق ہے شور صاحب نے کوئی اجتہاد نہیں کیا۔ اُن کی تقریباً تمام نظمیں پابند ہیں اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر ردیف و قافیہ کے حسن و ترنم کے قائل ہیں۔ اُن کے اسلوب میں بڑی پختگی و دلنشینی ہے اور وہ الفاظ کے موزوں و بر محل استعمال پر بھی قادر ہیں۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ اکثر الفاظ کے مناسب استعمال سے لفظ و خیال میں ایک صوتی ہم آہنگی پیدا کر دیتے ہیں، اسکے علاوہ عمدہ و لطیف تشبیہات، تمثیلات اور استعارات اور بعض جگہ معنی خیز اشاریت اُن کے اُسلوب بیان کو اور بھی جاذب و دلکش بنا دیتی ہے۔ عام طور پر بڑی سادہ اور رواں زبان استعمال کرتے ہیں لیکن اس سادگی و روانی میں ایک صفائی، ایک علمیت اور ایک پرکاری ضرور جھلکتی ہے۔

بحیثیت مجموعی پروفیسر شور پاکستان کے اُن چند شعرا میں سے ہیں جو اپنے مشاہدے اور حقائق سے کام لے کر اُردو شاعری میں کچھ نہ کچھ اضافہ کر رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کا شعری سرمایہ مختصر ہے تاہم اُن کی شاعری ابھی ارتقائی منزل میں ہے اور وہ اپنے زرسخن کو جس کاوش و احتیاط کے ساتھ فکر و فن کی بھٹی میں پگھلا رہے ہیں اُس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تھوڑے ہی ریاض کے بعد اسے زر خالص بنانے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔

انتخاب کلام

دولت کی خدائی

انکھڑیوں کی مستیاں دوشیزہ رخساروں کی آگ
میری مٹھی میں ہے حسن مصر و روما کا سہاگ
عفتوں کے خون سے شاداب میری وادیاں
رقص فرما ہیں مرے سازوں پہ مریم زادیاں
عصمتیں اکثر پگھل جاتی ہیں میری آگ میں
ایسی زنجیریں بھی گل جاتی ہیں میری آگ میں
میرو سلطان و وزیر و کجکلاہ و تاجدار
میرے فتراکوں کے آہو، میرے تیروں کے شکار

فرّ جاگیر و وراثت ، قصر و ایوان کا وقار
میری ٹھوکر کے خزف ، میری شرابوں کا خمار
چتر جم ، اورنگ پرویزی ، قبائے بخت یار
میری صبحوں کے دھندلکے ، میرے رستوں کے غبار
نخوتیں میری وراثت ، عشرتیں میری برات
ساغر و مینا کی صبحیں ، عارض و گیسو کی رات
زمزمے میرے اُجالے ، قہقہے میرے چراغ
خون آدم زاد سے دھکے ہوئے میرے ایاغ
سیم و زر میرے نبی ، لعل و گہر میرے رسول
میرا اعجاز خلافت کھیتیوں کا عرض و طول
مرہم حج و زیارت ، زخم دینار و درم
میرے ناسوروں سے چھلنی سینۂ مصر و عجم
میرے ناخن سے کلیساؤں کے سینوں پر خراش
معبد و ہیکل کی نورانی جبینوں پر خراش
راہب و صوفی میرے گم کردہ منزل راہ گیر
میری محرابوں میں دل ، میرے ہی طاقوں میں ضمیر!
جبہ و دستار کو میری خلافت کا شرف
سبحہ و زنار میرے ہی خدنگوں کے ہدف
ہر عزا خانے میں بے گور و کفن میرے شہید
ہر حسین آباد میں میرے تراشیدہ یزید
میرے بوجہلوں کی زد پر ہر پیمبر کا وقار
کھیلتے ہیں میرے زناری خداؤں کا شکار
جرم و جہل و کذب وعصیاں میرے ہی نشے میں چور
میرے کس بل پر رذالت کو شرافت کا غرور
مجھ سے نسلیں سرگراں ، مجھ سے نجابت کا حشم
مجھ سے چہرے معتبر ، مجھ سے ضمیروں کے بھرم
مفلسی سب سے بڑا میری شریعت میں گناہ
زہر میرا ہر تبسم ، طنز میری ہر نگاہ!
خود فروشی میری فطرت ، پردہ پوشی میرا کام
مجھ سے چھپ جاتا ہے نسل و آدمیت کا جذام

میری راتیں میرے دن میرے شبستاں میرے خواب
چھین لوں میں جس سے چاہوں ماہتاب و آفتاب
طاعت و تقدیس و عرفاں آؤ میری سمت آؤ !
اپنے سر ، اپنی جبینیں میرے قدموں پر جھکاؤ !
کون سی دوکان پر دیر و حرم بکتے نہیں
یا خدا بکتا نہیں ہے یا صنم بکتے نہیں
اطلس و دیبا میں بھی عریاں رہیں جن کے بدن
اُن غلاموں کے بھی ماتھوں پر ہے سونے کی شکن

اندیشے

نور و نکہت میں وہ بہتی ہی رہی ہے اکثر
ہمکنار گل و لالہ ہے ابھی اُس کی نظر
وہ سمجھتی ہے کہاں برق و شرر کے تیور
دُور ہر موج سے سوئی ہے وہ اک ساحل پر

دور طوفاں سے بہت دور وہ سوئی ہے ابھی
سوچتا ہوں اُسے بیدار کروں یا نہ کروں

وہ اگر جاگ گئی ، جاگ کے پچھتائے گی
چونک اُٹھی تو اسے نیند نہ پھر آئے گی
اپنے خوابوں کے تصور سے بھی گھبرائے گی
اپنے احساس کے شعلوں ہی میں جل جائے گی

اُس نے دیکھی نہیں موجوں کی تباہی اب تک
اُس کو طوفاں سے خبردار کروں یا نہ کروں

اُسکی خلوت میں شفق ، اُسکے شبستاں میں سحر !
اُسکے رستوں کے تو ذرے بھی ہیں الماس و گہر
اُسکے تیور میں نہاں سطوت زار و سنجر
اُسکے نغموں کی غلامی میں ہیں ناہید و قمر

وادیاں اُسکی ، فضا اُسکی ، ہوائیں اُسکی
ایسے آہو کو گرفتار کروں یا نہ کروں !

گر یہ ساماں تو نہیں ہنس کے ہنسانا اُس کا
زہر آلودہ کہاں جام شبانہ اُس کا
وہ سمجھتی ہے زمانہ ہے زمانہ اُس کا
حاصل بزم دو عالم ہے فسانہ اُس کا

جس کو دنیا کی تباہی کا تصور بھی نہیں
ایسی غمخوار کو غمخوار کروں یا نہ کروں

روح عفت گنہ جنگ سمجھتی ہی نہیں
فتنۂ افسر و اورنگ سمجھتی ہی نہیں
زندگی موت کا آھنگ سمجھتی ہی نہیں
طاعت عشق کو وہ ننگ سمجھتی ہی نہیں

ایسی معصوم ہے ھنستی ہی چلی جاتی ہے
اُس کی آنکھوں کو گہر بار کروں یا نہ کروں

اُسکی نظروں میں دھکتے ہوئے آلام کہاں
اُسکی نظروں میں سلگتے سحر و شام کہاں
اُسکی نظروں میں خراش دل ایام کہاں
اُسکی نظروں میں بھلا زہر بھرے جام کہاں

وہ مرے دلکی دھڑک سے بھی نہ برھم ہو جائے
ایسے طوفاں میں اُسے پیار کروں یا نہ کروں

چشمک تیغ و سناں اُسکے تصور میں کہاں
خون کی جوئے رواں اُسکے تصور میں کہاں
زلزلے شعلہ فشاں اُسکے تصور میں کہاں
جلتی لاشوں کا دھواں اُسکے تصور میں کہاں

نیت فطرت خونخوار سمجھتی ہی نہیں
ایسی مدھوش کو ھشیار کروں یا نہ کروں

نور و نغمہ کی پیمبر، وہ محبت کی رسول
جسکی نظروں میں نہیں جبر مشیّت کا شمول
آہ ! جو یاسمن و گل سے بھی نازک ہو وہ پھول
کر سکی جسکو نہ میلا کبھی افکار کی دھول

جسکی دنیا میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
اُسکی دنیا سے بھی انکار کروں یا نہ کروں

راستے

ارض ''ناقوس'' و ''اذاں'' جولانگہ اہل کتاب
اک شب بے ماہ و اختر، اک سحر بے آفتاب

وہ زمیں بستے ہیں جس پر زہد کے پالے گناہ
معبدوں کی کھڑکیوں سے جھانکنے والے گناہ

برہمن زادوں کی گلیاں، راہبوں کے رہ گذار
بے بہ بے کوچہ بہ کوچہ آدمیت کے مزار

''زہد'' کی فتنہ گری ''زنار داروں'' کے فریب
ایسی کالی رات اور یہ ''چاند'' ''تاروں'' کے فریب

خون آدم کا تلاطم رہگزر در رہگزر......
آدمیت کا جنازہ ''کفر'' و ''دیں'' کے دوش پر

کس قدر ''تسبیح خواں'' ہیں کس قدر ''زنار دار''
اٹھ رہا ہے ہم نفس وہ دیکھ رستوں سے غبار

آہ وہ رستے رواں ہوں جن پہ ڈاکو سیکڑوں
گامزن ہوں جن پہ چنگیز و ہلاکو سیکڑوں

روندتے ہوں جن کو ''منعم'' جن پہ ہنستے ہوں ''امیر''
جن پہ لو دیتی ہوں نظریں جن سے بجھتے ہوں ضمیر

کس قدر مفلوج ان رستوں میں محو خواب ہیں
گود میں ان ساحلوں کی کس قدر سیلاب ہیں

کتنے ''عارف'' کتنے ''صوفی'' کتنے کعبے کے ''امام''
گامزن ہیں کتنے قیدی، گرم رو کتنے غلام

خاک برسر کیسے کیسے بے نوا خانہ بدوش
کتنی آہیں، کتنی چیخیں، کتنے غم، کتنے خروش

کتنی میلی چادریں ہیں کتنے برقعوں میں ہے خاک
کتنے دامن ہیں دریدہ، کتنے پیراہن ہیں چاک

سوختہ کتنے جگر ہیں، کتنے سینے دل فگار
کتنی آہیں بے اثر ہیں، کتنی آنکھیں اشکبار

کیسے کیسے بے سر و ساماں بڑھاپے صرف خواب
کتنے افسردہ لڑکپن، کتنے پژمردہ شباب

کس قدر جلوے غبار راہ میں گم ہیں یہاں
خون میں ڈوبے ہوئے کتنے تبسم ہیں یہاں
جانب ''دیر'' و ''کلیسا'' جانے والے رہگزار
اُف یہ سانپوں کی طرح لہرانے والے رہگزار
''خانقاھوں'' کے مقدس خواب دکھلاتے ہوئے
سرمدیں آذر کدوں کے زمزمے گاتے ہوئے
دور سے آغوش پھیلاتے ہیں کتنے راستے
بن بلائے سامنے آتے ہیں کتنے راستے
ہم نوا میرا نہ کوئی ہم سفر میرے لئے
کتنی وحشت ناک ہے ہر رہگزر میرے لئے

ملاّح

یہ گاتے زلزلے، یہ ناچتے طوفان کے دھارے
ہوا کی نیتوں سے بے خبر ملاح بیچارے
وہ طوفانوں کے ہل چلنے لگے سیال کھیتی میں
وہ کشتی آکے ڈوبی گوھریں قطروں کی ریتی میں
وہ ٹوٹیں موج کی شفاف دیواریں سفینوں پر
وہ پھر لہریں اُبھر آئیں ارادوں کی جبینوں پر
وہ ٹکرانے لگی آواز نیلے آسمانوں سے
وہ خط رہگزر پر جل اُٹھیں شمعیں ترانوں سے
ہوائیں تھم نہیں سکتیں، تلاطم رک نہیں سکتے
مگر موج و ھوا کے سامنے سر جھک نہیں سکتے
سفینے ہیں کہ طوفاں کے تھپیڑے کھائے جاتے ہیں
مگر ملاح گیت اپنے برابر گائے جاتے ہیں
ہیں کتنے غم کہ جنکی مے سرور انگیز ہوتی ہے
ہیں کتنے گیت جنکی لو ھوا سے تیز ہوتی ہے
کھنچا ہو جن کا خط رہگزر طوفاں کے دھاروں پر
بڑی مشکل سے اُن کو نیند آتی ہے کناروں پر

نہال سیوہاروی

عبدالخالق نام نہال تخلص ۲۷ اگست ۱۹۰۱ء کو سیوھارہ ضلع بجنور (یو۔پی) میں نعمت ہستی سے بہرہ ور ہوئے ۔ آپ کے والد قاضی عبدالواسع صاحب سیوھارہ کے شرفا و معززین میں شمار ہوتے تھے اور ساتھ ھی شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے ۔

نہال صاحب نے ابتدائی تعلیم کے بعد اسکول کی زندگی سے کنارہ کشی کر لی ۔ فارسی و انگریزی کی تعلیم گھر پر حاصل کی ۔ فطری طور پر آپ کا رجحان طبع جس قدر ادب کی طرف مائل تھا اُسی قدر ریاضی سے طبیعت دور بھاگتی تھی یہی وجہ تھی کہ آپ گھریلو تعلیم اور ذاتی مطالعہ پر اکتفا کر کے اپنی علمی و ادبی تشنگی بجھاتے رہے ۔ لیکن حالات کی ستم ظریفی اور اتفاقات کی عجوبہ کاری دیکھئے کہ بچپن میں جس ''حساب کتاب'' سے طبیعت راہ فرار اختیار کرتی تھی وھی ''حساب کتاب'' اُن کا ذریعہ معاش بنا ۔ چنانچہ نوجوانی میں جب وہ تلاش روزگار میں سیوھارہ سے دھلی آئے تو ڈویزنل اکاؤنٹس آفس نارتھ ویسٹرن ریلوے میں ملازم ہوئے اور تقسیم ھند تک وہ دھلی میں اسی محکمہ سے متعلق رھے ۔ قیام پاکستان کے بعد آپ پاکستان چلے آئے اور کراچی میں اپنی پرانی جگہ پر کام کرتے رھے ۔ تاآنکہ جنوری ۱۹۵۲ء میں موصوف نے انتقال فرمایا ۔

حضرت نہال کو بچپن ھی سے شعر و شاعری سے دلچسپی تھی ۔ مشق سخن کی بدولت اس دلچسپی میں اور بھی اضافہ ھوتا گیا ۔ پھر مشرقی و مغربی شاعری کے مطالعہ اور عمر کی رفتار کے ساتھ ساتھ اُن کے کلام میں پختگی اور گہرائی و گیرائی بھی پیدا ھوتی گئی ۔ نہال صاحب اُن شعرا میں سے ھیں جنہوں نے دبستان فطرت سے درس انسانیت و محبت لیا اور مکتب زندگی سے انسانی اُخوت اور بھائی چارے کا سبق سیکھا ۔ چنانچہ زندگی سے براہ راست حاصل کئے ہوئے تجربات اُن کے ذھنی سرمائے کا بڑا حصہ ھیں ۔ اُن کا کلام تخریبی میلانات ، تشکک اور لذت پرستی کے عناصر سے پاک ھے ۔ اُن کے موضوعات اپنی گہرائی ، پہنائی اور تنوع کے اعتبار سے پوری زندگی پر حاوی ھیں زندگی کا جدلیاتی نظریہ ، انسانی فطرت کی لازوال عظمت اور اُس کا احساس ، غموں میں تفاول اور مجبوریوں میں بلند عزائم کی پاسداری ، عالمگیر محبت کا خواب ، یہ اُن کے محبوب ترین موضوعات ھیں ۔ ساتھ ھی اُن کے کلام میں رجائیت اور سرمستی اس بلا کی ھے کہ بجھے ہوئے دلوں میں ایک بار زندگی کروٹیں لینے لگتی ھے ۔ اُن کی غزلیات ، رباعیات اور منظومات کا ھر شعر ایک نئے جوش ، نئے ولولے اور نئے عزم سے بھر پور نظر آتا ھے اور ایسا معلوم ھوتا ھے کہ اُردو کا یہ جواں سال شاعر ازل سے استقلال و پامردی کی لازوال خصوصیات سے مشرف تھا ورنہ

پائے ہمت سے مصائب کو کچلنا چاہئے
مسکرا کر سرخ انگاروں پہ چلنا چاہئے
باوجود غم مسلسل قہقہے اے نامراد!
کاروان زندگی کے ساتھ چلنا چاہئے

مصائب و آلام زندگی کے دھکتے ہوئے انگاروں کو روندنا اور کاروان زندگی کے ساتھ چلنے کے لئے نامرادی و رنجوری میں مسلسل قہقہے لگانا ہر شخص کے بس کا روگ نہیں۔

حضرت نہال مرحوم ہمیں ایک نئے دور کا پیغام دیتے ہیں۔ اس پیام میں خواجہ حافظ کا لب و لہجہ اور علامہ اقبال کا اعتماد ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مرحوم کے ذہن میں کوئی ایسا واضح اور متعین تصور نہیں تھا جسکی تفصیلات و جزئیات فلسفہ کی بنیادوں پر قائم ہوں تاہم اُن کے تصورات میں ایک ہم آہنگی اور وسعت ضرور پائی جاتی ہے۔ ساتھ ہی چونکہ نیم پخت رومانیت اور انقلاب کے ترانے ہی اُن کا سہارا نہیں ہیں اس لئے اُن کی ہیئت شعر میں ایک وقار پایا جاتا ہے۔ جس میں کلاسیکی انداز ہیں۔ تفکر کے باوجود اُن کی زبان میں انتہائی سادگی، سلاست اور ترنم ہے اور الفاظ آئینہ سے زیادہ صاف، تلوار سے زیادہ تیز اور پانی سے زیادہ رواں ہیں۔

جدلیاتی نظریہ، اکثر شعر کے دو مصرعوں میں الفاظ کی خاص تکرار اور دروبست سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور یہ فن کارانہ وصف جناب نہال کا طغرائے امتیاز ہے۔ اُن کے کلام میں الفاظ کی تازگی، آہنگ اور آرائش کا بڑا اچھا اہتمام ملتا ہے۔ مختصر یہ کہ گو مرحوم کی شاعری پر کوئی خاص لیبل نہیں لگایا جا سکتا تاہم موضوعات کی وقعت، زندگی کی تنقید، انتخاب کی قوت، ہیئت کی رعنائی اور خلوص کی شدت کے معیار پر اگر اُن کے کلام کو پرکھا جائے تو اُنہیں ایک خوش فکر شاعر ضرور تسلیم کرنا پڑیگا۔ افسوس کہ مرحوم کی زندگی نے وفا نہ کیا ورنہ وہ جس ذہن اور جذبے سے اپنی شاعری کی آبیاری کر رہے تھے اُس سے اُن کے کلام کے اور زیادہ نکھرنے اور سنورنے کی توقعات وابستہ تھیں۔ حضرت نہال کے دو مجموعے ”گلبانگ آزادی“ اور ”شباب و انقلاب“ شائع ہو چکے ہیں۔ ”گلبانگ آزادی“ وطنی اور قومی رباعیات کا مجموعہ ہے اور ”شباب و انقلاب“ منظومات و غزلیات پر مشتمل ہے۔

انتخاب کلام

منظومات

کھیل

گزر دلاورانہ کر جہاں سے کھیلتا ہوا
زمیں سے کھیلتا ہوا، زماں سے کھیلتا ہوا

بساط عشق پر وهی هے کامیاب عشق جو
سدهار جائے اپنے نقد جاں سے کھیلتا ہوا
مصائب جہاں ہیں دل شکن یہ مانتا ہوں میں
گزر بھی جا مصائب جہاں سے کھیلتا ہوا
نہ روک پائے عزم ابھی ہے دور منزل یقیں
قدم یوں ھی بڑھائے جا گماں سے کھیلتا ہوا
الم کی تلخیوں میں بھی مسرتوں کے گیت گا
نوا زنِ بہار بن خزاں سے کھیلتا ہوا
مرے وطن کی زندگی کا کہیئے جس کو عہد نو
وہ آ رہا ہے نیزہ و سناں سے کھیلتا ہوا
سمجھ گیا جہاں کے نظم کہنہ و جواں کو میں
جہاں کے نظم کہنہ و جواں سے کھیلتا ہوا
بلند و بے نیاز رکھ سر غرور زندگی
ہزار دشمنہائے جانستاں سے کھیلتا ہوا
ہمیں ہے یاد سرگزشت زندگی ''نہال'' کی
ہوا تمام، حسن گل رخاں سے کھیلتا ہوا

آدم

کون و مکاں میں غایت کون و مکاں ہے آدمی
اصلِ جہاں سے بے خبر اصل جہاں ہے آدمی
روز ازل سے ہے لئے دوش پہ بار کائنات
ذرۂ ناتواں نہیں کوہ گراں ہے آدمی
اس کا خرام تند و تیز رونق عرصۂ ستیز
عرصہ گہ ستیز میں سیل رواں ہے آدمی
جب یہ نہ ہو تو رونق خمکدۂ حیات کیا
خمکدۂ حیات کا پیر مغاں ہے آدمی
عقل جسے نہ پا سکی، ذہن میں جو نہ آ سکا
وہ دل کائنات کا سرِّ نہاں ہے آدمی
ایک نفس کے ساتھ ہیں گرچہ ہزار انقلاب

همت آدمی تو دیکھ پھر بھی جواں ہے آدمی
مالک همت بلند ' مہر میں سے ارجمند
عرش نشاں ہے اور کون ' عرش نشاں ہے آدمی
خم رہے کیوں سر غرور جلوۂ دھر کے حضور
اپنی تجلیوں سے آپ ایک جہاں ہے آدمی
معرض گفتگو میں ہیں تازہ ترین مکاشفات
ارض و سما سنو سنو گرم بیاں ہے آدمی
حیرت و اشتیاق سے دیکھ رہے ہیں برق و باد
کون سی منزلوں کی سمت تیز رواں ہے آدمی
کچھ خزاں نہ کچھ بہار ' اک سرور اک خمار
وجہ بہار آدمی ' وجہ خزاں ہے آدمی
جس کی بلندیوں سے ہوش اڑتے ہیں جبرئیل کے
دیکھ تو کس مقام پر زمزمہ خواں ہے آدمی
اف رے یہ تابناکیاں ایک شرار عشق کی
عہد ازل سے آج تک شعلہ بجاں ہے آدمی
فطرت آدمی ہے یہ ' ثمرۂ آگہی ہے یہ
کوئی ہو مبتلائے غم ' صرف فغاں ہے آدمی
رونق کاروبار دھر همت آدمی سے ہے
جوش پہ یہ بہار دھر همت آدمی سے ہے

گلبانگ آزادی

ہر موج کے لب پہ صبح و شام آزادی بہتے ہوئے دریا کا خرام آزادی
زنہار یہ اے بندۂ آزاد نہ بھول فطرت کا ہے اولیں پیام آزادی

سرمایۂ عیش کائنات آزادی ہر غم سے وسیلۂ نجات آزادی
یہ راز سکندر کو بھی معلوم نہ تھا ہے خمکدۂ آب حیات آزادی

کس نے جو غلامی کو وہ ناگ آزادی گرمائے جو باطن کو وہ آگ آزادی
اک مطرب نوخیز یہ کل کہتا تھا آزاد جوانی کا ہے راگ آزادی

سر مخزن احساس تمام آزادی | ہے بادۂ زندگی کا جام آزادی
بے آب بقا ہے جنکی مینائے حیات | اُن مردہ دلوں پہ ہے حرام آزادی

عزم و عمل

اے دور فلاکت و مصیبت کٹ جا | آہستہ خرامی سے نہ چل ' سر پٹ جا
اے روز نشاط مسکراتا ہوا بڑھ | اے غم کی سیاہ رات پیچھے ہٹ جا

سر تا بقدم زندگی ایمانی | پر جوش سمندر کی طرح طوفانی
یہ موت کے سرد راگ اوروں کو سنا | اے مطرب دھر میں ہوں پاکستانی

ذرے ہیں اگر تو مل کے صحرا ہو جائیں
قطرے ہیں اگر تو مل کے دریا ہو جائیں
ہے قوم کو اک لشکر اعظم درکار
ہیں جتنے فدائے قوم یک جا ہو جائیں

محنت کش و نباض مزاج دوراں | ترمیم کن رسم و رواج دوراں
دیکھے تو کوئی مرد مسلماں کی یہ شان | کاندھے پہ گلیم ' سر پہ تاج دوراں

طوفان کی سختیاں اُٹھانے والا | طوفان کو خاطر میں نہ لانے والا
گھستا ہے جبین عجز سے دنیا کا غرور | درکار ہے دنیا کو جھکانے والا

ہو بزم جہاں میں جب درندوں کا عمل | اے مرد جری بعزم پیکار نکل
مایوس نہ ہو کہ رنگ لائے گی ضرور | یہ جنگ وجدل ' جنگ وجدل ' جنگ وجدل

ناموس وطن کی پاسباں ہے تلوار | محبوبۂ مردان جہاں ہے تلوار
بے زور ہے جس ہاتھ میں تلوار نہیں | ارباب شجاعت کا نشاں ہے تلوار

زائل جو کبھی نہ ہو وہ مستی ہے جہاد | ہستی کے لئے ثبوت ہستی ہے جہاد
اونچی ہے جو شاخ گل تو مایوس نہ ہو | ایسے میں تری دراز دستی ہے جہاد

غزلیات

چارہ فرمائی دل رسم بتاں ہے تو سہی
ابھی کچھ مہر و محبت کا نشاں ہے تو سہی
نقش پا تیرا ہے گر تو نہیں اے حشر خرام
اک نہ اک باعث آشوب جہاں ہے تو سہی
آپ سے آپ تو پیدا نہیں یہ لالہ و گل
کوئی آخر چمن آرائے جہاں ہے تو سہی
یہ بھی کہتے ہیں کہ ہے عرض تمنا بے سود
یہ بھی کہتے ہیں ترے منہ میں زباں ہے تو سہی
جلوۂ دوست کو سمجھا نہیں یہ بات ہے اور
جلوۂ دوست محیط دل و جاں ہے تو سہی
چاہئیے اور تجھے کیا پئے ہنگامۂ حسن
تیرے قرباں یہ سب کون و مکاں ہے تو سہی
ہم نے مانا کہ نہیں حالی و مجروح ' نہال
پیروِ غالب اعجاز بیاں ہے تو سہی

گرمئی عشق کے بغیر لطف حیات رائیگاں
عشق ہے زندگی کا روپ ' عشق سے زندگی جواں
ہائے وہ چند ساعتیں گزریں جو تیرے قرب میں
رشک سے دیکھتی رہی جن کو حیات جاوداں
اُف ری منازل بلند تیرے حریم ناز کی
پائے طلب کو کتنے طے کرنے پڑے ہیں آسماں
برق کی دسترس سے دور ' عصرِ نوی کے اے طیور
اور بلند آشیاں اور بلند آشیاں
گرم حصول جوئے شیر ' ہاں یوں ہی مرد تیشہ گیر
تیشہ زنی ہے دھر میں اصل حیات کامراں
محتسبِ شراب تو بزم جہاں میں ہیں بہت
یہ بھی کہو کہ ہے کوئی محتسب غم نہاں

جذبۂ ہمت اے نہال جب ہو مرا شریک حال
میرے لبوں پہ آئے کیوں شکوۂ گردش زماں

رابطہ ہے مجھے شیشے سے نہ پیمانے سے
پھر وہ کیا بات ہے منسوب ہوں میخانے سے
اہل میخانہ سلیقے سے پئیں آب حیات
ورنہ پھر موت ہے چھلکے گی جو پیمانے سے
ایک عالم سے جدا مصلحتیں ہیں اسکی
کون ہر بات پہ اُلجھے ترے دیوانے سے
خرد آشوب ہے ہر نکتۂ عرفان حیات
اور بڑھتا ہے جنوں عقل کے بڑھ جانے سے

دلِ نا مطمئن اندیشۂ برق طپاں میں ہے
جو بے تابی قفس میں تھی وہی اب آشیاں میں ہے
مری بے تابیٔ دل کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا
خدا جانے ترا حرف تسلی کس زباں میں ہے
یہی انداز ہیں تو غم نہیں کچھ بُعد منزل کا
اُمنگیں جاگ اُٹھی ہیں، زندگی سی کارواں میں ہے
اسی کے راگ سے گونجیں گی کل راہیں مسرت کی
یہ مانا آج انساں منزل آہ و فغاں میں ہے
کوئی نسبت نہیں منزل رسی کو رہ نوردی سے
وہ لذت کامیابی میں کہاں جو امتحاں میں ہے
یہ تخصیص چمن کیا، التجائے باغباں کیسی
بہت اے ہمت پرواز گنجائش جہاں میں ہے

عہد حاضر میں عیار صبح تو بدلا مگر
اے اندھیری رات تجھ کو بھی بدلنا چاہئے
باوجود غم مسلسل قہقہے اے نا مراد !
کاروان زندگی کے ساتھ چلنا چاہئے
شان رندانہ کی ہے توہین از خود رفتگی
سہل ہے پینا مگر پی کر سنبھلنا چاہئے
زندگی وہ کیا جو ہو ناواقف آشوب عشق
سینۂ آدم میں طوفانوں کو پلنا چاہئے

اقتضائے عصر نو ہے زندگی تو درکنار موت کو بھی حسن کے سانچے میں ڈھلنا چاہئے
اے جنوں کچھ دیر شغل خاکبازی ہی سہی
دل تو اس صحرائے ہستی میں بہلنا چاہئے

کچھ ایسے انجم رخشاں زمیں پہ آئے نظر میری نگاہ میں توقیر مہر و ماہ نہیں
جمال مہر درخشاں ہے بے نقاب تو کیا ہر ایک ذرہ کی تقدیر میں نگاہ نہیں
جھپک نہ جائے تری آنکھ ہوشیار نہال مقام رزم یہ دنیا ہے خواب گاہ نہیں

یہی بے لوث محبت یہی غمخوارئی خلق اور معراج کسے کہتے ہیں انسانوں کی
نام ہے کیا اسی ہنگامے کا آغاز شباب ایک آندھی سی چلی آتی ہے ارمانوں کی
جسقدر عشق سے ہوتی ہے فزوں وسعت فکر عقل رکھتی ہے بنائیں نئے زندانوں کی
اپنی موت اپنی تباہی کی طرف کیا دیکھیں کہ نگاہیں طرف شمع ہیں پروانوں کی
ہو گئی عمر بہاروں کے تصور میں تمام سیر کرتے رہے نادیدہ گلستانوں کی
ماسوا اس کے نہیں اور کچھ افسانۂ ہند
ایک تاریخ ہے اجڑے ہوئے کاشانوں کی

اڑا لئے ہیں کچھ ارباب گلستاں نے تو کیا ہزار شیوۂ نو ہیں مری فغاں کیلئے
زمین کوچۂ جاناں سے آ رہی ہے صدا بلندیاں نہیں مخصوص آسماں کیلئے
ہے ختم حوصلہ مندی وجود آدم پر ستیزہ کار ہے فتح غم جہاں کیلئے
ہے سخت بے ادبی گر کہے فسانۂ عشق ہر ایک بات مناسب نہیں زباں کیلئے
اندھیری رات، تھکی ہمتیں، کڑی منزل سلامتی کی دعا مانگ کارواں کیلئے
سجائی فکر درخشاں نے میری بزم نجوم
تھی منتظر یہ زمیں ناز آسماں کیلئے

زمانہ کیا دیکھئے دکھائے، نہ جانے کیا انقلاب آئے
فلک کے تیور ہیں خشمگیں سے، زمیں کے دل میں غبار سا ہے
کہاں دیوانگی تو جب ہے، رہے نہ احساس جیب و دامن
اگر ہے احساس جیب و دامن تو پھر جنوں ہوشیار سا ہے
کچھ آج ایسی ہی جی پہ گزری، دبی ہوئی تھی جو چوٹ ابھری
جسے سنبھالے ہوا تھا دل میں وہ نالہ بے اختیار سا ہے

زندگی زہر کا اک جام ہوئی جاتی ہے
کیا سے کیا یہ مئے گلفام ہوئی جاتی ہے

کچھ گزاری ہے غم عشق و محبت میں حیات
کچھ سپرد غم ایام ہوئی جاتی ہے

پھر کسی مرد براہیم کا محتاج ہے دھر
پھر وھی کثرت اصنام ہوئی جاتی ہے

ھوس سیر و تماشہ ہے کہ ھوتی نہیں ختم
زندگی ہے کہ سبک گام ہوئی جاتی ہے

جو کبھی خالق ھنگامۂ طوفاں تھی وہ موج
حیف ! خُو کردۂ آرام ہوئی جاتی ہے

صحبت پیر مغاں میں یہ کھلی عظمت عشق
عقل بھی دُرد تہ جام ہوئی جاتی ہے

تم جو آئے ہو تو شکلِ در و دیوار ہے اور
کتنی رنگین مری شام ہوئی جاتی ہے

غزل مسلسل

اک شخص جواں خاک بسر یاد تو ھوگا
وہ اپنی نگاھوں کا اثر یاد تو ھوگا

وہ دھوم زمانے میں مرے جوش جنوں کی
وہ غلغلۂ شام و سحر یاد تو ھوگا

بھولے تو نہ ھوگے وہ تجلی کی حکایت
وہ تذکرۂ داغ جگر یاد تو ھوگا

ھر گام پہ وہ حسن کی پرھوش نگاھیں
وہ عشق کا بدمست سفر یاد تو ھوگا

ھر لمحہ وہ دنیائے محبت میں تغیّر
ھر سانس میں وہ رنگ دگر یاد تو ھوگا

وہ دل کو ترے حسن خود آرا سے تعلق
وہ خاک سے پیمان نظر یاد تو ھوگا

وہ کارگہ دھر سے اک بے خبری سی
وہ طعنۂ ھر اھل خبر یاد تو ھوگا

وہ دیدہ کہ تھا روکش آرائشِ گیتی
پھروں طرف راہ گذر یاد تو ھوگا

وہ عشق کے جذبات کا بھرپور تلاطم
طوفان کی موجوں میں گذر یاد تو ھوگا

گم کردہ سکوں پا کے مجھے اپنی گلی میں
کہنا وہ تجاھل سے ''کدھر'' یاد تو ھوگا

انوار مجسم وہ ملاقات کی راتیں
راتوں میں وہ انداز سحر یاد تو ھوگا

بھولی تو نہ ھوگی مری اُلفت کی حقیقت
مدت کا فسانہ ہے مگر یاد تو ھوگا

احمد ندیم قاسمی

احمد شاہ ، خاندانی اور احمد ندیم قاسمی ادبی نام ہے ۔ ندیم تخلص کرتے ہیں ۔ مولد موضع انگہ ، تحصیل خوشاب ، ضلع شاہ پور پنجاب ہے جہاں ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء کو آپ کی پیدائش ہوئی ۔ اجداد مجاہدین عرب کے ساتھ ایران ہوتے ہوئے ہندوستان آئے اور ان میں سے چند بزرگ ملتان میں رہ کر تبلیغ دین میں مصروف ہو گئے ۔ مغلوں کے دور حکومت میں ان فدائیان اسلام نے سکیسر پہاڑی کی وادی میں اسلام آباد نامی گاؤں بسایا لیکن تیمور کی یلغار میں یہ تباہ و برباد ہو گیا تو اسی کے قریب موجودہ گاؤں انگہ آباد کیا ۔ رفتہ رفتہ یہ خاندان تبحر علمی ، پرہیز گاری اور صلح کلی کے باعث محترم اور سلسلۂ پیری مریدی کی بدولت مشہور ہونا شروع ہوا ، یہاں تک کہ عقیدت مندوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی جن میں سے اکثر آج بھی گجرات اور سیالکوٹ کے اضلاع اور ریاست کشمیر میں موجود ہیں ۔ اس خاندان کے بزرگ و محترم ارکان میں ایک ندیم صاحب کے والد پیر غلام نبی مرحوم و مغفور بھی تھے جو اپنی عبادت و ریاضت اور زہد و تقویٰ کی وجہ سے اہل اللہ میں شمار ہوتے تھے ۔

ندیم صاحب کی ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہوئی ۔ لیکن ۱۹۲۳ء میں والد کے انتقال کے بعد ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ان کے حقیقی چچا خان بہادر پیر حیدر شاہ مرحوم نے اپنے ذمے لی اور ۱۹۲۵ء میں وہ ان کے ہمراہ کیمبل پور چلے گئے ۔ پیر حیدر شاہ صاحب عربی و فارسی کے عالم اور شعر و سخن کا بڑا پاکیزہ مذاق رکھتے تھے چنانچہ انہوں نے بھتیجے کو اسکول کی تعلیم کے علاوہ تفسیر حقانی کا درس بھی دیا اور اشعار سے صحیح طور پر محظوظ ہونے کے طریقے بھی سکھائے ۔ غرض شفیق چچا کی صحبت میں حضرت ندیم کو مذہبی ، علمی اور شاعرانہ ماحول میسر آیا اور انکی قابل رشک تربیت ہونے لگی ۔ ۱۹۳۱ء میں آپ نے میٹرک پاس کیا اور ایجرٹن کالج بہاولپور میں داخل ہو گئے جہاں آپ کے چچا مشیر مال تھے ۔ ۱۹۳۳ء میں آپ بی ۔ اے میں تھے کہ اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے چچا کا انتقال ہو گیا ۔ یہ زمانہ ندیم صاحب کی بڑی ذہنی و روحانی پریشانیوں کا زمانہ تھا ، بارے جوں توں کر کے آپ نے ۱۹۳۵ء میں بی ۔ اے پاس کیا ۔ پھر چار سال مسلسل تلاش معاش میں سر گرداں رہے لیکن کہیں کامیابی نہ ہوئی آخر ۱۹۳۹ء میں ایک عزیز کی وساطت سے محکمہ آبکاری میں سب انسپکٹر ہو گئے اور ۲۰ ستمبر ۱۹۴۲ء تک اس خلاف مزاج ملازمت میں دن گزارنے کے بعد اس سے مستعفی ہو کر لاہور چلے آئے اور ۲۵ ستمبر

۱۹۳۲ء سے دارالاشاعت پنجاب لاهور میں ''تہذیب نسواں'' اور ''پھول'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے - ۱۹۴۳ء میں رساله ''ادب لطیف'' کی ادارت سنبھالی - ۱۹۴۴ء میں سالنامه ''ادب لطیف'' کے ایک مضمون کی اشاعت کی بنا پر حکومت پنجاب نے آپ کو گرفتار کر لیا - یه مقدمه ایک برس تک چلتا رها۔ مقدمه کے دوران هی میں آپ بیمار هوگئے۔ مئی ۱۹۴۵ء میں مقدمه سے بری هوکر آپ اپنے وطن چلے گئے اور فروری ۱۹۴۶ء میں علالت کے پیش نظر ''ادب لطیف'' کی ادارت سے دست بردار هو گئے - تقسیم کے بعد پشاور ریڈیو میں ڈیڑھ سال ملازم رہے - پھر هاجره مسرور کے ساتھ مل کر ''نقوش'' کی ادارت شروع کی لیکن کچھ دنوں بعد یه رساله بھی سیفٹی ایکٹ کا شکار هوکر بند هو گیا - اب ۵ مارچ ۱۹۵۳ء سے روزنامه ''امروز'' کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے هیں اور اس معیاری روز نامے کی ادارت کے لئے آن جیسے معیاری ادیب کا انتخاب نه صرف موزوں بلکه مستحسن هے -

ندیم صاحب کی شاعری کا آغاز پندره برس کی عمر سے هوا - اُنهیں کسی سے تلمذ کا شرف تو حاصل نہیں لیکن شعر گوئی کے معاملے میں وه اپنے چچا مرحوم ' مولانا عبدالمجید صاحب سالک اور اختر شیرانی مرحوم کے رهین منت ضرور هیں ' جنکے مفید مشورے آن کی رهنمائی کا باعث هوئے - یہاں بقول ندیم صاحب اس بات کا تذکره ضروری معلوم هوتا هے که ''آج تک جو کچھ میں نے لکھا هے وه میرا اپنا سرمایه هے ' میری آنکھوں ' میرے دل اور میرے دماغ کا خزانه هے جس پر کسی دوسرے کا کوئی اثر نہیں - البته ماحول کے اثر سے انکار نہیں کیا جا سکتا ' میں اپنی شاعری اور افسانه نگاری کا خود هی خالق هوں اور خوش هوں که مجھے اپنا مستقبل روشن و تاباں نظر آتا هے'' - اس قول سے یه بات واضح هو جاتی هے که شعر و شاعری کے معاملے میں وه اپنی انفرادیت کے سختی سے پابند هیں اور اُنهوں نے اس سلسلے میں اپنے ذاتی مشاهدات ' احساسات ' تفکر اور اسلوب سے کام لیکر اپنے فن کی پرورش کی هے -

حضرت ندیم نے غزل ' نظم ' قطعه' رباعی غرضیکه هر صنف میں طبع آزمائی کی هے آن کے کلام کے سرسری مطالعه سے بھی یه اندازه بخوبی لگایا جا سکتا هے که وه جو کچھ کہتے هیں بڑے خلوص و دیانت داری کے ساتھ کہتے هیں آنکے یہاں شدید احساس ' مطمئن تخیل ' حالات کا صحیح تجزیه ' حیات انسانی کی حقیقی ترجمانی اور اسلوب کی پختگی وغیره خصوصیات نمایاں هیں اور ان خصوصیات نے مل جل کر ان کے کلام کو نه صرف ایک نیا رنگ و آهنگ دیا هے بلکه اُسے عظیم شاعری کی اُن سرحدوں کے قریب پہنچا دیا هے جہاں شعر ایک ابدی حقیقت کی صورت اختیار کر لیتا هے -

اس میں شک نہیں که جدید شاعری کا یه جواں سال فنکار اپنی فنی زندگی کے ایک مخصوص دور میں فکر و فن کی بہت سی اُلجھنوں میں پھنسا رها هے جسکے باعث اُس زمانه کی تخلیقات میں ژولیدگی ' عسیرالفهمی اور کہیں کہیں شدید تلخی و تندی پیدا هو گئی هے لیکن تھوڑے هی عرصه میں مطالعه ' صحبت اور غور و فکر نے جب ان اُلجھنوں کو صاف کر دیا تو تخلیقات بھی صحت مند اور روشن عناصر سے هم آهنگ هو کر نکھرنا شروع هو گئیں ' حتیٰ که اب آن کی شاعری فن کی اُس منزل میں قدم رکھ چکی هے جس میں نه صرف انسان کے بنیادی مصائب اور زندگی کے اٹل حقائق کی دلکش تفسیر پیش کی جاتی هے بلکه آن کی تطہیر کا عرفان بھی پیدا هو جاتا هے -

ندیم صاحب کے اسلوب بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالمجید سالک ''شعلہ و گل'' کے تعارف میں فرماتے ہیں: ''ندیم نے ہماری شاعری میں نہایت گراں بہا اضافہ کیا ہے۔ اس نے اظہار کے کئی نئے راستے دکھائے ہیں وہ وزن و بحر اور قافیہ ردیف وغیرہ کے معاملے میں بھی صرف اسی قدر تجاوز یا انحراف کا روا دار ہے جو ہماری شاعری کے مزاج کے مطابق ہو، وہ الفاظ کے انتخاب میں بے حد محتاط ہے، وہ ان کی موسیقی کو بھی سمجھتا ہے اور بعض اوقات ان کے محل استعمال میں ایسا اجتہاد کرتا ہے کہ پرانے شعرا منہ تکتے رہ جاتے ہیں اور انہیں انکار و اعتراض کی جرائت نہیں ہوتی''۔ بلاشبہ مولانا کی یہ رائے اس بارے میں حرف بہ حرف صحیح ہے۔

ندیم صاحب کے حالات زندگی اور انکی شاعری سے متعلق یہ چند باتیں کہنے کے بعد خود جناب ندیم کے بارے میں یہ رائے قائم کرنا کہ وہ ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم انسان بھی ہیں ہمارے نزدیک ان خوبیوں اور صلاحیتوں کا حقیقی اعتراف ہے جو قدرت نے انہیں ودیعت کی ہیں اور جن کے جائز استعمال نے ان کی زندگی اور فن کو باوقار اور پر عظمت بنایا ہے۔ موصوف کی نثری نگارشات سے قطع نظر ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو کر ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکے ہیں۔ جن میں ''دھڑکنیں'' اور ''رم جھم'' محض قطعات اور ''جلال و جمال'' اور ''شعلہ و گل''۔ منظومات اور غزلیات کے مجموعے ہیں۔

انتخاب کلام

غزلیات

ہر مسرت سے سرگرانی ہے | کیا یہی عالمِ جوانی ہے
مسکرانا جسے نصیب نہ ہو | وہ جوانی بھی کیا جوانی ہے

جو پاس ضبط سے ڈر ڈر کے ٹپکا | وہ آنسو چاند سے بڑھ کر گراں ہے

فصلِ گل آئی نشیمن جل گئے | ہائے دیوانوں کی دور اندیشیاں

زخم ہوتے ہیں دنوں میں مندمل | اور صدیوں تک چلی جاتی ہے بات

پھر حسینوں پہ اعتبار کریں   آؤ پھر دل کو لالہ زار کریں
ہر طرف چھا رہی ہے تاریکی   آؤ مل جل کے ذکرِ یار کریں

ہم ترے شوق میں پرواز جہاں کرتے ہیں   اور وہ پرواز ' کہ بیگانۂ رفتار ہیں ہم

ذرّے ذرّے میں ترا عکس نظر آتا ہے   راستہ دیکھتے رہنا بھی اب آساں نہ رہا

جانے کہاں تھے ' اور چلے تھے کہاں سے ہم
بیدار ہو گئے کسی خوابِ گراں سے ہم
آخر دعا کریں بھی تو کس مدعا کے ساتھ
کیسے زمیں کی بات کہیں آسماں سے ہم
اب جی میں ہے کہ کعبۂ مقصود کے عوض
مانگیں ترے نقوشِ قدم کہکشاں سے ہم
یہ خانۂ تباہ ' یہ سلطان کجکلاہ
پوچھینگے آج اپنا پتہ میہماں سے ہم

تری زندگی حقیقت ' مری زندگی فسانہ   وہ خرد کی تنگ ظرفی ' یہ جنوں کی بیکرانی
نہ کمانِ یار ان پر ' نہ جمال یار ان میں   ترے کوکب و قمر سے نہ بہل سکی جوانی

نہ سمجھ سکی مشیّت ' نہ بدل سکا زمانہ   وہی تیغ اصفہانی ' وہی خون ارغوانی

راستہ دیکھتا ہے تیرا حریم   جانے کس بے نیاز راہی کا

وہ میرے عشق کا مقصود خاص پوچھتے ہیں   ضرورت آن پڑی آئینہ دکھانے کی
ندیم کھیل رہا ہوں پرانی یادوں سے   یہی تو آخری کوشش ہے بھول جانے کی

عجیب شمع ہے جو جل کے خود نہیں بجھتی   عجیب تر ہیں مگر بے نیاز پروانے
رخ ملیح ' لب سرخ ' زلف ژولیدہ   بہت لطیف ہیں رسوائیوں کے افسانے

میں چھوڑ دوں ترے کہنے سے احترامِ جفا　　مگر میں ذوقِ وفا میں ذرا کمی تو کروں
اجل کے خوف سے آزاد ہے حیات مری　　مگر یہ شوق، تماشائے جانکنی تو کروں

یہ ایک قطرۂ شبنم ہے آفتاب بدست
بہت قریب سے دیکھی ہے فطرتِ بشری
یہ تجھ کو دیکھ کے کیوں لوگ مجھ کو دیکھتے ہیں
یہ تیری جلوہ گری ہے کہ میری پردہ دری
فلک پہ ٹوٹے ستارا، زمیں پہ اشک گرے
مرے ندیم، یہی ہے کمال بخیہ گری

ہونٹوں کی لرزش کچھ کہہ رہی ہے　　اک مدعا ہے محتاج اظہار
اے ذوقِ پرواز اب ضبط کیسا!　　اٹھتی رہے گی زنداں کی دیوار

میں تجھ کو بھول چکا لیکن ایک عمر کے بعد　　ترا خیال کیا تھا کہ چوٹ ابھر آئی

ذکر اک روز پلٹنے کا کیا تھا تم نے　　اک دیا دل کے اندھیرے میں جلا رکھا ہے

میں جسے شرط ادب کہتا ہوں، تو فرط حیا
عشق اور حسن میں حائل ہے وہ دیوار ابھی
ابھی انسان کو مانوسِ زمیں ہونا ہے
مہر و مہتاب کے ایواں نہیں درکار ابھی
کتنے ساگر ہیں سنبھالے ہوئے ناسفتہ گہر
کتنے اسرار ہیں آمادۂ اظہار ابھی
ابھی نسلوں کے اک انبوہ میں محبوس ہوں میں
آدمیت کے تقاضے نہیں بیدار ابھی
راہیں لٹ سی گئیں، مٹ سے گئے قدموں کے نقوش
سن رہا ہوں تری پازیب کی جھنکار ابھی

اگر حضور ابھی مائل ظہور نہ تھے　　تو تشنگانِ محبت بھی ناصبور نہ تھے
اُفق کی دھند میں لپٹے ہوئے چراغ سے ہیں　　وہ دن جب آپ کے انداز پُر غرور نہ تھے
جزا تو خیر، سزا کے لئے ترستے رہے　　غلام آپکے، اتنے تو بے قصور نہ تھے
مرے نصیب کو کیوں تابع نجوم کیا　　اگر نجوم مری دسترس سے دور نہ تھے

تلاشِ حسن کہاں لے چلی، خدا جانے　　اُمنگ تھی کہ فقط زندگی کو اپنائیں
تمام میکدہ سنسان، میگسار اُداس　　لبوں کو کھول کے کچھ سوچتی ہیں مینائیں

نئے چراغ جلا لوں، مگر یہ عزم صمیم　　کہ شمع کشتہ سے ہر حال میں نباہ کروں
کلی کلی کی رگوں میں رواں ہے میرا لہو　　کسے گلے سے لگاؤں، کسے تباہ کروں

چشمِ سرشار میں حیا چمکی　　ساغرِ مے میں چاندنی کی ڈلی
گردشِ چشم ہے کہ گردش دھر　　پلکیں جھکنے لگیں کہ دھوپ ڈھلی
کائنات ایک دشت بے انجام　　اب کہاں ڈھونڈیئے کسی کی گلی

پھر بھیانک تیرگی میں آ گئے　　ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے
ہائے خوابوں کی خیاباں سازیاں　　آنکھ کیا کھولی چمن مرجھا گئے
کس تجلی کا دیا ہم کو فریب　　کس دھند لکے میں ہمیں پہنچا گئے
رہنماؤ! رات ابھی باقی سہی　　آج سیّارے اگر ٹکرا گئے؟
اب کوئی طوفاں ہی لائے گا سحر
آفتاب اُبھرا تو بادل چھا گئے

کس نے ڈھالا تھا پیکرِ آدم　　کوئی لذت اگر ہوس میں نہیں
کاکلیں کھیلتی ہیں شانوں پر　　کائنات اب کسی کے بس میں نہیں

کلیاں کس دور کے تصور میں　　خون ہوتے ہی مسکراتی ہیں

یہ تیری چاپ ہے یا مرے دل کی دھڑکن ہے
بہت قریب سے آتی ہے دور کی آواز
غبار ، اوجِ بصارت ، ستارے بارِ نظر
بہت لطیف ہیں احساس کے نشیب و فراز

چاند بھی ساکن وقت بھی ساکن شاید تُو کچھ سوچ رہا ہو
تو نے یوں شرما کر دیکھا جیسے تھک کر دیا بجھا ہو
وقتِ سحر یوں کلیاں چٹکیں جیسے تیرا نام لیا ہو
تو کہتا ہے تارا ٹوٹا اور اگر آنسو ٹپکا ہو !

فرار کا یہ نیا روپ ہے اگر ہم لوگ چراغ توڑ کے نورِ قمر کا ذکر کریں
اگر نہایت بے چارگی ہے چارہ گری تو کس اُمید پہ زخمِ جگر کا ذکر کریں
تمام عمر کئے چاک دامنی کے گِلے بعزمِ بخیہ گری ، بخیہ گر کا ذکر کریں
مرے ندیم ! مری ذات کو سمجھ کر آپ
مرے کلام کے نقص و اثر کا ذکر کریں

ہجومِ فکر و نظر سے دماغ جلتے ہیں
وہ تیرگی ہے کہ ہرسو چراغ جلتے ہیں
چمک رہے ہیں شگوفے ، دھک رہے ہیں گلاب
وفورِ موسمِ گل ہے کہ باغ جلتے ہیں
ترے نصیب میں راتیں ، مرے نصیب میں دن
ترے چراغ ، مرے دلکے داغ جلتے ہیں

مری شکست میں انسانیت ہے نالہ کناں یہ سانحات فقط میرے سانحات نہیں
میں گل کو دیکھ کے تخلیقِ گل کی سوچتا ہوں گلوں کو دیکھتے رہنا تو کوئی بات نہیں
یہ راستے تو مرے ہاتھ کی لکیریں ہیں جو تو رفیقِ سفر ہو تو رات ، رات نہیں

اب اس کے بعد مجھے فکر کیا کہ ہوگا کیا وہ آنکھیں آج مرے غم پہ ڈبڈبائی تو ہیں

یہی عنوانِ کرم ہے تو زہے لطف و کرم ٭ سانس چلتی ہے تو چلتے رہیں نشتر تیرے

ہوتا نہیں ذوق زندگی کم	بنیادِ حیات ہے ترا غم
تیرے ہی غموں نے مجھ کو بخشی	کوندے کی لپک غزال کا رم
زخموں میں چٹک رہی ہیں کلیاں	ہوتی ہے یونہی بساط برہم

یہ اور بات کہ انجان بن گئے ورنہ ٭ ترے خرام کو پہچان لیں ہزار میں ہم

یہ سوچتا ہوں کہ پھولوں کے رقص کی بنیاد
نہ جانے باد چمن ہے کہ تیرا حسن خرام

یہ کیا طلسم ہے، دریا میں بن کے عکسِ قمر
رکے ہوئے بھی تمہی ہو، رواں دواں بھی تمہی

ہر گل ہے پناہ گاہِ زنبور	گلچیں کو گِلہ ہے باغباں سے
جو پیار نہ کر سکے زمیں سے	پائیں گے نہ بھیک آسماں سے
ہم آبلہ پا ہی اے زمانے!	الجھیں گے تیرے یمِ رواں سے
یزداں پہ جھپٹ پڑے گا ابلیس	انساں ہٹا جو درمیاں سے
گنجینۂ وقت بن گئی ہے	جو بات نکل گئی زباں سے

منظومات

رات کی بات

میرے خوابوں کے دریچوں سے یہ جھانکا کس نے
نیند کی جھیل پہ یہ کس نے کنول پھیلائے
لال پوروں میں یہ آنچل کا کنارا تھا سے
کس نے پائل کی مدھر تال پہ دوہے گائے

سونی سونی سی یہ آنکھیں ہیں ادھورے سپنے
خلوتِ دل میں چھپا رکھتے ہیں جنکی جھنکار

مرمریں گالوں پہ روشن ہیں شفق رنگ دیئے
جو چمکتے ہیں خیالوں کی ندی کے اُس پار

وہی سنجیدہ سا اک لوچ ہے ہنگامِ خرام
جیسے بھٹکی ہوئی ساون کی اکیلی بدلی
رخِ رنگیں پہ وہ ہلکا سا تفکر جیسے
سیپی لہروں میں نظر آتی ہے گدلی گدلی

ان گنت نظروں سے بچتی ہوئی تو آئی ہے
اپنے ٹھکرائے ہوئے دوست کا جی بہلانے
وہی عنواں ہیں کہانوں سی بھنوؤں میں مستور
مجھ سے جن پر ابھی لکھے نہ گئے افسانے

انگلیوں میں وہ ستاروں کی تپاں بے چینی
مسکراہٹ میں گجردم کی خنک رعنائی
کالے بالوں میں وہ موہوم سنہری لہریں
جیسے جلتے ہوئے جنگل میں چلے پروائی

ہائے وہ لمس، وہ اک گونج، وہ اک واویلا
وہ دھندلکوں میں پگھلتے ہوئے پتلے سائے
وادیٔ خواب میں وہ سرسر دنیائے شعور
جیسے بھرپور بہاروں میں خزاں آ جائے

دھجیاں بن کے اڑا رات کا پیراہن تار
تارے ٹکرائے خلاؤں میں فضا چکرائی
میٹھی نیندوں کو کترتی ہوئی کرنیں لپکیں
خون کا طشت لئے صبح کی دیوی آئی

رات بیکراں تو نہیں

نجوم بجھتے رہیں، تیرگی امنڈتی رہے
مگر یقینِ سحر ہے جنہیں — اداس نہیں

آفق دھڑک تو رہا ہے، سجھائی دے کہ نہ دے
شفق اُبل تو رہی ہے، دکھائی دے کہ نہ دے
گلوں پہ اوس شعاؤں کے انتظار میں ہے
کہ اس کے حسن کی عظمت کرن کے پیار میں
وہ ایک اور ستارا لرز کے ٹوٹ گیا!
بجا کہ رات بھیانک ہے، بیکراں تو نہیں
عظیم وقت کی رفتار رائگاں تو نہیں
سنا ہے دو قدم آگے مہک رہے ہیں چمن
اسی لئے تو ہواؤں میں ہے لطیف چبھن
اسی لئے تو اندھیرے میں پڑ رہی ہے شکن
اسی لئے تو قدم تیز تیز اٹھتے ہیں
طلسم شب کا یہی توڑ ہے قدم نہ رکیں
اندھیرا ٹوٹ کے برسے، مگر یہ سر نہ جھکیں
نجوم بجھتے رہیں، تیرگی امنڈتی رہے
سحر کا توڑ کسی ذی نفس کے پاس نہیں

انسان عظیم ہے!

اُس نے تجھے عرش سے بلایا
انسان عظیم ہے خدایا!
تو بسترِ کہکشاں پہ لیٹا تاروں کو بتا رہا تھا راہیں
اس خاک کے تودۂ رواں پر پڑتی ہی نہ تھیں تری نگاہیں
وہ تجھ کو زمیں پہ کھینچ لایا
انسان عظیم ہے خدایا!
تو نور ہی نور بن رہا تھا وہ خاک ہی خاک چھانتا تھا
آنکھیں تھیں تری جھلک سے محروم لیکن تجھے دل سے مانتا تھا
اب چھونے لگا ہے تیرا سایا
انسان عظیم ہے خدایا!
تو سنگ ہے اور وہ شرر ہے تو آگ ہے اور وہ اُجالا
تو نم ہے، نمو کا پاسباں وہ تو دشت ہے، وہ چراغ لالہ

انساں نے تجھے حسیں بنایا
انسان عظیم ہے خدایا !

تو عین حیات ہے، مگر وہ   تزئین حیات کر رہا ہے
اس پر ہے غلط فنا کا الزام   سامانِ ثبات کر رہا ہے
اب جینے کا ڈھب سمجھ میں آیا
انسان عظیم ہے خدایا !

تو وقت ہے، روح ہے، بقا ہے   وہ حسن ہے، رنگ ہے، صدا ہے
تو جیسا ازل میں تھا سواب ہے   وہ ایک مسلسل ارتقا ہے
ہر شے کی پلٹ رہا ہے کایا
انسان عظیم ہے خدایا !

مری شکست

مجھے تسلسل لیل و نہار کی سوگند   بجھا نہیں ہے سرِ راہِ انتظار چراغ
گلوں میں لپٹی ہوئی یادِ یار کی سوگند   کھلا ہوا ہے ابھی تک مری شکست کا باغ
چٹخ گیا ہے اگر فرط تشنگی سے ایاغ
اگر غبارِ سرِ راہ سے اٹا ہے دماغ
تو اس غبار میں ہیں کتنی منزلوں کے سراغ
مجھے شباب کی اس یادِ یار کی سوگند

اسی شکست تمنا کے دم سے آج مجھے   دکھائی دیتے ہیں کتنے صنم چٹانوں میں
رہی عزیز کچھ ایسی جہاں کی لاج مجھے   کہ میں بھٹک نہ سکا تیرہ آسمانوں میں
کوئی گداز نہیں خلد کے فسانوں میں
مری بہشت ہے تنکوں کے آشیانوں میں
بڑا سرور ہے انساں کی داستانوں میں
لبھا سکا فقط انسان کا مزاج مجھے

میں تیرے جسم کی حدّت ابھی نہیں بھولا   اسی کی آگ مرے شعلۂ حیات میں ہے
میں اپنے شوق کی شدّت ابھی نہیں بھولا   وہ کیفیت تو عیاں میری بات بات میں ہے
مرا غرور ترے حسن کے ثبات میں ہے
تو میرے دل میں نہیں، ساری کائنات میں ہے
تو دن کی طرح نہاں اس اندھیری رات میں ہے

میں تیرے ذوق کی حدّت ابھی نہیں بھولا
ترے لبوں کی نمی اور تری نظر کی کرن   مرے شعور میں تحلیل ہو کے پھول بنی
یہ رات جسکی جبیں پر ہے تیرگی کی شکن   مرے لئے تو ترے گیسوؤں کا طول بنی
مری شکست ' مری فتح کا رسول بنی
مری شکست مرے راستے کی دھول بنی
مری شکست تو ادراک کا اصول بنی
کلی کا خون ہوا اور سنور گیا ہے چمن

قطعات

عزم

ان بھیانک، جلی چٹانوں میں
زندگی کا سراغ پاؤں گا !
ہم سفر تو ٹھہر سکے تو ٹھہر
میں تو ان چوٹیوں پہ جاؤں گا

سانولا سلونا

ڈھول بجتے ہیں ' دنا دن کی صدا آتی ہے
فصل کٹتی ہے ' لچکتی ہے ' بچھی جاتی ہے
نوجوان گاتے ہیں جب سانولے محبوب کا گیت
ایک دوشیزہ ٹھٹک جاتی ہے ' شرماتی ہے

انجم شناس

اندھیروں میں کٹی ہے زیست جن کی
نہیں کرتے ستاروں ' کی غلامی
بھٹک جاتے ہیں جب پگڈنڈیوں سے
تو بنتی ہے سہارا نرم گامی

همہ اُوست

میں نے معصوم بہاروں میں تجھے دیکھا ہے
میں نے موہوم ستاروں میں تجھے دیکھا ہے
میرے محبوب ! تری پردہ نشینی کی قسم
میں نے اشکوں کی قطاروں میں تجھے دیکھا ہے

مسافر

دلِ بیدار و توفیق سفر دے
مقامِ جستجو پاؤں نہ پاؤں
جہاں سے کارواں گزرا ہے تیرا
میں ان راہوں کو جا کر دیکھ آؤں

نور پوشی

اداس چاند نے بدلی کی آڑ میں ہو کر
کنارے کالی گھٹاؤں کے کر دئے روشن
شبِ وصال میں جیسے تصوّر رخِ دوست
دلِ حزیں کے اندھیرے میں روشنی کی کرن

سکندر علی وجد

سکندر علی متخلص بہ وجد ' اورنگ آباد کے رہنے والے ہیں جہاں اُن کی پیدائش ۱۹۱۴ء میں ہوئی ۔ تعلیم کے ابتدائی مراحل وطن میں طے کرنے کے بعد آپ نے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے بی ۔ اے کی ڈگری حاصل کی ۔ پھر حیدرآباد سول سروس کے مقابلہ کے امتحان میں کامیاب ہو کر سر رشتۂ عدالت میں ملازم ہوئے ۔ جب سے اس شعبہ سے متعلق ہیں اور قیام زیادہ تر حیدرآباد ہی میں رہتا ہے ۔

وجد صاحب کو طالب علمی کے زمانے سے شاعری کا شوق ہے ' شعر گوئی کا آغاز تقریباً ۱۹۳۰ء سے ہوا ' اُس وقت سے مشق سخن برابر جاری ہے اور آج ان کا شمار حیدرآباد کے نوجوان شعرا کی صف اول میں ہوتا ہے ۔ نظم و غزل دونوں میں دستگاہ حاصل ہے ۔ لیکن اُن کا رجحان زیادہ تر نظم نگاری کی طرف رہا ہے اور یہی اُن کی شہرت و مقبولیت کا باعث ہوئی ۔ اُن کی نظمیں رنگینی ' موسیقیت' جدت اور عشقیہ سوز و گداز سے لبریز ہیں ۔ اپنی نظموں میں اُنھوں نے ایسے موضوعات و مسائل پر بھی قلم اُٹھایا ہے جنھیں وقت کا راگ کہنا چاہئے' مثال کے طور پر ''کسان'' ''نوجوان سے خطاب'' ''پنکھا قلی'' ''وقت کی آواز'' وغیرہ لیکن اس سے کہیں زیادہ دلکش اُن کی تاریخی و رومانی منظومات ہیں ۔ خصوصاً تاریخی آثار و مشاہیر پر طبع آزمائی کر کے اُنھوں نے بعض ایسے شاہکار پیش کئے ہیں جن میں شاعر کی قوت تخیل ' مشاہدہ ' جدت طرازی اور لطف بیان اپنے شباب پر نظر آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان نظموں میں جذب و دلکشی اور درد و اثر زیادہ ہے ۔ اس سلسلے میں وجد صاحب کی ''اجنتا'' ''عبدالرزاق لاری'' ''چاند بی‌بی'' ''تاج محل'' ''محمد علی'' وغیرہ نظمیں خاص طور پر قابل‌مطالعہ ہیں ۔

جہاں تک اُن کی رومانی نظموں کا تعلق ہے اُن میں تغزل کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے ۔ وہ اپنی عشقیہ وارداتوں اور رومانی لمحات زندگی کا بیان کچھ ایسے حسین الفاظ اور رنگیں و لطیف پیرائے میں کرتے ہیں کہ ساری نظم میں حسن و نغمہ کی ایک مخصوص فضا پیدا ہو جاتی ہے اور پڑھنے والا اس کیف آور فضا کے اثر سے محظوظ و متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا ۔ اپنی رومانی شاعری کا تعارف خود وجد صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے :-

سنا رہا ہوں یہ روداد اُس زمانے کی ۔۔۔ چمن کی تھی کوئی پروا ' نہ آشیانے کی
مصیبت آئی نہ تھی پیش ' سر جھکانے کی ۔۔۔ ہر ایک بات پہ ہمت تھی مسکرانے کی

جنوں بدوش تھا ہنگام نوجوانی کا
نئی بہار تھی ' موسم تھا کلفشانی کا

اور بلا شبہ شعر میں ایسی رنگینی و سرمستی زندگی کے ایک ایسے ہی دور میں پیدا ہو سکتی ہے جب ہر نوجوان شباب و خواب کی ایک مثالی دنیا میں دن گزارا کرتا ہے۔ لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ حسن و عشق سے اس درجہ شیفتگی ہونے کے باوجود اُن کی نظموں میں وہ کھویا ہوا پن اور مظلومیت نہیں ہے جو ہماری رومانی شاعری کی ایک لازمی خصوصیت ہے۔ علیٰ ہذالقیاس غزلوں میں ایک پھیکا پن ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وجد صاحب غزلیں نظموں کی طرح ڈوب کر نہیں کہتے۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ اس صنف سخن کی طرف اُن کی توجہ نسبتاً کم رہی ہے۔ لیکن اگر وہ اس طرف زور دیں تو یقیناً بہت اچھی غزلیں کہہ سکتے ہیں۔ وجد صاحب کا ایک مجموعۂ کلام ''لہو ترنگ'' ۱۹۴۴ء میں چھپکر ادبی دنیا میں خاصا مقبول ہو چکا ہے۔

انتخاب کلام

تغزل

یہ سب قصور ہے اے قیس کم نگاہی کا — نظر کو پردۂ محمل بنا دیا تو نے
سفینہ ڈوب چکا اب سکوں ہے اے طوفاں — بھنور کو دامن ساحل بنا دیا تو نے
بچاؤ اپنے نشیمن کا ''وجد'' خوب کیا — جو بجلیوں کے مقابل بنا دیا تو نے

عجب آرزو ہے انوکھی طلب ہے — تجھی سے تجھے مانگنا چاھتا ہوں

رہےگا ''وجد'' بیاں عشق کا سدا یکساں — بدلتی جائے گی سرخی فقط فسانے کی

دل کی بستی عجیب بستی ہے — یہ اُجڑنے کے بعد بستی ہے
سارا عالم ہے خواب کا عالم — ساری ہستی فریب ہستی ہے
خوف صیاد آشیاں کو نہیں — برق کے زیر سر پرستی ہے

''وجد'' مت بھول اوج قسمت پر
ہر بلندی کے بعد پستی ہے

ترے آتے ہی سب دنیا جواں معلوم ہوتی ہے
خزاں رشک بہار جاوداں معلوم ہوتی ہے

کسی کی جستجو میں ''وجد'' اس منزل پہ پہنچا ہوں
جہاں منزل بھی گردِ کارواں معلوم ہوتی ہے

دیر سے یاد آ رہی ہے تری　　کیا تجھے یاد آ رہا ہوں میں
جب سے ٹھکرا دیا نشیمن کو　　برق پر مسکرا رہا ہوں میں

کھلائے غنچۂ گل ' غنچہ ہائے دل نہ کِھلے
نسیم واقف طرز خرام یار نہیں
ہمیشہ باد مخالف میں جگمگاتا ہے
چراغ عشق چراغ سر مزار نہیں

اس نظر سے تم نے کیوں دیکھا مجھے　　ہر تمنا خواب بن کر رہ گئی

خوش ہوا قلب چمن جب وہ شگوفے نہ کِھلے
جن کے انداز سے پیدا تھا گلستاں ہونا
اے صبا لالۂ کم ظرف سے اتنا کہہ دے
دل کی توہین ہے داغوں کا نمایاں ہونا

دل و جاں تری طرز پرسش کے صدقے　　مجھے تجھ سے کچھ بد گمانی نہیں ہے

رہرو راہ محبت کے لئے منزل نہیں　　زندگی کا عشق حاصل 'عشق کا حاصل نہیں
ابتدا میں ہر مصیبت پر لرز جاتا تھا دل　　اب کوئی غم امتحان عشق کے قابل نہیں

کتنی جنوں نواز ہے دنیائے رنگ و بو　　اک بار دل میں شمع محبت جلا کے دیکھ

ہنگام سحر قطرۂ شبنم کی ضیا میں　　انجام جھلکتا ہے شباب گل تر کا

یقیناً کوئی شمع ہستی بجھے گی　　جبین محبت پہ تا بندگی ہے

تیری نیچی نگاہ کے آگے کس کو دعویٰ ہے خوش بیانی کا

اُس نے پوچھا تو بات کر نہ سکے خلش عرض حال نے مارا
بزم میں تجھ کو دیکھتے ہی رہے لذت انتخاب نے مارا

سینے میں جیسے پھانس کھٹکتی ہے دم بدم
تیرا خیال درد جگر بن کے رہ گیا

پھول چننے سے پہلے گلچیں نے بند کر دی زبان عنادل کی

نگاہ اہل گلشن کہہ رہی ہے خزاں جائے، بہار آئے نہ آئے
چراغ زندگانی بجھ رہا ہے وہ جان انتظار آئے نہ آئے

جو چھلکتی ہے چشم ساقی سے وہی صہبائے ناب ہوتی ہے
نوجوانی کا حسن کیا کہنا
ہر ادا لا جواب ہوتی ہے

منظومات

اجنتا

جہاں خون جگر پیتے رہے اہل ہنر برسوں
جہاں گھلتا رہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں
جہاں کھنچتا رہا پتھر پہ عکس خیر و شر برسوں
جہاں قائم رہے گی جنت قلب و نظر برسوں
جہاں نغمے جنم لیتے ہیں رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے
شراب کہنہ کی تاثیر ہے ٹھنڈی ہواؤں میں
بہار زندگی غلطاں ہے سبزے کی اداؤں میں

نوائے سرمدی آتی ہے جھرنوں کی صداؤں میں
بیاں ممکن نہیں، جو لطف آتا ہے دعاؤں میں
یہاں صدیوں سے رائج پرسکوں شیریں مقالی ہے
یہاں کا ذرہ ذرہ مظہر شان جمالی ہے
جگر کے خوں سے سینچے گئے ہیں نقش لاثانی
تصدق جن کے ہر خط پر تحیّر خانۂ مانی
مشّکل ہے شباب و حسن میں تخئیل انسانی
تقدّس کے سہارے جی رہا ہے ذوق عریانی
گلستان اجنتا پر جنوں کا راج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا
بہانہ مل گیا اہل جنوں کو حسن کاری کا
اثاثہ لوٹ ڈالا شوق میں فصل بہاری کا
چٹانوں پر بنایا نقش دل کی بے قراری کا
سکھایا گُر اسے جذبات کی آئینہ داری کا
دل کہسار میں محفوظ اپنی داستاں رکھدی
جگر داروں نے بنیاد جہان جاوداں رکھدی
ہنر مندوں نے تصویروں میں گویا جان بھر دی ہے
ترازو دل میں ہو جاتی ہے وہ کافر نظر دی ہے
اداؤں سے عیاں ہے لذت درد جگر دی ہے
کُھلیں گے راز، اس ڈر سے دھن پر مُہر کر دی ہے
یہ تصویریں بظاہر ساکت و خاموش رہتی ہیں
مگر اہل نظر پوچھیں تو دل کی بات کہتی ہیں
کرشمہ ہے یہ ارباب ھمم کی سعئی پیہم کا
جنھیں احساس بھی باقی نہ تھا کچھ شادی‌وغم کا
دلوں پر عکس کھنچ آیا تھا جن کے حسن‌عالم کا
قلم کو نقش از بر ہو گیا تھا اسم اعظم کا
چٹانوں پر شباب و حسن کی موجیں رواں کر دیں
فسوں کاروں نے رنگوں میں مقیّد بجلیاں کر دیں
جہاں چھوڑا خوشی سے، جاوداں پیغام کی خاطر
خوشامد اہل دولت کی نہیں کی نام کی خاطر

نہ چھانی خاک در در کی کسی انعام کی خاطر
جئے بھی کام کی خاطر، مرے بھی کام کی خاطر
زمانے کی جبیں پر عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہیں گے نقش ان کے نام مٹ جائینگے شاہوں کے

شباب و خواب کی دنیا

یہاں اکثر سنے تھے حسن کے راز نہاں میں نے
یہاں چھیڑی کبھی تھی درددل کی داستاں میں نے
یہاں ڈھونڈا تھا سجدوں کیلئے اک آستاں میں نے
یہاں پائی تھی آخر اک بہشت جسم و جاں میں نے
یہی تھی ہمنشیں میرے شباب و خواب کی دنیا

وہ آ جاتا تو شب رشک سحر معلوم ہوتی تھی
ہر اک شے حسن سے جنت نظر معلوم ہوتی تھی
جوانی کی نظر صہبا اثر معلوم ہوتی تھی
خوشی میں زندگانی مختصر معلوم ہوتی تھی
یہی تھی ہمنشیں میرے شباب و خواب کی دنیا

بھری برسات میں پچھلے پہر گِھر کر سحاب آتا
بہاریں ٹوٹ پڑتیں ذرے ذرے پر شباب آتا
جنوں کا دور ہوتا دور میں جام شراب آتا
مثال موج مے، ساقی کے چہرے پر حجاب آتا
یہی تھی ہمنشیں میرے شباب و خواب کی دنیا

پیام زندگی دیتی تھیں شرمیلی ملاقاتیں
جواں برسات کے دن جان لیوا چاندنی راتیں
بیاں کرتے تھے دونوں حسن و الفت کی کراماتیں
فضا میں گونجتی رہتی تھیں پیہم دل نشیں باتیں
یہی تھی ہمنشیں میرے شباب و خواب کی دنیا

محبت کے نشے میں حسن کے دریا بہاتے تھے
مجھی کو ابتدائے عشق کا قصہ سناتے تھے
کبھی میں مسکرا دیتا تو فوراً روٹھ جاتے تھے
ستانے کے لئے منہ پھیر کر کچھ گنگناتے تھے

یہی تھی ہمنشیں میرے شباب و خواب کی دنیا

کبھی قبل سحر پورا نہ ہوتا میرا افسانہ
جھکولے نیند کی موجوں میں کھاتی جان میخانہ
بھڑک کر شمع بنتی زینت آغوش پروانہ
یونہی اکثر چمکتی رات بھر تقدیر غم خانہ
یہی تھی ہمنشیں میرے شباب و خواب کی دنیا

اندھیری رات میں آن کا چلا آنا قیامت تھا
مری حیرانیوں پر پھول برسانا قیامت تھا
صدائے جنبش داماں سے گھبرانا قیامت تھا
سحر کے نور میں، ہنس کر سہا جانا قیامت تھا
یہی تھی ہمنشیں میرے شباب و خواب کی دنیا

ایک نرس

گھٹا رحمت کی برسے روز و شب تیرے نشیمن پر
مصائب جھیلتا ہے تیرا قلب نازنیں اکثر
نسیم آتی ہے سب سے پیشتر تیرے جگانے کو
گلوں سے قبل اوس آتی ہے تیرا منہ دُھلانے کو
سحر ملبوس نورانی قمر سے مانگ لاتی ہے
تجھے پہنا کے جوڑا گُل جہاں پر پھیل جاتی ہے
ہوائیں مست و عنبر بار تیرے ساتھ آتی ہیں
ترے آنے سے گل ہنستے ہیں کلیاں مسکراتی ہیں
دل پژمردہ پاتے ہیں رہائی بے قراری سے
تری آمد نہیں کم آمدِ باد بہاری سے
بلا کی دل نشینی ہے تری گفتار نے پائی
تری رفتار میں ہے موجزن طوفان رعنائی
نہاں جذبات مہر و لطف ہیں خدمت گزاری میں
اثر اکسیر کا پنہاں ہے تیری غمگساری میں
تبسم، جس سے پھولوں کے دلوں میں رشک پیدا ہو
تکلم وہ کہ بلبل گل کے بدلے تجھ پہ شیدا ہو
نظام دھر کو تھا ناز اپنی بے مثالی پر
عمل تیرا مگر ہے خندہ زن اس کج خیالی پر

وقت کی آواز

اے مرد خدا اُٹھ ' ہے یہ ہنگام تگ و تاز
جنگاہ کی بنیاد ہلا دے تری آواز
اس معرکۂ سخت میں تقلید جنوں کر
بھٹکائے نہ تجھ کو خرد تفرقہ پرداز
بیکار نہ جائے گی تری شعلہ نوائی
تدبیر سے ہو جائیں گے تقدیر کے درباز
پھر بزم میں اس رنگ سے مضراب زنی کر
نغمات کے شعلوں پہ مچلتا ہو دل ساز
درکار ہیں اس وقت وہ پر عزم نگاہیں
ہوں جن سے خجل برّش شمشیر کے انداز
اک بار گراں روح پہ ہے قوت بازو
دل ہی میں نہیں جب خلش لذت پرواز
یہ کام نہیں لشکر و شمشیر و سناں کا
ہمت ہے جہاں گیر' جہاں سوز' جہان ساز

مٹ جائیگی وہ قوم جو بیدار نہ ہوگی
کٹ جائے گا جس ہاتھ میں تلوار نہ ہوگی

میرا مسلک

میں بزم عشرت احباب کو برہم نہیں کرتا
کبھی اشکوں سے اپنے اُن کا دامن تر نہیں کرتا
یہ اک دستور ہے میرا کہ اپنے قدر دانوں کو
شریک عیش کرتا ہوں ' شریک غم نہیں کرتا

ایک تازہ غزل

زندگی جب اجل سے ٹکرائی
دیر تک روشنی نظر آئی
شب نوازوں کا دور ختم ہوا
آ رہے ہیں سحر کے شیدائی
ہر ادا شعر' ہر سخن نغمہ
نوجوانی تمام رعنائی
اُس نے جب مسکرا کے منہ پھیرا
ایک بجلی سی دل پہ لہرائی

''وجد'' حسن سخن پہ ناز نہ کر
خامشی ہے کمال گویائی

ساحر لدھیانوی

عبد الحئی متخلص به ساحرؔ لدھیانه (مشرق پنجاب) کے رھنے والے ھیں - سال ولادت غالباً ۱۹۲۲ء ھے - ساحر صاحب لدھیانے کے ایک مقتدر جاگیردار کے چشم و چراغ ھیں - لیکن بد قسمتی سے وہ کمسن ھی تھے که اُن کی ماں اور والد کے تعلقات خراب ھوگئے اور ایک نزاعی مسئله یه پیدا ھوا که وہ کس کے پاس رھیں - جاگیردار باپ کو ایک ولی عہد کی ضرورت تھی اور حسن اتفاق سے ساحر کے علاوہ اُن کے کوئی اولاد نرینه بھی نه تھی - چنانچه اُنھوں نے گھر کا جھگڑا عدالت میں پہنچا دیا - ساحر نے مجسٹریٹ کے سامنے پیش ھو کر ماں کے پاس رھنے کی فطری خواھش کا اظہار کیا - اس واقعه کے بعد ظاھر ھے ساحر کے والد کو اُن سے کوئی دلچسپی نه رھی اور وہ ھمیشه کے لئے شفقت پدری سے محروم ھوگئے -

ساحر صاحب کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت کی تمام تر ذمه داری اُن کی والده اور ماموں کے سر رھی ھے - اُنھوں نے ۱۹۳۸ء میں خالصه ھائی سکول لدھیانه سے انٹرنس پاس کیا - اُس کے بعد گورنمنٹ کالج لدھیانه میں داخله لیا - کالج کی طالب علمی کے زمانه میں اُنھوں نے ملکی سیاست میں حصه لینا شروع کیا - رفته رفته اُن کی سیاسی دلچسپیاں اس درجه بڑھ گئیں که ۱۹۴۲ء میں جبکه وہ بی-اے فائنل کے طالب علم تھے اُنھیں یه پته چلا که انگریز دشمنی کے جرم میں عنقریب کالج سے نکال دئے جائینگے- اس اطلاع کے ملتے ھی وہ لدھیانه کو خیرباد کہکر لاھور چلے آئے اور اسلامیه کالج میں داخل ھوگئے- لیکن بعض وجوہ کی بنا پر بی-اے کے امتحان میں شریک ھونے سے قبل ھی انھیں اپنی تعلیم کو ختم کردینا پڑا - کالج سے نکل کر ساحر صاحب نے ''ادب لطیف'' ''شاھکار'' اور پھر ''سویرا'' میں مختلف اوقات میں کام کیا - اسی دوران میں وہ ۱۹۴۵ء سے اواخر ۱۹۴۶ء تک کئی مرتبه بمبئی گئے - معاشی نقطۂ نظر سے یه شہر انھیں بہت پسند آیا چنانچه تقسیم ھند کے بعد مئی ۱۹۴۸ء میں وہ مستقل طور پر لاھور سے بمبئی چلے گئے اور اب فلمی گانے و مکالمے لکھنے کے سلسلے میں اُنھوں نے وھاں بڑی اچھی ساکھ قائم کر لی ھے - اس میں شک نہیں که یه مشغله اُن کی فکر و فن کے لئے کسی طرح بھی مفید ثابت نہیں ھوگا مگر نه جانے اس معاشی بد حالی کے دور میں ساحر جیسے کتنے فنکار پیٹ کی خاطر ایسے ھی مشاغل اختیار کئے ھوئے ھیں -

ساحر کی شاعری کا آغاز ۱۹۳۸ء سے ہوا جب وہ ہائی سکول کے طالب علم تھے۔ شعر گوئی کے معاملے میں وہ نہ کسی کے شاگرد ہیں اور نہ ہی کسی سے اپنے کلام پر اصلاح لی ہے۔ البتہ فیض کی شاعری سے بہت متاثر ہیں اور غالباً یہ فیض ہی کا اثر ہے کہ ساحر نے عام نوجوان شعرا کی طرح ہیئت شاعری میں کسی قسم کا اجتہاد کرنے کے بجائے معنی و موضوع اور سب سے زیادہ انداز بیان میں اجتہاد کیا ہے۔ اُن کے کلام میں یوں تو تفکر کی گہرائی، مشاہدے کی ہمہ گیری اور ماحول کی اثر آفرینی سب کچھ موجود ہے لیکن ان خصوصیات سے کہیں زیادہ شدت احساس کی کار فرمائی ہے پھر چونکہ ساحر کے فن کی بنیادیں صالح اور پرخلوص احساس پر استوار ہیں اسلئے اُن کا کلام نہایت حقیقت افروز اور موثر ہے۔

ساحر نے رومانی نظمیں بھی کہی ہیں اور سیاسی و سماجی بھی۔ اُن کی رومانی نظموں میں عشق و محبت کی رنگینیاں و سر شاریاں تو موجود ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت مدت تک رومان کے دھندلکوں میں رہنے کے بجائے حقائق کے اُن کھلے میدانوں میں نکل آئے جہاں قدم قدم پر خلاف فطرت معاشی مفروضوں اور خود ساختہ اخلاقی معیاروں سے مڈبھیڑ ہوتی ہے زندگی کی یہی وہ منزل ہے جس پر پہنچ کر ساحر کی محبت غور و فکر میں تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب   ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

یہیں سے ساحر کے یہاں ایک ذہنی انقلاب شروع ہوتا ہے جو انہیں حقائق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا سکھاتا ہے۔ ساحر کی فکری نظموں میں ایک مخصوص انفرادیت پائی جاتی ہے اور اُن کے ایک ایک شعر سے ایک نئے دکھ، ایک نئے زاویے اور ایک نئی صبح کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

ساحر کا اسلوب نہایت دلکش، واضح اور منفرد ہے۔ آپ ساحر کی تمام نظمیں پڑھ جائیے آپ کو کہیں ابہام کا شائبہ بھی نظر نہیں آئیگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعر کے ذہن میں کوئی اُلجھاؤ نہیں ہے اور وہ قانون، مذہب یا سماج جس پر بھی قلم اُٹھاتا ہے تو دور از کار استعاروں اور اجنبی تشبیہوں کے بجائے نہایت نرم و نازک اشاریت سے کام لیکر ایسی جچی تلی باتیں کرتا ہے کہ پڑھنے والا ان باتوں سے محظوظ اور متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اس میں شک نہیں کہ ساحر کے یہاں کہیں کہیں تھوڑی بہت تلخی ضرور پائی جاتی ہے لیکن سچ پوچھئے تو ابھی اُن کی اور اُن کے فن کی عمر ہی کیا ہے۔ تا ہم اُنکے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ پختگی عمر کے ساتھ ساتھ جوں جوں اُن کا مشاہدہ وسیع، تجربات متنوع اور قوت فکر رسا ہوتی جائیگی اُن کی اس تلخی میں شیرینی کا عرفان بھی پیدا ہوگا اور کلام کی ہمہ گیری و رچاؤ میں بھی اضافہ ہوگا۔ اس سلسلے میں ساحر کی شاعری سے متعلق احمد ندیم قاسمی صاحب کے خیالات بھی قابل ذکر ہیں وہ ساحر کے مجموعہ کلام ''تلخیاں'' کے مقدمے میں فرماتے ہیں ''ساحر کے فن کی خصوصیات میں احساس کی شدت سب سے ممیز اور نمایاں ہے۔ اور چونکہ اُس کا احساس زندہ اور بیدار ہے اس لئے اُردو کے جدید شعرا میں اُس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اگر اُس کے کلام کی پختگی، زبان کی پاکیزگی اور اُسلوب کی بے پناہ

جاذبیت کے مقابلہ میں اُس کی عمر کو دیکھا جائے تو تعجب ہوتا ہے ۔ لیکن شاعری سن وسال کی محتاج نہیں ۔ ساحر کی اٹھان نہایت درخشندہ مستقبل کی غمازی کر رہی ہے ۔ اگر وہ افراط و تفریط سے بچا رہا اور اپنے خلوص کو بے لوث اور اپنے احساس کو بے داغ رکھنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ بہت جلد ہندوستان کے ممتاز ترین شعرا کی صف اولی میں شامل ہو جائیگا ۔''

غرض ساحر لدھیانوی دور حاضر کے ایسے نوجوان شاعر ہیں جنھوں نے اپنے کلام کی گوناگوں خوبیوں کی بدولت ایک مخصوص و منفرد مقام حاصل کر لیا ہے اور ہمیں اُمید ہے کہ وہ اپنے موجودہ مشاغل و مصروفیات سے وقت نکال کر نہ صرف اپنی اس بندھی ہوئی ساکھ کو برقرار رکھیں گے بلکہ اُن توقعات کو بھی پورا کرنے میں کامیاب ہونگے جو ادبی حلقوں نے جائز طور پر اُن کی شاعری سے وابستہ کر رکھی ہیں ۔

انتخاب کلام

شکست

اپنے سینے سے لگائے ہوئے اُمید کی لاش
مدتوں زیست کو ناشاد کیا ہے میں نے
تو نے تو ایک ہی صدمے سے کیا تھا دو چار
دل کو ہر طرح سے برباد کیا ہے میں نے
جب بھی راہوں میں نظر آئے حریری ملبوس
سرد آہوں میں تجھے یاد کیا ہے میں نے

اور اب جبکہ مری روح کی پہنائی میں
ایک سنسان سی معصوم گھٹا چھائی ہے
تو دمکتے ہوئے عارض کی شعائیں لے کر
گُل شدہ شمعیں جلانے کو چلی آئی ہے

میری محبوب یہ ہنگامۂ تجدید وفا
میری افسردہ جوانی کے لئے راس نہیں
میں نے جو پھول چنے تھے ترے قدموں کے لئے
اُن کا دھندلا سا تصور بھی مرے پاس نہیں
ایک یخ بستہ اُداسی ہے دل و جاں پہ محیط
اب مری روح میں باقی ہے نہ اُمید نہ جوش
رہ گیا دب کے گراں بار سلاسل کے تلے

میری در ماندہ جوانی کی اُمنگوں کا خروش
ریگ زاروں میں بگولوں کے سوا کچھ بھی نہیں
سایۂ ابر گریزاں سے مجھے کیا لینا ؟
بجھ چکے ھیں میرے سینے میں محبت کے کنول
اب ترے حسن پشیماں سے مجھے کیا لینا ؟
تیرے عارض پہ یہ ڈھلکے ہوئے سیمیں آنسو
میری افسردگی غم کا مداوا تو نہیں
تیری محجوب نگاھوں کا پیام تجدید
اک تلافی ھی سہی — میری تمنا تو نہیں

گریز

مرا جنونِ وفا ھے زوال آمادہ
اُن آرزوؤں پہ چھائی ھے گرد مایوسی
فریب شوق کے رنگیں طلسم ٹوٹ گئے
سکون و خواب کے پردے سرکتے جاتے ھیں
وہ تارے جن میں محبت کا نور تاباں تھا
عجیب عالم افسردگی ھے رُو بہ فروغ
تری نظر ترے گیسو تری جبیں ترے لب
میں زندگی کے حقائق سے بھاگ آیا تھا
مگر یہاں بھی تعاقب کیا حقائق نے
ہر ایک ھاتھ میں لے کر ھزار آئینے
مرے ہر ایک طرف ایک شور گونج اُٹھا
کہاں تلک کوئی زندہ حقیقتوں سے بچے
وہ دیکھ سامنے کے پر شکوہ ایواں سے
وہ پھر سماج نے دو پیار کرنے والوں کو
پھر ایک تیرہ و تاریک جھونپڑی کے تلے
وہ پھر بِکی کسی مجبور کی جوان بیٹی
وہ پھر کسانوں کے مجمع پہ گن مشینوں سے
سکوت حلقۂ زنداں سے ایک گونج اُٹھی

شکست ھو گیا تیرا فسون زیبائی
جنھوں نے تیرے تبسم میں پرورش پائی
حقیقتوں نے حوادث سے پھر جلا پائی
دماغ و دل میں ھے وحشت کی کار فرمائی
وہ تارے ڈوب گئے لے کے رنگ و رعنائی
نہ اب نظر کو تقاضا نہ دل تمنائی
مری اُداس طبیعت ھے سب سے اُکتائی
کہ مجھ کو خود میں چھپا لے تیری فسوں زائی
یہاں بھی مل نہ سکی جنت شکیبائی
حیات بند دریچوں سے بھی گذر آئی
اور اس میں ڈوب گئی عشرتوں کی شہنائی
کہاں تلک کرے چھپ چھپ کے نغمہ پیرائی
کسی کرائے کی لڑکی کی چیخ ٹکرائی
سزا کے طور پہ بخشی طویل تنہائی
سسکتے بچے پہ بیوہ کی آنکھ بھر آئی
وہ پھر جھکا کسی در پر غرور برنائی
حقوق یافتہ طبقے نے آگ برسائی
اور اُسکے ساتھ مرے ساتھیوں کی یاد آئی

نہیں نہیں مجھے یوں ملتفت نظر سے نہ دیکھ　　نہیں نہیں مجھے اب تاب نغمہ پیرائی
مرا جنون وفا ہے زوال آمادہ
شکست ہو گیا تیرا فسون زیبائی

پھر وہی کنج قفس......

چند لمحوں کے لئے شور اٹھا ڈوب گیا　　کہنہ زنجیر غلامی کی گرہ کٹ نہ سکی
پھر وہی سیل بلا ہے وہی دام امواج　　ناخداؤں میں سفینے کی جگہ بٹ نہ سکی

ٹوٹتے دیکھ کے دیرینہ تعطل کا فسوں　　نبض اُمید وطن اُبھری مگر ڈوب گئی
پیشواؤں کی نگاہوں میں تذبذب پا کر　　ٹوٹتی رات کے سائے میں سحر ڈوب گئی

میرے محبوب وطن! تیرے مقدر کے خدا　　دست اغیار میں قسمت کی عناں چھوڑ گئے
اپنی یک طرفہ سیاست کے تقاضوں کے طفیل　　ایک بار اور تجھے نوحہ کناں چھوڑ گئے

پھر وہی گوشۂ زنداں ہے وہی تاریکی　　پھر وہی کہنہ سلاسل وہی خونیں جھنکار
پھر وہی بھوک سے انساں کی ستیزہ کاری　　پھر وہی ماؤں کے نوحے وہی بچوں کی پکار
تیرے رہبر تجھے مرنے کیلئے چھوڑ گئے　　ارض بنگال! انہیں ڈوبتی سانسوں سے پکار
بول چٹگاؤں کی مظلوم خموشی کچھ بول!　　بول اے پیپ سے رستے ہوئے سینوں کی بہار
بھوک اور قحط کے طوفان بڑھے آتے ہیں　　بول اے عصمت و عفت کے جنازوں کی قطار
روک ان لوٹتے قدموں کو، انہیں پوچھ ذرا　　پوچھ اے بھوک سے دم توڑتے ڈھانچوں کی قطار
زندگی جبر کے سانچوں میں ڈھلے گی کب تک؟
ان فضاؤں میں ابھی موت پلے گی کب تک؟

نیا سفر ہے پرانے چراغ گُل کر دو

فریب جنت فردا کے جال ٹوٹ گئے　　حیات اپنی اُمیدوں پہ شرمسار سی ہے
چمن میں جشن ورُود بہار ہو بھی چکا　　مگر نگاہ گل ولالہ سوگوار سی ہے

فضا میں گرم بگولوں کا رقص جاری ہے — اُفق پہ خون کی مینا چھلک رہی ہے ابھی
کہاں کا مہر منور، کہاں کی تنویریں — کہ بام و در پہ سیاہی جھلک رہی ہے ابھی

فضائیں سوچ رہی ہیں کہ ابن آدم نے — خرد گنوا کے، جنوں آزما کے کیا پایا ؟
وہی شکست تمنا وہی غم ایّام — نگار زیست نے سب کچھ لٹا کے کیا پایا؟

بھٹک کے رہ گئیں نظریں خلا کی وسعت میں — حریم شاہد رعنا کا کچھ پتہ نہ ملا
طویل راہگذر ختم ہو گئی ——— لیکن — ھنوز اپنی مسافت کا منتہا نہ ملا

سفر نصیب رفیقو ! قدم بڑھائے چلو — پرانے رھنما لوٹ کر نہ دیکھیں گے
طلوع صبح سے تاروں کی موت ہوتی ہے — شبوں کے راج دلارے ادھر نہ دیکھیں گے

تاج محل

تاج تیرے لئے اک مظہر اُلفت ھی سہی
تجھ کو اس وادئی رنگیں سے عقیدت ھی سہی
میری محبوب ! کہیں اور ملا کر مجھ سے

بزم شاھی میں غریبوں کا گزر کیا معنی ؟
ثبت جس راہ پہ ھوں سطوتِ شاھی کے نشان
اُس پہ اُلفت بھری روحوں کا سفر کیا معنی ؟
میری محبوب ! پس پردۂ تشہیر وفا
تو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ھوتا
مردہ شاھوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ھوتا
اَن گنت لوگوں نے دنیا میں محبت کی ھے
کون کہتا ھے کہ صادق نہ تھے جذبے اُن کے
لیکن اُن کے لئے تشہیر کا سامان نہیں
کیونکہ وہ لوگ بھی اپنی ھی طرح مفلس تھے
یہ عمارات و مقابر یہ فصیلیں یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاھوں کی عظمت کے ستوں

سینۂ دھر کے ناسور ھیں کہنہ ناسور
جذب ھے ان میں ترے اور مرے اجداد کا خوں
میری محبوب! انھیں بھی تو محبت ھوگی
جن کی صنّاعی نے بخشی ھے اِسے شکل جمیل
اُن کے پیاروں کے مقابر رھے بے نام و نمود
آج تک ان پہ جلائی نہ کسی نے قندیل
یہ چمن زار یہ جمنا کا کنارا یہ محل
یہ منقش در و دیوار یہ محراب یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ھم غریبوں کی محبت کا اڑایا ھے مذاق
میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے

ایک منظر

افق کے دریچوں سے کرنوں نے جھانکا فضا تن گئی راستے مسکرائے
سمٹنے لگی نرم کُہرے کی چادر جواں شاخساروں نے گھونگھٹ اٹھائے
پرندوں کی آواز سے کھیت چونکے پُراسرار لَے میں رھٹ گنگنائے
حسیں شبنم آلود پگڈنڈیوں سے لپٹنے لگے سبز پیڑوں کے سائے
وہ دور ایک ٹیلے پہ آنچل سا جھلکا
تصوّر میں لاکھوں دئے جھلملائے

متفرقات

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں جو کچھ مجھے دیا ھے وہ لوٹا رھا ھوں میں

زندگی کو بے نیازِ آرزو کرنا پڑا آہ کن آنکھوں سے انجام تمنّا دیکھتے

ابھی زندہ ھوں لیکن سوچتا رھتا ھوں خلوت میں
کہ اب تک کس تمنّا کے سہارے جی لیا میں نے

آنھیں اپنا نہیں سکتا مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ کچھ مدت حسیں خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے

تجھ کو خبر نہیں مگر اک سادہ لوح کو
برباد کر دیا ترے دو دن کے پیار نے
میں اور تم سے ترکِ محبت کی آرزو
دیوانہ کر دیا ہے غمِ روزگار نے
اب اے دلِ تباہ ترا کیا خیال ہے
ہم تو چلے تھے کاکلِ گیتی سنوار نے

پھر نہ کیجیے مری گستاخ نگاہی کا گِلہ
دیکھئے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھکو

ٹوٹا طلسم عہدِ محبت کچھ اس طرح
پھر آرزو کی شمع فروزاں نہ کر سکے
مایوسیوں نے چھین لئے دل کے ولولے
وہ بھی نشاطِ روح کا ساماں نہ کر سکے

گر زندگی میں مل گئے پھر اتفاق سے
پوچھیں گے اپنا حال تری بے بسی سے ہم

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

فطرت کی مشیّت بھی بڑی چیز ہے لیکن
فطرت کبھی بے بس کا سہارا نہیں ہوتی

مجھے معلوم ہے انجام رُوداد محبت کا
مگر کچھ اور تھوڑی دیر سعئی رائیگاں کرلوں

موت آ گئی نہ ہو مرے ذوقِ اُمید کو
محرومیوں میں کیف سا پانے لگاھوں میں

اپنی تباہیوں کا مجھے کوئی غم نہیں
تم نے کسی کے ساتھ محبت نبھا تو دی

زمیں نے خون اگلا آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دن بدلے تو انسانوں پہ کیا گذری
میرا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا سو ہے ابتک
مگر اس عالم وحشت میں ایمانوں پہ کیا گذری
یہ منظر کونسا منظر ہے پہچانا نہیں جاتا
سیہ خانوں سے کچھ پوچھو شبستانوں پہ کیا گذری
چلو وہ کفر کے گھر سے سلامت آ گئے، لیکن
خدا کی مملکت میں سوختہ جانوں پہ کیا گذری

معمورہ احساس میں ہے حشر سا برپا خاموش مگر طبع خود آراء نہیں ہوتی
نالاں ہوں میں بیدردی، احساس کے ہاتھوں دنیا مرے افکار کی دنیا نہیں ہوتی
بیگانہ صفت جادہ منزل سے گزر جا ہر چیز سزا وار نظارا نہیں ہوتی
فطرت کی مشیت بھی بڑی چیز ہے، لیکن
فطرت کبھی بے بس کا سہارا نہیں ہوتی

ز۔خ۔ش صاحبہ

اُردو کی یہ شاعرۂ شعلہ‌نوا' جو ادبی حلقوں میں اپنے نام کے مخفف ز۔خ۔ش سے متعارف ہے' کا اصل نام زاھدہ خاتون شروانیہ تھا ۔ زاھدہ' نزھت اور ز ۔ خ تینوں تخلص کرتی تھیں ۔ آپ دسمبر ۱۸۹۴ء میں اپنے والد مرحوم نواب سر محمد مزمل اللہ خان صاحب کی قدیم سکونت گاہ بھیکم پور ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئیں اور جدید فرودگاہ '' ظفر منزل'' جو ریاست بھیکم پور کے قریب ہی‌واقع ہے' میں پرورش پائی ۔ چار پانچ سال کی عمر میں چونکہ آپ کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا اس لئے آپ کی تعلیم و تربیت کی تمام تر ذمہ داری آپ کے والد مرحوم کے کاندھوں پر آ پڑی ۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ اُنہیں کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ھے کہ زاھدہ صاحبہ اسم بامسمیٰ ھونے کے ساتھ ساتھ صاحب علم و فضل اور نہایت باذوق خاتون بنیں ۔ آپ کی تعلیم قدیم مشرقی انداز کے مطابق گھر پر ہی‌ہوئی اور تربیت کے لئے ایک ایرانی معلمہ رخشندہ نامی مقرر کی گئیں ۔ یہ معلمہ ایران کے شاھی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور فارسی کی بڑی اچھی شاعرہ تھیں ۔ چنانچہ انھیں کے فیض سے ز ۔ خ ۔ ش کےلئے‌فارسی زبان مادری زبان کی حیثیت اختیار کر گئی ۔ اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ھے کہ اُن کی فارسی شاعری میں وھی یگانگت' تسلسل اور روانی پائی جاتی ھے جو اُن کی اردو شاعری کا جزو خاص ھے ۔

زاھدہ صاحبہ نہایت روشن خیال ۔ حریت پسند ' پکی مسلمان اور مشرقی اخلاق و عادات کا کامل نمونہ تھیں ۔ اُنھوں نے باوجودیکہ اتنی تعلیم حاصل کی کہ اپنے خیالات کا اظہار آزادی سے کر لیتی تھیں لیکن خاندانی رواج کے مطابق وہ نہ کسی عام جلسے میں شریک ھوتیں اور نہ کسی‌خاص علمی‌مجالس میں' تاھم اس محدود فضا میں رہ کر بھی اس‌ھونہار شاعرہ نے زبان و ادب کی جو خدمت کی ھے وہ نہایت وقیع و لائق تحسین ھے ۔ افسوس کہ محترمہ نے بڑی مختصر عمر پائی اور صرف اٹھائیس سال کی عمر میں ۴ فروری ۱۹۲۲ء کو بعالم دوشیزگی رحلت فرمائی ۔

مرحومہ نے دس گیارہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کئے اور اُن کا کلام اُس زمانہ کے اکثر رسائل میں مختلف ناموں سے شائع ھو کر خراج تحسین وصول کرتا رھا ۔ ان ناموں میں سے بعض '' سخن گو خاتون '' '' نادر خاتون '' '' ایک شریف بی‌بی '' '' ز ۔ خ ۔ ش'' وغیرہ ھیں لیکن علمی دنیا اُنھیں زیادہ تر موخرالذکر نام سے جانتی ھے ۔ آپ کو یہ شرف بھی حاصل ھے کہ شعر و شاعری میں آپ کو کسی سے باقاعدہ تلمذ نہیں جیسا کہ خود کہا ھے ۔

بے فیض تلمذ ھوئی اُستاد سخن میں
یہ فخر ھے اس احقر خود ساز سے مختص

البتہ یہ فیضان رخشندہ خانم (معلمہ) ھی کا ھے کہ شعر کہنے کی صلاحیت جلا پا گئی ۔ یوں تو مرحومہ عربی و فارسی میں بھی شعر کہتی تھیں لیکن اردو میں بالخصوص آپ کا رنگ نہایت پختہ و سنجیدہ ھے ۔ آپ کے دو مجموعہ کلام شائع ھو چکے ھیں ۔ ان میں ''آئینہ حرم'' ایک مختصر سا رسالہ ھے جس میں آپ کے مشہور مسدس ''آئینہ حرم'' نیز چند دیگر منظومات شامل ھیں ۔یہ مجموعہ ۱۹۲۱ء میں طبع ہوا ۔ دوسرا ''فردوس تخیل'' خاصا ضخیم مجموعہ ھے۔ یہ مجموعہ کلام باوجودیکہ خود زاھدہ صاحبہ کا مرتب کردہ اور اس کا نام بھی انہیں کا تجویز کردہ ھے لیکن اس کی اشاعت محترمہ کی وفات کے کافی عرصہ کے بعد ۱۹۴۱ء میں ہوئی ۔

زاھدہ صاحبہ کے کلام پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ھی معلوم ھو جاتا ھے کہ قومی و ملی رنگ آپ کی شاعری پر چھایا ھوا ھے ۔ اس کے علاوہ آن کی شاعری کا اھم موضوع خواتین کی مذھبی سماجی' تمدنی' اور اخلاقی اصلاح ھے ۔ اس ضمن میں گو مرحومہ نے بہت کچھ لکھا اور بڑے موثر انداز میں حقائق کو پیش کیا ھے لیکن چونکہ یہ مسائل بذات خود بڑے ٹھوس اور خشک ھیں اس لئے یہ ناصحانہ کلام شاعرانہ نقطۂ نظر سے زیادہ کیف و سرور کا حامل نہیں ۔ بایں همه یہ اپنی افادیت کے لحاظ سے حد درجہ قابل قدر ھے ۔ ساتھ ھی اس سے خود شاعرہ کی فارسی اور عربی کی دقیع استعداد کے علاوہ اُن کے دینی اور اسلامی تاریخ کے شغف کا بھی پتہ چلتا ھے ۔

محترمہ نہایت پر گو شاعرہ تھیں اور آپ نے تقریباً ھر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ھے ۔ آپ کے مجموعہ کلام میں حمدونعت' قصیدہ' مسدس' رباعی' غزل' نظم' قطعات غرضیکہ سب کچھ ملتا ھے اور اس میں عرفان حقیقت سے لے کر جذبات نگاری تک کی مثالیں موجود ھیں ۔ لیکن آپ کی قومی و ملی شاعری کا جہاں تک تعلق ھے ایسا معلوم ھوتا ھے کہ آپ علامہ اقبال سے خاصی متاثر تھیں اور ھونا بھی چاھیئے تھا کیونکہ یہ تو پورا دور ھی اقبال کا دور ھے اور اس نسل میں علامہ موصوف کی فکر کے اثرات شعوری' و غیر شعوری دونوں صورتوں میں موجود ھیں ۔

مختصر یہ کہ مرحومہ ز ۔ خ ۔ ش صاحبہ اردو کی بڑی ھونہار شاعرہ تھیں اور ان سے بڑی توقعات وابستہ تھیں مگر افسوس کہ وہ نو عمری میں ھی اس جہان فانی سے کوچ کر گئیں ۔ تاھم انہوں نے جو کچھ کہا ھے اس سے مرحومہ کی سنجیدہ مزاجی' علمیت اور قوم و ملت بالخصوص مسلم خواتین سے حددجہ ھمدردی اور الفت کا پتہ ضرور چل جاتا ھے ۔ اور سچ پوچھئے تو یہ اسی پر خلوص شاعری کا نتیجہ ھے کہ گو مرحومہ نے تمام عمر خود کو گوشۂ گمنامی میں رکھا اور تا دم آخر اپنے اصلی نام سکونت اور شخصیت سے دنیا کو روشناس نہ ھونے دیا لیکن اس کے باوجود آج ادبی حلقوں میں بہت کم لوگ ایسے ھوں گے جو ز ۔ خ ۔ ش کے نام سے واقف نہ ھوں ۔

انتخاب کلام

آئینہ حرم (انتخاب)

میں نے مانا کہ خموشی ھے بیاں سے بہتر ‏ ‏ ‏ لب پیوستہ' لب شہد فشاں سے بہتر

صبر شیون سے، شکیبائی فغاں سے بہتر دل ہے اسرار کے رہنے کو زباں سے بہتر
پر ہر اک شے کے لئے حد ہے معیّن لوگو
ضابطہ درد ہو کب تک جگر زن لوگو

مہد سے تابہ لحد ظلم اٹھائے صدیوں تیر پر تیر دل خستہ نے کھائے صدیوں
چپکے چپکے گھُر اشک لٹائے صدیوں قصص حسرت دل، دل کو سنائے صدیوں
صنف غالب میں گر اس صبر و سکوں کا شمّہ
سعی و تفتیش سے مل جائے تو میرا ذمّہ

بھائیو! آہ رہے سینہ میں مدفوں کب تک دل ہی دل میں گلہ، طالع واژوں کب تک
آستیں سے ہو نہاں دیدۂ پر خوں کب تک غم کو پوشیدہ رکھے خاطر محزوں کب تک
حال دل کیوں نہ کہیں منہ میں زباں رکھتے ہیں
ہم بھی پہلو میں دل اور جسم میں جاں رکھتے ہیں

کیا کہوں کیسے الم دیدہ و ناشاد ہیں ہم خستۂ جور ہیں ہم، کُشتۂ بیداد ہیں ہم
تختہ مشق سناں بازئ صیّاد ہم ہیں آدمی کا ہے کوھیں پیکر فولاد ہیں ہم
ہائے یہ ظلم کہ بے جرم چلائیں خنجر
اس پہ یہ حکم کہ فریاد نہ آئے لب پر

آتش ظلم سے دنیا ہوئی دوزخ ہم پر پھونک ڈالا تپ دق بن کے غموں نے اکثر
بے اجل مرتے ہیں تہخانہ کے اندر گھُٹ کر ہیں جو تنگی میں منافق کی لحد سے بدتر
ڈاکٹر کہتے ہیں ''در کھولو ہوا آنے دو''
تنگدل کہتے ہیں ''ہرگز نہیں مر جانے دو

یاد ایّام کہ تھا بخت فدائے مسلم ڈھونڈھتے تھے فلک و ارض رضائے مسلم
دلِ ہرقل کو ہلاتی تھی ندائے مسلم تاج ایران تھا زیر کف پائے مسلم
رتبہ ''انتم الاعلون'' تھا اس کے لائق
قول ''اکملت لکم دینکم'' اس پر صادق

ہم سے غافل نہ تھی یوں انجمن قال اقول نہ گرایا تھا ہمیں صورت حرف معلول
عائشہ کےدھن پاک سے جھڑتے تھےجو پھول آج تک ہیں وہ بہار چمن شرع رسول
عرصۂ جنگ میں بھی ہم نے کئے کار وقیع
صنف نازک سے نہ تھی خولۂ جانباز و شجیع

کون؟ مسلم وہی فرماں بر شاہِ انساں ہاں وہی مصلح اخلاق تباہِ انساں
ہاں وہی اوج دہ رایت جاہِ انساں ہاں وہی نور دہِ بخت سیاہِ انساں
ہاں وہی واقف عقلیت اسباب و علل
ہاں وہی واصف حریت افکار و عمل

مردوزن مل کے اٹھا سکتے ہیں وہ اثقل بار کانپ اٹھا جس سے دل ارض و سپہر دوّار
مردوزن مل کے لگا سکتے ہیں وہ کشتی پار جو خلیج متلاطم میں پڑی ہے بیکار
آؤ وحدت کی امانت کو اٹھالیں مل کر
آؤ ! اسلام کی کشتی کو بچا لیں مل کر

شوق نظارہ تھیٹر و بازار نہیں مقصد حریت و علم یہ زنہار نہیں
حُکم برداری شوہر سے بھی انکار نہیں بخدا پردہ دری کے بھی روا دار نہیں
ہے حیا بادشہ علم کے سر کا افسر
قول مشہور ہے ''العلم حجاب الاکبر''

سدّ راہ ستم فتنہ گراں ہے پردہ خازن معتمد گنج نہاں ہے پردہ
مظہر شان خداوند جہاں ہے پردہ جذبۂ غیرت مسلم کا نشاں ہے پردہ
اثرعصر سے محفوظ ہے پردے کا وجود
دُور ہوں اس سے جو ناقابل برداشت قیود

مرد کا رتبہ گھٹانا نہیں ہرگز مقصود زن کو بے شبہ رضا جوئی شوہر ہے ضرور
لیکن اس کو تو فراموش نہ فرمائیں حضور بطن عورت سے ہوا نور محمّد کا ظہور
یہ تنفر، یہ حقارت کی نگاہیں کب تک
عرش جنباں ہوں خواتین کی آہیں کب تک

لذّتِ عرفاں

رنگ فطرت ہے وجہ حیرانی عقل ہے اور حیائے نادانی
رازداں مدعا کو کہتے ہیں حسن آلفت کا داغ پیشانی
حسن ''باقی'' نے دل کو کھینچ لیا رخصت اے حسن ہستئ فانی
دل ہے وقف رجائے رحم و کرم جاں ہے نذر رضائے ربّانی
اب میں سمجھی کہ ہے فنائے خودی انبساط بہشت لا فانی
غم نہ کر ہے نقیب ابر بہار خشکی موسم زمستانی
دل صد پارہ کے الم گن لوں دیکھی جائے گی سبحہ گردانی
کر سکے طے نہ ملک عرفاں کو رومی و مغربی و کرمانی
دورئ بزم دوست کے غم میں محو افغاں ہے اک افغانی
عرش کے کنگرے پہ طائر قدس رات کرتا تھا یوں خوش الحانی
کہ ہے انساں طلسم شان خدا قدر اپنی نہ اس نے پہچانی
بند کیں اس نے جب ذرا آنکھیں کھل گیا راز بزم امکانی

چارۂ روح فلسفی ہے نہ شیخ ایک وھمی ہے ایک خفقانی
کثرت این وآں میں وحدت دوست گنج نایاب کی فراوانی
شیخ رنج بیاں کا ڈر نہ کرے لا بیاں ہے یہ کیف وجدانی
متشکک ہے اور شکایت ھجر
''نزھت'' اور شکر لطف پنہانی

پیام

دل فسردہ کو اب طاقت قرار نہیں نگاہ شوق کو اب تاب انتظار نہیں
نہیں نہیں مجھے برداشت اب ''نہیں'' کی نہیں خدا کے واسطے کہنا نہ ایکی بار ''نہیں''
همیشہ وعدے کئے اب کے مل ھی جا آکر حیات و وعدہ و دنیا کا اعتبار نہیں
دکھاتی اپنی محبت کو چیر کر سینہ مگر نمود مرا شیوہ و شعار نہیں
مری بہن ! مری محبوبہ ! حُب عجب شے ہے
جہان خاک نہیں کچھ، جو دوست دار نہیں

تحفۂ درویش

بحر غم میں ہے سخت طغیانی سر سے آوپر گزر گیا پانی
کب تک اے نزھت برشتہ جگر شور ''یا رب'' سے عرش جنبانی
رونے دھونے سے جان کھونے سے کہیں بنتے ھیں کام دیوانی
درد دل درد آفرین کو سنا کر گزر جی میں ہے جو کچھ ٹھانی
دشت وحدت ہے دشت وحدت ہے دیکھ آھستہ کرفرس رانی
بے خبر پہلے نقش کر دل پر عظمت بارگاہ یزدانی
مایۂ اشک، یاں بضاعت مور ھیچ واں شوکت سلیمانی
پہلے دے صدقہ ماسوی اللہ کا پہلے کر جان و دل کی قربانی
صدف فکر سے نکال گُہر تر بتر کر عرق سے پیشانی
''نزھت'' بے نوا سے ھدیہ بدست ھو قبول جناب سلطانی
ھدیہ کیا ؟ ایک سادہ دفتر پر لکھ کے لائی ھوں لفظ '' لاثانی ''
دیں ہے اُلفت، وطن افغانستان
عرف مجنوں ہے پیشہ حسّانی

دو رباعیاں

جاں بلب ضعف سے ہوں،لب کو ہلاؤں کیونکر
دسترس اس پہ نہیں خامہ اٹھاؤں کیوں کر
حال پوچھو نہ مرا خود ہی بتاؤ مجھ کو
ایسی حالت میں تمہیں حال بتاؤں کیوں کر

مسلمانو! کہاں تک بے زباں حیواں کی قربانی
درِ جاں آفریں پر آؤ، کردیں جاں کی قربانی
موقر تھی خلیل رب کی قربانیٔ لختِ دل
مگر ہے اور شے شبیر با ایماں کی قربانی

تضمین براشعار غالب

درد الفت یونہی تھا رگ رگ میں ساری، ہائے ہائے
کیوں لگایا پھر وفا کا زخم کاری، ہائے ہائے
تجھ سا بے فکر ۔ اور کسی کی غمگساری، ہائے ہائے
درد سے میرے ہو تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم! تری غفلت شعاری؟ ہائے ہائے

کچھ ہنسی تھا شرکت رنج و الم کا حوصلہ
آہ یہ ۔ اک خوگر ناز و نعم کا حوصلہ
کیوں کیا بے قوّت دل اس ستم کا حوصلہ
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

تھا مرا غمخوار بن کر پھولنا پھلنا محال
کٹ گیا آخر نہ تیرا نخل عمر؟ اے نونہال
آہ ناداں! کیوں نہ سوچا میری الفت کا مآل
کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی میری دوست داری ہائے ہائے

جیتے جی ہم تم رہے گریک دل ویک جا — تو کیا
تا دم آخر ۔ بھرا گردم محبت کا — تو کیا
عمر بھر پیماں رہا منت کش ایفا — تو کیا
عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا — تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے

چھوڑ کر زنداں میں مجھ کو تو نے راہ خلد لی
تیرے زخم ناوک فرقت سے میں جیتی بچی
ہو چکی بس اعتماد دل کی شیخی کر کری
خاک میں ناموس پیماں محبت مل گئی
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسم یاری، ہائے ہائے

وا دریغا تھا دل بیمار غم کو آسرا
"آب تیغ ناز سے اک دن مجھے ہوگی شفا"
حسرت اے شوق جراحت! رخصت اے ذوق فنا
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری، ہائے ہائے

غم ہرے کرتی ہے فصل اشکبار برشگال
مثل قسمت تار ہیں لیل و نہار برشگال
کب کھلے گا ہائے ۔ ابر سایہ دار برشگال
کیسے کاٹوں ہائے ۔ میں شب ہائے تار برشگال
ہے نظر خوکردۂ اختر شماری ہائے ہائے

ایک دن وہ بھی تھا جب دم بھر کی فرقت تھی محال
آہ اک دن یہ بھی ہے جب رونما ہے انفعال
یہ الم کب تک سہوں ؟ کب تک نہ ہو جینا وبال
گوش مہجور پیام و چشم محروم جمال
ایک دل تس پر یہ نا امیدواری ہائے ہائے

جلال الدین اکبر

چودھری جلال الدین نام اکبر تخلص ، ستمبر ۱۹۰۵ء میں علی وال نہراں والا ضلع گورداس پور میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے والد چودھری فتح علی مرحوم شہ زوری میں شہرہ آفاق تھے ۔ اور اپنی سیر چشمی و فیاضی کی بدولت سارے علاقہ میں ایک نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ اکبر صاحب نے ابتدائی تعلیم کی تکمیل اپنے گاؤں میں کی ۔ پھر میٹرک ایم ۔ بی ہائی سکول گوجرہ سے پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہورمیں داخلہ لیا اور یہاں سے بی ۔ اے (آنرز) کی ڈگری حاصل کی ۔ طالب علمی کے زمانہ میں اکبر صاحب نے تقریباً ہر درجہ میں اپنی نمایاں کامیابی کی وجہ سے وظیفہ پایا اور اسی دوران میں انہیں تعلیمی زندگی سے اس قدر رغبت پیدا ہو گئی کہ گورنمنٹ کالج سے فارغ التحصیل ہو کر سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے معلمی کی سند لی اور انجمن حمایت اسلام لاہور کی ملازمت اختیار کر لی جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے ۔ آجکل آپ انجمن کے اسلامیہ ہائی اسکول ملتان روڈ لاہور کے ہیڈ ماسٹر ہیں ۔

اکبر صاحب کو شعر و شاعری سے بچپن ہی سے شغف رہا ہے ۔ شعر گوئی کا آغاز ثانوی تعلیم کے زمانے سے ہوا ۔ جب لاہور تشریف لائے تو ادبی حلقوں میں آپ کا کلام مقبول ہوا اور پھر ملک کے مقتدر جرائد میں اس کی اشاعت شروع ہوئی ۔ ۱۹۲۷ء میں آپ کا تعارف منصور احمد صاحب مرحوم سے ہوا جو اس وقت ''ہمایوں'' کے مدیر تھے ۔ رفتہ رفتہ یہ شناسائی گہرے روابط کی صورت اختیار کر گئی اور ان تعلقات کا یہ اثر ہوا کہ پھر آپ نے جو کچھ لکھا وہ پہلے منصور صاحب کو دکھا لیا اسکے بعد اشاعت کے لئے بھیجا ۔ منصور صاحب کے علاوہ آپ اپنے استاد سید عابد علی صاحب عابد (پرنسپل دیال سنگھ کالج لاہور) کے بہت ممنون ہیں ۔ چونکہ عابد صاحب نے نہ صرف آپ کے کلام کی بیشتر اصلاح کی بلکہ آپ کا مجموعہ کلام ''نقش ارژنگ'' بھی انہیں کی نظر ثانی کے بعد ۱۹۳٦ء میں شائع ہوا ۔ البتہ یہاں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کا تذکرہ بھی ضروری ہے جنہوں نے خط و کتاب کے ذریعہ شعر و سخن کے بہت سے نکات اکبر صاحب کو بتائے اور ''نقش ارژنگ'' پر ''معارف'' میں نہایت معقول و حوصلہ افزا تبصرہ لکھ کر ان کی شاعری کی داد دی ۔

''نقش ارژنگ'' کی اشاعت کے بعد اکبر صاحب کی مشق سخن جاری رہی ۔ اُن کی زندگی میں کوئی بھی ایسا واقعہ نہیں گزرا جو قابل ذکر ہو سوائے اس کے کہ وہ طالب علمی کی حدود سے گزر کر اُستاد بن گئے ۔ البتہ ۱۹۳۸ء میں اُن کی ملاقات ایک ایسے مرد درویش سے ہوئی جس نے تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی روحانیت کے اثر سے اُن کے خصائل ' رجحانات ' معتقدات غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں ایک نمایاں تغیر پیدا کر دیا ۔ یہ بزرگ حضرت حاجی حافظ حاکم علی‌رحہ تھے ۔ آپ کا وصال ۱۹۴۰ء میں ہوا لیکن وصال سے پہلے آپ نے اکبر صاحب کے حسن سیرت اور عقیدتمندی کے پیش نظر اُنہیں اپنا خرقۂ مبارک دیگر خلافت عطا فرمائی ۔ بہر حال اس واقعہ کی اہمیت اکبر صاحب کی زندگی کے دوسرے تغیرات سے قطع نظر ہمارے لئے یوں زیادہ ہے کہ اس سے اُن کی شاعری میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا ہے اور اب اُن کا کلام رنگینی و مستی کی فضاؤں سے نکل کر سرحد عرفان میں قدم رکھ چکا ہے ۔

حضرت اکبر کے کلام پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد ایک بات جو نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ باوجودیکہ اُنہوں نے نظم و غزل دونوں میں طبع آزمائی کی ہے لیکن وہ خالصتاً غزل گو شاعر ہیں ۔ چنانچہ اُن کی منظومات میں بھی جو دلکشی و جاذبیت پائی جاتی ہے وہ در اصل اُن کے تغزل کی وجہ سے ہے ۔ اُن کے تغزل میں ایک سادگی ' ایک دھیماپن اور ایک مخصوص رکھ رکھاؤ پایا جاتا ہے ۔ اکبر صاحب کے جذبات عام طور پر بلند ہیں لیکن ساتھ ہی وہ چونکہ بڑے سلیقہ اور احتیاط کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں اس لئے اُن میں بڑی کشش ہے ۔ غزل میں یوں بھی ''کیا کہا ہے'' کے مقابلہ میں ''کیونکر کہا ہے'' کو زیادہ اہمیت حاصل ہے اس لئے کہ یہ ایسا جادو ہے جو پیش پا اُفتادہ خیالات میں بھی ایک نئی روح پھونک دیتا ہے ۔ اکبر صاحب اس ''کیوں کر کہا ہے'' کے گر سے بخوبی واقف ہیں چنانچہ اُن کی اکثر غزلیات اپنے سادہ مگر حسین اُسلوب اور زبان کی بے پناہ لطافت و روانی کے محاسن سے آراستہ ہیں ۔ وہ فارسی کی تراکیب بالعموم کم استعمال کرتے ہیں لیکن جہاں کہیں استعمال کرتے ہیں اُن میں تنوع اور رنگینی سے کام لے کر کلام کو پر زور بنا دیتے ہیں ۔

یوں تو آپ کا سارا کلام ہموار و شیریں ہے لیکن آپ کی چھوٹی بحروں کی غزلیں خصوصیت کے ساتھ قابل مطالعہ ہیں ۔ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے ''نقش ارژنگ'' کی اُنہیں غزلیات سے متاثر ہو کر اکبر صاحب کو پنجاب کا ''حسرت موہانی'' کہا تھا ۔ اور اس میں شک نہیں اس رنگ میں شاعر موصوف نے بعد میں اور بھی ترقی دکھائی ہے ۔ تاہم یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ حسرت مرحوم کے تغزل کے لئے نہایت رچی ہوئی شعریت اور بلا کی فنی مشاطگی کی ضرورت ہے ۔ ساتھ ہی ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حسرت کی زندگی اور اُن کی غزل سرائی میں ایک لطیف ہم آہنگی بھی تھی جو بلاشبہ ہر شاعر کے یہاں پیدا نہیں ہو سکتی ۔ بہر حال حسرت تو بہت کچھ تھے لیکن یہ کیا کم ہے کہ جناب اکبر نے اپنے مذاق و سلیقہ کے مطابق اُن کے رنگ سخن کو اپنایا اور ایسا اپنایا کہ کہیں کہیں اُن کی آواز پر ''رئیس المتغزلین'' کی آواز کا دھوکا ہونے لگتا ہے ۔

جہاں تک زبان کا تعلق ہے یقیناً حضرت اکبر قابل مبارک باد ہیں اُن کی زبان ایسی صاف، سادہ اور شستہ ہے کہ پڑھنے والا اُن کی اور دلی اور لکھنؤ کی زبان میں کوئی خاص امتیاز نہیں پیدا کر سکتا۔ پھر وہ جذبات کے بیان میں ایسے برمحل و پرتاثیر الفاظ سے کام لیتے ہیں کہ کلام میں درد و لطافت کی ایک عام کسک محسوس ہوتی ہے۔

آخر میں اُن کے عارفانہ رنگ کے متعلق بھی کچھ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے چونکہ یہی وہ رنگ ہے جسے اُن کے پچھلے پندرہ سولہ سال کے ذہنی تغیرات کی نمائندگی حاصل ہے۔ اُن کے اس رنگ میں ابھی وہ کیفیت تو نہیں پیدا ہوئی جسے ہم ''من تو شدم تو من شدی'' کے مصداق کہہ سکیں مگر تغزل کی رنگینی پر ایک طہارت و پاکیزگی ضرور غالب آ چلی ہے۔ اور اُن کے لب و لہجہ میں اعتماد کی جھلک پائی جاتی ہے۔ یقین ہے کہ اس رنگ کی کامیابی اُن کے کلام میں سپردگی کی وہ لازوال خصوصیت پیدا کر دے گی جسکے بغیر غزل کا شعر ایک اچھا شعر تو بن سکتا ہے نشتر نہیں بن سکتا۔

انتخاب کلام

تغزل

ہو گیا حسن شرمسار جفا — عشق نادم ہوا جفا کر کے
آئے تسکین اضطراب کو وہ — اور بھی کچھ چلے سوا کر کے

مرے دیر آشنا کو مجھ سے اُلفت ہوتی جاتی ہے
تمنا دل کی پامال مسرت ہوتی جاتی ہے
وہ ظلم ناروا کے ذکر پر شرمائے جاتے ہیں
شکائت بھی مجھے وجہ ندامت ہوتی جاتی ہے

ہر دل ہے جوش بادۂ اُلفت سے میکدہ — تیری نگاہ انجمن آرائے کیف ہے

بھولتا ہی نہیں ہے وہ مجھ کو — بھول کر بھی کیا نہ جس نے یاد

جدا ہیں مجھ سے وہ لیکن نہیں پھر بھی جدا مجھ سے
مرا دل اُن میں رہتا ہے وہ میرے دل میں رہتے ہیں
تصور کی خیال آرائیاں دل سے نہیں جاتیں
نکل کر تیری محفل سے تری محفل میں رہتے ہیں

قیامت ہے انھیں مجھ سے گلہ ہے کم نگاہی کا
غضب ہے مرے ارماں اُنکے ارماں ہوتے جاتے ہیں

ہم سے قائم جنون اُلفت ہے — یعنی سرگشتۂ وفا ہیں ہم
ایک عالم کے دل میں بستے ہیں — یعنی اک دلنشیں ادا ہیں ہم
عشق سے ہے فروغ رنگ جہاں — ابتدا ہم ہیں انتہا ہیں ہم

حسن اگر آشکار ہو جائے — فتنۂ روزگار ہو جائے
دل کو اس طرح دیکھنے والے — دل اگر بے قرار ہو جائے
شوخیٔ یار کا تقاضا ہے — شوق بے اختیار ہو جائے
کوئی شکوہ رہے نہ "اکبر" کو — تو اگر ایک بار ہو جائے

اُن کے جلووں نے پھول برسائے — ناز کی گل فروشیاں نہ گئیں
ظلم بھی اُن کے لطف ٹھیرائے — دل کی نازک خیالیاں نہ گئیں

ہو گئے ایک مہرباں سے جدا — مٹ گیا لطف زندگانی کا

تجھ کو اللہ نے بخشا ہے یہ کیا حسن کلام — تیرے انکار میں اقرار نظر آتا ہے

حیرت فروز ہو گئیں تیری تجلیاں — دیدار برق حسن کی جرأت نہ ہو سکی
تمکین ناروا میں وہ پرسش نہ کر سکے — خود داریوں میں ہم سے شکایت نہ ہو سکی

اب وہ نگاہ یار کی دلداریاں کہاں — اب ظلم آشکار میں لطف نہاں کہاں

اب رنگ التفات کہاں چشم شوخ میں　　اب شوق کامگار کی گستاخیاں کہاں
اب میں ہوں اور کاهش ناکامئ وفا　　اب وہ فریب شوق کی سرمستیاں کہاں

آپ کی بندہ نوازی تو مسلّم لیکن
مجھے معلوم ہے جو کچھ مری تقدیر میں ہے
اس میں کچھ میری نظر کا بھی کرشمہ ہے ضرور
یہ جو اک حسن نمایاں تری تصویر میں ہے

نرالا ہے طریق رازداری اُن کا دنیا سے
جسے کچھ ہوش آ جائے وهی دیوانہ ہو جائے

میں تاثیر وفا کو رو رہا ہوں　　ترے تمکین بے حد کا گِلا کیا
پلٹنا هی پڑے گا سوئے کعبہ　　نہیں ہوگا در میخانہ وا کیا

اللہ اللہ تیرا جلوہ ناز　　خود بخود جھک گئی جبین نیاز
اضطراب وفا کا حال نہ پوچھ　　دل دھڑکنے کی سُن ذرا آواز

شکایت سے کہیں شکر ستم کو دل نشیں پایا
کہ هم نے اُس وفا نا آشنا کو شرمگیں پایا

رونا تو ہے یہی کہ نہیں آہ میں اثر　　شکوہ ہے آپ سے نہ شکایت ہے آپ سے
اس دل کی آرزوئے محبت کو کیا کہوں　　جس دل کو آرزوئے محبت ہے آپ سے
''اکبر'' وہ مہربان ہے جان جہان تو پھر　　اہل جہاں کو ہو جو عداوت ہے آپ سے

بیگانگی میں بھی تھا کبھی رنگ التفات　　لیکن اب التفات میں بیگانگی سی ہے

اُنہیں غرور مجھے ناز بے نیازی تھا　　ملے ، مگر کبھی دل سے ملے نہ آپس میں

یاد گناہ و اشک ندامت میں لطف ہے ورنہ نہیں ہے خاک بھی لذت گناہ میں
یہ زندگی حیات ہے یا موت ہے حیات گزری تمام عمر اسی اشتباہ میں
زندہ دلی کے ساتھ مٹا زندگی کا لطف لذت ثواب میں نہ مزا ہے گناہ میں
''اکبر'' کو ایسے منزل مقصود مل چکی
بیٹھا ہے پاؤں توڑ کے کمبخت راہ میں

نہ سہی دیر و حرم کوچۂ جاناں ہی سہی
ایک سجدے سے غرض ہے وہ کہیں ہو جائے

خلوص عشق کو شکوے بہت ہیں تمہارے التفات بد گماں سے
تمہاری ہمدمی کا ایک لمحہ کہیں بہتر ہے عمر جاوداں سے

ایک آنسو میں کہہ دیا غم دل کس قدر ہم نے اختصار کیا

عشوہ و ناز کا قصور نہیں مجھ کو ذوق نگاہ نے مارا
تنگ دستی نے پارسا رکھا آرزوئے گناہ نے مارا

تھا مژدۂ وصال کہ شرما کے رہ گئے کچھ آج زیر لب جو وہ فرما کے رہ گئے
پاس ادب نے دی نہ کبھی فرصت کلام شکوے مری زبان پر آ آ کے رہ گئے

یہ کائنات یہ بزم ظہور کچھ بھی نہیں
تری نظر میں نہیں ہے جو نور کچھ بھی نہیں
نگہ اگر ہو تو ہر ذرہ میں ہزاروں طور
نگہ اگر نہ ہو بالائے طور کچھ بھی نہیں
یہ قرب و بُعد بمقدار شوق سالک ہیں
جسے تو دور سمجھتا ہے دور کچھ بھی نہیں

دنیا کا غم نہ خواہش عقبیٰ کرے کوئی میری طرح جو تیری تمنا کرے کوئی
ہر آن ایک تازہ تجلی ہے روبرو - میری نگاہ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

اُن کو تو اپنی جلوہ نمائی سے کام ہے　　دیکھا کرے کوئی کہ نہ دیکھا کرے کوئی
سرمایۂ نشاط دو عالم ہے دردِ عشق　　اچھا کرے کوئی جو نہ اچھا کرے کوئی

اور ٹھہرا ہے کہیں اور نہ کہیں دل ٹھہرے
وہ مری زندگیٔ شوق کا حاصل ٹھہرے
گو ہر اک گام پہ آفاتِ سفر تھیں در پیش
ہم جو منزل کو چلے بر سرِ منزل ٹھہرے

کہاں نہیں ہے اگر دل میں ہے مقام اُس کا
کہیں نہیں ہے اگر وہ یہاں نہیں ملتا

یہ بھول بھی کیا بھول ہے یہ یاد بھی کیا یاد
تو یاد ہے اور کوئی نہیں تیرے سوا یاد
اس حسنِ تعلق کا ادا شکر ہو کیوں کر
میں نے جو کیا یاد تو اُس نے بھی کیا یاد
اُس مردِ خدا مست کی کیا بات ہے ''اکبر''
جس کو نہ رہا کچھ بھی بجز یادِ خدا یاد

ترا وصل ہے مجھے بے خودی، ترا ہجر ہے مجھے آگہی
ترا وصل مجھ کو فراق ہے، ترا ہجر مجھ کو وصال ہے
میں ہوں در پر اُس کے پڑا ہوا، مجھے اور چاہئے کیا بھلا
مجھے بے پری کا ہو کیا گِلا، مری بے پری پر و بال ہے
وہی میں ہوں اور وہی زندگی، وہی صبح و شام کی سرخوشی
وہی میرا حسنِ خیال ہے، وہی اُن کی شانِ جمال ہے

''اکبر'' بتوں کے لطف سے محروم ہوں اگر　　کچھ غم نہیں کہ میرا خدا میرے ساتھ ہے

دل مردہ پہ ہیں مسدود سب راہیں محبت کی
جو دل زندہ ہو ہر دم دوست کا پیغام آتا ہے

کوئی کیا جانے دل کا اور اُن کا رابطہ کیا ہے
کہ دل ہی دل میں ہم اُن کو ہمیشہ یاد کرتے ہیں
اب اس سے بڑھ کر اوج طالع عشاق کیا ہوگا
کہ جب ہم یاد کرتے ہیں تو وہ بھی یاد کرتے ہیں

منظومات

نغمۂ ناہید

(کسی وفا نا آشنا کے حضور میں)

میری خاموش التجاؤں کی ساعت ہو نہ ہو
تیرے انداز تغافل کی نہایت ہو نہ ہو
میرے حال زار پر چشم عنایت ہو نہ ہو
اے وفا نا آشنا تجھ کو محبت ہو نہ ہو

عشق میرا سر بسر رنگینئ اُمید ہے
آنکھ محو جستجو ہے دل میں ذوق دید ہے

عشق تیرا ہے بہشت جاوداں میرے لئے
یاد تیری ہے نشاط کامراں میرے لئے
رنج تیرا ہے سرور بے کراں میرے لئے
تیرے جلوے حاصل کون و مکاں میرے لئے

باوجود نامرادی عشرت جاوید ہے
میرے ارمانوں کی دنیا میں ہمیشہ عید ہے

مجھ کو تجھ سے خواہش لطف و کرم کوئی نہیں
یہ ترا جور و ستم جور و ستم کوئی نہیں
شوق میں تیرے مجھے رنج و الم کوئی نہیں
مجھ کو تیری بے وفائی کی قسم کوئی نہیں

جام غم واللہ مجھ کو ساغر خورشید ہے
نالۂ حسرت سرود و نغمۂ ناہید ہے

وعدہ آنے کا وفا کیجئے

اے ۰۰۰۰ اے پیکر شائستۂ مہر و وفا
تیرا ہر انداز مجھ کو باعث صد ناز ہے
تیرے الطاف فراواں کا یہ سارا فیض ہے
آج بھی حاصل جو مجھ کو لذت آغاز ہے
تیرا ہر شیوہ ترے اکرام پیہم کی دلیل
میرا ہر انداز تیرے شوق کا غماز ہے
تیری اُلفت ہے سرور زندگانی کی کفیل
میں جو زندہ ہوں اسی اُلفت کا یہ اعجاز ہے
آج بھی تیری تمنا میں وہی ہیں گرمیاں
آج بھی دل کی جگہ طوفان سوز و ساز ہے
اب نہیں جان حزیں کو تاب رنج انتظار
وعدہ آنیکا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے
بڑھ گئیں حد سے جنون شوق کی بے تابیاں
روح اب قید بدن سے مائل پرواز ہے
اک ہجوم شوق ہے دل میں مگر خاموش ہوں
آ ' کہ تیرے واسطے میں سر بسر آغوش ہوں

تحریک عمل

دیکھے اگر تو یاس ہے انکار ذات حق
اُمید وار رحمت پروردگار رہ
آئیں گی مجھ کو راس نہ سرمستیاں کبھی
رہنا ہے اس جہاں میں اگر ہوشیار رہ
اب دشت گردیوں کے زمانے گزر گئے
ہنگامہ زائے محفل زیبائے یار رہ
شایاں عاشقی نہیں مایوسی و فراق
ہر دم رہین کشمکش انتظار رہ
جاتی رہیں گی حسن کی بے اعتنائیاں
تو اپنے عہد شوق پہ خود اُستوار رہ
اچھی نہیں ہیں دوست یہ عزلت گزینیاں
تو حق و راستی ہے سدا آشکار رہ
یہ تیرہ خاکداں ترے دم سے جھلک اُٹھے
رخشاں عمل کے چرخ پہ خورشید وار رہ
اہل نظر کو زندگئی پر سکوں ہے موت
بحر جہاں میں برق صفت بیقرار رہ
پیدا ہر اک بہار میں اپنی بہار کر
اور بے نیاز عہد خزان و بہار رہ

کس نے کہا تجسس و تدبیر چھوڑ دے
سنگ عمل سے شیشۂ تقدیر توڑ دے

رباعیات و قطعات

از بسکہ بلند ہے طبیعت میری
همدوش ثریا ہے یہ رفعت میری
ہوں بندۂ سرور دو عالم ''اکبر''
مسجود ملائک ہے محبت میری

جتنا کہ میں سرشار ہوا جاتا ہوں
اتنا ہی خبردار ہوا جاتا ہوں
کیا شے ہے شراب معرفت بھی ''اکبر''
پی پی کے میں ہشیار ہوا جاتا ہوں

وہ لطف بھی گیا وہ مدارات بھی گئی
یعنی کبھی کبھی کی ملاقات بھی گئی
تدبیر تھی کہ اور فزوں لطف یار ہو
تقدیر کا برا ہو کہ وہ بات بھی گئی

پیکار عمل کو آبرو کہتا ہوں
دنیا کو مقام هاؤ ھُو کہتا ہوں
''اکبر'' ہے سکون، موت میرے نزدیک
ہستی کو مذاق جستجو کہتا ہوں

مشتاق جمال ہیں نگاہیں میری
اشراق جمال ہیں نگاہیں میری
طاری ہے جہان پر میرا حسن نظر
خلاقِ جمال ہیں نگاہیں میری

اگر بے تابیاں دل کی یہی ہیں
تو اب جا کر ملا اُس جان جاں سے
ہوائے شوق اڑائے جا رہی ہے
بڑھا جاتا ہوں آگے کارواں کے

الٰہی کیسی مصیبت ہے ہجر جاناں میں
کہ ہر خوشی مجھے وجہ ملال ہو جائے
کسی طرح تو دل مضطرب کو چین آئے
نہیں جو وصل ہے ممکن وصال ہو جائے

زیب عثمانیہ

تاجور نام ، زیب تخلص ، عثمانیہ نسبت خاندانی سے مشہور ہیں ۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۳ء کو لدھیانہ (مشرق پنجاب) کے ایک متوسط افغان گھرانے میں پیدا ہوئیں ۔ بچپن ہی میں آپ کے عم محترم خان غلام محمد خاں صاحب یکتا نے جو لاولد تھے ، آپ کو متبنیٰ کر لیا چنانچہ زیب صاحبہ کی تعلیم و تربیت انہیں کی آغوش عاطفت میں ہوئی ۔ اسلامی گھرانوں کے رواج کے مطابق آپ کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام گھر پر کیا گیا اور محترمہ نے اپنی ذہانت و فطانت کی بدولت جلد ہی آردو فارسی علم و ادب پر عبور حاصل کر لیا ۔ تقریباً بیس سال کی عمر میں آپ کی شادی اپنے پھوپھی زاد بھائی سلطان بہاؤالدین صاحب سے ہوئی اور اس طرح موصوفہ کی خوشگوار ازدواجی زندگی کا آغاز ہوا ۔

محترمہ زیب کے عم محترم حضرت یکتا ایک کہنہ مشق شاعر تھے ۔ چنانچہ آپ کو اوائل عمر ہی سے آن کا کلام دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہا اور یہی چیز آپ کے لئے ترغیب شاعری کا باعث ہوئی اس پر مستزاد یہ کہ خود بھی قدرت کی طرف سے شاعرانہ دل و دماغ لے کر پیدا ہوئی تھیں نتیجہ یہ ہوا کہ مشغلۂ شعر و سخن دلچسپی کے ساتھ آسان بھی نظر آنے لگا ۔ ابتدا ہی سے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کرنا شروع کی اور چند سال کی مشق نے خیالات میں بلندی اور کلام میں پختگی پیدا کر دی ۔ دسمبر ۱۹۳۷ء میں آپ پہلی مرتبہ ادبی دنیا کے سامنے ایک بلند پایہ شاعرہ کی حیثیت سے متعارف ہوئیں ۔ جب کہ آل انڈیا مشاعرہ منعقدہ لاہور میں آپ کو ایک نظم ''مقصد حیات'' پر انجمن آردو پنجاب کی طرف سے طلائی تمغہ عطا کیا گیا ۔ علم و ادب کی بیرونی فضا میں اس پہلی کامرانی کے بعد رفتہ رفتہ آپ کا کلام ملک کے اکثر مؤقر جرائد و اخبارات میں چھپنے لگا اور ادبی حلقوں میں نہ صرف مقبول ہوا بلکہ نہایت وقیع نظروں سے دیکھا گیا ۔ یہ حوصلہ افزائی بالآخر آپ کے مجموعہ کلام ''متاع حرم'' کی تدوین کا باعث ہوئی جو ۱۹۴۱ء میں لاہور سے شائع ہوا ۔ تقسیم ہند کے بعد محترمہ پاکستان آ گئی ہیں اور فکر سخن جاری ہے یہاں کے رسائل بالخصوص عصمت میں آپ کا کلام دیکھنے میں آتا ہے ۔

موجودہ دور شاعری در حقیقت حکیم الامت علامہ اقبال مرحوم کا دور ہے اور اس دور کے ادباء ، شعرا اور مفکرین ارادی یا غیر ارادی طور پر اقبال کے کلام و پیام سے متاثر ضرور ہیں ۔ تاہم وہ شعرائے کرام جنہوں نے صحیح معنوں میں علامہ موصوف کا اتباع کیا ہے آن میں حضرت اسد ملتانی اور جناب امین حزیں خاص طور قابل ذکر ہیں ۔ ان دونوں بزرگوں کے بعد متبعین اقبال میں اگر کسی کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ ہماری

شاعرہ زیب صاحبہ کا ہے ۔ آپ کے کلام کے مطالعہ کے بعد قاری اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ آپ نے نہ صرف موضوعات اقبال پر طبع آزمائی کی ہے بلکہ اقبال کے فلسفہ ، پیغام اور روح کو حسب بضاعت بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ کامیابی اس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتی جب تک اس عظیم شاعر کے کلام کا غائر مطالعہ نہ کیا جائے اور ان بنیادی مسائل کو نہ سمجھا جائے جو اس کی فکر کا محور ہیں ۔ زیب صاحبہ اس کڑی منزل سے تو گزری ہی ہیں ساتھ ہی چونکہ انہیں ملکی ، ملی اور سیاسی مسائل سے گہری دلچسپی رہی ہے اور آپ کا بیشتر وقت ایسے ہی امور سے متعلق غور و فکر میں گزرا ہے اس لئے ان پر علامہ مرحوم کا اثر بہت ہی گہرا پڑا ہے ۔

تاثرات اقبال کو اپنے اندر جذب کر لینے کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ محترمہ کا فکر و اسلوب دونوں اقبال کے رنگ میں رنگے گئے ہیں ۔ جہاں تک موضوع کا تعلق ہے آپ کے یہاں بھی عمل کی تلقین ، خودی کا درس اور اقوام مشرق بالخصوص اسلام کی بیداری کا پیام ملتا ہے ۔ ساتھ ہی مغربی قوموں کی سیاست و سفاکی کے پول قدم قدم پر کھولے گئے ہیں ۔ لیکن یہ حقائق ایک ایسے سادہ ، دلنشین اور پرجوش اسلوب میں پیش کئے گئے ہیں کہ کلام میں ثقالت یا گرانی کے بجائے جذب و دلکشی پیدا ہو گئی ہے ۔ بلکہ بعض جگہ تو ان کی آواز پر سچ مچ اس ''دانائے راز'' کی آواز کا شبہ ہونے لگتا ہے مثال کے طور پر زیب صاحبہ کے چند شعر ملاحظہ کیجئے ۔

قوموں کی تقدیر وہ مرد جنگاہ — ایمان جس کا الحکم للہ

دنیا ہے خود اک جنگ عناصر — باہم صف آرا ہیں انجم و ماہ

ہے اک جہاں پر بھاری وہ ملت — شمشیر جسکی الملک للہ

جن کے ایک ایک لفظ سے اقبال جیسے حریت پسند شاعر کی للکار ٹپکتی ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ اس حقیقی اتباع کے باوجود زیب صاحبہ کے کلام میں وہ ہمہ گیری ، وہ تبحر و ژرف نگاہی اور عمق و گہرائی نہیں پیدا ہو سکی ہے جو علامہ مرحوم کے کلام میں پائی جاتی ہے ۔ اور سچ پوچھئے تو ہمیں ایک مقلد سے یہ توقع بھی نہ رکھنی چاہئے ۔ تاہم انہوں نے جو کچھ کہا ہے ۔ اس میں خلوص و صداقت کی ایسی کارفرمائی ہے کہ یہ اتباع بھی قابل قدر بن گیا ہے ۔ اور محترمہ زیب عثمانیہ اس اس لحاظ سے لائق مبارک باد ہیں کہ انہوں نے ایک پردہ نشین خاتون ہوتے ہوئے وہ کچھ کر دکھایا جو اچھے اچھوں کے بس کا روگ نہیں ۔

انتخاب کلام

تغزل

بے شک ہمیں صیاد نہ دے اذن فغاں اور

بڑھ جائے مگر اس سے نہ احساس زیاں اور

پہنچا ہے گزند اس سے مریدوں کے یقیں کو
تھا مرشد مغرب کا جو دل اور زباں، اور

اهل نظر اس بزم میں لاکھوں سہی لیکن فیض نظر کمیاب ہے معلوم نہیں کیوں

خضر کا نام لے کر ہم سفر نے حقیقت ھی بتا دی رهنما کی
بتاتے ھیں جسے قشقه و محراب بہت معروف شکلیں ھیں ریا کی
وہ جسکو ''زیب'' کہتا ہے زمانه بری حالت ہے اس درد آشنا کی

خاک پر ھی مرے آنسو ھیں نه دامن میں کہیں
جو تری راہ میں کھویا گیا پایا نه گیا
سبب خندۂ گل، گل کو نہیں خود معلوم
اس طرح کوئی بھی دیوانه بنایا نه گیا
مختلف نغمه سے ہے قلب مغنّی کا راز
جو لب ساز په بھی بزم میں لایا نه گیا
رکھ دیا خلق نے نام اس کا قیامت اے ''زیب''
کوئی فتنه جو زمانے سے اٹھایا نه گیا

آہ اس آنکھ کی گراں خوابی! جو یه سمجھی ہے خواب ہے دنیا
دل کو یک قطرۂ خوں کہتی ہے کس قدر تنگ نظر ہے دنیا
کوئی منزل ہے نه منزل کا نشاں رات دن پا به سفر ہے دنیا

ھیں خندۂ زن تری حالت په شمع و آئینه
کسی کی بزم میں اپنا مقام پیدا کر
کسی کی بزم میں مڑ مڑ کے نقش پا کو نه دیکھ
مه و ستارہ کی شان خرام پیدا کر

کسی کے چار تنکے ھوں چمن میں فلک کی آنکھ میں وہ آشیاں ہے

ادھر دل ہے مرا اور شوق منزل آدھر میں ہوں غبار کارواں ہے
جسے محفل میں کوئی بھی نہ سمجھا وہی فقرِ فریب داستاں ہے

خود کو دنیا میں جو راضی بہ رضا کہتے ہیں
اپنی ہستی سے وہ اک بات سوا کہتے ہیں
موت آتی ہے تو اک فرض ادا ہوتا ہے
اُن کو دھوکا ہے قضا کو جو قضا کہتے ہیں
درد دل گو تیری اک گونہ مراعات سے ہے
نکتہ چیں اس کو بھی انداز جفا کہتے ہیں
حرم و دیر ہوئے ترک عمل سے رسوا
دیکھئے اہل عقیدت اسے کیا کہتے ہیں
صورتیں ہیں یہ دو احساس دروں کی اے ''زیب''
حشر میں جن کو سزا اور جزا کہتے ہیں

تجھ سے بڑھ کر ہے کہیں اُن کا مقام اے ساقی
مست رہتے ہیں جو بے بادۂ و جام اے ساقی
قطرے قطرے کو پھریں تیرے سبوکش لاچار
ہے یہ کس کے لئے غیرت کا مقام اے ساقی ؟
مکرمت سے تری ہو جائیں نہ میکش بد دل
سنگدل ہے تری محفل کا نظام اے ساقی
''زیب'' بھی عرض حقیقت میں ہے اکثر محتاط
اہل محفل میں یہ احساس ہے عام اے ساقی

آزادیِ افکار سے بھی جو ہوئی محروم
سچ یہ ہے کہ اُس قوم کے جینے کا بھرم کیا
بیداد زمانے کو مٹانے جو اُٹھے ہیں
خود بھی وہ اُٹھائینگے زمانے کے ستم کیا

اُٹھا ہے محفل ہستی سے اعتماد وفا
کہو کسی سے کہ رسم جفا پہ ناز کرے
ہے عیب فرد کو وہ انہماک ذوق مجاز
جو زندگی کے حقائق سے بے نیاز کرے
مآل دانش مغرب میں "زیب" ہے یہ سبق
کوئی زمانہ نہ اہل خرد پہ ناز کرے

کہتے ہیں جب حقیقت راز نہاں دل — دیتے ہیں اک فریب نیا رازداں کو ہم
گھبرا کے سرد مہرئ دنیا سے رات دن — رویا کئے ہیں "زیب" کسی مہرباں کو ہم

آ گیا خود سے گذرنے کا سلیقہ جس کو — وہ نظر کا تری شرمندۂ احساں نہ ہوا
تجھ کو بھی دیتا زمانہ مہ نو سے تشبیہ — تو بھی کیوں رنج کش گردش دوراں نہ ہوا
گھڑ لئے عقل نے دو چار عناصر ہی کے نام — اس سے جب تجزیۂ عالم امکاں نہ ہوا

اہل دنیا حشر کا ہنگام کہتے ہیں جسے — اک زمانہ ہے دلوں سے درد اٹھ جاتا ہے جب
عقل کو حاصل نہیں دونوں جہاں کا اعتماد
اس کے آگے طے نہ کر اے "زیب" زانوئے ادب

ناداں نہیں کچھ وادئ ایمن ہی سے مخصوص
دنیا میں ہر اک ارض محبت ہے شرر ریز
اس قوم کا آفاق پہ چھا جانا ہے ممکن
سیلاب صفت جسکا ہے ہر پیکر نوخیز
چاہا تھا کہ پوشیدہ ہی رہ جائے غم دل
ہے "زیب" مگر اہل زمانہ کی نظر تیز

یہ تیری چشم لطف سے پہلے کی بات ہے — اے جان گلستاں ہمیں اب گلستاں سے کیا
علم زباں سے ہو کوئی نسبت نہ جسکو "زیب" — دعوائے ہمسری اُسے اہل زباں سے کیا

اہل وفا کی قدر کر حاصل داستاں ہیں یہ
حسن بھی ایک داستاں عشق بھی ایک داستاں

کسی کا حسن بے پردہ بھی سو پردوں میں پنہاں تھا
بہت برخود غلط اس بزم سے اہل نظر نکلے

فلک کی طرفہ کاری ہے کہ آج اے "زیب" دنیا میں
جو تھے صیاد وہ خود طائر بے بال و پر نکلے

منظومات

نیستان نالہ

(اقبال کے رنگ میں)

تو صاحب تدبیر نہ میں صاحب تدبیر
تدبیر پہ موقوف ہے ہر قوم کی تقدیر

مغرب کی نظر کیف امارت سے پُر از خواب
مشرق کی نگاہوں میں عیاں قوت تعبیر

سازش میں جہاں شام و سحر نفس و خرد ہو
انسانیت اس ملک میں ہے بیکس و دلگیر

بولا کہ خودی اور خدائی میں تفاوت!
یزداں سے جو پوچھی گئی اوہام کی تفسیر

قومیں جو ہمیشہ نشۂ حال میں تھیں مست
لے آیا انہیں راہ پہ حور فلک پیر

اے "زیب" پلٹ آئی ہیں اس راہ سے قومیں
ناکام رہی غرب کی یہ کوشش تزویر

اقوام کی جاگیریں بے دردی و سفاکی
ہمدردی و دل داری انسان کی جاگیریں

اقوام نے دیکھا ہے جو خواب حصول زر
بربادی و ناکامی اس خواب کی تعبیریں

اس دین کے معنی ہیں اب خار و خذف سے کم
مہر و مہ و انجم تھیں جس دین کی تفسیریں

شمشیر کو دنیا میں ہے نصرت حق سے کام
مغلوب جو حق ہے پھر بیکار ہیں شمشیریں

توحید پرستوں کی اک ضرب یداللّٰہی
اوہام پرستوں کی صد آہنی تدبیریں
احساس غم انسان اے ''زیب'' ہے دیں جس کا
نازاں نہ ہوں کیوں اُن پر خود قوم کی تقدیریں

حقیقت کے منافی ہے تری موجودہ بیداری
کہ تجھ میں بندۂ مومن کی قہّاری نہ غفاری
مری کوتاہ افکاری سے بے وقعت مرے نغمے
تیری کوتاہ کاری سے تری منزل میں دشواری
ابھی تہذیب وہ محروم ہے ایماں کی دولت سے
کسی تہذیب میں گر فقر کے معنی ہیں ناداری
زمانے کے حوادث پتھروں کو توڑ دیتے ہیں
بچائے گی تجھے کیا کفر کی آئینہ دیواری
مجھے اے ''زیب'' پہروں خون کے آنسو رلاتی ہے
مری ملت کی کم کوشی مری ملت کی ناداری

وہ قوم حق سے پاتی ہے انعام
جس کے قواء ہیں محروم آرام
تو سادہ رہرو، میں سادہ رہرو
فتنوں سے پر ہے منزل کا ہرگام
اپنی خودی کو پوج اے برہمن
کم تر ہیں اس سے تیرے سب اصنام
اُس کو زمانہ رکھتا ہے قائم
جس قوم کو ہے احساس انجام
ہے عہد عسرت عہد بغاوت
اور عیش و عشرت عسرت کا پیغام

مقصد حیات

بھول کے بھی نہ درد کو دل سے کبھی جدا سمجھ
شاھد دل نواز کی یہ بھی کوئی عطا سمجھ
امن کی آرزو نہ کر، امن کا مدعا ہے موت
ہر نفس حیات کو درد میں مبتلا سمجھ
شاھرہِ حیات میں رہبر و راھزن نہ بن
اپنے سفر کا مدعا ان سے کہیں سوا سمجھ

منزل ہست و بود میں تیرا مقام ہے بلند
مہر و مہ و نجوم کو اپنے نشانِ پا سمجھ
جوہر درد ہے اگر گوہر اشک میں ترے
دامن کائنات کو موتیوں سے بھرا سمجھ
تیرے صفائے قلب کا دہر میں امتحان ہے
خود کو بشر سمجھ مگر قدسیوں سے سوا سمجھ
"زیب" حریم قلب کی خاک میں جب جمود ہے
فتنہ کوئی اٹھا سمجھ، حشر کوئی بپا سمجھ

فلسفہ ایمان

ایمان محکم قوموں کا معیار
ایمان ناقص ملکوں کا ادبار
ایمان نبوت کا ہے درس اول
ایمان خدا کے آئیں کا شہکار
ایمان سے محکم حمزہ کے بازو
ایمان سے فاتح حیدر کی تلوار
ایمان ہمارا ساز تمدن
ایمان ہمارا سامان پیکار
مومن کے تابع ساری خدائی
مومن خدا کا احکام بردار
ایمان محکم ہوتا ہے اس دم
جب ضرب غم سے ہو روح بیدار
ذکر خدا سے تازہ ہوں احساس
فکر خودی پر مائل ہوں افکار

بھکارن

رات کا ہنگام، جنگل کا سماں، عورت کی ذات
کس لئے برہم نہیں ہوتا نظام کائنات
جا رہی ہے بھیک دامن میں لئے حرماں نصیب
ہاتھ پکڑے ساتھ ہیں دو طفل معصوم و غریب

آہ ! اے عندوستاں ! اے فاقہ مستوں کے وطن
چھوڑ مغرب کی پرستش بت پرستوں کے وطن
اپنے دست و پا کی قوت ہو نہ جب تک آستوار
مرگ ذہنی ہے مراعات و رعایت پر مدار
بھوک کی تکلیف ہرگز سہ نہیں سکتے عوام
بن رہی ہے اُن پہ جو کچھ کہہ نہیں سکتے عوام
گر غریبوں کی نہ رمز خامشی سمجھی گئی
مسکنت ان کی دلیل بے حسی سمجھی گئی
کوئی دم میں ٹوٹ پڑنے کو ہے فطرت کا عذاب
تیرے دروازے پہ دستک دے رہا ہے انقلاب !

جگن ناتھ آزاد

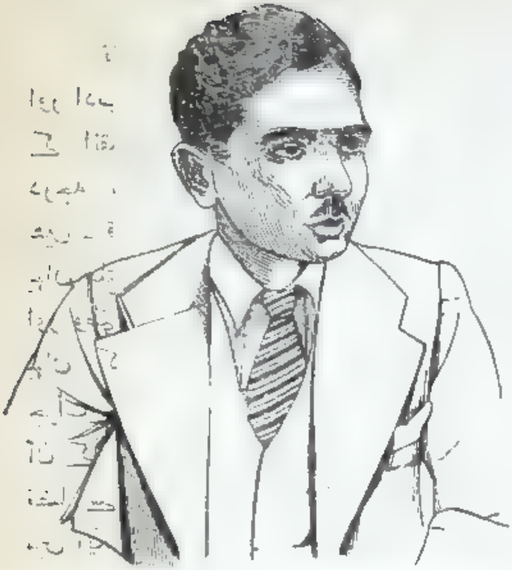

جگن ناتھ نام آزاد تخلص - دسمبر ۱۹۱۸ء میں میانوالی کی سنگلاخ سر زمین میں پیدا ہوئے لیکن پرورش راولپنڈی میں پائی جہاں آپکے والد لالہ تلوک چند محروم عرصہ تک بسلسلۂ ملازمت مقیم رہے۔ آپ نے ابتدائی اور ثانوی تعلیمی مراحل سے گزر کر ۱۹۳۹ء میں گارڈن کالج راولپنڈی سے بی - اے کی ڈگری حاصل کی - اس کے بعد آزاد صاحب تحریک رفاقت اور دیگر اداروں میں مختلف خدمات سر انجام دیتے رہے - تین سال بعد سلسلۂ تعلیم دوبارہ جاری کیا اور دیال سنگھ کالج لاہور سے ایم-اے کیا - قیام پاکستان کے وقت مجبوراً ترک وطن کرکے پنجاب سے دہلی پہنچے اور رسالہ ''آجکل'' کے ادارۂ تحریر میں منسلک ہوگئے - چنانچہ آج تک اسی ادارے سے وابستہ ہیں اور اپنے فرائض بڑی مستعدی و خوش اسلوبی سے سر انجام دے رہے ہیں -

جگن ناتھ آزاد کو ذوق شعری اپنے والد محترم منشی تلوک چند محروم سے ورثے میں ملا مگر ساتھ ہی چونکہ محروم صاحب ایک پختہ کار استاد سخن ہونے کے علاوہ بڑے وسیع المشرب، صاحب نظر اور سنجیدہ کردار کے انسان ہیں اسلئے اُن کے فیضان صحبت سے بیٹے میں نہ صرف شعر و ادب کا ذوق پیدا ہوا بلکہ وہ تہذیب و شائستگی پیدا ہوئی جسکی عدم موجودگی میں ایک نوجوان کم از کم جوان صالح نہیں بن سکتا - اس فیضان پدری کے ماسوا آزاد نے اپنے کلام کی آبیاری کلام اقبال سے بھی کی ہے - اور اس ضمن میں یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ وہ اُن نوجوان شعرا میں سب سے زیادہ تند آور شاعر ہیں جنھوں نے اقبال کی پیروی کرتے ہوئے اقبال کے رنگ سخن میں اپنی تخلیقات شعری کو ڈھالا اور اس پیر ہندی کے معنوی و روحانی شاگرد بننے پر فخر محسوس کیا -

جگن ناتھ آزاد نظم، غزل، قطعہ رباعی وغیرہ تمام اصناف پر یکساں قدرت رکھتے ہیں - اور دور جدید کے حساس شاعروں کی طرح وہ بھی زندگی کے مسائل کو شاعری کے سانچے میں خوبصورتی سے ڈھالتے ہیں - زندگی کے ترجمان ہونے کی وجہ سے اُن کا کلام ایک طرف تو تصنع اور سطحیت کے خس و خاشاک سے پاک ہو گیا ہے دوسری طرف اس میں وہ حقائق بھی رچ گئے ہیں جو نوع انسانی کے لئے دلچسپ بھی ہیں اور مفید بھی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُن کا کلام بڑی تیزی کے ساتھ فکر و فن کی ارتقائی منازل طے کر رہا ہے جسکا نتیجہ یہ ہے کہ اب ورثے میں ملی ہوئی شاعری خود آزاد کے خون

جگر کی آبیاری کی بدولت برابر سنورتی اور نکھرتی جا رہی ہے اور ماضی کی بہترین فنی روایات نئے مگر خوبصورت سانچے میں ڈھل رہی ہیں۔

تقسیم ہند سے قبل تک بقول حضرت آزاد شعر گوئی کے ساتھ اُن کا تعلق سرسری تھا اور ادب برائے زندگی کی تحریک سے بھی وہ کچھ زیادہ متاثر نہ ہوئے تھے مگر ۱۹۴۷ء کے انقلاب اور اُس کے بعد کے پیدا ہونے والے واقعات نے اُن کے قلب و نظر کو اس درجہ متاثر کیا کہ جذبات و خیالات کے بند چشمے اب گویا ہمیشہ کیلئے پھوٹ پڑے ہیں۔ قیام پاکستان تک اُن کی نظموں کے بیشتر موضوعات وہی تھے جو علامہ اقبال کے یہاں ملتے ہیں مگر اُس کے بعد ترکِ وطن کرنے پر اُن کی نظموں کے موضوعات میں سیاسی اور وطنی عنصر بھی شامل ہو گیا ہے۔ ان نئے موضوعات پر طبع آزمائی کرتے وقت اُن کے یہاں کہیں کہیں تبلیغی انداز ضرور پیدا ہو گیا ہے لیکن بحیثیت مجموعی جس دلیری اور جرأت کے ساتھ اُنھوں نے حالات حاضرہ پر تبصرہ کیا ہے وہ بلا شبہ اُنھیں کا حصہ ہے۔ اُن کے ہر شعر میں ماحول کی سخت گیری کا احساس بھی ہے اور اس دم گھونٹ دینے والی فضا سے باہر نکل آنے کی خواہش بھی۔ بلا شبہ انھیں دو باتوں کی بدولت اُن کی شاعری میں ایک تڑپ اور حوصلہ مندی پیدا ہو گئی ہے۔

جگن ناتھ آزاد کی غزلیات سادہ اور سلیس ہوتی ہیں مگر اُن پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے اتنا اندازہ بھی ضرور ہوتا ہے کہ شاعر نے اس صنف میں غم جاناں سے کہیں زیادہ غم دوراں کو سمویا ہے اور چونکہ وہ فن کی نزاکتوں اور لطافتوں سے بخوبی واقف ہے اس لئے زندگی کے تلخ حقائق بھی اُس کی غزلوں میں ایسی دلکشی و رعنائی کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں کہ روح تغزل کہیں مجروح نہیں ہونے پائی اور کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ درد، تپش، اُمنگ اور حوصلہ مندی کے امتزاج نے اُن کی غزلیات کو بہت خوشگوار بنا دیا ہے۔

غرض جگن ناتھ آزاد کی شاعری ایک درد مند دل کی آواز ہے جو نظم و غزل دونوں میں گونجتی ہے۔ اُن کے کلام میں معنی اور حسن بیان، انقلابی چوٹیں اور شاعرانہ اشاریت اور فن اور مقصد کا لطیف امتزاج پایا جاتا ہے۔ انہی خصوصیات کلام کی وجہ سے اُردو کے نوجوان شعرا میں اُنھیں ایک خاص مقام حاصل ہے اور آج ہماری شاعری کی بہت سی اُمیدیں اُن کی ذات سے وابستہ ہیں۔ حضرت آزاد کے اب تک دو مجموعہ کلام '' بیکراں '' اور '' ستاروں سے ذروں تک '' زیور طبع سے آراستہ ہو کر مقبولیت کا شرف حاصل کر چکے ہیں۔

انتخاب کلام

تغزل

نظر کی حد تک لگا دیا ہے سیاہ راتوں نے شامیانہ

اسی اندھیرے میں دیکھتا ہوں اُبھر رہا ہے نیا زمانہ

فضا میں چمکی نئی تجلی، زمیں پہ گونجے نئے ترانے
ہر ایک ذرہ پکار اٹھا وہ آ رہا ہے نیا زمانہ

زندگی ہے تمام سوز و گداز — اے غم دوست! تیری عمردراز
اے نشیمن! مجھے فریب نہ دے — جا چکی اب تو حسرت پرواز

ہزاروں بار آیا ہے جنوں امداد کو لیکن
ہزاروں بار کھایا ہے فریب آگہی میں نے

تیرا کرم ہے باد بہاراں — ہر شاخ زخمی ہر پھول بسمل

یہ جو دل کی کیفیت ہے نہیں راز اگر تو کیا ہے
کبھی گلستاں میں چپ ہوں کبھی دشت میں غزلخواں
مرے درد کی لطافت ہے تری نظر کا پر تو
مرے پردۂ سخن میں ترا نطق ہے غزلخواں

پیام دوست بن کر آ رہی ہے — نوائے دلربائے آبشاراں

سُست گامی کا گِلہ کیا وادیٔ پر خار میں
جب چلیں گے ہم نئے رستے بناتے جائیں گے
اس جہاں اور اُس جہاں کی تلخیوں کے روبرو
رقص کرتے جائیں گے ہم مسکراتے جائیں گے
اس جہاں کو بخش کر اے دوست! جنت کا جمال
ٹھپے جنت کی دنیا پر لگاتے جائیں گے

بہ فیض مصلحت ایسا بھی ہوتا ہے زمانے میں
کہ رہزن کو امیر کارواں کہنا ہی پڑتا ہے
تجھے اے طائر شاخ نشیمن کیا خبر اسکی
کبھی صیّاد کو بھی باغباں کہنا ہی پڑتا ہے

مروت کی قسم تری خوشی کے واسطے اکثر
سراب دشت کو آب رواں کہنا ھی پڑتا ھے
نہ پوچھو کیا گزرتی ھے دل خود دار پر اکثر
کسی بے مہر کو جب مہرباں کہنا ھی پڑتا ھے

واپس دلادو ھم کو اسیری آزادیوں کے پروردگارو !
بکھرے ھوئے ھیں گیتی کے کاکل آزاد ! اٹھو ان کو سنوارو !

آسماں کے اوج سے افکار کو واپس بلا
یہ زمیں سب کچھ ھے ناداں آسماں کچھ بھی نہیں
عزم و ھمت کے کرشمے ھیں یہ اے اھل چمن
عزم ھو دل میں تو یہ دور خزاں کچھ بھی نہیں

پرانی غزل کے معائب نہ دیکھ پرانی غزل میں بھی اک بات ھے
غم دوست کے بعد دنیا کا غم منازل اسی طرح ھوتی ھیں طے

اب جو ممکن ھو تو افسانۂ مزدک بھی سنا
قصہ خواں چھوڑ بھی اس دور میں افسانۂ جم
اے قلمکار ذرا وقت کا فرمان بھی سُن
ٹوٹ تو جائے مگر مڑ نہ سکے نوک قلم

غنچۂ وگل کی جگہ پھوٹ رھے ھیں شعلے موسم گل ! تری ممنون ھے ھرشاخ چمن

یوں گلستاں میں آئی باد نسیم ھمصفیروں کا ساتھ چھوٹ گیا
میں نے پوچھا جو زندگی کیا ھے ھاتھ سے گر کے جام ٹوٹ گیا

تری یاد سے ھوئے محو ھم ترے ذھن سے ھم اتر گئے
یہ بھی منزلیں تھیں کہ طے ھوئیں، یہ بھی مرحلے تھے گزر گئے

تو کہاں ہے بادخزاں کہ پھرے چمن کو تیری ہی جستجو
وہ فضا میں رنگ بکھر گیا ، وہ زمیں پہ پھول نکھر گئے

دیار دوست کو اب کون جاسکے گا ندیم دیار دوست کی اب رہگذر تلاش نہ کر

تجھے بھلا نہ سکوں تجھ کو یاد رکھ نہ سکوں
یہ راہ عشق میں آیا عجب مقام اے دوست !
غمیں نہ ہو کہ ہمیشہ بدل کے رہتی ہے
برنگ صبح درخشاں ہر ایک شام اے دوست !

پھر حسن خود نما پہ نظر کر رہا ہوں میں
پھر امتحان قلب و جگر کر رہا ہوں میں
دنیا میں مجھ کو جنس وفا کی ہے جستجو
خاشاک میں تلاش گُہر کر رہا ہوں میں
اب دل کو نا پسند ہے پھولوں کا حسن و رنگ
شاید بلند ذوق نظر کر رہا ہوں میں

ہم شوق میں منزل سے بھی آگے نکل آئے
معلوم نہیں روح کو یہ کس نے پکارا
ہر منزل دشوار کو آسان بنایا
کیا چیز ہے اے ذوق نظر تیرا سہارا
اے عقل ! خدا تیرے سفینے کا محافظ
یہ عشق کا دریا ہے نہیں جسکا کنارا

ترتیب نشیمن کیا ہوگی، آئین گلستاں کیا ہوگا
آغاز بہاراں کچھ تو بتا انجام بہاراں کیا ہوگا
تہذیب کا پرچم لہرایا ہر شہر و چمن ویران ہوا
تعمیر کا ہے ساماں جو یہی تخریب کا ساماں کیا ہوگا

ماحول کی گرد سے کچھ ایسا دھندلایا حال کا آئینہ
کچھ اس میں نظر آتا ہی نہیں مستقبلِ انساں کیا ہوگا

اے دل الجھ گیا ہے مذاق نظر کہاں
منزل کہاں یہ حسن سر رہ گزر کہاں
گم ہوچکی ہے کاہکشاں گرد راہ میں
اب دیکھئے ہو ختم ہمارا سفر کہاں
مانا چمن میں حکم زباں بندیوں کے ہیں
راز جنوں کو فاش کریں ہم مگر کہاں
خارا شگافیوں کے زمانے گزر گئے
اب ڈھونڈتا ہے شوق کہ ہیں شیشہ گر کہاں

یہ کاش تجھ کو بھی ذوق نظر بتا سکتا
تری تلاش میں ذوق نظر پہ کیا گزری
حضور دوست کا عالم بتا نہیں سکتا
میں کیا کہوں مرے قلب و نظر پہ کیا گزری
نظر تو محو غم جستجو تھی اے آزاد
یہ آس کے ساتھ دل بے خبر پہ کیا گزری

چاند تارے اب تو گرد راہ میں گم ہو گئے
کون سی منزل کے عازم ہیں دل دیوانہ ہم
زندگی دشوار سے دشوار تر ہوتی گئی
چھیڑ بیٹھے یا الٰہی کون سا افسانہ ہم

پھولوں سے ' بہاروں سے ستاروں سے گزر جا
ہے دور کہیں ذوق نظر تیرا ٹھکانہ

اب کے تو رنگ و بو کا تماشا ہی اور ہے
یوں اپنا شوق سلسلہ جنباں نہ تھا کبھی
پھولوں کو دیکھتی ہیں نگاہیں کچھ اس طرح
جیسے میں آشنائے بہاراں نہ تھا کبھی
انسانیت خود اپنی نگاہوں میں ہے ذلیل
اتنی بلندیوں پہ تو انساں نہ تھا کبھی

فصل گل آئی بھی اور باغ سے رخصت بھی ہوئی
آہ ! وہ شوق فسردہ کہ غزل خواں نہ ہوا

منزل سے بھی ناواقف ہیں راہ سے بھی آگاہ نہیں
اپنی دھن میں پھربھی رواں ہیں یہ بھی عجب دیوانے ہیں

بس ایک نور جھلکتا ہوا نظر آیا
پھر اُس کے بعد نہ جانے چمن پہ کیا گزری
مرے چمن میں بھی آئی تو تھی بہار مگر
میں کیا بتاؤں کہ اہل چمن پہ کیا گزری
وہ انجمن کہ جو کی تھی خلوص نے تعمیر
نہ پوچھ مجھ سے کہ اُس انجمن پہ کیا گزری

منظومات

آزادی کے بعد

گرد دامن سے غلامی کی چھڑانے والے
ترے ماتھے پہ غلامی کا نشاں آج بھی ہے
جو سماں تیری نگاہوں سے نہاں ہے شاید
وہ سماں میری نگاہوں پہ گراں آج بھی ہے
تو بہاروں کا فسوں دیکھ کے مسحور نہ ہو
ان بہاروں کے تعاقب میں خزاں آج بھی ہے
آج بھی روح میں ہے درد کی دنیا آباد
دم بخود کانپتے ہونٹوں پہ فغاں آج بھی ہے
آج بھی دل میں ہیں بے تاب تکلم نالے
اور سینے میں دل زار تپاں آج بھی ہے
جلوہ فرمائی پہ حسن آج بھی آمادہ نہیں
عشق کی ڈوبتی نظروں میں فغاں آج بھی ہے

آج بھی دیدۂ افکار پہ پردے ہیں محیط
حل طلب مسئلۂ سود و زیاں آج بھی ہے
عندلیب آج بھی گلزار میں ہے محو فغاں
درد ہر پھول کے سینے میں نہاں آج بھی ہے
یہ الگ بات ہے تو اس کو نہ دیکھے لیکن
ترے ماحول میں آہوں کا دھواں آج بھی ہے
رنگ محفل کا بدلتا نظر آتا ہی نہیں
ایک کا سود ہزاروں کا زیاں آج بھی ہے
آج بھی بندہ و آقا میں تفاوت ہے وہی
دیدۂ عدل بہر سو نگراں آج بھی ہے
آج بھی شور فضا میں ہے وہی محنت کا
گوش سرمایہ پہ یہ شور گراں آج بھی ہے
بزم احباب سے آتی ہے صدا الجھی ہوئی
شور ناقوس سے آواز اذاں آج بھی ہے
آج بھی مفت نظر ہے وہی سینوں کا عناد
بند اخلاص و محبت کی دکاں آج بھی ہے
آج بھی پائی نہیں دین سے دنیا نے نجات
نالہ کش محفل صاحب نظراں آج بھی ہے
اس نئے عصر میں انصاف کی اے جنس لطیف
صاف کہہ کوئی ترا مرتبہ داں آج بھی ہے ؟
کون اس دور میں ماحول کا ہو شکوہ طراز
نطق پر دشنۂ احکام رواں آج بھی ہے

زندگی

(۱)

ہر طرف سے گھٹا گھر کے آتی رہی
چار جانب اندھیرے گراتی رہی
تیرگی ایک عالم پہ چھاتی رہی
لیکن ایسے میں بھی

زندگی رس بھرے گیت گاتی رہی
ہر طرف اپنے نغمے لٹاتی رہی

(۲)

بربریت کی رو تیز ہوتی رہی
یاس ہنستی رہی، آس روتی رہی
خوں سے انسانیت چہرہ دھوتی رہی
ایسے ماحول سے
اپنا دامن ہمیشہ بچاتی رہی
زندگی ہر طرف جگمگاتی رہی

(۳)

چرخ پر بادلوں میں خراماں رہی
باد صحرا کے جھونکوں میں رقصاں رہی
قمریوں کے گلو میں غزل خواں رہی
حادثے دیکھ کر
قہقہے حادثوں پر لگاتی رہی
زندگی رس بھرے گیت گاتی رہی

(۴)

گاہ طوفان بن کر ابھرتی رہی
گاہ دریا کے دل میں اترتی رہی
وقت کے ساز پر رقص کرتی رہی
شورشوں سے الگ
گنگناتی رہی، مسکراتی رہی
زندگی اپنا پرچم اڑاتی رہی

(۵)

کہکشاں میں چمکتی دمکتی رہی
نرم رو ندیوں میں سرکتی رہی
پھول کی پتیوں میں لہکتی رہی
گویا تھی ہی نہیں

تلخئی دھر کو یوں بھلاتی رھی
شورشوں کو نظر سے گراتی رھی

(٦)

زندگی بے نیاز زمان و مکاں
زندگی بے نیاز غم این و آں
زندگی بے نیاز بہار و خزاں
تند ماحول میں
گنگناتی رھی، مسکراتی رھی
اور ظلمات میں جگمگاتی رھی

سخنے بہ پاکستان

(طویل نظم 'وطن میں اجنبی' کا ایک حصہ)

اے مری ارض وطن! اے ارض پاکستاں سلام
بھیجتا ھے آج تجھ پر تیرا اک مہماں سلام
میں تری دنیا میں آیا اک مسافر کی طرح
جذبۂ اخلاص لایا اک مسافر کی طرح
تیرے گلزاروں میں آیا صورت باد سحر
لوٹنے والا ھوں اب تیرے گلستاں چھوڑ کر
منتظر ھیں میرے گھر والے جہاں جاتا ھوں میں
اے وطن! اب جانب ھندوستاں جاتا ھوں میں
اے وطن! میرے وطن! میرے بزرگوں کے وطن
میری دنیا کے عرب میری مرادوں کے چمن
تجھ سے رہ کر دور، میں تجھ کو بھلا سکتا نہیں
نقش الفت اپنے سینے سے مٹا سکتا نہیں
تیرے لاکھوں رنگ پوشیدہ مرے سینے میں ھیں
تیری لا تعداد تصویریں اس آئینے میں ھیں
لیکن ان سب سے ھے بڑھ کر درد کا تحفہ ترا
ھے فنائے نام سے نا آشنا تحفہ ترا

درد کی سوغات بخشی ہے جو تیرے پیار نے
روح انعامات بخشی ہے جو تیرے پیار نے
"یہ ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رلواؤں گا"

رباعی

اے منظر بیقرار دم بھر تو ٹھہر
اے جلوۂ زرنگار دم بھر تو ٹھہر
جی بھر کے میں اک بار تجھے دیکھ تو لوں
اے قافلۂ بہار دم بھر تو ٹھہر

حیا لکھنوی

کنیز فاطمہ متخلص بہ حیا عصر حاضر کی خوش فکر و قادر الکلام شاعرہ ہیں۔ آپ کا آبائی وطن قصبہ سترکھ ضلع بارہ بنکی ہے لیکن چونکہ قیام زیادہ تر لکھنؤ میں رہا ہے اس لئے ادبی دنیا میں آپ کو لکھنوی تصور کیا جاتا ہے۔ حیا صاحبہ اس لحاظ سے نہایت خوش قسمت خاتون ہیں کہ انہوں نے ایک نہایت معزز، مقتدر اور با ذوق خاندان میں آنکھ کھولی۔ چنانچہ یہ آن کی خاندانی روایات اور روشن خیال گھرانے کی تربیت کا اثر ہے کہ آپ کی عمر کا بیشتر حصہ ادبی و تہذیبی مشاغل میں گزرا ہے۔ آپ کے والد چودھری نعمت اللہ صاحب لکھنؤ کے نہایت کامیاب بیرسٹروں میں سے ہیں۔ حیا صاحبہ کی تعلیم و تربیت گھر ھی پر ہوئی لیکن آپ نے اپنے ذاتی مطالعہ کی بدولت نہ صرف آردو فارسی کی اچھی دستگاہ حاصل کی بلکہ شعر و ادب کا بڑا سلجھا ہوا مذاق بھی پیدا کیا۔ اس کا بین ثبوت محترمہ کا وہ ادبی ماہنامہ ''حیا'' ہے جو آپ کی ادارت میں کافی عرصہ تک لکھنؤ سے نکلتا رہا اور حلقۂ نسواں میں بہت مقبول ہوا۔

حیا صاحبہ کو ادبی دلچسپیوں سے قطع نظر تہذیبی و اصلاحی کاموں سے بھی شغف رہا ہے۔ اس سلسلے میں ''زنانہ پارک لکھنؤ'' جہاں ہر ہفتہ خواتین لکھنؤ کا اجتماع ہوا کرتا تھا، سے متعلق آپ کی سرگرمیاں لائق صد ستائش ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ آپ نے بڑی تندھی و خلوص کے ساتھ یہاں شرکت کرنے والی خواتین کی اصلاح و ترقی میں حصہ لیا۔ اس کے ماسوا خواتین لکھنؤ کی اور بھی کئی انجمنیں ایسی تھیں جن کی آپ خاموش مگر وقیع کارکن رھی ہیں۔ محترمہ کی یہ خدمات لکھنؤ میں تقسیم ہند سے پہلے برابر جاری رہیں۔ قیام پاکستان کے بعد آپ اپنے رفیق حیات چودھری عبدالرحمان صاحب سندیلوی کے ہمراہ لاہور تشریف لے آئیں۔ لیکن یہاں آنے کے کچھ ھی عرصہ بعد آپ کو ایک ایسے سوھان روح حادثہ سے دو چار ہونا پڑا جس کا اظہار کرتے ہوئے بھی سچ مچ دکھ ہوتا ہے۔ یہ جانکاہ واقعہ آپ کے شوہر عزیز کے انتقال پر ملال کا ہے۔ ظاہر ہے اس مرگ ناگہاں کا اثر حیا صاحبہ جیسی حساس خاتون کے دل پر جتنا بھی پڑا ہو کم ہے۔ اور غالباً یہ اسی واقعہ کا اثر ہے کہ آپ کا کلام عرصہ سے کسی پرچے میں نظر سے نہیں گذرا۔

حیا صاحبہ نے گیارہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کئے۔ آپ کی سب سے پہلی نظم ''گلاب'' تہذیب نسواں لاہور میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ آن کا کلام آئینہ، عصمت، زیب‌النساء، رومان، حیا، اور دوسرے رسائل میں چھپنے لگا۔ گو آپ نے اپنے کلام کی تدوین کا خیال کبھی نہیں کیا لیکن اس وقت تک آپ نے جو کچھ کہا ہے اگر اسے یکجا کیا جائے تو یقیناً ایک ضخیم مجموعہ کلام تیار ہو سکتا ہے۔ آپ نظم و غزل دونوں کہتی ہیں اور ہر دو اصناف سے پختگی و قدرت کلام ٹپکتی ہے۔ آپ کے ابتدائی اشعار میں تصوف کی جھلک پائی جاتی تھی مگر کچھ ھی دنوں بعد ایسے

اشعار کی آمد ختم ہو گئی اور آپ کے حقیقی رومانی رنگ کا آغاز ہوا ۔ شعر گوئی کے معاملے میں محترمہ حیا کا مسلک بقول حضرت صفی مرحوم،

شاعری کیا ہے ؟ دلی جذبات کا اظہار ہے

رہا ہے ۔ چنانچہ آپ کے کلام کا نمایاں وصف جذبات کی شدت ہے ۔ لیکن اس سے بھی زیادہ قابل قدر بات یہ ہے کہ آپ نے اپنے محسوسات کو نہایت خلوص و بے تکلفی کے ساتھ نظم کیا ہے ۔

حیا صاحبہ کی شاعری در حقیقت جذبات محبت کی ترجمانی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام پر بحیثیت مجموعی رومانی رنگ چھایا ہوا ہے ۔ اُردو شاعری کے دور جدید میں کئی رومانی شاعر پیدا ہوئے لیکن ان میں اختر شیرانی مرحوم ایک امتیازی شان کے مالک تھے ۔ حیا صاحبہ بھی چونکہ رومان پسند شاعرہ ہیں اس لئے شعوری یا غیر شعوری طور پر اختر شیرانی مرحوم کے کلام سے کافی متاثر معلوم ہوتی ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ اُن کے کلام میں اختر کی سی نفیس موسیقیت نہیں پائی جاتی تا ہم رنگینئی تخیل اور نزاکت ادا کے اعتبار سے دونوں کا کلام ایک دوسرے سے بہت کچھ قریب ہے ۔

جہاں تک اسلوب بیان کا تعلق ہے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ کے طرز ادا میں بڑی بے ساختگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے ساتھ ہی چونکہ ہماری شاعرہ کو اہل زبان ہونے کا بھی فخر حاصل ہے اس لئے زبان کی جملہ خصوصیات سلاست و روز مرہ، تشبیہات و استعارات وغیرہ آپ کے کلام کے ایک نمایاں جوہر بن گئے ہیں ۔ اور زبان و بیان کی انہی خوبیوں نے مل کر آپ کے کلام کو نہایت کیف آور، وجد آگیں اور مؤثر بنا دیا ہے ۔

غرض کنیز فاطمہ حیا صاحبہ دور جدید کی ایک ممتاز شاعرہ ہیں ۔ آپ کی شاعری واردات قلبیہ کی آئینہ دار ہے مزیدبرآں چونکہ طرز بیان بھی پختگی و بے تکلفی اور زبان میں سادگی و پاکیزگی پائی جاتی ہے اس لئے آپ کا کلام مجموعی طور پر نہایت بلند و پر کیف واقع ہوا ہے ۔

انتخاب کلام

غزلیات

چمن وہی ہے گھٹائیں وہی، بہار وہی
مگر گلوں میں وہ اب رنگ و بو نہیں باقی
ہے دلکشی میں وہی اب بھی موسموں کی بہار
نظر میں کیفیت رنگ و بو نہیں باقی

شباب دھر کی اب بھی ہے وہ فراوانی
مگر خیال میں جوش نمو نہیں باقی
ہے دل میں درد بھی، پہلو میں دل بھی ہے لیکن
کسی کے درد پہ رونے کی خو نہیں باقی
حرم کی شمع فروزاں ہے آج بھی لیکن
تجسسِ نظرِ شعلہ جُو نہیں باقی
گلے تو ملتے ھیں حباب اے ''حیا'' اب بھی
مگر دلوں میں صداقت کی بو نہیں باقی

نگاہ شوق اگر دل کی ترجماں ہو جائے
تو ذرہ ذرہ محبت کا راز داں ہو جائے
پھر اس کے رنج و غم دائمی کی حد ہے کوئی
جو اس جہاں میں گھڑی بھر کو شادماں ہوجائے
کسی سے کیا گلۂ جور آسماں کیجیے
کہ جس زمیں پہ رھیں ھم وہ آسماں ہوجائے
''حیا'' ٹھکانا بھی کچھ ایسی درد مندی کا
کہ لب تک آئے نہ اک حرف اور فغاں ہوجائے

شوق کہتا ہے کہ چلئے کوئے جاناں کی طرف
چاهئیے وارفتگی کی پاسداری ان دنوں
پھر بہار آئی ہے جی آمڈا ہے یاد دوست میں
دل کرے زاری اور آنکھیں اشکباری ان دنوں
آہ! یہ برسات کا موسم یہ زخموں کی بہار
ہو گیا ہے خون دل آنکھوں سے جاری ان دنوں
کیا تقاضا کیجئے ان سے نگاہ لطف کا
بے نیازی ہے وھاں، یاں سوگواری ان دنوں

نہ ہوتی حال دل کہنے کی جرأت تو اچھا تھا
نہ سنتے کاش وہ شرح غم الفت تو اچھا تھا

مری بیتابی دل بڑھ گئی ہے الاماں کتنی
نکلتی گر نہ شوق دید کی حسرت تو اچھا تھا
وہ راحت بیزیاں ثابت ہوئیں کتنی حباب آسا
کبھی ہوتا نہ اتمام شب فرقت تو اچھا تھا
ہوا کیوں التفات انکا بڑھا کیوں حوصلہ میرا
نہاں پھولوں میں رہتی آہ گر نکہت تو اچھا تھا
تمنا ہے فزوں ہوں شورشیں جذب محبت کی
دل مضطر کی بڑھتی اور بھی وحشت تو اچھا تھا
رہیں غم کی شرر انگیزیاں یارب قیامت تک
"حیا" غم سے نہ ملتی گر کبھی فرصت تو اچھا تھا

حرف شکایت (غزل مسلسل)

یہ کیا کہ مرے عشق کا چرچا نہیں کرتے
پہلے کی طرح اب مجھے رسوا نہیں کرتے
مکتوب میں اُن کے نہیں کچھ حرف و حکایت
لبہائے حسیں اب مرا شکوہ نہیں کرتے
سو آرزوئیں دل میں تھیں بیتاب تمہارے
کیوں مجھ پہ فدا اب دل شیدا نہیں کرتے
اللہ ری بے مہری و بیگانگیٔ عشق
اب بھول کے اظہار تمنّا نہیں کرتے
اک شکوۂ شیریں میں گزر جاتے تھے پہروں
اب کیا ہے جو اُلفت کا تقاضا نہیں کرتے
دے دے کے قسم اب نہیں لیتے کوئی وعدہ
خود وعدۂ فردا کو بھی ایفا نہیں کرتے
آنے کی خوشی اور نہ جانے کا کوئی غم
اب رسم محبت کا اعادا نہیں کرتے
ہو جاؤں خفا گر تو مناتے تھے وہ پہروں
اب پھر تسلی کبھی شکوا نہیں کرتے
یہ کیا ہوا اک دم سے جو بدلی نگہِ مہر
کیوں اب نظر شوق سے دیکھا نہیں کرتے

یہ کیا مئے اُلفت میں نہیں جوش ذرا بھی
کیوں میری طرف چشم تماشا نہیں کرتے
اُف ! قصۂ اُلفت کو بس اک وہم سمجھ کر
ٹھکرا دیا ، انسان تو ایسا نہیں کرتے
افسانۂ زرّیں کو پامال بتایا
دل والے ان افسانوں کو بھولا نہیں کرتے
یہ ” قصۂ پارینہ ہے اک خواب پریشان “
یہ کہہ کے محبت کو مٹایا نہیں کرتے
یہ کیا کہ بھلانے پہ بھی تم دل میں سمائے
اس طرح جلے دل کو ستایا نہیں کرتے
کہتے ہیں تصوّر میں وہ ماضی کی کہانی
کس روز ”حیا“ مجھ کو رلایا نہیں کرتے

منظومات

شوھر کا تحفہ

خدائے حسن مرا پیکر جمال مرا چراغ حسن مرا مرکز خیال مرا
سرور قلب مرا کیف لا زوال مرا ہر ایک حال میں تنہا شریک حال مرا
اسی کے دم سے ہے راحت دل حزیں کیلئے
اسی کے در کے ھیں سجدے مری جبیں کیلئے
وہ اپنی پاک محبت کا زندہ افسانہ وہ اپنی شمع حرم کا اسیر پروانہ
نشاط روح کا وہ حسن سحر کارانہ وہ اپنے جلوۂ پنہاں سے آپ بیگانہ
وہ گلستاں بکنار و بہار در آغوش
وہ جان میکدہ و لالہ زار در آغوش
وہ کہکشان مرصع کے تار لایا ھے متاع نور مہ زرنگار لایا ھے
وہ سلک گوھر تازہ بہار لایا ھے دُر خوش آب کا خوشرنگ ھار لایا ھے
بہشت حسن کی تنویر جس کا ھر موتی
بہار خلد کی تصویر جس کا ھر موتی

یہ ہار الفت باقی کی یادگار حسیں　　یہ ہار عقد ثریا کی سلک خوش آئیں
کسی کے رشک مسرّت کا تحفۂ رنگیں　　کسی کے نقش محبت کا لا زوال نگیں
شعاع مہر منور سے جس کا رشتہ ہے
مرے حسین مقدر سے جس کا رشتہ ہے

گلے کا ہار ہے یا شرح مدعا ہے یہ　　مرا انیس شبستان پر ضیا ہے یہ
سفینۂ دل مضطر کا نا خدا ہے یہ　　سکون قلب کا اک نسخۂ شفا ہے یہ
ادائے حسن پہ صد جلوۂ خجل قرباں
یہ آرزو ہے کروں اس پہ جان و دل قرباں

رفیق جاں ہے یہ معصوم الفتوں کیلئے　　حریم دل ہے مرا اس کی عظمتوں کیلئے
یہ نذر شوق ہے میری مسرتوں کیلئے　　یہ کارساز غم دل ہے راحتوں کیلئے
ہے جسکی دید سواد نظر کی اک تصویر
یہ تحفہ اسکی وفاؤں کی معنوی تفسیر

ضیائے سلک پہ صد جلوۂ بتاں صدقے　　مرا خیال تصدق، مری زباں صدقے
"حیا" تمام محبت کی داستاں صدقے　　یہ کائنات ہو قرباں، دو جہاں صدقے
رہے یہ دل کے قریں اس کا دلنشیں تحفہ
نوید عیش فراواں بنے حسیں تحفہ

اقرار محبت

ان کا اصرار ہے الفت کا تم اقرار کرو
ہم کو پوجو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو
کہتے ہیں نذر محبت دل بیمار کرو
جان محزوں کو رہین غم و آزار کرو
غم کا اقرار کرو عشق کا اظہار کرو
ہمکو پوجو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

آپ غیروں میں رہیں پاس نہ آنے کو کہیں
پاس آئیں نہ کبھی ہم کو بلانے کو کہیں
گر کبھی بات کہیں وہ بھی رلانے کو کہیں
خود ستائیں ہمیں غیروں سے ستانے کو کہیں
پھر تقاضا ہے کہ الفت کا تم اقرار کرو
ہمکو پوجو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

حکم یہ ہے کہ کسی غیر سے بولا نہ کریں
جس سے تکلیف اُنھیں پہنچے ہم ایسا نہ کریں
سب سے روپوش رہیں اُن سے ہی پردہ نہ کریں
غیر کو خط نہ لکھیں غیر کا چرچا نہ کریں
اُن کا اصرار ہے تم عشق کا اظہار کرو
ہم کو پوجو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

جی میں حسرت ہے سنائیں اُنھیں افسانہ غم
کبھی موقع ملے سب کچھ ہی کہیں اُنکی قسم
لیکن آتے نہیں سنتے نہیں رو داد الم
کتنے مجبور ہیں بتلائیں یہ ہے کیسا ستم
اس پہ طرہ ہے کہ اُلفت کا بھی اقرار کرو
ہمکو پوجو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

راز اُلفت کا بہت دن سے چھپا رکھا تھا
درد کو اپنے کلیجے سے لگا رکھا تھا
جذبۂ عشق کو سینے میں دبا رکھا تھا
غم کا اظہار قیامت پہ اُٹھا رکھا تھا
بے حد اصرار ہوا عشق کا اظہار کرو
ہمکو پوجو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

رات دن ہمکو رلاتے ہیں الٰہی توبہ
اپنی فرقت میں ستاتے ہیں الٰہی توبہ
خواب اُلفت کا دکھاتے ہیں الٰہی توبہ
ایسی باتیں وہ بناتے ہیں الٰہی توبہ
پھر بھی تکرار ہے اُلفت کا تم اقرار کرو
ہم کو پوجو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

راز اُلفت کا ہماری نہ کھلا تھا جب تک
درد دل کا بھی نہ اظہار ہوا تھا جب تک
ہم نے حال دل مضطر نہ کہا تھا جب تک
اس قدر سوز دروں بھی نہ بڑھا تھا جب تک
اُن کا اصرار ہوا عشق کا اظہار کرو
ہم کو پوجو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

چین لوٹا غم و آلام سکھایا ہم کو
مضطرب دن کو کیا شب کو رلایا ہم کو
ہجر میں ایک گھڑی چین نہ آیا ہم کو
خواب میں بھی کبھی جلوہ نہ دکھایا ہم کو
پھر بھی کہتے ہیں کہ اُلفت کا تم اقرار کرو
ہم کو پوجو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

ایسے بے رحم ہیں انصاف کا بھی پاس نہیں
مہر کی ذرہ برابر بھی تو بُو باس نہیں
ایسی بے مہری پہ بھی دلکو مرے یاس نہیں
اب بھی آجائیں کہ جینے کی کوئی آس نہیں
اور خود آ کے کہیں عشق کا اظہار کرو
ہم کو پوجو ہمیں چاہو ہمیں تم پیار کرو

ایسے میں

سحر کے جھٹپٹے میں جب پرندے چہچہاتے ہیں
مناظر صبح کے جس دم رسیلے راگ گاتے ہیں
بہاروں کے جلو میں دلربا نغمے لٹاتے ہیں
حسیں غنچے چمن میں صبحدم جب مسکراتے ہیں
تم ایسے میں مجھے بے ساختہ کیوں یاد آتے ہو

شفق جب جھانکتی ہے دامنوں سے کوھساروں کے
فضا میں تھرتھراتے ہیں ترانے آبشاروں کے
ہوا میں تیرنے لگتے ہیں نقشے جوئباروں کے
بیاباں جب بدل لیتے ہیں چوے سبزہ زاروں کے
تم ایسے میں مجھے بے ساختہ کیوں یاد آتے ہو

پری قوس قزح کی آسماں پر جب سنورتی ہے
ادائے دلبری سے رنگ کے سانچوں میں ڈھلتی ہے
صبا کے مشکبو جھونکوں سے نکہت ٹوٹ پڑتی ہے
بہار آ کر چمن کی جب گلوں سے مانگ بھرتی ہے
تم ایسے میں مجھے بے ساختہ کیوں یاد آتے ہیں

کنار آب کا نظارہ جب مدھوش ہوتا ہے
درخشاں ریت کا میدان جب زر پوش ہوتا ہے
کنول آب رواں کی زینت آغوش ہوتا ہے
حسیں لہروں کے دل میں جذبۂ پرجوش ہوتا ہے

تم ایسے میں مجھے بے ساختہ کیوں یاد آتے ہو

خنک راتوں کی بھینی بھینی جب مہکار ہوتی ہے
ستاروں کی نظر جب واقف اسرار ہوتی ہے
کسی شاعر کی چشم روح جب بیدار ہوتی ہے
مرے پندار کے تاروں میں جب جھنکار ہوتی ہے

تم ایسے میں مجھے بے ساختہ کیوں یاد آتے ہو

پیغام عمل

اٹھیں پھر فصل گل میں آرزوؤں کو جواں کردیں
چلیں پھر بلبلوں کو آشنائے گلستاں کردیں
حوداث کے خس و خاشاک میں پیدا دھواں کردیں
زمانے بھر پہ اپنی شعلہ سامانی عیاں کردیں
چمن زادان خوش آواز کب تک چپ رہیں آخر
تقاضا ہے یہ فطرت کا انھیں پھر نغمہ خواں کردیں
بہت خواب گراں میں سو چکے اب وقت آیا ہے
کہ اپنی عقل و دانش کو ہم اپنا پاسباں کردیں
ثبوت زندگی دینا ہے پھر تہذیب حاضر کو
ہماری کوششیں پھر اس زمیں کو آسماں کردیں
اگر دنیا میں رہنا ہے تو یوں دنیا پہ چھا جائیں
کہ اپنے ہر عمل کو زندگی کا ترجماں کردیں
ضرورت ہے کہ ہم بیدار ہو کر درد قومی سے
بدل دیں فطرت غم، ختم یہ آہ و فغاں کردیں
سرشک بے بسی ٹپکے ہیں جن بے لوث آنکھوں سے
ستاروں کی طرح اُن موتیوں کو ضوفشاں کردیں

سنا دیں غنچہ و گل کو حکایت پائمالی کی
نگاہِ نغمۂ فطرت کو اپنا راز داں کردیں

ترقی کے منازل چومتے ہیں پائے ہمت کو
اٹھائیں یوں قدم اک موج بیداری رواں کردیں

وہ پابندی جو سکھلا دے ہمیں بے لوث قربانی
نثار اس قید پر ہم سینکڑوں آزادیاں کردیں

شگوفے اب تو علم با عمل کے کھلنے والے ہیں
ہوائے ذوق سے بیدار روح گلستاں کردیں

نہیں ہے اس سے بہتر افتخار خدمت قومی
مٹیں تو یوں کہ مٹنے کو حیات جاوداں کردیں

''حینا'' مرکز رہا ہے لکھنو علم و تمدن کا
نہ کیوں نور عمل سے بھی اسے ہم ضوفشاں کردیں

صفیہ شمیم

محترمہ صفیہ، متخلص بہ شمیم، عصر حاضر کی نامور شاعرہ ہیں - آپ کی ولادت ۷ مارچ ۱۹۲۰ء کو ملیح آباد (مضافات لکھنؤ) کے ایسے گھرانے میں ہوئی جو معزز و مقتدر ہونے کے علاوہ نہایت با ذوق گھرانا تسلیم کیا جاتا ہے اور جس میں شاعری کئی پشتوں سے چلی آتی ہے - چنانچہ شمیم صاحبہ کے مورث اعلیٰ، حسام الدولہ تہور جنگ نواب فقیر محمد خاں گویا سے لے کر اُن کے پرنانا نواب محمد احمد خاں احمد تعلقدار کسمنڈی اور نانا نواب بشیر احمد خاں تعلقدار ملیح آباد تک کوئی بزرگ ایسا نہیں ہے جو صاحب دیوان شاعر نہ ہو - پھر سب سے آخر میں محترمہ کے حقیقی ماموں شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی تو دور حاضر کے اُن چوٹی کے شعرا میں سے ہیں جن کے پختہ آرٹ اور جوان نغموں نے ادبی حلقوں میں اپنا سکہ بٹھا رکھا ہے - غرض اس خاندانی تعلق کی موجودگی میں شمیم صاحبہ کا ذوق شعری بجا طور پر موروثی کہلانے کا مستحق ہے -

صفیہ شمیم صاحبہ کا قیام عموماً لکھنؤ میں رہا - یہیں آپ نے چند سال مسلم گرلز اسکول میں تعلیم پائی اور اس کے بعد گھر پر شوق علم پورا کرتی رہیں اور یہیں اُنہیں وہ ادبی صحبتیں نصیب ہوئیں جن کی بدولت اُن کا فطری شاعرانہ مذاق پروان چڑھا۔ تقسیم ہند کے بعد آپ اپنے رفیق حیات کے ساتھ پاکستان تشریف لے آئیں - آج کل آپ کا قیام راولپنڈی میں ہے اور بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ فکر شعر برابر جاری ہے چنانچہ پاکستان کے چند معیاری رسائل ''ماہ نو''، ''ساقی'' اور ''ہمایوں'' وغیرہ میں آپ کا کلام اکثر شائع ہوتا رہتا ہے -

صفیہ صاحبہ نے دس سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا - اس طرح اب اُن کی شاعری کی عمر کم و بیش ایک ربع صدی کی ہو چکی ہے - اتنی مدت تک فکر سخن کا یہ نتیجہ ہے کہ موجودہ اُردو شاعرات میں اُنہوں نے نہایت وقیع و اہم مقام حاصل کر لیا ہے - وہ حضرت جوش ملیح آبادی کے رنگ سے خاصی متاثر ہیں اور اُن کے یہاں اس عظیم شاعر کے فن کی بعض خصوصیات بڑے نمایاں انداز میں جلوہ گر نظر آتی ہیں لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ جوش صاحب سے اتنی قربت کے باوجود اُن کا تاثر تمام تر غیر شعوری ہے اور خود محترمہ کے بقول جوش صاحب نے اُن کے ایک شعر کو بھی کبھی تنقیدی نظر سے نہیں دیکھا اور مشورہ سخن کے معاملے میں ہمیشہ اُن کی مصروفیت حائل رہی -

محترمہ شمیم غزل، نظم، رباعی غرضکہ ہر صنف میں طبع آزمائی کرتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ خوب کہتی ہیں - آپ کے کلام کا نمایاں وصف محاکات کا حسن ہے - اس

سلسلہ میں آپ بھی جوش صاحب کی طرح نازک، لطیف ، اور اچھوتی تشبیہات استعمال کرتی ہیں، بالخصوص مناظر قطرت کی تصویر کشی میں آپ کو کمال حاصل ہے ۔ مظاہر قدرت کو زیادہ جاندار، زیادہ دلکش اور زیادہ مؤثر بنانے کے لئے آپ اکثر ان کی لفظی تصویروں میں لطیف جذبات انسانی کا رنگ بھرتی ہیں لیکن اس پیچیدہ اور دشوار فن میں آپ کو جیسا عبور حاصل ہے وہ یقیناً آپ ہی کا حصہ ہے ۔ اس خوبی کے علاوہ آپ کے کلام میں عام طور پر حقیقی جذبات کی ترجمانی پائی جاتی ہے اور یہ جذبات چونکہ شدید، عمیق اور ذاتی طور پر محسوس کئے ہوئے ہوتے ہیں اس لئے آپ کے اشعار زندگی سے زیادہ قریب اور نہایت موثر ہوتے ہیں ۔

صفیہ شمیم کو تغزل سے فطری لگاؤ معلوم ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام کی مجموعی فضا رومانی ہے ۔ محبت کا ابدی نغمہ آپ کے یہاں کچھ ایسے والہانہ اور پر کیف انداز میں دھرایا گیا ہے کہ پڑھنے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ ان موضوعات سے قطع نظر آپ نے زندگی کے گھرے مسائل پر بھی قلم اٹھایا ہے اور اس ضمن میں آن کے یہاں انسانی عظمت، ملک و قوم کی زبوں حالی اور اہل وطن کی خستگی و نکبت وغیرہ کے نقوش ابھرتے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن بلا شبہ ان کی حیثیت ثانوی ہے کیونکہ ھندی نغمے تو وقت کے ھاتھوں نعرہ مومن میں بدل سکتے ہیں مگر محبت کا راگ ایک ایسا راگ ہے جو زمان و مکان کے تغیر سے یکسر آزاد ہے ۔

محترمہ شمیم کا اسلوب بیان نہایت ستھرا اور نکھرا ہوا ہے، انہیں اھل زبان ہونے اور زندگی کا بیشتر حصہ خاص لکھنؤ میں گزارنے کی وجہ سے الفاظ و محاورات کا عمدہ انتخاب اور بر محل استعمال خوب آتا ہے ۔ اس کے ماسوا انہیں نہایت لطیف، رقصاں اور زندگی سے بھرپور تشبیہات کے برتنے کا بھی بڑا اچھا سلیقہ ہے ۔ مختصر یہ کہ صفیہ شمیم صاحبہ کا کلام زبان و بیان کی جملہ خصوصیات کا حامل ہے ۔ اور باوجودیکہ آن کی شاعری ابھی ارتقائی منزل میں ہے آن کے متعلق یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ وہ موجودہ اردو شاعرات میں صف اول کی شاعرہ ہیں ۔

انتخاب کلام

تغزل

گر ہے نئے نظام کی تخلیق کا خیال ‏— آبادیوں کو نذر بیاباں تو کیجئے
گر جلوۂ جمال کی دل کو ہے آرزو ‏— اشکوں سے چشم شوق چراغاں تو کیجئے
ہونا ہے درد عشق سے گر لذت آشنا ‏— دل کو خراب تلخئ ھجراں تو کیجئے
اک لمحۂ نشاط کی گر ہے ہوس ''شمیم'' ‏— دل کو ھلاک حسرت و ارماں تو کیجئے

دے موت ہی شاید غم ہستی سے رہائی
ہستی تو ہے اک صورت زندان مرے آگے

یہ وضعداریٔ اہل وفا کوئی دیکھے
گلے تو رکھتے ہیں لیکن زباں نہیں رکھتے
نہ لطف برق سے واقف نہ زور طوفاں سے
جو بد نصیب کوئی آشیاں نہیں رکھتے

کر دیا باد خزاں نے خاک سارا گلستاں
لب ہلے ہی تھے کلی کے مسکرانے کے لئے

اے ہمنشیں نہ چھیڑ حکایات رنگ و بو
مدت ہوئی کہ بھول چکے ہم بہار کو

مرے چمن کے نصیبوں میں گر بہار نہیں
تو اس کو ہدیۂ برق و شرار ہی کردے
وفا نہ ہو نہ ہو، وعدہ تو کرے آنے کا
مجھے رہین غم انتظار ہی کر دے

بہاریں آئیں بھی اور ہوگئیں رخصت مگر اب تک
گلستاں میں گلوں کی چاک دامانی نہیں جاتی
کسی کا نام سن کر ضبط کے باوصف پہروں تک
مرے بے نور چہرے کی درخشانی نہیں جاتی

وہ حسرت بہار نہ طوفان زندگی
آتا ہے پھر رلانے کو ابر بہار کیوں
آلام و غم کے تند حوادث کے واسطے
اتنا لطیف دل مرے پروردگار کیوں
جب زندگی کا موت سے رشتہ ہے منسلک
پھر ہمنشیں ہے خطرۂ لیل و نہار کیوں
جب ربط و ضبط حسن محبت نہیں رہا
ہے بار دوش ہستئی ناپائدار کیوں
رونا مجھے خزاں کا نہیں کچھ مگر ''شمیم''
اس کا گلہ ہے آئی چمن میں بہار کیوں

اہل خرد! تلطف یزداں کے باوجود
بیچارگئی حضرت انساں نہ پوچھئے
وقت سفر تسلئی پیہم کے باوجود
کیوں چھٹ گیا تھا صبر کا داماں نہ پوچھئے
چہرہ عرق عرق ' وہ ادائیں تھکی تھکی
نظارۂ جمال پشیماں نہ پوچھئے
فرصت سی ہو گئی ہے غم روزگار سے
کیا کیا ہیں دل میں حسرت و ارماں نہ پوچھئے

ہم سے زندہ ہے گلستان دب گو خراب بہار ہیں ہم لوگ
اک بجھا سا چراغ حسرت ہیں اک لٹی سی بہار ہیں ہم لوگ

رہ رہ کے امنڈ رہے ہیں آنسو یہ دل سے کسے بھُلا رہے ہیں
بے چین ہیں بجلیاں فلک پر گلشن ہیں کہ مسکرا رہے ہیں

مجھے گماں نہ ہوا اُن کی بے نیازی کا
کچھ اس ادا سے وہ بیگانہ وار گزرے ہیں
ہر ایک گام پہ راہ وفا میں تھے کانٹے
گزرنے والے مگر لاکھ بار گزرے ہیں
نہ پوچھ منزل ہستی کی بے بسی ہم سے
ادھر سے گزرے ہیں جو اشکبار گزرے ہیں
روش روش پہ چھڑی ہے حدیث لالہ و گل
چمن سے کیا وہ نسیم گزرے ہیں!

شمع امید جلا بیٹھے تھے دل میں خود آگ لگا بیٹھے تھے
ہوش آیا تو کہیں کچھ بھی نہ تھا ہم بھی کس بزم میں جا بیٹھے تھے
دشت گلزار ہوا جاتا ہے کیا یہاں اہل وفا بیٹھے تھے
اب وہاں حشر اٹھا کرتے ہیں کل جہاں اہل وفا بیٹھے تھے

اللہ ری بے نیازیٔ آشفتگان شوق دامن بچا کے دیر و حرم سے گزر گئے

کچھ خبر ہو نہ سکی تیرے بغیر کب خزاں آئی کب بہار آئی

وہ بھی دل پر گزر گیا عالم دل میں طوفان اشک، لب پہ مہرِ سکوت

زندگی کی بدل گئی صورت غم سے جب سے ہوئی شناسائی

بے خبر، منزل مقصود نہیں دور مگر عالم ہوش سے ہستی کو گزر جانے دے

ٹھہر اے باد خزاں، ایک نفس کی مہلت رنگِ گلشن کو ابھی اور نکھر جانے دے

اک نگاہ کرم کی حسرت میں زندگانی گزار دی ہم نے

بجھی بجھی سی سہی شمع زندگی، لیکن
ضمیر عشق میں سرمایۂ شرار ہیں ہم
بایں کشا کش حرماں، بایں غم دوراں
کسی کے چشم کرم کے امیدوار ہیں ہم

کربِ تمام بن گئیں روح کی بے قراریاں
عالم جاں گداز ہے اُن کا سکوت دل نواز
نبض جہاں رکی ہوئی شمع سحر بجھی ہوئی
پچھلے پہر نہ پوچھئے کیفیت شکستِ ساز
ارض و سما کی وسعتیں جس میں سما کے رہ گئیں
کون سمجھ سکے ''شمیم'' اُس دل بے نوا کا راز

آمیدیں مٹ گئیں اب ہم نفس ' کیا　　　نشیمن کی خوشی ' رنج قفس کیا
بسر کانٹوں میں ہو جب زندگانی　　　بہار خندۂ گل یک نفس کیا
مری دیوانگی کیوں بڑھ رہی ہے　　　بہار آئی چمن میں ہم نفس کیا
نہ ہو جب رنگ آزادی چمن میں　　　تو پھر اندیشۂ قید قفس کیا
بہار نو کی پھر ہے آمد آمد　　　چمن اجڑا کوئی پھر ہم نفس کیا

شمع حسرت جلا گئے آنسو　　　رونق دل بڑھا گئے آنسو
ضبط غم کی شکستگی مت پوچھ　　　اُن کی آنکھوں میں آ گئے آنسو
آ گئی کام دل کی بے تابی　　　خلش غم بڑھا گئے آنسو
تھم گئے جب فراق میں نالے　　　دل میں طوفاں اُٹھا گئے آنسو
جس کو دل سے لگا کے رکھا تھا　　　وہ خزانہ لٹا گئے آنسو
کیا قیامت تھی پردہ داریٔ غم　　　مسکراتے ہی آ گئے آنسو

منظومات

ملکہ صبح

آ رہی ہے صبح کی ملکہ وہ بل کھاتی ہوئی
صبح کا خاموش نغمہ زیر لب گاتی ہوئی
نور کے زرّیں سمندر میں ڈبوتی کائنات
آ رہی ہے صبح ' رُخ سے زلف سرکاتی ہوئی
جھاڑیوں سے جھانکتی' شاخوں سے اٹھلاتی ہوئی
آ رہی ہے تاج پہنے صبح بل کھاتی ہوئی
ہر شجر کی چوٹیوں کو جگمگاتی ' جھومتی
آ رہی ہے صبح سیمیں' نور پھیلاتی ہوئی
نہر کی خوابیدہ موجوں کو جگاتی ' چھیڑتی
آ رہی ہے صبح' دل کلیوں کے چٹکاتی ہوئی
نہر سے آنکھیں لڑاتی ' تھر تھراتی' کودتی
آ رہی ہے ہر قدم پر ناز فرماتی ہوئی

اہل عالم کو پیام زندگی دیتی ہوئی
نا اُمیدوں کو خوشی کے خواب دکھلاتی ہوئی
محفلِ گلشن کو دیتی صبح بیداری کا حکم
قطرۂ شبنم کو ضو سے اپنی جھلکاتی ہوئی
کھیتیوں پر برق کی سی لہر دوڑاتی ہوئی
ولولے دل میں اُٹھاتی زیر لب گاتی ہوئی
خامشی کا تار ٹوٹا چھڑ گئے نغمے نئے
محفل صحرا میں آئی صبح ' بل کھاتی ہوئی
لہر موسیقی اُٹھاتی گلشن خاموش میں
آ رہی ہے صبح راگ زندگی گاتی ہوئی

جھاڑیوں سے مسکراتی آ گئی صبح بہار
پھر ''شمیم'' مبتلا کی روح چونکاتی ہوئی

برسات کی چاندنی رات

یہ برشگال کی برسی ہوئی سنہری رات
یہ بوئے عود سے مہکی ہوئی سنہری رات
یہ چاندنی ' یہ فضائیں یہ وادیوں کی بہار
گہاں یہ ہوتا ہے رہ رہ کے پڑ رہی ہے پھوار
یہ زرنگار فضائیں یہ جوش نکہت و نور
زمیں ہے وجد میں ' طاری ہے آسماں پہ سرور
یہ چاندنی یہ چٹکتے ہوئے سبک غنچے
یہ بوئے عود سے مہکے ہوئے خنک جھونکے
جبین ناز ہے روشن عروس فطرت کی
ہوائیں چلتی ہیں گلشن میں باغِ جنت کی

یہ جوش حسن' فروغ بہار' کیا کہنا
یہ چاندنی یہ لب جوئے بار کیا کہنا

نعرۂ مومن

مرے بازو میں ہے زور خدائی غرور خواجگی میری گدائی
مرے سینے میں روشن شمع عرفاں مری ہستی فروغ بزمِ ایماں
فراز آدمیّت میری منزل مری ہیبت سے شق ہے قلب باطل
مری ہستی چراغ بزم آدم مرے آئینے میں حسن دو عالم
مرا نقشِ قدم راہ سعادت میں نور آگہی ' صبح حقیقت
مری دنیا ہجوم برق و باراں مری ہر سانس موج جوش و طوفاں
فلک پر جھومتا ابر رواں ہوں زمیں پر موج بحر بیکراں ہوں
مجھے ہے حاصل حیات جاودانی مری ٹھوکر میں فتح و کامرانی
مزاج آب و گلِ تولا ہے میں نے نقاب زندگی کھولا ہے میں نے

سراپا سوز و ساز عاشقی ہوں
امانت دار نورِ آگہی ہوں

شاعرہ کی موت

زیست میری جب فنا کی گود میں سو جائے گی
جب متاع زندگی اے ہمنشیں کھو جائے گی
موت کے ہاتھوں اجڑ جائے گا جب باغ حیات
روح غم دنیا کے اندیشوں سے پائے گی نجات
منہ پہ جب احساس کے پڑ جائے گی کالی نقاب
آرزوؤں کا مری جب ٹوٹ جائے گا رباب
سانس کا جب ٹوٹ جائے گا یہ رنگیں سلسلہ
قطع ہو جائے گا رشتہ جسم کا اور جان کا

انجمن پھولوں کی ہوگی نوحہ خواں میرے بغیر
ہوگی دیوی صبح کی حسرت فشاں میرے بغیر
ہر خس و خاشاک میں جب تازگی آ جائے گی
عارض قدرت پہ مایوسی سی اک چھا جائے گی
پاس آ گیں راگنی تالاب کی ہو جائے گی
ہنسنے والی ہر کلی مایوس سی ہو جائے گی
چشم باراں خوں کے آنسو شب کو جب ٹپکائے گی
روح میری آسمانوں پر بہت گھبرائے گی

نور سا روئے شفق کا دیکھنا اُڑ جائے گا
میرے بِن کوئل کا دل گھبرائے گا اکتائے گا

صبح کی چڑیاں جگانے کو بہت چلّائیں گی
دیکھ کر ساکت مجھے مایوس واپس جائیں گی

پھول فرقت میں مری ہو جائیں گے خستہ خراب
کھائے گی ہر شاخ میرے نام پر یوں پیچ و تاب

چاک دامانی کرے گی میرے بِن حورِ نسیم
خاک اڑائے گی مری فرقت میں پھولوں کی شمیم

جستجو میں میری آوارہ پھرے گا ماهتاب
میرے بِن تارے فلک پر ہوں گے غرق اضطراب

روئیں گی شبنم کی لڑیاں میرے غم میں زار زار
ذکر سے میرے نگار شب کو ہوگا اضطرار

قبر پر میری عجب دھومیں مچیں گی صبح و شام
گائیں گے بیدار کرنے کو طیور خوش کلام

میری فرقت میں دوانی تتلیاں ہو جائیں گی
منتشر فرش زمیں پر تتلیاں ہو جائیں گی

سسکیاں لیں گی مری تربت پہ زندہ حسرتیں
روئیں گی فرقت میں میری گلشنوں کی رونقیں

جب بھری برکھا میں سب مل کر ترانے گائیں گی
شوخیاں میری بہت سکھیوں کو یاد آ جائیں گی

میری اُلفت خیز باتوں کو بہت ترسیں گے کان
پر نہ پائے گا کوئی میری محبت کا نشان

باغ سے آئے گی جب غمگیں پپیہے کی پکار
یاد آ جائے گی سکھیوں کو مری بے اختیار

جب کہانی ہوگی جاڑوں کی سنہری رات میں
یاد کر لیں گی مری سکھیاں مجھے ہر بات میں

جشن رنگیں ہوں گے جب دھومیں مچیں گی بے پناہ
یاد میں میری نکل جائے گی سب کے منہ سے "آہ"

موسم باراں میں ہر سو حسن جب چھا جائے گا
ساتھ اشکوں کے مرا سب کو خیال آ جائے گا

نوحہ خواں بزم صحافت ہوگی میرے ہجر میں
ہوگا اک طوفاں بپا ہندوستاں کے بحر میں
سبزۂ علم و ادب کچھ زرد سا ہو جائے گا
شاعری کا کچھ دنوں جیسے مزا کھو جائے گا
پر الم نظمیں لکھی جائیں گی میری موت پر
مشرقی بہنیں مری فرقت میں ہوں گی نوحہ گر
ذکر میرا جب کبھی بزم سخن میں آئے گا
ایک نشتر سا دلوں میں دفعتاً چبھ جائے گا
شاعری کی بزم ہو جائے گی غمگیں ، بے قرار
لکھنوی بہنیں مری فرقت میں ہونگی سوگوار
آئیں گے جب آسماں پر بادلوں کے قافلے
یاد اہل ذوق کو آئیں گے میرے زمزمے
ہوگی فطرت غرق گریہ نوحہ خواں میرے لئے
کچھ دنوں تک روئے گا ہندوستاں میرے لئے
ایک دن پھر من چلی دنیا کو صبر آ جائے گا
قصر امیدوں کا اک تازہ بنایا جائے گا

رباعیات

دل وقت کے دھارے میں بہا جاتا ہے
ماضی کا ہر اک نقش مٹا جاتا ہے
رنگینئی فطرت سے ہر اک لمحۂ زیست
فردوس کا اک خواب ہوا جاتا ہے

کیوں درد کو درماں سے نہ بڑھ کر سمجھوں
کیوں اشک تمنا کو نہ گوہر سمجھوں
یہ لذت روح ہے وہ تسکین حیات
کیوں غم کو مسرت سے نہ بہتر سمجھوں

اٹھ دولت عزّ و جاہ مل جائے گی
منزل گہہ مہر و ماہ مل جائے گی
کر اوج نگاہ و دل میں پیدا غافل
عرفان خودی کی راہ مل جائے گی

کج فہموں پہ یہ لطف و عنایت یا رب　　ہو علم پہ یہ جہل کی حکومت یا رب
فاقوں سے زبوں حال ہوں اہل دانش　　نا اہلوں پہ یہ بارش دولت یا رب

کیا عقدۂ شعر کھول سکتا ہے کوئی　　دربار سخن میں بول سکتا ہے کوئی
نقاد سخن سے کوئی جا کر پوچھے　　کیا بوئے سمن کو تول سکتا ہے کوئی ؟

جو بات یہاں ہوئی مدلل نہ ہوئی　　مجمل ہی رہی کبھی مفصل نہ ہوئی
دنیا نے ہزار رنگ بدلے ' لیکن　　تصویر یہاں کوئی مکمل نہ ہوئی

ہر ذرے کی حسرت ہے قمر بن جاؤں　　ہر شب کی تمنا ہے سحر بن جاؤں
اللہ رے اضطراب قلب گیتی　　ہر قطرے کو ارماں ہے گہر بن جاؤں

اٹھی وہ گھٹا ' باد بہاری آئی　　پھر آئی ' وہ فصل بے قراری آئی
لائی ہے صبا نکہت زلف جاناں　　آنکھوں کو نوید اشکباری آئی

جاں نثار اختر

جاں نثار اختر متخلص بہ اختر جدید اردو شعرا میں رومانی اور انقلابی شاعر کی حیثیت سے ممتاز درجہ رکھتے ھیں ۔ آپ کی پیدائش ۱۹۱۴ء میں گوالیار میں ھوئی جہاں آپ کے والد حضرت مضطر خیر آبادی نے ملازمت کی وجہ سے سکونت اختیار کر لی تھی ۔ ویسے آبائی وطن خیرآباد ھے اور آپ خیرآباد کے اس معزز و معروف خاندان سے نسبت رکھتے ھیں جس میں مولانا فضل امام ، مولانا فضل حق خیرآبادی اور مولانا عبدالحق المنطقی جیسے مشاھیر و اکابر گزرے ھیں ۔ ان بزرگوں کے علاوہ اختر صاحب کے والد جناب مضطر خیرآبادی اردو کے مسلم الثبوت استاد اور صاحب طرز شاعر تھے بالخصوص خمریات پر معرکے کے اشعار کہنے کی وجہ سے خمریات کے امام کہلاتے تھے ۔

اختر صاحب نے ابتدائی تعلیم وکٹوریہ کالجیٹ ھائی اسکول گوالیار میں حاصل کی اور وھیں سے ۱۹۳۰ء میں میٹرک کا امتحان پاس کر کے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا ۔ ۱۹۳۷ء میں بی ۔ اے آنرز اور ۱۹۳۹ء میں ایم ۔ اے (اردو) کی ڈگریاں حاصل کیں ۔ بعد ازاں ۱۹۴۰ء میں آپ کا تقرر وکٹوریہ کالج گوالیار میں اردو کے لکچرار کی حیثیت سے ھو گیا ۔ چنانچہ یہ فرائض وہ اب تک سرانجام دے رھے ھیں اور اسی ادارہ سے وابستہ ھیں ۔

جناب اختر نے شاعری کا ذوق وراثت میں پایا لیکن ان کی ادبی زندگی کا آغاز اور نشو و نما علیگڑھ میں ھوئی ۔ یہیں کی ادبی فضا میں رہ کر انھوں نے بلند پایہ نظمیں کہیں اور نوجوان شعرا میں ایک امتیاز حاصل کیا ۔ شروع شروع میں تو آپکی شاعری طلباء اور نوجوان طبقے میں ھی مقبول رھی لیکن رفتہ رفتہ دیگر حلقوں میں بھی آپ کی شعری کاوشوں کو بنظر استحسان دیکھا جانے لگا ۔ علیگڑھ کے دوران قیام میں اختر صاحب مختلف ادبی خدمات انجام دیتے رھے ۔ اس سلسلے میں آپ حدیقۃ الشعرا اور ''انجمن اردوئے معلیٰ'' کے سکرٹری رھے اور ایک عرصہ تک ''علی گڑھ میگزین'' کی ادارت بھی کی ۔

جاں نثار اختر اردو شعرا کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ھیں جنھوں نے ''ادب برائے زندگی'' کی تحریک کو مشعل راہ بنایا اور فن میں افادیت اور مقصدیت کے علمبردار رھے ۔ چنانچہ یہی افادیت اور مقصدیت ان کے کلام میں جگہ جگہ نمایاں ھے ۔ البتہ ان کی شاعری میں نہ تو پروپیگنڈے نے راہ پائی ھے اور نہ ھی مقصدیت کے ھاتھوں فن کے جمالیاتی عناصر کا کہیں خون ھوا ھے ۔ بلکہ اس نقطۂ نظر کا ایک بہتر پہلو یہ ھے کہ ان کی

انقلابی منظومات سے قطع نظر' رومانی نظموں میں بھی جذبات و احساسات کا اظہار خالص جذباتی ہونے کی بجائے تفکر سے لبریز ہے اور ساتھ ہی اس میں ایک نظریۂ حیات کی جھلک بھی ہے مثال کے طور پر ان کی نظم ''زندگی'' کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

سوچ دنیا سے الگ بھاگ کے جائیں گے کہاں
اپنی جنت بھی بسائیں تو بسائیں گے کہاں
امن اس عالم افکار میں پائیں گے کہاں

پھر زمانے سے نگاہوں کا چرانا کیسا
عشق کی ضد میں فرائض کا بھلانا کیسا
زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم

جس میں شاعر زندگی کو صرف محبت کا مرادف نہ سمجھتے ہوئے کشاکش زندگی سے فرار حاصل کرنے کی بجائے اس عالم افکار کی آنکھوںمیں آنکھیں ڈالنے کا عزم رکھتا ہے اور اپنے محبوب کو خیالی جنت بسانے کے بجائے زندگی کے فرائض کا احترام سکھاتا ہے۔ زندگی کا یہ نقطۂ نظر جیسا کہ ظاہر ہے نہایت حقیقت پسندانہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اختر صاحب کی رومانی شاعری عشق و محبت کی ایک ایسی داستان ہے جو رنگین و رعنا ہونے کے ساتھ ساتھ حقائق زندگی سے ہم آہنگ اور بڑی متوازن ہے۔

جہاں تک اختر صاحب کی انقلابی شاعری کا تعلق ہے وہ در حقیقت جوش ملیح آبادی کی انقلابی شاعری کا پر تو ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس میں وہ گھن گرج' وہ تیزی و تندی اور وہ شکوہ و کرختگی نہیں جو جوش کے یہاں ہے تاہم وہ اپنے باغیانہ انداز اور انقلاب کا راگ ہونے کی حیثیت سے جوش کی شاعری ضرور معلوم ہوتی ہے۔ مزید برآں نئی نئی تراکیب اور رقصاں تشبیہات جو جوش کے کلام کا طرۂ امتیاز ہیں' اختر صاحب کے یہاں بھی پوری تابناکی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ ان خصوصیات نے اختر صاحب کے مقصدی کلام کو ثقالت و گرانی سے بھی بچایا ہے اور اسے زیادہ حسین' زیادہ دلکش اور زیادہ واضح بھی بنا دیا ہے۔ موصوف کا ایک مجموعہ کلام ''سلاسل'' کے نام سے عرصہ ہوا کتب خانۂ علم و ادب دھلی کے زیر اہتمام چھپ چکا ہے۔

انتخاب کلام

منظومات

زندگی کی آرزو

نہ صبح خندۂ حسین نہ شامِ گیسوئے جمیل
نہ ذرۂ روکشِ عدن نہ قطرہ رشکِ سلسبیل

نہ گل بہار کا امیں نہ خار امن کا کفیل
ابھی تو زندگی ہے صرف زندگی کی آرزو

نہ فرق سنگ و خشت پر ہے ضو فگن گہر کا تاج
نہ آب و گِل کی آبرو نہ کاسہ و سبو کی لاج
نہ گرم آشتی کا دل نہ نرم تیغ کا مزاج
ابھی تو زندگی ہے صرف زندگی کی آرزو

نہ خوشبوؤں کی بستیاں نہ آب و رنگ کے دیار
نہ چاندنی کے گلستاں نہ کہکشاں کے شاخسار
نہ راگنی کی ندیاں نہ زمزموں کے آبشار
ابھی تو زندگی ہے صرف زندگی کی آرزو

شباب جاوداں ابھی نہ شوق جاوداں ابھی
نہ حسن کامراں ابھی نہ عشق کامراں ابھی
نہ جام خور فشاں ابھی نہ بادہ مہ چکاں ابھی
ابھی تو زندگی ہے صرف زندگی کی آرزو

نہ دام میں صبا ابھی نہ دوش پر قمر ابھی
نہ بجلیوں کا قلب چیرتی ہوئی نظر ابھی
نہ وسعت خلا میں امتحان بال و پر ابھی
ابھی تو زندگی ہے صرف زندگی کی آرزو

نہ بام و عرش پر کمند پھینکتی جوانیاں
نہ مہر و ماہ پر ابھی بشر کی حکمرانیاں
نہ صفحۂ حیات پر دوام کی نشانیاں
ابھی تو زندگی ہے صرف زندگی کی آرزو

ابھی تو جوش و فکر ہے ابھی تو سعی و اضطراب
ابھی تو رُوئے دھر سے ہٹا ہے گوشۂ نقاب
ابھی تو بازوؤں میں لے رہا ہے زیست کو شباب
ابھی تو زندگی ہے صرف زندگی کی آرزو

مراحل

ایک لمحے کے لئے وقت کی گردش نہ تھمی
حسب دستور مہ و سال بدلتے ہی رہے

ایک لو، ایک لگن، ایک لہک دل میں لئے
ہم محبت کی کٹھن راہ پر چلتے ہی رہے
کتنے پر پیچ مراحل کو کیا طے ہم نے
وادیاں کتنی ملیں بیچ میں دشوار گزار
سیکڑوں سنگ گراں راہ میں حائل تھے مگر
ایک لمحے کو بھی ٹوٹی نہ جنوں کی رفتار
آج ابھرے ہیں وہ گھنگور اندھیرے لیکن
جن میں ڈھونڈھے سے بھی ملتے نہیں راہوں کے سراغ
وہ اندھیرے کہ نکلتے ہوئے ڈرتی ہو نگاہ
سامنے ہو تو نظر آئے نہ منزل کا چراغ
مجھ سے برھم نہ ہو اے دوست کہ میری نظریں
کیا ہوا پیچ و خم راہ میں الجھی ہیں اگر
رود کہسار کی ہر لمحہ بھٹکتی موجیں
اپنی منزل کی طرف ہی تو رہیں گرم سفر
مجھ سے برگشتہ نہ ہو تو کہ مرا دل ہے وہی
کیا ہوا فکر کے چھائے ہیں جو گھیرے بادل
چشم ظاہر سے جو چھپ جائے تو چھپ جانے دو
ابر میں بجھ نہیں جاتی ہے قمر کی مشعل
مجھ سے بیزار نہ ہو تو کہ مرے ذہن میں آج
کیا ہوا صرف جو بیدار ہے منزل کا خیال
موجۂ صبح کی خاطر ہی تو بنتا ہے فلک
ظلمت شب میں یہ تاروں کا چمکتا ہوا جال
میرے چہرے پہ جو ہے وقت کا شبگوں پر تو
ہے اسی عکس سے دھندلا ترا آئینہ دل
آ کہ یہ لمحۂ حاضر نہیں حاصل اپنا
ہے پرے آج کی ظلمات سے اپنی منزل
ان دھواں دھار اندھیروں سے گزرنے کے لئے
خون دل سے کوئی مشعل تو جلانی ہوگی
عشق کے رفتہ و سرگشتہ جنوں کو اے دوست
زندگانی کی ادا آج سکھانی ہوگی

بگولا

جون کا تپتا میہنہ، تمتماتا آفتاب
ڈھل چکا ہے دن کے سانچے میں جہنم کا شباب
دوپہر اک آتش سیال برساتی ہوئی
سینۂ کہسار میں لاوا سا پگھلاتی ہوئی
وہ جھلستی گھاس، وہ پگڈنڈیاں پامال سی
نہر کے لب خشک سے، ذروں کی آنکھیں لال سی
چلچلاتی دھوپ میں میدان کو چڑھتا بخار
آہ کے مانند اٹھتا ہلکا ہلکا سا غبار

دیکھ وہ میدان میں ہے اک بگولا بے قرار
آندھیوں کی گود میں ہو جیسے مفلس کا مزار
چاک پر جیسے بنائے جا رہے ہوں زلزلے
یا جنوں طے کر رہا ہو گردشوں کے مرحلے
ڈھالنا چاہے زمیں جس طرح کوئی آسماں
جیسے چکر کھا کے نکلے توپ کے منہ سے دھواں
مل رہا ہو جس طرح جوش بغاوت کو فراغ
جنگ چھڑ جانے پہ جیسے ایک لیڈر کا دماغ
خشمگیں ابرو پہ ڈالے خاک آلودہ نقاب
جنگلوں کی راہ سے آئے سفیر انقلاب
یوں بگولے میں ہیں تپتے سرخ ذرے بے قرار
جس طرح افلاس کے دل میں بغاوت کے شرار

کس قدر آزاد ہے یہ روح صحرا یہ بھی دیکھ
کس طرح ذروں میں ہے طوفان برپا یہ بھی دیکھ
اٹھ بگولے کی طرح میدان میں گاتا نکل
زندگی کی روح ہر ذرّے میں دوڑاتا نکل

تاب سخن

ہند صدیوں کی غلامی سے تو آزاد ہوا — تم بھی آزاد ہوئے اہل وطن سے پوچھو
غنچۂ گل کے چٹکنے کی صدا تو آئی — پھول بھی کوئی کھِلا شاخ چمن سے پوچھو

آج ذرّات کے سینے میں اندھیرا تو نہیں — جگمگاتی ہوئی نو خیز کرن سے پوچھو
اب تو ساحل پہ پیاسا نہیں مرتا کوئی — موجۂ گنگ و لب رود جمن سے پوچھو
اب تو محفل میں نہیں حکم زباں بندی کا — رنگ خاموشی ارباب سخن سے پوچھو
آج تو زہر بھرے جام نہ پینا ہوں گے — لذت تشنگئی کام و دہن سے پوچھو
اب تو جینے کی تمنا میں نہیں مرنا ہے — در بدر لاشۂ بے گور و کفن سے پوچھو
کل کے وعدے کہیں شرمندۂ ایفا تو نہیں — سادگیہائے بت وعدہ شکن سے پوچھو
اب تو دل پر اثر جادوئے افرنگ نہیں — نو طلسم نگہ سحر فگن سے پوچھو
اب تو پیدا نہیں منصورِ بغاوت کوئی — منتظر مرحلۂ دار و رسن سے پوچھو
اب بھی کیا رشک کے قابل نہیں خلد کشمیر — گلستان اِرم و باغ عدن سے پوچھو

اس زمیں پر بھی کسی روز شفق پھوٹے گی
دوستو! خاک شہیدان وطن سے پوچھو

شکست افسوں

آج ظلمت کا وہ شب تاب فسوں ٹوٹ گیا
چشم انساں کو لبھاتا رہا راتوں کا جمال
نرم کرنوں میں الجھتی رہی پرواز خیال
جگمگاتے رہے افلاک پہ انجم کے نگیں
چاند کو رشک سے تکتی رہی آدم کی زمیں
موج در موج رہی کاھکشاں کی تنویر
خواب آلودہ شعاعوں میں رہا ذہن اسیر
جھلملاتے رہے نظروں میں طلسمی انوار
فکر و احساس پہ چھاتا رہا زرّیں غبار
آج ظلمت کا وہ شب تاب فسوں ٹوٹ گیا
آج تخئیل بناتی نہیں گردوں پہ محل
سرحد فکر پہ جلتے نہیں تاروں کے کنول

اب نہیں حسن گماں، تاب یقیں سے بہتر
سطح افلاک نہیں روئے زمیں سے بہتر
خواب آلود نہیں آج نگاہ آدم
کروٹیں قلب میں لیتا ہے سحر کا عالم
آج سوئی ہوئی صدیوں کی زمیں جاگ اٹھی
افق صبح کی گلرنگ جبیں جاگ اٹھی
آج ظلمت کا وہ شب تاب فسوں ٹوٹ گیا

غزل

ہر سمت افق پہ ہیں دھندلکے
پیمانۂ صبح جلد چھلکے
آغاز نوائے شوق، جیسے
چھیڑے کوئی ساز ہلکے ہلکے
پھولوں پہ چمک رہی ہے شبنم
کانٹوں پہ بھی حسن بن کے جھلکے
ہم ہوگئے تجھ کو کھو کے اے دوست
دنیا کی نظر میں کتنے ہلکے
کچھ بھید کھلے مری نظر سے
کچھ راز تری ہنسی سے جھلکے
بڑھتی ہوئی ظلمتوں کے باوصف
رنگیں ہیں خیال کے دھندلکے
اس خاک چمن میں آج بھی دوست
پھولوں کے ہیں عکس ہلکے ہلکے
موتی تو نہ بن سکیں گے آنسو
دامن پہ ترے اگر نہ ڈھلکے
وہ رنگ رہا نہ روشنی میں
اس سے حسین تھے دھندلکے
یہ منت مہر و ماہ کب تک
گیتی سے کہو کہ آپ جھلکے
اس شیشۂ آرزو سے "اختر"
کیا جانے کتنے رنگ چھلکے

قطعات

(۱)

انگڑائی یہ کس نے لی ادا سے
کیسی یہ کرن فضا میں پھوٹی
کیوں رنگ برس پڑا چمن میں
کیا قوس قزح لچک کے ٹوٹی

(۲)

یہ کس کا ڈھلک گیا ہے آنچل
تاروں کی نگاہ جھک گئی ہے
یہ کس کی مچل پڑی ہیں زلفیں
جاتی ہوئی رات رک گئی ہے

مختار صدّیقی

مختارالحق صدیقی نام مختار تخلص ، یکم مارچ ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئے ۔ آبائی وطن سیالکوٹ ہے مگر آپ کے والد صاحب کے گوجرانواله کو وطن بنانے پر مستقل سکونت یہیں ہو گئی ۔ مختار صاحب نے کالج کی ہفتخواں بی ۔ اے تک طے کی ۔ اس کے بعد حالات کی نا مساعدت کی بنا پر تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا ۔ ابتدائی چند سال خود اختیارانہ بے کاری کی نذر ہوئے ۔ پھر کلرکی ذریعہ معاش بنی ۔ آخر کار اس لعنت سے چھٹکارا ملا اور آپ ریڈیو پاکستان میں پروگرام اسسٹنٹ ہو گئے ۔ چنانچہ آجکل آپ ریڈیو پاکستان راولپنڈی میں کام کر رہے ہیں ۔

مختار صاحب کی شاعری کا آغاز کالج کے زمانے سے ہوا ۔ سیماب اکبر آبادی سے شرف تلمذ حاصل ہے ۔ آپ نے تقریباً ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے مگر موضوع کے لحاظ سے بیشتر غنائی چیزیں ہی لکھی ہیں ۔ اُن کے کلام پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اُستاد سیماب اکبر آبادی کے علاوہ جوش ، حفیظ اور اختر شیرانی کے رنگوں پر بھی فریفتہ رہے ہیں ۔ چنانچہ جہاں سیماب اسکول کی خصوصیات مصرعوں کی نوک پلک سے درستی ، حشو و زوائد سے گریز اور معنی و مفہوم کی وضاحت وغیرہ اُن کے یہاں پائی جاتی ہیں وہاں اُنہوں نے اپنے زمانے کے سیاسی و سماجی میلانات سے بے اعتنائی نہ برتنا جوش سے ، گیتوں اور مترنم بحروں کا استعمال حفیظ سے اور تلذذ اور رومانیت اختر شیرانی سے حاصل کی ہے ۔ مزید براں راشد ، میراجی اور تصدق حسین خالد کے اثرات بھی اُن کی معریٰ نظموں میں بڑے صاف اور واضح ہیں ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اُنہوں نے اپنے ان پیش رووں کی اہمیت کو بہت جلد محسوس نہیں کیا جس کی وجہ غالباً اُن کے مزاج کی ایک بنیادی خوبی ضبط و ٹھہراؤ ہے ۔ مختصر یہ کہ گو وہ ہماری نئی پود کے شاعر ہیں لیکن اُن کا رنگ سخن خاصا رچا ہوا اور اُن کی آواز میں صدیوں کی گونج کے باوجود ایک منفرد و مخصوص سرتال کا احساس ہوتا ہے ۔

مختار صاحب کی منظومات کی سب سے نمایاں خصوصیت خیال و اسلوب کی جدت ہے ۔ وہ ہر بات نئے انداز ، نئے تیور اور نئے ڈھب سے پیش کرنے میں کوشاں رہتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اُن کی بیشتر نظمیں نرالی وضع اور انوکھے لب و لہجے کی

حامل ھیں ۔ تاھم اس جدت طرازی کے جذبہ نے اُن کے یہاں کہیں کہیں بات میں طوالت اور خیال میں اُلجھاؤ بھی پیدا کر دیا ھے ۔ یہ کیفیت بالعموم اُن نظموں میں پیدا ھوئی ھے جہاں بنیادی جذبہ و خیال کے ساتھ وہ ضمنی باتوں کی وضاحت اور تفصیل میں پڑ گئے ھیں ۔ ایسی چند نظموں کو چھوڑ کر اُن کی زیادہ تر نظمیں اپنی وضعی جدت اور خیالات کی اُپج کے لحاظ سے قابل مطالعہ ھیں ۔ ان منظومات کی ایک اور خوبی یہ ھے کہ اُن میں ھندی شاعری کے لب و لہجے ' ھندی کے رسیلے اور مترنم الفاظ کے استعمال اور گیتوں کی موسیقی سے بڑی دلکشی و دلنشینی پیدا ھو گئی ھے ۔ کلام کی یہ نغمگی و موسیقیت کچھ تو مختار صاحب کی موسیقی سے اپنی ذاتی دلچسپی کا نتیجہ ھے اور کچھ اس میں موصوف کی ریڈیو کی ملازمت کو بھی دخل ھے جس کی بدولت اُنھیں ھندوستانی سنگیت سے زیادہ سے زیادہ شغف حاصل ھوا ۔

جہاں تک اُن کی غزلوں کا تعلق ھے یہ کہنا بے جا نہ ھو گا کہ ابتدائی غزلیات کو چھوڑ کر جن میں غالباً سیاب مرحوم کے تغزل کا رنگ جھلکتا ھوگا اُن کی بعد کی غزلوں میں میر کا اتباع پایا جاتا ھے ۔ اُن کی غزلوں کے مطالعے سے پڑھنے والے کو ایک ھی نظر میں پتہ چل جاتا ھے کہ میر کا دور شاعری بالخصوص شہنشاہ تغزل میر کے کلام کا مطالعہ اُن کا محبوب مشغلہ ھے ۔ چنانچہ اُن کی کئی غزلیں نہ صرف اُنھیں بحور میں ھیں جن میں خدائے سخن میر کی غزلیں ھیں بلکہ اُن میں لہجہ کی نرمی ' اسلوب کی سادگی اور گداختگی و یاسیت بھی میر ھی کی سی ھے ۔ بلا شبہ اس میں مختار صاحب کی شعوری کوشش بھی شامل حال ھے مگر شاید اس کاوش سے زیادہ کارگروار اُس نومیدانہ زیست کا ھے جس کے طفیل اُنھیں دل کو خون کرنے کا ڈھب بھی ملا اور وہ آشفتہ حالی بھی نصیب ھوئی جس کی موجودگی میں دل جمعی کے سامان پیدا ھی نہیں ھوتے ۔ بحیثیت مجموعی اُن کے تغزل کا یہ انداز بڑا اُمید افزا ھے اور اگر وہ میر کے اثر کو برقرار رکھتے ھوئے زبان و بیان میں بھی مزید وسعت پیدا کر سکے تو اُن کے پارس بننے میں کس کو شبہ ھو سکتا ھے ؟

غرض مختار صاحب کا شعری سرمایہ ایک لحاظ سے مختصر اور اپنے معاصرین سے مختلف ھے ۔ اُن کے یہاں اُردو ھندی کی پرانی شاعری کی روایت پرستی کے باوصف ایک انفرادیت ھے ۔ اُن کے کلام میں نغمہ و خیال کی ایسی لطیف آمیزش ھے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کر کے دیکھنا بے حد دشوار ھو جاتا ھے ۔ وہ اپنی آواز میں ڈوب کر بات کہتے ھیں اور شعر کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں پر اُن کی خاص نظر رھتی ھے ۔ یوں موضوع کے لحاظ سے اُنھوں نے غنائی چیزیں ھی پیش کی ھیں تاھم ترقی پسند تحریک کے لئے بھی اُن کا کلام فراریت کا ترجمان نہیں ۔ اس کے ثبوت میں اُن کی ''فاشزم'' اور ''بازیافتہ'' جیسی نظمیں پیش کی جا سکتی ھیں ۔ موصوف کا مجموعہ کلام ''منزل شب'' عنقریب زیور طبع سے آراستہ ھو کر ادبی حلقوں میں پہنچا چاھتا ھے ۔

انتخاب کلام

منظومات

رسوائی

ٹیکا لگاؤں ، مانگ بھی صندل سے بھر چکوں
دلہن بنوں تو چاہئے جوڑا سہاگ کا
مہندی رچے گی پوروں کہیں جا کے دیر میں
کنگھی کروں تو چڑھتی ہے کالوں کی اور لہر
افشاں ہے بخت بھی کہ رہا آن کے پھیر میں
کتنی ہے سانجھ ! بھور کے اب گھاٹ اتر چکوں
تم بیٹھو میں تو آئی پہ جی سے گزر چکوں

اتنے دنوں تو دل کی لگی نے خدائی کی
پائل بجے تو بنسی کی دھن ناچ ناچ اٹھے
بدنامیاں کرشمے مرے دیوتا کے ہیں
دیدے گھما گھما کے کہیں کیوں نہ گوپیاں
ان کے چلن تو بگڑے ہوئے ابتدا کے ہیں
بپتا نہ ہو گی کل سے لگائی بجھائی کی
دھکے شفق ، تو دھکے چتا جگ ہنسائی کی

چیخیں سُن سُن کے سبھی نیند کے ماتے جاگے
سامنے دھکی ہوئی آگ کا پیکر دیکھا
چل کے دو چار قدم ، پھر سے پلٹ کر جولاں
چیخیں شعلوں کے دھکنے پہ لپک اٹھتی تھیں
دود کے حلقے ، رواں سوئے فلک ، چرخ زناں
سب یہ سمجھے کہ کوئی غول بیابانی ہے
یوں ہی لوکا جو لگانے کو نکل آیا یہاں
باد پا آگ تھی ، یا لال رسیلی ، ساڑی
چھایا کالوں کی تھی شعلوں کی زبانوں کا دھواں
یک بیک کندنی باھیں بھی اٹھیں چیخ کے ساتھ
کانپتے آئے نظر ، پھول سے مہندی بھرے ہاتھ

ایک نے بڑھ کے وھیں آگ پہ ڈالا پانی
آگ یوں پانی کی شہ پائے تو دوزخ نہ بنے؟
جیتے جی اشکوں سے کیا جی کی لگی بجھتی تھی
آگ پانی کی اڑائی تو چتا پر بھی ٹھنے
خاک ڈالی تو ھوئیں پھر کہیں مدھم آنچیں
بخت رسوا ھو، تو رسوائی بنا کیسے سنے
پوچھو جلنے کی تو جانے وھی جس تن لاگے
چیخیں سن سن کے سبھی نیند کے ماتے جاگے

منزل شب

پھر بھڑک اٹھی ھے ان دل دوز فریادوں کی آگ
نیند کے چڑھتے نشے میں جو ڈبوتی تھیں ابھی
دل کو برمانے لگی ھیں بے صدا سرگوشیاں
نیم بیداری کے رس میں جو سموئی تھیں ابھی
اب کہاں ھے راحت قربت کی مخموری کا رنگ
اور تم — میرے خم بازو میں سوئی تھیں ابھی
اور یہ سرگوشیاں کہتی ھیں — نکہت تھے وہ لوگ
کس جہنم کی خدائی، جن کی جنت میں ھے اب
کتنے نستعلیق، کتنے خوبصورت تھے وہ لوگ
کن درندوں کی غلامی جن کی قسمت میں ھے اب
ان کی ھستی ان تمناؤں کی جدت میں ھے اب
کاش وہ دن آئیں جب، انسان سمجھے جائیں ھم
یہ بہشتی سرزمیں جس دست قدرت میں ھے اب
کاش وہ دن آئیں جب اس کو فنا کر پائیں ھم
اپنی وادی اپنے کہساروں کو ھم اپنائیں ھم

گھرے سنّاٹے لرزتے ھیں کہیں جھونکا کوئی
دم بخود پتوں کو چونکاتا پھرا ھے ڈال ڈال

ہر رگ و پے میں ہے ساری ، ایسا انجانا گداز
ڈوبتے دل کو ہوئی تاروں کی چشمک بھی وبال

اور سرگوشیاں کہتی ہیں ـــــ پہچانو انھیں
یہ سبک سر ہیں انھیں روحوں کے بھٹکے قافلے
جن کو تم منزل کے متوالوں نے چھوڑا راہ میں
آ گئی منزل ـــــ تو غیرت مندیوں کے حوصلے
تم نے اطمینان کی ہر سانس میں پیدا کئے
ورنہ جو بے بس تمہاری جان کا صدقہ بنیں
اُن کی خاطر کیوں یہ تدبیروں کے ایسے سلسلے ؟
چاہتیں اُن کی یہاں آ کر بھی کیوں دعویٰ بنیں ؟
غیرتیں منزل نشیں ہو کر ہی کیوں سودا بنیں ؟

بھیگی بھیگی رات میں تاروں کی نیچی ہے نگاہ
چاند چھپ جائے گا شاید روشنی کم کم ہوئی
اشک آنکھوں میں چھلکتے آ رہے ہیں اس طرح
میرے شانوں پر ترے بالوں کی ہر لٹ نم ہوئی

اور سرگوشیاں کہتی ہیں ـــــ وہ باتیں گئیں
شہر و صحرا ، خون ناحق سے رہیں گے لالہ گوں
زندگی بے مایہ ہے ، جیتیں گئیں ، ماتیں گئیں
آج اک عالم کو پاگل کر چکی ہے بوئے خوں
سروری کرتا ہے بے مقصد تباہی کا جنوں
نسل انسانی کی جیسے حسرت دل ہو یہی
علم و حکمت اس طرح ہے اس کے آگے سرنگوں
جیسے ان صدیوں کی جانکاہی کا حاصل ہو یہی
آدمی کے ارتقا کی جیسے منزل ہو یہی !

ماند پڑ جائے گا تاروں کا یہ اُجلا پن ابھی
ہو چکی ہے خستہ ساماں ہلکی ہلکی چاندنی
شبنمی خنکی سے بوجھل ہوتی جاتی ہے صبا
دیکھتے ہی دیکھتے ، ہر شے سے ڈھلکی چاندنی

اور اب دل کی تڑپ کہتی ہے یہ دنیا بھی کیا
کیسی بے نظمی سے ہوتی ہے یہاں جینے کی بات
ساز و ساماں چاہتا ہے موت کا سودا ہی کیا ؟
بے گل و بے شمع کٹتی ہے یہاں ہستی کی رات
یہ سسکتی زندگی جیسے فنا کی ہو زکات
جن کے چھن جانے سے ہم جب تک جئیں ڈرتے رہیں
اس پہ یہ طرہ کہ جب تک دن کے بعد آئے گی رات
ہم بھی آپس میں کبھیں ماریں ، کبھیں مرتے رہیں
جیتے جی یوں موت ہی کی چاکری کرتے رہیں

اب اُفق پر ہو چلا سہمی سپیدی کا ظہور
اور اُفق کے اُس طرف ، اک دوسری دنیا کی شام
ڈوبتے تاروں کو بلوانے لگی اپنے حضور
اور تم میرے خم بازو میں سوتی ہو ابھی
اور تم میرے ——

خیال ایمن

اب تو بجھ جانے کو ہے شام کی جلتی کایا
بڑھتا آتا ہے دھندلکوں کا گداز رنجور
پھیلتے سایوں سے ٹکرا کے نگاہیں پلٹیں
اب کسے دیکھیں ، سیاہی میں کوئی پاس نہ دور !
نیلے سرمے کی اُمنڈ آئی ہے گہری چھایا
مٹی لالی کو دھواں چھوڑ کے آہیں پلٹیں !

سر پہ رات آئی تو یوں گنگ ہوئی مہتابی
دن ہی اس زیست کے نغموں کا خدا ہو گویا
اب وہ کھڑاگ فنا ہو گیا سنّاٹے میں
یوں مٹا ہے کبھی پیدا نہ ہوا ہو گویا !
اب کوئی ڈر کوئی کھٹکا نہ رہے گا باقی
دن کا غماز کہیں کھو گیا سنّاٹے میں

اب ہے کیا دیر کوئی سوچ قدم کیوں روکے ؟
کوئی بجرا ، کوئی کشتی نہیں بار دریا
نیم بے ہوش ہوئیں دن کی تھکن سے لہریں
سو چلا رات کی گودی میں فشار دریا
نیا باندھو رے کنارے دریا
باندھو کنارے دریا !

بہلاوا ——

دیر کیا آؤ بھی نیّا باندھو ،
رات خود اوٹ ہے ، اب آؤ بھی نیّا باندھو !
دیر کیا ، رات ہی خود اوٹ ہے اب آؤ بھی نیّا باندھو !
دیر کیا آؤ بھی نیّا باندھو ——— نیّا باندھو رے کنار دریا———
باندھو کنار دریا———

انترہ ——

گر مَیں ہوتی وہ جواں بخت پرانا برگد
جس سے تم باندھتے دریا کے کنارے نیّا
یا تمہی ہوتے سجن ، میرے گلے کی گنھٹی
میری بندی ، میری آنکھوں کا رسیلا کجرا
شام کی راہ پہ ہر آہ نہ کہتی بھرتی
رازداں تیرگی ہوتی ہے نثار دریا
نیّا باندھو رے کنار دریا
باندھو کنار دریا !

پیا آنے کو ہیں ' شمعیں کرو روشن ' سکھی اٹھو مرے گہنے لاؤ
موتیوں سے مرے جُوڑے کو سجاؤ ' نئی راتیں ہیں ' نرالا چاؤ
بدھیاں بیلے کی ' زرتار ' سکھی ساتھ مرے گندھواؤ
مانگ صندل سے بھرو ' آؤ پہناؤ گجرے !
اے سکھی آؤ پہناؤ گجرے !

نیّا باندھو رے سجن ' اب تو کنار دریا
باندھو کنار دریا !!

دونوں وقت آن ملا کرتے ہیں دم بھر کے لئے
ورنہ دنیا کی یہی ریت ہے ' بچھڑے نہ ملیں !
رات ' تو راگ کے بیراگ میں کٹ جائے گی
چاک اُجالوں کے مگر ان سے تو شاید نہ سلیں ؟
نیّا جیون کی نہ آ جائے کنار دریا !!

غزلیات

جو جو صدمے ہم پہ گزرے ' کیسے اُن کا بیان کریں
کون سا داغ نکال کے دل سے ' ثبت سر دیوان کریں
آٹھ پہر آشفتہ خیالی کس کو بھلا خوش آتی ہے
جی مانے تو ہم بھی کچھ دل جمعی کا سامان کریں
جب سے قفس کا گوشہ چھوٹا ایک ہی دُگدا رہتی ہے
جینا مشکل ' مرنا مشکل ' کیا مشکل آسان کریں

اس کی شکایت کون کرے گا ' دل کی وہ حالت گو نہ رہی
بارے تیرے تلوّن سے یکسانئی شام و سحر نہ رہی
جیتے رہے تو ٹھانی ہے یہ ' نومیدانہ زیست کریں
اور کوئی تدبیر نہ تھی جو اب تک پیش نظر نہ رہی

کیا غم جاں ، اور کیا غم جاناں ، سب کے محرم راز ہوئے
اب پابند نوا بھی نہیں ہیں ، اب تو پردۂ ساز ہوئے
شعر و سخن ، سامان جنوں کیا ، کوھکنی درویشی کیا
قید حیات میں درد کے مارے رہے تو حیلہ ساز ہوئے
آج غزل کی صورت میں جو آپ کے سامنے آئے ہیں
کن جتنوں سے یہ خون کے قطرے ، ابتک پس انداز ہوئے

تھی تو سہی پر آج سے پہلے ایسی حقیر فقیر نہ تھی
دل کی شرافت ، ذہن کی جودت اتنی بڑی تقصیر نہ تھی
سچ کہتے ہو ، ہم ایسے کہاں ، اور سوز و گداز عشق کہاں
سچ ہے مرے آئینہ دل میں کوئی کبھی تصویر نہ تھی
اب جو اُچاٹ ہوئی ہے طبیعت ، شاید اب ہم رخصت ہیں
بن کارن ، بے بات وگر نہ ، ایسی کبھی دلگیر نہ تھی
اھل جنوں کو فصل خزاں سے اب کے بھی گو نہ ربط رہا
اب کے بہار وہ آئی کہ جس کی بوئے گل بھی سفیر نہ تھی
آخر غیرت نے سمجھایا ، نومیدانہ زیست کریں
باقی ھر تدبیر تو کی ، جو اپنے خلاف ضمیر نہ تھی

موت کو زیست ترستی ہے یہاں
موت ھی کون سی سستی ہے یہاں
دم کی مشکل نہیں آساں کرتے
کس قدر عقدہ پرستی ہے یہاں
سب خرابے ہیں تمناؤں کے
کون بستی ہے جو بستی ہے یہاں
چھوڑو بے صرفہ ہیں ساون بھادوں
دیکھو ھر آنکھ برستی ہے یہاں
اب تو ھر اوج کا تارا ڈوبا !
اوج کا نام ھی پستی ہے یہاں

قیوم نظر

عبدالقیوم بٹ اصل اور قیوم نظر قلمی نام ہے ۔ نظر تخلص کرتے ہیں ۔ مولد و وطن لاہور ہے جہاں ۷ مارچ ۱۹۱۴ء کو آپ کی پیدائش ہوئی ۔ قیوم صاحب نے اپنی تعلیم کے مراحل پنجاب کے مختلف شہروں میں طے کئے ۔ البتہ طالب علمی کے آخری چند سال آنھیں دیال سنگھ کالج اور مشن کالج لاہور میں گزارنے کا موقع ملا ۔ ان معروف درسگاہوں میں وہ بی ۔ اے ۔ اور ایم ۔ اے ۔ میں پڑھتے رہے اور یہیں آن کا ادبی و علمی ذوق پروان چڑھا ۔ لیکن اتفاق سے وہ تعلیم مکمل نہ کرنے پائے تھے کہ بعض وجوہ کی بنا پر آنھیں تلاش معاش میں سرگرداں ہونا پڑا چنانچہ ابتداً آپ اے، جی آفس لاہور میں ملازم ہوئے اور کئی سال تک اس خلاف مزاج مشغلہ سے دو چار رہے ۔ ۱۹۵۱ء میں قیوم صاحب نے اورینٹل کالج لاہور سے اردو میں ایم ۔ اے پاس کیا اور چند ماہ بعد وہ گورنمنٹ کالج لائلپور میں آردو کے لکچرار مقرر ہو گئے ۔ ۱۹۵۲ء میں آپ نے اپنا تبادلہ لاہور کرا لیا چنانچہ جب سے گورنمنٹ کالج لاہور ہی میں ہیں ۔

دیال سنگھ کالج کے زمانۂ تعلیم میں قیوم صاحب کو پروفیسر عابد علی عابد اور علامہ تاجور جیسے شفیق آستاد ملے جنھوں نے نہ صرف تحصیل علم میں آن کی رہبری و رہنمائی کی بلکہ صحیح علمی و ادبی ذوق بھی پیدا کیا ، بالخصوص شعر و شاعری کے باب میں تو یہ حضرات آن کے لئے بہت ہی مفید ثابت ہوئے ۔ لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ عابد صاحب جیسے کہنہ مشق اور مشاق غزل گو سے استفادہ کے باوجود قیوم صاحب اپنی غزلوں میں وہ بات نہ پیدا کر سکے جس سے آن کی آواز میں انفرادیت پیدا ہوتی اور غالباً یہی وجہ تھی کہ آنھوں نے غزل سرائی کے ساتھ ساتھ نظم جدید کو بھی اپنایا اور بلا شبہ اس میدان میں انھیں خاصی کامیابی نصیب ہوئی ۔

قیوم نظر صاحب کی نظموں میں شدت احساس ، وسعت مشاہدہ ، تخیل کی جولانی اور اسلوب بیان کی ایسی لطافتیں پائی جاتی ہیں جو آنھیں اپنے ہم عصر نظم نگاروں میں ممیز و ممتاز بناتی ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ آن کی ابتدائی نظموں میں خیال و اسلوب کی جدتوں کے با وصف ، تجربہ ایک سانچے میں ڈھلا ہوا ، مکمل اور قاطع نہیں مگر جوں جوں آن کے فکر و فن کی ارتقائی منزلیں طے ہوتی جا رہی ہیں آن کی نظموں میں جان پیدا

ہو رہی ہے ۔ چنانچہ پچھلے چند سالوں میں موصوف کے کلام میں جیسا نکھار اور پختگی پیدا ہوئی ہے اُس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ اپنے نخل سخن کی آبیاری اسی خلوص و ریاض کے ساتھ کرتے رہے تو اُن کی تخلیقات میں وہ عظمت بھی پیدا ہو جائے گی جس کے بغیر شاعری متاثر تو کرتی ہے مسحور نہیں کر پاتی ۔

جناب نظر کی منظومات کی سب سے نمایاں خصوصیت اُن کا وہ اسلوب بیان ہے جس میں اُردو شاعری کے قدیم و جدید اسالیب کا دلکش امتزاج پایا جاتا ہے ۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ گو اُنہوں نے آزاد نظمیں نہیں لکھی ہیں لیکن شکل و ہیئت کے اعتبار سے اپنے اظہار خیال کے لئے نئے نئے سانچے ضرور تلاش کئے ہیں ۔ انداز بیان کے ان مختلف طریقوں میں جنھیں ہیئتی یا وضعی تجربہ کہنا چاہئے نظر صاحب نے اپنے نہایت قریب کے پیشروؤں اور ہمعصروں کے تجربات سے فائدہ اُٹھایا ہے لیکن بعض جگہ اچھوتے پیرائے اختیار کر کے جدت و اُپج کا ثبوت بھی دیا ہے ۔ اور نامانوس بحور اور ارکان کے تغیر و تبدل یا کمی بیشی کے ساتھ ساتھ بعض نئے الفاظ و تراکیب اور نئے استعارات و تشبیہات اس طرح استعمال کئے ہیں کہ قاری کو مفہوم کے سمجھنے میں زیادہ دقت نہیں ہوتی ۔

اُن کی منظومات موضوع کے لحاظ سے بھی متنوع ہیں ۔ اُن میں دوسری جنگ نیز تقسیم ہند سے پیدا شدہ انفرادی و اجتماعی مسائل کی بازگشت بھی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دراصل یہ نظمیں وہ آئینہ ہیں جن میں حضرت نظر کی تمام سوچ ، اُن کے تجربات ، میل ملاقاتیں ، عشق و محبت ، آرزوئیں ، اُمیدیں اور خدشات پورے خلوص سے فن کی صورت میں منعکس ہوئے ہیں ۔ خاص طور پر ہماری سوسائٹی کی معاشی ، اقتصادی ، اخلاقی اور سیاسی مجبوریوں پر اُنہوں نے بڑے دلنشیں انداز میں قلم اُٹھایا ہے ۔

غزلوں اور نظموں کے علاوہ نظر صاحب نے گیت بھی لکھے ہیں جو شعر و نغمہ کی دنیا میں ایک الگ حیثیت کے مالک ہیں ۔ ان گیتوں میں جوان و رعنا محبت کی سرشاری بھی ہے اور اولین ناکامی کے بعد ایسی غمگین سنجیدگی بھی، جس میں مایوسی و اُمید دونوں کا امتزاج ہے ۔ اسی ناکامئی محبت کی بدولت ان نغمات میں ایک اور دلکشی بھی پیدا ہوگئی ہے یعنی مظاہر فطرت سے شیفتگی اور اُن میں آسودگی پانے کی بے پایاں خواہش ۔ مزید برآں فنی اعتبار سے ان گیتوں میں جذبات و تاثرات دھنوں میں کچھ اسطرح سموئے گئے ہیں کہ اُن میں موسیقیت رچ گئی ہے ۔

مختصر یہ کہ قیوم صاحب ہماری نئی پود کے بڑے ہونہار شاعر ہیں اور توقع ہے کہ آئندہ اُن کی شاعری فکر و فن کی گہرائیوں میں ڈوب کر زیادہ ہمہ گیر صورت اختیار کرے گی، اب تک موصوف کے دو مجموعے ''قندیل'' اور ''پون جھکورے'' شائع ہو چکے ہیں اور ایک تازہ مجموعہ ''سویدا'' زیر اشاعت ہے ۔

انتخاب کلام

منظومات

اپنی کہانی

اس کی آنکھیں ہیں دھکتے ہوئے انگاروں پر
مرمریں راکھ کا باریک سا شفّاف غلاف
دم بخود شعلوں کی حِدّت سے چڑھا ہو جیسے

شیر کے پنجرے کو گھیرے ہیں تماشائی کئی
دوپہر ' موسم سرما کی بھلی دھوپ ' مگر
وہ کسی اور ہی. عالم میں پڑا ہو جیسے

اس کی آنکھوں میں کھٹکتی ہے وہی رات ابھی
جس میں کمزور شکاری نے ریا کاری سے
ایسی دنیا میں وہ خود جس کا خدا ہو جیسے

جس میں ہنگامۂ محشر ہو کبھی اس کا خرام
سانس لے سکتا نہ ہو جس میں کوئی اس کے سوا
اس کی آواز جہاں سیل بلا ہو جیسے

ایسی دنیا میں کیا سیمگوں ہاتھوں سے اسے
دست و پا باندھ کے یوں فاقہ کشی پر مجبور
جام آزادی میں پیغام فنا ہو جیسے

تنگ و بے ربط ہے اب روزن زنداں کی طرح
تلخئی صبر میں لپٹی ہوئی پامال کچھار
جس میں وہ —— بھورا سا اک ڈھیر پڑا ہو جیسے

اور پھر سامنے اس کے ہیں لچکتے آ ہو
چڑ چڑاتے ہوئے لنگور ' اکڑتے بندر
بوڑھا لومڑ —— جو کھڑا اونگھ رہا ہو جیسے

اس کی آنکھوں میں اتر آیا ہے احساس کا خوں
سرد لوہے کی سلاخیں ' یہ گراں دیواریں
توڑ ہی ڈالے گا اب ٹھان چکا ہو جیسے

آدم

یہ نرم و شیریں ہوا کے جھونکے
یہ داستاں گو بجھے دلوں کے
ہمیشہ یونہی اٹھے ہیں گویا
رواں دواں تازگئی دنیا
دکھا کے اپنے بدلتے پہلو
جگا کے رعنائیوں کا جادو
ہر ایک ذرّے سے آشنا ہے

ہوا کی موجوں نے ساز چھیڑا
ہوا کی موجیں مری تمنا
نئی، انوکھی، نہاں، نمایاں
یہاں، وہاں، زندگی بداماں
عجیب کیفیتوں میں کھوئی
خرد کی ناکامیوں کا کوئی
اثر نہ جن پر کبھی ہوا ہے

انہی کے بل پر ستم کدوں سے
نہ سامنے آئی منزلوں سے
میں سینہ تانے گزر سکوں گا
اُفق کے اُس پار اُتر سکوں گا
حسیں خزانے سمیٹنے کو
مسرتوں کے لپیٹنے کو
ہوا کی موجوں میں اور کیا ہے ؟

ہوا کی موجوں میں کیا نہیں ہے
مگر یہی کوتہ آستیں ہے
یہ آدمی —— یہ جنوں کا پرتو
یہ سرگراں زیست کی تگ و دو
ہزار موجوں کا ایک طوفاں
خموشیوں کو کئے پریشاں
ملول و تنہا گزر رہا ہے

مجبوری

یہ چمکتی آنکھیں ، یہ ترشے ہوئے لب شعلہ کار
یہ دھکتے گال ، یہ شاداب پھولوں کی بہار
کیفیت بردوش جوبن کا نکھار
ہو رہے ہیں تیری مبہم خامشی کے سائے میں اب شرمسار
اپنی پرکاری سے تو جس کو سراہے گی کبھی
تیری مجبوری اُسے چاہے تو چاہے گی کبھی
رہ سکے گا حسن کا یونہی وقار
جانتا ہوں ورنہ کیوں یوں رو رہی ہے آج تو دیوانہ وار
تجھ کو جانا تھا مگر یہ آخری صورت تھی کیا
اور تو جذبات سے خالی حسیں مورت تھی کیا
کیا نہ تھی اب تجھ میں تاب انتظار
تیرے اپنوں نے کیا کیوں تجھ کو تیری موت سے یوں ہمکنار
کیوں اُنہوں نے ناشناسائے جنوں سمجھا تجھے
اپنی ناکامی کے آگے سرنگوں سمجھا تجھے
تیرے احساسات کا آن پر مدار
شمع آئین کہن پر آہ یہ جلنا ترا پروانہ وار
تیرے سینے میں بھی پل سکتی ہے دنیا چاہ کی
سختیاں تو بھی تو سہ سکتی ہے سوز آہ کی
کیوں اُنہیں آیا نہ اس کا اعتبار
حسن رنگیں تر کی خواہش حسن رنگیں کو نہیں کیا زینہار
تیری فطرت اور یوں جبر و رضا کی بندشیں
تو نے خود چاہی ہیں کیوں بے جا حیا کی بندشیں
دشمن ہوش و خرد ہے یہ شعار
وقت باقی ہے ابھی کچھ اب بھی تو کہہ دے ''نہیں'' بس ایک بار

غزلیات

کیوں بیٹھ گئے غبار سے ہم — کچھ کہہ نہ سکے بہار سے ہم
یہ زندگی ، عمر بھر کا رونا — گھبرا گئے انتظار سے ہم

وہ ہجر کی لذتوں کا عالم باز آئے اس اختیار سے ہم
ہنستے ہیں کہ ہنس سکے زمانہ خوش ہیں تو اس اعتبار سے ہم
یوں بھی تو سکوں ملا ہے برسوں پھرتے رہے بے قرار سے ہم
وہ لمحہ ہے آج تک گریزاں جب تم سے تھے، ہمکنار سے ہم
اب آخر شب ''نظر'' ہے شاید
پھر جیسے ہیں ہوشیار سے ہم

آپ سنتا ہوں اپنے افسانے اور کیا حال ہو خدا جانے
آہ وہ ابتدا کی کج فہمی دوست کیا کیا نہ آئے سمجھانے
کیا یہی ہیں بہار کی باتیں اک کلی آئے باغ سہکانے
لاکھ چاہوں مگر یہ آمیدیں بکھرے جاتے ہیں ریت کے دانے
عشق کے نام پر ہوئے تاراج حسن کے بے شمار کاشانے

کھا رہا ہوں ابھی فریب وفا آرزو پھر بہل گئی شاید
ہنس رہا ہوں فراق دائم پر غم کی صورت بدل گئی شاید

رُت بیت چکی ہے برکھا کی اور پیت کے سارے بیٹھے ہیں
روتے ہیں، رونے والوں کی آنکھوں میں ساون رہتا ہے
دل توڑ کے جانے والے سُن، دو اور بھی رشتے باقی ہیں
اک سانس کی ڈوری اٹکی ہے اک پریم کا بندھن رہتا ہے

میں کہاں اس نگاہ کے قابل ذرۂ دل کو آفتاب نہ کر
برق ڈھلتی ہے اس تبسم میں بجلیوں سے مجھے خطاب نہ کر
لمحہ بھر لا کے مجھ کو اپنے قریب عمر بھر خانماں خراب نہ کر

کیا موت نے بھی سیکھ لئے دلبری کے ڈھنگ
یہ طرز بے رخی تو اس آرام جاں کی ہے

کس منہ سے ہو محرومیٔ قسمت کی شکایت
ایک آہ تھی وہ بھی دم فریاد ہے خاموش

کیوں دیکھتے ہیں مجھ کو حیرت سے جہاں والے
کیا غم کی یہاں کوئی تصویر نہیں ہوتی
تاثیر محبت سے آہیں تو ہوئیں پیدا
آہوں میں ''نظر'' پیدا تاثیر نہیں ہوتی

مٹ مٹ کے محبت میں تیری، یوں تجھ کو پکارے جاتے ہیں
کٹ کٹ کر دریا کی تہ میں جس طرح کنارے جاتے ہیں

ہر طرف شورِ نو بہار سہی — دم بخود پھر بھی ہر کلی ہے ابھی
جان دینا جنوں سہی لیکن — رسم دنیا میں یہ بھلی ہے ابھی

در و دیوار نقش پا کی صورت — کہاں جائے گی ویرانی یہاں سے
عجب عالم تھا عرض مدعا کا — نہ جانے ہم کہاں پہنچے کہاں سے

اُن کو دیکھ کے دل سا مورکھ جب سانچے میں ڈھل جاتا ہے
میری بساط تو کیا ہے، اک عالم پر جادو چل جاتا ہے
میر سے لے کے میرا جی تک عشق کے مارے ہی مرتے ہیں
ورنہ ان ایسے وارفتوں سے تو زمانہ چل جاتا ہے

دل لگا کر ہے جاں بلب کوئی — کر رہا ہے یہ کیا غضب کوئی
خود ہی کرتا ہے پھر بیان غم — حال دل پوچھتا ہے جب کوئی
سو بہانوں سے خود کو اُلجھایا — جب ملا زیست کا سبب کوئی

حاصل زیست ہی سہی جلنا — سینۂ موج گل سے لگ چلنا
دیدنی ہیں خزاں کے یہ انداز — شعلۂ گل کی آنچ پر پلنا
عمر گزری اسی کشا کش میں — ختم بھی ہوگا رات کا ڈھلنا

گیت

آئے بہار کے پھر دن آئے

پھر دن آئے
آئے بہار کے پھر دن آئے
اٹک مٹک کر چلیں محوے
چھپی چھپی کہیں شاما بوے
کلی کلی بھونرا منڈلائے
اور گائے
آئے بہار کے پھر دن آئے
ہرہریالی
پیت نے اپنے روپ میں ڈھالی
بنی کھڑی ہے صبح سہانی
کرشن کنھیا، رادھا رانی
ہری بھری سنجوگ کی ڈالی
لہرائے
آئے بہار کے پھر دن آئے

اندھیارے میں پھر شعلے لہرائیں

اندھیارے میں پھر شعلے لہرائیں
ہنس ہنس وقت بتائیں
منگل گائیں راس رچائیں
لاکھ سجھائے کوئی نہ سمجھیں اور نہ دھیان میں لائیں
جیسے بھول ہی جائیں
اندھیارے میں پھر شعلے لہرائیں
جھوٹی لاج کے مارے
جگمگ جگمگ چمکیں تارے
آنے والے کل کا اجالا بے بے نام پکارے
سننے سے گھبرائیں

اندھیارے میں پھر شعلے لہرائیں
یہ طبلے طنبورے
اونچے محلوں کے کنگورے
دھن دولت کے بڑھتے سپنے ہوئے نہ ہونگے پورے
ان سے پنڈ چھڑائیں
اندھیارے میں پھر شعلے لہرائیں

بے دھیانی میں جانے کہاں سے آ ہی گیا تھا اک ریلا

بے دھیانی میں جانے کہاں سے آ ہی گیا تھا اک ریلا
سنبھل رہی تھی کہ دنیا بدلی ٹھہر سکا نہ وہ البیلا
تن من ہارے، ندی کنارے اب چپ بیٹھی رہتی ہوں
گھاس پھوس کی بات ہی کیا ہے بھاری پتھر ساتھ گئے
جھولتی بیلیں، پیڑ سجیلے، رکے نہ ہاتھوں ہاتھ گئے
لہروں کا طوفان کہاں اب آنسوؤں ہی میں بہتی ہوں
سائیں سائیں کرتی ہوائیں ایک ہی سمت کو جاتی ہیں
رینگتے پانی کے سینے پر ناچ کے جی بہلاتی ہوں
سنتی تھی نہ کبھی جن کو اب دیکھتی ہوں اور سہتی ہوں

سراج الدین ظفر

سراج الدین ظفر (اس میں ظفر تخلص نہیں) جہلم کے رہنے والے ہیں جہاں ۲۵ مارچ ۱۹۱۲ء کو آن کی پیدائش ہوئی ۔ موصوف ایم عبدالقادر صاحب ریلوے انجینیئر کے صاحبزادے ہیں ۔ آپ کی والدہ مسز عبدالقادر اردو داں طبقہ میں ایک افسانہ نگار خاتون کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل کر چکی ہیں ۔ ظفر صاحب کے نانا مولوی فقیر محمد صاحب دیوبند کے فاضل اور بلا مبالغہ درجنوں اسلامی کتابوں کے مصنف تھے ۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ اردو کے اس جواں سال شاعر نے ابتدا ہی سے ایک علمی و ادبی گھریلو ماحول میں آنکھ کھولی اور شعر و ادب کا ذوق اپنے بزرگوں سے ورثہ میں پایا ۔

جناب ظفر نے بی ۔ اے ۔ ایل ۔ ایل ۔ بی کرنے کے بعد کچھ عرصہ وکالت کی پھر ہوائی فوج میں افسر رہے ۔ لیکن آخر ان مشاغل سے اکتا کر تجارت کی طرف متوجہ ہوئے چنانچہ آج کل وہ فیروز سنز کراچی سے متعلق ہیں ۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ ڈاکٹر عبدالوحید صاحب ڈائرکٹر فیروز سنز ظفر صاحب کے برادر نسبتی ہیں اور غالباً اسی قرابت کی بنا پر آنہوں نے اپنے سابقہ کاموں پر موجودہ مشغلہ کو ترجیح دی ہے ۔

ظفر صاحب کو شعر و شاعری کا شوق بچپن سے ہے اور بقول خود وہ بارہ برس کی عمر سے شعر کہہ رہے ہیں ۔ لیکن فن شعر میں نہ تو آنہیں کسی سے شرف تلمذ حاصل ہے اور نہ ہی وہ روایتی اُستادی شاگردی کے قائل ہیں ۔ بلکہ آنہوں نے اب تک جو کچھ کہا ہے وہ محض اپنے ذوق صحیح اور وجدان سلیم کی رہبری و رہنمائی میں کہا ہے ۔ بہر صورت کچھ بھی ہو آن کا کلام آن کی خوش فکری و خوش گوئی پر دال ہے اور وہ عصر حاضر کے نوجوان شعراء میں ایک امتیازی شان کے مالک ہیں ۔

جناب ظفر ایک ولولہ انگیز نوجوان شاعر ہیں ۔ جنہوں نے موجودہ زمانے کی جدید ادبی کاوشوں کے دور میں کسی خاص مدرسۂ فکر یا شعر و شاعری کا اتباع کرنے کی بجائے ضرورت کے مطابق جدت آفرینی و آزاد خیالی سے کام لے کر اپنے کلام میں خاصی جامعیت اور صحت و پختگی پیدا کر لی ہے ۔ آنہوں نے غزل ، نظم ، مثنوی ، قصیدہ ، قطعہ اور رباعی غرضکہ ہر صنف میں طبع آزمائی کر کے نہ صرف اپنی شاعرانہ مہارت کا ثبوت دیا ہے بلکہ ان میں سے تقریباً ہر صنف میں آنہوں نے جذبات انسانی کے بعض ایسے

مرقع بھی پیش کئے ھیں جو وسعت مشاھدہ ' رفعت خیال اور لطافت بیان کے اعتبار سے قابل قدر ھیں۔ بالخصوص آنکی مثنویاں تو شاھکار کہلانے کی مستحق ھیں۔ چنانچہ ''لاجونتی'' اور ''مسافر'' ایسی تخلیقات ھیں جنہیں بلاشبہ اُردو شاعری کی غیر فانی دولت قرار دیا جا سکتا ھے۔

جہاں تک غزل کا تعلق ھے ظفر صاحب غزلیں بھی عرصے سے کہہ رھے ھیں لیکن اُن کے ۱۹۳۶ء سے پیشتر کے کلام پر مشتمل مجموعۂ کلام زمزمۂ حیات میں کوئی چونکا دینے والی بات یا رہ رہ کر یاد آنے والا خیال نہیں ملتا اور نہ ھی اسلوب کے اعتبار سے اس میں کوئی ایسی بات ھے جو عام عاشقانہ جذبات میں جذب و کشش پیدا کر دے تاھم یہ دیکھ کر بڑی مسرت ھوتی ھے کہ اس کے بعد ظفر صاحب نے فنی اور ارتقائی نقطۂ نظر سے بڑی ترقی کی ھے اور اب اُن کی غزلوں میں وہ جان پیدا ھو گئی ھے جسے تغزل کی جان کہنا چاھئے۔ اُنھوں نے قدیم رنگ شاعری میں اپنے نئے اسلوب سے ایک ایسا انقلاب برپا کر دیا ھے کہ اُن کی انفرادیت مسلم ھو گئی ھے۔

قطعات اور رباعیوں میں بھی جہاں کوئی ایک خاص بات یا خاص اشارہ کافی ھوتا ھے ظفر صاحب کامیاب ھیں۔ اور اُن کا وار ایسا بھرپور ھوتا ھے کہ پڑھنے یا سننے والا پھڑک اُٹھتا ھے۔ اُن کی رباعیوں میں حسن و عشق' رندی و سرمستی سے لے کر معرفت و عرفان تک کے تمام مضامین پائے جاتے ھیں اور ساتھ ھی اُسلوب اتنا دلکش اور زبان بر جستہ و ھموار ھے کہ اُن کی رباعیوں میں ایک عام اپیل پیدا ھو گئی ھے۔

غرض سراج الدین ظفر صاحب ایک خوش فکر اور ھونہار شاعر ھیں جنھوں نے نوجوان شعرا کی صف میں ایک امتیازی مقام اور اُردو شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے دلوں میں اپنے لئے خاصی جگہ پیدا کر لی ھے لیکن اس سے بھی زیادہ خوش آئند بات یہ ھے کہ اُن کا فن متواتر ارتقائی منازل طے کر رھا ھے چنانچہ اُن کی ذات سے اُردو شاعری کی بہت سی توقعات وابستہ ھیں۔ خدا کرے کہ اُن کا مستقبل اُن کے حال سے زیادہ روشن و تابناک ھو اور وہ اپنے بہی خواھوں کی یہ توقعات بدرجۂ احسن پوری کر سکیں۔ اب تک موصوف کا ایک مجموعہ کلام ''زمزمۂ حیات' کے نام سے شائع ھوا ھے۔ اس کے علاوہ آنکے افسانوں کا مجموعہ ''آئینے'' بھی عرصہ ھوا چھپ چکا ھے۔

انتخاب کلام

منظومات

لاجونتی

(مثنوی)

کہیں دریائے راوی کے کنارے نہاتے تھے جہاں راتوں کو تارے

نشیبِ کوہ میں اک جھونپڑی تھی　　جو خود رو لالہ زاروں میں کھڑی تھی
بڑھاپے کی مئے بے رنگ سے چُور　　وہاں رہتا تھا اک بیچارہ مزدور
نقاہت سے نہ تھا محنت کا یارا　　اُسے دو بیٹیوں کا تھا سہارا

بڑی دونوں میں سے تھی لاجونتی　　مقابل میں جو شمشادوں کے تنتی
تھے اُس کے حسن سے جنگل سہانے　　دبے تھے پاؤں کے نیچے ترانے
سحر کی طرح جب وہ مسکراتی　　شرارے سرخ پھولوں سے اُڑاتی
جو اُڑتی زلف اُس کی پیچ در پیچ　　نظر آتا خرامِ ابر بھی ہیچ

کہیں اُس سے برس چھوٹی تھی رانی　　شراب نور تھی اُس کی جوانی
وہ اُس کی حسن سے مخمور آنکھیں　　وہ موٹی موٹی موتی چُور آنکھیں
ندی اُس کی اداؤں پر مچلتی　　ہوا اُس کا اشارہ پا کے چلتی

ذرا اُس جھونپڑی سے دور ہٹ کر　　کہیں اُس خوش نما وادی کے اندر
جواں رہتا تھا اک رادھے سوامی　　جوانی اور محبت کا پیامی
وہ جب اپنا پہاڑی ساز اُٹھاتا　　دلوں میں سوز کی شمعیں جلاتا
جوانی اُس کی جب بربط پہ جھکتی　　نوا سے بادلوں کی سانس رکتی
ہوا ہونٹوں کو اُس کے چومتی تھی　　شرابی ہو کے فطرت جھومتی تھی

گزرتی جب ادھر سے لاجونتی　　کلیجے کو بجز تھامے نہ بنتی
محبت تھی اُسے رادھے کی لے سے　　وہ لے میٹھی تھی جو ہر ایک شے سے
سمجھ کر عشق کا اُس کو شوالا　　بنا لاتی وہ اک پھولوں کی مالا
وہ مالا عشق جس کی بُو سے جاگے　　اُٹھا کر ڈال دیتی اُس کے آگے
مگر وہ بے خودی سے لو لگائے　　نوا پرداز رہتا سر جھکائے

ادھر سے ہو کے رانی جب گزرتی　　جوانی اُس کے آگے رقص کرتی
جو رادھے دیکھتا رانی کو آتے　　اُسے وہ سرمدی سُر بھول جاتے
وہ تھا اُس کی محبت کا بھکاری　　جوانی کے شوالے کا پجاری
مگر رانی تھی اک بوئے پریدہ　　محبت سے نہ تھی لذت چشیدہ
محبت جب گریباں چاک پھرتی　　وہ آہو کی طرح بے باک پھرتی

غزل خواں اک برس آئی جو برسات
ہوئی رادھے کی رانی سے ملاقات
ندی میں دودھ تھا فطرت کا جاری
ہواؤں پر تھی بادل کی سواری
اُسے اس طرح تنہائی میں پا کر
ہوا بے باک عشق روح پرور
وہ مالا آج لاجو نے جو دی تھی
ابھی تک سامنے اُس کے پڑی تھی
نیاز عشق کا دے کر حوالا
اُسے رادھے نے پہنا دی وہ مالا
جوانی نے محبت کو جگایا
چراغ آرزوئے دل جلایا
وہ رانی تھی محبت سے جو عاری
ہوئے آنکھوں سے اُس کے اشک جاری
وہ اب سمجھی کہ پروائی ہوائیں
حقیقت میں ہیں رادھے کی نوائیں
وہ اب سمجھی کہ پھولوں کی جوانی
حقیقت میں ھے رادھے کی کہانی

دیئے جب جل اُٹھے سب بستیوں میں
اُٹھی وہ غرق ہو کر مستیوں میں
دوپٹہ ڈال کر سر پر بسنتی
کھڑی تھی راستے میں لاجونتی
پڑیں اُس کی جو مالا پر نگاھیں
لبوں تک رہ گئیں آ آ کے آھیں
یہ مالا تھی بلائے ناگہانی
ہوئی سب منکشف اُس پر کہانی
مصیبت سے کوئی کس طرح بھاگے
اندھیرا آ گیا آنکھوں کے آگے

وہ بستی کے دیئے کی مسکراہٹ
وہ جھونکوں کی ترانہ ریز آہٹ
وہ شب کی ناچتی پریوں کے سائے
وہ بادل بستیوں پر سر جھکائے
اُسے سب یاد رادھے کی دلاتے
تپیدہ حسرتوں کو خوں رلاتے
نظر آیا نہ جب کوئی ٹھکانہ
ہوئی دریائے راوی کو روانہ
اُسے برسات نے جانے سے روکا
سہانے آبشاروں نے بھی ٹوکا
جوانی اُس کے پیچھے پیچھے بھاگی
فضا شور قیامت سن کے جاگی
پہنچ کر دور راوی کے کنارے
شکستہ آرزوؤں کے سہارے
نئی اک زندگی کی ہو کے جویا
ہوئی اس طرح تنہائی میں گویا
مرے شاھد ہو تم اے دیوتاؤ
جوانی اور محبت کے خداؤ
قیامت عشق پر ڈھائی گئی ھے
جوانی میری ٹھکرائی گئی ھے
کہاں اب آرزوؤں کے ترانے
یہاں آئی ہوں بھینٹ اپنی چڑھانے
کہا یہ اور آنچل سر پہ ڈالے
ندی کے کر دیا خود کو حوالے

قضا کو آ گیا ٹھنڈا پسینہ دھڑک اٹھا گلستانوں کا سینہ
ہوا نے اپنے میٹھے گیت چھوڑے ندی نے آبلے سینے کے پھوڑے
گئی وہ عشق کے امرت کی پیاسی نظر آنے لگی ہر سو اداسی

اسے اب دس برس ہونے کو آئے زمانے نے کئی منظر دکھائے
بچارا دل شکستہ اور رنجور کبھی کا مر چکا ہے بوڑھا مزدور
بیاہی بھی گئی رادھے سے رانی ہوئی یکجا محبت اور جوانی
محبت میں ہیں دونوں اب بھی سچے ہیں شاہد اس کے دو معصوم بچے
یہ بچے ہیں نہایت بھولے بھالے حریم جنت فطرت کے پالے
کبھی راوی میں آتا ہے جو طوفاں کہا کرتی ہے نارائن سے شاماں
"صدا باہر جو پیدا ہو رہی ہے
یہ خالہ لاجونتی رو رہی ہے"

غزلیات

در میخانہ سے دیوار چمن تک پہنچے
ہم غزالوں کے تعاقب میں ختن تک پہنچے
ہاتھ میخواروں کے بے قصد اٹھے تھے لیکن!
اتفاقاً ترے گیسو کی شکن تک پہنچے
مدرسے میں کہاں اس زلف کا موضوع جدید
لوگ پہنچے تو روایات کہن تک پہنچے
راستہ ایک تھا ہم عشق کے دیوانوں کا
قد و گیسو سے چلے دار و رسن تک پہنچے
آئیں ہم دست درازی پہ تو میخانے سے
سلسلہ انجمن سرو سمن تک پہنچے
یوں سر راہ بھرے بیٹھے ہیں میکش کہ بہار
اب کے آئے تو سلامت نہ چمن تک پہنچے
آپ ہی آپ جو کھل جائے تیری زلف دراز
ناگہاں بے ہنری نقطۂ فن تک پہنچے

اے سخن فہم ہم بزم سے آئے ہیں جہاں
حیرت آئینہ اسلوب سخن تک پہنچے
اس طرح شوق غزالاں میں غزلخواں ہو ظفر
شہرت مشک غزل شہر ختن تک پہنچے

اٹھو زمانے کے آشوب کا ازالہ کریں
بنام لالہ رُخاں رخ سوئے پیالہ کریں
بیاد دیدۂ مخمور پُر پیالہ کریں
اٹھو کہ زہر کا پھر زہر سے ازالہ کریں
وہ رند ہیں نہ اٹھائیں بہار کا احساں
ورود ہم تری خلوت میں بے حوالہ کریں
کہاں کے دیر و حرم آؤ ایک سجدۂ شوق
بیاد ہوشربایان بست سالہ کریں
برس پڑے جو گلستاں میں اس نظر سے شراب
بہک بہک کے ہم آگے سبوئے لالہ کریں
سبو اٹھا کہ گدایان کوئے میخانہ
ترے حوالے مہ و مہر کا قبالہ کریں
اگر ہو گردش شام و سحر سے خدشۂ شر
ہم اس کو رو بروئے گردش پیالہ کریں
تلاش دوست سحر کو کریں سپرد نسیم
غزال صبح روانہ پس غزالہ کریں
اٹھو جلا کے مئے سرخ سے چراغ ابد
نشاط صحبت شب کو ہزار سالہ کریں
ادا وہ نیچی نگاہوں کی ہے کہ جیسے ''ظفر''
تلاش کنجِ غزالان خورد سالہ کریں

اٹھا ساغر کہ میخواروں کے آگے نہیں چلتی کسی کی طمطراق
سنبھل کر اے خزاں کے کاروانو بہاریں ہیں مرے ساغر میں باق
محبت کچھ سہی لیکن یہ شے ہے یکے از حادثات اتفاق

عزیزو ہم تو کیا باقی رہیں گے   رہے گا مہ وشوں کا نام باقی
''ظفر'' تیری غزل کیا تھی کہ اب تک   ہواؤں میں ہے آہنگ عراق

شب ہو گئی خنک جو اٹھی وہ نقاب رخ
موسم بدل گیا جو وہ زلف دوتا کُھلی
ڈالی خرابئ دو جہاں پر جو اک نظر
کیا کیا نہ سازش نگہ سرمہ سا کُھلی
پوچھیں گے ایک آہوئے رم خوردہ کا پتہ
ہم سے کبھی جو گردش دوراں ذرا کُھلی

آج اُن سے ہے ملاقات کا قصد   کچھ سر تختۂ گل طے ہوگا
حسن تھا میری نظر کی ایجاد   لوگ سمجھے کہ بڑی شے ہوگا
منزل شاھد و مے دُور سہی   واستہ رقص کناں طے ہوگا
آدمی اور نہ ہو تر دامن   یہ تقاضائے ازل ہے' ہوگا
آج دیوانوں کے درپے سہی عشق   کل تری زلف کے درپے ہوگا

یوں زندگی پہ میری نظر ہے کہ جسطرح   اک جسم مرمریں کے نشیب و فراز پر
سمجھیں گے مہ وشوں کو حقیقت پرست کیا   آؤ مری طرف کہ سند ہوں مجاز پر
وہ میں تھا مہ وشوں سے سلامت گزر گیا   یہ تجربہ کرو نہ کسی پاک باز پر

ذوق گل و سبو میں قباحت کی کیا ہے بات
ہم اس معاملے میں ذرا تیز ہی سہی
کچھ روندنے کو رند کے قدموں میں ڈال دو
کچھ بھی نہیں تو سطوت پرویز ہی سہی

ہمارے دوش پہ کھلتی تو تری زلف سے ہم
نسیم صبح کے لہجے میں گفتگو کرتے

اک سبو اور کہ لوح دل بے نوشاں پر کچھ نقوش سحر و شام ابھی باقی ہیں
سلسلہ سر مد و منصور کا منسوخ نہیں اور فہرست میں کچھ نام ابھی باقی ہیں

ہم دل زہرہ وشاں میں خالق اندیشہ ہیں
گو خراباتی سہی جبریل کے ہم پیشہ ہیں

رباعیات

زندہ ہوں طرب کی در کشائی کے لئے
صر صر ہوں چراغ پارسائی کے لئے
یہ میرا سبو بکف لرزتا ہوا ہاتھ
کافی ہے مشیت کی کلائی کے لئے

رندانہ ارادوں پہ اڑے رہتے ہیں
سبزے پہ سبو بکف پڑے رہتے ہیں
کیا موسم گل ہم سے کرے قصد گریز
ہم وقت کے ناکے پہ کھڑے رہتے ہیں

غنچوں کے سبو تہی کئے جاتا ہوں
پھولوں کی رگوں سے رس پئے جاتا ہوں
اے خالق حسن روک سکتا ہے تو روک
بہکا کے بہار کو لئے جاتا ہوں

سودائی دختران بتخانہ ہوں
شیدائی ہر نجمہ و ریحانہ ہوں
کیا شور فنا مجھکو جھنجوڑے گا کہ میں
پازیب کی جھنکار کا دیوانہ ہوں

یوسف ظفر

محمد یوسف نام ظفر تخلص ، یکم دسمبر ۱۹۱۴ء کو کوہ مری کی برفانی سر زمین میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے والد شرفائے شہر میں شمار ہوتے تھے اور شعر و سخن کا اعلیٰ ذوق رکھنے کے علاوہ شعر بھی کہتے تھے ۔ اس لحاظ سے گویا شاعری یوسف ظفر صاحب کو ورثے میں ملی ۔ آپ نے راولپنڈی میں پرورش پائی اور وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی ۔ ۱۹۲۷ء میں جب کہ آپ ساتویں جماعت کے طالب علم تھے آپ کے والد صاحب بیمار پڑے اور دو سال کی طویل علالت کے بعد ۱۹۲۹ء میں آن کا انتقال ہو گیا ۔ اس صدمے سے آپ کی ہمشیرہ کا بھی حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا ۔ بیک وقت یہ دو شدید روحانی صدمے یوسف ظفر کے لئے انتہائی تکلیف کا باعث ہوئے ۔ لیکن ساتھ ہی انہیں صدمات نے آپ کی شاعری کا سنگ بنیاد بھی رکھا ۔ کیونکہ زندگی میں سب سے پہلی نظم آپ نے اسی موقع پر کہی ۔

۱۹۳۶ء میں ظفر صاحب نے بی ۔ اے پاس کیا اور ۱۹۳۷ میں عملی زندگی کے میدان میں قدم رکھا ۔ اسی سال تلاش روزگار میں دھلی پہنچے لیکن بد قسمتی سے وہاں موصوف کو طویل ناکامیوں سے واسطہ پڑا حتیٰ کہ بھوک سے تنگ آکر آپ نے ہوٹل کے گائیڈ سے لے کر دیواروں پر اشتہار چپکانے تک کی ادنیٰ سے ادنیٰ ملازمتیں کیں ۔ اسی زمانہ میں حسن اتفاق سے حضرت جوش ملیح آبادی کے نیاز حاصل ہوئے ۔ جنھوں نے آپ کو ''کلیم'' کا منیجر مقرر کر دیا ۔ لیکن چند ماہ بعد یوسف ظفر صاحب اس ملازمت سے سبکدوش ہو کر لاھور چلے آئے اور نومبر ۱۹۳۸ میں صدر دفتر محکمہ نہر میں بطور کلرک ملازم ہو گئے پھر پورے پانچ سال بعد نومبر ۱۹۴۳ میں آپ کلرکی سے مستعفی ہو کر ''ھمایوں'' کی ادارت میں میاں بشیر احمد کے شریک کار بنے ۔ کئی سال تک یہ فرائض ادارت خوش اسلوبی سے سر انجام دینے کے بعد آپ نے ''ھمایوں'' سے بھی علیحدگی اختیار کر لی ۔ آجکل ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے متعلق ھیں ۔

یوسف ظفر صاحب ھند و پاکستان کے آن ان گنت نوجوانوں میں سے ھیں جنھیں زندگی کی تلخیوں کا احساس بچپن میں ھی ھو جاتا ھے اور جو اقتصادی خراب حالی کی بنا پر بچپن ھی سے جدوجہد کرکے روزی کمانے پر مجبور ھو جاتے ھیں ۔ آپ کے والد شیخ غلام رسول مرحوم اگرچہ ایک خوش حال اور فارغ البال انسان تھے مگر آن کی طویل بیماری اورکاروبار میں شدید نقصان کی بدولت اقتصادی تباھی نے آپ کو والدین کی مدد کے لئے سوچنے پر مجبور کر دیا چنانچہ آپ آن دنوں راولپنڈی کے گلی کوچوں میں رسالے اور کتابیں فروخت کرکے گھر کے اخراجات میں مدد کرتے رھے ۔ اس کے بعد دھلی

کے دوران قیام میں ''کلیم'' کی منیجری سے قبل جو کچھ آن پر بیتی ہے وہ بھی اظہر من الشمش ہے ۔ زندگی کے انہی ناگوار واقعات اور تلخ تجربات نے آپ کے احساسات میں شدت پیدا کر دی اور حسن اتفاق سے چونکہ شاعر ہیں اس لئے یہ شدت احساس آپ کی تمام شاعری پر محیط ہے ۔

یوسف ظفر صاحب اپنی شاعری کی ابتدا میں غزل گوئی کی طرف راغب تھے ۔ ''کلیم'' کی منیجری کے زمانے میں حضرت جوش ملیح آباد کے مشورے پر غزل کہنا تقریباً ترک کر دی اور تمام تر توجہ نظم کی طرف رہی لیکن ایک طویل عرصے کی نظم گوئی کے بعد آجکل پھر غزل کی طرف متوجہ ہیں ۔ تاهم آن کی فکر و فن کا اصل میدان نظم ہی ہے ۔ آپ لاہور کے ابتدائی دوران قیام میں احسان دانش اور میراجی سے برابر ملتے رہے اور آن کے اثرات بھی لئے لیکن آپ کی نظموں میں تقلید کی بجائے انفرادیت ہی رہی اور اسی انفرادیت کی بدولت آج آنہیں اردو کے نوجوان شعرا میں بھی ایک امتیازی مقام حاصل ہے ۔

یوسف ظفر صاحب شروع میں منظریہ نظمیں لکھتے رہے جن کا تمام تر تعلق مناظر فطرت سے ہوتا تھا ۔ بعد میں کلام میں جذبات کی ترجمانی اور حقیقت نگاری کا رنگ آبھرتا گیا۔ در اصل آپ کی جذبات نگاری بھی حقیقت نگاری سے کچھ مختلف نہیں ہے کیونکہ آپ کے جذبات زندگی کے حقائق اور تجربات ہی سے پیدا ہوتے ہیں ۔ یہی تجربات آپ کے احساسات کو بیدار کرتے ہیں اور زندگی کی تلخیاں تخیل کو تحریک دیتی ہیں جن کے سہارے آپ اپنی نظموں کا تانا بانا بنتے ہیں ۔ اسی بنا پر آپ کے کلام میں خلوص اظہار ' شدت احساس اور تفکر غالب ہے ۔ آپ نے نظم معریٰ میں بیشتر طبع آزمائی کی ہے ساتھ ہی جدید رجحانات کی نمائندگی میں نئی نئی ہیئتوں کے تجربے بھی ۔ ان تجربات میں رطب و یابس سب کچھ شامل ہے بالخصوص لب و لہجہ کی تلخی اور ابہام نے کہیں کہیں آپ کی نظموں میں شاعرانہ لطافتوں کا خون بھی کر دیا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ آن کے شاعرانہ محاسن کے مقابلے میں یہ فرو گذاشتیں لائق اعتنا نہیں ۔ آپ کے دو مجموعہ کلام '' زنداں '' اور ''زہر خند'' شائع ہو چکے ہیں ۔

انتخاب کلام

منظومات

الفاظ

انہیں الفاظ میں مدفون ہیں شاہوں کے ضمیر
انہیں الفاظ میں ملفوف ہے مذہب کا خدا
یہی الفاظ لئے بیٹھے ہیں پیمانوں میں
دوش کی لَے ' مئے امروز ' نشاط فردا

ایک لفظ اور حکومت کی کڑی زنجیریں
ایک لفظ اور حقارت کے سمندر کا جلال
ایک لفظ اور سکوت مہ و انجم ٹوٹے
ایک لفظ اور چھلک جائے شراب مہ و سال

مری آنکھوں میں اس اک لفظ کے روشن ہیں چراغ
جو ترے کانوں میں آویزہ بنے گاتا ہوا
ترے ایوان تصور میں مجھے لے جائے
ترے خوابوں کے حسیں پردوں کو سرکاتا ہوا

یہی اک لفظ اگر تجھ پہ عیاں ہو جائے
تیرے ہونٹوں کی حیابستہ ''نہیں'' ''ہاں'' ہو جائے

انجام

جبین شام پہ قشقہ جسے سمجھتا تھا
وہی ستارہ کہیں دور سے چمکتا تھا
شباب و حسن کی معصومیت شرار آمیز
کہ جھلملاتی ہوئی چشم انتظار آمیز
مری نگاہوں کا مرکز یہی ستارا تھا
اسی نے مجھ کو عطا کی تھی چاک دامانی
اسی نے میری محبت کا دل ابھارا تھا
اسی کی ایک عنایت ——— مری پریشانی
فضائے تار میں رہ رہ کے جھلملاتا رہا
مرے خیالوں میں غم کے دئے جلاتا رہا
مری نگاہوں میں تا دیر مسکراتا رہا
میں اس کی سمت بڑھا اور بے قرار بڑھا
چھپائے آنکھوں میں اک حشر انتظار بڑھا
بڑھا ——— کہ دل میں محبت کا اعتبار بڑھا
فسانۂ غم و الام بڑھ کے جا پہنچا ———
میں اس کی کرنوں کے زینوں پہ چڑھ کے جا پہنچا
میں اس کے ایک اشارے پہ بڑھ کے جا پہنچا

تخیّلات کے پر جوڑتا ہوا پہنچا
تمام تاروں سے منھ موڑتا ہوا پہنچا
تمام تاروں کا دل توڑتا ہوا پہنچا
مری رگوں میں شرارے تھے آنکھ میں تارے
ہر اک قدم کے تلے دم بخود تھے سیّارے
وہاں اڑا کہ جہاں ضبط حوصلہ ہارے
تو یہ کھُلا ہے کہ میری تمام گرم روی
مرے شباب کی اک نا مراد کاوش تھی
یہ تارہ بھی وہی بے نور ارض خاکی ہے
جہاں سے میں نے محبت کی ابتدا کی ہے

انصاف

(۱)

بادشاہوں کی حکومت کے فسانوں کے سوا
ان تواریخ کے اوراق میں کیا رکھا ہے
وہ حکومت جسے کمزور نے طاقت بخشی
جس نے کمزور کا خوں پینا روا رکھا ہے
جب بھی یہ شاہوں کے افسانے نچوڑے میں نے
ان سے بہتے ہوئے دیکھے ہیں لہو کے دریا
جب بھی اس ساز کو مضراب نظر سے چھیڑا
میرے کانوں نے سنا نغمۂ جام و مینا
تیری تاریخ نے دھرایا ہے جن قصوں کو
ان میں شاہوں کے سوا کوئی بھی انسان نہیں
وہی انسان کہ جس سے یہ شہنشاہی تھی
جن کی مٹی سے گزوں ابھری ہے یہ سطح زمیں
چھوڑ یہ شاہد و مینا و سبو کے قصے
دیکھ یہ ٹوٹے ہوئے جبڑے کئی صدیوں کے
یہی تاریخ ہے ان لوگوں کی —— یہ اونچے پہاڑ
ٹوٹے پھوٹے ہوئے یہ دانت ، یہ خم ندیوں کے

دیکھ یہ پشتے کہ ہے ان میں لہو پشتوں کا
دیکھ ان دانتوں کی ریخوں میں رگوں کے ریشے
ان کا صیقل عرق آلود جبینوں سے ہے
ان کے سینوں میں ابھی گونج رہے ہیں تیشے

ان میں اُن لوگوں کی تاریخ کے افسانے ہیں
کس طرح اُن کے گراں ڈیل قوی باہوں نے
توڑ دی تھیں یہ حدیں اور پھر اُن سے ڈر کر
کھولے تھے خیبر و بولان گزر گاہوں نے

آریاؤں کے جواں قافلے وہ آتے ہیں
کارواں بڑھتے ہیں دل توڑتے کہساروں کے
اُن کے قدموں کے دھماکوں سے دہلتے ہیں پہاڑ
اُن کی آنکھوں میں تصور ہیں سمن زاروں کے

(۲)

کتنے انسان ہیں گمنام گڑے مردوں میں
جن کے سانسوں نے تمدن کے جلائے تھے چراغ
اپنی تاریخ کے اوراق اُلٹ کر پھر دیکھ
دیکھ ! کیا اُن کا کہیں ملتا بھی ہے کوئی سراغ

سرمئی صدیوں کی محرابوں میں آویزاں ہیں
سیکڑوں شاہوں کی تصویروں کے فانوس دوام
جو مری پھونک ، بھی برداشت نہیں کر سکتے
اُن کے شعلوں میں کہاں نغمۂ ساز ایّام
ایک ہی نغمۂ جاوید ہے —— وہ نغمہ کہ جو
کسی شیشے نے جگایا ہے کسی پتھر میں
ورنہ یہ شاہ ، یہ دولت کے تراشے ہوئے بت
درحقیت ہیں اس افسانے کے پس منظر ہیں

کھلونے

چُنے میں نے موجوں سے موتی ، جواہر سے جیوتی ، بہاروں کے راگ
لئے میں نے خوشوں سے خوشبو کے توشے
اُلٹ کر نگاہوں سے راہوں کے گوشے

بڑھا میں — چلا میں لئے ساتھ ساون کی پروا ' چناروں کی آگ
بہاروں کے راگ
نہ کام آئے موجوں کے موتی ' جواہر کے جیوتی ' نہ خوشبو نہ راگ
مقدر میں پیہم نجوم ٭ شب غم
مسرت کا ماتم ' مصیبت کا عالم
وہ سارے خزینے خزاؤں نے چھینے کہ سینے میں ہے اب چناروں کی آگ
نہ خوشبو نہ راگ
ملیں غم کی موجیں' مصائب کی فوجیں' رگ و پے کے اندر سمندر کے راگ
حقائق کے زنداں میں حیراں پریشاں
تصور' تخیل ' تنفس سے نالاں
مجھی کو لگانے بجھانے کو پائی جہاں نے سہانے چناروں کی آگ
سمندر کے راگ
مگر تیرے دامن میں' پھولوں کے مسکن میں سنتا ہوں اکثر بہاروں کے راگ
٭ ترے نرم خوشے ' محبت کے توشے
مرے بھولے بھالے حسیں دل کے گوشے
مرے رنج و غم' تیرے فکر و الم کو دکھاتے ہیں آ کر چناروں کی آگ
ستاروں کی آگ

آزادی

ہر اک صدا میں گھلی ہوئی ہے' ہر اک نفس میں بسی ہوئی ہے
یہ کون ہے' کون ہے جو یوں میری زندگی میں رچی ہوئی ہے

کبھی بکھر کر ہر ایک جلوہ محیط ارض و سما ہوا تھا
کلی کے دامن میں گلستاں تھے' جبین شبنم پہ کھیلتا تھا
سحر کی کرنوں کا نور رنگیں' سحاب سیمیں میں دوڑتا تھا
جمیل شاموں کا لالہ گوں ریشمیں تبسم —— کہ رات آ کر
اسے گلوں میں سمو کے رکھ دے' اسے حسیں عارضوں میں بھر دے
اسے لبوں کی لچکتی قوسوں میں سجدہ گاہ حیات کر دے

کبھی سمٹ کر تمام راہیں کسی کی محفل کو جا رہی تھیں
نگاہیں محراب آرزو میں چراغ الفت جلا رہی تھیں

جمیل قوس و قزح کی لہریں رگوں میں وہ گیت گا رہی تھیں
جنہیں شب و روز سُن رہے تھے، جنہیں فضائیں بسا رہی تھیں
تمام خوابوں کی وادیوں میں، تمام جلووں کے قہقہوں میں
جنہیں مری جستجو نے پایا ہر ایک آواز کی تہوں میں

ہر اک صدا میں گھلی ہوئی ہے، ہر اک نفس میں بسی ہوئی ہے
یہ کون ہے، کون ہے جو یوں میری زندگی میں رچی ہوئی ہے؟

بکھر سمٹ کر میں اپنے زندان تیرہ و تار میں پڑا تھا
کبھی یہ آسیب دیکھتا تھا، کبھی وہ آواز سن رہا تھا
جو ڈس کے پھیلا رہی تھی خوں میں وہ زہر جس کی دوا نہیں تھی
مگر کوئی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ یہ مری انتہا نہیں تھی
میں اپنے زندان تیرہ و تار میں یہ محسوس کر رہا تھا
کہ اک بہار اس طلسم قاتل کو آ کے پل میں شکست دے گی
کہ اک سحر ان اتھاہ تاریکیوں سے مجھ کو رہا کرے گی

تمام راہوں میں میرے نغمے گداز شعلوں کا روپ لے کر
حسیں ستاروں کی آنچ کھا کر، جمیل چہروں کی دھوپ لے کر
نئی پھواروں کی جھلملاہٹ میں اس طرح رقص کر رہے ہیں
کہ ہر طرف قہقہوں کی بارش ہے، پھول ہر سو بکھر رہے ہیں
مگر مرے لب پہ گفتگو ہے اسی کی جس نے رہا کیا تھا
مگر مجھے جستجو ہے اس کی جو اس طرح مسکرا دیا تھا
کہ جیسے اب میری زندگی کی خوشی فسون دوام ہوگی
کہ جیسے اب صبح صبح بن کر رہے گی، اور شام شام ہوگی

یہ کون ہے، کون ہے جو یوں میری زندگی میں رچی ہوئی ہے
ہر اک صدا میں گھلی ہوئی ہے، ہر اک نفس میں بسی ہوئی ہے

تغزل

نگہ التفات ! کیا کہنا　　لاکھ شکوے زباں تک آئے ہیں
اے خوشا آرزوئے منزل دوست　　راستے گمرہاں تک آئے ہیں
تو کہاں ہے کہ تیرے دیوانے　　روش کہکشاں تک آئے ہیں
نارسائی سی نارسائی ہے　　لوگ وہم و گماں تک آئے ہیں
کن بہاروں کی یاد آئی تھی　　کہ درِگلستاں تک آئے ہیں
گھٹتے گھٹتے غمِ محبت سے　　ہم غمِ دو جہاں تک آئے ہیں

مرحلے کٹ ہی جائیں گے اک دن
جب ''ظفر'' ہم یہاں تک آئے ہیں

زیست کو جب ترا کرم جانا　　ہم نے ہر غم کو مغتنم جانا
ہے مبارک یہ گردش پیہم　　موت سے حادثوں کا تھم جانا
زندگی ہر قدم پہ بدلے گی　　زندگی بھر قدم قدم جانا
کوئی تو بات یاد آئی ہے　　ورنہ یوں آنسوؤں کا تھم جانا

ہے رسا بخت نارسائے ''ظفر''
آپ نے درخورِ ستم جانا

قتیل شفائی

اورنگ زیب خان اصلی اور قتیل شفائی ادبی نام ہے ۔ قتیل تخلص کرتے ہیں ۔ آپ دسمبر ۱۹۱۹ء میں تحصیل ہری پور ضلع ہزارہ میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم اسلامیہ مڈل اسکول راولپنڈی میں حاصل کی اس کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل ہوئے لیکن ۱۹۳۵ء میں والد کے فوت ہو جانے اور کوئی سرپرست نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رہ سکی ۔ والد صاحب کا چمڑے کا کاروبار تھا اس لئے کافی پیسہ تھا اور دن اچھے گزر رہے تھے ۔ والدہ کو کسی نے مشورہ دیا کہ لڑکے کو بھی کاروبار میں لگاؤ چنانچہ ہری پور میں اسپورٹس کے سامان کی دوکان کھول دی گئی ۔ لیکن نا تجربہ کاری کے باعث کامیاب نہ ہوئے اور دوکان بند ہوگئی ۔ اس کے بعد پھر ایک دو تجارتی مشغلے اختیار کئے لیکن جب ان میں بھی ناکامی ہوئی تو قتیل صاحب نے ملازمت کی تلاش شروع کی ۔ اس سلسلے میں وہ پہلے چونگی میں قلیل تنخواہ پر ملازم ہوئے پھر ''مری ٹرانسپورٹ'' میں بکنگ کلرک اور بعد میں منیجر ہو گئے اور تنخواہ بھی معقول ملنے لگی مگر ایک تو یہ کام خلاف مذاق تھا دوسرے اس میں صبح سے شام تک مصروفیت رہتی تھی اس لئے آپ چودھری برکت علی مرحوم کے ایما پر ''ادب لطیف'' کی ادارت کے لئے لاہور آ گئے اور فکر تونسوی کے ساتھ مل کر چند ماہ تک ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے ۔ لیکن یہ کام تین ماہ سے زیادہ نہ چل سکا اور ۱۹۴۶ء میں قتیل صاحب واپس راولپنڈی چلے گئے ۔ یکم جنوری ۱۹۴۷ء کو لاہور میں آپ کی فلمی زندگی کا آغاز ہوا ۔ چنانچہ جب سے فلمی گیت لکھنا ہی آپ کا ذریعہ معاش ہے ۔

قتیل صاحب نے بقول خود کبھی روائتی اصلاح تو اپنے کلام پر لی نہیں ۔ تاہم ابتدا میں انھوں نے جو چیزیں لکھیں وہ حکیم یحییٰ شفا کانپوری ، جنکی نسبت سے وہ ''شفائی'' کہلاتے ہیں ، کو دکھائیں اور انھوں نے چند غزلوں پر اصلاح بھی دی ۔ اس کے بعد انھوں نے جو کچھ بھی لکھا وہ احمد ندیم قاسمی صاحب کو مشورے کے لئے بھیج دیا ۔ چنانچہ ان دوستانہ مشوروں سے قتیل صاحب نے بہت فائدہ حاصل کیا ۔

قتیل صاحب کی شاعری کی ابتدا گو غزل سے ہوئی اور آج بھی وہ غزلیں کہتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ بنیادی طور پر وہ غنائی شاعر ہیں ۔ جس کے ثبوت میں ان کے گیتوں کا مجموعہ ''ہریالی'' پیش کیا جا سکتا ہے ۔ گیتوں میں انھوں نے عشق ومحبت

کے ھلکے سے ھلکے اور گہرے سے گہرے نقوش کو ایسی صناعی ، چابکدستی اور حسن و خوبی کے ساتھ ھلکے پھلکے اور رقصاں و لرزاں الفاظ میں پیش کیا ھے کہ اردو ادب میں گیتوں کی افسوسناک کمی کا احساس نسبتاً کم ھونے لگتا ھے اور بقول احمد ندیم صاحب ''یہ ھلکے پھلکے ، ننھے گیت ستاروں کی طرح خوبصورت اور پھولوں کی طرح نرم و نازک ھیں ۔ گیت کہنے کے لئے جس بے پایاں مہارت اور زبان و بیان کی جس تکمیل اور رفعت کی ضرورت ھوتی ھے وہ قتیل میں بدرجۂ اتم موجود ھے اور اسی لئے یہ گیت حفیظ ، تاثیر ، ساغر اور اندر جیت شرما کے گیتوں کے ھمراہ اردو ادب میں ایک معتدبہ اضافہ کا باعث ھیں'' اور غالباً غنائی کیفیات سے فطری مناسبت ھی کا یہ نتیجہ ھے کہ گیتوں کے علاوہ اُن کی ابتدائی نظموں میں بھی حسن و عشق کے مروجہ افسانوں کی تکرار پائی جاتی ھے ۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ قتیل شفائی صاحب نے زندگی کے دوسرے موضوعات کو ھاتھ ھی نہیں لگایا ۔ اُن کی بعد کی منظومات میں دور حاضر کے سماجی ، نفسیاتی اور کبھی کبھی سیاسی مسائل پر ایسے لطیف طنزیہ پیرائے میں اظہار خیال ملتا ھے کہ اس ھونہار شاعر کے موضوع و بیان کے ضمن میں ایسی زقند بھرنے کو پڑھنے والا قدرے حیرت سے دیکھنے لگتا ھے ۔ اس میں شک نہیں کہ رومانی ناکامی ھی نے شاعر کو سیاست اور سماج کا باغی بنا دیا ھے لیکن اس سے ایک فائدہ یہ ھوا ھے کہ اُن کی انقلابی شاعری میں خلوص کی کارفرمائی ھے اور اُن کی اپنی محرومی و نا آسودگی صرف اُنھیں کی ذات تک محدود نہیں رھتی بلکہ اُس میں ایک کائناتی دکھ اور محرومی کی کیفیت پیدا ھو جاتی ھے ۔ اس سلسلے میں اُن کی ''ایکٹریس'' ''البم'' ''بانجھ'' ''آج اور کل'' ''مشورہ'' ''بازار'' ''جشن آزادی'' وغیرہ نظمیں قابل مطالعہ ھیں ۔

اب رھیں اُن کی غزلیں تو اس قدیم صنف شعر میں بھی اُنھوں نے اپنے تخئیل کی جولانی سے نئے شگوفے کھلائے ھیں بالخصوص تسلسل خیال اور سادگی و پرکاری کے اعتبار سے اُن کی غزلیں بڑی اچھی ھیں ۔ پھر لطف یہ ھے کہ اُن کی غزلوں میں حقائق حیات ایسی آسان زبان اور ایسے موسیقانہ ، مترنم اور رواں انداز میں ادا کئے گئے ھیں کہ وہ نئے تقاضوں سے ھم آھنگ ھونے کے باوجود سلاست ، روانی اور ترنم کی خصوصیات سے محروم نہیں ھونے پاتیں ۔ غرض نئے کہنے والوں میں قتیل ایک کامیاب شاعر ھیں ۔ اگر اُنھوں نے اپنی موجودہ فنی ریاضت جاری رکھی تو بلا شبہ وہ ایک خاص اسلوب اور خاص مرتبے کے شاعر ھونگے ۔ لیکن اگر وہ انفرادی صدمے ھی کو لئے بیٹھے رھے تو اُن کی شاعری میں وہ کیفیت معدوم ھو جائے گی جو فنکار کی تخلیق کو انسان کا اثاثہ بنا دیتی ھے ۔ اب تک آپ کے تین مجموعہ کلام ''ھریالی'' ''گجر'' ''جلترنگ'' شائع ھو چکے ھیں ۔ اور ایک چھوٹا سا مجموعہ ''بازار'' زیر اشاعت ھے ۔

انتخاب کلام

گیت

دیکھو دیکھو ہریالی

دیکھو دیکھو ہریالی او مالی
رت آئی ہے متوالی او مالی
جھوم رہی ہے ڈالی ڈالی
کلی کلی ہے مد کی پیالی
جگنو چمکیں یوں پیڑوں پر
جیسے آئی دیوالی او مالی
دیکھو دیکھو ہریالی او مالی
چاند کی اوس کو چومیں
تارے سے نینوں میں گھومیں
ہر کیاری آکاش بنی ہے
پہلے تھی جو مٹیالی او مالی
دیکھو دیکھو ہریالی او مالی
پھول کھلے ہیں پیارے پیارے
بھنورا گونجے دوارے دوارے
لوٹ نہ لے پھولوں کا جوبن
کرنا ان کی رکھوالی او مالی
دیکھو دیکھو ہریالی او مالی

منزل کو پہچان

منزل کو پہچان
مسافر
منزل کو پہچان
کتنی آڑی ترچھی راہیں
دیکھیں گی مایوس نگاہیں

لانا مت ہونٹوں پر آہیں
یہ نہیں تیری شان
مسافر
منزل کو پہچان

پھاند کے پربت بڑھتے جانا
دریاؤں کو بوند بنانا
صحراؤں کی خاک اُڑانا
بن جا طوفان
منزل کو پہچان

بجلی کڑکے، آندھی آئے
ساری دنیا پلٹا کھائے
دھرتی پانی میں بہہ جائے
ہار نہ پھر بھی سان
مسافر
منزل کو پہچان

منظومات

آج اور کل

جب چھلکتے ہیں زر و سیم کے گاتے ہوئے جام
ایک زہر اب سا ماحول میں گُھل جاتا ہے
کانپ اٹھتا ہے تہی دست جوانوں کا غرور
حسن جب ریشم و کمخواب میں تل جاتا ہے

میں نے دیکھا ہے کہ افلاس کے صحراؤں میں
قافلے عظمت احساس کے رک جاتے ہیں
بیکسی گرم نگاہوں کو جھلس دیتی ہے
دل کسی شعلۂ زر تاب سے پُھک جاتے ہیں

جن اصولوں سے عبارت ہے محبت کی اساس
ان اصولوں کو یہاں توڑ دیا جاتا ہے

اپنی سہمی ہوئی منزل کے تحفظ کے لئے
رہگزاروں میں دھواں چھوڑ دیا جاتا ہے

میں نے جو راز زمانے سے چھپانا چاہا !
تو نے آفاق پہ اس راز کا در کھول دیا
میری باھوں نے جو دیکھے تھے سنہرے سپنے
تو نے سونے کی ترازو میں انھیں تول دیا

آج افلاس نے کھائی ھے زر و سیم سے مات
اس میں لیکن ترے جلووں کا کوئی دوش نہیں
یہ تغیّر اسی ماحول کا پروردہ ھے
اپنی بے رنگ تباھی کا جسے ھوش نہیں

رہگزاروں کے دھندلکے تو ذرا چھٹ جائیں
اپنے تلووں سے یہ کانٹے بھی نکل جائیں گے
آج اور کل کی مسافت کو ذرا طے کر لیں
وقت کے ساتھ ارادے بھی بدل جائیں گے

بانجھ

کتنے ھی سال ستاروں کی طرح ٹوٹ گئے
مری گودی میں کوئی چاند جنم لے نہ سکا
ٹکٹکی باندھ کے افلاک پہ روئی برسوں
آج تک کوئی بھی واپس مرا غم لے نہ سکا

وہ زمیں جو کوئی پودا نہ اُگل سکتی ھو
قاعدہ ھے کہ اسے چھوڑ دیا جاتا ھے
گھر میں ھر روز یہی ذکر یہی شور سنا
شاخ سوکھے تو اسے توڑ دیا جاتا ھے

مجھے باھوں پہ اٹھا لے ، مجھے مایوس نہ کر
اپنے ھاتھوں کی لکیروں میں سجا لے مجھ کو

اپنے احساس کے صلے میں مرا جوبن لے لے
(کر دیا سب نے مقدر کے حوالے مجھ کو)

ایک، دو، تین، ــــ کہاں تک کوئی گنتا جائے
ان گنت سانس مہکتے ہیں مرے سینے پر
مرے لب پر کوئی نغمہ، کوئی فریاد نہیں
لوگ انگشت بدنداں ہیں مرے جینے پر

کتنے ہاتھوں نے ٹٹولا مری تنہائی کو
کوئی جگنو، کوئی موتی، کوئی تارا نہ ملا
کتنے جھولوں نے جھلایا مرے ارمانوں کو
دل میں سوئی ہوئی ممتا کو سہارا نہ ملا

کل بھی خاموش تھی میں، آج بھی خاموش ہوں میں
میرے ماحول میں طوفان نہ آیا کوئی
کتنے ارمان مٹے ایک تمنا کے لئے
گھر لٹانے پہ بھی مہمان نہ آیا کوئی

کتنے ہی سال ستاروں کی طرح ٹوٹ گئے

جشن آزادی

مینہ برستا ہے تو دھرتی کی نظر جھومتی ہے
پھول کھلتے ہیں تو گلشن پہ نکھار آتا ہے
لیکن اے جشن بہاراں کے نئے منتظمو!
خود فریبی سے کہیں دل کو قرار آتا ہے

تم اگر جشن بہاراں بھی کہو گے اس کو
موت کے گھاٹ یہ دھوکا بھی اتر جائے گا
باد صرصر کو اگر تم نے کہا موج نسیم،
اس سے موسم میں کوئی فرق نہیں آئے گا

یہ گلستاں، یہ گلستاں میں سسکتے غنچے
اپنے اعمال کے پردے میں انہیں ڈھانپ تو لو
اقتدار آج بھی سر گرم سفر ہے لیکن
بے نواؤں کے ارادوں کو ذرا بھانپ تو لو

آج انسان کی عظمت نے کیا ہے اعلان
خود فریبی سے کوئی جی کو نہ بہلائے گا
جب تک آرائش گلزار نہیں ہو جاتی
کسی کونپل کسی غنچے کو نہ چین آئے گا

لیکن اے جشن بہاراں کے نئے منتظمو
یہ تماشا ہمیں بے کار نظر آتا ہے
مینہ برستا ہے نہ دھرتی کی نظر جھومتی ہے
پھول کھلتے ہیں نہ گلشن پہ نکھار آتا ہے

غزلیات

سایۂ زلف سیہ فام کہاں تک پہنچے
جانے یہ سلسلۂ شام کہاں تک پہنچے
دور آفق پار سہی ، پا تو لیا ہے تجھ کو
دیکھ ہم سے کے ترا نام کہاں تک پہنچے
نہ کہیں سایۂ گل ہے، نہ کہیں ذکرِحبیب
اور اب گردش ایام کہاں تک پہنچے
ہم تو رسوا تھے مگر آنکی نظر بھی نہ بچی
ہم پہ آئے ہوئے الزام کہاں تک پہنچے
آن کی آنکھوں کو دئے جو مری آنکھوں نے
کس سے پوچھوں کہ وہ پیغام کہاں تک پہنچے

صدمے جھیلوں جان پہ کھیلوں اس سے مجھے انکار نہیں
لیکن تیرے پاس وفا کا کوئی بھی معیار نہیں
ایک ذرا سا دل ہے جس کو توڑ کے بھی تم جاسکتے ہو
یہ سونے کا طوق نہیں ، یہ چاندی کی دیوار نہیں
قید قفس کے بعد کرے گا قید گلستاں کون گوارا
اب بھی وہی زنجیریں ہیں گو پہلی سی جھنکار نہیں

وصل کی رات نہ جانے کیوں اصرار تھا آن کو جانے پر
وقت سے پہلے ڈوب گئے تاروں نے بڑی دانائی کی

اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

گنگناتی ہوئی آتی ہیں فلک سے بوندیں کوئی بدلی تری پازیب سے ٹکرائی ہے

اک دھوپ سی جمی ہے نگاہوں کے آس پاس
یہ آپ ہیں تو آپ پہ قربان جائیے
کچھ کہہ رہی ہیں آپ کے سینے کی دھڑکنیں !
میرا نہیں تو دل کا کہا مان جائیے

یہ دل ، ذرا سا دل تری یادوں میں کھو گیا
ذرّے کو آندھیوں کا سہارا ہے ان دنوں
شمعوں میں اب نہیں ہے وہ پہلی سی روشنی
کیا واقعی وہ انجمن آرا ہے ان دنوں

ترے ستم کے قرینے کہاں کہاں نہ ملے
بھنور کے ساتھ سفینے کہاں کہاں نہ ملے
بنے فلک پہ ستارے تو آنکھ میں آنسو !
وہ غم دئے جو کسی نے کہاں کہاں نہ ملے
جبین گل پہ ہے لرزاں ستارۂ شبنم
ندامتوں کے پسینے کہاں کہاں نہ ملے

خیال و خواب سے چل کر شعور تک پہنچے
تری تلاش میں ہم دور دور تک پہنچے
مذاق اہل نظر سے نہ کوئی کھیل سکا
پہنچنے والے غیاب و حضور تک پہنچے
"قتیل" اس کی مروّت کا کیا ٹھکانا ہے
وہ اک نظر جو دل نا صبور تک پہنچے

احترام لب و رخسار تک آ پہنچے ہیں
بوالہوس بھی مرے معیار تک آ پہنچے ہیں
جو حقائق تھے وہ اشکوں سے ہم آغوش ہوئے
جو فسانے تھے وہ سرکار تک آ پہنچے ہیں
اب تو کھل جائے گا شاید تری اُلفت کا بھرم
اہل دل جرأت اظہار تک آ پہنچے ہیں

وہی گیسوؤں کی اُڑان ہے، وہی عارضوں کا نکھار ہے
یہ کسی کی شان ورود ہے کہ میری نظر کا وقار ہے
مری سادگی کے خلوص نے تجھے بخش دی وہ برہنگی
جو نفس نفس کی ہے تشنگی، جو نظر نظر کی پکار ہے
غم ذات سے مری زندگی غم کائنات میں ڈھل گئی
کسی بزم ناز میں کھو کے بھی مجھے کائنات سے پیار ہے

جمیل الدین عالی

مرزا جمیل‌الدین احمد نام عالی تخلص، یکم جنوری سنه ۱۹۲۶ء کو دهلی میں پیدا هوئے ۔ آبائی وطن لوهارو هے اور لوهارو کے بهی آپ اس معزز و معروف گهرانے سے تعلق رکهتے هیں جو اردو داں طبقه میں عرصه سے متعارف و مشهور چلا آتا هے ۔ یعنی وهی نوابان لوهارو کا خاندان جس کی سخن دانی و سخن فهمی سے زیاده سخن پروری نے مرزا غالب جیسے همه داں شخص کے دل میں نه صرف گهر کیا بلکه آسے همیشه کے لئے اپنا گرویده بنا لیا ۔ چنانچه یہی وجه هے که غالب نے اپنے رقعات میں جہاں کہیں اس خاندان کے افراد کا ذکر کیا هے نہایت شیفتگی و محبت سے کیا هے ۔ عالی صاحب کے والد امیرالدین احمد خاں فرخ مرزا مرحوم نواب علاؤالدین احمد خاں علائی کے صاحبزادے تهے اور آن کی والده ماجده سید ناصر وحید مرحوم نبیرهٔ خواجه میر درد دهلوی کی صاحبزادی هیں ۔ اس طرح گویا شعر و شاعری کا ذوق عالی صاحب کو صحیح معنوں میں ورثے میں ملا هے یا یوں کہئیے که شعر گوئی آن کی خاندانی روایات میں سے هے ۔

حضرت عالی نے تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد عربک کالج دهلی سے بی ۔ اے ۔ کیا ۔ قیام پاکستان کے بعد آپ ترک وطن کر کے کراچی چلے آئے اور یہاں پر ابتداً کسی اور محکمه میں ملازم رهے پهر افسر انکم ٹیکس کی حیثیت سے آپ کا تقرر هو گیا ۔ چنانچه تا ایں دم آپ کراچی هی میں مقیم اور اسی عہدے پر فائز هیں ۔ جہاں تک شعر و سخن کا تعلق هے موصوف بچپن سے شعر کہتے هیں ۔ سنه ۱۹۳۹ء میں نواب سراج‌الدین احمد خاں سائل مرحوم کی خدمت اختیار کی اور آن کی ادبی صحبتوں سے فیضیاب بهی هوئے مگر شرف تلمذ حاصل نه کر سکے ۔

عالی صاحب شروع سے هی غزل میں زیاده دلچسپی لیتے رهے هیں لیکن اس کے ماسوا آنہوں نے گیت اور دوهے بهی کہے هیں ۔ آن کی دوها نگاری کا آغاز سنه ۱۹۴۷ء سے هوا اور جب سے برابر وه دوهے لکھ رهے هیں ۔ اس میں شک نہیں که اردو میں دوهے اور بهی کئی شاعروں نے کہے هیں بالخصوص مقبول حسین احمد پوری کے دوهوں میں تو بڑا رس اور نکهار پایا جاتا هے لیکن عالی صاحب کا ایک امتیاز اس باب میں یه هے که اس صنف سخن کو وه مستقل طور پر اپنا رهے هیں ۔ اور اس میں رومانی جذبات سے قطع نظر زندگی کے دیگر مسائل کو بهی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نظم کرتے هیں ۔ اردو میں دوهے هندی شاعری سے آئے هیں بنا بریں ان میں هندی کے الفاظ، فقرے اور تراکیب کا استعمال بهی هوتا هے اور لب و لہجے کے اعتبار سے بهی یه هندی شاعری سے بہت کچھ ملتے جلتے هیں ۔ عالی صاحب کے دوهوں میں هندی شاعری کے یه اثرات تو هیں هی اس کے علاوه موضوع اور طرز ادا کے اعتبار سے بهی ان میں خاصا تنوع اور دلکشی پائی جاتی هے ۔ چنانچه ان خصوصیات کے پیش نظر یه بات بلا خوف تردید کہی

جا سکتی ہے کہ اگر اُن کی توجہ اس صنف سخن کی طرف برابر مبذول رہی تو مستقبل قریب میں وہ اس میں ضرور ایک انفرادیت پیدا کر لیں گے ۔

جہاں تک اُن کی غزل گوئی کا تعلق ہے خود اُن کی ایک غزل کا مطلع ہی اُس پر بہترین تبصرہ ہے'

مری نوائے محبت نہ پست نہ تیز   بس اک رچی ہوئی کیفیت الم انگیز

اُن کی غزلوں میں اس نوائے محبت کی گونج اور درد و الم کی کسک صاف جھلکتی ہے ۔ تا ہم وہ ابھی اپنے فن میں کوئی جدت یا اُپج نہیں پیدا کر سکے ہیں ۔ اُن کے یہاں اچھے اشعار بھی ملتے ہیں مگر یہ احساس نہیں ہوتا کہ جس طرح اُنھوں نے کسی چیز کو دیکھا ہے اس طرح کوئی اور نہیں دیکھ سکا ۔ اور دیانت داری کی بات یہ ہے کہ ہماری اُن سے اس طرح کی توقع وابستہ کرنا بھی قبل از وقت ہو گا چونکہ ابھی تو اُن کی اور اُن کی شاعری دونوں کی عمر ہی کیا ہے ۔ بایں ہمہ اُن کا کلام احساس کی شدت ' فکر کی گرمی اور انداز بیان کی دلکشی سے مالا مال ہے ۔ پھر چونکہ وہ اہل زبان ہیں اور حضرت سائل دھلوی جیسے کہنہ مشق اُستاد کی صحبت اُٹھائے ہوئے ہیں اس لئے اُن کے کلام میں زبان و بیان کا حسن بھی کار فرما ہے ۔

غرض پچھلے چند سالوں میں اُردو شاعری میں جو نئی پود پروان چڑھی ہے اُس میں مرزا جمیل‌الدین عالی ایک ہونہار شاعر کی حیثیت سے اُبھرے ہیں ۔ اور اُن کے فن میں ترقی کے بڑے امکانات ہیں ۔ خدا کرے کہ آئندہ اُن کی شاعری کے یہ امکانات پورے ہوں اور اُس میں فکر و فن کی وہ گہرائی و گیرائی پیدا ہو جائے جو شعر میں سحر و اعجاز کی خصوصیت پیدا کرتی اور اُسے لافانی بناتی ہے ۔ موصوف کا مجموعہ کلام زیر اشاعت ہے اور اُن کا وہ طویل منظوم ڈرامہ ''انسان'' بھی علیحدہ کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے جو ''نیا دور'' اور ''ماہ نو'' میں بالاقساط چھپ کر مقبول ہو چکا ہے ۔

انتخاب کلام

غزلیات

کسی کو ناز خرد ہے کسی کو فخر جنوں
میں اپنے دل کا فسانہ کہوں تو کس سے کہوں
نہ اضطراب میں لذت نہ آرزوئے سکوں
کوئی کہے کہ میں اب کیا فریب کھا کے جیوں
ترے لئے مرا ذوق وفا ہے صرف جنوں
مرے لئے ترا حسن و جمال روز افزوں

نظر نظر میں جوانی کے لاکھ افسانے
ادا ادا میں تغزل کے سیکڑوں مضموں
رہے گی پھر نہ یہ کیفیت طلب اے دل
چھپے ہوئے ہیں تو ہے اشتیاق دید فزوں

جس انجمن سے ہوا قصۂ جنوں آغاز
وہیں کبھی نہ کہا ، گو کہاں کہاں نہ کہا
ترے کرم کو کرم ہی کہا ستم کو ستم
زہے خلوص تمنا کہ امتحاں نہ کہا
ہمیں بھی ندرت اسلوب تھی عزیز مگر
انھیں جہاں ہی پکارا غم جہاں نہ کہا

ہزار ہنستی ہوئی صورتیں نظر آئیں
مگر ہر ایک تبسّم کی لو تھی اشک آمیز
ہر ایک یورش دوراں کو سہ رہی ہے حیات
ہزار بار چھلک کر بھی جام ہے لبریز
کبھی وصال کے لمحوں میں سوز محرومی
کبھی فراق کی راتیں بھی انبساط آمیز

بہت دنوں سے مجھے تیرا انتظار ہے آ جا
اور اب تو خاص وہی موسم بہار ہے آ جا
کہاں یہ ہوش کہ اسلوب تازہ سے لکّھوں
کہ روح تیرے لئے سخت بیقرار ہے آ جا
بدل رہا ہے زمانہ مگر جہان تمنا
ترے لئے تو ابد تک بھی سازگار ہے آ جا

اب یہ کیفیت دل ہے کہ چھپائے نہ بنے
اور جو وہ پوچھیں کہ کیا ہے تو بتائے نہ بنے
تو نے کیوں ان کو غم زیست دیا ہے یا رب
جن سے اک رنج محبت بھی اٹھائے نہ بنے

تم کو آزردگئی دل کا مزا کیا معلوم
کاش تم سے بھی کوئی کام بنائے نہ بنے
ھائے کیا پاس محبت ہے کہ تنہائی میں
اشک آنکھوں میں رہے اور بہائے نہ بنے
یہ بھی اک رسم تماشا ہے وہاں اے ''عالی''
دیکھتے رہئے مگر آنکھ اٹھائے نہ بنے

ہم مٹ گئے اس فطرت آشفتہ کی خاطر
حالانکہ وہ غارتگر جاں کچھ بھی نہیں ہے
جیتا ہوں تو پابندئی ہر رسم جہاں ہے
یوں میرے لئے سارا جہاں کچھ بھی نہیں ہے
یہ عشق کہ ظاہر ہو تو ہل جائیں دو عالم
جز چند اشارات نہاں کچھ بھی نہیں ہے
دل والوں کو دل والوں سے ہے حرف و حکایت
ظاہر میں محبت کا نشاں کچھ بھی نہیں ہے
مجھ خوگر بیگانگئی دوست کو ''عالی''
بیگانگئی اہل جہاں کچھ بھی نہیں ہے

کسی مقام پہ راز چمن نہیں کھلتا
بڑھا رہی ہے جنوں کو خرد کی گہرائی
تجھے تو کیسے بتاؤں کہ خود بھی یاد نہیں
کہاں کہاں کی ترے غم نے خاک چھنوائی
رکی نہ یورش غمہائے روزگار کہیں
ہزار سوز محبت نے آگ برسائی
خوشا نگاہ محبت کہ بار بار نگاہ
بہ اشتیاق گئی اور بہ اضطراب آئی
کرشمہ ھائے دل سادہ کیا بیاں کیجئے
اسی پہ قصر تمنا ' یہی تمنائی
اس التفات کو نا پائدار کہہ کہہ کر
سلجھ رہی تھی جو گتھی وہ اور الجھائی

دوہے

گھنی گھنی یہ پلکیں تیری یہ گرماتا روپ
تو ہی بتا او نار میں تجھ کو چھاؤں کہوں یا دھوپ

ساجن ہم سے ملے بھی لیکن ایسے ملے کہ ہائے
جیسے سوکھے کھیت سے بادل بن برسے اُڑ جائے

کدھر ہیں وہ متوارے نیناں کدھر ہیں وہ رتنار
نس نس کھنچے ہے تن کی جیسے مدرا کرے اُتار

جنم مرن کا ساتھ تھا جن کا آنہیں بھی ہم سے بیر
واپس لے چل اب تو ''عالی'' ہو گئی جگ کی سیر

گت میں چندن باس کا جھونکا' توڑ میں کندن روپ
نیچے سُر میں چھاؤں بھری ہے اونچے سُر میں دھوپ

اک اک تال کھرچ لے من کو اک اک سُر پر پیاس
اک اک مُرکی بدن جلائے جیسے آگ پہ گھاس

کیسے کیسے دئے جلے پھر وہی رہا اندھیر
بڑے بڑے وہی ڈوری پکڑے چھوٹوں کے وہی پھیر

تہ میں بھی ہے حال وہی جو تہ کے اوپر حال
مچھلی بچ کر جائے کہاں جب جل ہی سارا جال

روٹی جس کی بھینی خوشبو ہے ہزاروں راگ
نہیں ملے تو تن جل جائے' ملے تو جیون آگ

نہ کوئی اس سے بھاگ سکے اور نہ کوئی اس کو پائے
آپ ھی گھاؤ لگائے سمے اور آپ ھی بھرنے آئے

اگنی سی ھے روئیں روئیں میں نس نس دکھ سے چور
"عالی" ھم پر جیون کا جو وار پڑا' بھر پور

گیت

پھر اُس سے ملیں
جس کی خاطر
بدنام ھوئے

تھے خاص بہت اب تک عالی
اب عام ھوئے
بدنام ھوئے

دو لمحے چاندنی راتوں کے
دو لمحے پیار کی باتوں کے
الزام ھوئے
بدنام ھوئے

یوں تو نہ گئی واں کوئی خبر
پر آھوں کے خاموش اثر
پیغام ھوئے
بدنام ھوئے

یوں تو نہ دئیے کچھ سکھ ھم کو
پر اُن سے جو پہنچے دکھ ھم کو
انعام ھوئے
بدنام ھوئے

جب ھونے لگے یہ حال اپنے
سب روشن صاف خیال اپنے
ابہام ھوئے
بدنام ھوئے

نذیر میرزا برلاس

نذیر حسن میرزا نام اور برلاس خاندانی لقب ہے ۔ نذیر تخلص کرتے ہیں ۔ آپ نے یکم نومبر ۱۹۰۸ء کو جہلم سے جنوب کی طرف آٹھ میل دور قصبہ سنگھوئی کے ایک معزز علمی گھرانے میں جنم لیا اور اس گھرانے کی علمی و ادبی روایات ورثے میں پائیں ۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیمی مراحل سے گزرنے کے بعد علوم مشرق کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی پھر اردو اور فارسی میں مزید تعلیم حاصل کرکے پہلے فارسی میں اور اس کے کافی عرصہ کے بعد غالباً ۱۹۵۲ء میں اردو میں ایم ۔ اے کیا ۔ نذیر میرزا برلاس صاحب کو درس و تدریس سے خاص شغف ہے چنانچہ اسی جذبہ کے تحت آپ بی ۔ ٹی کرکے ۱۹۲۹ء میں محکمہ تعلیم صوبہ سرحد سے وابستہ ہوگئے ۔ ۱۹۳۶ء میں کابل کے برطانوی سفارت خانہ میں کچھ عرصہ میر منشی رہے ۔ ۱۹۴۲ء میں کچھ دنوں ملٹری اکادمی ڈیرہ دون میں انسٹرکٹر کی حیثیت سے قیام رہا اور اس کے بعد ۱۹۴۶ء میں آپ کلکتہ چلے گئے اور ایم ۔ اے ۔ ایچ ۔ اصفہانی کے پولیٹیکل سیکریٹری کے فرائض سر انجام دیتے رہے ۔ قیام پاکستان سے کچھ عرصہ قبل تعطیلات گزارنے کے لئے وطن مالوف تشریف لائے مگر فسادات کی بنا پر دوبارہ کلکتہ واپس نہ جا سکے چنانچہ یہ سلسلہ منقطع ہو گیا ۔ آجکل آپ گورنمنٹ کالج پشاور میں فارسی کے لکچرار ہیں اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے ۔

میرزا برلاس صاحب نے صوبۂ سرحد میں اردو بالخصوص جدید نظم کو فروغ دینے میں خوشگوار خدمات انجام دی ہیں ۔ آپ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہیں صوبہ سرحد میں جدید اردو شاعری کے رجحانات اور نئے اسالیب بیان کو مقبول بنانے میں اولیت کا شرف حاصل ہے ۔ مزید برآں موصوف نے اس علاقہ میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے اپنے چند رفقائے کار کے ساتھ مل کر دائرۂ ادبیہ پشاور کی بنیاد ڈالی ۔ نیز انجمن ترقی اردو (پشاور) کی سرگرمیوں میں بھی برابر حصہ لیتے رہے چنانچہ آج کل آپ انجمن مذکورہ کے جنرل سیکریٹری ہیں ۔ اس سلسلے میں آپ کی علمی و ادبی خدمات کے ایک اور پہلو پر روشنی ڈالنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ سرحد کے سرکاری ادبی جریدہ ''تعلیم نو'' اور اسلامیہ کالج کے ادبی ماہنامہ ''خیبر'' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں ۔

نذیر میرزا برلاس صاحب آردو کے نوجوان شعرا بالخصوص سرحدی شاعروں میں ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں ۔ وہ فارسی کلاسیکی شاعری کے ساتھ ساتھ انگریزی رومانی شاعری سے بھی بے حد متاثر معلوم ہوتے ہیں اور چونکہ آپ کا گھریلو ماحول بھی علمی و شعری لحاظ سے سازگار رہا نیز بچپن رنگین نظاروں اور شاداب وادیوں کے دیس میں گزرا اس لئے آپ کی شاعری میں جا بجا ان مناظر کی عکاسی ملتی ہے ۔ اس ضمن میں آپ کی نظم ''جہلم کے کنارے'' خاص طور پر قابل ذکر ہے ۔ جس میں جہلم کے نظاروں کی ایسی مکمل اور دلاویز تصویر کشی کی گئی ہے کہ پڑھنے والے کی نگاھوں میں بھی آن شاداب مقامات کی تصویر آبھر آتی ہے جنھیں چشم شاعر نے دیکھا ہے ۔ آپ کے کلام میں بعض مقامات پر جوش اور بعض نظموں میں اختر شیرانی کا رنگ جھلکتا ہے ۔ بلکہ اختر شیرانی کی پیروی میں تو آپ نے سانیٹ بھی لکھے ہیں ۔

حضرت نذیر نظم و غزل دونوں اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن آپ کا رجحان زیادہ تر نظم نگاری کی طرف ہے ۔ آپ کی نظم نگاری کی امتیازی خصوصیت وہ رومانی فضا ہے جو آپ کی تقریباً ہر نظم میں پائی جاتی ہے ۔ اور اس فضا کو زیادہ موثر و دلکش بنانے کے لئے آپ نے فن کی جن خوبیوں کو بہت زیادہ اپنایا ہے وہ تشبیہات و محاکات ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف کی منظومات میں رقصاں تشبیہات اور موثر محاکات کے بڑے خوبصورت نمونے ملتے ہیں ۔ ساتھ ھی آپ کی نظموں میں گیتوں کی سی نرمی و لوچ اور ترنم و موسیقیت کی بھی کمی نہیں ۔ یہ نرمی و موسیقیت جب تغزل کا روپ دھارتی ہے تو آس کی لطافت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے چنانچہ آپ کی غزلوں میں جو ھلکا پھلکا پن ' رنگینی و رعنائی اور ایک مخصوص مٹھاس پائی جاتی ہے وہ انہیں محاسن شعری کے رچاؤ کا نتیجہ ہے ۔ البتہ جہاں کہیں ان محاسن کا تناسب و توازن بگڑ گیا ہے وھاں غزل کے شعر زبان و بیان کے لحاظ سے کچھ عجیب آکھڑے آکھڑے سے معلوم ھوتے ھیں ۔ مگر یہ ضرور ہے کہ ایسے مواقع آن کے یہاں نسبتاً کم ھی آتے ھیں ۔

غرض نذیر مرزا برلاس نے سرحد میں نظم کی طرح نو ڈالی اور آن کی دلکش رومانی نظموں نے لوگوں کو ہماری شاعری کے جدید رجحانات سے آشنا کیا ۔ آن کی نظموں میں شفق کی رنگینیاں ' آفق کے پار کی خوابناک بستیاں اور حسن و عشق کی تمام سرگرمیاں ہیں اور وہ درد و کسک بھی ہے جو ازل سے حسن و عشق کی فطرت میں ودیعت ہے ۔ ساتھ ھی ان نظموں میں زندگی——اور زندگی کی شفق رنگ اور سنہری حقیقتیں ھیں ' محبت ہے خلوص ہے اور یہی وہ منظومات ھیں جنھوں نے سرحد کی ادبیات کو ایک نئے لیکن نہایت حسین ' دلنشین اور واضع موڑ سے آشنا کیا ۔ یہ منظوم انقلاب ''طرح نو'' کے نام سے ۱۹۴۲ء میں کتابی شکل بھی اختیار کر چکا ہے ۔

انتخاب کلام

جہلم کے کنارے

لہروں کی روانی میں ترنم ہے ابھی تک

موجوں کی جوانی میں تلاطم ہے ابھی تک
سیلاب جواں شورشوں میں گم ہے ابھی تک
بہتے چلے جاتے ہیں یہ مہکے ہوئے دھارے
کرتے ہیں اشارے
ہنستے ہیں نظارے
آباد ہیں اب تک مرے جہلم کے کنارے

اب تک اسی انداز سے ہنستی ہیں فضائیں
اب تک اسی خوشبو سے مہکتی ہیں ہوائیں
آتی ہیں اسی طور گھٹا ٹوپ گھٹائیں
اب تک اسی ماحول میں پلتے ہیں نظارے
چاند اور ستارے
یہ نور کے پارے
آباد ہیں اب تک مرے جہلم کے کنارے

پنگھٹ پہ جواں لڑکیاں آتی ہیں ابھی تک
پریوں کی طرح ناچتی گاتی ہیں ابھی تک
ہنستا ہوا ماحول بساتی ہیں ابھی تک
آنکھوں میں جھلکتے ہیں جوانی کے شرارے
رنگین ستارے
معصوم اشارے
آباد ہیں اب تک مرے جہلم کے کنارے

جامن کے درختوں کی وہی چھاؤں گھنیری
اور ان سے ذرا ہٹ کے مرے کھیت کی بیری
رومان کی دنیا ابھی محفوظ ہے میری
ان سایوں تلے ہم نے کئی پہر گذارے
بستی سے کنارے
کیا دن تھے ہمارے
آباد ہیں اب تک مرے جہلم کے کنارے

دنیا نے نہ دیکھا مرا رنگین فسانہ
جہلم کو مگر یاد ہے شاعر کا فسانہ
دریا کے بہاؤ مرا میلوں چلے جانا

پروان چڑھا ھوں انہیں موجوں کے سہارے
دیکھے ھیں نظارے
ھیں ذھن میں سارے
آباد ھیں اب تک مرے جہلم کے کنارے

رنگین وادی

افق کے اس طرف کہتے ھیں اک رنگین وادی ھے

وھاں رنگینیاں کہسار کے دامن میں سوتی ھیں
گلوں کی نکہتیں ھر چار سو آوارہ ھوتی ھیں
وھاں نغمے صبا کی نرم رو موجوں میں بہتے ھیں
وھاں آب رواں میں مستیوں کے رقص رھتے ھیں

وھاں ھے ایک دنیائے ترنم آبشاروں میں
وھاں تقسیم ھوتا ھے تبسم لالہ زاروں میں

سنہری چاند کی کرنیں وھاں راتوں کو آتی ھیں
وھاں پریاں محبت کے خدا کے گیت گاتی ھیں
کنار آب حسن و عشق باھم سیر کرتے ھیں
گئی گذری غلط فہمی کا ذکرِ خیر کرتے ھیں
وھاں کے رھنے والوں کو گنہ کرنا نہیں آتا
ذلیل و مبتذل جذبات سے ڈرنا نہیں آتا

وھاں اھل محبت کا نہ کوئی نام دھرتا ھے
وھاں اھل محبت پر نہ کوئی رشک کرتا ھے
محبت کرنے والوں کو وھاں رسوا نہیں کرتے
محبت کرنے والوں کا وھاں چرچا نہیں کرتے

ھم اکثر سوچتے ھیں تنگ آ آ کر کہیں چل دیں
مری جاں! اے مری خوابوں کی دنیا چل وھیں چل دیں

افق کے اس طرف کہتے ھیں اک رنگین وادی ھے

اُلجھن

چاند کی نذر کئے میں نے نظر کے سجدے
حسن معصوم کے جلووں کا پرستار رہا
میں نے تاروں پہ نگاھوں کی کمندیں پھینکیں
ایک رنگین حقیقت کا طلبگار رہا

ذھن کے پردے پہ رقصاں ھے کوئی عکس جمیل
حسن کے روپ میں شاید وہ یکایک مل جائے
ھر نئے جلوے سے بے ساختہ یوں لپٹا ھوں
جیسے بچھڑا ھوا اک دوست یکایک مل جائے

میں نے الفاظ میں رومان کے نغمے ڈھالے
سعئی تخلیق ترنم سے سکوں مل نہ سکا
مطمئن ھو نہ سکیں میری سلگتی نظریں
حسب دلخواہ مجھے ذوق جنوں مل نہ سکا

میری آشفتہ نگاھی کا اثر چھن جائے
مجھ سے اے کاش مرا ذوق نظر چھن جائے

ماحول

اب ستاروں میں جوانی نہیں رقصاں کوئی
چاند کے نور میں نغمات کے سیلاب نہیں
دل میں باقی نہیں آمڈا ھوا طوفاں کوئی
روح اب حسن آچک لینے کو بیتاب نہیں

اب فروزاں سی نہیں قوس قزح کی راھیں
انہی راھوں سے آفق پار سے گھوم آتے تھے
منتظر اب نہیں فطرت کی گلابی باھیں
ھم جنہیں جا کے شفق زار سے چوم آتے تھے

اب گھٹاؤں میں نہیں حوصلے رندانہ سے
اپنے شبہور ارادوں پہ ھنسی آتی ھے

اب فضاؤں میں نہیں ولولے دیوانہ سے
روح احساس کی تلخی سے بجھی جاتی ہے
ایسے ماحول کے زنداں سے رہا کر مجھ کو
وہی پہلے سے حسیں خواب عطا کر مجھ کو

گل فروش

یہ نازنیں کہ جیسے قاصد بہار کہیں
جواں حسینہ کہ فطرت کا شاہکار کہیں
پیام آمد فصل بہار دیتی ہے
جنوں نصیب دلوں کی دعائیں لیتی ہے
اسے چمن کے ہر اک پھول سے محبت ہے
اسے بہار کی رعنائیوں سے اُلفت ہے
گلوں میں پھرتی ہے یوں جیسے تیتری کوئی
چمن کی سیر کرے یا حسیں پری کوئی
جو پھول چنتے ہوئے نغمے گنگناتی ہے
یہ شاید اپنی جوانی کے گیت گاتی ہے
شباب نے جو اسے تمکنت سکھا دی ہے
غریب ہی سہی ''پھولوں کی شاہزادی'' ہے
جہان والوں کا حسن سلوک دیکھا ہے
اسے زمانے کی بے رحمیوں سے شکوہ ہے
گزر رہے ہیں شب و روز کتنے بھاری سے
شباب کاٹ رہی ہے ہزار خواری سے
خودی کا درس ہے افسانۂ حیات اس کا
جواب پیدا کرے گی نہ کائنات اس کا
اسے زمانے کی نیرنگیوں کا ہوش نہیں
مری نظر میں یہ دیوی ہے گل فروش نہیں
ستم ظریفئی فطرت کو آج شرماؤں
جو ہار گوندھے ہیں اس نے اسی کو پہناؤں

سانیٹ

ماضی

ماحول کو گھیرے ہوئے رنگین فسانے
نشے میں سموئے سے محبت کے ترانے
دوشیزۂ فطرت کو ہنسی آئی ہوئی سی
بہکی سی فضاؤں میں غزل گائی ہوئی سی

خوشبو سے مہکتی ہیں چمکتی ہوئی راہیں
روشن ہیں شرارت سے ستاروں کی نگاہیں
کرنوں میں جوانی کی ہنسی ناچ رہی ہے
نورانی فضاؤں میں پری ناچ رہی ہے

زلفوں میں ستارے سے جنوں ٹانک رہا ہے
اور چاند کے ایواں سے کوئی جھانک رہا ہے
اس پار کے ساحل سے مجھے کس نے پکارا
آواز دو رک جائے ذرا وقت کا دھارا

ماضی کے سلگتے ہوئے لمحات میں جاں ہے
اب تک مرا بیتا ہوا رومان جواں ہے

تغزل

وحشت میں کیا چین اک پل پھرین بگولا سے بیکل
مدھ ماتے متوالے نین جیسے پھول کٹورے جل
سارا گلشن جلتا ہے آگ لگی کونپل کونپل
یہ لالی ہو پھٹنے کی ہے جیسے پریوں کے آنچل
ہم نے دنیا دیکھی ہے
ہم سے الٹی چال نہ چل

بڑے عجیب ہیں دیر و حرم کے افسانے
یہ ہر مقام سے ذوق نظر اداس آیا
"نذیر" عہد جوانی کا اعتبار نہیں
بڑے نصیب ہیں آسکے یہ جسکو راس آیا

شورش کاشمیری

عبدالکریم نام شورش تخلص جو اب ان کا نام ہی بن چکا ہے ' ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء کو لاہور میں پیدا ہوئے ۔ میٹرک تک باقاعدہ تعلیم پائی ۔ مگر بچپن ہی سے مزاج میں آزاد روی کو بہت دخل تھا اس لئے تعلیم کو جاری نہ رکھ سکے ۔ تاہم ابتدائی عمر سے ہی ادبی کتب کے مطالعہ کا شوق جنون کی حد تک بڑھا ہوا تھا جو اب تک ہے ۔

بچپن ہی سے شعر و شاعری کا ذوق پیدا ہوا ۔ ابتدا میں مولانا تاجور نجیب آبادی سے مشورہ سخن کیا اور ازاں بعد مولانا ظفر علی خاں سے مشورہ کرتے رہے لیکن باقاعدہ طور پر کسی کی شاگردی اختیار نہ کی ۔

مزاج کی افتاد نے شورش صاحب کو سیاست کے میدان خار زار میں لا کھڑا کیا ۔ شورش صاحب کی سیاسی زندگی کی ابتدا مسجد شہید گنج سے شروع ہوئی ۔ اس کے بعد سیاست شورش صاحب کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بن گئی ۔ عمر کے دس سال جیل میں بسر کئے ۔

سیاسی زندگی میں شورش صاحب کو حضرت مولانا ظفر علی خاں صاحب کی صحبت میسر آئی ۔ جس نے ان کی نثر و نظم پر ہی نہیں بلکہ ساری زندگی پر ظفر علی خاں کو غالب کردیا ۔ مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم نے ان کی کتاب ''گفتنی و ناگفتنی'' کے دیباچے میں صحیح لکھا ہے کہ

شورش کاشمیری مولانا ظفر علی خاں کے صحیح متبع ہیں ۔

لیکن ان میں ایک منفرد خوبی یہ ہے کہ وہ غزل کے مزاج سے خوب واقف ہیں اور نظم میں بھی غزل کے شعر کہہ جاتے ہیں ۔

مولانا ظفر علی خاں صاحب کے علاوہ ' علامہ اقبال ' جوش ملیح آبادی اور اختر شیرانی کا پرتو بھی ان کی شاعری میں جھلکتا ہے ۔

حقیقت میں شورش ایک شاعر ہیں ۔ مگر سیاست میں پڑ کر وہ شاعر کی بجائے خطیب اور صحافی زیادہ ہیں ۔ نثر میں وہ ایک منفرد اسلوب کے مالک ہیں ۔ خصوصیت سے

سیاسیات میں ان کے قلم کی جولانیاں دیکھنے کے قابل ہیں ۔ ایک بے باک خطیب کی حیثیت سے مجمع پر چھا بھی جاتے ہیں اور اثر انداز بھی ہوتے ہیں ۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ۔ شورش صاحب ایک نظم گو شاعر ہیں ۔ مگر ان کی نظم میں بھی غزل کا رنگ نمایاں ہوتا ہے ۔ تاہم ہر صنف سخن پر کامیابی سے قلم اٹھایا ہے۔ چونکہ مزاج پر سیاست کا اثر غالب ہے ۔ اس لئے ان کی شاعری میں بھی سیاست کو کافی دخل ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظمیں اکثر ہنگامی ہوتی ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود شورش کے کلام میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہے ۔

بقول تاثیر مرحوم ''شورش کی شاعری میں روانی نہیں طغیانی ہے'' ۔ یعنی جب شعر کہتے ہیں تو مسلسل اور متواتر کہے جاتے ہیں اور جب طبیعت رک جائے تو ہفتوں شاعری کی طرف رخ نہیں کرتے ۔

شورش کا مجموعہ کلام ''گفتنی و ناگفتنی'' کے نام سے چھپ رہا ہے ۔

انتخاب کلام

سرمئی راتوں سے چھنوا کر سحر کی رونقیں
نالۂ شام غریباں بیچتا پھرتا ہوں میں

موج بربط، موج گل، موج صبا کے ساتھ ساتھ
نگہت گیسوئے خوباں بیچتا پھرتا ہوں میں

دیدنی ہے اب مرے چاک گریباں کا مآل
کجکلا ہوں کے گریباں بیچتا پھرتا ہوں میں

شعلۂ تاریخ کی زد پر ہے تاج خسروی
غرّہ تقدیر سلطاں بیچتا پھرتا ہوں میں

کلبہ محنت کشاں کو دے کے غیرت کا چراغ
شوکت قصر زر افشاں بیچتا پھرتا ہوں میں

اب جی رہا ہوں گردش دوراں کے ساتھ ساتھ
یہ ناگوار فرض ادا کر رہا ہوں میں

اے رب ذوالجلال تیری برتری کی خیر
اب ظالموں کی مدح و ثنا کر رہا ہوں میں

''شورش'' مری نوا سے خفا ہے فقیہہ شہر
لیکن جو کر رہا ہوں بجا کر رہا ہوں میں

لات و منات صدر نشینان بزم ھیں
اس بتکدے سے کوئی تو انسان اٹھائیے
یاران ھم سفر گل و لاله سے درگذر
لازم ھے ناز خار مغیلاں اٹھائیے
بیتے دنوں کی خندہ جبنی کا واسطه
اک بار تو نگاہ پشیماں اٹھائیے
شاخیں ھیں پائمال شگوفے ھیں خسته حال
''شورش'' کچھ اور لذت زنداں اٹھائیے

راستے پر پیچ ' راھی رُستگار رھبروں کے نقش پا گم ھو گئے
ضربت امواج تیرا شکریه ناؤ ڈوبی ناخدا گم ھو گئے
شیخ صاحب ! ھمرہ پیرمغاں میکدے میں کیا ھوا' گم ھوگئے
خندہ مہر درخشاں کی قسم اس سحر کے آشنا گم ھو گئے
اب کہاں شعر و سخن کی رونقیں
شاعر شعله نوا گم ھو گئے

اے جان صد بہار و امین شمیم و گل اک بار لوٹ آ که طبیعت اداس ھے
آؤ چلیں دیار ربیعه کے آس پاس یاران ھم نوا که طبیعت اداس ھے

اس کشا کش میں یہاں عمر رواں گذرے ھے
جیسے صحرا سے کوئی تشنه دھاں گذرے ھے
اس طرح تلخئ ایام سے بڑھتی ھے خراش
جیسے دشنام عزیزوں په گراں گذرے ھیں
اس طرح دوست دغا دے کے چلے جاتے ھیں
جیسے ھر نفع کے رستے سے زیاں گذرے ھے
یوں بھی پہنچے ھیں کچھ افسانے حقیقت کے قریب
جیسے کعبه سے کوئی پیر مغاں گذرے ھے
اس طرح ذھن میں افکار امڈ پڑتے ھیں
جیسے اک قافلۂ زھرہ وشاں گذرے ھے

ہم گنہگار جو اس سمت نکل جاتے ہیں
ایک آواز سی آتی ہے فلاں گذرے ہے

عروس البلاد

حلقہ بگوش گردش دوراں رہا ہوں میں
آہنگ انقلاب کا عنوان رہا ہوں میں

کچھ اپنی سرگذشت کہی ہے برنگ شعر
کچھ آپ کے لئے بھی غزل خواں رہا ہوں میں

بے نام تہمتوں کو سمیٹا ہے بے دریغ
امیدوار رحمت یزداں رہا ہوں میں

فطرت بھی اس خیال سے شاید نڈھال ہو
اتنا ترے بغیر پریشاں رہا ہوں میں

''شورش'' گذشتہ رات عروس البلاد میں
اک جان نو بہار کا مہماں رہا ہوں میں

قریب آ جاؤ

اک شاعر نے پکارا ہے' قریب آ جاؤ
آج ہر شعر تمہارا ہے' قریب آ جاؤ

تم جو چاہو' تو ستارے بھی اتر آئیں گے
جام مہتاب ہمارا ہے' قریب آ جاؤ

شفق شام نے خون دل خاور لے کر
اپنے چہرے کو نکھارا ہے' قریب آ جاؤ

شاخساروں پہ شگوفوں کے دئے روشن ہیں
ہر کلی ایک ستارا ہے' قریب آ جاؤ

وقت کی زلف پریشاں کو بڑی مدت میں
نور و نگہت نے سنوارا ہے' قریب آ جاؤ

سرخ گالوں پہ حکایات شبینہ کی خراش
کتنا خاموش اشارہ ہے' قریب آ جاؤ

ان کھلے سرخ لبوں کا یہ دل آویز سکوں
زندگانی کا سہارا ہے' قریب آ جاؤ

رد عمل

یہ کون ناچ رہی ہے بلند کوٹھے پر!
فضا میں تیر رہا ہے سرود چنگ و رباب!
ہوا کے دوش پہ ہے گھنگروؤں کی موسیقی
غزل کی لے میں گھلے جا رہے ہیں شیب‌وشباب

اڑاؤ کاگ کہ ہے محتسب بھی رند خراب
اٹھاؤ جام مداوائے روزگار ہے یہ
قبائیں کھول دو، زلفوں کو منتشر کر دو
بڑھاؤ ہاتھ تقاضائے نو بہار ہے یہ

مغنیہ کی دُھنیں ہیں کہ کہکشاں کے خطوط
یہ پھول وہ ہیں کہ شرمندۂ بہار نہیں
ہر ایک بول ہے دامن کش شکیب و قرار
شراب لاؤ کہ ہستی کا اعتبار نہیں

بنا رہی ہے کئی زاویے فضاؤں میں
نرت کے روپ میں تبدیل ہوتی جاتی ہے
گداز جسم کی ہر قوس ایک نغمہ ہے
ہوا سرود میں تحلیل ہوتی جاتی ہے

صدائے منبر و محراب اے خدا کی پناہ
کہ اس سے نغمۂ چنگ و رباب بہتر ہے
حرم فروش فقیہوں کے حوض کوثر سے
مغنیہ کے لبوں کی شراب بہتر ہے

کہانی

دور پنگھٹ پہ ستاروں کی جوانی لے کر
چند شاداب شگوفے پھوٹے
رشک ماہتاب شگوفے پھوٹے
اپنی رفتار میں لہروں کی روانی لے کر

پھول تھے عصمت و عفت کے سر راھگذار
چشم میگوں میں شراب
ایک بے داغ شباب
نغمہ و شعر کے گوھر تھے کہ انمول شرار

اپنے آنچل کو سنبھالے ھوئے شرمائے ھوئے
ایک گم نام کہانی گذری
موسم گل کی جوانی گذری
گاگریں سر پہ اٹھائے ھوئے بل کھائے ھوئے

کھیت میں باغ میں ہے راھگذر پھیل گئی
اک گڈریے نے ترانہ چھیڑا
وقت کے ساتھ فسانہ چھیڑا
آگ تھی آگ کہ تا حد نظر پھیل گئی

نیا سفر ھے پرانے چراغ گل کر دو

ربیعہ ! آ کہ زمانے پہ مسکرا کے چلیں
بہار بن کے رھیں ھمقدم صبا کے چلیں
قضا کے رخ کو بدل دیں بعزم عشق جواں
حیات تلخ سہی ، اس پہ مسکرا کے چلیں
سہیلیوں سے کہو زاویے بدل ڈالیں
غزل کی لے میں کوئی گیت گنگنا کے چلیں
افق کے پار شفق رنگ لالہ زاروں میں
چلی چلو تو یہاں سے ، قدم بڑھا کے چلیں
حیات کیا ھے عناصر کے تجربہ کے سوا
بہشت ارض کو خلد بریں بنا کے چلیں
جوانیوں کی نئی ڈالیوں پہ لہرائیں
محبتوں کے نئے کارواں بنا کے چلیں

شہنشہوں کو جھکائیں حضور محنت میں
قلم کو تیغ بنا کر ' فضا پہ چھا کے چلیں

سانیٹ

ربیعہ ! کچھ تو آخر اہتمام زندگی کر لیں
زمانے کی ستم آرائیاں دیکھی نہیں جاتیں
عزیزوں کی کرمفرمائیاں دیکھی نہیں جاتیں
ربیعہ ! اس سے بہتر ہے کہ دونوں خودکشی کر لیں

قضا کے روپ میں تکمیل شرح عاشقی کر لیں
ہمیں مہر و وفا کا آسمانی گیت گانا ہے
ہمیں اس زندگی کی سرحدوں سے دور جانا ہے
ثریا سے تعارف ' کہکشاں سے دوستی کر لیں

ستاروں سے ستاروں میں چلیں افلاک تک پہنچیں
افق کے نیلگوں آنچل سے رعنائی چرا لائیں
مہ و خورشید کے چہرے کی برنائی چرا لیں
ربیعہ ! قدسیوں کے دامن بے چاک تک پہنچیں

عروس شعر سے موسیقی و آوازے آئیں
ربیعہ' گل کدوں سے کونپلوں کے سازے آئیں

سیف الدین سیفؔ

سیف الدین متخلص به سیف مارچ ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے - مولد و آبائی وطن امرتسر ہے - آپ کے والد خواجه معراج الدین صاحب کا امرتسر میں پشمینه کا کاروبار تھا - خواجه صاحب میں ہمارے مشرقی انداز و مزاج کی جہاں اور خوبیاں پائی جاتی ہیں وہاں ایک خصوصیت یه بھی ہے که وہ بڑے مذہبی قسم کے انسان واقع ہوئے ہیں - چنانچه اُن کی تربیت کا یه اثر ہوا که سیف صاحب نے بھی ابتدا ہی سے دینی اذکار و اشغال میں دلچسپی لی اور رفته رفته خدمت دین کے سلسلے میں وہ مذہبی تحریکات میں حصه لینے لگے - طبیعت کا یه رجحان انہیں اسم با مسمی بنانے میں تو یقیناً کامیاب ہوا مگر اس سے اُن کی تعلیم پر کچھ مضر اثرات بھی پڑے - اس اجمال کی تفصیل یه ہے که سیف صاحب ۱۹۳۹ء میں جبکه وہ دسویں جماعت کے طالب علم تھے، خاکسار تحریک کے سرگرم کارکن ہونے کے جرم میں گرفتار ہوئے اور دو سال قید فرنگ میں رہے قید سے رہا ہو کر جب انہوں نے دوبارہ سلسلۂ تعلیم جاری کیا تو میٹرک اور ایف - اے کی منزلوں سے گزر کر بی - اے کے دونوں سال پورے کئے ہی تھے که بعض مذہبی و سیاسی مسائل پر ارباب کالج سے اُلجھ پڑے جس کا نتیجه یه ہوا که انہیں بی - اے کے امتحان میں شرکت سے روک دیا گیا - مجبوراً حضرت سیف نے نه صرف کالج سے کناره کشی اختیار کی بلکه انہوں نے تعلیم سے بھی منه موڑ لیا اور تلاش معاش میں سرگرداں رہنے لگے - ایک سال تک اسی چکر میں وہ دہلی، شمله اور کشمیر میں پھرے - آخر ۱۹۴۶ء میں فلم لائن اختیار کی - جب سے فلمی گانے اور مکالمے لکھنا اُن کا ذریعه معاش ہے - ملکی تقسیم سے پہلے امرتسر میں سکونت تھی لیکن قیام پاکستان کے بعد سے مستقل طور سے لاہور میں اقامت گزیں ہیں -

سیف صاحب کو بچپن ہی سے شعر و سخن سے دلچسپی تھی اس پر طرہ یه که انہیں اختر حسین رائے پوری، فیض اور تاثیر مرحوم جیسے باذوق لوگوں کی صحبت بھی میسر آ گئی - نتیجه یه ہوا که بہت جلد اُن کی شعر گوئی کا آغاز ہو گیا - اس سلسلے میں اُن کی پہلی نظم ''بد دعا'' جو ایک مقامی پرچه میں چھپ کر مقبول ہوئی اُس زمانے کی فکر کا نتیجه ہے جب وہ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے - اس کے بعد دسویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے اُن کا کلام ملک کے مختلف ادبی رسائل میں چھپنے لگا اور وہ ادبی حلقوں میں متعارف بھی ہو گئے -

سیف صاحب نے غزل، رباعی، طویل و مختصر نظمیں اور گیت سب کچھ کہے ہیں لیکن تغزل سے انہیں فطری لگاؤ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے که وہ ہر بات ایجاز و کنائے میں کہنے کے عادی ہیں - اُن کے کلام کو دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے که

گو اُس کا سلسلہ خم کاکل سے شروع ہوتا ہے مگر وہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اُس میں آشوب دھر ، گردش روزگار ، حب وطن ، درد غریب ، جور اغیار اور مہر احباب غرضکہ غم دل اور فکر جہاں کی ان گنت کیفیتیں ایسی ہیں جن سے اس کے رشتے قائم ہیں ۔ اُن کے اشعار میں ذاتی تجربہ کے خلوص کے علاوہ ہمارے دور کے عمومی مسائل و مصائب کا احساس بھی شامل ہے ۔ اور سچ پوچھئے تو یہ رنگ بتدریج نمایاں ہوتا جا رہا ہے ۔ جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں ۔

چھپتا نہیں اب غم زمانہ　　　ہم ذکر کریں ہزار دل کا

اس میں شک نہیں کہ ابھی تک وہ بیشتر دل ہی کی بات کہتے ہیں لیکن اس پاکیزگی ، اس خلوص اور درد سے کہتے ہیں کہ یہ بھی ہمیں اپنے ہی دل کی بات معلوم ہوتی ہے ۔

سیف صاحب ہماری نئی پود کے اُن متغزلین میں سے ہیں جنہیں غزل کے مزاج سے حقیقی مناسبت ہے ۔ چنانچہ اُن کی غزلوں میں عبارت ، اشارت اور حسن ادا کے محاسن کا ایسا مسلسل اور ہموار اظہار ہے کہ اُنھیں پڑھکر سچ مچ فرحت حاصل ہوتی ہے ۔ اُن کی حدیث محبت میں ایک ملائم وقار اور پر خلوص آرزو مندی ہے جو مؤثر بھی ہے اور دل خوش کن بھی ۔ جہاں تک حسن ادا کا تعلق ہے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اُن کا طریق اظہار نتھرا ہوا ، شفاف اور بہت دلکش ہے ۔ وہ سیدھے سادے الفاظ میں اپنے جذبات و احساسات کو ایسی چابکدستی کے ساتھ قلم بند کرتے ہیں کہ نہ تو لفظوں ہی میں کہیں جھول پڑتا ہے اور نہ ہی اُنھیں معانی پر چسپاں کرنے کے لئے کھینچا تانی کی ضرورت ہوتی ہے ۔

سیف صاحب کی نظموں اور گیتوں میں تغزل کے رچاؤ کے ساتھ ساتھ وہ نغمگی ، اور موسیقیت بھی ہے جو اس دور کی نمایاں خصوصیت سمجھی جاتی ہے ۔ خاص طور پر اُن کی طویل نظمیں ''مسافر'' اور ''ساربان'' جواب چند اور نظموں کے ساتھ ''دور و دراز'' کے نام سے کتابی صورت میں عنقریب شایع ہو رہی ہیں قابل مطالعہ ہیں ۔ غرض حضرت سیف گو ابھی نوجوان ہیں لیکن فن سخن میں اُنھیں سہارت بھی ہے اور زندگی و فن کے بنیادی حقائق سے بھی وہ بخوبی آگاہ ہیں ۔ چنانچہ اُن کے متعلق یہ توقع کرنا بے جا نہ ہوگا کہ آئندہ وہ ہماری شاعری بالخصوص غزل میں کچھ نہ کچھ انمٹ نقوش ضرور چھوڑیں گے ۔ اب تک آپ کا کلام ''خم کاکل'' زیور طبع سے آراستہ ہو کر ادبی حلقوں میں نہایت مقبول ہو چکا ہے ۔

انتخاب کلام

غزلیات

ہر اک چلن میں اُسی مہرباں سے ملتی ہے　　　زمیں ضرور کہیں آسماں سے ملتی ہے

سرود عشق میں نغمات حسن شامل ہیں　　　تری خبر بھی مری داستاں سے ملتی ہے

تری نگاہ سے آخر عطا ہوئی دل کو — وہ اک خلش کہ غم دو جہاں سے ملتی ہے
چلے ہیں "سیف" وہاں ہم علاج غم کے لئے — دلوں کو درد کی دولت جہاں سے ملتی ہے

بڑے خطرے میں ہے حسن گلستاں ہم نہ کہتے تھے
چمن تک آ گئی دیوار زنداں ہم نہ کہتے تھے
بھرے بازار میں جنس وفا بے آبرو ہوگی
اٹھے گا اعتبار کوئے جاناں ہم نہ کہتے تھے
اسی محفل ، اسی بزم وفا کے گوشے گوشے میں
لٹے گی مستئی چشم غزالاں ہم نہ کہتے تھے
اسی رستے میں آخر وہ کڑی منزل بھی آئے گی
جہاں دم توڑ دے گی یاد یاراں ہم نہ کہتے تھے
خزاں کی آہٹوں پر کانپتی ہیں پتیاں گُل کی
بکھرنے کو ہے اب زلف بہاراں ہم نہ کہتے تھے

کھول کر ان سیاہ بالوں کو — روک دو صبح کے اجالوں کو
اک تبسم سے عمر بھر کے لئے — روشنی دے گئے خیالوں کو
"سیف" جب وہ نگاہ یاد آئی — آگ سی لگ گئی خیالوں کو

جی نہیں آپ سے کیا مجھ کو شکایت ہوگی — ہاں مجھے تلخئی حالات پہ رونا آیا
حسن مغرور کا یہ رنگ بھی دیکھا آخر — آخر اُن کو بھی کسی بات پہ رونا آیا
"سیف" یہ دن تو قیامت کی طرح گزرا ہے — جانے کیا بات تھی ہر بات پہ رونا آیا

"سیف" کیا چار دن کی رنجش سے — اتنی مدت کا پیار ٹوٹ گیا

غنچوں کی نادانی دیکھو ! — ہنستے ہیں مرجھانے پر بھی
"سیف" زمانہ حاسد کیوں ہے — دکھ سہنے غم کھانے پر بھی

یہ مانا کہ تھی بزم اغیار پھر بھی — نگاہیں تو ملتیں اشارا تو ہوتا
عدم تک انہیں "سیف" ہم ڈھونڈ آتے — نگاہ طلب کا اشارا تو ہوتا

موت سے تیرے درد مندوں کی — مشکل آسان ہو گئی ہوگی
ان سے بھی چھین لو گے یاد اپنی — جن کا ایمان ہو گئی ہوگی
مرنے والوں پہ "سیف" حیرت کیوں — موت آسان ہو گئی ہوگی

ہر آستاں اگرچہ ترا آستاں نہ تھا — ہر آستاں پہ تجھ کو پکارے چلے گئے

گو خوش تو نہیں ہوں تم کو کھو کر — غم ہے پہ تمہارا غم نہیں ہے
دل کو جو تری جفا کی خو ہے — دنیا کا ستم ستم نہیں ہے
تسکیں نہ ملے گی "سیف" سو جا — رونا تو علاج غم نہیں ہے

آہ تسکین بھی اب "سیف" شب ہجراں میں
اکثر اوقات بڑی دیر کے بعد آئی ہے

کوئی ایسا اہل دل ہو کہ فسانۂ محبت
میں اسے سنا کے روؤں وہ مجھے سنا کے روئے

پلکوں پہ لرزتے ہوئے تارے سے یہ آنسو — اے حسن پشیماں ترے قربان گئے ہم
بدلا ہے مگر بھیس غم عشق کا تونے — بس اے غم دوراں تجھے پہچان گئے ہم
ہے "سیف" بس اتنا ہی تو افسانۂ ہستی — آئے تھے پریشان، پریشان گئے ہم

ان جفاؤں پر ان وفاؤں پر — اب پشیماں ہیں آپ بھی ہم بھی
کس کو منظور تھی حیات مگر — جی رہے ہیں تری خوشی ہم بھی
سیف کچھ چاہئے تھا مٹنے کو — بن گئے نقش زندگی ہم بھی

دل سنبھل کر بھی پیچ و تاب میں ہے — زلف بکھری تو کچھ سنور ہی گئی

کل کیسے جدا ہوئے وہ ہم سے — اور آج وہ کس طرح ملے ہیں

کہتے ہیں قصۂ غم ہر انجمن میں جا کر
ہم اہل دل بھی کیسے دیوانے ہو گئے ہیں
یا اب تری جفا میں وہ لذّتیں نہیں ہیں
یا ہم تری نظر میں بیگانے ہو گئے ہیں
ہر منزل طلب میں رفتار پا سے اپنی
جو نقش بن گئے ہیں بتخانے ہو گئے ہیں
تعمیر کی ہوس نے سو بار دل اُجاڑا
پہلو میں ''سیف'' کتنے ویرانے ہو گئے ہیں

پہلی پہلی نظر کے افسانے — وہ ملاقات اور ہی کچھ تھی
آپ آئے تھے ' زندگی میری — رات کی رات اور ہی کچھ تھی

آج یہ ہے موسم کا تقاضا — زلف تری کُھل کر لہرائے
ان آنکھوں سے موتی برسے — اُن ہونٹوں نے پھول کِھلائے

دلِ حبیب دُکھانے کا حوصلہ نہ ہوا — یہ حال تھا کہ سنانے کا حوصلہ نہ ہوا
مجھے کچھ اُس کی بلندی سے خوف آتا تھا — تری نظر میں سمانے کا حوصلہ نہ ہوا
تمہارے بعد خدا جانے کیا ہوا دل کو — کسی سے ربط بڑھانے کا حوصلہ نہ ہوا
اُنھیں فسانۂ اُلفت سنا دیا لیکن — نظر ملا کے سنانے کا حوصلہ نہ ہوا
وطن عزیز نہ تھا پھر بھی ''سیف'' غربت میں
کسی کو دل سے بھلانے کا حوصلہ نہ ہوا

دیکھ کر حال ہمارا نہ ہنسو غربت میں
کون ہیں ' کس طرح آئے ہیں ' تمہیں کیا معلوم

شاید تری سادگی نے اب تک — دیکھا ہی نہیں جمال اپنا

وہ ترا عہد وہ ترا پیماں — خواب سا کچھ خیال سا کچھ ہے

ہے یہی فرقۂ ارباب وفا کا مقسوم
یہ پریشانئی حالات نئی بات نہیں

کل بھی آشفتہ مزاجی کا سبب دنیا تھی
آج بھی گردش ایام سہی تو نہ سہی
کوئی صورت ہو کہ مشکل مری آساں ہو جائے
وقت آخر ترا پیغام سہی تو نہ سہی

ایسے لمحے بھی گزارے ہیں تری فرقت میں
جب تری یاد بھی اس دل پہ گراں گزری ہے
زندگی ''سیف'' لئے قافلہ ارمانوں کا
موت کی راہ سے بے نام و نشاں گزری ہے

لگی ہے ''سیف'' نظر انقلاب دوراں پر
سنا تو ہے کہ زمانے بدلتے رہتے ہیں

موت دشوار ، زندگی مشکل
اب کوئی کام اپنے بس میں نہیں
تیرے ہر ہر ستم کی یہ تاویل
دورِ ایّام اپنے بس میں نہیں

دنیا بھر کا درد سہا ہے
ہم نے تیرے غم کے بہانے

وفا انجام ہوتی جا رہی ہے
محبت خام ہوتی جا رہی ہے
قیامت ہے محبت رفتہ رفتہ
غم ایّام ہوتی جا رہی ہے
سنا ہے اب ترے لطف و کرم کی
حکایت عام ہوتی جا رہی ہے
محبت ''سیف'' اک لطف نہاں تھی
مگر بدنام ہوتی جا رہی ہے

بستی ہی رہی آمید لیکن
لٹتا ہی رہا دیار دل کا
چھپتا نہیں اب غم زمانہ
ہم ذکر کریں ہزار دل کا
آ ''سیف'' خود اپنا غم اٹھائیں
کوئی نہیں غمگسار دل کا

خیال و فکر پر پہرے ' لب اظہار پر مہریں
کوئی اہل وفا سے بد گماں ایسا بھی ہوتا ہے
ادھر شعلوں میں چیخیں ' ٹوٹتی شاخوں کی فریادیں
اُدھر پتّے بجائیں تالیاں ایسا بھی ہوتا ہے
ہمارے دست و بازو کاٹ ڈالے دستگیروں نے
تری دنیا میں رب دو جہاں ایسا بھی ہوتا ہے
پریشاں پھول ' افسردہ شگوفے ' منتشر کلیاں
بہار آئے تو رنگ گلستاں ایسا بھی ہوتا ہے

یہ آلام ہستی ' یہ دور زمانہ ! تو کیا اب تمہیں بھول جانا پڑے گا

چمن کے پتے پتے پر لہو ہم نے نچوڑا ہے
بہار آئی تو انداز گلستاں ہم بھی دیکھیں گے
کسے معلوم تھا یہ دن بھی گزرے گا کبھی ہم پر
کہ اپنے دیس میں شام غریباں ہم بھی دیکھیں گے
ابھی تو "سیف" اک لذت سی ہے دلکی جراحت میں
ترا غم درد بنتا ہے کہ درماں ہم بھی دیکھیں گے

"سیف" جہاں آغاز وفا کے پہلے نغمے گائے تھے
اب تک میری آنکھوں میں وہ رین بسیرے پھرتے ہیں

زندگی "سیف" مصیبت ہی سہی جی سے جانا بھی تو آساں نہیں

تیرا خیال ہی مری یادوں کا حسن تھا عہد فراق نے تری صورت بھی چھین لی
اب میں ہوں اور یورش آلام روزگار دنیا نے تیری یاد کی فرصت بھی چھین لی

اٹھی ہے موج غم دنیا اے غم جاناں ساتھ نہ چھوٹے

میں بہت بچ بچ کے گزرا ہوں غم ایّام سے
لٹ گئے تیرے تصور کے پریخانے کہاں

یہ بھی تیرے غم کا اک بدلا ہوا انداز ہے
میں کہاں ورنہ غم دوراں کے افسانے کہاں

سیف ہنگام وصال آنکھوں میں آنسو آ گئے
یاد آئے اُن کی بے مہری کے افسانے کہاں

دل ترا ہو گیا تو کیا غم ہے
یہ کسی کا ہوا ہی کرتا ہے

یہ گھٹا اور عذر پینے میں
کون سی بات کس مہینے میں

دل کہ اک محشر تمنا تھا
داغ سا رہ گیا ہے سینے میں

''سیف'' اس حال میں بھی زندہ ہوں
جانے کیا دلکشی ہے جینے میں

تھکی تھکی سی فضائیں بجھے بجھے تارے
بڑی اداس گھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

ابھی نہ جاؤ کہ تاروں کا دل دھڑکتا ہے
تمام رات پڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

دم فراق میں جی بھر کے تجھ کو دیکھ تو لوں
یہ فیصلے کی گھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

منظومات

تلاش

رات کی بے سکوں خموشی میں
رو رہا ہوں کہ سو نہیں سکتا
راحتوں کے محل بناتا ہے
دل، جو آباد ہو نہیں سکتا

دور شمع خیال کی مانند
شمع وادی کی جھلملاتی ہے
پاس کے بیکراں اندھیرے میں
ایک اُمید مسکراتی ہے

دُور پربت کے پاس چرواہا
کھو گیا غم فزا ترانوں میں
بین کرتی ہے روح زخم آلود
بانسری کی خفیف تانوں میں

تیرے جانے کا غم بھلاتا ہوں
تیرے آنے کی یاد آتی ہے
ہائے اس بے بسی کے عالم میں
کس زمانے کی یاد آتی ہے

شب کو ویران رھگزاروں سے
سر جھکائے ہوئے گزرتا ہوں
قہقہوں میں قرار کھویا تھا
آنسوؤں میں تلاش کرتا ہوں

میرے محبوب وطن

مرے محبوب وطن اے مرے محبوب وطن
کون کر سکتا ہے میلا ترا اُجلا دامن
ایک گرداب بلا ہے ترے ماتھے کی شکن
کشتیاں پھونک کے نکلے ہیں ترے شیر افگن
اے مرے زندہ و پائندہ وطن

نکہت و نور سے معمور سویرے تیرے
زلف جاناں سے کہیں سائے گھنیرے تیرے
مرجع امن و اماں رین بسیرے تیرے
یہ مہکتے ہوئے گلشن یہ لہکتے ہوئے بن
اے مرے زندہ و پائندہ وطن

سحر و شام فضاؤں میں اذانوں کی پکار
عظمت منبر و محراب مناروں کا وقار
تیرے بازاروں کی رونق، تری گلیوں کا نکھار
آنکھ اُٹھا کر نہ ادھر دیکھ سکے گا دشمن
اے مرے زندہ و پائندہ وطن

گیت

نادان!

اے دل اے نادان
سُونا سُونا کر گئے تجھ کو دو دن کے مہمان
کس کس نے توڑے ہیں تجھ سے اُلفت کے پیمان
راتیں کتنی سُونی ہیں اب دن کتنے ویران

اے دل اے نادان

ایک ذرا سی ٹھیس لگی اور تو نے مجھے تڑپایا
غم کا ایک اشارہ پا کر ہر غم یاد دلایا
یہ تیری نازک پھلواری کیسے چڑھے پروان

اے دل اے نادان

ساجن روٹھا ' ساتھی چھوٹے ' جگ سے رشتہ ٹوٹا
ایک اکیلے راہی تجھ کو جس نے چاہا لوٹا
اور تجھے باقی ہیں اب تک چاہت کے ارمان

اے دل اے نادان

رباعیات

اب دیدۂ پرنم کی حقیقت کیا ہے
تو ہے تو مرے غم کی حقیقت کیا ہے
اک جام اگر حسن ادا سے مل جائے
افکار دو عالم کی حقیقت کیا ہے

پھر آیا ترا خیال چلتے چلتے
پھر چلنا ہوا محال چلتے چلتے
تقدیر نے آ کے ایسا مہرہ پھینکا
پھر بھول گیا ہوں چال چلتے چلتے

انجام سفر دیکھ کے رو دیتا ہوں ' ٹوٹے ہوئے پر دیکھ کے رو دیتا ہوں
روتا ہوں کہ آہوں میں اثر ہو لیکن آہوں کا اثر دیکھ کے رو دیتا ہوں

فارغ بخاری

سید میر احمد شاہ بخاری اصل اور فارغ بخاری قلمی نام ہے، فارغ تخلص کرتے ہیں۔ آپ کا آبائی وطن پشاور ہے۔ جہاں ۱۹۱۸ء میں پیدائش ہوئی۔ انگریزی تعلیم میٹرک تک حاصل کی ہے لیکن پشتو، اردو اور فارسی میں بھی دستگاہ رکھتے ہیں اور تینوں زبانوں میں فضیلت کی سندیں حاصل کر چکے ہیں۔ فارغ صاحب کا قیام زیادہ تر پشاور ہی میں رہا ہے۔ یہیں اُن کی تعلیم و تربیت ہوئی اور یہیں زندگی کے دوسرے مشاغل کے ساتھ اُنہوں نے ادبی زندگی میں قدم رکھا۔ یوں پیشے کے اعتبار سے وہ ڈاکٹر ہیں مگر چونکہ شعر و ادب سے اُنہیں فطری لگاؤ ہے اس لئے اُن کا بیشتر وقت ادبی خدمات میں گزرتا ہے۔ کئی اخبارات و رسائل کے مدیر رہ چکے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ المشرق، ہفتہ وار شباب، ماہنامہ نغمۂ حیات، ماہنامہ کیسر کیاری پشاور سے اور اخبار شباب لاہور سے نکال چکے ہیں۔ ان کے علاوہ فارغ صاحب نے اپنے شفیق دوست رضا ہمدانی کی معیت میں پشاور سے معیاری جریدہ سنگ میل بھی نکالا تھا جو آزادئ رائے کے جرم میں حکومت نے بند کر دیا اور اسی ترقی پسندی کے جرم میں آپ ایک سال تک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت اسیر بھی رہے۔

فارغ بخاری پاکستان کے نوجوان شعرا بالخصوص سرحدی سخنوروں میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام کے مالک ہیں۔ اُن کی شاعری کی ابتدا ۱۹۳۵ء سے ہوئی تاہم اس مختصر عرصے میں اُنہوں نے اپنے ہم عصر شعرا کے درمیان جو امتیاز حاصل کیا ہے وہ بلا شبہ لائق ستائش ہے۔ فارغ صاحب نظم و غزل دونوں کہتے ہیں۔ نظموں میں وہ بالعموم رومانی اور انقلابی نظمیں کہتے ہیں۔ تا ہم اُن رومانی نظموں میں بھی ایک انقلابی بانکپن پایا جاتا ہے۔ جس کا رشتہ کبھی اختر شیرانی کی رومانیت سے تو کبھی جوش کی رومانوی انقلابیت سے جا ملتا ہے۔ مثال کے طور پر اُن کی نظم ''بھکارن'' میں وہی جوش صاحب والا تصور ہے کہ حسن اور اس عالم میں، اور اُن کی ایک دوسری رومانی نظم ''شکایت'' میں وہ خود سپردگی اور جذباتی بہاؤ نہ سہی لیکن لب و لہجہ اختر شیرانی ہی کا ہے۔ البتہ اختر شیرانی اور فارغ کی رومانیت میں ایک چیز مابہ الامتیاز یہ ہے کہ اختر مرحوم کا انقلابی شعور جذبات و خیالات کے آزادانہ اظہار کا حامل تھا لیکن فارغ کا شعور ایک ایسے سماجی انقلاب کا حامل ہے جو پوری شخصیت کو متوازن کرنے کے ساتھ ساتھ سماجی زندگی کے مادی عیوب کو بھی دور کر سکے۔ یہ سماجی انقلاب کا تصور شاعر کی کثرت مشاہدہ،

عمق جذبات اور پختگیٔ شعور کے ساتھ جوں جوں رچتا گیا ہے ۔ اُس کی آواز میں زیادہ وزن اور فن میں زیادہ نکھار پیدا ہوتا گیا ہے ۔ فارغ صاحب کی انقلابی منظومات میں ایک طرف تو مزدور طبقہ کے جذبات کا احترام ہے اور دوسری طرف ان جذبات کی ایسی پر خلوص اور ولولہ انگیز ترجمانی پائی جاتی ہے ۔ جو ان تخلیقات کو ایک زندگی، ایک ولولہ اور ایک عزم سے ہمکنار کر دیتی ہے اور ان خصوصیات کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ فارغ صاحب کی انقلابی نظمیں حسن و تاثیر کے زیور سے بھی آراستہ ہو گئی ہیں ۔
جہاں تک غزلیات کا تعلق ہے شاعر نے بقول خود

نئے انداز سے چھیڑی ہے غزل فارغ نے — اب ہر اک لب پہ بغاوت کے ترانے ہونگے

ان میں بھی انقلابی گیت گائے ہیں مگر کیا کیا جائے غزل بذات خود بڑی کافر صنف سخن ہے جو اول تو موضوع کی تبدیلی آسانی سے قبول ہی نہیں کرتی اور اگر کرتی بھی ہے تو کسی ایسے فنکار کے ہاتھوں جو '' کیا کہا جائے '' کے علاوہ '' کیوں کر کہا جائے '' کے گر سے بخوبی واقف ہوتا ہے ۔ ہمارے فارغ صاحب ابھی ایک نوجوان شاعر ہیں اس لئے ظاہر ہے '' کیوں کر کہا جائے '' کے لئے جس اعلیٰ ترین ذہنی عمل اور ژرف نگاہی کی ضرورت ہوتی ہے وہ ابھی ان کے یہاں پیدا نہیں ہوئی ہے ۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ انقلابی موضوعات کو اپنی غزلوں میں فن کارانہ اُسلوب سے نبھا نہیں سکے اور اُن کی اکثر غزلیات خطابت کا شکار ہوگئی ہیں اس کے برعکس اُن کی کامیاب غزلیں وہی ہیں جن میں بغاوت کے ترانے نہیں ہیں ۔

فارغ صاحب کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے ممتاز حسین صاحب اُن کے مجموعہ کلام ''زیر و بم'' کے دیباچے میں فرماتے ہیں '' اُن کی شاعری کی عمر بہت قلیل ہے ۔ آپ پانچ چھ سال کے عمر میں اس کی توقع نہیں کر سکتے کہ اُنہیں فنی محاسن پر اساتذہ ایسا عبور حاصل ہو سکتا ہے ۔ اس کے لئے ایک عمر درکار ہوتی ہے . . . . اُن کے بعض مصرعے ڈھیلے اور بعض لفظوں کا انتخاب احسن نہیں ہے لیکن ان جزوی خامیوں کے باوجود جو چیز آپ کو خاص طور پر متوجہ کرے گی وہ اُن کا طرب ناک جذبہ اظہار ہے ۔ وہ حقیقت کی مصوری کرتے ہیں لیکن فسانے کی کیفیت باقی رکھتے ہیں یہ احساس بذات خود اُن کے فن کو بلندیوں پر پہنچانے کا ضامن ہے '' اور اس میں شک نہیں کہ اگر فارغ بخاری نے اپنے فن کی اسی خلوص و جانفشانی کے ساتھ آبیاری جاری رکھی تو وہ مستقبل قریب میں پاکستان کے قابل فخر اور محبوب ترین شعرا میں سے ایک ہوں گے ۔

انتخاب کلام

منظومات

تشنگی

کتنی مسرور تھی اُمید کی دولت پا کر
شادمانی کے کنول آنکھوں میں لہراتے رہے

رقص کرتا ہوا ماحول بسایا تو نے
مسکراتی ہوئی دنیا کے خیال آتے رہے

خود فریبی نے تصور کے حسیں جال بُنے
جو تری فطرت احساس کو بہلاتے رہے

تو نے بڑھتے ہوئے سایوں سے پناہیں مانگیں
ایک آوارہ کرن کو بھی غنیمت جانا
غم و اندوہ کی تعبیر شکن دنیا میں
جھوٹے خوابوں کے چمن کو بھی غنیمت جانا

ہر طرف یاس کی تاریک گھٹائیں پا کر
فرحت چشم زدن کو بھی غنیمت جانا

اپنی معصوم دعاؤں کی یہ تاثیر بھی دیکھ
اب ترے درد کی تکمیل ہوا چاہتی ہے
گُھٹ کے رہ جائیں بہاروں کے ترانے جن میں
ایسے زندانوں کی تشکیل ہوا چاہتی ہے

جس کرن کو تری نظروں نے سہارا سمجھا
وہ بھی اب سایوں میں تحلیل ہوا چاہتی ہے

وہ ارادے جو اُمنگوں کے نگہبان رہے
آج خود بیکس و لاچار نظر آتے ہیں
لہلہاتے تھے جو کل شان دلاویزی سے
آج وہ پھول بھی بیمار نظر آتے ہیں

تُو تو افلاس سے بھاگ آئی تھی لیکن اب تو
ہر طرف قحط کے آثار نظر آتے ہیں

خوشحال خاں خٹک

(پشتو زبان کا لافانی حرّیت پرست فنکار)

آدمیت خونچکاں انسانیت تا راج تھی
ارض مشرق روشنی کے واسطے محتاج تھی

ایشیا کی سر زمیں مدت سے تھی ظلمت نصیب
اے کہستانی ادیب

اوج پر رہتا تھا ظل اللہیوں کا اقتدار
جاں بلب تھے ہر طرف اندھی عقیدت کے شکار
بن چکی تھی ادعائے ہوش کی دنیا رقیب
اے کہستانی ادیب

ہو رہا تھا ظلم مذہب کے مقدس نام پر
ٹوٹتے تھے پے بہ پے کوہ ستم ہر گام پر
نشۂ ثروت میں کھوئے تھے اخوّت کے خطیب
اے کہستانی ادیب

چھا رہا تھا ہر طرف جمہور کش فاشی نظام
بیکس و مظلوم انسانوں کا جینا تھا حرام
زندگانی تھی زمانے میں ہلاکت کے قریب
اے کہستانی ادیب

تو نے توڑا اونچی بارگاہوں کا غرور
خاک میں تو نے ملایا کجکلاہوں کا غرور
ہند میں آزادئ جمہور کے پہلے نقیب
اے کہستانی ادیب

تیری جانبازی حریفان وفا میں فرد تھی
تیرے آگے سطوتِ اورنگ شاہی گرد تھی
جاگ اٹھے تیرے بل بوتے پہ خوابیدہ غریب
اے کہستانی ادیب

رشک کرتا ہے جہاں اب بھی ترے کردار پر
اک قلم پر ہاتھ تھا اور دوسرا تلوار پر
تو کبھی سرکش مجاہد تھا کبھی باغی ادیب
اے کہستانی ادیب

احتجاج

یہ سوز عشق یہ زہرہ گداز تنہائی
رہ وفا میں ترا ساتھ کس نے چھوڑ دیا

نہ چوڑیوں کی کھنک ہے نہ پائلوں کی چھنک
تری جوانی کے سازوں کو کس نے توڑ دیا
گداز باھوں میں انگڑائیوں کے افسانے
الم کے تند بگولوں میں ڈھلتے جاتے ھیں
تری نگاھوں کی ضو آفریں کرنوں کو
حوادث غم دوراں نگلتے جاتے ھیں
شراب و شعر کا ماحول سوگوار ہے کیوں
گلوں کی راہ میں کانٹے بچھادئے کس نے
بہار آتے ھی گلشن کو کس نے لوٹ لیا
چراغ جلنے سے پہلے بجھا دئے کس نے
یہ بکھرے بکھرے سے گیسو یہ سمٹی سمٹی نظر
نفس نفس میں یہ زھراب کس نے گھول دیا
ترے شباب کی انمول آرزوؤں کو
یہ سیم و زر کے ترازو میں کس نے تول دیا

نہ پھونک دیں کہیں دیر و حرم یہ انگارے
تری آداس نگاھوں نے جن کو پالا ھے
یہ احتجاج یہ خاموش احتجاج ترا
پکار بن کے فضاؤں کو ڈسنے والا ھے

تقاضا

ذھن انسان پہ ہے صدیوں کی روایات کا بوجھ
ان دھندلکوں سے بھلا اس کو ابھاروں کیسے
وھی طغیان حوادث وھی طوفان بلا ــــــــــ
ان خزاں دیدہ بہاروں کو نکھاروں کیسے
بارگاھوں کی بلندی تو میں پھاند ھی لوں
دل کو ان تنگ خلاؤں سے گزاروں کیسے
اس سلگتے ھوئے ماحول میں رہ کر اے دوست
اپنے آشفتہ خیالات سنواروں کیسے

توڑ کر کتنے حصاروں کو چلا آیا ہوں
ہر قدم پر ابھی دیواریں ھی دیواریں ھیں
زندگی سوز تعفن کے خرابے ھیں یہاں
اور وھاں زلف سیہ مست کی مہکاریں ھیں
آستانے بھی وھی ، سر بھی وھی ، در بھی وھی
وھی زنداں وھی زنجیروں کی جھنکاریں ھیں
وھی سینے ھیں وھی نقرئی خنجر کی انی
وھی حلقوم وھی سونے کی تلواریں ھیں
میں ابھی اپنی تگ و تاز سے مایوس نہیں
میرے بے باک ارادوں میں توانائی ھے
بجھ نہیں سکتی کبھی میرے جنوں کی مشعل
میں نے ظلمت کو مٹانے کی قسم کھائی ھے
میرے اشعار نہیں ، اھل جہاں کی ھے پکار
میرے نغمات نہیں ، وقت کی شہنائی ھے
غور سے سن اسے جمہور کی آواز ھے یہ
اس نئے دور کا اب دھر تمنائی ھے

تغزل

مرا غم جاوداں ھونے لگا ھے — زمانہ ہم زباں ھونے لگا ھے
یہ منزل کون سی ھے کارواں بھی — غبار کارواں ھونے لگا ھے
خوشا یہ حسن سعئی رازداری — کہ عالم رازداں ھونے لگا ھے
حریف کار ہوگا کون جُز قیس — وفا کا امتحاں ھونے لگا ھے
جنون شوق کا انجام معلوم
غم سود و زیاں ھونے لگا ھے

دل میں رھے نگاہ سے مستور ھو گئے — جتنے بھی وہ قریب ھوئے دور ھو گئے
کچھ دار سے اُلجھ کے بھی ناکام ھی رھے — کچھ حسن اتفاق سے منصور ھو گئے

کس قدر کیف آفریں ہے وہ نگاہ دلنشیں
خود سمجھتا ہوں مگر سمجھا نہیں سکتا ہوں میں
وہ محبت کی جوانی، وہ ستاروں کا شباب
کتنے افسانے ہیں جو دہرا نہیں سکتا ہوں میں
ہر گھڑی تیرا نشہ، تیرا تصوّر، تیری یاد
وہ حقائق ہیں جنہیں جھٹلا نہیں سکتا ہوں میں

اور مشق جفا سے جلا پائے گی — یہ لگن تو کبھی مٹنے والی نہیں

آنکھیں اُن کی گر اٹھ جائیں — پیمانوں کو مات کریں
کیا شیریں ہے اُن کی حکایت — ذکر یہی دن رات کریں

ابھی تو ہم نفسوں کو ہے وہم چارہ گری
ہوئی نہ درد میں پھر بھی کمی تو کیا ہوگا
یہ تیرگی تو بہر حال چھٹ ہی جائے گی
نہ راس آئی ہمیں روشنی تو کیا ہوگا
نفس نفس میں فغاں ہے، نظر نظر میں ہراس
کچھ اور دن یہی حالت رہی تو کیا ہوگا

اُن کی محفل پہ کچھ نہیں موقوف — سارا ماحول ہی نرالا ہے
سہمی سہمی ہے یوں فضا جیسے — کوئی طوفان آنے والا ہے
وہ بھی آنکھیں دکھا رہے ہیں ہمیں — جن کو آنکھوں میں ہم نے پالا ہے

تیرے ''فارغ'' کی جوانی ایک نغمہ تھا جسے
زندگانی کے سلگتے ساز پر گایا گیا

قطعات

تیرے ہونٹوں میں گیت پلتے ہیں — تیری آنکھوں سے صبح پھوٹتی ہے
سانس رکتی ہے گردشوں کی جب — تیری انگڑائی بن کے ٹوٹتی ہے

دیکھ کر تیرا التفات ناز — ایسی سرعت سے نبض چلتی ہے
جس طرح کوئی ڈوبتی کشتی — بچ کے ساحل پہ آ نکلتی ہے

عشق کیسا؟ یہاں پہ دولت حسن — خوشہ چینوں میں عام بٹتی ہے
یہ سرائے ہے جسمیں زر کے عوض — ہر مسافر کی رات کٹتی ہے

عالم عیش میں کبھی یوں ہی — روح میں کپکپی سی ہوتی ہے
جس طرح غم نصیب دوشیزہ — گھر میں آنکھیں بچا کے روتی ہے

رباعیات

کتنے ہی یہاں ایسے کنول ہوتے ہیں — کھلتے نہیں اور وقف اجل ہوتے ہیں
یہ بات جدا ہے کہ وہ تعمیر نہ ہوں — ہر ذہن میں کچھ تاج محل ہوتے ہیں

اک دل نہیں سرمایۂ غم کے قابل — اک جام نہیں ملتا ہے جم کے قابل
کعبے پر چڑھانے کو بھی دو پھول نہیں — اک شمع نہیں طاق حرم کے قابل

تاثیر زباں کو یہ فسوں کہتے ہیں — سرمایۂ رعنائی کو خوں کہتے ہیں
کس درجہ خرد سے ہیں عاری دنیا والے — پندار کے حاصل کو جنوں کہتے ہیں

ادا جعفری

عزیز جہاں بیگم متخلص بہ ادا بدایوں کی رہنے والی ہیں ۔ جہاں اگست ۱۹۲۴ء میں آپکی پیدائش ہوئی ۔ آپ کے والد قاضی بدر الحسن صاحب مرحوم محکمۂ زراعت میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ادا صاحبہ نے باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد اپنی والدہ کی مشفقانہ تربیت و نگرانی میں گھر پر تعلیم پائی ۔ ۱۹۴۰ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا لیکن چونکہ اردو سے زیادہ شغف تھا اسلئے آپ نے اردو کے مضمون میں خصوصی امتیاز حاصل کیا ۔ اردو کے علاوہ فارسی اور ہندی سے بھی آپ کو خاصا شغف ہے ۔

محترمہ ادا جعفری کا ذوق سخن بھی فطری ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ گو اُن کی شاعری کی عمر ابھی کچھ ایسی زیادہ نہیں لیکن اُن کے کلام میں پختگی کے تمام آثار پائے جاتے ہیں ۔ آپ نے ۱۹۳۸ء تک اختر شیرانی مرحوم سے استفادہ کیا ۔ پھر حضرت جعفرعلی خاں اثر لکھنوی سے اصلاح لینا شروع کی اور کشمیر چلے جانے کے بعد بھی اُن کا دامن نہ چھوڑا ۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۱ء میں استاد موصوف نے خود ہی لکھ بھیجا کہ ''بیٹی اب تمہیں اصلاح کی ضرورت نہیں'' ۔ حضرت اثر جیسے کہنہ مشق و قادر الکلام سخنور کا یہ فقرہ بلا شبہ ادا صاحبہ کے کلام کی صحت کے سلسلے میں ایک قابل قدر سند کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس واقعہ کے بعد ادا صاحبہ کا کلام مختلف رسائل میں شائع ہونے لگا ۔ تاہم آپ کی ادبی شہرت کا مدار زیادہ تر رسالہ '' آجکل '' پر ہے جس میں غالباً ۴۵ء سے آپ کی غزلیں اور نظمیں چھپنا شروع ہوئیں اور پھر تقسیم ہند سے قبل تک برابر چھپتی رہیں ۔ ۱۹۴۶ء تک آپ ادا بدایونی تھیں مگر جعفری صاحب سے شادی ہو جانے کے بعد ادا جعفری ہوگئیں ۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی تشریف لے آئیں لیکن کراچی میں چند سال گزار کر اب ۴۹ء سے راولپنڈی میں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے ۔

ادا جعفری دور حاضر کی بڑی ہونہار شاعرہ ہیں اور اُن کا کلام زندگی کے جدید رجحانات کا ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری موروثی روایات کا ایک عمدہ نمونہ ہے ۔ ادا صاحبہ کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کو موضوع شاعری بنانے کی قائل ہیں ۔ دوسری طرف انھوں نے اقبال،

فانی، جگر، اثر لکھنوی اور اختر شیرانی جیسے مستند شعرا کے طرز و فکر اسلوب بیان سے خاصا استفادہ کیا ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں ''طاؤس و رباب'' سے لیکر '' شمشیر و سناں '' تک کے تمام مراحل بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ طے کئے ہیں اور آج اُن کی ذات سے ہماری شاعری کی بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں ۔

ادا صاحبہ نظم و غزل دونوں کہتی ہیں ۔ نظموں میں انھوں نے پابند و آزاد ہر طرح کی نظمیں کہی ہیں مگر ہیئت کی تبدیلی کے باوجود یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ردیف و قافیہ کے حسن و ترنم کی قائل ہیں ۔ آپ کو منظر نگاری اور رومان انگیز کیفیات کے اظہار پر بڑی قدرت حاصل ہے چنانچہ اُن کی رومانی نظموں میں گو بیان تو وہی عشق و محبت کی رنگینیوں اور سرشاریوں کا ہے مگر طرز ادا میں ایسا والہانہ پن، ترنم اور شگفتگی ہے کہ کہیں کہیں اُن کی آواز پر اختر شیرانی مرحوم کی آواز کا اشتباہ ہونے لگتا ہے اور بلا شبہ یہی خصوصیات اس نغمۂ ناہید کی جاذبیت و اثر آفرینی کی کافی سے زیادہ ضمانت ہیں ۔ منظر نگاری کے سلسلے میں ادا صاحبہ نے نہایت رقصاں و نادر تشبیہات سے کام لے کر اپنے بیان کو موثر بنایا ہے ۔ اس کے علاوہ مظاہر فطرت پر قلم اُٹھاتے ہوئے وہ اپنے دلدوز جذبات کو کچھ اس حسن و لطافت کے ساتھ سموتی ہیں کہ اُن کی منظریہ نظمیں محاکات کا ایک کارنامہ بن جاتی ہیں ۔ مثال کے طور پر '' جوہی کی کلیاں '' ''جھیل'' ''صبح بنارس'' '' بہار کا راگ '' اور ایسی متعدد نظموں میں ادا نے جہاں فطرت کے لطیف مظاہر و مناظر کی تصویر کشی کی ہے وہاں اپنے ساز کے اُس تار کو بھی چھیڑا ہے جس سے غمگین نغمات پیدا ہوتے ہیں ۔

ان موضوعات سے قطع نظر اُنھوں نے زندگی کے نئے مسائل پر بھی طبع آزمائی کی ہے اور بلا شبہ اُن کی شاعری کا یہ حصہ بہت ہی قابل قدر ہے اس سلسلے میں اُن کے یہاں قدیم اُسلوب زندگی سے بیزاری اور بغاوت پائی جاتی ہے تاہم اس بیزاری اور بغاوت کی تہ میں ایک جذبۂ طلب اور ایک پیغام عمل ضرور پوشیدہ ہے ۔ جس کی بدولت شاعرہ نے اُفق کے پار ستاروں کی خوابگاہوں پر اپنے افکار کی کمند پھینک کر ایک نظامِ نو کا سحر آگیں راگ سنا ہے ۔ یہی وہ راگ ہے جسے ادا صاحبہ نے اپنی کئی منظومات میں دھرایا ہے اور اسی کی بدولت اُن کی شاعری محض فن کاری کے دائرے سے باہر نکل کر عوام کی زندگی کے وسیع تر میدانوں میں حقوق انسانیت کے مطالبے کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ چونکہ انھیں زبان و بیان پر پوری قدرت حاصل ہے اسلئے انکی انقلابی شاعری ہیجانی ہونے کی بجائے نہایت شستہ، شائستہ اور موثر ہے ۔

ادا صاحبہ کا مجموعہ کلام '' میں ساز ڈھونڈتی رہی '' ۵۲ء میں شائع ہوا تھا ۔

انتخاب کلام

تغزل

اور کچھ دیر لب پہ آہ رہے اور کچھ اُن سے رسم و راہ رہے

پھر نگاھوں کو آزما لیجئے ! پھر وفاؤں پہ اشتباہ رہے
دل کی آرزدگی بجا ' لیکن وہ بھی محروم یک نگاہ رہے

خلش تیر بے پناہ گئی لیجئے اُن سے رسم و راہ گئی
سامنے بے نقاب بیٹھے ھیں وقعت حسن مہر و ماہ گئی
اُس نے نظریں اُٹھا کے دیکھ لیا عشق کی جرأت نگاہ گئی
مر مٹے جلد باز پروانے اپنی سی شمع تو نباہ گئی
دل میں عزم حرم سہی لیکن اُن کے کوچہ کو گر یہ راہ گئی

با ہزاراں تلطف یزداں کہیں بدلی ھے فطرت انساں
حسن رنگین و دیدۂ حیراں زندگی اور اس قدر ارزاں
مجھے ساحل پہ اعتماد مگر ھے یہ توھین عظمت طوفاں
زلف برھم' نگاہ ژولیدہ کس فسانے کا بن گئے عنواں !

ہزار غنچوں نے چاھا الگ تھلگ رھنا جو کوئی شوخ کرن آپ ھی الجھ جائے
گرہ کشائی شبنم کی داد کیا دیں ' گل ھنسی کے ساتھ ھی آنکھوں میں اشک بھر آئے
تمہیں تو حسن کی ژولیدگی سے شکوہ تھا
''ادا'' یہ کس نے نگاھوں کے راز سلجھائے

بجھا بجھا کے چراغ وفا جلائے ھیں خطا معاف' سمجھ کر فریب کھائے ھیں
جنھیں نصیب تری کم نگاھیاں بھی نہیں وہ کم نصیب ابھی آسرا لگائے ھیں
خدا نکردہ کچھ احسان برق و باد نہیں ھم آرزوئے نشیمن پہ مسکرائے ھیں
بہار ریز اُفق پر دھواں دھواں کیسا چمن کی خیر یہ کس آرزو کے سائے ھیں
فروغ حسن نظر دیکھ کر رھا نہ گیا کہاں پہنچ کے ''ادا'' پاؤں لڑکھڑائے ھیں

وہ بھی آزردۂ نگاہ رہے دل ھی تنہا نہ تھا تماشائی
منزلیں بڑھ کے خود قدم لیتیں میں ھی آغاز رم نہ کر پائی
بھولنے والے بھول کر خوش تھے یاد آئی تو بار بار آئی
التجا اتنی بے اثر تو نہ تھی ھائے پندار ناپذیرائی
دل کا انداز شرمسار ''ادا''
نگہ ناز بھی تو پچھتائی

آجڑنے والوں سے ویرانیوں کا حال نہ پوچھ
غرور حسن تماشا سنور گیا ہوگا
ہزار بار سنوارا جسے نگاہوں نے
ہزار بار وہ نغمہ بکھر گیا ہوگا
جو اک نگاہ خرد آزما پہ مر نہ مٹا
وہ جینے والا بڑا نام کر گیا ہوگا
شعور ناز کا الزام دلفریب "ادا"
نہ جانے کس کی تمنا کے سر گیا ہوگا

اسیر رکھ نہ سکے انجم و قمر کے حصار — تمہیں ملال مجھے ناز جرأت انکار
پیام زندگیٔ نو نہ بن سکیں صدحیف — یہ اودی‌اودی گھٹائیں، یہ بھیگی بھیگی بہار
تو میرے عزم کی پہنائیاں نہ بھانپ سکا — میں دیکھ بھال چکی تیرے ثابت و سیّار

حاصل آہ و فغاں — اک نگاہ بدگماں
ایک آنسو، اک نگاہ — داستاں در داستاں
اُن کے آنے تک "ادا" — ختم تھی ہر داستاں

ناز اٹھے کب دیدۂ تر کے — ہنس ہنس کر کھائے ہیں چرکے
دن بھی راس آئیں کہ نہ آئیں — راتیں تو کاٹیں مر مر کے
آنکھ اٹھی تھی بیگانہ سی — کھائے ہیں دل نے یہ بھی چرکے
رات نے تم کو لوٹا ہوگا — ہم نے دھوکے کھائے سحر کے
تھک گئیں آنکھیں منزل تکتے — پاؤں ہوئے ہیں من من بھر کے
ٹوٹی مالا کون سمیٹے! — بکھرے سپنے جیون بھر کے
آج دوانے کھُل کھیلیں گے
عمریں بیتیں آہیں بھر کے

صبر و ہوش و کلام سے گزرے — بےخودی! کس مقام سے گزرے
ہوش رہتا تو کیا گزر سکتے — بے خبر صبح و شام سے گزرے
خون‌شدہ‌حسرتیں ہیں آنکھوں میں — رنگ صہباو جام سے گزرے
دامن درد تھام تھام لیا — جب بھی مشکل مقام سے گزرے

دل خوں گشتہ کا ملال نہیں — خلش ناتمام سے گزرے
منزلیں کھوگئی ہیں راہوں میں — ہم بھی کس کس مقام سے گزرے
آرزوؤں کو نام بخش دئے — وہ جو بے تنگ و نام سے گزرے
منزلوں نے قدم لئے ہیں ''ادا''
ولولے جس مقام سے گزرے

منظومات

جوھی کی کلیاں

بہار خلد منظر جلوہ گر ہے — ہجوم سبزہ تاحدّ نظار ہے
ہوائے مست ہے بہکی ہوئی سی — فضائے دل نشیں مہکی ہوئی سی
سکوت شب تحیّر آزما ہے — جمال ماہ کیفیت فزا ہے
ہوا کے نرم جھونکے ہیں کہ آہیں — کہ بکھری بکھری نا دیدہ نگاہیں
ستارے یوں پلک جھپکا رہے ہیں — نگاہ شوق سے شرما رہے ہیں
فلک سے چاند کی مغرور کرنیں — و فور شوق سے مسرور کرنیں
برائے سیر گل آئی ہوئی ہیں — زمیں تا آسماں چھائی ہوئی ہیں
سر مژگاں ستارے کانپتے ہیں — کہ جوھی کے شگوفے کھل رہے ہیں
نزاکت آفریں، رعنا، سمن بر — تخیّل کے نشاط انگیز پیکر
کتاب حسن کا عنوان رنگیں! — جواں فطرت کا ارمان بہاریں
جبین غنچہ پر شبنم نہیں ہے — عرق آلود، روئے نازنیں ہے
یہ کلیاں ہیں کہ ماضی کی وہ یادیں — جنھیں ہنگامہ ھائے غم بھلا دیں
بڑے نازوں کی یہ پالی ہوئی ہیں — مئے عشرت سے متوالی ہوئی ہیں
یہ جرأت آزما مبہم اشارے
ہیں کس کے منتظر رنگیں ستارے

نقرئی دھندلکے

ڈھلکے ڈھلکے آنسو ڈھلکے — چھلکے چھلکے ساغر چھلکے
دل کے تقاضے، اُن کے اشارے — بوجھل بوجھل، ھلکے ھلکے

دیکھو دیکھو دامن الجھا ٹھہرو ٹھہرو ساغر چھلکے
اُن کا تغافل، اُنکی توجہ اک دل اُس پر لاکھ تہلکے
اُن کی تمنا، اُن کی محبت دیکھو سنبھلکے، دیکھو سنبھلکے
غم نے اٹھائے سیکڑوں طوفاں دل نے بسائے لاکھ محلکے
پل میں ھنساؤ پل میں رلاؤ! پل میں آجائے پل میں ڈھلکے
ہم نے سمجھا تم نے نہ جانا دل نے مچائے لاکھ تہلکے
لاکھ منایا، لاکھ بھلایا نین کٹورے بھر بھر چھلکے
کتنے الجھے، کتنے سیدھے رستے اُن کے رنگ محل کے

کڑیاں جھیلیں، پاپڑ بیلے
جھلکے اب تو مکھڑا جھلکے

عید نظارہ

مژدہ نگاہ شوق! کہ عید نظارہ ہے
پلکیں کسی کی راہ گزر میں بچھاؤں میں
آمد ہے آج ایک سراپا بہار کی
کس کس طرح نہ غمکدہ اپنا سجاؤں میں
خورشید کی جبیں سے کرن مستعار لوں
مہتاب سے ضیائے جواں مانگ لاؤں میں
دامان ابر تیرہ سے گوھر سمیٹ لوں
قوس قزح کا رنگ عروسی رچاؤں میں
باغ اِرم سے آرزوئے رنگ و بو کروں
روئے شفق سے غازۂ احمر چھڑاؤں میں
شبنم سے اشکہائے گہر تاب چھین لوں
غنچہ کے لعل لب سے تبسم چراؤں میں
بلبل سے پاکبازئی الفت طلب کروں
معصومئی شباب کو پھولوں سے چھاؤں میں
جذب و وفا و ھمت پروانہ چاهئے
پھر گداز و سوز سوئے شمع جاؤں میں
رنگینیاں شراب سے تھوڑی سی مانگ لوں
اور سادگئی طفلک معصوم پاؤں میں!

ظلمت میں ہوگا نور فشاں ماہ نیم ماہ
بہرِ نثار اغر انجم منگاؤں میں !
وہ اور میرے گھر میں ہوں مہماں خوشا نصیب !
گلہائے اشک سرخ سے دیپک جلاؤں میں
آنکھوں کو میری دولت دیدار ہے نصیب
خود کو نہ اُن کے شوق میں کیوں بھول جاؤں میں
وہ ابتدا سے آج سنیں گے حدیث غم
بلبل کی طرز نغمۂ رنگیں اڑاؤں میں
جب حسن ہی نیاز پہ مائل ہو اے ندیم
پھر کیا صلاح آج نہ کیوں روٹھ جاؤں میں
اے اضطراب شوق ! سنبھلنے دے اسقدر
ہاتھوں پہ رکھ کے دل کو پئے نذر لاؤں میں
اور اُس کے بعد عرض کروں حکم ہو اگر
رنگین ایک مطلع ''ادا'' کا سناؤں میں
'' اے چشم مست تیرا اشارہ جو پاؤں میں
جو نغمے سو رہے ہیں انہیں بھی جگاؤں میں ''

میں ساز ڈھونڈتی رہی

بہار کھلکھلا اٹھی
جنوں نواز بدلیوں کی چھاؤں میں
جنوں نواز بدلیوں کی چھاؤں میں بہار کھلکھلا اٹھی
ہر ایک شاخ لالہ زار سجدہ ریز ہوگئی
ہر ایک سجدہ ریز شاخسار پر طیور چہچہا اٹھے
ہوائے مرغزار گنگنا اٹھی
فضائے نو بہار لہلہا اٹھی
ہوائے نو بہار میں، فضائے مرغزار میں حیات مسکرا اٹھی
جنوں نوازیاں بڑھیں
فسانہ سازیاں بڑھیں
ادائے ناز کی کچھ اور بے نیازیاں بڑھیں
کچھ اس ادائے ناز سے بہار کھلکھلا اٹھی

جنوں نواز آودی آودی بدلیوں کی چھاؤں میں !
مگر بہار کو ابھی تک آرزوئے نغمہ تھی
شہید کیف انتظار و جستجوئے نغمہ تھی
نوائے شوخ و مست و دلنواز ڈھونڈنے لگی
بصد غرور و افتخار و ناز ڈھونڈنے لگی
میں ساز ڈھونڈتی رہی
بہار کی فضاؤں میں
جنوں نواز بدلیوں کی بھینی بھینی چھاؤں میں
میں محو جستجو رہی
مگر یہ میری بھول تھی
حیات اپنی رس بھری کہانیاں سنا چکی
ہوائے مرغزار لوریاں سنا کے جا چکی
فضائے نو بہار جام ارغواں لنڈھا چکی
بہار کی نشیلی انکھڑیوں میں نیند آ چکی
مگر میں ڈھونڈتی رہی
مجھے وہ ساز دلنواز آج تک نہ مل سکا
وہ آودی آودی بدلیاں کہ فخر صد بہار تھیں
فلک کی چشم خوں فشاں سے اشک بن کے ڈھل چکیں
دکھائی دے رہی ہے کائنات کچھ لٹی لٹی
دھوئیں کی بوُ سے ہے فضا کی سانس بھی گھٹی گھٹی
زمیں پہ شعلہ باریاں، فلک پہ گڑگڑاہٹیں
کہ سن رہے ہیں چشم و دل نظام نو کی آہٹیں
بہار بیت ہی چکی خزاں بھی بیت جائیگی
مگر میں ایک سوچ میں پڑی ہوئی ہوں آج بھی
وہ میری آرزو کی ناؤ کھے سکے گا یا نہیں
نظام نو بھی مجھ کو ساز دے سکے گا یا نہیں ! ؟

قافلہ

قافلے آئے گئے
قافلے آئے نگاہوں نے بچھایا دامن

تیرہ و تار فضاؤں نے جلا لیں شمعیں
آئینہ گردش ایام کو دکھلانے لگے
وقت کے لب پہ نئے زمزمے اترانے لگے
رات کے اشک سیہ تاب کے ساغر ڈھلکے
اَن کہے راز ستاروں کی نگہ سے چھلکے
ناز کرتا ہوا زر کار سجیلا آنچل
مسکراتا ہوا مدھوش رسیلا کاجل
داستانیں ہوئیں تصنیف بہ عنوان وفا
لیلئ شوق سے باندھے گئے پیمانِ وفا
زندگی مچلی اُمنگوں کا اشارا پا کر
جاگ اُٹھی پھوٹتی کرنوں کا سہارا پا کر
آگ سی لگ گئی سینے میں کہستانوں کے
زمزمے گونج اُٹھے مست حدی خوانوں کے
قافلے آئے گئے
قافلے گزرے، نگاہوں نے سمیٹا دامن
تھرتھراتے ہوئے لمحوں نے بجھا دیں شمعیں
کیف بردوش فضاؤں پہ اندھیرے لپکے
بھوت بن بن کے خلاؤں میں بگولے لپکے
راز داں تاروں کی معصوم نگاہی بھی نہیں
ظلمت دشت میں بھٹکا ہوا راہی بھی نہیں
بے وفا راھوں میں پیمان سفر کھو بھی چکا
وقت کے ھاتھ میں یادوں کا دیا بھی نہ رہا
ریت کے ماتھے پہ نقش کف پا بھی نہ رہا

ریت کے ماتھے پہ نقش کف پا بھی نہ سہی
وقت کے ھاتھ میں یادوں کا دیا بھی نہ سہی

حوصلے اور نئی شمعیں جلائیں گے ابھی
نئے راهی، نئی منزل، نیا سامان سفر
نئے پیماں، نئے عزم، نئی شان سفر
ظلم پر وردہ تمناؤں کی شہ پائے ہوئے
سر اٹھائے ہوئے بپھرے ہوئے، تھرائے ہوئے
زخم کھائے ہوئے کُچلے ہوئے ٹھکرائے ہوئے
یعنی ہر گام پہ منزل کی قسم کھائے ہوئے
قافلے اور اسی راہ سے آئینگے ابھی!

خاطر غزنوی

محمد ابراہیم بیگ اصل اور خاطر غزنوی قلمی نام ہے ۔ خاطر تخلص کرتے ہیں ۔ وطن پشاور ہے جہاں ۵ نومبر ۱۹۲۵ء کو آپ کی پیدائش ہوئی ۔ تعلیم بنوں اور پشاور میں حاصل کی ۔ میٹرک تک اسکول میں پڑھا ۔ پھر پرائیویٹ طور پر پشتو فاضل اور ایف ۔ اے پاس کیا ۔ آجکل بی ۔ اے کی تیاری میں مصروف ہیں ۔ اس کے علاوہ عجائب گھروں کے رکھ رکھاؤ سے متعلق Meuseology کا کورس بھی پاس کر چکے ہیں ۔

خاطر صاحب ریڈیو پاکستان پشاور میں ملازم ہیں ۔ لیکن اس مشغلہ سے قطع نظر اُن کا بیشتر وقت ادب و شعر کی خدمت میں گزرتا ہے ۔ اس سلسلے میں وہ کئی تہذیبی اور ادبی انجمنوں کے امتیازی کارکن بھی رہے ہیں بالخصوص انجمن ترقی اُردو (سرحد) کے تو وہ بڑے مخلص و سرگرم کارکن ہیں ۔ اُن کا شمار صوبہ سرحد کے اُن با ذوق نوجوانوں میں ہوتا ہے جنھوں نے پچھلے چند سالوں میں اس علاقہ میں اُردو کی ترویج و اشاعت کے لئے مسلسل جد و جہد کی اور اُن کی یہ پر خلوص کوششیں اب بھی بڑی مستعدی کے ساتھ جاری ہیں ۔ ان ادبی خدمات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ خاطر صاحب کئی اخباروں اور رسالوں کے مدیر رہ چکے ہیں ۔ اس ضمن میں آپ کا تازہ شاہکار ماہنامہ ”زندگی“ ہے جسے آپ نے اپنے رفیق کمال حیدر آبادی کی معیت میں نکالا مگر معلوم نہیں کن وجوہ کی بنا پر اس کا صرف ایک ہی شمارہ دسمبر ۱۹۵۳ء میں نکل کر رہ گیا حالانکہ ادبی نقطۂ نظر سے یہ بڑا اچھا پرچہ تھا اور پاکستان کے مختلف ادبی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا تھا ۔

خاطر غزنوی اُردو شاعری کی نئی پود کے ایک ہونہار سخنور ہیں اور پشاور کے نوجوان شعرا میں اُن کی خوش گوئی ممیز و ممتاز سمجھی جاتی ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کی شاعری کی عمر ابھی مختصر ہے مگر یہ اُٹھان ایک عظیم‌الشان انتہا کا پیش خیمہ ضرور ہے ۔ خاطر صاحب کی شاعری کی ابتدا گو غزل سے ہوئی لیکن نظموں اور گیتوں کی طرف اُن کا رجحان زیادہ ہے ۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزلیات میں وہی نرمی اور لوچ ہے جو گیتوں کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے ۔ تاہم وہ دلکشی ، وہ رعنائی اور وہ دلنشینی جو اُن کی نظموں میں پائی جاتی ہے ۔ اُن کی دوسری تخلیقات میں نسبتاً کم ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُنھوں نے اس صنف میں اپنے شدید احساس ، بیدار فکر اور لطیف فن کے جوہر زیادہ سے زیادہ سمونے کی کوشش کی ہے ۔

خاطر غزنوی کی منظومات رومانی اور انقلابی موضوعات پر مشتمل ہیں - اُن کی رومانی نظموں میں ، خیال انگیزی اور حسن و شباب سے شیفتگی سب کچھ موجود ہے لیکن ان محاسن سے زیادہ جو چیز قابل قدر ہے وہ یہ کہ رومانیت کی نازک بلکہ خطرناک راہ میں اس نوجوان شاعر سے کہیں لغزش نہیں ہوتی اور اُس نے یہ راہ کم از کم اب تک بڑی پا مردی سے طے کی ہے - اسی لئے خاطر کی اکثر رومانی تخلیقات ذاتی مشاہدہ سچے جذبات اور صحت مندانہ ذہنی کیفیات کی پیدا وار ہیں اور اُن میں محض تخیل پرستی یا سستی جذباتیت کے بجائے زندگی کا صحیح احساس اور حالات کا صحیح شعور جھلکتا ہے - ساتھ ہی وہ چونکہ بڑے سنجیدہ اور باہوش نوجوان ہیں اس لئے اُنہیں جذبات پر اس درجہ قابو حاصل ہے کہ بقول شخصے وہ بہکنے کی جگہوں پر بھی نہیں بہکتے اور اُن کے کردار کی اس خصوصیت کا اثر یہ ہوا ہے کہ اُن کی شاعری بالخصوص رومانی کلام بڑا متوازن ہے -

جہاں تک خاطر غزنوی کی انقلابی نظموں کا تعلق ہے اُن کے یہاں انسان دوستی ، عام خوشحالی اور عالمی امن و آشتی کی ایک مسلسل آرزو ہے اور یہی وہ آرزو ہے جو اُنہیں زندگی سے زیادہ قریب لے آئی ہے - چنانچہ اب یہ کیفیت ہے کہ کہ ہر انسانیت کش واقعہ اور ہر امن سوز تحریک پر اُن کا دل کڑھتا ہے اور وہ ایسے واقعات و تحریکات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں - مگر قابل تعریف بات یہ ہے کہ وہ جب اپنی اس صدائے احتجاج کو شعر کے قالب میں ڈھالتے ہیں تو فن کے تقاضوں کا ضرور خیال رکھتے ہیں - جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کی انقلابی نظمیں نعرہ بازی کے بجائے ٹھوس حقائق کی دلنشیں ترجمان بن جاتی ہیں - ہاں یہ ضرور ہے کہ اُن کا فن ابھی ارتقائی منازل طے کر رہا ہے اور ایسی صورت میں اُن کے یہاں وہ پختگی و مشاطگی تلاش کرنا فضول ہے جو اساتذہ کے لئے مخصوص ہوا کرتی ہے بایں ہمہ اُنہوں نے زبان و بیان پر جیسا عبور حاصل کر لیا ہے وہ لائق ستائش ہے - بالخصوص اچھوتی ترکیبیں اور نادر و رقصاں تشبیہات وہ خوب استعمال کرتے ہیں -

خاطر غزنوی افسانہ نگار بھی ہیں اور اُن کی کہانیوں کا مجموعہ ''افسانہ'' اور ایک ناولٹ ''پھول اور پتھر'' چھپ بھی چکے ہیں - لیکن مجموعہ کلام اب تک نہیں شائع ہوا ہے - خاطر صاحب کی ادبی کاوشوں کے ضمن میں یہ بات بھی کہنا ضروری ہے کہ اُنہوں نے پشتو ادب اور کلچر پر مضامین اور پشتو شہ پاروں کے اُردو تراجم بھی کئے ہیں -

انتخاب کلام

منظومات

خانہ بدوش

زندگی رقص میں ہے ، رقص حسیں کرنوں کا
نقرئی نغمے ہیں شب تاب فضاؤں پہ محیط

شہر سے دور جنوں زار محبت کے قریب
چند خیموں میں سمٹ آئی ہے دنیائے بسیط

مسکراہٹ کے ہر اک سمت ہیں پرچم پرّاں
قہقہے بہکی فضاؤں میں ہیں رقصاں رقصاں
دُودھیا چہروں پہ ہے کیف کا عالم طاری
غم کہیں دور چھپا بیٹھا ہے مضطر، حیراں

ہر الاؤ پہ ہے آزاد ترانوں کا ہجوم
سرد نغمے بھی یہاں آ کے پگھل جاتے ہیں
اور ان گیتوں کی آزاد دھنوں میں گھل کر
اسی ماحول کی رنگینی میں ڈھل جاتے ہیں

ہر نئی صبح کو رہ جاتے ہیں کچھ راکھ کے ڈھیر
دور اڑتا ہے کہیں کشمکشِ نو کا غبار
ہر پڑاؤ پہ انہیں کرتی ہے رخصت آ کر
نئے جذبوں کی مہکتی ہوئی زرکار پھوار

زندگی ایک چھناکا ہے پری زادوں کا
کون اڑتے ہوئے نغمات کو محبوس کرے
کون بہتی ہوئی آوارہ کِرن کو روکے
کون آزاد کو زندانوں سے مانوس کرے

بہن

شعور آیا تو احساسِ بیکسی لایا
مری حیات تھی تنہائیوں کے گھیرے میں
خلوص ششدر و حیراں، وفا خموش و ملول
بھٹک رہی تھی محبت مری اندھیرے میں

چراغِ شوق نے تاروں سے روشنی مانگی
ہوئی تلاش تقدّس مری نگاہوں کو
مرے ضمیر نے مجھ سے قدم قدم پہ کہا
ہے لوریوں کی ضرورت ترے گناہوں کو

مآلِ کار تجسس نے روشنی پائی
اُمنگ مجھ کو مجسم ملی ہیولوں میں
وہ خواب جو کبھی خوابوں میں بھی نہ دیکھا تھا
وہ آج جھول رہا تھا یقیں کے جھولوں میں

میں بے قرار تھا لپکا اُمنگ کی جانب
لئے یہ عزم کہ دل میں اسے بٹھا لوں گا
ہزار تیرہ سہی زندگی کی راہ مگر
میں اس چراغ سے ماحول کو اُجالوں گا

ابھی بڑھا بھی نہ تھا میں کہ آس کے سائے
تڑپ کے ڈوب گئے ملگجے دھندلکوں میں
ابھی ابھی جو مجسم تھا اک حقیقت تھا
وہ خواب سو گیا پھر بے قرار پلکوں میں

مری سسکتی تمنا پہ لوگ ہنستے رہے
یہ خار ازل سے مری روح میں کھٹکتا رہا
مری تلاش میں لیکن کبھی کمی نہ ہوئی
میں کھوئے سائے کی دُھن میں سدا بھٹکتا رہا

نگاہ شوق نے ہر بار گمشدہ سایہ
ہوس نصیب فریبوں کی دھوپ میں دیکھا
وہ لفظ جو مری آوارگی کا عنوان تھا
بڑی ہی تلخ حقیقت کے روپ میں دیکھا

قدم قدم پہ وفا کے دیے جلائے ہوئے
مرے خلوص نے اُس کو پکارنا چاہا !
مگر حریص نگاہوں نے ، پھیلے ہاتھوں نے
ہوس کے شیشے میں مجھ کو اُتارنا چاہا !

مری جھجک نے مری پیاس اور بھڑکا دی
گھنے اندھیروں میں سائے بھی ہوگئے تحلیل
وہ لفظ ملتا ہے اب بھی مگر خلوص بغیر
کھنکتے سکّوں میں ہو جائے گر وفا تبدیل

نظر نظر نے ہوس کے محل کئے تعمیر
مگر دیار وفا میں نہ رہ سکی کوئی
لبوں پہ نت نئی فرمائشیں رہیں لیکن
خلوص قلب سے بھائی نہ کہہ سکی کوئی

خمارِ گندم

آئینہ ہی نہیں میں محرم جذبات بھی ہوں
میں ہر انداز سے واقف ہوں کہ ہوں رمز شناس
آج اس چال میں کچھ ایسا فسوں ہے جس سے
مجھ کو آتی ہے ترے ریشمی احساس کی باس

ترے سینے میں ہے اَن جانے سے شعلے کی لپک
اور بدن تیرا کوئی بولتی تصویر سی ہے
تیری ہر ٹوٹتی انگڑائی کی مجروح کماں
رات کے نور فشاں خواب کی تعبیر سی ہے

تیری ہر بات میں شبنم کی اڑنوں کی طلب
تیری ہر سانس میں سرگوشیاں رومانوں کی
تیری ہر فکر میں اک تازہ غزل کی دستک
تیری ہر سوچ میں کیفیتیں افسانوں کی

تیری پلکوں میں امنگوں کے ستارے پنہاں
تیرے ہونٹوں میں تڑپتی ہوئی اظہار کی مے
تیری آنکھوں میں تجسس، تری نظروں میں تلاش
تیرے نغمات کی کچھ اور ہی دُھن اور ہی لَے

تیری نس نس میں امنگوں کا مچلتا ہوا خوں
تیرے انگ انگ سے اٹھتا ہوا خوشبو کا غبار

تیرے چہرے پہ یہ پھیلا ہوا پھولوں کا شباب
جاگا جاگا سا تیرے جسم میں احساس بہار
تیرے جذبات میں آمڈی ہوئی لہروں کا خروش
تیرے افکار پہ کچھ شوخ سے رنگوں کی پھوار
تیرے انداز میں کھلتے ہوئے مستی کے گلاب
تیرے احساس میں ڈھلتا ہوا گندم کا خمار
جیسے جنگل میں ہو طاؤس کوئی رقص کناں
رنگ ہی رنگ بکھرے ہوئے اودے نیلے
اور رقصندہ فقط ایک تمنا کا اسیر
کوئی دیکھے ، کوئی آئے ، مرے آنسو پی لے

سلامتی کونسل

لڑ کھڑائی ہوئی ذہنتیں ، تاریک شعور
شوق تسخیر دماغوں میں ابھی زندہ ہے
دل میں تخریبی تجسس ابھی تا بندہ ہے
جنتیں آگ کے شعلوں کی فصیلوں میں اسیر
زندگی خون کے طوفانوں میں کر لاتی ہوئی
موت ہر گام پہ پھنکارتی منڈلاتی ہوئی
شوکتی گولیاں ، غُرّاتے ہوئے بھاری ٹینک
بھنبھناتے ہوئے طیّارے برستے ہوئے بم
اپنے ہی واسطے انسان نے تراشے ہیں ستم
اور پھر اپنے ہی زخموں کے مداوے کے لئے
جھلملاتے ہوئے ایوان سجا رکھے ہیں
چند لچکیلے سے قانون بنا رکھے ہیں
زندگی جب کہیں ہو جاتی ہے شعلوں میں اسیر
سب یہاں سوچتے ہیں سوچتے رہ جاتے ہیں
مشورے خون کے سیلاب میں بہہ جاتے ہیں
رات بھر جلتے رہیں گر یوں ہی سوچوں کے چراغ
راکھ ہو جائیں گے پروانے سحر ہونے تک
" کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک "

نظم معرا

لوک گیت

پرے شہر سے
خشک ٹیلوں کے دامن میں
ایک پھول مہکا
حسیں اور انوکھا
نیا اور نویلا
مہک دلنشیں اور رنگوں میں یکتا
مگر سارے پھولوں سے بالکل الگ اور بالکل اکیلا

ہر اک لب پہ اس پھول کے تذکرے ہیں
اسے کس نے بویا
اسے کس نے سینچا
وہ مالی کہاں ہے !
وہ مالی کہاں ہے !!
وہ مالی کہاں ہے !!!

گیت

''اور دبانے سے ابھرے گی، گیتوں کی گنجار''

چلتی آندھی رک نہیں سکتی
اڑتی بدلی جھک نہیں سکتی
ننھی لہریں روک سے بن جاتی ہیں خونی دھار
اور دبانے سے ابھرے گی گیتوں کی گنجار
کوئی قلم کو توڑ بھی ڈالے
ہونٹوں پر پڑ جائیں تالے
لیکن پھر بھی سچ کی ہوگی ہر سو جے جے کار
اور دبانے سے ابھرے گی ، گیتوں کی گنجار
او چیخوں سے ڈرنے والے
انگلی کان میں دھرنے والے

اُڑتا پنچھی قیدی ہو کر اور مچائے رار
اور دبانے سے اُبھرے گی گیتوں کی گنجار
تانیں گہری ہو جائیں گی
لہریں زہری ہو جائیں گی
چاروں کھونٹ بکھر جائے گی میری ہا ہا کار
اور دبانے سے اُبھرے گی گیتوں کی گنجار
لاکھ مٹا ، آباد رہیں گے
گیت سدا آزاد رہیں گے
پائل چاہے قید ہو لیکن قید نہیں جھنکار
اور دبانے سے اُبھرے گی گیتوں کی گنجار

تغزل

بصد یقیں بڑھے حدِّ گماں سے لوٹ آئے
مری نظر کے تقاضے کہاں سے لوٹ آئے
گلوں کی محفل رنگیں میں خار بن نہ سکے
بہار آئی تو ہم گلستاں سے لوٹ آئے
بلا رہی ہیں جو تیری ستارہ بار آنکھیں
مری نگاہ نہ کیوں کہکشاں سے لوٹ آئے
فریب ہم کو نہ کیا کیا اس آرزو نے دئے
وہی تھی منزل دل ہم جہاں سے لوٹ آئے

جب اُس زلف کی بات چلی — ڈھلتے ڈھلتے رات ڈھلی
اب کے بھی تم دور رہے — اب کے بھی برسات چلی
اُن آنکھوں میں لوٹ کے بھی — اپنے اوپر بات نہ [illegible]لی
''خاطر'' یہ ہے بازیٔ دل — اس میں جیت سے مات بھلی

کتنا بھولا ہے پروانہ اس پر جان دے دیتا ہے
جو اک ہلکے سے جھونکے کو اپنا میت سمجھتی ہے

زندگی کی راھوں میں غم بھی ساتھ چلتے ھیں
کوئی غم میں ھنستا ہے کوئی غم میں روتا ہے

باقی صدیقی

محمد افضل اصلی اور باقی صدیقی ادبی نام ہے ' باقی تخلص کرتے ہیں۔ آبائی وطن قصبہ ''سہام'' ضلع راولپنڈی ہے۔ یہیں ۲۰ دسمبر ۱۹۰۹ء کو باقی صاحب کی پیدائش ہوئی۔ بد قسمتی سے بچپن ہی میں شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اس لئے میٹرک سے زیادہ تعلیم نہ حاصل کر سکے اور اسکول سے نکلتے ہی فکر روزگار نے آ گھیرا۔ ابتدا میں آپ تقریباً پانچ سال تک ضلع راولپنڈی کے دیہاتی اسکولوں میں مدرس کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور اسی دوران میں جے۔ وی کا امتحان بھی پاس کر لیا مگر اس کے باوجود اس فضا میں وہ اپنے آپکو کو ڈھال نہ سکے چنانچہ ملازمت سے سبکدوش ہو کر بمبئی چلے گئے۔ بمبئی میں تین سال تک باقی صاحب کا قیام رہا۔ اس دوران میں انہوں نے فلمی شوق کے پیش نظر دو ایک کمپنیوں میں کام کیا۔ آخر اس مشغلہ سے بھی بیزار ہوکر وطن واپس آ گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو چکا تھا اور فوج میں بھرتی ہو رہی تھی۔ جناب باقی نے بھی حالات سے مجبور ہو کر موقع غنیمت جانا اور حوالدار کلرک ہو گئے۔ دو سال بعد آپ فوج سے علیحدہ ہوئے تو آرڈننس ڈپو میں ملازمت اختیار کر لی۔ مگر یہ سلسلہ بھی تین سال سے زیادہ نہ چل سکا۔ پھر آپ ایم۔ ای۔ ایس کے محکمہ میں چار سال تک کام کرتے رہے۔ ۱۹۴۹ء میں والدہ کی وفات پر یہ ملازمت بھی ترک کرنی پڑی۔ ۱۹۵۰ء میں آپ ہفتہ وار ''راہ و منزل'' راولپنڈی کے ادارے میں شامل ہوگئے۔ ۱۹۵۱ء میں ریڈیو پاکستان پشاور سے متعلق ہو گئے لیکن قسمت نے یہاں بھی یاوری نہ کی اور ۱۹۵۳ء کی تخفیف میں آپ کو اس جگہ سے علیحدہ ہونا پڑا۔ فی الحال اپنے وطن ''سہام'' میں قیام پذیر ہیں اور فکر شعر کے علاوہ اپنا دوسرا مجموعہ کلام مرتب کر رہے ہیں۔

پچھلے چند سالوں میں اردو شاعری میں جو شعرا ابھرے ہیں ان میں جناب باقی صدیقی ایک نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ غالباً سب سے پہلے سید وقار عظیم صاحب کی ادارت کے زمانے میں ان کی غزلیں ''ماہ نو'' میں چھپنا شروع ہوئیں لیکن رفتہ رفتہ پاکستان کے اس معروف جریدہ کے علاوہ ان کا کلام یہاں کے تقریباً ہر مقتدر پرچے میں جگہ پانے لگا۔ اور اس میں شک نہیں کہ آج ان کا شمار ہماری نئی پود کے ہونہار متغزلین میں ہوتا ہے۔ آپ غزل کے ماسوا کبھی کبھی نظمیں بھی کہتے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزل سے انہیں خاص شغف ہے چنانچہ اس صنف سخن میں وہ فکر و فن کی خصوصیات کو جس خوش اسلوبی سے سمو لیتے ہیں نظموں میں وہ بات نہیں پیدا ہو پاتی۔

غزلگوئی میں بھی ان کا فن ابھی ارتقائی منازل طے کر رہا ہے بایں ہمہ انہوں نے

اب تک جو کچھ کہا ہے اُس کے پیش نظر یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ اُنہوں نے اُردو غزل کے کلاسیکی انداز و اُسلوب کو اپنایا ہے اور غالباً وہ اسی کو اپنے لئے بہترین پیرایۂ اظہار سمجھتے ھیں ۔ ھاں باعتبار موضوع اُنہوں نے قدما پر یہ فضیلت ضرور حاصل کی ہے کہ جدید متغزلین کی طرح غم ذات کے ساتھ غم کائنات کو بھی اپنے کلام میں جگہ دے کر اُسے زیادہ حسین ' زیادہ دلکش اور زیادہ حقیقت افروز بنا دیا ہے ۔ خصوصیت کے ساتھ اُن کی چھوٹی بحر کی غزلیں اپنی صفائی و سادگی ' ایمائیت و اشاریت ' نرمی و روانی اور موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے بڑی دلکش اور کامیاب ھیں ۔

حضرت باقی دیار شعر میں نووارد ھونے کے باوجود بڑے محتاط سخنور ھیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے تغزل میں صالح جذبات کی ترجمانی ' فن کی پابندی ' زبان و بیان اور ادبی روایات کا احترام سب کچھ موجود ہے ۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ایک روائتی و رسمی شاعر ھیں ۔ اُن کے یہاں وہ جذبات و احساسات بھی ھیں جن کا تعلق براہ راست زندگی سے ہے وہ کیفیات بھی ھیں جو شاعر کو شاعر بناتی ھیں ۔ وہ دردمندی و خلوص اور انسانی ھمدردی بھی ہے جو نظر میں وسعت پیدا کرتی ہے اور جس کے بغیر فن ایک بے جان پیکر کے سوا کچھ نہیں ھوتا ۔

باقی صاحب کے کلام کی سب سے بڑی خوبی اُسکا سلجھا ھوا انداز ہے ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کے ذھن میں کوئی اُلجھن نہیں ہے اور وہ اپنی واردات قلبیہ اور مشاھدات کو بغیر کسی ایچ پیچ یا پیترا دکھائے سیدھے سادے انداز میں قلم بند کرنے کے عادی ھیں ۔ اُن کے اشعار میں نرمی و سادگی کے ساتھ ساتھ سوز و گداز کی کچھ ایسی فن کارانہ آمیزش ہے کہ قاری کے دل میں کھنک کے ساتھ ایک کسک بھی جاگ اُٹھتی ہے ۔ بلکہ بعض جگہ جہاں اُن کے مجروح شخصیت کا پرتو زیادہ صفائی سے جھلکا ہے یہ کسک اور بھی بڑھ جاتی ہے مثال کے طور پر اُن کے یہ چند شعر ملاحظہ ھوں ۔

یوں موت کے منتظر ھیں ''باقی''   مل جائیگا چین جیسے مر کے
دیکھ کر ابر وہ کیوں کر خوش ھوں   جنکی تقدیر میں شبنم بھی نہیں
عشق میں بھی نہ کچھ ملا ''باقی''   اور دنیا کے کام سے بھی گئے

ان کے ایک ایک لفظ سے ناکامی و نامرادی اور حسرت و اندوہ ٹپکتا ہے ۔ لیکن چونکہ وار بھر پور اور پیرایۂ اظہار بے ساختہ ہے اسلئے بات میں دلنشینی اور اثر پیدا ھو گیا ہے ۔

غرض حضرت باقی کی شاعری میں اچھے اُسلوب اور سچے خیال کی کارفرمائی موجود ہے اور ایک روشن مستقبل اُن کے سامنے ہے ۔ خدا کرے کہ وہ اسی کاوش و خلوص کے ساتھ اپنے فن کو سنوارتے رھیں تاکہ آئیندہ اُن کے کلام میں زیادہ سے زیادہ ' پختگی ' مشاطگی اور فنی رچاؤ پیدا ھو سکے ۔

انتخاب کلام

غزلیات

جوشِ جنوں میں زیست کے سارے نشاں جلے
منزل جلی ، مقام جلے ، کارواں جلے

سُونی پڑی ہوئی ہیں محبت کی محفلیں
دشمن جلے ، رقیب جلے ، مہرباں جلے

فصلِ بہار میں جو نکالے گئے ندیم
اُن کی بلا سے باغ جلے ، باغباں جلے

مجبوریوں کا نام ہی شاید ہے بیکسی
نظروں کے سامنے ہی کئی آشیاں جلے

اہلِ فغاں تو کر کے فغاں مطمئن ہوئے
سوزِ نہاں میں جتنے جلے بے زباں جلے

''باقی'' ستم گروں کی ادائے ستم نہ پوچھ
زنداں وہیں بنے ہیں نشیمن جہاں جلے

منزل کے رہے نہ رہگذر کے
اللہ رے حادثے سفر کے

چپ ہو گئے یوں اسیر جیسے
جھگڑے تھے تمام بال و پر کے

جب اُن کو خیال وضع آیا
انداز بدل گئے نظر کے

اے بادِ سحر نہ چھیڑ ہم کو
ہم جاگے ہوئے ہیں رات بھر کے

یوں موت کے منتظر ہیں باقی
مل جائے گا چین جیسے مر کے

زمانہ گم ، زمیں گم ، آسماں گم
خیالِ دوست میں سارا جہاں گم

بڑھی جاتی ہے راہِ منزلِ غم
ہوا جاتا ہے میرِ کارواں گم

تغیّر آشنا ہے سطحِ دریا
کبھی کشتی ، کبھی موجِ رواں گم

چمن کی وسعتوں سے شور اُٹھا
قفس میں ہو گئی برقِ تپاں گم

بہت نازک ہے منزل دوستی کی   یہیں ہوتا ہے ہر اک مہرباں گم
نظر اٹھی ہی تھی سُونے زمانہ   ہوا اتنے میں تیرا آستاں گم
محبت ڈھونڈتی پھرتی ہے ''باقی''
جہاں نے کر دیا ہم کو کہاں گم

سرسری ربط کی امید ہی کیا   اس پہ یہ ظلم کہ ایسا بھی نہیں
کتنے اونچے تھے جہاں سے گویا   آسماں تھی ترے کوچے کی زمیں
دیکھ کر ابر وہ کیوں کر خوش ہوں   جن کی تقدیر میں شبنم بھی نہیں
حادثہ ہے کوئی ہونے والا   دل کے مانند دھڑکتی ہے زمیں
دیکھ کر رنگ تری محفل کا   ہم نے غیروں کی طرح باتیں کیں
ہم نے تیور تو بدلتے دیکھے   پھر کہا آپ نے ''کیا یاد نہیں''
چھوڑ گیا میرا فسانہ ''باقی''
اور پھر انکی نگاہیں نہ اٹھیں

کس کی راتیں کہاں کی برساتیں   آپ کے ساتھ ہی تھیں سب باتیں
میکدہ ہے جناب شیخ یہاں   کون سنتا ہے آپ کی باتیں
غمزدوں کا ہے کام کیا ''باقی''   یا شکایات یا منا جاتیں

دل کیلئے حیات کا پیغام بن گئیں   بے تابیاں سمٹ کے ترا نام بن گئیں
کچھ لغزشوں سے کام جہاں کے سنور گئے   کچھ جرائتیں حیات پہ الزام بن گئیں

اس انہماک سے تیری نظر کو دیکھ رہا ہوں
میں جیسے حاصل شام و سحر کو دیکھ رہا ہوں
ابھی سنائے نہیں میں نے تیرے حسن کے قصے
ابھی جہاں کے مذاق نظر کو دیکھ رہا ہوں
تم آ ہی نکلو گے جیسے ابھی کہیں نہ کہیں سے
کچھ اس امید سے ہر رہگذر کو دیکھ رہا ہوں
ادھر رفیق شبانہ ' ادھر تمام زمانہ
کدھر چلے گا میں اب راہبر کو دیکھ رہا ہوں

نہ وہ فسانۂ ساقی ، نہ وہ غم مئے باقی
عجیب رنگ میں قلب و جگر کو دیکھ رہا ہوں

اور جا جا کے عرضِ حال کرو　　لو سلام و پیام سے بھی گئے
راس آئی نہ میکدہ طلبی　　تشنہ لب ایک جام سے بھی گئے
تیرے دم سے کسی کا نام سہی　　اور جو اپنے نام سے بھی گئے
عشق میں بھی نہ کچھ ملا باقی　　اور دنیا کے کام سے بھی گئے

بیداری کا نام فراق　　آنکھ لگی اور آپ ملے
باس بھی ہم تک آ نہ سکی　　پھول کچھ اتنی دُور کھِلے
قدم قدم پر پہرہ تھا　　ملنے والے پھر بھی ملے
جن پر ناز کیا ''باقی''　　ایسے بھی کچھ داغ ملے

یاد آئی کیا تیری بات　　نیند نہ آئی ساری رات
تم بھی واپس لا نہ سکو　　اتنی دور گئی ہے بات
رسوائی کا نام بُرا　　جب چھیڑو تازہ ہے بات
ہم بھی چپ ہیں تم بھی خاموش　　اس کو کہتے ہیں حالات
جب عرض غم کی باقی
ہنس کر ٹال گئے وہ بات

جانے وہ چپ رہے ہیں کیوں ورنہ　　بات کرنے کے تھے بہانے سو
یوں لرزتی ہے دل میں یاد تری　　جیسے پانی میں چاند کا پرتو
ہر نئے موڑ پر اُبھرتی ہے　　زندگانی بھی صورت مہ نو!
رہبروں کے معاملے مت پوچھ　　راستے میں اُلجھ گئے رہرو

ہوئے آزاد لیکن آ رہی ہے　　قفس کی بو ابھی تک بال و پر سے
شکستہ لب کنارے کہہ رہے ہیں　　کوئی طوفان گزرا ہے ادھر سے
لو ارباب چمن بھی پوچھتے ہیں　　کہ آئی ہے یہ بوئے گل کدھر سے
غم منزل ہی اب منزل ہے ''باقی''　　عقیدت ہو گئی ہے راہبر سے

جانے کس حال میں بیٹھے تھے ہم گھور کر اپنے پرائے ، گزرے
کس نے چھیڑا ترے دیوانوں کو آسماں سر پہ اٹھائے ، گزرے

تونے پھر بات بڑھادی ، ورنہ داستاں ہم تو سنا بیٹھے تھے
کیسے منزل پہ پہنچتا کوئی راہ میں راہنما بیٹھے تھے
اس طرح اٹھے تری محفل سے جیسے ہم بھول کے آ بیٹھے تھے

گذر گیا ہے محبت کا مرحلہ شاید ترے خیال سے بھی دل نہ بیقرار ہوا
نسیم صبح کی شوخی میں تو کلام نہیں مگر وہ پھول جو پامال رہگذار ہوا

اک زمانے کو کر گئے گمراہ مٹتے مٹتے بھی تیرے نقش قدم
اک تمہاری نظر بدلنے سے ہو گئیں کتنی محفلیں برہم
ایک سے ایک بڑھ کے زخم حیات اور کیا ہے حقیقت عالم

یہ ادائیں ، یہ حسن ، یہ تیور تجھ پہ ہونے لگا گماں غزل
تیری باتوں کا لطف آتا ہے اتنی رنگین ہے زبان غزل
زلف و رخسار ہی کا عکس نہیں اب ہے کچھ اور گلستان غزل
اور بھی کچھ طویل کر دی ہے غم ہستی نے داستان غزل

اس قدر برہمی شکایت پر چھوڑیئے ہم نے مدعا پایا
اور بھی تلخ ہو گیا جینا وضعداری کا جب خیال آیا
کون سے راستے پہ چل نکلے جس نے دیکھا اسی نے سمجھایا

ہائے کس وقت تو نے یاد کیا ہائے اس وقت پاس ہم نہ ہوئے
خیر ہو تیری کم نگاہی کی ہم کبھی بے نیاز غم نہ ہوئے
لوح آزاد ہے ، قلم آزاد پھر بھی کچھ حادثے رقم نہ ہوئے
خون ٹپکا کلی کلی سے مگر !! دست صیّاد ہی قلم نہ ہوئے

حیرت ہے کہ تیرے سامنے سے — غیروں کی طرح گذر گئے ہم
ہر حادثۂ حیات کے پاس — لے کر غم راہبر گئے ہم
گزری ہے صبا قفس سے ہو کر — لینا غم بال و پر گئے ہم
حالات بتا رہے ہیں ''باقی''
کیا منہ سے کہیں کدھر گئے ہم

رسم سجدہ بھی اُٹھا دی ہم نے — عظمت عشق بڑھا دی ہم نے
جب کوئی تازہ شگوفہ پھوٹا — کی گلستاں میں منادی ہم نے
جب چمن میں نہ کہیں چین ملا — در زنداں پہ صدا دی ہم نے
آنچ صیاد کے گھر تک پہنچی — اتنی شعلوں کو ہوا دی ہم نے
خون دل سے در میخانہ پر — تیری تصویر بنا دی ہم نے
اس قدر تلخ تھی رُوداد حیات — یاد آتے ہی بھلا دی ہم نے
دل کو آنے لگا بسنے کا خیال
آگ جب گھر کو لگا دی ہم نے

ناصر کاظمی

ناصر رضا کاظمی نام ناصر تخلص - ۸ دسمبر ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ مولد و وطن انبالہ شہر ہے - آپ کے والد محمد سلطان صاحب فوج میں صوبیدار میجر تھے- اور ایک والد صاحب ہی پر موقوف نہیں آپ کے خاندان کے اکثر بزرگ فوج اور پولیس کے محکموں سے وابستہ رہے ہیں - اس لحاظ سے مرزا غالب کا یہ بیان واقعی -

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

کم و بیش ہمارے نوجوان شاعر جناب ناصر کے بھی حسب حال ہے - چونکہ انہوں نے بھی مرزا غالب کی طرح آبائی سپہ گری کے بجائے شاعری کو اپنا محبوب مشغلہ بنایا ہے -

ناصر صاحب کی ابتدائی تعلیم شملہ اور انبالہ میں ہوئی جہاں سے انہوں نے اردو مڈل اور ہائی اسکول کے امتحانات پاس کئے- پھر اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور ایف - اے پاس کر کے بی - اے میں پڑھتے بھی رہے لیکن ۱۹۴۵ء میں بعض وجوہ کی بنا پر امتحان دئے بغیر وطن واپس چلے گئے - گھر پر دو ڈھائی سال اپنی موروثی زمینداری کی دیکھ بھال میں گزار کر ۷ ستمبر ۱۹۴۷ء کو آپ دوبارہ لاہور آگئے اور اب یہیں مستقل طور پر سکونت پذیر ہیں - اس مرتبہ لاہور کے دوران قیام میں آپ ابتداً امپلائمنٹ ایکسچینج میں ملازم رہے پھر تقریباً ایک سال تک ''اوراق نو'' کے عملۂ ادارت میں شامل رہے بالاخر یکم اکتوبر ۱۹۵۲ء سے ''ہمایوں'' کی ادارت کے فرائض انجام دینا شروع کئے - چنانچہ آپ کا یہ مشغلہ اب تک جاری ہے -

ناصر صاحب کی شعر گوئی کا آغاز ۱۹۴۰ء سے ہوا لیکن ادبی حلقوں تک اُن کی آواز ۱۹۴۲ء میں پہنچی جب آل انڈیا ریڈیو لاہور کے پہلے نشریہ مشاعرہ میں انہوں نے اپنا کلام پڑھا - شاعری کی ابتدا سانیٹ اور نظم سے ہوئی اور اس رنگ میں اختر شیرانی مرحوم سے وہ خاصے متاثر رہے - پھر یہ خیال کرکے کہ یہ رنگ کچھ تقلیدی سا ہے غزل سرائی شروع کی - غزل گوئی کے باب میں اُن کی رہنمائی حضرت حفیظ ہوشیارپوری نے کی اور حقیقت یہ ہے کہ انہیں کے مفید مشوروں سے ناصر صاحب اپنے اس نئے رنگ میں ایک انفرادیت پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے -

غم عشق کے ہاتھوں انسان کے دل پر جو کیفیتیں گزرتی ہیں غزل کو اس کی روداد کہا گیا ہے ۔ لیکن کبھی کبھی غم روزگار کی کسک اس درجہ بڑھ جاتی ہے کہ دل غم عشق کے صدمے بھول کر اس غم میں ڈوب کر رہ جاتا ہے اور پھر غزل جو دراصل دل کی آواز کی گونج ہے غم روزگار کا افسانہ دہراتی ہے ۔ تا ہم حقیقت یوں ہے کہ جب تک غم روزگار کو عشق کا منصب نہ سونپا جائے اور جب تک اس پھیلے ہوئے غم کو سمیٹ کر دل کی بستی نہ بسائی جائے اس وقت تک وہ غزل کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہوتا ۔ یہ بات ہمارے نئے غزل گویوں میں سب سے زیادہ ناصر کاظمی نے سمجھی ہے اُن کی غزل شروع سے آخر تک غم عشق کی بھر پور ہم نوائی بھی کرتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ غم روزگار کو پورے خلوص کے ساتھ اپنا غم اور اپنے دل کی آواز بنا کر اپنے ہر نغمہ ' اپنی ہر لے میں وہ سوز و گداز پیدا کرتی ہے جس کے بغیر غزل غزل نہیں بنتی ۔ تقسیم اور اس کے پیدا کئے ہوئے غیر معمولی انتشار نے ہمارے دلوں میں جو خلش اور جو بے تابی پیدا کی ہے اس کی کسک ہماری غزل میں بھی آئی ہے ' اس کی غم انگیز صدائیں تقریباً سب غزل گویوں کے یہاں سنائی دیتی ہیں ' لیکن اس خلش ' بے تابی اور غم کی آواز کو جتنے درد اور جتنے حسن و لطف کے ساتھ ناصر کاظمی نے غزل کے مزاج میں پوری طرح سمویا ہے وہ بلا شبہ تقسیم کے بعد اس رنگ کی صحیح تصویر اور اس آواز کی مکمل گونج ہے ۔ تقسیم کے اثرات کی داخلی کیفیتوں کی نمائندگی غزل میں ناصر کاظمی سے بہتر کسی اور نئے غزل گو نے نہیں کی اور اس کی کئی وجہیں ہیں ۔

سب سے پہلے تو یہ کہ ناصر کاظمی نے اس بدلی ہوئی فضا کو پوری طرح اپنے اوپر طاری کر کے اس کی آواز کو اپنی آواز سے ملا لیا ہے اور دوسرے اس لئے کہ انہوں نے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ فراموش نہیں کیا کہ غزل کا ایک خاص مزاج ہے اور مزاج کی یہ کیفیت اس میں صدیوں کی مسرت و غم کو سمو لینے کے بعد پیدا ہوئی ہے ۔ غزل میں کوئی بات بھی کہی جائے ایک خاص لہجہ ' ایک خاص انداز میں کہی جا سکتی ہے ۔ اگر اس طرح نہ کہی جائے تو وہ بات غزل کی بات نہیں رہتی ۔ غزل کے مزاج کی اسی کیفیت کا نام روایت ہے ۔ ناصر کاظمی کی غزل اس مفہوم میں روایت کے حسن کی ایک نکھری ہوئی شکل ہے ۔ لیکن اس نکھری ہوئی صورت میں ناصر کاظمی نے اپنی طرف سے کچھ اضافے بھی کئے ہیں ۔ وہ غزل کے معاملہ میں روایت پسند ' بلکہ روایت کے پرستار ہیں ۔ لیکن ان کی روایت خارجی ماحول اور تاریخی تسلسل کے ساتھ ساتھ شخصیت کے بھر پور سوز و گداز کی حامل ہے ۔ ناصر کاظمی کی غزل پڑھکر اس بات کا یقین ہوتا ہے ۔ کہ اچھا غزل گو اس وقت تک شعر نہیں کہتا جب تک اس کے دل کی تڑپ اسے شعر کہنے پر مجبور نہ کر دے ۔ دل کی تڑپ بے ساختہ اور بے تابانہ شعر کا لباس پہن لے تو غزل بن جاتی ہے ۔ ناصر کی غزل روایت کے تسلسل اور اس کے رچے ہوئے حسن کے ساتھ ساتھ اسی بے ساختہ ' بے تابانہ تڑپ کی مکمل عکاس و ترجمان ہے ۔

ناصر کاظمی کی غزل کی ایک اور خصوصیت جس سے ان کی جدت پسندی ' غیر معمولی اپج اور غزل کی صحیح مزاج دانی کا اندازہ ہوتا ہے یہ ہے کہ انہوں نے فطرت کے نغموں کو اپنا ہم نوا بنا دیا ہے ۔ حسن فطرت سے غزل کی محفل سجائی ہے اور خارجی مظاہر '

داخلی کیفیات اور حسن فطرت کے درمیان ایک ایسا رشتہ قائم کیا ہے کہ تینوں چیزیں ایک ہی زنجیر کی کڑیاں بن گئی ہیں ۔

ناصر کو اچھا غزل گو بننے میں جس چیز نے (دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ) بہت مدد دی ہے وہ اُن کے بیان کی سادگی اور لچک ہے ۔ اُن کے پاس گہری کیفیت کے اظہار کے لئے آسان سے آسان لفظ موجود ہیں اور اُنہیں یہ معلوم ہے کہ ان آسان لفظوں کو کس طرح ترتیب دیا جائے تو وہ ایک لطیف اور دل سوز نغمہ بن جاتے ہیں ۔

غرض گذشتہ چند برسوں میں ہمارے اُفق شاعری پر جو درخشاں ستارے اُبھرے ہیں اُن میں ناصر کاظمی شاید سب سے سلجھے ہوئے غزل گو ہیں ۔ اُن کی غزلوں میں خالی خولی معاملہ بندی نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے آپ میں ڈوب کر شعر لکھتے ہیں چنانچہ اُن کے خیال کی گہرائی اور بیان کی پہنچ اُنہیں اپنے ہم عصروں سے کہیں آگے لے گئی ہے اور پڑھنے والوں کے ذہنوں میں وہ بلا شبہ نوجوان کی حیثیت سے نہیں ' ایک کہنہ مشق کی حیثیت سے اُبھرتے ہیں ۔ موصوف کا مجموعہ کلام ''برگ نے'' حال ہی میں مکتبۂ کارواں کے زیر اہتمام شایع ہوا ہے ۔

انتخاب کلام

غزلیات

وا ہوا پھر در میخانۂ گل — پھر صبا لائی ہے پیمانۂ گل
زمزمہ ریز ہوئے اہل چمن — پھر چراغاں ہوا کاشانۂ گل
رقص کرتی ہوئی شبنم کی پری — لے کے پھر آئی ہے نذرانۂ گل
پھول برسائے یہ کہہ کر اُس نے — میرا دیوانہ ہے دیوانۂ گل
پھر کسی گل کا اشارہ پا کر — چاند نکلا سر میخانۂ گل
پھر سر شام کوئی شعلہ نوا — سو گیا چھیڑ کے افسانۂ گل
آج غربت میں بہت یاد آیا — اے وطن تیرا صنم خانۂ گل
آج ہم خاک بسر پھرتے ہیں — ہم سے تھی رونق کاشانۂ گل
ہم پہ گزرے ہیں خزاں کے صدمے — ہم سے پوچھے کوئی افسانۂ گل
کل ترا دور تھا اے باد صبا — ہم ہیں اب سرخئی افسانۂ گل

ہم ہی گلشن کے امیں ہیں ''ناصر''
ہم سا کوئی نہیں بیگانۂ گل

عشق جب زمزمہ پیرا ہوگا — حسن خود محو تماشا ہوگا
سن کے آوازۂ زنجیر صبا — قفس غنچہ کا در وا ہوگا
جرس شوق اگر ساتھ رہی — ہر نفس شہپر عنقا ہوگا
دائم آباد رہے گی دنیا — ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا
کون دیکھے گا طلوع خورشید — ذرہ جب دیدۂ بینا ہوگا
ہم تجھے بھول کے خوش بیٹھے ہیں — ہم سا بیدرد کوئی کیا ہوگا
پھر سلگنے لگا صحرائے خیال — ابر گھر کر کہیں برسا ہوگا
پھر کسی دھیان کے صد راہے پر — دل حیرت زدہ تنہا ہوگا
ہر روش رنگ برستے ہوں گے — عالم خاک شفق زا ہوگا
پھر کسی صبح طرب کا جادو — پردۂ شب سے ہویدا ہوگا
کُل زمینوں کے خنک رمنوں میں — جشن رامش گری برپا ہوگا
پھر نئی رت کا اشارہ پا کر — وہ سمن بو چمن آرا ہوگا
گلِ شب تاب کی خوشبو لے کر — ابلق صبح روانہ ہوگا
پھر سر شاخ شعاع خورشید — نکہت گل کا بسیرا ہوگا
اک صدا سنگ میں تڑپی ہوگی — اک شرر پھول میں لرزا ہوگا
تجھ کو ہر پھول میں عریاں سوتے — چاندنی رات نے دیکھا ہوگا
دیکھ کر آئینۂ آب رواں — پتہ پتہ لب گویا ہوگا

شام سے سوچ رہا ہوں ''ناصر''
چاند کس شہر میں اترا ہوگا

یہ شب یہ خیال و خواب تیرے — کیا پھول کھلے ہیں منہ اندھیرے
شعلے میں ہے ایک رنگ تیرا — باقی ہیں تمام رنگ میرے
آنکھوں میں چھپائے پھر رہا ہوں — یادوں کے بجھے ہوئے سویرے
دیتے ہیں سراغ فصلِ گل کا — شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے
منزل نہ ملی تو قافلوں نے — رستے میں جما لئے ہیں ڈیرے
جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو — بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے

روداد سفر نہ چھیڑ ''ناصر''
پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے

مایوس نہ ہو اُداس راہی — پھر آئے گا دور صبح گاہی
اے منتظر طلوع فردا — بدلے گا جہان مرغ و ماہی
پھر خاک نشیں اٹھائیں گے سر — مٹنے کو ہے ناز کجکلاہی
انصاف کا دن قریب تر ہے — پھر داد طلب ہے بے گناہی
پھر اہل وفا کا دور ہوگا — ٹوٹے گا طلسم کم نگاہی
آئین جہاں بدل رہا ہے — بدلیں گے اوامر و نواہی

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا — وہ تری یاد تھی اب یاد آیا
آج مشکل تھا سنبھلنا اے دوست — تو مصیبت میں عجب یاد آیا
دن گزارا تھا بڑی مشکل سے — پھر ترا وعدۂ شب یاد آیا
تیرا بھولا ہوا پیمان وفا — مر رہیں گے اگر اب یاد آیا
پھر کئی لوگ نظر سے گزرے — پھر کوئی شہر طرب یاد آیا
حال دل ہم بھی سناتے لیکن — جب وہ رخصت ہوا تب یاد آیا

بیٹھ کر سایۂ گل میں ''ناصر''
ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
برہم ہوئی ہے یوں بھی طبعیت کبھی کبھی
تیرے قریب رہ کے بھی دل مطمئن نہ تھا
گزری ہے مجھ پہ یہ بھی قیامت کبھی کبھی

اس پیکر ناز کا فسانہ — دل ہوش میں آئے تو سنائے
آنکھیں تھیں کہ دو چھلکتے ساغر — عارض کہ شراب تھر تھرائے
اُڑتی ہوئی زلف یوں پریشاں — جیسے کوئی راہ بھول جائے
کچھ پھول برس پڑے زمیں پر — کچھ گیت ہوا میں لہلہائے

کیا کہوں اب تمہیں خزاں والو ! — جل گیا آشیاں میں کیا کیا کچھ

یہ نگری اندھیاری ہے — اس نگری سے جلدی بھاگ

پیاسی دھرتی جلتی ہے   سوکھ گئے بہتے دریا

ترے ملنے کو بیکل ہو گئے ہیں   مگر یہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں
بہاریں لے کے آئے تھے جہاں تم   وہ گھر سنسان جنگل ہو گئے ہیں
جنہیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ''ناصر''   وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں

کچھ کہہ کے خموش ہو گئے ہم   قصہ تھا دراز سو گئے ہم
تو کون ہے تیرا نام کیا ہے   کیا سچ ہے کہ تیرے ہو گئے ہم
زلفوں کے دھیان میں لگی آنکھ   پُر کیف ہوا میں سو گئے ہم

گرفتہ دل ہیں بہت آج تیرے دیوانے
خدا کرے کوئی تیرے سوا نہ پہچانے
ہزار شکر کہ ہم نے زباں سے کچھ نہ کہا
یہ اور بات کہ پوچھا نہ اہل دنیا نے
خیال آ گیا مایوس رہگزاروں کا
پلٹ کے آ گئے منزل سے تیرے دیوانے

یوں آیا وہ جان بہار   جیسے جگ میں پھیلے بات
رنگ کُھلے صحرا کی دھوپ   زلف گھنے جنگل کی رات
کچھ نہ کہا اور کچھ نہ سنا   دل میں رہ گئی دل کی بات

دیکھ محبت کا دستور   تو مجھ سے میں تجھ سے دور
ہم اپنا غم بھول گئے   آج کسے دیکھا مجبور
دل کی دھڑکن کہتی ہے   آج کوئی آئے گا ضرور

ہمیں بھی کریں یاد اہل چمن   چمن میں اگر کوئی غنچہ کِھلے

آنکھ کا تارا آنکھ میں ہے   اب نہ گنیں گے تارے ہم

ترے جلو میں بھی دل کانپ کانپ اٹھتا ہے
مرے مزاج کو آسودگی بھی راس نہیں
مجھے یہ ڈر ہے تری آرزو نہ مٹ جائے
بہت دنوں سے طبیعت مری اداس نہیں

دل ویراں میں دوستوں کی یاد
جیسے جگنو ہوں داغ میں گل کے
کیسی آئی بہار اب کے برس
بوئے خوں ہے ایاغ میں گل کے

دل میں تیری یادوں نے
کیسے کیسے رنگ بھرے
پھول تو کیا کانٹے بھی نہیں
کیسے اجڑے باغ ہرے

یہ بھی کیا شام ملاقات آئی
لب پہ مشکل سے تری بات آئی
صبح سے چپ ہیں ترے ہجر نصیب
ہائے کیا ہوگا اگر رات آئی
بستیاں چھوڑ کے برسے بادل
کس قیامت کی یہ برسات آئی

یاد ہیں مرحلے محبت کے
ہائے اس بیکلی میں کیا کچھ تھا
کتنے بیتے دنوں کی یاد آئی
آج تیری کمی میں کیا کچھ تھا
کتنے مانوس لوگ یاد آئے
صبح کی چاندنی میں کیا کچھ تھا

مری بربادیوں پر رونے والے
تجھے محو فغاں دیکھا نہ جائے
سفر ہے اور غربت کا سفر ہے
غم صد کارواں دیکھا نہ جائے
در و دیوار ویراں شمع مدھم
شب غم کا سماں دیکھا نہ جائے
پرانی صحبتیں یاد آ رہی ہیں
چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے

صدائے رفتگاں پھر دل سے گزری
نگاہ شوق کس منزل سے گزری
ہوائے صبح نے چونکا دیا یوں
تری آواز جیسے دل سے گزری

خموشی انگلیاں چٹخا رہی ہے
تری آواز اب تک آ رہی ہے
ترے شہر طرب کی رونقوں میں
طبیعت اور بھی گھبرا رہی ہے

کرم اے صر صر آلام دوراں دلوں کی آگ بجھتی جا رہی ہے
کڑے کوسوں کے سنّاٹے ہیں لیکن تری آواز اب تک آ رہی ہے

کم فرصتیٔ خواب طرب یاد رہے گی
گزری جو ترے ساتھ وہ شب یاد رہے گی

نصیب عشق دل بے قرار بھی تو نہیں
بہت دنوں سے ترا انتظار بھی تو نہیں
تلافیٔ ستم روزگار کون کرے
تو ہم سخن بھی نہیں راز دار بھی تو نہیں
زمانہ پرسش غم بھی کرے تو کیا حاصل
کہ تیرا غم، غم لیل و نہار بھی تو نہیں
تو ہی بتا کہ تری خامشی کو کیا سمجھوں
تری نگاہ سے کچھ آشکار بھی تو نہیں
بہت فسردہ ہے دل، کون اس کو بہلائے
اداس بھی تو نہیں بے قرار بھی تو نہیں

دل میں ہر وقت چبھن رہتی تھی تھی مجھے کس کی طلب یاد نہیں
وہ ستارا تھی کہ شبنم تھی کہ پھول ایک صورت تھی عجب یاد نہیں
کیسی ویراں ہے گزر گاہ خیال جب سے وہ عارض و لب یاد نہیں
رشتۂ جاں تھا کبھی جس کا خیال اس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں

جب تجھے پہلی بار دیکھا ہے وہ بھی تھا موسم طرب کوئی
یاد آتی ہیں دور کی باتیں— پیار سے دیکھتا ہے جب کوئی
چوٹ کھائی ہے بارہا لیکن آج تو درد ہے عجب کوئی

سائے کی طرح مرے ساتھ رہے رنج و الم
گردش وقت کبھی راس نہ آئی مجھ کو
دھوپ ادھر ڈھلتی تھی، دل ڈوبتا جاتا تھا ادھر
آج تک یاد ہے وہ شام جدائی مجھ کو

کوئی بھی ہم سفر نہ تھا شریک منزل جنوں
بہت ہوا تو رفتگاں کا دھیان آ کے رہ گیا
وہی اداس روز و شب، وہی فسوں، وہی ہوا
ترے وصال کا زمانہ یاد آ کے رہ گیا

ترے خیال سے لو دے اٹھی ہے تنہائی
شب فراق ہے یا تیری جلوہ آرائی
یہ سانحہ بھی محبت میں بارہا گزرا
کہ اس نے حال بھی پوچھا تو آنکھ بھر آئی

بچھڑ کے تجھ سے ہزاروں طرف خیال گیا
تری نظر مجھے کن منزلوں میں چھوڑ گئی

ترا خیال بھی تیری طرح مکمل ہے
وہی شباب، وہی دلکشی، وہی انداز

چلے تو ہیں جرس گل کا آسرا لے کر
نہ جانے اب کہاں نکلے گا صبح کا تارا

فکر تعمیر آشیاں بھی ہے   خوف بے مہرئی خزاں بھی ہے
رنگ بھی اڑ رہا ہے پھولوں کا   غنچہ غنچہ شرر فشاں بھی ہے
کچھ ترا حسن بھی ہے ہوش ربا   کچھ مری شوخئی بیاں بھی ہے
وجہ تسکیں بھی ہے خیال اس کا   حد سے بڑھ جائے تو گراں بھی ہے
زندگی جس کے دم سے ہے "ناصر"
یاد اس کی عذاب جاں بھی ہے

کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے
گزر گئی جرس گل اداس کر کے مجھے

ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی
مزے ملے انہیں راتوں میں عمر بھر کے مجھے
پھر آج آئی تھی اک موجۂ ہوائے طرب
سنا گئی ہے فسانے ادھر ادھر کے مجھے

اسی منزل میں ہیں سب ہجر و وصال رہرو آبلہ پا غور سے سن!
اسی گوشے میں ہیں سب دیر و حرم دل صنم ہے کہ خدا غور سے سن
رنگ منت کش آواز نہیں گل بھی ہے ایک نوا غور سے سن
ہر قدم راہ طلب میں ''ناصر''
جرس دل کی صدا غور سے سن

اللہ نواز خاں نوازؔ

اللہ نواز خان نام ۔ سردار خاندانی لقب اور نواز تخلص' ۱۹۱۳ء میں ضلع ڈیرہ غازیخان کے دور افتادہ قصبہ ''وھوا'' میں پیدا ہوئے ۔ یہ قصبہ دامن کوہ سلیمان میں واقع ہے ۔ آپکے والد سردار رب نواز خان اپنی قوم کھتران پٹھان کے چیف اور اپنے علاقہ کے تمندار ہیں ۔ نواز صاحب اپنے تمام بھائیوں میں سب سے بڑا ہونے کیوجہ سے تمنداری کے واحد وارث ہیں ۔

نواز صاحب کے اجداد ھایوں کے ہمراہ قندھار سے آکر دامان کوہ سلیمان میں آباد ہوگئے ۔ اس علاقہ میں انکی قوم کے تقریباً دس ہزار افراد آباد ہیں ۔ اور یہ اس قوم کے سردار ہیں ۔ سرکار برطانیہ نے انہیں بہت قسم کی مراعات از قسم جاگیر نقدی و اراضی دے رکھی تھیں ۔ اپنے علاقہ کے دیوانی اور فوجداری مقدمات بھی خود سماعت کرتے تھے شاہی جرگۂ تمنداری کے ممبر ہیں ۔ پاکستان کی تشکیل کے بعد دیگر تمنداران کے ساتھ انکے اختیارات مجسٹریٹی بھی واپس لے لئے گئے ۔

نواز صاحب کی ابتدائی تعلیم وھوا میں ہوئی ۔ لیہ ضلع مظفر گڑھ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اسلامیہ کالج لاھور میں داخل ہوگئے ۔ مزاج میں افغانیت غالب تھی ۔ ہر وقت لڑنے مرنے پر آمادہ رہتے تھے ۔ بچپن میں ھی بر بنائے ھجو نویسی سب سے جھگڑا مول لے بیٹھتے ۔ اسلئے بمشورۂ اساتذہ انکو اسلامیہ کالج پشاور میں داخل کرانا پڑا وھاں سے ۱۹۳۴ء میں بی۔اے (آنرز) کا امتحان پاس کیا ۔

۱۹۳۷ء میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر نامزد کئے گئے ۔ مگر اپنی آزادہ روی کیوجہ سے زیادہ دیر تک ملازمت نہ کر سکے اور ایک سال کے اندر اندر ملازمت سے سبکدوش ہونا پڑا ۔ اس واقعہ کے متعلق خود کہتے ہیں

لطف شہ کی سیہ روئی سے شکر ہے ہم آزاد رہے
اپنے نام کی رسوائی سے نقش نگیں بد نام نہیں

ہمچو بیدل زیر دست چتر شاہی نیستم
موئے سر در سایۂ خود پرورد مجنوں ما

انقطاع ملازمت کے بعد آنریری مجسٹریٹ بنائے گئے - مگر یہ نسخہ بھی انکے مزاج کو راس نہ آیا - ہمیشہ ہوا کے مخالف چلنے کے عادی ہیں - مسلم لیگ کی سرگرمیوں کے سلسلے میں ڈیرہ اسمعیل خان میں تقریر کرنے پر تین ماہ کیلئے واجن پور میں نظر بند کر دئے گئے - اختیارات مجسٹریٹی سے بھی دستکش ہونا پڑا - اپنی اس نظر بندی کے متعلق کہتے ہیں -

آتا ہے یاد دور فرنگی کہ کر گیا زنداں نصیب جرم متاع ہنر مجھے
بزمانۂ فرنگی میں بھی تھا قفس میں بلبل بقصور نغمہ سنجی بگناہ نکتہ دانی
بتخانہ بھارت میں لیا نام خدا کا اسواسطے ہیں بندہ نواز آپ نظر بند

سیاست میں دخل دینے کا بیحد شوق ہے - سیاسی مقصد کے پیش نظر آجکل لا کالج میں داخل ہو کر قانون کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں - پرائمری جماعتوں سے شعر کہنے کا شوق ہوا تھا - مڈل میں آ کر فارسی شعر کہنے لگے - ابتدا میں حضرت شاداں بلگرامی اور میرزا یاس یگانہ سے ایک آدھ غزل میں اصلاح لی مگر پسند خاطر نہ ہوئی چنانچہ یہ غزلیات دیوان سے بھی خارج کر دیں اردو میں غالب اور فارسی میں بیدل انکے روحانی استاد ہیں - چنانچہ انکے فارسی کلام پر بیدل کا رنگ بہت غالب ہے - اردو کلام میں بھی اس افتاد طبع کی شہادت پائی جاتی ہے -

گرفتم درس رفت و بود دل در مکتب بیدل من آخر چشم دارم تا کسے گوید بیا اینجا

کلام میں متصوفانہ عقائد کا غلبہ ہے - محی الدین ابن عربی سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں - کائنات کی نفی کے شدت سے قائل ہیں قدیم رنگ میں شاعری کرتے ہیں - جدید رنگ کی بے قافیہ نظموں سے سخت گریز پا ہیں بلکہ شدت سے مخالف - اردو سے زیادہ فارسی میں کہتے ہیں - دونوں زبانوں میں صاحب دیوان ہیں - پنجابی اور ملتانی زبان میں بھی شعر کہتے ہیں - غزل میں پختگی ہے ہجو گوئی میں ید طولیٰ حاصل ہے - مزاج میں '' انا '' کا بیحد غلبہ ہے - کسی کو خاطر میں نہیں لاتے وقت کے ماحول کا ساتھ نہیں دے سکے اسواسطے بہت شہر آشوب اور فلک آشوب لکھی ہیں جن میں تموج جذبات سے ہجو یہ رنگ غالب ہو گیا ہے -

انتخاب کلام

ذرّے کی کائنات کو صحرا نہ کر سکا اک قطرۂ سرشک کو دریا نہ کر سکا
دنیا کے واسطے وہ مسیحا سہی ''نواز'' لیکن ہمارے دل کا مداوا نہ کر سکا

اے جہان حسن کے مہ وشو ! ہاں نگاہ لطف ادھر بھی ہو
کہ تمہارا منتظر کرم ہے کوئی غریب دیار بھی

نہ ہو خندہ زن کبھی عندلیب مری خزاں کے فشار پر
چمن حیات نواز میں کبھی آ چکی ہے بہار بھی

تمہارے سایۂ دیوار میں تھکا ماندہ پڑا ہے کوئی غریب الدیار رہنے دے
تمہیں وصال کی رنگینیاں مبارک ہوں مجھے ستم کش صد انتظار رہنے دے

اے پھول نہیں زیبا، اے حسن نہیں سجتا گر باغ سے بکنے کو بازار میں تو آئے
کیا بات "نواز" آخر ان رندوں کی مستی کی مسجد میں بھی جو مئے سے ہیں کر کے وضو آئے

انکی گلی میں کل نواز کرتے ہی گرتے رہ گیا زخم نے چوٹ روک لی درد نے آسرا دیا

لئے پھرتی ہے بیاباں میں بگولوں کی طرح
آنکے پیمان وفا کی ہوس خام مجھے
کاش میں آن سے رہ و رسم بڑھاتا نہ کبھی
نہ تھا معلوم اس آغاز کا انجام مجھے
شکریہ حضرت عیسیٰ کے تکلف کا مگر
ہوں وہ بیمار نہیں آئیگا آرام مجھے

پھر دے رہا ہوں حسن کو فرمان دلبری
عالم کو درد عشق عطا کر رہا ہوں میں
کب تک ہو مجھ سے وعدۂ فردا کا انتظار
اے شب! گذر کہ حشر بپا کر رہا ہوں میں

میری خوں ریز آنکھوں نے ہزاروں گُل کھلائے ہیں
مگر اب تک میرے گھر کی بیابانی نہیں جاتی

میری لحد پر کہتے ہیں ہاں اب تو کچھ آرام ہوا
جیتے جی یہ کہتے تھے آرام نہیں آرام نہیں

حشر اُٹھا وقت سے پہلے قیامت آ گئی
میری تربت پر کوئی محشر خرام آ ہی گیا

ہوں وہ فرزانہ کیا لاکھوں میں تیرا انتخاب
کسلئے کہتے ہیں اہل ہوش دیوانہ مجھے
اٹھ گئے وہ جنکے دم سے بزم دل آباد تھی
ساری دنیا اب نظر آتی ہے ویرانہ مجھے

یہی مختصر ہے جہان دل میں حیات و موت کا فلسفہ
تیرے وصل سے کوئی جی اٹھا تیرے ہجر میں کوئی مر گیا
وہ ستم نصیب جفا ہوں میں ' وہ حریص ذوق وفا ہوں میں
نہ ھی زخم دل کو شفا ہوئی نہ "نواز" درد جگر گیا

بس اک وار اور ہو تیر نظر کا تمنا میں نے کتنی مختصر کی

اے دل یہ تیری خانہ خرابی کہ الاماں اتنا تو کچھ وہ شوخ ستمگر حسیں نہیں
ساغر نہیں تو خُم کو لگا لینگے منہ سے ہم ساقی نشہ بقید لبِ سا تگیں نہیں

شوق سے مجھکو تو ہے رنج دو عالم بھی قبول
ہو بیک لمحۂ میسر تیری آغوش مجھے

شیخ ! انکا کہاں ٹھکانا ہے جو خدا سے بھی نا مراد آئے

ھاں آپ اگر خفا ھیں خدا تو خفا نہیں بندہ نواز آپ کسی کے خدا نہیں
کھوئے گئے کچھ ایسے کسی کی تلاش میں اتنا پتہ ملا ہے کہ اپنا پتا نہیں

یہ اپنا ہو کے بھی اپنا نہ ہو سکا یارب
دلِ "نواز" سا کوئی بھی بے وفا نہ ملا

ظلم ہے یہ تیرا انداز تغافل ورنہ ہم
لطف سے تعبیر کرتے ھیں تیری بیداد بھی

کیا کہوں میں اسکی چشم سرمگیں کی کیفیت
خود بخود شرما گیا آئینۂ زانوئے دوست
اف بہار زندگانی کی جنوں سامانیاں
آ گیا پردوں سے باھر حسن بے قابوئے دوست

مری نظر سے اگر یہ دیکھیں حجاب اٹھ جائیں آرزو کے
یہ عین لیلیٰ ھے جسکو غافل حجاب محمل سمجھ رھے ھیں
دیا تھا الزام عشق شیریں کا اھل عالم نے کوھکن کو
یہ مجھ سے مزدور بے نوا کو بھی تیرے قابل سمجھ رھے ھیں

میرا نالہ حاصل خستگی میرا نغمہ عرض شکستگی
میری زندگی غم دلربا میری بندگی غم ماسوی
یہ سفینہ دل کے بھنور میں ھے نہ کوئی کنارا نظر میں ھے
نہ بھروسہ اسکو خدا پہ ھے نہ ھے نا خدا کا بھی آسرا

مجھے پیار ھے جان من! زندگی سے کہ تیری طرح بے وفا زندگی ھے
نہ جینے کی ھمت نہ مرنے کی طاقت کچھ ایسی ھی بے دست و پا زندگی ھے

میں توڑ دوں اس آئینے کو جو رنگ دوئی کا حامل ھو
تصویر تیری آئینہ میں کیوں تیرے مقابل ھو جائے

کیا ''نواز'' کی طرح جستجو ھے جہان لیل و نہار کو
کسے ڈھونڈھتے ھیں یہ اے خدا مہ و آفتاب لئے ھوئے

عشق اور بے نصیب ھو حسن کے التفات سے
تیری طلب طلب نہیں میرا جنوں جنوں نہیں

ھونے لگا ھے چرخ پھر اب مائل ستم آنے لگا ھے تیرے کرم کا یقین مجھے
میخانۂ الست پہ چھانے لگی گھٹا ھونے لگا ھے ذوق لب ساتگیں مجھے

قتیبہ عاقبت اندیش مجھکو پینے دے مجھے جوانی کی راتوں سے شرمسار نہ کر

تیرا بندہ ہے فانی گرچہ نقش آب کی صورت
دماغ اسکا مگر سرشار کِبر و عُجب و مستی ہے
میری کشت تمنا ہے وہ کھیتی کہ ''نواز'' اسمیں
جھڑی آنکھوں کی لگتی ہے گھٹا غم کی برستی ہے

جس جگہ سے ہوا آغاز وہی ہے انجام
زندگی کیا ہے اگر گردش پرکار نہیں

یہ رات وہ تھی کہ ہے صبح تک خمار اُسکا
یہ بات وہ ہے جسے راز داں سمجھتے ہیں
کسی پہ لطف و کرم اور سامنے اپنے
ہم اس ادا کو ترا امتحاں سمجھتے ہیں
تمہارے ابرو و مژگاں کو دیکھ خوں روئے
یہ زخم تیغ و سناں کی زباں سمجھتے ہیں
گِلا جفا کا مجھے اُنکو شکوہ‌ہائے وفا
یہ رخنہ گر ہے کوئی درمیاں سمجھتے ہیں

بت کریں دعویٰ خدائی کا یہ کیا کم ہے ثبوت
کون کہتا ہے کہ ظالم کو خدا یاد نہ تھا
مجھ کو برباد کیا تو نے دل خانہ خراب
رہنے والے بھی یہ کہتے ہیں کہ آباد نہ تھا
شعر کہنے کا سلیقہ اُنہیں آیا نہ نواز
مصرع ''قامت'' محبوب جنھیں یاد نہ تھا

تھک تھک کے وہ اب جور سے باز آ گئے آخر
شرمندہ ہوئی اُن سے ''نواز'' اپنی وفا کیا

سانس رکی رکی سی ہے ، نبض چھٹی چھٹی سی ہے
جان بلب ہے آشنا ۔ اب بھی نہ آئیگا کیا ؟
چشم ترِ "نواز" سے ابر برس برس پڑے
کُھل کے برس چکی گھٹا اب بھی نہ آئیگا کیا ؟

ہاں شمع کی ھچکیاں لے لے کر شب صبح تلک کٹ جاتی ہے
جو رات کو تارے گنتے ھیں آنکی بھی سحر ھو جاتی ہے
کیا پوچھتے ھو اندوہِ تعب ، اس منزل میں ہے نواز کہ اب
ھر ھوک سے شعلہ اٹھتا ہے ، ھر آہ شرر ھو جاتی ہے

وہ اگر آئے تو آئے بھی ھیں کس وقت "نواز"
ھوش امروز ہے باقی نہ سر دوش مجھے

وہ ھوئے دور آتنے جتنے ھم ھوئے آنکے قریب
جتنا آسان وصل تھا آتنا ھی مشکل ھوگیا

ذکر میرا ھوا محفل میں تو فرمایا "نواز"
ھاں کچھ ایسا ھی تھا نام آنکا ھمیں یاد نہیں

درد فراق و زندگی کھیل نہیں ھنسی نہیں
تیرے بغیر جان من ! زندگی ، زندگی نہیں

تیرے قیام و قعود و سجود ھیں بے سود
تری نماز میں گر مقصدِ نماز نہیں
ابھی تلک ھیں تیرے گرد آب و گلِ کے حصار
ابھی تُو اسود و احمر سے بے نیاز نہیں
خدا بنا نہ سکے جو وہ بندگی کیا ہے ؟
ہے کیا وہ بندۂ مومن جو کار ساز نہیں

دل کی نہ تشنگی بجھی، برسی نہ کُھل کے یہ گھٹا
اشک نکل کے آنکھ سے نوک پلک پہ تھم گئے

صوفی و مولوی و برھمن سے الحذر
کچھ رند فاقہ مست تھے جو با صفا ملے
اس دل کی بے وفائی کا ھمکو ھو کیا گِلا
تم بھی تو میرے دل کی طرح بے وفا ملے
دریا کی موج موج سے آ کر اُلجھ پڑے
تنکے کا ڈوبتے کو اگر آسرا ملے
کوئی خدا کا بندہ یہاں خود نگر نہ تھا
جو بھی ملے ''نواز'' ھمیں خود نما ملے

اک بے وفا سے ھمکو وفا کی رھی امید
شبنم کو فیض نیّر تاباں سے کیا ملے
دامان چاک عشق سے عریاں تنی ملی
دیکھیں کہ عقل سر بگریباں سے کیا ملے

نہ ھوگا میری طرح کوئی دلفگار کبھی
کسی کو یوں بھی نہ آئیگی یاد یار کبھی
ستارے اُبھرینگے، راتیں بھی ھونگی، دن ھونگے
جہاں میں بند نہیں ھوتے کار و بار کبھی
ستاروں میں یہ چمک، رات اسطرح کی خنک
کہو تو کیا یہ دن آتے ھیں بار بار کبھی
فریب حسن نہ کھائیگا حسن دنیا میں
پھر آئیگا نہ محبت کا اعتبار کبھی
جنیں کی مادر گیتی نہ پھر کوئی منصور
جنون عشق نہ آئیگا سر بدار کبھی
رھیگا ماہ جبینوں کو اعتراف شکست
نہ ھوگا حسن کا سرمایہ افتخار کبھی
کہیں گے گیسو بریدہ جہاں میں عورت کو
نہ ھوگا زلف کا پر پیچ اعتبار کبھی
نہ ھوگا فرق زن و مردِ بے بروت میں کچھ
دکھائیگا یہ تماشا بھی روزگار کبھی
ھزار عشق میں رسوائے روزگار آئے
ھزار سال میں آتا ھے راز دار کبھی

ابھر ابھر کے مٹینگے نقوش راز حیات
مگر نہ آئینگے دنیا میں دلفگار کبھی
اب آ بھی جاؤ کہ بجھنے پہ ہے چراغ حیات
کسی کا کرتا نہیں وقت انتظار کبھی

خور چراغ تہ داماں ہے میری شام کے ساتھ
نقش منزل ابھر آیا میرے ہر گام کے ساتھ
کوئی منہ تفرقہ پرداز کا کالا کر دے
صبح وابستہ ہے کیوں وصل کی ہر شام کے ساتھ
ہم وہی ہیں جو کبھی تھے، سو وہی ہو کے رہے
تم بدلتے ہی رہے گردش ایام کے ساتھ

پھر ایک وعدۂ بے اعتبار ہی کر لو
بڑا مزا ہے ہمارے فریب کھانے میں

جب پاس نہ تھے وہ آس تو تھی اب پاس ہیں تو وسو اس رہا
اس پریم پیار کی بازی میں سو ہار گئے جو جیتے ہیں
جب دست جنوں کی جنبش سے اڑتے تھے گریباں کے پرزے
اب سوزن مژگاں سے اپنا ہم چاک گریباں سیتے ہیں
رگ رگ کے طرارہ بھرتی ہے، دب دب کر نبض ابھرتی ہے
مرنے کی ابھی امید نہیں، آؤ کہ ابھی تک جیتے ہیں

ہر بُنِ خار سے پھوٹی ہے محبت کی کلی
مژدہ اے قیس کہ صحرا میں بہار آئی ہے
وسعت دھر میں اک مرد قلندر ہوں "نواز"
بخت اسکندر و نے شوکت دارائی ہے

بکھر جاتے ہیں اجزائے دو عالم میری نظروں میں
جو یاد آتا ہے عالم یار کی زلف پریشاں کا

مجھے بھول جا

اے نشاط زیست سے آشنا میں ستم رسیدۂ غم سہی
میں غم حیات کا ماجرا میں حدیث درد و الم سہی
میں حکایت غم دو جہاں میں فسانہ ہائے ستم سہی
میں ہوں بے نصیب کرم اگر تو میں بے نصیب کرم سہی
مگر آپکو ہو یہ فکر کیوں ؟ کسی بد نصیب کا ذکر کیوں ؟
اے جہان حسن کے مہ لقا
مجھے بھول جا مجھے بھول جا

تیرا کام نغمۂ جانفزا یہ حدیث سوز و گداز کیوں ؟
تیری جاں ہو کیوں ستم آشنا تیرا دل ہو درد نواز کیوں ؟
جو بنا ہو نغموں کے واسطے ہو وہ ساز نالہ طراز کیوں ؟
ہو جہان حسن کا غزنوی غم زندگی کا ایاز کیوں ؟
میرے درد و غم کا الم نہ کر یہ غضب نہ کر یہ ستم نہ کر
اے جہان حسن کے مہ لقا
مجھے بھول جا مجھے بھول جا

جو "نواز" بھول چکا مجھے اسے یاد میری ستائے کیوں ؟
کوئی کیوں ملال کرے میرا کوئی مجھ پہ اشک بہائے کیوں ؟
میں جلوں تو جلتا رہوں مگر کوئی اپنے دل کو جلائے کیوں ؟
جسے مل چکا ثمرِ وفا وہ کسی فریب میں آئے کیوں ؟
مجھے یاد کرکے غمیں نہ ہو میری بیکسی پہ حزیں نہ ہو
اے جہان حسن کے مہ لقا
مجھے بھول جا مجھے بھول جا

قطعات

میری تدبیر ہے میری شنہشاہ نہیں تکتا کبھی تقدیر کی راہ
بلند و پست کا خالق ہوں خود میں یہ کہتا تھا کوئی مرد خود آگاہ

یہ کیا چیز ہے گر تباہی نہیں ہے جواں کے ارادوں میں شاہی نہیں ہے
وہ کیا قوم تلوار سے ہو جو غافل وہ کیا مرد ہے جو سپاہی نہیں ہے

سرود الملک للّٰہی نہیں ہے — جوانوں میں خود آگاھی نہیں ہے
وطن ہے اصطلاح انکی کہ جنکے — ارادوں میں شہنشاھی نہیں ہے
وطن ھندوستاں کو کیوں کہوں میں — میری ھمت میں کوتاھی نہیں ہے

مدارس کے بتوں کو کیا سراھیں — ہے رخ پر غازہ نسوانی نگاھیں
نہیں انکی خودی میں زندگانی — یہ کیا ھیں چلتی پھرتی خانقاھیں

میرا شیوہ نہیں ہے آہ و زاری — میرا پیشہ نہیں اختر شماری
محبت ہے مجھے تیغ و سناں سے — میرا مذھب ہے ضربِ ذوالفقاری

چمن کو گل کو ذوق رنگ و بو دے — امیروں کو مے و جام و سبو دے
لرز جائیں جسے سن کر شہنشاہ — مجھے وہ نعرۂ اللہ ھُو دے

غریبی کو خودی سے بہرہ ور کر — فقیری میں شہنشاھی کی خو دے
جو دل کو زندہ، خوں کو گرم کر دے — الٰہی مجھکو ایسی آرزو دے

شہنشاھوں کا عالم ہے جفا مست — غلاموں کا زمانہ ہے وفا مست
میری دنیا نہ یہ مست و نہ وہ مست — قلندر ھوں خودی مست و خدا مست